بیادگار

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

جدید ایڈیشن

تذکرۂ سعید

❖ حالاتِ زندگی ❖ علمی خدمات ❖ امتیازات و خصوصیات ❖ نقوش و تاثرات
❖ ملفوظات ❖ منظومات ❖ اور بین الاقوامی شخصیات کے تعزیتی پیغامات پر مشتمل ایک عظیم دستاویز



سرپرست

حضرت مولانا مفتی اشتیاق احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم

استاذ فقہ و تفسیر جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیوبند

مرتب

انس احمد قاسمی غفرلہ

خادم تدریس مدرسہ جامع العلوم امبور

دار المؤلفین ٹیلگرام چینل

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ (سورۂ ہود:۱۰۸)

"رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے"

تَذْکِرَۂ سَعِیْد

بیادگار: رئیس المحدثین حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہ

❖ حالاتِ زندگی ❖ علمی خدمات ❖ امتیازات و خصوصیات ❖ نقوش و تاثرات
❖ ملفوظات ❖ منظومات ❖ اور بین الاقوامی شخصیات کے تعزیتی پیغامات پر مشتمل ایک عظیم دستاویز

سرپرست

حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم

استاذ فقہ و تفسیر دارالعلوم دیوبند

مرتب

انس احمد قاسمی

خادمِ تدریس مدرسۂ جامع العلوم، آمبور

معاونین

مولانا محمد اکرام الحق رشیدی، مولانا مفتی صدیق احمد داری

دارالمؤلفین ٹیلگرام چینل

فہرستِ مضامین

پیشِ گفتار

باخضر ہم نشیں باش

حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر اشتیاق احمد قاسمی صاحب
استاذِ تفسیر وفقہ دارالعلوم دیوبند، سرپرست ماہنامہ السعید

میرے محسن ومربی، استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند، عالم اسلام میں ممتاز ترین شخصیت کے حامل تھے، جنہوں نے اپنے کوعلمِ دین کے لیے خاص وخالص کررکھا تھا، یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، اگروہ چاہتے تو بہت مال اکٹھا کرسکتے تھے، مگر وفات کے بعد ان کی کتابوں اور جبّہ وعمامہ کے سوا کوئی چیز ترکہ میں تقسیم کرنے کے لیے نہ تھی، انہوں نے ترکہ چھوڑا تو صرف علم کا، عمل کا، شاگردوں کا، نمونۂ سلف کا، فضل وکرم اور احسان کا اور صرف نسبی وارث کے لیے نہیں پوری امت کے لیے۔ اہل علم اور اہل فضل کے لیے یہی نشانی ہونی بھی چاہیے ایک سچے عاشق رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی، انبیائے کرام علیہم السلام درہم و دینار نہیں چھوڑتے وہ علم ہی کا ترکہ چھوڑتے تھے۔ **انما ورثوا العلم** (ترمذی) میں اس کی صراحت ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی ترکہ کو آپس میں تقسیم فرماتے تھے، یہی ترکہ دائمی ہے، آج تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی ترکہ سے ہم حصے لے رہے ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ تقسیم چلتا رہے گا۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی دنیا طلبی سے دور تھی ایک بار عصر کے بعد ہم سب کو سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا: مال کی طلب میں زیادہ نہ پڑو یہ تو دنیا ہے، جتنی قسمت میں ہے مل کر رہے گی، اس سے کم بھی نہیں مل سکتی ہے؛

اس لیے یکسوئی کے ساتھ علم میں لگے رہو! پھر پر جوش انداز میں ارشاد فرمایا:

سنو! میں گجراتی ہوں، جو تجارت میں بڑی مہارت رکھتے ہیں لیکن میں نے علم کو ترجیح دی، اس کی وجہ سے بڑی بڑی پریشانیاں آئیں، فاقے بھی ہوئے؛ مگر پائے ثبات میں لرزہ نہیں آیا، پھر اللہ تعالیٰ نے فراوانیاں عطا فرمادیں، جب چھ بچے ہوگئے تو بہت سی قسمتیں اکٹھا ہوگئیں اور جب ہدایت القرآن کی تفسیر شروع کی تو اس کے بعد کبھی پریشانی نہ ہوئی، ہر مؤمن کی آزمائش ہوتی ہے اور ہر ایک کی زندگی میں ایک عقبہ (گھاٹی) آتا ہے، جب صبر واستقلال کے ساتھ وہ عقبہ پار کرلیتا ہے تو پھر آسانی ہی آسانی رہتی ہے۔ ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسَد اللّٰہی
جب عشق سِکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھُلتے ہیں غلاموں پر اَسرارِ شہنشاہی

ہم سب اللہ تعالیٰ کے شکرگزار ہیں کہ ایسی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جس نے اسلاف کے قصے پر مہرِ صداقت لگادی، جن کے ہر عمل کو ہم نے سنت کے مطابق پایا، جن کے قریب رہ کر اندازہ ہوا کہ وہ اپنے عمل کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے لائق بنانے کی محنت کررہے ہیں، خلوص وللّٰہیت کا پیکر تھے، ان کی مثال کم از کم مجھے تو نہیں ملی، جن کے علم کی جامعیت ایسی کہ علوم شرعیہ کا ہر علم ہر وقت مستحضر تھا، ہر علم کو فن کی حیثیت سے پڑھا اور پڑھایا تھا، مجھے جب بھی کوئی اشکال پیش آتا خدمت میں حاضر ہوتا تو اس مسئلہ کی ایسی تقریر فرماتے جیسے ابھی میرے لیے تازہ مطالعہ کیا ہو! متعدد کتابوں کے مطالعے کے باوجود اپنی کم فہمی، کج فہمی اور کم مائیگی کا احساس بھی ہوجاتا تھا۔

ڈوب سا جاتا ہے دل رہ رہ کے ان کی یاد میں
کوئی کیا سمجھے کہ وجہِ بے خودی ہوتی ہے کیا؟

دل جب بہت بے چین ہو جاتا ہے تو ان کی بیٹھک میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں ، اس کے درودیوار کو دیکھ کر حضرت کی نشست گاہ کے قریب تھوڑی دیر گزار کر آجاتا ہوں۔ ؎

نہیں ہے پیر میخانہ ، مگر فیضان باقی ہے
ابھی تک میکدے سے بوئے عرفانی نہیں جاتی

تھوڑی تسلی تو ہوتی ہے ؛ مگر پھر کسی بات، کسی ادا اور کسی صدا کا ذہن و دماغ میں آنا بے کیفی کا باعث ہو جاتا ہے۔ لیکن ؎

مراد دل از کہ پرسم کہ نیست دل دارے
کہ جلوۂ نظر و شیوۂ کرم دارد

اب میں اس دل کی مراد کس سے حاصل کروں کہ اب کوئی ایسا تسلی دینے والا نہیں کہ جس میں نگاہ کی رونق اور شرافت کا کرشمہ موجود ہو۔

دیوبند جیسی علمی جگہ میں آپ کی آمد سے رحلت تک آپ کا مرعوب کن امتیاز مسلم رہا ؛ بلکہ طالب علمی کے زمانے میں بھی فوقیت و آفاقیت میں ممتاز تھے، علمی انہماک اتنا کہ کئی کئی ماہ تک اساتذہ، کمرہ اور درسگاہ کے علاوہ کہیں جانا نہ ہوتا کہ افتاء کے سال ایک طرف اپنے اسباق ، پھر حفظ قرآن کریم ، اساتذہ کی خدمت اور بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں ہمہ تن مصروف رہتے ، جب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے شیخ نے پوچھا: پیارے کیا کرتے ہو؟ جب اپنی مصروفیات بتائیں تو ارشاد فرمایا: ٹھیک ہے، اس میں لگے رہو کہ بڑا مبارک مشغلہ ہے، یہی کافی ہے، وفات تک روزانہ اسی طرح علم میں لگے رہے۔ دارالعلوم جیسی درسگاہ میں کوئی طالب علم سالانہ امتحان میں بھی اتنی محنت نہیں کرتا، صبح بیٹھتے تو ساڑھے بارہ بجے تک لگے رہتے سر بھی نہیں اٹھاتے ، پھر مغرب بعد سے رات بارہ بجے تک یہی اشتغال رہتا۔ ؎

دید کی پیاسی نگاہیں تجھ کو پائیں گی کہاں؟

مرحوم میں اخفائے حال بہت تھا، اپنی نیکی کسی کو نہ بتاتے تھے، ایک دن حکم ہوا: تراجم کی کتابوں میں دیکھ کہ حضرت حسن بصری (۲۱ھ تا ۱۱۰ھ) اور رابعہ بصریہ (۱۰۰ھ تا ۱۸۰ھ) کا زمانہ ایک تھا یا الگ الگ؟ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت حسن بصری کی وفات کے وقت حضرت رابعہ بصریہ دس سال کی تھیں، پھر الاعلام للزرکلی میں حضرت رابعہ بصریہ کا ایک قول ملا:

''اکتموا حسناتکم کما تکتمون سیئاتکم''

(ترجمہ: تم اپنی نیکیوں کو (دوسروں سے) اسی طرح چھپاؤ جس طرح (دوسروں سے) اپنی برائیوں کو چھپاتے ہو!)

اس قول کو کئی بار پڑھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا پھر فرمایا: الحمد للہ! میری حالت اور عادت ایسی ہی ہے۔ بڑے بڑے اسٹیجوں پر بڑے اصرار کے بعد ہی جاتے، میں نے بڑے بڑے عالمی قابلِ فخر سیمیناروں سے معذرت کرتے دیکھا ہے، اس کی ایک ظاہری معقول وجہ تصویر کشی بھی بتا دیتے تھے، آپ کا اسوۂ حسنہ ہم سب کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

ہزاروں رحمتیں ہوں اے میرِ کارواں تجھ پر
فنا کے بعد بھی باقی ہے شانِ رہبری تیری

کئی بار میں نے گزارش کی کہ حضرت اپنی ''آپ بیتی'' لکھ دیجیے یا لکھوا دیجیے! اس پر توجہ نہ دی، جب بہت اصرار کیا تو فرمایا: میری زندگی کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، میں تو اپنے اندر کوئی خوبی پاتا ہی نہیں! اگر اس پر میں کچھ کہتا تو **لا حول ولا قوۃ الا باللہ** پڑھتے اور موضوع بدلنے کے لیے کبھی کہتے: چھوڑ دو اس کو ایک مسئلہ بتاؤ پھر کسی حدیث یا کسی آیت کے سلسلے میں سوال ڈالتے اور بالکل رخ پھیر دیتے، کبھی فرماتے: بھائی! کچھ لے آؤ کھانے کے لئے، بڑا امکھن لگا رہا ہے! اور کبھی ارشاد فرماتے: مجھے مرنے دو پھر تعریف کرنا! پھر جو چاہو بولنا، لکھنا، ابھی میرا نفس

خراب ہوجائے گا۔

گرت ہوا ست کہ باخضر ہمنشیں باشی
نہاں ز چشمِ سکندر چو آبِ حیواں باش

اگر تیری خواہش یہ ہے کہ خضر علیہ السلام کے ساتھ بیٹھو تو آب حیات کی طرح نگاہ سکندر سے پوشیدہ رہو

ایک بار عرض کیا کہ میں نے ''حیات سعید'' کے عنوان سے ایک فائل بنا رکھی ہے، اس میں یادداشت جمع کررہا ہوں، تو اس کے بعد مجھ سے اپنی زندگی کی بہت سی باتیں صاف صاف بتانے لگے، ان شاء اللہ جب توفیق ہوگی مرتب ہوجائے گی۔ **وباللہ التوفیق**

ابھی سردست عزیز القدر مولانا مفتی انس احمد قاسمی زید لطفہ اوران کے رفقائے کار نے ہمت کی ہے، اہلِ علم واصحابِ فضل اور حضرت کے شاگردوں سے ان کے تاثرات لکھوائے ہیں اور اپنی بساط بھر اچھی طرح مرتب کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ چونکہ یہ سب خاکے ہیں اس لیے کہ اس میں زندگی کے سارے زاویے اگرچہ نہیں آسکے ہیں؛ مگر بہت سے پوشیدہ زاویے ضرور وا ہوں گے اور قارئین کو شخصیت کے سلسلے میں واقفیت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ محنت کو قبول فرمائے اور سارے نگارش نگار اور ترتیب وتہذیب میں حصہ لینے کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز**

اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند
رات دس بجے: ۲۰؍صفرالمظفر ۱۴۴۲ھ/ ۸؍اکتوبر ۲۰۲۰ء

عرضِ مرتب

الحمدللہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدالانبیاء والمرسلین ومن تبعھم بأحسان الی یوم الدین امابعد!

بڑی مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

ہر لمحہ موت وفناء کا نقارہ بج رہا ہے، کوئی ذی روح ایسا نہیں ہے جو اس نقارہ کی دھمک سے محفوظ رہ سکے اور نہ کسی کو امتیاز واختصاص حاصل ہے، ہر فناء پذیر ''کل من علیھا فان'' کی تصویر پیش کررہا ہے، ان فناء پذیر لوگوں میں بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی رحلت بہت سے دلوں کو سوگوار اور بہت سے قلوب کو رنجیدہ کردیتی ہے، اور جن کے خلا کو برسوں محسوس کیا جاتا ہے، ان ہی ہستیوں میں سے ایک عظیم ہستی: مفکرِ اسلام، مفسر قرآن، محدث کبیر، محقق دوراں، فکر نانوتوی اور رموز ولی اللہی کے شارح وامین، فقیہ العصر، امام المنطق والفلسفہ، نمونہ سلف، ترجمانِ علمائے دیوبند، ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین، استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ ہیں، جو ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت چاشت اپنے پیچھے ہزارہا علماء، صلحاء اور طلباء کو روتے بلکتے چھوڑ کر دارالفناء سے دارالبقاء کی طرف روانہ ہوگئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعون ،اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وِلِلّٰهِ مَا اَعْطٰى، وَكُلٌّ عِنْدَهُ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بہت مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
وما کان قیس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

”قیس کا مرجانا؛ صرف ایک شخص کی موت نہیں ہے، وہ تو پوری قوم کی بنیاد تھی جو منہدم ہوگئ“

بلا شبہ حضرت الاستاذؒ کا رخصت ہو جانا، صرف ایک شخص کا دنیا سے چلا جانا نہیں ہے؛ بلکہ ایک عہد اور دور کا خاتمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ امت کو بالخصوص دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

ماہنامہ السعید:

اس المناک خبر کو سن کر آنکھیں نم ہوگئیں اور دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی اور پاؤں تلے زمین نکلنے لگی۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

جب یہ خبر پورے ملک و بیرون ملک میں بجلی بن کر برس پڑی، اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک و بیرون ملک افسوس وغم میں ڈوب پڑا اور ہر طرف سے تعزیت ناموں کا سلسلہ شروع ہوا، طلبہ اور متعلقین نے ایصال ثواب کیا، انہیں ایام میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق مختلف عناوین پر خطباء کے لئے مضامین اکٹھا کر رہا تھا، تو دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ ایک مستقل برقی مجلہ حضرتؒ کی یاد میں آپ ہی کی طرف انتساب کرتے ہوئے شروع کیا جائے، تو احباب سے مشاورت کے بعد حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب، استاذ تفسیر وفقہ دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں ”ماہنامہ السعید“ کے نام شروع کیا گیا۔ جس میں مستند علمی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین سمیت حضرت الاستاذؒ کی طرف منسوب آپ کے علوم ومعارف پر مشتمل مضامین بھی شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔

تذکرۂ سعید:

پھر احباب نے طے کیا کہ ’’ماہنامہ السعید‘‘ کا آغاز حضرت الاستاذؒ پر ’’خصوصی شمارہ‘‘ کے ذریعہ کیا جائے؛ اس لئے متعدد اہل علم حضرات کے تعزیتی اور تاثراتی مضامین جمع کر کے جون/۲۰۲۰ء کا خصوصی نمبر نکالا گیا، جس کو اہل علم نے بہت پسند کیا اور خوب پذیرائی ہوئی، فللہ الحمد و المنۃ۔

تذکرۂ سعید کا نیا ایڈیشن:

اس کے بعد مزید اہل علم واصحاب فضل اور حضرتؒ کے شاگردوں سے رابطہ کر کے ان سے مضامین کی درخواست کی گئی، الحمد للہ بہت سے اہل علم نے مضامین ارسال کئے، پھر ان تمام مضامین کو نئی ترتیب کے ساتھ مستقل کتابی شکل میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔(فی الحال کچھ نا مساعد حالات کی وجہ سے پی ڈی ایف کی شکل میں شائع کی جارہی ہے۔) چنانچہ اب یہ تمام مضامین اس کتاب ’’تذکرۂ سعید‘‘ میں جمع کر دئے گئے ہیں، جس پر حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب کا وقیع مقدمہ بھی ہے۔

باب اول: حضرت الاستاذؒ کی وفاتِ حسرت پر اکابرین کی طرف سے جو تعزیتی خطوط موصول ہوئے تھے اور اسی طرح بعض اکابر نے بذریعہ آڈیو اظہارِ تعزیت فرمایا تھا، انہیں اس باب میں جمع کیا گیا ہے۔

باب دوم: حالاتِ زندگی: ولادت سے وفات تک مختصر سوانح

باب سوم: امتیازات وخصوصیات: اوصاف وکمالات، تدریسی خصوصیات

باب چہارم: علمی خدمات: تدریسی خدمات، تصنیفات وتالیفات کا تعارف وغیرہ

باب پنجم: نقوش وتاثرات: اکابرین، معاصرین اور حضرتؒ کے شاگردوں کے تاثرات نیز حضرتؒ سے وابستہ کچھ یادوں اور باتوں پر مشتمل مضامین۔

باب ششم: ارشادات وملفوظات: علمی، تحقیقی اور اصلاحی ملفوظات کا مجموعہ

باب ہفتم: نذرانۂ عقیدت: مرثیے، نظمیں، دعائیہ کلام اور قطعاتِ تاریخ

اس مجموعہ میں بعض باتیں مکرر نظر آئیں گی؛ وجہ اس کی یہ کہ عام طور پر شخصیات پر لکھے جانے والے مضامین میں کسی نہ کسی حد تک تکرار ضرور ہوتا ہے، بریں بنا یہ مجموعۂ مضامین بھی تکرار سے خالی نہیں ہے، لیکن چونکہ ہر مضمون نگار نے اپنے اپنے انداز سے حضرت الاستاذؒ کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے؛ اس لئے بہت سی جگہوں میں اس کو گوارہ کرلیا گیا ہے جو ان شاء اللہ قندِ مکرر ثابت ہوگا۔

ہدیۂ تشکر

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس وقت میں معاونین کا شکریہ ادا نہ کروں بالخصوص ''حضرت مولانا مفتی اشتیاق احمد صاحب دامت برکاتہم العالیہ استاذِ تفسیر وفقہ دار العلوم دیوبند'' کا کہ جن کی خاص توجہ اور سرپرستی کی برکت سے یہ کتاب منظر عام آرہی ہے۔

اسی طرح ان تمام اصحاب علم وفضل اور مضمون نگار حضرات کا بھی شکرگزار ہوں، جنھوں نے مضامین بھیج کر ہمارا بھرپور تعاون کیا خصوصاً مولانا محمد اکرم الحق صاحب مدظلہ کا جنھوں نے بہت سے اہل علم سے رابطہ کرکے مضامین کی حصول یابی کو ممکن بنایا اور مضامین کی تصحیح اور نظرثانی میں عرق ریزی سے کام لیا اور اسی طرح مولانا مفتی صدیق احمد داری صاحب مدظلہ کا بھی ممنون ومشکور ہوں کہ مضامین کی تصحیح میں تعاون پیش کیا اور ہمیشہ ان دونوں حضرات نے قدم قدم پر تعاون کیا، بلاشبہ ان کا یہ تعاون اگر نہ ہوتا تو یہ کام تکمیل کو نہ پہنچتا۔ **فجزاھم اللہ خیراً و احسن الجزاء فی الدارین۔**

اللہ رب العزت تمام ہی معاونین کو بے حد جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی کاوشوں کو شرف قبولیت بخشے اور

دارین میں عافیت کے فیصلے فرمائے۔آمین۔

کمپیوٹر کتابت میں بالخصوص پروف ریڈنگ اور تصحیح کا مرحلہ بہت اہم ہوتا ہے،ان مضامین میں تصحیح کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے، پھر بھی غلطیاں رہ جانے کا امکان ہے؛اس لئے قارئین سے گذارش ہے کہ وہ دوران مطالعہ کوئی غلطی پائیں تو مطلع فرمائیں۔

رب کریم کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ الہ العالمین! حضرت الاستاذ کی قبر کو نور سے منور فرما،غریق رحمت فرما، درجات بلند فرما،حضرت کی خدمات جلیلہ کو قبول فرما، جملہ پسماندگان؛اعزا وأقارب،علماء،طلباء اور محبین ومعتقدین کو صبر جمیل اوراجرِ جزیل عطافرمااوردارالعلوم دیوبندکوحضرت کانعم البدل عطافرما،آمین ثم آمین۔

والسلام

انس احمد قاسمی غفرلہ

خادمِ تدریس مدرسہ جامع العلوم،آمبور،تمل ناڈو

۱۴رصفرالمظفر ۱۴۴۲ھ مطابق ۲راکتوبر ۲۰۲۰ء

باب اول:

تعزیتی پیغامات

تعزیت نامہ

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب
مہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند

مکرمی حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری ودیگر برادران گرامی، وجناب مولانا وحید احمد صاحب
ودیگر صاحبزادگانِ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری قدس سرہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری قدس اللہ سرہ کی وفات حسرت آیات کا جو حادثۂ عظمیٰ آج صبح پیش آیا، اس پر اپنی جانب سے نیز دارالعلوم کے تمام ارکانِ شوری، اساتذہ کرام اور کارکنان وخدام کی جانب سے آپ حضرات کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہوں، اللہ رب العزت آپ حضرات اور تمام متعلقین و محبین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقام بلند نصیب فرمائے۔آمین۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس موقع پر ہم سبھی مستحق تعزیت ہیں۔اسلئے کہ ہم سب کیلئے مشترک حادثہ ہے۔بلاشبہ حضرت مفتی صاحب دارالعلوم کی مسند تدریس کی آبرو اور جماعت دیوبند کے علمی سالار تھے، انہوں نے تقریبا نصف صدی تدریسی خدمات انجام دیں اور مقبولیت کا اعلی معیار حاصل کیا، ان کا شوق تدریس اور سبق میں انہماک حضرات اکابر کی یاد تازہ کرتا تھا۔اسی کے ساتھ اللہ رب العزت کی توفیق سے انہوں نے بلند پایہ تصنیفی وتالیفی خدمات بھی انجام دیں۔ رحمۃ اللہ الواسعہ، تحفۃ القاری، تحفۃ الالمعی اور ہدایت القرآن وغیرہ جیسی گراں قدر تالیفات ان کے نام کو زندہ جاوید رکھنے کیلئے کافی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ فنا فی العلم تھے اور انکی شخصیت سے علم کی

خوشبو مہکتی تھی، علم ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، وہ اپنی مسلسل محنت اور علمی اشتغال کے اعتبار سے اسلاف کی یادگار تھے، ایسی شخصیت کا اٹھ جانا نہ صرف آپ حضرات کیلئے بلکہ پوری جماعت دیوبند اور ملت اسلامیہ کیلئے عظیم سانحہ ہے۔

میں غم کی اس گھڑی میں آپ تمام حضرات سے تعزیت کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ حضرات اور تمام اہل تعلق کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

ابوالقاسم نعمانی

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء

تعزیت نامہ

حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری صاحب

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند

جمعیۃ علماء ہند کے صدر امیر الہند مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری اور ناظم عمومی مولانا محمود مدنی نے دارالعلوم دیوبند کے انتہائی موقر شیخ الحدیث وصدرالمدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج والم ظاہر کیا ہے، حضرت مولانا کے دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کے اڑتالیس سالہ دور میں ہزارہا تشنگان علوم سرچشمہ فیض سے بلا واسطہ فیضیاب ہوئے، جن کے قلمی فیوض اہل علم کیلئے نعمت لازوال ہیں۔آپ جیسے کریم النفس صاحب تقوی مشفق استاذ کا سایہ بہت بڑی سعادت اورانکی وفات بری محرومی اور عظیم نقصان ہے۔آپ کی ذات ستودہ صفات بہت سی علمی وعملی خوبیوں کا مظہر تھی۔ رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ ، افادات درس ترمذی، تحفۃ الالمعی ، افادات درس بخاری، تحفۃ القاری، زبدۃ الطحاوی، داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت، العون الکبیر وغیرہ ان کی بہترین تصنیفات ہیں، انکے علاوہ انہوں نے متعدد علمی وفقہی کتابیں لکھی ہیں۔

مولانا موصوف کل ہند مجلسِ تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کے ابتداء سے تاحیات ناظم عمومی رہے، انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں بوقت ضرورت فتاوی نویسی فرمائی اوراہم فتاوی کے جوابات کی نگرانی فرماتے۔آپ نے ہمیشہ جمعیۃ علماء ہند اوراکابر جمعیۃ سے خصوصی تعلق رکھا اور دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت میں درجہ علیا کے استاذ مقرر ہوئے تو وہاں جمعیۃ علماء کی سرگرمیوں سے باضابطہ وابستہ

ہوئے اور مسلسل نو سال تک جمعیۃ علماء راندیر کے ناظم بھی رہے۔ حضرت فدائے ملت مولانا اسعد مدنیؒ ان سے مشورہ فرماتے اور جب بھی مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند کے اجتماعات منعقد ہوتے انکو خصوصی طور سے مدعو فرماتے۔ حضرت مولانا سال گذشتہ بھی مباحث فقہیہ کے اجتماع میں شریک ہوئے، وہ فقہ حنفی کے برصغیر میں نامور عالموں میں تھے اور دلائل کی قوت سے مسلک احناف کو عصر حاضر کے مسائل کا بہترین حل کے طور پر پیش فرماتے۔

جمعیۃ علماء حضرت مولانا کے پسماندگان سے ددی ہمدردی ظاہر کرتی ہے اور دست بہ دعا ہے کہ اللہ تعالی اپ کو زمرہ صالحین میں مقام اعلی عطا فرمائے اور انبیاء وصدیقین کا رفیق بنائے۔ نیز اہل خاندان، اولاد و رفقاء، ہزارہا تلامذہ اور ہم متوسلین کو صبر واستقامت کے ساتھ اس غم کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جمعیۃ علماء ہند اپنے تمام جماعتی احباب، دینی مدارس کے ذمہ داروں سے مولانا مرحوم کیلئے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کے اہتمام کی اپیل کرتی ہے۔ ممبئی میں صبح حضرت مولانا موصوف کی انتقال کی خبر موصول ہوتے ہی جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری نے دیوبند میں ان کے گھر جا کر برادر خورد حضرت مفتی امین پالن پوری صاحب اور مفتی صاحب مرحوم کے صاحبزادگان و دیگر اہل خانہ سے تعزیت مسنونہ پیش کی۔

نئی دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں بعد نماز ظہر ایک تعزیتی نشست بھی منعقد ہوئی جس میں دعائے مغفرت کی گئی۔ اس میں جمعیۃ علماء ہند کے سکریٹری مولانا حکیم الدین قاسمی، مولانا کلیم الدین قاسمی، مولانا عرفان، مولانا نجیب اللہ قاسمی، مولانا ضیاء اللہ قاسمی، مولانا یاسین قاسمی، مولانا عظیم اللہ قاسمی سمیت دفتر میں موجود سبھی اسٹاف شریک ہوئے۔

۞...۞...۞

پیغام تعزیت

بروفات حسرت آیات حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب
مہتمم دار العلوم وقف دیو بند

آج صبح بعد نمازِ فجر متصلاً موبائل پر مکتوب پیغام موصول ہوا کہ استاذ مکرم جناب حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند حالیہ مختصر علالت کے بعد بمبئی کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بارگاہ رب جلیل میں دست بہ دعا ہوں حق تعالیٰ اپنے بیکراں فضل واحسان کے صدقے میں مرحوم ومغفور کو اعلیٰ علیین میں مقام کریم سے سرفراز فرماتے ہوئے جملہ اہل خانہ ومتعلقین کو صبر جمیل کی توفیق سے بہرہ ور فرمائیں۔

عقل انسانی کے وساوس وشکوک سے بھی وراء الوراء اس حقیقت کی صداقت میں کیا کلام ہوسکتا ہے کہ جو کوئی بھی اس دار فانی میں آتا ہے پہلی سانس کے ساتھ ہی اسکی زندگی کا اپنے منطقی انجام کی طرف سفر کا آغاز ہوجاتا اور وقت موعود آجانے پر انجام کار اس کو دار بقاء کی جانب رخت سفر باندھ کر رخصت ہونا ہوتا ہے، کیونکہ موت وحیات اس کارگاہ عالم کی ناقابل تبدیل خاصیات کے لازمی اجزاء کا سب سے اہم ترین حصہ ہے، کوئی بھی انسان ظاہری و معنوی مراتب کی ہی رفعتوں اور بلندیوں کو کیوں نہ عبور کرلے لیکن وقت موعود آجانے پر نہ کسی کیلئے کوئی راہ فرار ہے، نہ کوئی استثناء اور نہ کسی کیلئے کوئی رعایت، اگر مشیت رب میں استثناء کو امکان کا درجہ حاصل ہوتا تو الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر روئے زمین پر حق تعالیٰ کے سب سے مقدس ومحبوب ترین طبقۂ انبیاء اور اس میں بھی بالخاص

نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام اس مرتبہ استثناء کے احق قرار پاتے لیکن اس حوالے سے از روئے کلام اللہ قانون ازلی بیان فرمادیا گیا ہے ”کل من علیھا فان ویبقٰی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام“۔

بشمول ملک کے مختلف علمی دوائر واجتماعیات میں حضرت مفتی صاحبؒ کی رحلت پر دارالعلوم وقف دیوبند میں ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کا کیا گیا۔حق تعالیٰ جملہ تلامذہ ومحبین کی دعاوں کوشرف قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے حضرتؒ کوآسودہ رحمت فرمائیں۔آمین یارب العالمین

محمد سفیان قاسمی
مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند
۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

تعزیت نامہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرامی قدر مکرم حضرت مولانا ابو القاسم نعمانی صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند حَفِظَکُمُ اللّٰہُ تَعَالیٰ مِنْ کُلِّ سُوْءٍ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفاتِ حسرت آیات اس امت کا بڑا سانحہ ہے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

ان کی وفات کے موقع پر ان کے صاحبزادے سے ٹیلی فون پر حالات معلوم ہوئے، اور زبانی تعزیت بھی تمام اہل خانہ تک پہنچائی گئی، لیکن خیال آیا کہ اگر چہ ان جیسی شخصیت کی وفات پر ہم جیسا ہر طالب علم بلکہ ہر مسلمان مستحق تعزیت ہے، کون کس کی تعزیت کرے؟ لیکن شاید سب سے زیادہ قابلِ تعزیت دار العلوم دیوبند ہے جس کی مسندِ حدیث کی عظیم زینت حضرت مولانا قدس سرہٗ کی عظیم ذات تھی، نہ صرف درسِ حدیث کی حد تک، بلکہ دار العلوم کے مسلک ومشرب اور مزاج ومذاق کے تحفظ میں اُن کا وجود ایک بڑا سرمایہ تھا، اس سرمایہ سے محرومی ہماری اس امّ المدارس کا بڑا نقصان ہے، اس لیے یہ تعزیت نامہ دار العلوم کے نمائندے کی حیثیت سے آنجناب کی خدمت میں ارسال ہے، جس میں اولاً کلماتِ مسنونہ سے تبرک کرتا ہوں۔ إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهٗ مَا أَعْطٰى وَكُلٌّ

عِندَهٗ بِأَجَلٍ مُسَمّٰی، اَللّٰهُمَّ أَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهٗ وَأَسْكِنْهُ جَنَّاتِ النَّعِيمِ۔

ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دارالعلوم کو اس نقصان کے اثرات سے محفوظ رکھ کر اپنی خاص دستگیری سے نوازیں، اور آپ حضرات پر جو ذمہ داری آئی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین!

والسلام

محمد تقی عثمانی

جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۵/۱۰/۱۴۴۱ھ

❁...❁...❁

تعزیتی پیغام

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب
استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علمائے ہند

یہ خبر انتہائی رنج وغم کے ساتھ سنی جائے گی کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدرالمدرسین حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ، آج صبح بمبئی میں انتقال فرماگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ دارالعلوم دیوبند کے ابنائے قدیم میں سے تھے، مولانا بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے اپنی ذہانت وذکاوت کی وجہ سے مختلف علوم وفنون اور خاص طور پر فقہ اور حدیث میں ممتاز جانے جاتے تھے، فراغت کے بعد مختلف مدرسوں میں علم حدیث کی خدمت کرتے رہے اور پھر تقریباً ۴۷ سال پہلے دارالعلوم دیوبند نے مادر علمی کی خدمت کے لئے دارالعلوم میں بلالیا، اسی وقت سے ان کا علم حدیث سے خاص شغف رہا ہے، اس وقت موصوف دارالعلوم کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے، اس زمانہ میں ان کا درس حدیث مختلف علوم وفنون پر دسترس کی بنیاد پر بہت ہی ممتاز سمجھا جاتا تھا، اگر یہ کہا جائے کہ داراالعلوم کے مسند حدیث کے امتیاز کو انہوں نے قائم کرر کھا تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا، اس کے علاوہ مولانا مرحوم کی متعدد تصانیف ہیں جس سے لوگ مستقبل میں استفادہ کرتے رہیں گے۔

مولانا مرحوم دارالعلوم کے شعبہ ختم نبوت کے ناظم بھی تھے، ہمیں افسوس ہے کہ مولانا ہم سے جدا ہوگئے، وہ زمانہ سے شوگر کے مریض تھے اور اس وقت ان کے عوارض یکے بعد دیگرے بڑھتے گئے یہاں تک کہ انہوں ہم کو

داغ مفارقت دیدیا، ہماری بارگاہ خداوندی میں دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور دارالعلوم کو اس کانعم البدل عطافرمائے اور مولانا مرحوم کی علمی وصلبی اولاد کی نگہبانی فرمائے۔

ہم سب خدامِ جمعیۃ ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں، میری جماعتی احباب، اہل مدارس، علماء کرام، طلباء عزیز، ابنائے دارالعلوم اور مسلمانوں سے حضرت مرحوم کی مغفرت وترقی درجات کے لئے اور پسماندگان، اعزا واقارب کے لئے بارگاہ خداوندی میں صبر جمیل کی دعاء کی اپیل ہے۔

❁…❁…❁

تعزیت نامہ

بروفات حسرت آیات حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب
مدیر دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بخدمت گرامی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ، دار العلوم دیو بند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج شریف!

ابھی ابھی حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ کی اچانک وفات کی خبر معلوم ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بہت بلند فرمائے۔ المتوفیٰ علم ودین کی بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور دار العلوم کو ان کا بدل عطا فرمائیں۔

آپ اور سبھی حضرات اساتذہ اور طلبہ کی خدمت میں تعزیت پیش ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ وہ ان کو شایانِ شان جزاء عطا فرمائیں اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل اور ودعا سے نوازیں۔ والسلام

مخلص

سعید الرحمن اعظمی

مدیر دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

❁...❁...❁

مکتوب تعزیت

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ؛ ایک نابغۂ روزگار شخصیت

حضرت مولانا سید محمد شاہد صاحب سہارنپوری
امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

مکرمان ومحترمان بندہ مولانا مفتی محمد امین صاحب زید مجدہ و جملہ صاحبزادگان حضرت مفتی صاحب مرحوم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دنیا بھر کے علمی ودینی حلقوں اور علماء ومشائخ کی مجلسوں میں یہ روح فرسا خبر بڑے رنج وغم کے ساتھ سنی گئی کہ دور حاضر کے جید عالم دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، محدث عصر حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری طویل علالت کے بعد وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور تحریر وتقریر کی محفلوں میں مولانا کو جو عظیم مقام اور بلند اعتماد حاصل تھا اس سے عوام اور خواص سب ہی واقف ہیں، اوراب یہ تمام محفلیں یقیناً بیک وقت سونی ہوگئی ہیں۔

حضرت مفتی صاحب ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے مختلف مدارس میں حاصل کرنے کے بعد مشہور ومعروف علمی درسگاہ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں مزید تعلیم کے حصول کے لیے تشریف لائے، چنانچہ یہاں پہلے سال شوال ۱۳۷۷ھ اپریل ۱۹۵۸ء میں آپ نے یہ چھ کتابیں پڑھیں: قطبی، بحث اسم، شرح تہذیب، کنز الدقائق، اصول الشاشی، تلخیص المفتاح۔ پھر شوال ۱۳۷۸ھ میں دوبارہ داخلہ لے کر مختصر المعانی، میر قطبی، شرح وقایہ، نورالانوار، سلم العلوم، رشید یہ پڑھ کر شوال ۱۳۷۹ھ میں تیسری مرتبہ جامعہ مظاہر علوم میں داخلہ لے کر ملاحسن، شرح عقائد،

مقامات، میبذی، امور عامہ، ملا جلال، میر زاہد، سبعہ معلقہ سات (۷) کتابیں پڑھ کر امتحان سالانہ میں اول نمبرات سے کامیاب ہوئے۔

جامعہ مظاہر علوم کے زمانہ تعلیم میں اگر چہ آپ کا تعلق اپنے تمام ہی اساتذہ سے نیاز مندانہ رہا لیکن بطور خاص قرب وانسیت حضرت مولانا مفتی سید یحییٰ سہارنپوریؒ سے رہی، چنانچہ آپ اپنا زیادہ تر وقت ان ہی کی خدمت میں گزارتے تھے۔

جامعہ مظاہر علوم میں تین سالہ تعلیم کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور وہاں داخلہ لے کر جلالین شریف، ہدایہ اولین اور تصریح وغیرہ سے اپنی تعلیم شروع کرتے ہوئے دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی اور وہیں پر افتاء کی تعلیم بھی مکمل کی۔

مظاہر علوم میں حصول تعلیم کے زمانہ ہی سے آپ کا نیاز مندانہ اور عقیدتمندانہ تعلق حضرت شیخ مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی سے قائم ہوگیا تھا، چنانچہ آپ کثرت کے ساتھ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اسی نسبت سے گاہ بگاہ ماہِ رمضان میں بھی کبھی اعتکاف اور کبھی ملاقات کی نیت سے حاضر خدمت ہوتے رہتے تھے چنانچہ رمضان ۱۳۹۷ھ/ستمبر ۱۹۷۷ء کا آخری عشرہ معتکفِ شیخ میں گزارنے کا ذکر تو حضرتؒ نے اپنے روزنامچہ (۴) میں بھی کر رکھا ہے۔

حضرت شیخ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم ہونے پر چند سال معمولات اور اوراد و وظائف کی پابندی اور اس کے اہتمام کے بعد آپ نے حضرت شیخ سے باقاعدہ طور پر ذکر جہری کی اجازت لی اور ۲۴/رمضان ۱۳۹۲ھ/نومبر ۱۹۷۲ء سے آپ نے اس کو پابندی کے ساتھ کرنا شروع کیا اور اس راہ میں پیش آنے والے احوال و واردات کی باقاعدہ طور پر اطلاع اپنے شیخ و مرشد کو دے کر ہدایات ورہنمائی حاصل کرتے رہے۔

یہاں آپ کا ایسا ہی ابتدائی دور کا ایک یادگار خط پیش کیا جاتا ہے جو آپ نے آج سے اڑتالیس سال قبل ۲۸

رشوال ۱۳۹۲ھ، ۵ر دسمبر ۱۹۷۲ء میں اس وقت لکھا تھا جب آپ دیوبند سے تکمیل علوم کے بعد دارالعلوم اشرفیہ راندیر، گجرات کے استاذ بن کر درس وتدریس کے میدان میں اتر چکے تھے۔

اس خط کے مطالعہ سے واضح طور پر دو چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں، اول یہ کہ جتنے علمائے راسخین کو اللہ تعالی نے علوم شریعت سے نوازا اور پھران کے فیوض سے خلق خدا کی ایک کثیر تعداد دنیا بھر میں مستفیض ہوئی انہوں نے اولاً کسی شیخ وقت اور مربی روحانی کے دامن سے وابستہ ہوکر اپنی اصلاح وتربیت کی ضرورت محسوس کی اورسلوک واحسان کی لائن سے ذکر وفکر کے ساتھ مربوط رہتے ہوئے عالمی دنیا میں اپنے قدم بڑھائے، گویا انہوں نے علوم شریعت کو کافی نہ سمجھتے ہوئے علوم طریقت اور اصلاح باطن کا بھی اپنے آپ کو محتاج سمجھا اور اپنے اندر ملکوتی صفات اور اخلاق عالیہ پیدا کرنے کی سخت ضرورت محسوس کی۔

دوسرے یہ کہ جتنے علمائے کاملین ایسے ہیں کہ ان کے فضل وکمال کا دنیا نے لوہا تسلیم کیا اور ان کے علم وعمل کی تابانی سے دنیا کو روشنی اور تازگی ملی اور وہ اپنی بہترین ذہنی وفکری تربیت کے ساتھ دین وشریعت اور عقائد حقہ پر پوری زندگی استقامت کے ساتھ جمے رہے، یہ تمام کے تمام علماء وہ ہیں جنہوں نے اپنے ابتدائی دور میں اپنے آپ کو اپنے تمام تر فضل وکمال اور علم و ذہانت کی بے پناہ وسعتوں کے باوجود اپنے دور کے کسی نہ کسی شیخ وقت اور عارف ربانی کے قدموں میں اپنے آپ کو ڈال کر بلکہ پوری طرح اپنے آپ کو ان کے سپرد کرتے ہوئے روحانی تربیت حاصل کر کے صفات کمالیہ اپنے اندر پیدا کیں، تو پھر اس کے نتیجہ میں وقت آنے پر دنیا نے ان کو اپنے سروں پر بٹھایا اور عظمتوں کے تاج ان کے سر پر رکھے گئے۔

یہی مطلب ہے حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کے اس ارشاد کا کہ: جس نے چھوٹا بن کر اپنی اصلاح نہیں کی وہ بڑا بن کر مخلوق کی اصلاح نہیں کرسکتا۔ آج بھی ہمارے اس دور کی حقیقت اور سچائی (خواہ اس کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے) یہ ہی ہے کہ بڑا بننے کے لیے پہلے چھوٹا بننا پڑتا ہے، اونفس امارہ کسی اللہ والے

روشن صفات کی جوتیاں سیدھی کرنے ہی سے چھوٹا بن سکتا ہے۔

تمنا درِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

حضرت مولانا پالن پوری کا ذیل میں پڑھا جانے والا مکتوب بھی اسی حقیقت اور سچائی کی تصدیق وتائید کرتا ہے: آج جب کہ خط کے کاتب اور مکتوب الیہ دونوں اللہ تعالی کے حضور میں حاضر ہو چکے ہیں، یہ خط بطور خاص ان لوگوں کے لیے پیش کیا جارہا ہے جو اہل علم وعلماء کے انتہائی دور کے شاہانہ طور وطریق، رئیسانہ انداز اور اُجلے لباس پر تو حسد کرتے ہیں لیکن ان کے ابتدائی دور کے مجاہدات، نفس کشی اور ذکر وفکر کی راہ سے قلب ودماغ کی پاکیزگی پر شک نہیں کرتے۔

اس ضروری تمہید کے بعد حضرت مفتی صاحب مرحوم کا مکتوب بنام شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی کو دل ودماغ کی پوری بصیرت علم وعرفان کی پوری آگئی اور ذہن وفکر کی پوری وسعت کے ساتھ ملاحظہ کیا جائے۔

باسمہ سبحانہ وتعالی

سیدی وسندی نفعنا اللہ بصحبتکم المبارکۃ وأفاض علینا من برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خادم حقیر نے رمضان شریف کی چوبیسویں سے ذکر جہری شروع کیا ہے، سہارنپور سے واپسی پر دو ایک روز سفر کی وجہ سے ناغہ ہوا، اس کے علاوہ اللہ پاک کے فضل وکرم سے پابندی کے ساتھ جاری ہے، اور کوئی خاص حالت پیش نہیں آئی، بجز اس کے کہ آپ کے حضور میں جو ذکر کرتا تھا اس وقت بہت زیادہ سکون محسوس ہوتا تھا، بار بار گریہ بھی طاری ہوجاتا تھا، جس کی بعض مرتبہ اتنی شدت ہوتی تھی کہ ذکر بند کرنا پڑتا تھا، آپ کے فیض صحبت سے

محرومی کے بعد سے گریہ سے بھی محرومی ہوگئی ہے کبھی کبھار اتفاقاً معمولی دل بھر آتا ہے اوراس طرح ملکہ سبا کے مقولہ اسلمت مع سلیمن للہ رب العلمین'' کا مطلب خوب سمجھ میں آ گیا کہ معیت سے کیا کیا برکات حاصل ہوتی ہیں۔

چندروزتو ذکر میں کوئی خاص لطف بھی نہ رہا تھا لیکن بعد چندے اللہ پاک نے دوبارہ ذکر میں لطف عنایت فرما دیا ہے، اب بفضل اللہ خوب جی لگتا ہے۔

چند باتیں حکم طلب ہیں ارشاد عالی سے مطلع فرمائیں:

(۱) نیازمند حضرت والا کی بیشتر تصانیف کا مطالعہ کر چکا ہے بعض کا مکرر، سہ کرر بھی کیا ہے لیکن اب یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ صرف علمی حیثیت سے تھا جو کافی نہیں ہے، اب دوبارہ فیض صحبت حاصل کرنے کی غرض سے مطالعہ شروع کروں چنانچہ خصائل نبوی کا مطالعہ شروع کیا ہے کیونکہ شمائل نبوی للامام الترمذی زیر درس ہے نیز کوکب الدری بھی شروع کی ہے کہ جامع ترمذی زیر درس ہے، مکتوبات تصوف دومرتبہ مطالعہ کر چکا ہوں، لہذا اب اردو کی کوئی کتاب شروع کروں۔

(۲) علمی کام کا بوجھ بہت زیادہ ہے رات دیر تک مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے جس کی وجہ سے تہجد کے لیے ہمیشہ وقت پر اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے، دیر سویر ہو جاتی ہے بلکہ بعض مرتبہ تو فوت بھی ہو جاتی ہے۔ پھر ان کو تلافی مافات کا وقت بھی نہیں ملتا اور دن بھر بہت قلق واضطراب رہتا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ سونے سے پہلے تہجد کی نیت سے نماز پڑھ لوں؟ اور کتنی رکعات پڑھوں؟

[مکتوبات تصوف حضرت شیخ کے اس مجموعہ مکاتیب کا نام ہے، جو راقم سطور نے ۱۳۹۲ / ۱۹۷۲ء میں مرتب کر کے پہلی مرتبہ شائع کیا تھا۔ اس خط سے کم از کم اتنا تو معلوم ہو گیا کہ طرفین کا ایک دوسرے سے شناسائی کا تعلق نصف صدی قبل ۱۳۹۲ / ۱۹۷۲ء میں قائم ہو چکا تھا۔]

مغرب بعد کے نوافل بفضل اللہ خوب پابندی سے ادا ہو رہے ہیں، جن میں نصف پارہ پڑھتا ہوں۔ حضرت والا! خادم نے قرآن پاک دورہ سے فارغ ہونے کے بعد حفظ کیا ہے، اور وہ بھی قلیل مدت میں۔ دارالافتاء دیوبند

کی طالب علمی کے ساتھ ساتھ اس لیے قرآن پاک اچھی طرح جما نہیں ہے، روزانہ آدھا پارہ چند بار کہہ کر یاد کر لیتا ہوں تمام نمازوں میں اسی کو گردانتا رہتا ہوں لیکن اس معمول میں بھی علمی مشاغل حائل بنتے رہتے ہیں، کوشش کرتا ہوں کہ ایک وقت قرآن پاک یاد کرنے کے لیے متعین کر دوں، اور اس وقت میں اور کوئی کام نہ کروں، حضرت والا سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ پاک توفیق ارزانی فرمائیں۔

(۳) نفی اثبات والے ذکر میں بوقت نفی سبابہ سے اشارہ کیا جائے یا نہیں جیسا کہ تشہد میں کیا جاتا ہے۔

زیادہ حد ادب۔

کمترین خدام
سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
مدرس دار العلوم اشرفیہ راندیر (ضلع سورت)
۲۸؍شوال ۹۲ ۱۳ھ

ملحوظہ: یہ مکتوب حضرت شیخ کو سہارنپور میں ۳۰؍شوال ۹۲ ۱۳ھ، ۷؍دسمبر ۱۹۷۲ء پنجشنبہ میں موصول ہوا اور اسی دن حضرت نے اس کا جواب تحریر فرما کر مفتی صاحب مرحوم کو بھیج دیا۔

حضرت شیخ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ اس طرح کے اہم اصلاحی اور سلوکی خطوط راقم سطور (محمد شاہد) کو مرحمت کر دیا کرتے تھے۔ جس زمانہ میں یہ خط موصول ہوا اس وقت مولانا محمد علی مینار سورت گجرات حضرتؒ کو خطوط سنانے اور جوابات لکھنے پر مامور تھے، چنانچہ ان کے قلم سے منجانب شیخ یہ جملہ اس مکتوب پر تحریر ہے۔

موصولہ واجیب عنہ ۳۰؍شوال ۹۲ ۱۳ھ، بملاحظہ مولوی شاہد صاحب'' اور آج نصف صدی گزرنے کے بعد یقیناً خط ایک یادگار تاریخی حیثیت حاصل کر گیا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مرحمت فرمودہ محفوظ ذخیرہ نوادرات میں مفتی صاحب مرحوم کا ایک طویل مضمون '' فکر اسلامی کی تشکیل جدید ضرورت اور لائحۂ عمل'' کے عنوان سے اس احقر کے پاس موجود ہے۔

یہ مضمون کسی زمانہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب مرحوم اپنی قلمی نگارشات اور تحقیقات حضرت شیخ کی خدمت میں دعاؤں اور توجہات کے حصول کی نیت سے بھی بھیجا کرتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم کو راقم سطور کے ساتھ بھی تعلق خاطر تھا، سلام وکلام کے تبادلے اکثر ہوتے رہتے تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ چونکہ لکھنے پڑھنے کے ذوق سے آشنا اور مالا مال تھے اور یہ راقم سطور بھی شروع ہی سے صفحات سیاہ کرنے کا عادی ہے اس لیے طرفین سے اپنی اپنی تصنیفات وتالیفات کا بھی تبادلہ ہوتا رہتا تھا چنانچہ جب انہوں نے حجۃ اللہ البالغۃ کی وقیع شرح تالیف کی تو راقم سطور کو بھی اس کا ایک نسخہ بطور ہدیہ ارسال کیا۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد طلحہ کے وصال پر جب وہ آخری مرتبہ بطور تعزیت سہارنپور تشریف لائے تو راقم سطور کے لیے اپنی جدید تفسیری کاوش آسان بیان القرآن کے نام سے لانا نہیں بھولے۔

اللہ تعالی ان کی تمام علمی، دینی و درسی خدمات کو قبولیت اور مقبولیت مرحمت فرما کر بہترین صلہ ان کو عطا فرمائے، اور جنت الفردوس ان کا ٹھکانہ بنائے، اوران کے تمام اخلاف کو صبر جمیل، اجر جزیل عطا فرما کر ان کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین۔

سید محمد شاہد غفرلہ

امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

شب ۲۷ ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

تعزیت نامہ

حضرت مولانا محمد سعیدی صاحب
ناظم ومتولی مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

مکرمان ومحترمان پسران حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

آج ۲۵ ؍رمضان المبارک کو علی الصباح یہ جانکاہ ودل گداز خبر صاعقہ اثر ملی کہ اسلام کے عظیم فقیہ ومحدث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے مختصر علالت کے بعد ممبئی کے اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب موصوف دور حاضر کے مثالی محدث، بیباک خطیب، ادیب اریب اور فقیہ لبیب تھے وہ اخیر عمر میں مسلک علمائے دیوبند کے عظیم ترجمان اور شان تھے ان کے وجود سے طبقۂ علماء کو سکون اور قرار تھا، ان کی گفتگو عالمانہ، ان کی تحریریں محققانہ، ان کا طرز تحریر ادیبانہ اور ان کا اشہب قلم سچ اور حق کا پاسبان وچوبدار تھا، انہوں نے تقریباً نصف صدی تک علم فقہ اور حدیث کی شان کے ساتھ خدمت انجام دے کر نئی نسل کی تعمیر وتشکیل میں کلیدی کردار ادا فرمایا ہے۔

مفتی صاحب جس بات کو سچ اور حق سمجھتے تھے اس کے لکھنے اور بیان کرنے میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، وہ اپنی ٹھوس استعدادِ علمی اور کمالات فقہی کے باعث دیوبندیت کی ڈھال تھے، انہوں نے

مظاہرعلوم (وقف) سہارنپور میں چندسال پہلے اجلاس ختم بخاری کے موقع پر ڈیڑھ گھنٹہ تک مظاہرعلوم کے اپنے دور طالب علمی، یہاں کے اپنے اساتذہ اور اس وقت کے حالات اور ماحول پر دلچسپ تقریر فرمائی تھی، مفتی صاحبؒ کومظاہر واکابر مظاہر سے بے انتہا محبت رہی، چنانچہ انہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ سے اپنے اصلاحی تعلق کی شروعات کی تھی بعد میں فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفرحسین سے خلعت خلافت حاصل ہوئی، چنانچہ یہ خلافت نامہ مفتی محمد امین پالن پوری نے مفتی صاحب کی شرح حجۃ اللہ البالغہ کے ابتدائیہ میں شامل کر کے جاوید بنا دیا ہے۔

اس آنی جانی اور فانی دنیا میں قرار کسی کونہیں ہے سب کی تقدیر میں یہاں سے فرار مقدر ہے، موت سے سبھی کو ہمکنار ہونا ہے، کل نفس ذائقة الموت ایک سچائی ہے جس سے مجال انکار کسی کونہیں ہے، اب جب کہ مفتی صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے تو اس موقع پر ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم تعلیمات شریعت، سیرت نبوی اور احکامات قرآنی کی روشنی میں اپنی زندگیاں گزار کر ان کی روح کو شاد اور ان کے مشن کو صاد کریں، زیادہ سے زیادہ دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کریں، رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر میں ان کا اس دنیا سے پردہ فرمانا اِن شاء اللہ اللہ کی رضا، قرب اور عنایات سے لطف اندوز ہونے کا باعث ہوگا۔

اس المناک حادثہ، جانکاہ صدمہ اور صاعقہ اثر خبر کلفت اثر پر ہم اپنے آپ کو مستحق تعزیت سمجھتے ہیں۔ **ان للہ ماأخذ و له ماأعطی و کل شئی عندہ بأجل مسمی فلتصبر و لتحتسب۔** یا اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں مقام رفیع عطا فرما اور ان کے مشن کے احیا و سربلندی کے لئے غیب سے سامان پیدا فرما۔

والسلام

محمد سعیدی

ناظم و متولی مظاہرعلوم (وقف) سہارنپور

۲۵ ررمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

تعزیت نامہ

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب

امیر شریعت تملناڈو

برادرانِ محترم وفرزندانِ ذی وقار حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محدث کبیر فقیہ العصر حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات یقیناامت کیلئے ایک عظیم علمی خسارہ ہے۔آپ ایک عظیم محدث، مفسر قرآن، شارح حدیث، علم کے سمندر، سادگی کے پیکر تھے۔ حضرتؒ کے فراق سے ہم مغموم وسوگوار ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔آپ کی قبر کو نور سے بھر دے اور جنت کا باغ بنادے۔ہم سب کی جانب سے اللہ تعالی اپنی شایان شان اجر جزیل نصیب فرمائے۔امت میں پیدا ہوئے خلا کو پُر فرمائے۔آپ کا ہمیں خصوصاً دارالعلوم دیوبند کیلئے نعم البدل نصیب فرمائے۔آپ کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔اس حادثہ فاجعہ کی خبر سن کر ہم نے ایصال ثواب کیا اور سلسلہ جاری ہے۔

ہم خدام امارت شرعیہ تملناڈو آپ حضرات کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ حضرت کے جملہ خدمات جلیلہ کو قبول فرما کر صدقہ جاریہ بنائے۔آمین۔

(نائب امیر شریعت تملناڈو)

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رشادی، پلاپٹی

حضرت مولانا مفتی ابوالحسن محمد یعقوب صاحب قاسمی

پیغام تعزیت

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند،

معزز اراکین شوری، اساتذۂ کرام وطلبہ وحضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری، جناب مولانا وحید احمد صاحب پالن پوری ودیگر برادران حَفِظَهُمُ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کو حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند قدس سرہ کی وفات حسرت آیات کی افسوسناک خبر ملی، جس نے صرف آپ ہی کو نہیں ہم سب کو مستحق تعزیت بنادیا ہے۔ إنا اللہ وإنا إليه راجعون، إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمًّى۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مستعار زندگی کو خوب کارآمد بنادیا، ایک طرف ام المدارس دارالعلوم دیوبند میں طویل عرصے تک ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے انھوں نے بے شمار تشنگان علوم نبوت کو سیراب کردیا، جس کے اعتراف میں مجلس شوری نے انہیں شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے اعلیٰ علمی منصب پر فائز فرمادیا، دوسری طرف ’’رحمۃ اللہ الواسعہ، تفسیر ہدایت القرآن، تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری، تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی‘‘ اور دیگر شاہ کار تصانیف کا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ کر اپنے

لیے صدقۂ جاریہ اور امت مسلمہ کے لیے ایک عظیم سرمایہ کا انتظام فرمایا، اس کے ساتھ ساتھ اپنے اصلاحی اور علمی بیانات سے انھوں نے روئے زمین پر بسے ہوئے بے شمار مسلمانوں کو بھی فیض یاب فرمایا۔

ہم اس عظیم سانحہ کے موقع پر اپنی طرف سے اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے تمام اساتذہ وطلبہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ: **تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَ الْفَقِيْدِ الْجَلِيْلِ أَعْمَالَهُ الصَّالِحَةَ وَخَدْمَاتِهِ الدِّيْنِيَّةَ وَأَجْزَلَ مَثُوْبَتَهُ، وَأَلْهَمَكُمْ وَإِيَّانَا الصَّبْرَ وَالسُّلْوَانَ۔ آمین!**

عبدالرزاق اسکندر
مہتمم جامعہ

سید سلیمان یوسف بنوری
نائب مہتمم جامعہ

عبدالرؤف غزنوی
استاذ حدیث جامعہ

جملہ اساتذہ کرام
جامعہ ہذا

۹ر شوال المکرم ۱۴۴۱ھ = یکم جون ۲۰۲۰ء

تعزیت نامہ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب
استاذِ حدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

بہت ہی صدمے اور گہرے رنج کی خبر ہے کہ آج بتاریخ ۲۵ ررمضان المبارک ۱۴۴۱ء بروز منگل مطابق ۱۹ رمئی ۲۰۲۰ء دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز استاد استاذ الاساتذہ حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند صبح چھے سات بجے کے درمیان جوگیشوری بمبئی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ملک کے طول وعرض اور پوری دنیا میں ان کے تلامذہ کا جال پھیلا ہوا ہے آج ان کی وفات کوسن کر ہزاروں لاکھوں دل رو رہے ہونگے۔

ہزاروں تلامذہ نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے مگر احقر کا تعلق ان کے ساتھ استادو شاگردی میں ایک امتیازی اور نمایاں انداز کا رہا ہے اور کبھی کبھی احقر اور ان کے درمیان رائے کے اختلاف کے ساتھ علمی بحث بھی ہوتی رہی ہے اور احقر نے ان سے بے شمار علمی ابواب وعنوانات حاصل کیے ہیں احقر نے درس وتدریس میں ہمیشہ انہیں کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا سبق ہمیشہ مرتب ہوا کرتا تھا اس لیے طلبہ ان کے اسباق سے مطمئن ہو کر کے اٹھتے تھے ان کے زیر سایہ ہزاروں کی تعداد میں بہترین مفتی بہترین مدرس اور اچھے مصنفین تیار ہوئے۔

ان کا مشغلہ ہمیشہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے دائرے میں رہا، اور تعلیمی سال کے دوران وعظ و تقریر اور ملی سرگرمی کے اسفار بہت ہی کم ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے یہاں سبق کا ناغہ اور نقصان بھی

بہت کم ہوتا تھا اور ان کا درس انتہائی تحقیقی اور محققانہ ہوا کرتا تھا۔

وہ حل کتاب کے اعتبار سے ایک بہترین استاذ تھے اسی لیے طلبہ کے درمیان وہ ایک متکلم عالم اور محقق کی حیثیت سے مشہور تھے جس کی وجہ سے ان کے تلامذہ کے علاوہ دیگر علمی حلقوں میں بھی ان کی شہرت نیک نامی اور ایک بہترین محقق عالم کے حیثیت سے ایک عبارت تھی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے پالنپور میں حاصل کرنے کے بعد مظاہر علوم سہارنپور میں کئی سال تک تعلیم حاصل فرمائی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علوم عالیہ کی تعلیم حاصل فرمائی اور ۱۳۸۲ھ میں دورہ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی۔ اور وہ فخر المحدثین شیخ فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور علامہ ابراہیم بلیاوی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے مخصوص اور نمایاں تلامذہ میں سے تھے اور ان کے سبق میں حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی کا رنگ زیادہ غالب رہتا تھا، دورہ حدیث شریف کے بعد انہوں نے ایک سال افتاء پڑھا اور پھر معین المفتی کی حیثیت سے بھی کچھ دن دارالعلوم میں کام کیا اس کے بعد جامعہ اشرفیہ راندیر میں نو سال تک تدریسی خدمات انجام دیں پھر اس کے بعد لگ بھگ اڑتالیس سال سے دارالعلوم دیوبند میں نمایاں استاد کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں اور آج وہ ایک شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

امسال بخاری شریف کے آخری سبق میں اچانک ان کی آواز بند ہوگئی اور طلباء میں گریہ وزاری کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی اطلاع ملنے پر احقر نے ان کے صاحبزادے حضرت مولانا مفتی حسین احمد پالنپوری سے حالات معلوم کیے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اس دن کی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہفتہ ۲ ہفتے سے ان کی کیفیت یہی ہوتی رہی کہ اچانک ان کی آواز بند ہو جاتی ہے اور بالکل خاموش ہو جاتے ہیں پھر جب وہ اصلی حالت میں ہوتے ہیں تو ان سے معلوم کیا جاتا ہے تو ان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے بے شمار کتابیں تصنیف فرمائیں ان میں سے حجۃ اللہ البالغہ جیسی دقیق کتاب کی شرح بھی مکمل تحریر فرمائی اور ترمذی شریف کی مکمل شرح اسی طرح بخاری شریف

کی مکمل شرح بھی حضرت کی درسی تقریر کی حیثیت سے شائع ہوکر مقبول ہوئی اور ہدایت القرآن کے نام سے قرآن کی تفسیر کی بھی تکمیل فرمائی۔ ان کا کوئی کام ادھورا نہیں رہتا تھا بلکہ شروع سے آخر تک مکمل ہوا کرتا تھا۔ آج ہزاروں تلامذہ اور لاکھوں متعلقین کو داغِ فراق دے کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آج دارالعلوم دیوبند کے درودیوار اساتذہ اور تلامذہ ان کے فراق میں پژمردہ ہیں۔ تعزیتی اجلاس سے متعلق ان کی رائے اکابر دیوبند میں بالکل الگ تھلگ رہی ہے وہ اس کے قائل نہ تھے اتفاق کی بات ہے کہ آج ایسے زمانے میں ان کی وفات کا دردناک سانحہ پیش آیا ہے کہ پورے ملک میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا نہیں سکتے لاک ڈاؤن اور کرفیو کی ایسی شکل ہے کہ آزادانہ طور پر گلی کوچوں میں چل بھی نہیں سکتے ایسے حالات میں بمبئی میں آج ان کی وفات ہوئی دارالعلوم دیوبند کے طلبہ اور اساتذہ اور جو ان کے تلامذہ کا جال پھیلا ہوا ہے ان میں سے کوئی بھی ان کے جنازے میں شرکت کے لیے نہیں جاسکتا۔

اللہ نے ان کو صاحب اولاد بنایا ہے دو بیٹیاں اور غالباً بارہ بیٹے اللہ نے ان کو عطا فرمائے سبھی حافظ قرآن ہیں دونوں بیٹیاں بھی حافظ قرآن ہیں انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کو بھی حافظ بنایا تھا ان کے دوسرے نمبر کے بیٹے حافظ سعید صاحب مرحوم جلالین تک پڑھنے کے بعد آگے نہ پڑھ سکے اور باقی سارے صاحبزادگان حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم دین بھی ہیں ان کی وفات کے وقت بمبئی میں ان کے ساتھ صرف دو صاحبزادے رہے باقی سب دیوبند میں ہیں۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ جنازہ میں شرکت کے لیے کوئی بھی نہ جاسکا، اور ان کے صاحبزادگان میں سے بڑے دو صاحبزادے مولانا رشید احمد اور حافظ سعید احمد حضرت کی زندگی میں وفات پاگئے اور ان کے دوسرے نمبر کے بیٹے حافظ سعید احمد اور تیسرے نمبر کے بیٹے مولانا وحید احمد دونوں نے احقر کی دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات کے زمانے میں احقر سے نورالایضاح پڑھی ہے اس لیے دونوں صاحبزادگان کا احقر سے بہت ہی والہانہ تعلق رہا ہے، اگرچہ وہ آج اکیلے دور افتادہ علاقہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں لیکن ان کے ہزاروں تلامذہ اور متعلقین ان کے لئے ایصال

ثواب میں لگے ہوئے ہیں اللہ پاک ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔

وہ پیچیدہ مسائل کوحل کرنے کے ماہر تھے اور ابھی ابھی لاک ڈاؤن کے دوران رمضان سے قبل ثریا ستارے کے طلوع ہونے سے متعلق جو حدیث میں تبصرہ ہے اسکے متعلق بعض اہل علم کی طرف سے کچھ نامناسب تاویلات کی تشہیر پوری دنیا میں ہونے لگی اس سلسلے میں احقر بھی بہت تشویش میں رہا احقر تحریری طور پر اشکال وجواب کا قائل نہیں ہے اس سے عوام میں اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے اسی لیے خاموش رہا مگر اللہ نے حضرت الاستاذ کے دل میں بات ڈالی اور پہلی تراویح کے بعد انہوں نے اپنے بیان میں صاف الفاظ کے ساتھ ثریا ستارے کی غلط تشریحات پر تردید فرمائی اور ان کی تردید کے بعد وہ سلسلہ ختم ہوگیا اور لوگوں نے راحت کا سانس لیا۔

حضرت کی ولادت کے بارے میں حضرت سے زبانی معلوم ہوا کہ ۱۳۶۰ھ ہجری میں آپ کی ولادت ہوئی اس اعتبار سے اکیاسی سال کی عمر ہوگئی حضرت کو حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب سے اور احقر کے بچوں کے نانا حضرت مولانا سید محمود حسن صاحب سہارنپوری جو حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے تھے ان سے بھی اجازت بیعت حاصل تھی ان کی طرف سے اجازت بیعت کی تحریر احقر کے ذریعے سے پہنچائی گئی ہے اللہ تعالی حضرت الاستاذ کی کروٹ کروٹ مغفرت فرمائے اعلی علیین میں مقام عطا فرمائے اور ان کے سارے علمی کارناموں کو شرف قبولیت سے مالا مال فرمائے۔

احقر انہی جملوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران اور طلبہ کی خدمت میں اور انکے تمام صاحبزادگان اور صاحبزادیوں کی خدمت میں اور ان کے تمام تلامذہ کی خدمت میں اور تمام پسماندگان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہے، اور تمام احباب سے ایصال ثواب کی گزارش کرتا ہے۔

شبیر احمد قاسمی

خادم الافتاء والحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

۲۵ ررمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ رمئی ۲۰۲۰ء

پیغامِ تعزیت

حضرت مولانا محمد سلیم دھورات صاحب، بانی وناظم، اسلامک دعوۃ اکیڈمی لیسٹر (یو، کے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم ومکرم حضرت مفتی محمد امین صاحب دامت برکاتکم وجملہ صاحبزادگان حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ مورخہ ۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کو محدث کبیر، فقیہ النفس، عالم باعمل، یادگارسلف، صاحبِ تصانیف کثیرہ، جامع الکمالات، استاذ الاساتذہ، امّ المدارس دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین، حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی اس دارِ فانی سے دار بقاء کی طرف رحلت کی خبر موصول ہوئی، ایک دھچکا لگا اور سکتہ طاری ہوگیا، دل ڈوبنے لگا! إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهٗ مَا أَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهٗ بِأَجَلٍ مُسَمًّى ایصالِ ثواب اور دعا کی توفیق ملی، مسجد میں اعلان کے ذریعے اہلِ شہر سے بھی ایصالِ ثواب اور دعا کی درخواست کی گئی۔

حضرت پیرانہ سالی سے گزر رہے تھے؛ لیکن یہ خیال نہیں تھا کہ علم وعمل کا یہ مجسمہ، مسلکِ دیوبند کا علمبردار اور اس کا محافظ ہمیں اس طرح اچانک داغِ مفارقت دے کر چلا جائے گا، ہر وقت یہی دعا رہتی تھی کہ آپ کی عمر مزید طویل ہو اور امت آپ سے فیضیاب ہوتی رہے؛ لیکن بندے تقدیرِ الٰہی کے سامنے عاجز ہیں؛ جب کہ امت مسلمہ کی کشتی بھنور میں ہے اور ہر طرف سے طوفانوں میں گھری ہوئی ہے۔ آپ کی رحلت موت العالِم موت العالَم کا صحیح مصداق ہے، ایسی جامع الکمالات ہستیاں بڑی تیزی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتی چلی جارہی ہیں

اور صد افسوس کہ ایسے باعظمت لوگوں کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہے۔

وہ ایک تھے ؛ مگر کارواں لگتے تھے
وہ تھے خاک نشیں ؛ مگر آسماں لگتے تھے
پیکر عشق و وفا مجسمۂ صبر و رضا
وہ استقامت کے کوہِ گراں لگتے تھے
ہزاروں گل ہیں میرے چمن کی زینت
وہ حضرت مفتی سعید خود گلستاں لگتے تھے
اب نہ آئے گا نظر ایسا کمالِ علم و فن
گو بہت آئیں گے دنیا میں رجالِ علم وفن

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی رحلت صرف آپ کے خاندان یا دارالعلوم دیوبند کے لیے نہیں ؛ بلکہ عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ ہے اور آج انہی الفاظ کو دہرانے کو جی چاہتا ہے جنہیں حضرت عباد بن عوام رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے موقع پر فرمائے تھے:

يَنۢبَغِيْ لِأَهْلِ الإِسْلَامِ أَنْ يُعَزِّيَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا بِأَبِيْ يُوْسُفَ

حضرت مفتی صاحبؒ نے دنیا ومافیہا سے بے پرواہ ہوکر پوری یکسوئی، محنت اور جفاکشی کے ساتھ اپنی عمر عزیز کے ایک ایک لمحے کو دینِ متین کی خدمت کے لیے وقف کر کے ہم جیسوں کے لیے عظیم اسوہ چھوڑا ہے، اسی محنت کا ثمرہ تھا کہ آپ اپنے ابتدائی دور ہی سے ترقی کے زینے پر چڑھتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ آپ نے علمی دنیا میں اپنی ایک شناخت قائم کی اور بالآخر برصغیر بلکہ دنیا کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی اس مسند پر بجا طور پر جلوہ افروز ہوئے جس پر کسی زمانے میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، محدث العصر علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہم اور علم وفن کے ماہتاب وآفتاب بیٹھا

کرتے تھے، آپ نے اس مسند کا صرف حق ہی ادا نہیں کیا؛ بلکہ اس کی عظمتوں اور رفعتوں کو چار چاند لگائے، اسی طرح آپ کی تصانیف کو بھی قابلِ رشک مقبولیت حاصل ہوئی، متعدد مدارس میں آپ کی لکھی ہوئی کتابیں داخل نصاب ہیں، اور شاید ہی کسی مدرسہ یا عالم کا کتب خانہ آپ کی کتابوں سے خالی ہوگا، کسی نے خوب کہا:

بغیر اس کے ہرگز کسی نے نہ پائی
فضیلت ، نہ عزت ، نہ فرماں روائی
وہی لوگ پاتے ہیں ، عزت زیادہ
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

حق گوئی اور بیباکی میں آپ بے مثال تھے، اس باب میں آپ کسی شخصیت، ادارے، جماعت یا صاحب ثروت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، مدح وذم سے متأثر ہونا فطری امر ہے؛ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ اس مرحلے سے آگے گزر چکے تھے، قدرت نے آپ کو تحریر وتقریر میں افہام وتفہیم کا جو ملکہ عطا فرمایا تھا، اس میں دور دور تک آپ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا، آپ اپنی تقاریر میں عوام کے عقائد اور نظریات کی حفاظت کی خاطر سہل انداز میں ایسے موضوعات کو بیان کرکے لوگوں کو مطمئن کرتے جنھیں چھیڑنے کی ہر کوئی ہمت نہیں کرتا، بارہا دیکھا کہ بیان سے پہلے پروگرام کی ابتداء میں یا نماز میں پڑھی گئی آیات کو موضوعِ سخن بنا کر ایسی جامع اور دلکش تفسیر کرتے گویا لگتا تھا کہ آپ ابھی ابھی کتابوں سے مراجعت کرکے آئے ہیں، علم میں اس قدر وسعت اور گہرائی تھی کہ آدمی حیرت واستعجاب میں انگشت بدنداں رہ جاتا!

بندے کی زبان وقلم حضرت کے اوصاف وکمالات کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں، اربابِ نظر اور اہل دل ہی آپ کے مقام کا صحیح ادراک کرسکتے ہیں؛ لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں اور یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ آپ دورِ حاضر کے ان ممتاز علماء میں سے تھے جن کی بدولت علم وعمل کی ساکھ قائم تھی، جن سے دار العلوم دیوبند آباد اور

بارونق تھا، آپ مقبول مدرس، فاضل مقرر، کامیاب مصنف، صدق واخلاص کے مجسمے، استغناء وتقوی کے پیکر، نصیحت وخیرخواہی اور حق گوئی میں ممتاز اور نہایت ذہین ومدبّر تھے، آپ اور آپ کے کارناموں کو زمانہ یاد کرتا رہے گا، امید قوی ہے کہ اگلے دنوں میں سوانح کی شکل میں آپ کی زندگی کے بہت سے گوشے اجاگر ہوکر سامنے آئیں گے، جن سے علماء وطلباء کا طبقہ بہت کچھ سیکھ سکے گا، نیز یہ بھی تمنا ہے کہ آپ کے علم وحکمت سے بھرپور مواعظ بھی کتابی شکل میں مرتب ہوکر منظر عام پر آئیں؛ تاکہ رہتی دنیا تک لوگ ان سے استفادہ کرتے رہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی برطانیہ بھی تشریف آوری ہوتی رہی، ہماری اکیڈمی کو بھی اپنی تشریف آوری اور دعاؤں سے نوازتے تھے، بندہ بھی آپ کی شفقتوں اور محبتوں سے مستفیض ہوتا رہا، آپ جہاں جاتے اکابرِ علماء دیوبند کے مشن کو لے کر چلتے اور دیارِ غیر میں اسلاف کے طرز پر مدارس کے قیام کے سلسلے میں فکرمند رہتے، مسلک کی بقالیکے اردو زبان کی تعلیم وترویج پر زور دیتے اور خدامِ دین کی ہمت افزائی کرتے اور آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے، اس باب میں آپ بڑے فراخ دل اور مخلص تھے۔

دل کی گہرائی سے دعا ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائیں، آپ کے مرقد کو انوارِ الٰہی کا موردِ بنائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں، آپ کی دینی وعلمی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائیں، تا قیام قیامت روحانی وصلبی اولاد جن کی تعداد ہزاروں میں ہے اور تصانیف کے ذریعے آپ کے علمی اور روحانی فیض کو جاری رکھیں اور دارالعلوم دیوبند اور امت کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائیں، دین کے اس قلعے کی حفاظت فرمائیں اور اس کا فیض تا قیام قیامت جاری وساری رکھیں، پسماندگان کو صبر جمیل اور اجرِ جزیل عطا فرمائیں (آمین)

والسلام

بندہ محمد سلیم دھورات عفا اللہ عنہ، خادم الحدیث النبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اسلامک دعوہ اکیڈمی، لیسٹر، یو، کے

۲۷ رشوال ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ رجون ۲۰۲۰ء

پیغامِ تعزیت

حضرت مولانا احمد شفیع صاحب، مہتمم دارالعلوم ہاٹ ہزاری، بنگلہ دیش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قابل صد اعزاز و اکرام پسماندگان و پسران حضرت العلام مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

(شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۲۵؍ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ دن کے آغاز کو اچانک ایک المناک اور پُرحسرت خبر پھیلی کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین دورِ حاضر کے بیباک متکلم اسلام، نقاد محدث، عظیم فقیہ، لائق باغِ قاسمی حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری صاحبؒ نے ممبئی کے ایک اسپتال میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور مولائے حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب مرحوم عصر رواں کی ایک برگزیدہ شخصیت، مثالی محدث، یکتا فقیہ، ترجمانِ دیوبندیت، تابندہ ودرخشندہ ایک مہتابِ شریعت، فطین، بلند فکر، راستی پسند، ظریف الطبع، فصاحت وبلاغت کا رمز شناس، جامع علوم وفنون، تاریخ ساز زندگی کے حامل ایک متبحر عالم تھے، شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ مہاجر مدنی کے امین اور راز داں اور فقیہ الاسلام مفتی مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل اور لائق جانشین تھے۔

مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ اپنی مخلصانہ جدوجہد، تبحر علمی، خداداد ذہانت، ممتاز قوت حافظہ اور نرالی شان

کے درسی روش کے ذریعہ دارالعلوم دیوبند میں ایک نمایاں مقام اور پوزیشن حاصل کیے تھے، اورطویل مدت تک دارالعلوم کی مسند حدیث کو رونق اورصدارتِ تدریس کو زینت بخشی، ان کے چشمۂ علم وحکمت سے ملک اور بیرون ملک کے ہزاروں تشنگانِ علوم ومعارف سیراب ہوئے۔

اورحسب فرمائش رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مَوْتُ الْعَالِمِ مُصِيْبَةٌ لاَتُجْبَرُ وَثُلْمَةٌ لاَ تُسَدُّ مولانا موصوف کا انتقال امت مسلمہ کے لیے نا قابل جبرنقصان اور جانکاہ حادثہ ہے، بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی رحلت سے دینی مجال میں جوخلا پیدا ہواوہ کبھی پُر نہ ہوگا۔

اس رحلت حسرت آیات پر میں بہ نفس نفیس اور دارالعلوم ہاٹ ہزاری کے تمام اساتذہ وطلبہ بے حد حزین وغمگین ہیں اوردیگراحباب واقارب کے ساتھ شریک غم ہورہے ہیں۔

بالآخر دربارِ خداوندی میں التجاء ہے کہ ان کی تمام دینی خدمات کوشرف قبولیت سے نوازیں، اوران کے شاہکارعلمی کارنامے سے تا قیامت طالبان علوم نبوت کومستفید فرماویں، ان کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام عطا فرماویں، اورپسماندگان کوصبرجمیل کی توفیق عنایت فرماویں۔آمین!

احمد شفیع

مہتمم دارالعلوم معین الاسلام ہاٹ ہزاری، بنگلہ دیش

۲۷/۹/۱۴۴۱ھ

❁...❁...❁

تعزیت نامہ

حضرت مولانا محمد عبد الحلیم بخاری صاحب

مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ پٹیہ چاٹگام۔ بنگلہ دیش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بشرف ملاحظہ قدوۃ العلماء حضرت علامہ مفتی ابو القاسم نعمانی قاسمی صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اما بعد! امید کہ مزاج عالی بتمام عافیت ہوں گے۔ عرض یہ ہے کہ انٹرنیٹ سے معلوم ہوا کہ گزشتہ ٢٥ر رمضان المبارک کو دار العلوم دیوبند کے مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق شیخ الحدیث وصدر المدرسین حضرت علامہ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو چکی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ عالم اسلام کے لیے ایک سنگین حادثہ ہے، حضرت مرحوم نے ایک طویل عرصہ تک دار العلوم کی قابل ستائش اور نمایاں خدمت انجام فرمائی ہے، اور صحیح بخاری، جامع ترمذی اور حجۃ اللہ البالغہ کی انمول اور بے مثال شروحات سمیت بہت ساری تصنیفات سے علمی دنیا کو سیراب فرمایا ہے، ہم اراکین جامعہ اسلامیہ پٹیہ، اساتذۂ کرام اور تمام طلباء اس حادثہ کی خبر سے نہایت صدمہ رسید ہوئے، اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے درجات بلند فرمائیں اور حضرت مرحوم کو جنت الفردوس کا اعلیٰ مقام عطا فرمائیں، نیز ارباب دار العلوم دیوبند اور حضرت مرحوم کے تمام رشتہ داروں کو صبر وسکون عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین!

تعزیتی پیغام

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی صاحب

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد

یہ دنیا دار الفناء ہے، ہر بندہ نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **کل نفس ذائقۃ الموت**، ہر جی نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے، کچھ دن پہلے ہمارے محسن ومکرم بزرگ حضرت شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ وفات پا گئے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللھم لا تحرمنا اجرہ و لا تفتنا بعدہ۔**

فقیر کہ دارالعلوم دیوبند کی حاضری کے وقت حضرت سے تفصیلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، سوچتا تھا کہ

ندانیم ما گل خنداں چہ رنگ وبو دارد
کہ مرغ ہر چمنے گفتگوے او دارد

جیسا سنا تھا ویسے ہی پایا منور چہرہ، شخصیت پر علمی جلالت شان، طبیعت میں سادگی و عاجزی۔ ملاقات کر کے دل باغ باغ ہو گیا۔ پھر محبت کا ایک رشتہ وجود میں آیا۔ پھر محبت کا ایک رشتہ وجود میں آیا، زامبیا میں حضرت سے پھر دوبارہ ملاقات ہوئی اس دن حضرت نے بہت سارے لطیفے بھی سنائے، بہت بے تکلفی کا اظہار فرمایا۔ فقیر حضرت کے بیانات بڑے شوق سے سنتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے ان سے مستفید ہونے کا وقت بہت تھوڑا نکلا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

اللہ تعالی انھیں اپنے قرب کے اعلی ترین درجات عطا فرمائے علمی حلقوں میں ان کی یادیں بہت عرصہ تک باقی رہیں گی بقول شاعر۔

کلیوں کو میں سینے کا لہو دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضاء یاد کرے گی

اللہ تعالی کرے کہ یہ علمی خلا جلدی پورا ہو جائے۔ آمین اللہ تعالی ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطاء فرمائے اور علمی فیض ان کی آنے والی نسلوں میں جاری وساری فرمائے۔ **وما ذلك على الله بعزيز**

❁...❁...❁

حضرت اقدس علامہ سعیدؒ کا سفرِ سعید الی دار السعید

مولانا منظور احمد مینگل صاحب
رئیس جامعہ صدیقیہ کراچی

للہ الحمد و البقاء

لو کانت الدنیا تدوم لاحد　　لکان رسول اللہ فیھا مخلد

اگر دنیا بکس پائندہ بودے　　ابوالقاسم درزندہ بودے

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے جانے ہی کے لیے آیا ہے آئندہ بھی جو آئے گا جانے ہی کے لیے آئے گا نہ کہ اس دنیا میں رہنے کے لیے چونکہ یہ دنیا عارضی ہے اور دار البقاء نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا وطن اصلی ہے اگر قدرت کے نظام ہستی میں موت نہ ہوتی تو آج اس دنیا میں کسی کے لیے پاؤں دھرنے کی جگہ تک نہ ہوتی، یہی وہ فلسفہ ہے جس کے پیش نظر علماء امت اور طالبان دین کے عظیم روحانی پیشوا اور علمی کشتی کے ناخدا محبوب العلماء والصلحاء فقیہ الملت شیخ الحدیث والتفسیر مفتی سعید احمد پالنپوری رحمہ اللہ نے ماہ رمضان جیسے بابرکت مہینے میں ہمیں فراقِ جاودانہ کا داغ دیکر اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

آپ رحمہ اللہ خود تو اس جانے پر نازاں و شاداں ہو کر بلال و عمار کا نعرہ **کیف لا نفرح غدا نلقی الاحبۃ محمدا و حزبہ** لگا کر اپنے رب اور اس کے پیاروں سے جا ملے مگر اپنے پیچھے میرے جیسے لاکھوں عقیدت مندوں اور متوسلین کو میدان تیہ میں غمزدہ حیران و سرگردان چھوڑ کر چلے گئے۔ شاید کہ ہم زمانے کے موسیٰ اور اپنے وقت کے ہارون کی قدردانی نہیں کر پائے اور ورنہ نوبت بایں جارسید کا سامنا نہ کرتا پڑتا، اگر کسی بھی عظیم ہستی کے جانے پر جزع فزع نوحہ و فریاد کرنے کی اجازت شریعت میں ہوتی تو میں اپنے شیخ و استاذ رحمہ اللہ کے فراق پر

آسمان وزمین کو بھی رورو کر دکھا دیتا کہ آہ ...کون گیا ہے؟ اور کتنا بڑا صدمہ دے گیا ہے؟ لیکن نہیں ہمیں ہمارے شیخ قل کل من عنداللہ اور لا نعتقد و لا نقول الا بما یرضی بہ ربنا کا درس دیکر اس دنیا سے چلے گئے۔

آپ رحمہ اللہ کون تھے؟

قارئین اگر محسوس نہ کریں تو شیخ محمد عوامہ کا یہ جملہ اس موقع پر بالکل بجا ہے کہ **لا یعلم العالم الا العالم** کہ عالم کی علم کی معرفت عالم ہی کو ہوسکتی ہے نہ کہ کیا غیر عالم کو میرے شیخ مفتی سعید احمد پالنپوریؒ نے دنیا میں اپنے علم و تحقیق سے اپنی پہچان کرائی اور اس زمانے میں اپنی علمی قابلیت کا لوہا منوایا میں جب ہی تو آج علمی دنیا میں ہر سو آپ ہی کے ڈنکے بج رہے ہیں اور یہی آپ کی امتیازی کی پہچان بھی ہے نہ کہ آپ کی پہچان کچھ اور **یعرف الرجال بالحق و الحق لا یعرف بالرجال** کا ضابطہ اسی امر کا تقاضا کرتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں کروڑوں کی تعداد دیوبندی چاہے وہ علماء ہوں یا غیر علما سمیت مجھ جیسے ناواقف علماء کو دیوبندیت کے حدود اربعہ کا علم نہیں اس سے بڑھکر جہالت اور کیا ہوسکتی ہے: **الی اللہ المشتکی و المفزع**

آپ رحمہ اللہ سے عقیدت کا ذریعہ

استاذی و سندی رئیس المحدثین استاد الکل مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ کئی بار حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالنپوری رحمہ اللہ کے فضل وکمال کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھا مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ کی لسان سے آپ کی علمی قابلیت کی ترجمانی ہی ہماری عقیدت والفت ذریعہ بنی اور آپ رحمہ اللہ کا اشتیاق ہمارے دل میں جاگزیں ہو گیا اور اس سے بڑھ کر احقر کی ساری زندگی درس نظامی کی کتب کا درس دینے میں کھپ گئی جامعہ فاروقیہ میں (جو کہ ام المدارس فی باکستان ہے) درس نظامی کی تقریبا تمام کتب بشمول بعض کتب احادیث پڑھانے کا موقع ملا اور پھر عرصہ دراز سے ادارہ جامعہ صدیقیہ میں صحاح ستہ، مشکوۃ اور تخصص فی الفقہ کی کتب بھی زیر درس ہیں، اس سلسلہ میں احقر حلِ کتاب کا محتاج رہتا ہے، لمبی چوڑی تقاریر بندہ کو طبعاً ناپسند ہیں، موجودہ زمانہ کے علماء میں سے

کتاب دانی کا بادشاہ اور شاہ سوار میں نے جن ہستیوں کو پایا ان میں سے سرفہرست شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان ،حضرت اقدس مولانا صدیق احمد باندوی اور حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالنپوری رحمھم اللہ کو ہی پایا تجربہ ہے کہ مدرس جب اصل کتاب کو چھوڑ کر لمبی و چوڑی تقاریر کا سہارا لے تو سمجھ لیا جائے کہ مدرس اصل کتاب سے ناواقف ہے۔ چونکہ حلِ کتاب کے لیے اصل کتاب کا سمجھنا اور سمجھانا نہایت ضروری ہے حضرت اقدس کی تحفۃ الالمعی ،تحفۃ القاری، رحمۃ اللہ الواسعۃ ، ہدایۃ القرآن و دیگر تصانیف اسی بات کا کھلم کھلا اور ثبوت بین ہیں۔

آپ رحمہ اللہ کا انداز تدریس:

ہمارے بزرگوں میں سے حضرت اقدس قاسم العلوم والخیرات نانوتویؒ ،فقیہ الامت رشید احمد گنگوی، شیخ الہند محمود حسن دیوبندی، رئیس المحدثین محمد انور شاہؒ، شیخ العرب والعجم حسین احمد مدنیؒ، حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالنپوریؒ ان کا انداز اور اسلوب ،عبقریانہ ،فقیہانہ اور محدثانہ ہے، آپ رحمہم اللہ نصوص قرآنیہ اور نصوص احادیث میں غوطہ زن ہو کر مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے جبکہ دیکھا گیا ہے کہ بعض حضرات کا انداز اصرف ناقلانہ ہے نقل درنقل سے ہی کام لیا گیا ہے جبکہ مذکورہ بالا عبقری شخصیات کا انداز درس صرف اور صرف تحقیق پر مبنی ہے۔

فقہ وحدیث میں آپ رحمہ اللہ حسین امتزاج

سید وسندی حضرت اقدس مفتی صاحب رحمہ اللہ ہمیشہ احادیث مبارکہ کو متبوع بنا کر فقہی مسائل کو اس سے جوڑا کرتے تھے نہ کہ ہمارے اس زمانے کے عام علماء کی طرح، ہمارے زمانے کے علماء مسائل فقہیہ میں سے غیر مفتی بہ اور شاذ و مرجوح اقوال کی بنا پر حدیث میں تاویل کر کے حدیث کو اس کمزور مسئلے کا تابع بنا لیتے ہیں بلکہ حدیث تابع بنانے کا جرم عظیم کا ارتکاب کر گزرتے ہیں جو علمی دنیا میں نہایت ہی قبیح اور ناقابل معافی جرم ہے۔ آپ رحمہ اللہ کا انداز فقیہانہ اور محدثانہ تھا نہ کہ مناظرانہ ومجادلانہ، آپ کی طبیعت مناقضانہ نہیں تھی کان یجعل الحنفیۃ تابعۃ للحدیث و لا یعکس الامر فجزاہ اللہ عنا و عن المحدثین و الفقاء۔ اور اس موقع پر میری

تمام علماء ومدرسین سے گزارش ہوگی کہ ان کے ہی اسلوب کی اتباع کریں۔

منشا اور اساس اختلاف:

آپ رحمہ اللہ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ائمہ مجتہدین میں منشاء اور اساس اختلاف کو اردو زبان میں بیان کیا اور ائمہ اربعہ کے اختلاف کو صواب وخطاء کا درجہ دیکر اس امر کو واضح کیا اور صرف اور صرف آپ ہی کا تفرد ہے میرے جیسے کئی ناواقف ملّا تو اس اختلاف حق و باطل کا رنگ دیکر امت کو ائمہ اربعہ کا دشمن بنا چکے ہیں، عبدالحلیم سیالکوٹیؒ کے بارے میں مشہور تھا کہ سنگ را موم کردہ موم را سنگ کرد لیکن میرے شیخ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو اللہ نے کی صلاحیت ودیعت میں عطا فرمائی تھی کہ آپ سنگ را موم کردہی کے مصداق تھے میں نے اپنے اکابرین میں مشکلات اتنی عمدہ تعبیر کرنے والا شخص آج تک نہ دیکھا اگر آپ کی تصانیف کے جواہر ودرر اور آپ کی عمدہ تعبیرات کو جمع کیا جائے تو شاید ایک بہت بڑی تصنیف ان اشیاء کو سمیٹ نہ سکیں۔

دعاء صبر ومحنت:

اللہ تعالی آپ کو غریق رحمت کردے، جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق نصیب فرمائے، آپ کی صرف نسبت نہیں بلکہ آپ کی جیسی محنت اور اخلاص ہم سب کو نصیب فرمائے، آپ سے شرف تلمذ اور سند حدیث اور اس پر تلخ اعتراضات اور حضرت اقدس کی طرف سے اور مفتی محمد امین پالنپوری، برادر مکرم مولانا محمد قاسم کی طرف سے مدد اور تعاون کا تذکرہ کسی مستقل مضمون میں ان شاء اللہ کروں گا۔ اللہ تعالی سے دعا ہے اس ناکارکو بھی آپ کے علوم کا کچھ حصہ عملاً نصیب فرمائے۔ آمین۔

۞...۞...۞

تعزیت نامہ

ایک عبقری شخصیت حضرت مفتی سعید صاحب پالن پوریؒ

حضرت مولانا عباس داود بسم اللہ صاحب
صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

یوں تو دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے کون آیا ہے، آج نہیں تو کل ہر ایک کو یہ مسافر خانہ چھوڑ کر حقیقی منزل کی طرف کوچ کر جانا ہے لیکن اللہ کے کچھ نیک بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی رحلت پر ایک عالم افسردہ ہو جاتا ہے، وہ تنہا نہیں جاتے، بلکہ ان کے ساتھ بہاروں کا ایک موسم رخصت ہو جاتا ہے اور رہ جاتی ہیں تو فقط ان کی حسین یادیں۔

جانے والے کبھی نہیں آتے آنے والوں کی یاد آتی ہے

حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند، ورکن شوری جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین رڈابھیل رسملک) ان باکمال ہستیوں میں سے ایک تھے جن کا وجود مسعود تشنگان علم کے لیے سراپا خیر اور ان کی ذات ہزاروں طالبان علوم نبوت کے لئے مشعل ہدیٰ تھی، مگر افسوس پھیپھڑوں میں پانی آنے کی وجہ سے ممبئی کے ایک ہسپتال میں وہ شمع ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

حشر تک اب زباں نہ کھولیں گے تم پکارو گے ہم نہ بولیں گے

خبر وفات سن کر دل کو بڑا رنج والم ہوا، ہم مفتی صاحب قدس سرہ کے تمام پسماندگان کو تعزیت پیش کرتے ہیں واللہ تعالی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی جوار رحمت عطا فرمائے، اہل خانہ و متعلقین کو صبر جمیل دے، اور امت کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

عباس داود بسم اللہ
صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل رسملک رگجرات
۳۰ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

تعزیت

بروفات استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ تعالی

حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ گنگوہی
مدیر جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

گرامی قدر حضرت مولانا مفتی امین احمد پالن پوری و پسران ذی احترام حضرت اقدس مفتی صاحبؒ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزشتہ کل ہی قدرے تاخیر سے یہ خبر وحشت اثر معلوم ہو کر انتہائی صدمہ ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدرالمدرسین ہزاروں علماء کے قابل فخر استاذ ،فقیہ النفس، عالم بے بدل، استاذ اکبر حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ طویل علالت کے بعد مسافران آخرت میں شامل ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شیئ عندہ بأجل مسمی فلتصبر والتحتسب۔

یہاں جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کے شیخ الحدیث اور ہمارے محسن ومخلص استاذ حضرت شیخ مولانا وسیم احمد سنسار پوری رحمہ اللہ کی وفات کا غم بالکل تازہ تھا کہ عالم جلیل اور محدث شہیر حضرت مفتی صاحب بھی داغ مفارقت دے گئے آپ کی وفات سے فضل وکمال کی ایک بستی اجڑ گئی۔ علم وتحقیق کا ایسا فرہاد چل بسا جس نے ساری زندگی قال اللہ وقال الرسول کی تفہیم وتشریح کیلئے وقف کردی تھی آپ کی وفات درحقیقت ایک عالم کی وفات ہے

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

حضرت مولانا کی اپنی انفرادیت تھی امام شعبہ یحییٰ بن سعید قطان اور علی ابن المدینی جیسے محدثین ومحققین کی خوبو ان میں جھلملاتی تھی۔ حضرۃ الاستاذ نے درس وتدریس، تصنیف تالیف اور اصلاح وتربیت کے جو مثالی نمونے چھوڑے

ہیں اس سے آپ کا نام اور کام بھی زندہ رہے گا جبکہ جویانِ علم استفادہ کرکے اپنا اپنا دامنِ مراد بھی بھر سکیں گے ۔لاریب حضرت مولانا راسخین فی العلم کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے ان کا علم بالکل تازہ اور پختہ تھا بخاری وترمذی شریف کے مقبول شارح ہونے کے ساتھ درجنوں کتابیں انہوں نے مختلف موضوعات پر تصنیف فرمائی ۔مسند الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی کی شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ اور قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا نانوتوی کی بعض کلامی کتابوں کو اردو کے قلب وقالب میں اس طرح ڈھالا کہ علمی دنیا آپ کی ممنون احسان بن گئی۔ **تقبل اللہ جھودہ وتغمدہ بواسع رحمتہ۔**

اس خاکسار پر بھی حضرت کی شفقتیں دراز تھیں ظاہری ملاقاتیں اگرچہ بہت کم رہیں لیکن لوجہ اللہ آپ سے جو عقیدت والفت کا رشتہ تھا حضرت مرحوم اسے پانی دیتے تھے دیوبند یا باہر کبھی ملاقات ہوتی تو کرم گستری کا معاملہ فرماتے تھے۔گنگوہ بھی کئی بار تشریف لائے ایک موقعہ پر بندہ نے شمائل ترمذی شریف کے افتتاحی درس کیلئے درخواست گزاری تو کسی لیت ولعل کے بغیر قدم رنجہ فرمایا۔ چند ماہ پہلے ہی گجرات کے ایک سفر میں آپ کے فرزند والا صفات کی علالت اور وفات کی خبر ملی تو بندہ وہیں خدمت میں حاضر ہوا مجھے وہاں دیکھ کر بہت منشرح ہوئے اور بڑی دعائیں دیں۔ المختصر یہ کہ انھیں دینی وعلمی اشتغال رکھنے والے اپنے تلامذہ کی قدر تھی افسوس کہ گردش شام وسحر سے متاثر ہوکر اس عالمی شخصیت نے بھی ہم سے منھ موڑ لیا جس سے محرومیوں کا سلسلہ اور دراز ہوگیا ہے لیکن مشیت خداوندی کے سامنے ہم سر تسلیم خم کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ حضرت استاذ محترم کی مغفرت کاملہ فرمائے،زلات سے درگزر فرماکر بہشت بریں میں ٹھکانہ دے اور تمام پسماندگان متعلقین اور تلامذہ کو صبر وسکون نصیب فرمائے۔میری طرف سے حضرت کے افراد خانہ اور جملہ محبین کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش ہے اور دعا کی درخواست بھی والسلام۔

شریک غم: خالد سیف اللہ گنگوہی

مدیر جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

۲۶؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ ہجری مطابق ۲۰ مئی ۲۰۲۰ء چہارشنبہ

تعزیت نامہ بروفات

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا مجیب اللہ صاحب گونڈوی
استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم دیوبند

۲۵/رمضان المبارک بروز منگل صبح آٹھ بجے میرے بیٹے عزیزم مولوی وحید اللہ نے میرے پاس آکر یہ اندوہناک خبر سنائی کہ مفتی صاحب کا انتقال ہوگیا، تو میرے بدن میں جیسے جان ہی نہ رہی ہو دل کی حالت غیر ہوگئی دراصل رمضان ہی میں ان سے میری دو مرتبہ گفتگو ہوئی اور دونوں مرتبہ انہوں نے پوری بشاشت سے اس طرح گفتگو فرمائی کہ وہ بیمار محسوس ہی نہیں ہو رہے تھے؛ بلکہ پہلی مرتبہ جب گفتگو ہوئی تو الٹے مجھ سے ہی کہنے لگے کہ تمہاری آواز بہت کمزور ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا......؟

ان کی اس پر اعتماد گفتگو سے طبیعت بڑی مطمئن تھی، اور دل میں اس اندوہناک حادثہ کا اندیشہ تک نہ تھا؛ لیکن قدرت کا اٹل فیصلہ ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور ہر شخص کی موت کا ایک وقت متعین ہے، حضرت مفتی صاحب کا وقت موعود بھی رمضان کی بڑی مبارک ساعتوں میں آیا، اللہ تعالی کو روح سعید کی عید سعید لاک ڈاؤن کی منحوس دنیا میں منظور نہیں تھی؛ اس لئے رمضان المبارک کے سب سے زیادہ بابرکت عشرہ میں اپنے پاس بلا لیا، واقعہ یہ ہے کہ ایک تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے علماء جس تیزی کے ساتھ دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں جنہیں رب کریم اپنی جوار رحمت میں جگہ دے رہے ہیں اسے دیکھ کر ناطق گلاوٹھی صاحب کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

محشر میں یا الٰہی کیا عید ہو رہی ہے

جاتے ہیں جانے والے کپڑے بدل بدل کر

وہ خودتو پاکیزہ کفن میں ملبوس خوش خوش رب کریم کی جوار رحمت میں چلے گئے، رہ گئے ہم تو اس لاک ڈاؤن میں عید کی ہر خوشی سے محروم ہیں، جہاں اجتماعی دوگانہ بھی ممکن نہیں، وقت کی ستم ظریفی کہیں یا شومئ قسمت کہ سوچتے ہیں اس عید کو کپڑا ابھی بدلیں یا رہنے دیں۔

مفتی صاحب کی بیماری ایسی نہیں تھی کہ جس سے کسی کو یہ شبہ بھی ہو کہ اب وقت رحیل ہے، بیماری میں شدت ختم بخاری کے روز طبیعت کی خرابی سے آئی، جب ختم بخاری کے بابرکت موقعہ پر کچھ کلام نہ کر سکے، دعا کیلئے زباں نے ساتھ نہ دیا اور گریہ طاری ہوگیا جس سے پورے دارالحدیث کی سسکیاں بندھ گئیں اور بار بار یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ "اللہ جو چاہے گا وہی ہوگا" ہوا وہی جو رب کو منظور تھا، اللہ کو اس سعید روح کو اپنے پاس بلانا تھا جو امر رمضان کی مبارک ساعت میں پورا ہو۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ حضرت مرحوم دارالعلوم کے طبقۂ اساتذہ میں شان امتیازی کے حامل تھے، انداز تدریس اور مشکل مسائل کی تفہیم میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا وہ کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ بہترین مصنف بھی تھے، جن میں سرفہرست "حجۃ اللہ البالغہ" کا اردو ترجمہ "رحمۃ اللہ الواسعۃ" تفسیر قرآن اور دیگر فنون کی بہت اہم مفید معتبر کتابیں ہیں، بعض کتابوں کی مقبولیت اس درجہ بڑھی کہ بیشتر مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔

انکا درس مقبول عام وخاص تھا ایسا سہل المنال کی عامی شخص بھی درس میں بیٹھ کر مستفید ہو سکے، درس کی قبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب قدیم فضلاء اور قرب وجوار کے مدارس کے طلبہ دارالعلوم آتے تو انکے سبق میں شرکت بھی انکے پروگرام کا حصہ بنتی۔

علم میں جب سمندر کے مانند گہرائی ہو، عقل پختہ ہو، وسیع مطالعہ ہو تو بعض منفرد تعبیرات کا اضافہ بھی ہوتا ہے جن کو شخصی تفردات کہا جاتا ہے مفتی صاحب کا شمار بھی انہیں علماء میں سے ہے۔ جن کے اپنے تفردات تھے جن سے

بعض علماء نے اختلاف کیا اور بعض نے اسکو محض تعبیر کا فرق سمجھ کر قبول کیا۔

مفتی صاحب کا ہمارے درمیان سے چلا جانا ایک بہت بڑا خسارہ ہے ان کے ساتھ علم کا بڑا حصہ اس دنیا سے اٹھ گیا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے **إن اللہ لایقبض العلم انتزاعاً ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلم یقبض العلماء** (آخر زمانہ میں) اللہ تعالی دین کا علم اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ علم دین کو لوگوں کے اندر سے کھینچ لے گا؛ بلکہ (اس دنیا سے) حقیقی علماء کو اٹھا لینے کی صورت میں علم دین کو اٹھائے گا۔

مرحوم کیلئے بہترین خراج عقیدت یہ ہے کہ ہم بھی ان ہی کی طرح اپنے قیمتی اوقات کی حفاظت کریں اور کثرت مطالعہ کے ذریعے اپنے علم میں گہرائی و گیرائی پیدا کریں اور اگر مدرس ہیں تو مولانا مرحوم کی طرح پوری تیاری کے ساتھ درسگاہ میں جائیں انکے منہج تدریس کو اپنا کر تسہیل و تفہیم کے اس نایاب سلسلے کو جاری رکھیں۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالی حضرت مرحوم کے ساتھ خصوصی فضل کا معاملہ فرمائے دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، برادران صاحبزادگان اور صاحبزادیوں کو صبر وسکون نصیب فرمائے۔آمین یارب العلمین

❁...❁...❁

تعزیت نامہ

حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب
بانی رئیس جامع علوم القرآن، گجرات

بخدمت محترم المقام جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب زید مجدہ السامی (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عافیت خواہ بعافیت ہے۔ ۲۵ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی صبح اول وقت میں نماز فجر پڑھ کر حسب معمول سو گیا تھا، کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جب بیدار ہوا تو موبائل فون دیکھا، واٹس آپ پر خبر صاعقہ اثر پڑھی کہ محدث جلیل، مفسر قرآن، فقیہ نفس، سرمایہ ملت، مرجع العلماء حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نوراللہ مرقدہ (شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند) مختصر علالت کے بعد راہی سفر آخرت ہو گئے، انا للہ و انا الیہ راجعون، إن للہ ما أخذ و لہ ما أعطی و کل شئ عندہ بأجل مسمی فلتصبر و لتحتسب خبر پڑتے ہی دل ڈھک سا گیا فکر میں خمود طاری ہو گیا اور کچھ دیر مسلسل استرجاع کرتا رہا۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی خلوص وللّٰہیت، جہد متواصل، بلند حوصلگی، عزم واستقلال اور یکسوئی سے عبارت تھی، بالخصوص پابندی اوقات، کتب بینی کا اسہاک اور تدریس سے وارفتگی کی حد تک دلچسپی لائق تقلید وصف تھا۔

راقم الحروف کا تعارف حضرت مفتی صاحب سے راندی کے زمانے سے تھا، جن دنوں حضرت مفتی صاحب

دارالعلوم اشرفیہ میں مدرس تھے، راقم الحروف جامعہ ڈابھیل کی طالب علمی کے آخری سالوں میں تھا اور اپنے استاذ حضرت مولانا مفتی ابراہیم چھودی مداللہ ظلہ کے ہمراہ جمعرات کو حضرت مفتی صاحب سے ملنے راندیر جایا کرتا تھا، میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب اس وقت اکیلے رہتے تھے تو ہفتہ بھر کا کھانا جمعرات کو پا لیتے تھے اور پورا ہفتہ مطالعہ کے لیے مختص رکھتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب جیسے مربی کی رحلت آپ کے پورے خاندان کے لیے خصوصا اور دارالعلوم رعلماء رطلبہ اور امت مسلمہ کے لیے عموما ایسا نقصان ہے کہ بظاہر اس کی تلافی ناممکن ہے والا ان شاء اللہ۔

اس اندوہناک وقت میں آپ حضرات کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہوں، اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے جوار خاص میں جگہ عنایت فرمائے اور آپ تمام پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازے۔آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

❁ ... ❁ ... ❁

تعزیت نامہ

حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب
بانی رئیس جامع علوم القرآن، گجرات

محترمی مولا حسن، حسین ودیگر برادران وجمیع اہل خانہ زاداللہ فضلکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالی آپ تمام کوخوش وآبادرکھے، آمین وبعد

۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی صبح اول وقت میں نماز فجر ادا کر کے کچھ دیر آرام کے لئے لیٹ گیا، جب بیدار ہوا تو واٹس آپ پر یہ جانکاہ، دردناک، الم آمیز اور روح فرسا خبر پڑھی کہ چند دنوں کی علالت کے بعد محدث عصر، مفسر قرآن، مربی جلیل، گنگوہی زمانہ، مرجع العلماء حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری (نور اللہ مرقدہ) آپ اور ہم سب کو داغ مفارقت دے کر راہی ملک بقا ہو گئے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون، إن للہ ما أخذ و لہ ما أعطی و کل شئ عندہ أجل مسمی فلتصبر و لتحتسب۔

جوں ہی حضرت مفتی صاحب کی رحلت کی خبر صاعقہ اثر پڑھی دل ڈھک سا گیا، ذہن پریشان اور فکر خامد ہوگئی، کچھ مسلسل استرجاع کرتا رہا۔

محترمان بندہ! حضرت مفتی صاحب علم کا بحر بیکراں عمل کا پیکر مجسم، عزم وحوصلہ کا کوہ ہمالیہ، کتب بینی کے دلدادہ خلوت پسند اور جہد مسلسل کا حسین مرقع تھے۔ میں جامعہ ڈابھیل میں طالب علم تھا ان دنوں حضرت مفتی

صاحب دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں مدرس تھے، میں اکثر پنجشنبہ کی شام اپنے استاد مکرم حضرت مولانا مفتی ابراہیم آچھودی مدظلہم العالی کے ہمراہ راندیر حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں جایا کرتا تھا، حضرت مفتی صاحب چونکہ تنہا رہتے تھے تو ہفتہ بھر کا کھانا جمعرات کو پکا لیتے تھے تا کہ دوران ہفتہ اوقات مطالعہ میں سے کھانا پکانے کے لیے ذرہ سا وقت بھی نہ نکالنا پڑے، یوں وارفتگی کی حد تک محنت آپ کی طبیعت ثانیہ بن گئی۔

راندیر سے دیوبند تشریف لے جانے کے بعد حضرت مفتی صاحب کے ساتھ روابط اور مضبوط ہوتے چلے گئے، خط وکتابت کا سلسلہ بھی رہا اور دیوبند کی حاضری پر حضرت والا سے گھر جا کر ملنے کا اہتمام بھی رہا اور میری دعوت حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ متعدد بار ہمارے جامع علوم القرآن، جمبوسر بھی تشریف لائے۔

آپ کا یوں رخصت ہو جانا جہاں آپ لوگوں کے لیے نا قابل تلافی نقصان ہے وہاں میرے لیے بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے بھی نا قابل برداشت ہے، لیکن انسان کر بھی کیا سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کو خلود نہیں، ورنہ ہم سب کے آقا مولیٰ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موت نہ آتی مگر

ولو كان في الدنيا بقاء لساكن　　لكان رسول الله فيها مخلدا

وما أحد ينجو من الموت سالمة　　وسهم المنايا قد أصاب محمدا

بہر حال میں اس کرب ناک اور الم آمیز موقع پر آپ لوگوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہوں، اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو اپنے جوار رحمت میں بلند مقام عطاء فرمائے اور آپ تمام کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازے اور آپ کا والی وحامی اور ناصر محافظ رہے۔ آمین۔

والسلام

حزین وغم آگیں

(حضرت مولانا مفتی) احمد دیولوی (دامت برکاتہم)

بانی رئیس: جامع علوم القرآن، جمبوسری بھروچ، گجرات

تعزیتی عریضہ بروفات:

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوری صاحب

[عالم اسلام کی عظیم شخصیت، دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین، حجۃ اللہ البالغۃ، بخاری اور ترمذی کے شارح، عظیم مفسر حق گو ناصح و واعظ، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ کی وفات پر لکھا گیا ایک تعزیتی عریضہ جو رسالہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اس میں حضرت کے اوصاف و کمالات، آپ کی تصانیف، چند معمولات اور آپ کے قابل تقلید حالات وغیرہ موضوعات پر چند باتیں جمع کی گئی ہیں۔]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

حضرت مولانا محمد امین صاحب پالنپوری و حضرات صاحبزادگان حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری (رحمہ اللہ) مدظلکم۔ رزقکم اللہ صبرا جمیلا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ رمضان کے بابرکت اور فضیلت والے مہینے میں حضرت والد ماجد رحمہ اللہ کی وفات کا حادثۂ جانکاہ پیش آیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون، اللھم اجرنا في مصیبتنا وعوضنا خیرا منھا، للہ ما اخذ ولھما أعطی وکل شئی عندہ بمقدار، ندعوا من اللہ تعالی ان یرزقکم صبرا جمیلا وعلی ما فقدتم اجرا عظیما وجزیلا، ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضي ربنا۔

یہ سرائے دہر مسافروں بخدا کسی کا مکان نہیں
جومکین اس میں تھے کل کہیں آج ان کا نشان نہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف آپ حضرات ہی نہیں، بلکہ عالم اسلام ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہوگیا۔ حضرت رحمہ اللہ کی وفات کا حادثہ ایک ایسا نقصان عظیم ہے کہ جس کی تلافی ممکن نہیں۔ ایسے نازک وافسوسناک موقع پر آپ کا رنج والم اور فطری تاثر قدرتی چیز ہے مگر اس راہ سے کسی کو مفر؟ **کل نفس ذائقة الموت** کا فیصلہ حتمی ہے ہم سب ہی کو اس منزل سے گذرنا ہے۔ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یہ چند سطریں قلمبند کرتا ہوں۔ اس وقت حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے وہ اشعار جو انہوں نے عبدالرحمن بن مہدی کو ان کے صاحبزادے کی تعزیت میں تحریر فرمائے تھے۔ آپ کی خدمت میں پیش کرنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

إنی أعزیک لا اني علی طمع من الخلود ولکن سنة الدین

فما المعزي بباق بعد صاحبه ولا المعزی وان عاش إلی حین

میں تعزیت پیش کرتا ہوں مگر خلود کی لالچ میں نہیں، بلکہ اس لئے کہ یہ دین اسلام کا طریقہ ہے، نہ تعزیت کنندہ باقی رہنے والا ہے اس کے دوست کے بعد، نہ تعزیت کیا جانے والا، اگرچہ دونوں اجل مسمی تک زندہ رہیں۔

آپ کو رنج ہوگا کہ آپ یتیم ہو گئے، حضرت رحمہ اللہ کی وفات بھی اپنے وطن اقامت سے دور ہندوستان کے ایک قدیم اور مشہور شہر بمبئی میں ہوئی، اور ملک میں ہی نہیں دنیا بھر میں وبائی حالات کی وجہ سے آپ حضرات کی جنازہ میں شرکت بھی ممکن نہیں تھی، اس لئے یہ غم پر غم مزید ہو گیا، مگر مومن کا سب سے بڑا ہتھیار صبر ہے۔ کسے خیال تھا کہ دیوبند کی سرزمین علم وعمل پر اپنی زندگی کی قیمتی عمر خدمت علم میں صرف کرنے والا یہ بحر علوم بمبئی کی زمین میں آسودۂ خواب ہوگا۔

اس وقت رہ رہ کر مرحوم کی خوبیاں یاد آرہی ہیں۔ مرحوم نے اپنے پیچھے قیمتی تصانیف، باصلاحیت تلامذہ اور علماء اور حفاظ کی حامل آپ جیسی اولاد چھوڑیں، جو ان کے لئے یقینا صدقہ جاریہ ہیں۔

خود بھی ایصال ثواب کیا اور دوستوں کو بھی تاکید کی۔ اللہ تعالی مرحوم کے ساتھ اپنی خصوصی رحمت کا معاملہ فرمائے، اور ہم سب ناقدروں کی طرف سے بہتر سے بہتر بدلہ نصیب فرمائے، اور جملہ پسماندگان کو خصوصا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

حضرت کے چند اوصاف وکمالات

مرحوم بڑے صفات کے مالک تھے۔ علم وسیع، نظر میں گہرائی وگیرائی، دور حاضر کے محقق، منجھے ہوئے مصنف ومؤلف، کہنہ مشق استاذ، علم مستحضر، حاضر جوابی میں یکتا اور فرد فرید، خطابت میں بھی بے نظیر فرقۂ باطلہ کے رد میں بے مثال معلومات کے حامل حق گوئی میں لاثانی، بڑے سے بڑے کے سامنے جو کہنا ہوتا تھا کہہ دیتے تھے۔ شان استغناء میں اسلاف کے حقیقی جانشین۔ تفسیر وحدیث اور فقہ میں کمال صلاحیت کے ساتھ جملہ علوم وفنون کے ماہر تھے۔ تحریر انوکھی، انداز خطابت نرالا، سوالات کے جوابات ہر وقت حافظہ میں محفوظ، دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس جیسے گوناگوں اوصاف وکمالات کے مالک۔ ع

خدا بخشے بڑی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

تصنیفی خدمات

حضرت رحمہ اللہ جید الاستعداد تھے۔ فراغت کے بعد راندیر کے زمانۂ تدریس ہی میں جب کہ آپ کی عمر میں سال سے زائد نہ تھی، نہ صرف یہ کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا علوم کا مطالعہ شروع فرمایا، بلکہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے علوم کی تسہیل کا آغاز کیا، یہ حوصلہ ہر کوئی نہیں پاتا، یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کا علم گہرا، استعداد میں پختگی کے ساتھ محنت و مطالعہ کا ذوق ہو۔

اسی زمانہ میں آپ نے فقہ کے ایک مشکل مسئلہ ''حرمت مصاہرت'' پر تفصیلی مواد جمع فرمایا۔ اور امکانی حد تک مسئلہ کے تمام گوشوں پر کلام فرما کر مسئلہ کو واضح فرمایا۔ مسئلہ پر آخری نظر'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

اللہ کے فضل و کرم سے مسئلہ کے تمام گوشوں پر مفصل بحث کی جا چکی ہے، یہاں ایک مرتبہ پھر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دقیق اور دور رس نگاہ نے حرمت مصاہرت کے ثبوت کی ایک عمدہ علت نکالی ہے کہ تمام آیات، احادیث و آثار بے تکلف اس پر ٹھیک منطبق ہو جاتے ہیں، البتہ دیگر ائمہ کرام رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے مذہب پر بہت سے آثار اور احادیث کو ترک کرنا پڑے گا''۔ (حرمت مصاہرت ص ۸۰)

اسی طرح اصول تفسیر کے مشہور رسالہ ''الفوز الکبیر'' کی شرح 'العون الکبیر' لکھی۔ علامہ طاہری کی ''المغنی'' کی عربی شرح تالیف فرمائی۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے علوم کو سمجھنا بھی ہر کسی کے لئے آسان نہیں ہے، بڑے غور و تدبر سے مطالعہ کرنے والا ہی سمجھ پاتا ہے، تاہم بعض مواقع پر صاحب استعداد بھی ہمت ہار جاتا ہے۔ حکیم الامت رحمہ اللہ کے فتاوی جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایک بے نظیر مجموعہ ہیں، اور اس صدی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہیں۔ ان میں تفسیر و حدیث اور فقہ کے ساتھ فرقۂ باطلہ کا رد، تزکیہ کے اصول، جدل و مناظرہ کے قواعد اس قدر جمع ہو گئے ہیں کہ یہ ایک کتب خانہ کے قائم مقام ہو گیا ہے۔ حضرت رحمہ اللہ نے اس پر حاشیہ کا کام شروع فرمایا مگر کچھ تو اپنی

مشغولی اور بعض ایسے اسباب جن کا اظہار مناسب نہیں ہے کی وجہ سے اس حاشیہ کا کام بند ہوگیا یا بند کرنا پڑا۔ اس حاشیہ میں آپ نے عربی عبارات کی تصحیح، مجمل مضامین کی تشریح، دقائق کی توضیح، کہیں کہیں حوالہ منتشر مسائل کی نشاندہی، کہیں تشنگی تھی تو تکمیل، بعض طویل عبارتوں کی تلخیص، فارسی فتاوی کی اردو میں ترجمانی، بعض متعلقات کے اضافے، بعض مواقع پر تسامح پر تنبیہ، ایک جگہ حاشیہ قدیمہ پر جرح، بعض عبارتوں پر اس سے زیادہ مناسب عبارتیں وغیرہ کا قابل رشک کارنامہ انجام دیا، **فجزاہ اللہ تعالی احسن الجزاء۔**

اب ماشاء اللہ حضرت مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب مدظلہ نے اس پر مثالی کام کرکے مکمل فتاوی پر مفید حواشی لکھ کر طبع فرما دیا ہے، جو یقیناً ایک قابل فخر خدمت ہے، اللہ تعالی انہیں بھی اس عظیم خدمت کا دارین میں بہترین بدلہ نصیب فرمائے۔

حضرت رحمہ اللہ کو اللہ تعالی نے یقیناً فقہ میں بصیرت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ الفتاوی‘‘ اور فتاوی دارالعلوم دیوبند پر آپ کے مفید حواشی قابل مطالعہ ہیں۔ بعض جگہوں پر کسی مسئلہ میں حکیم وڈاکٹر سے رجوع کی ضرورت محسوس فرمائی تو ماہر حکیم صاحب سے رجوع کر کے مسئلہ کو واضح کیا۔

فتاوی دارالعلوم دیوبند کی آخری غالباً چھ جلدوں پر آپ نے نظر ثانی فرمائی، اور ضروری مواقع پر بڑا مفید اور پر مغز کلام فرما کر اپنی فقہی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

’’بخاری شریف‘‘ اور ’’ترمذی شریف‘‘ پر جو تقریر شائع ہے۔ بعض امور میں کئی شروحات سے فائق ہیں۔ باب کے شروع میں مسئلہ کی حکمت اس انداز سے بیان فرمائی ہے کہ قاری کے سامنے باب اور مسئلہ کی نوعیت آجاتی ہے، اور مسئلہ پر ایک طرح کی بصیرت سے واقفیت کے بعد دوسرے مباحث کا مطالعہ دلچسپ بن جاتا ہے۔ بخاری اور ترمذی کی شرح میں آپ نے دوسری شروحات کی نری تقلید اور نقل کا طریقہ نہیں اپنایا، بلکہ بہت معتدلانہ کلام فرمایا، نہ اس قدر طویل کے پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس کرے، اور نہ اس قدر مختصر کے مطلب کو سمجھنے میں

دشواری ہو۔اور حل کتاب میں تو یہ دونوں شروحات لا جواب ہیں،عبارت معرب، ترجمہ، اور باب کے شروع میں کام کی باتیں، اختلاف ائمہ اور اپنے مسلک کی برتری اور اس پر بضرورت دلائل کا اضافہ اور دوسرے مسالک کے دلائل کے جوابات بڑے سلیقہ اور ایک مرتب انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔بعض مواقع پر حدیث کی تشریح میں اپنی رائے بھی دی ہے،اور یقیناوہ آپ کی حدیثی مہارت کی بین دلیل ہے۔

کہیں کہیں دوران درس اپنے حالات بھی ذکر کئے ہیں،اور اپنے اساتذہ کے حالات یا ان کے ملفوظات بھی سنائے کئی جگہوں پر علامہ بلیاوی رحمہ اللہ کے قیمتی اور مختصر جملے نقل فرمائے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغۃ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی بڑی معرکۃ الآراء تصنیف ہے،اس میں فقہ الحدیث اور اسرار شریعت کا نہایت عمدہ بیان ہے،حضرت رحمہ اللہ نے اس کی بڑی مفصل شرح تحریر فرمائی، جو ہزاروں صفحات پر پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہے۔دوصدی سے امت پر ایک قرض تھا جو حضرت رحمہ اللہ نے ادا فرمایا۔ چند اکابر پہلے بھی اس کی شرح کی تمنا لئے ہوئے غریق رحمت ہوئے مگر اللہ تعالی نے یہ کام آپ کے مقدر میں طے کرر کھا تھا، جو الحمد للہ بڑی کامیابی سے وجود میں آیا، **فجزاہ اللہ تعالی احسن الجزاء**۔

اللہ تعالی کا خاص فضل بھی ہوا کہ آپ کے قلم سے ایسی تصانیف وجود میں آئیں جن کا بار بار مطالعہ کیا جاتا ہے۔کتنے اکابر کی بہترین تصانیف ہیں جنہیں ایک بار مطالعہ کے بعد قاری رکھ دیتا ہے مگر حضرت رحمہ اللہ کی اکثر تصانیف ایسی ہیں جو روزانہ مطالعہ میں رہتی ہیں،اور بار بار شائع ہو رہی ہیں۔

پھر اپنی بات پر اڑ جانے کی عادت بھی نہیں تھی، بلکہ جہاں حق واضح ہوتا تو رجوع فرمالیتے ’’حدیث جساسہ میں پہلے آپ نے ایک کلام کیا،اور ایک محشی کے دلائل سے متأثر ہو کر اس حدیث پر ایک حکم لگایا، پھر اہل علم کے توجہ دلانے پر مسئلہ کی غلطی واضح ہوگئی تو رجوع فرما کر ایک تحریر بھی شائع کردی۔

حق گوئی میں علماء دیوبند کے حقیقی وارث

حق گوئی میں حضرت رحمہ اللہ اپنے اسلاف کے حقیقی جانشین اور علماء دیوبند کے صحیح وارث تھے۔ مداہنت وخودساختہ مصلحت سے ان کی زندگی پاک تھی، بروقت بڑے بڑے سے آدمی کو بھی جو کہنا ہوتا تھا وہ کہہ دیتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وصف صرف علم سے نہیں بلکہ عمل اور اللہ تعالی سے ایک خاص تعلق اور یقین کی صفت سے متصف ہی شخصیت کا خاصہ ہے۔

اہل علم ہوں یا اہل خانقاہ، اہل تمول ہوں یا اہل تبلیغ کسی سے مرعوب نہ ہوکر بلاخوف ولومۃ لائم آپ نے احقاق حق کا فریضہ انجام دیا۔ بلکہ آج سے چندسال پہلے تک اکابر علماء کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ دعوت وتبلیغ کی بے اصولی، اور بے انتہا غلو، اور بیانات میں بے احتیاطی پر کچھ لب کشائی کریں مگر حضرت رحمہ اللہ نے صرف دارالعلوم کی مسند حدیث پر جلوہ افروز ہوکر درس میں بلکہ عمومی بیانات اور علمی واصلاحی مجالس میں کھل کر تنقید کی، اور ان کی غلطیوں کو ڈنکے کی چوٹ اجاگر کیا، جس سے دوسرے اہل علم کو بھی کچھ نہ کچھ ہمت ہوگئی۔

دورحاضر کے بگڑے ہوئے خانقاہی نظام، اور غیر مستند واقعات، اور اولیاء کی من گھڑت کرامات، اور تصوف کے نام پر دنیا کمانے والے صوفیوں پر بھی جو کہہ سکتے تھے ذرہ برابر دریغ نہیں فرمایا۔ مثلا فرماتے تھے کہ: حدیث کا کتب حدیث میں ہونا ضروری ہے۔ بزرگوں کے ملفوظات میں حدیث ہواور کتب حدیث میں نہ ہو اس کا اعتبار نہیں۔ اسی سلسلہ میں فرمایا: حکایات اولیاء کو آنکھ بند کر کے نہیں مان لینا چاہئے، اس کی تحقیق کی جائے یہ صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ انہیں یقیناً حق تھا کہ دارالعلوم اور جامعات اور مدارس کے نظام میں کوتاہی پر بھی تنقید کریں اور کی، مدارس میں تعمیرات پر توجہ اور تعلیم سے بے پرواہی پر بھی خوب نصیحتیں کیں اور تنقید بھی فرمائی۔ الغرض کسی شعبے کی کوتاہی سے بے اعتنائی نہیں برتی۔ اور یہ حضرت کے اخلاص اور للّٰہیت کی دلیل تھی کہ بڑوں بڑوں نے ان کی کڑوی باتیں سنیں، اور کسی کو حضرت رحمہ اللہ کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ومَجاز (بفتح المیم) نہیں، مُجاز (بضم المیم) ہے

ایک مجلس میں ایک عالم نے مفتی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے عرض کیا کہ: حضرت یہ مفتی صاحب حضرت مولانا مفتی صاحب رحمہ اللہ کے مجاز (بفتح المیم) ہیں، فورا فرمایا مجاز (بفتح المیم) نہیں، مجاز (بضم المیم) ہے۔ مجاز تو حقیقت کے مقابل ہوتا ہے، اور مجاز: اجاز یجیز کا اسم مفعول ہے، اجازت یافتہ۔

نوٹ: میں نے بعد میں ایک نجی مجلس میں تبصرہ کرتے ہوئے مزاحاً کہا کہ: اس زمانہ کے اکثر بزرگوں کے خلفاء مجاز ہی ہیں، مجاز کم ہی ہیں۔

اہل تبلیغ آپ کو دیوبندی کہتے ہیں؟ دیوبند سے انہوں نے کیا رابطہ رکھا؟

ایک مرتبہ ڈیوزبری کے مشہور تبلیغی مرکز میں تشریف لائے، وہاں کے ذمہ دار حضرات بھی شریک ہوئے، اور مرکز کے امیر حافظ صاحب رحمہ اللہ بھی موجود تھے کسی بات پر حضرت نے صاف صاف فرمایا: حافظ صاحب آپ اپنے آپ کو دیوبندی کہتے ہو؟ دیوبند کب آتے ہو؟ اور دیوبند سے کیا رابطہ رکھا ہے؟ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ کے بعد آپ لوگوں نے دیوبند سے تعلق کم کرلیا اور اب تو بالکل ہی ترک کر دیا۔

اسی مجلس میں ایک صاحب آئے تو حافظ صاحب نے ان کا تعارف کرتے ہوئے کہا: یہ عورتوں کے شعبہ کے ذمہ دار ہیں، فورا فرمایا: عورتوں کا تبلیغی جماعت میں جانا تو جائز نہیں، اس پر ایک صاحب نے عرض کیا کہ آپ کی بات سے ہمیں تکلیف ہوئی، آپ نے فرمایا: میں نے شریعت بیان کی ہے، آپ کو شریعت کے بیان سے تکلیف ہوتی ہو تو اپنے ایمان کی خبر لے۔

آج کل کے تعزیتی جلسے ناجائز ہیں

ہمارے معاشرے میں ہی نہیں بلکہ ہمارے دینی اداروں اور جامعات تک میں تعزیتی جلسوں کا رواج بہت زور پکڑ گیا ہے، کس کی مجال ہے کہ تنقید کرے، فوراً اس کے بارے میں اکابر کے مخالف ہونے کا فتوی لگ جاتا ہے۔ کیا ہمارے اکابر اس طرح کے تعزیتی جلسے کرتے تھے؟ کیا انہوں نے تعزیتی جلسوں کے عنوان سے ہزاروں نہیں

لاکھوں روپے کا اسراف کیا؟ مرنے والے کی تعریف میں غلو کیا؟ اسٹیج پر بیٹھ کر تصاویر بنوائیں؟ حاشا وکلا، ہمارے اسلاف ان رسوم ورواج سے محفوظ اور بری تھے۔ یہ آج کے نام نہاد اکابر کا تو طریقہ ہوسکتا ہے۔ ان جلسوں میں جن میں لاکھوں روپیوں کا اسراف ہوں کون اسے جائز کہے گا؟ حضرت رحمہ اللہ نے اس غلط اور ناجائز رواج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنوں اور پرایوں سے بہت کچھ سنا مگر آپ کے پایہ استقامت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور راہ تنظیم سے نہ ہٹے۔ اللہ کرے ہمارے اداروں اور علماء کو اس طرح کے اسراف اور فضول خرچی کے جلسوں سے توبہ کی توفیق نصیب ہو، مدارس کا مال اس طرح کے جلسوں کے لئے نہیں ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ: ہم اس جلسوں میں مدرسہ کا مال خرچ نہیں کرتے، ان سے میری درخواست ہے کہ: آپ ہی تو ترغیب دیتے ہیں، آپ اس طرح خرچ کرنے والوں کو کیوں ترغیب نہیں دیتے کہ بھئی یہ پیسے آپ بجائے اس طرح کے تعزیتی جلسوں اور حسن قرأت کے سیمناروں اور قرائت مسابقوں کے بجائے غریب اساتذہ کی تنخواہ کے اضافوں یا ان کے لئے ہدیہ یا اور کسی ضرورت کے کام میں استعمال کریں۔ یہ سب ریاء اور شہرت کے جلسے ہیں الا ماشاء اللہ۔

راقم نے اپنے مضمون میں اس طرح کی کئی تنقیدات کو ایک مستقل عنوان کے تحت جمع کر دیا ہے۔ راقم کی عادت ہے کہ صاحب علم کی مجلس میں کوئی علمی سوال پوچھوں، یا کوئی شبہ ہو تو ضرور پیش کروں، بعض لوگ اسے ناپسند بھی کرتے ہیں، لیکن ایسے اہل علم کی صحبت بار بار کہاں نصیب ہوتی ہے، اس لئے ان مواقع کو غنیمت سمجھ کر کوئی سوال کر لیا کرتا ہوں۔ حضرت رحمہ اللہ اس عاجز سے بہت محبت فرماتے تھے، اور حوصلہ افزائی کا معاملہ فرماتے، چونکہ باٹلی میں حضرت کا قیام ہمارے رفیق مفتی یوسف ساچا صاحب مدظلہ کے یہاں رہتا تھا، اس لئے ساتھ رہنے اور ان کے فیض سے مستفیض ہونے کے کئی مواقع ملے۔ ایک مجلس میں خادم سے فرمایا: بھئی! ''علمی خطبات'' لاو اور ایک نئے منگوا کر بھری مجلس میں صرف راقم کو عنایت فرمایا، ساتھ ہی چند جملے بھی ارشاد فرمائے، انہیں نقل کرنا مناسب نہیں۔

میں نے جب حضرت رحمہ اللہ کے علوم سے فائدہ اٹھا کر ''حدیث وسنت میں فرق'' نامی رسالہ لکھا، اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو مطالعہ فرما کر بڑی دعائیں دیں اور دیوبند جا کر خود اپنے مکتبہ سے شائع کروایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دارالعلوم کی تاریخی اور اکابر دیوبند کی یادگار مسند دارالحدیث میں ''بخاری شریف'' کے سبق میں اس عاجز کا نام لے کر اس رسالہ کے مطالعہ کی ترغیب دی۔ یہی وجہ بنی کہ دارالعلوم کے ایک استاذ محترم نے اس کے رد میں ''نقد ونظر لکھی، جب راقم کو وہ رسالہ ملا تو جواباً ''بحث ونظر لکھنا پڑا۔

ایک مجلس میں میں نے سوال کیا کہ حضرت: وہ سنت اور حدیث کے فرق کا اختلاف ابھی جاری ہے یا ختم ہوگیا؟ تو فرمایا: میاں وہ اختلاف علمی کہاں تھا؟ وہ تو سیاسی اختلاف تھا ختم ہوگیا، اور اب سب سنت وحدیث کا فرق مان گئے۔

کیا عورتوں کا گھر میں اعتکاف کرنا ثابت ہے؟

ایک مجلس میں میں نے پوچھا حضرت! ہمارے یہاں مسئلہ ہے کہ عورتیں مسجد میں اعتکاف نہ کریں بلکہ اپنے گھروں میں اعتکاف کریں، کیا حضرات صحابیات یا خیر القرون میں عورتوں کا گھروں میں اعتکاف کرنا ثابت ہے؟ فرمایا: آج تک نظر سے نہیں گذرا کہ صحابیات یا خیر القرون میں کسی عورت نے گھر میں اعتکاف کیا ہو۔

آپ کے کچھ حالات ومعمولات

حضرت رحمہ اللہ کے علمی شغل نے آپ کی عملی زندگی کو پوشیدہ رکھا، ورنہ آپ کو اللہ تعالی نے علم ظاہری کے ساتھ علم باطنی سے بھی مالا مال فرمایا تھا، اگرچہ آپ کا فطری ذوق علمی تھا اور تصوف سے زیادہ مناسب نہیں تھی، تاہم آپ ابتدا ہی سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ رمضان سہارنپور خانقاہ میں گزارتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ سے کمرہ یا گھر سے وضو کر کے مسجد جانے کی عادت تھی۔ اپنے اساتذہ کی خدمت بھی خوب کی، استاد کی خدمت کے لئے تہجد سے پہلے بیدار ہو جاتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک

مدرسہ سے معمولی بات پر آپ کا اخراج ہو گیا، بڑی منت وسماجت کے باوجود دوبارہ داخلہ نہ ہوسکا تو دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، یہ اخراج رحمت بن گیا کہ بعد میں دارالعلوم دیوبند میں استاذ اور شیخ الحدیث اور صدر مدرس کے منصب تک فائز ہوئے۔

اپنے استاذ حضرت علامہ بلیاوی رحمہ اللہ کے ساتھ مقبرہ قاسمی میں جایا کرتے تھے۔ اور سنت کے مطابق ایصال ثواب کا اہتمام فرماتے تھے، قبرستان کی حاضری میں بھی غلو اور قبروں پر مراقبہ وغیرہ کرنے کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس پر کھل کر نکیر بھی فرمائی۔

عاجزی کا انداز اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یوم الشک کا روزہ نہیں رکھتے تھے، اور اپنے آپ کو عوام میں سمجھتے تھے کہ خواص کو اس کی اجازت ہے۔ یہ بھی تواضع کی بات ہے اپنے شاگرد کے فتوی کو اپنی تحقیق میں بطور دلیل پیش کیا جھینگا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کی تحقیق میں اپنے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ کے فتوی کو بطور دلیل نقل فرمایا۔

پورے قرآن کریم کے رکوعوں پر غور فرمایا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک جگہ سورۂ واقعہ کے پہلے رکوع کا نشان قابل اشکال ہے، بقیہ تمام رکوع صحیح جگہوں پر لگائے گئے ہیں۔

احرام ہوائی جہاز سے پہلے باندھ لیتے تھے مگر نیت ہوائی جہاز کے چلنے کے بعد کرتے تھے۔ حرمین شریفین میں عورتوں کو نماز کے لئے مسجد لے جاتے تھے۔ عرفات میں جمع بین الصلوتین کے قائل تھے۔ ریل اور ہوائی جہاز میں بعض اعذار کی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک پر عمل فرماتے اور نماز نہ پڑھتے تھے، بعد میں نماز کی قضا فرمالیتے۔ فرماتے تھے کہ تکبیر تشریق نفلوں کے بعد بھی پڑھنی چاہئے اور میں پڑھتا ہوں۔

اشعار کا ذوق نہیں تھا، طالب علمی کے زمانہ میں خوب اشعار یاد کئے مگر اپنے استاد کی نصیحت پر اس سے دوری اختیار فرمالی۔

برطانیہ میں رویت ہلال کے موضوع پر بیان کرنے سے باہر کے آئے ہوئے اکثر خطباء ہی نہیں اکابر علماء بھی گریز کرتے ہیں، مگر حضرت رحمہ اللہ نے کئی اسفار میں اس موضوع پر کھل کر بیان فرمایا، اور اپنا موقف صاف صاف ظاہر فرمایا۔ آپ کو قطعا اس کا خوف نہ تھا کہ کوئی میری عزت کرے یا توہین۔ ایک دو واقعات اس طرح کے ناخوش گوار پیش بھی آئے مگر آپ نے اظہار حق میں مداہنت گوارہ نہ فرمائی۔ اور ایسا ہوا بھی کہ بعض شہروں میں حضرت کا تشریف لے جانا ہوا، تو وہاں کے بعض اکابر علماء اس مسئلہ میں اختلاف کی وجہ سے ملاقات تک کے لئے نہیں آئے مگر اس سے حضرت کا کیا نقصان ہوا۔

رنگون میں بدھ مذہب کا ایک بڑا مندر بنا ہوا ہے، لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے جاتے ہیں، حضرت سے بھی اسے دیکھنے کی درخواست کی تو انکار فرمادیا۔

بلامعاوضہ تدریسی خدمات

اللہ تعالیٰ نے مالی اعتبار سے وسعت عطا فرمائی تھی، اس لئے کسی کے محتاج نہ تھے، بلکہ ایک مرتبہ برطانیہ کے سفر میں جس میں اہل مال کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد حاضر تھی بہت صاف صاف فرمایا: آپ لوگ یہ خیال نہ کرنا کہ میں یہاں پیسوں کے لئے آتا ہوں، الحمد للہ ہزاروں روپیہ زکوۃ کی رقم خود نکالتا ہوں۔ دارالعلوم میں تدریسی خدمت للہ فی اللہ انجام دی، اور تنخواہ لینے کی نوبت کم ہی آئی، بلکہ شروع کے سالوں میں جو تنخواہ لی تھی وہ بھی واپس کردی۔

اخیر میں اس بدوی کے دوشعروں پر تعزیتی عریضہ ختم کرتا ہوں جو انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی وفات پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سنائے تھے ممکن ہے کہ آپ کے لئے یہ اشعار سامان تسلی بنیں

اصبر نکن بک صابرین فانما — صبر الرعیۃ بعد صبر الراس
خیر من العباس اجرک بعدہ — واللہ خیر منک للعباس

آپ صبر کیجئے تو ہم بھی آپ کی اتباع میں صبر کریں گے، کیونکہ رعایا اس وقت صبر کرتی ہے جب بادشاہ صبر سے کام لے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے انتقال کے بعد آپ کا اجر زیادہ باعث خیر ہے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے مقابلہ میں آپ کے لئے اللہ زیادہ بہتر ہے۔ فقط والسلام۔

حضرت رحمہ اللہ نے جس سادگی سے زندگی گذاری اسی سادگی سے موت کا سفر بھی فرمایا کرونا کی وباء اور کرفیو کا سماں، اس حالت میں چل بسے کہ نہ لوگوں کو جنازہ میں شرکت کا موقع تربیت کے لئے جانا ممکن۔ عجیب بات ہے کہ حضرت رحمہ اللہ نے آج کل کے اسراف اور فضول خرچی پر مشتمل تعزیتی جلسوں پر بلاخوف اور کھل کر نکیر فرمائی، اور اہل علم کے اس غیر مناسب ہی نہیں بلکہ ناجائز عمل پر تنقید کا حق ادا کر دیا۔ اللہ تعالی نے مرحوم کو ایسے وقت میں اپنے پاس بلایا کہ کوئی شور و ہنگامہ، نہ جمع کی کثرت، اور نہ تعزیتی جلسوں کی گنجائش، رحمه الله رحمة واسعة۔

سفر کی موت شہادت کی موت ہے

موت کا حادثہ بھی اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور پیش آیا، غریب الوطنی کی موت خود باعث فضیلت، یہ بھی اللہ تعالی کی نرالی شان ہے کہ جس شخصیت کی زندگی کے قیمتی ایام دیوبند جیسے مشہور اور تاریخی قصبہ میں اور دارالعلوم جیسے مرکزی ادارہ میں دین کی آبیاری اور اشاعت دین وعلم میں گذرے، موت کے لئے سینکڑوں میل دور کا سفر کروا کر شہادت کی سعادت سے نوازا

دو چیز آدمی را کشد زور زور یکے آب و دانہ یکے خاک گور

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سفر کی موت شہادت کی موت ہے۔ (ابن ماجہ، باب ما جاء فیمن مات غریبا، کتاب الجنائز، رقم الحدیث: ۱۹۱۳) ایک اور حدیث میں سفر کی موت کی

فضیلت آئی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک صاحب کا مدینہ منورہ میں انتقال ہو گیا، جن کی ولادت بھی وہیں ہوئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، پھر فرمایا: کاش کہ ان کی موت اپنی جائے ولادت کے علاوہ کہیں اور ہوئی ہوتی۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں؟ آپ نے فرمایا: جب آدمی اپنی جائے ولادت کے علاوہ کہیں اور انتقال کرتا ہے تو اس کی جائے پیدائش سے اس کی موت کی جگہ تک جتنا فاصلہ ہے اتنی جگہ اس کو جنت میں (مزید) عطا کی جاتی ہے۔ (نسائی، باب الموت بغیر مولدہ، کتاب الجنائز، رقم الحدیث: ۱۸۳۱۔ ابن ماجہ، باب ماجاء فیمن مات غریبا، کتاب الجنائز، رقم الحدیث: ۱۹۱۴)

کئی مرتبہ خیال آیا کہ اگر حضرت کی وفات کا حادثہ دیوبند میں پیش آتا تو نہ جانے اپنے متعلقین اور تلامذہ کے علاوہ خلق خدا کی کس قدر بڑی تعداد جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کرتی، اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت تھی کہ ہزاروں تلامذہ کے اس محبوب استاذ کی جدائی پر چند افراد ہی شریک جنازہ ہو سکے۔

جنازہ میں کم شریک ہونے والوں کی تعداد کے چند تاریخی واقعات

کرونا وباء کی وجہ سے حضرت رحمہ اللہ کے جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بھی کم تھی، اس پر مجھے سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جنازہ کا منظر یاد آ گیا، خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد آپ کی نماز جنازہ صرف: ۱۷/ افراد نے پڑھی ہے۔ (سیر الصحابہ ص ۲۲۱)

اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں ایک مختصر سی جماعت شریک تھی، اس لئے کہ آپ کا حادثہ وفات مدینہ منورہ سے کچھ فاصلہ پر زبدہ کے مقام پر ہوا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشن گوئی کے مطابق ایک قافلہ نے ان کی تدفین و تکفین کا انتظام کیا۔ (سیر الصحابہ، ج ۲، حصہ ۳)

حضرت علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کا جنازہ بھی ایسا ہی ہوا کہ دو ہم سفر رفقاء نے ان کی نماز ادا کی۔ بصرہ آباد

ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عتبہ بن غزوان کو یہاں کا حاکم بنایا تھا، چند دنوں کے بعد انہیں معزول کر کے حضرت علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کو ان کی جگہ مقرر کیا، اور ان کو تحریر فرمایا کہ: فوراً بحرین چھوڑ کر بصرہ کا انتظام سنبھالو، اس حکم پر حضرت علاء حضری رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بصرہ روانہ ہو گئے لیکن فرمان خلافت کے ساتھ ہی پیام اجل بھی پہنچ گیا، اور راستہ میں مقام ''لیاس'' میں انتقال فرما گئے۔ یہ مقام آبادی سے دور اور بے آب و گیاہ تھا، پانی کی بڑی قلت تھی، حسن اتفاق سے بارش ہوئی تو ساتھیوں نے بارش کے پانی سے غسل کا انتظام کیا، اور تلوار سے گڑھا کھود کر قبر تیار کی۔ اس طرح بحرین و بصرہ کے حاکم اس بے سرو سامانی کے ساتھ ایک بے آب و گیاہ میدان میں سپرد خاک کئے گئے۔ (سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم ص ۱۷۵۔ جلد ۴، حصہ ہفتم)

حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ مشرکین کی قید میں گرفتار تھے کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ اور آپ کسی طرح قید سے رہا ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے مگر معاہدہ کی بناء پر واپس کئے گئے، پھر راستہ میں جو واقعہ پیش آیا وہ تاریخ میں محفوظ ہے بالآخر مدینہ منورہ سے دور ایک ساحلی مقام پر قیام کیا، اور رفتہ رفتہ یہ جگہ مظلوم مسلمان جماعت کی پناہ گاہ بن گئی، کچھ عرصہ بعد آپ نے اس آزاد گروہ کے بارے میں پیغام بھیجا کہ حضرت ابو جندل اور حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہما ہمارے پاس آجائیں اور دوسرے حضرات اپنے اپنے گھروں میں واپس چلے جائیں، یہ گرامی نامہ ایسے وقت پہنچا کہ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ بستر مرگ پر تھے، خط مبارک ہاتھ میں لے کر پڑھتے پڑھتے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھا کر اسی ویرانہ میں سپرد خاک کیا۔ اس ویرانہ میں نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کوئی زیادہ نہیں تھی۔ (سیر الصحابہ ص ۲۵۹ جلد ۴، حصہ ہفتم)

اور تو اور حضرات شہدائے کربلا رضی اللہ عنہم پر نماز جنازہ پڑھنے والے کیا ہزاروں تھے؟ ان کے علاوہ

سینکڑوں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین غزوات کے سفر میں شہید ہوئے، وہاں کوئی بڑی تعداد نماز جنازہ میں شریک نہیں تھی۔

اسی طرح صلحاء اور اولیاء کے نہ جانے کتنے بزرگ اور علماء حج وعمرہ اور حصول علم کے مبارک سفر میں وفات پا گئے، ان کی نماز میں شریک ہونے والے بھی تھوڑے سے ہی افراد تھے۔ تاریخ میں ایسے کئی بزرگوں کے حالات مذکور ہیں جو بحری جہاز میں انتقال فرما گئے، ان کی نماز بھی چند حضرات نے پڑھی۔

رمضان میں موت کی فضیلت

پھر اللہ تعالی نے اپنے پاس بلانے کے لئے مہینہ بھی رمضان کا منتخب فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کی موت رمضان المبارک میں ہو وہ جنت میں داخل ہوگا، جس کی موت عرفہ کے دن ہوجائے وہ جنت میں داخل ہوگا، جس کی موت صدقہ کے موقعہ پر (یعنی صدقہ خیرات کے بعد ہو) وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (ابونعیم شرح الصدور ص ۱۴۳ شمائل کبری ص ۲۴۶، جلد دہم مطبوعہ: زمزم پبلیشرز، کراچی) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ماہ رمضان میں مرنے والوں سے عذاب قبر اٹھالیا جاتا ہے۔ (شمائل کبری ص ۱۶۴، جلد دہم)

عمر کی یہ سعی مسلسل کارگر ہوتی گئی
زندگی لحظہ بلحظہ مختصر ہوتی گئی
سانس کے پردے پر یوں بجتا رہا ساز حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

مرغوب احمد لاجپوری

۱۶ر شوال المکرم ۱۴۴۱ھ مطابق: ۲۸ر مئی ۲۰۲۰ء، پیر

تعزیت نامہ

حضرت مولانا محمد یوسف قاسمی صاحب
جامعہ نور العلوم گٹھامن

بخدمت عالی حضرت المحترم مولانا مفتی امین صاحب زید لطفکم وصاحب زادگان حضرت قدس سرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت قدس سرہ کی وفات حسرت آیات ایک فرد، ایک خاندان، ایک ادارہ، ایک ملک کا حادثہ نہیں ہے بلکہ عالم اسلام اور اکیسویں صدی کا حادثۂ کبری ہے۔

وماهلك قيس هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

اس حادثۂ فاجعہ نے علماء کرام کی کمر توڑ دی، عالم اسلام کو یتیم بنا دیا، اہل علم حضرات میں آہ و نالہ کا شور ہے، ہر سمت اداسی مردنی چھائی ہوئی ہے لیکن موت انسانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جہاں ہر انسان قدرت خداوندی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یہ وہ مقام ہے جس سے دنیا کے ہر نفس کو موت کی آغوش میں جانا ہوگا اور کسی کو اس سے مفر نہیں۔

کیا پیمبر، کیا نبی، کیا ولی اور کیا فقیر　　　سب کو ہے **منها خلقنا کم** کا صدمہ ایک دن

حضرت قدس سرہ کی موت ایسی موت ہے جس کے رونے کے لئے آنسوں نہیں اور اظہارِ غم کے لئے قلم کو یارا نہیں سچ تو یہ ہے کہ ایک ایسی زندگی زندگی اور موت موت ہے۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لئے

حضرت قدس سرہ نے لاریب زندگی بھر دین حق اور خلق خدا کی خدمت کی، سالہا سال دارالعلوم دیوبند میں علوم نبویہ کی تدریس وتعلیم کے ساتھ بھولی بھٹکی مخلوق خدا کو صراط مستقیم پر لانے کی جدوجہد کی، اندرون ملک وبیرون ملک آپ نے سفر کئے اور خدا ہی جانتا ہے کیا کیا صعوبتیں اس راہ میں برداشت کی، آپ کا فیضان پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، علاقۂ پالن پور میں جامع نورالعلوم گٹھامن کا ہمہ جہت فیض بھی حضرت قدس سرہ کی توجہ وبرکات کا اثر ہے، یہ ادارہ بھی حضرت قدس سرہ کے لئے یقیناً عظیم صدقہ جاریہ ہے۔

سنے کون ہائے صدائے دل
ہائے کس کو ملے گی شفائے دل

وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل
وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ہم خدام جامعہ نورالعلوم گٹھامن (پالن پور) آپ تمام حضرات سے تعزیت کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالی حضرت قدس سرہ کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عنایت فرمائے اور آپ تمام حضرات کو نیز حضرت کے محبین ومتعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

حزین وسوگوار:
محمد یوسف عفی عنہ
خادم جامعہ نورالعلوم گٹھامن
۲۸؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

تعزیتی پیغام

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب
ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ مقبول مدرس، صاحب نظر مصنف اور ایک عظیم محقق تھے، انھوں نے نصف صدی سے زیادہ درس نظامی کی منتہی کتابوں کا درس دیا، اور طویل عرصہ تک بخاری اور ترمذی جیسی حدیث کی اہم کتابیں نہایت کامیابی کے ساتھ پڑھائیں، پوری دنیا میں ان کے تلامذہ مختلف جہتوں سے دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں، عام طور پر تدریس کے پیشہ سے وابستہ اہل علم تصنیف وتالیف کی طرف کم توجہ کر پاتے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو دوہری صلاحیت کا امتزاج بنایا تھا، انھوں نے اکثر اسلامی اور عربی علوم پر قلم اُٹھایا، بخاری شریف اور ترمذی شریف کی بہت سی اردو شرحیں برصغیر میں لکھی گئی ہیں؛ لیکن اس سلسلہ میں ان کی کاوش کو جو قبولیت حاصل ہوئی، کم ہی کسی دوسرے مصنف کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی، مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' اپنے موضوع پر ایک بےنظیر مگر دقیق کتاب سمجھی گئی ہے، آپ نے بہت خوش اسلوبی کے ساتھ اس کی شرح فرمائی ہے، جس نے اس سے استفادہ کو آسان کر دیا ہے، انھوں نے ہدایت القرآن کے نام سے قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر لکھی ہے جو اساتذہ وطلبہ اور عام اصحاب ذوق کے لئے فہم قرآن کی بہترین کلید ہے، درس وتالیف کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں میں ان کے خطابات بھی ہوا کرتے تھے، اور ان کے بیانات پر بھی علمی رنگ حاوی ہوتا تھا، وہ واقعی علوم اسلامی کے دُرِّ تابندہ تھے، ان کی وفات سے پوری علمی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور امت کو ان کا بدل عطا کرے۔

تعزیتی پیغام

حضرت مولانا سید رابع صاحب حسنی ندوی
ناظم دارلعلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

انا للہ و انا الیہ راجعون، یہ بہت ہی المناک خبر تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوئی کہ حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری جو دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور وہاں کے بڑے استاد تھے، اور ان کی وجہ سے علم و دین کا وقار قائم تھا، لوگ ان سے مستفید ہورہے تھے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے پہلے ان کی بیماری کی خبر سنی تھی، امید کرتے تھے کہ اللہ تعالی ان کو عمر دراز عطا فرمائیں گے لیکن منظور یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو بلا لیا، انہوں نے اعمال حسنہ اور دینی خدمات کا کام خوب انجام دیا اللہ تعالی ان کو اس کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے متعلق ان کا نعم البدل عطا فرمائے، ادھر کافی مدت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ معتدل شخصیات جن سے امت کو بڑی تقویت حاصل تھی، وہ اس دنیا میں نہیں رہیں، اللہ تعالی ہم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے، ان کے جو کام ہیں انہوں نے جو خدمت انجام دی ہیں اس کو ہم یاد کر کے اس سے فائدہ اٹھائیں، خاص طور وہ طلبہ جنہوں نے ان سے علم حاصل کیا اور امسال کے فارغین طلبہ ان کی تدریس کا جو اختتام تھا وہ بھی عجیب ہوا ہے، طبیعت پر اس کا بڑا اثر ہوا کہ وہ دعا نہ کرا سکے، اللہ تعالی ہر چیز مقدر کرتا ہے، ان سے ہمارا اچھا تعارف تھا مدرسہ کی بنیاد پر بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی اور ان سے بڑا اقرب بھی معلوم ہوتا تھا اور ان سے ایک تعلق معلوم ہوتا تھا اللہ تعالی ہم سب کو ان کے نقصان اور تلافی کی توفیق عطا فرمائے، ہم ان کے پسماندگان سے تعزیت پیش کرتے ہیں۔

❀ … ❀ … ❀

آہ مفتی سعید احمد پالن پوری

مولانا مفتی شعیب اللہ خان صاحب
مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

انا للہ و انا الیہ راجعون بہت بہت افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگ ایسی عظیم شخصیت سے محروم ہو گئے، جن کا علم نہایت عمیق، جن کا تفقہ مسلم، جن کی ادا بڑی مستند، جن کی گفتگو نہایت واضح، جن کی زندگی قابل تقلید اور جو مسلک اہل سنت کے داعی اور مستند شارح، سنت کے سچے عاشق اور بدعات سے نفور تھے، جن کی مجلس علم و تفقہ کا معدن تھی، جن کی زبان شیریں مگر باطل کے لئے تلوار تھی، جو ہر علم و فن میں یکتائے روزگار تھے، جو دار العلوم دیو بند کی مسند حدیث کی زینت تھے اور دار العلوم ان کی زینت تھا۔ آہ! وہ لاکھوں چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر ہنستے ہنستے اپنے مالک حقیقی کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔

دعاء ہے کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور بلند درجات سے نوازے اور آپ کے اہل خانہ و متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے اور آپ کے علمی و روحانی فیوض و برکات کو بقاء و دوام عطا کرے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین یارب العالمین۔

احقر شعیب اللہ خان
مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
۱۹ رمئی ۲۰۲۰ - ۲۵ ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

❁ ... ❁ ... ❁

تعزية

بسم الله الرحمن الرحيم

تعزية في وفاة فضيلة الشيخ المحدث / سعيد أحمد البالنبوري - رحمه الله

إلى طلاب الشيخ / سعيد البالنبوري - رحمه الله - وكذلك إلى محبيه وزملائه - حفظهم الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد

فقد بلغنا نبأ وفاة فضيلة الشيخ المحدث / سعيد بن أحمد البالنبوري - رحمه الله - فدمعت العين وحزن القلب، ولا نقول إلا ما يرضي ربنا: إنا لله وإنا إليه راجعون.

وأقول لجميع طلابه ومحبيه وزملائه من المشايخ: أحسن الله عزاءكم وأعظم أجركم وأنزل عليكم الصبر في هذا المصاب، وأسأل الله أن يعوض الامة خيرا.

وأقول لطلابه وطلاب العلم في القارة الهندية: اللهَ اللهَ في الجد في التحصيل وطلب العلم، وضبط العلم إتقانه والسعي في حفظه، فإن ذهاب العلماء يحملكم مسؤولية الاستعداد بما ذكر وغيره للقيام بالمسؤولية من بعدهم.

اللهم اغفر لعبدك / سعيد البالنبوري، وارحمه وأسكنه الفردوس الاعلى من الجنة واجعله مع الذين أنعمت عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين، آمين.

وكتب الفقير إلى الله تعالى: عامر بن محمد فداء بهجت

المدينة النبوية في السادس والعشرين من شهر رمضان المبارك لعام ١٤٤١ھ

❁...❁...❁

تعزية

الشيخ براء حنبلی حفظه الله ترکی

السلام عليكم ورحمة الله تعالی وبرکاته

معكم محمد براء الحنبلي الدمشقي من طلباء الشيخ و خدامه

فقد اكرمني الله سبحانه وتعالى عن حيثت بشرف خدمت مولنا الشيخ الحجه العالم المحدث الفقيه مولانا الشيخ سعيد احمد البالنبوری في مدت زيارته في تركيا حيث اكرمنا الله سبحانه و تعالی بقرأت المؤطاء بروية الامام محمد وقرأت الثلاثية لامام البخاری واليوم وفي صباح هذا اليوم فجئة الامة الاسلامية بعصرها خبر وفات الشيخنا و سيدنا مولنا الشيخ سعيد احمد البالنبوری فقط صرما اهل الاسلام ظلمة بوفات هذا الامام العامر العامل۔

نسئل الله سبحانه تعالى أن يجعله الله في الفردوس الاعلى مع الحبيب المصطفى علة و نعذ ابنائه واحبابه وطلبه و نعذ الامة الاسلامية بعصرها بوفاته ولانقول الامايرضي الله سبحانه و تعالی ان لله وانا اليه راجعون ولاحول ولاقوة الا بالله العلی العظيم۔

اللهم انا نسئلک ان ترفع عن شيخنا عن تذيهنا عن شيخنا عذاب القبر وعن تجعل قبرهروضة من روض الجنة اللهم اغسله ماء والثلج و البرد، ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس اللهم الوسع في مدخله اللهم مدله في بصره

❀...❀...❀

باب دوم:

حالاتِ زندگی

حیاتِ سعید کا مختصر خاکہ

حضرت مولانا مفتی محمد امین پالن پوری مدظلہ العالی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
تلخیص و اضافہ: ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی

اسم گرامی: (حضرت مولانا مفتی) سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا (یحییٰ) بن نور محمد (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند)

ولادت باسعادت: (محفوظ نہیں، اندازے سے) ÷ ۱۹۴۰/ ۱۳۶۰ھ۔

جائے پیدائش: کالیڑہ، ضلع: بناس کانٹھا، شمالی گجرات، آبائی وطن: ڈبھاڈ گاؤں کی نئ بستی مجاہد پورہ، رہائش گاہ: ڈبھاڈ کی سرحد میں، مستقل رہائش گاہ: محلہ اندرون کوٹلہ، دیوبند۔

تعلیم: (۱) مکتب کالیڑہ، اساتذہ: مولانا داؤد چودھریؒ، مولانا حبیب اللہ چودھریؒ، مولانا ابراہیم جونکیہؒ (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم آنند، گجرات) ہیں۔

(۲) دارالعلوم چھاپی، میں (چھ ماہ) اپنے ماموں: مولانا عبدالرحمن شیرؒ اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر ماموں کے ساتھ ان کے وطن جونی سیندھنی میں فارسی کی تکمیل ہوئی۔

(۳) پالن پور میں مصلح امت حضرت مولانا محمد نذیر میاںؒ کے مدرسہ میں عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں، حضرت مولانا مفتی محمد اکبر صاحب اور مولانا محمد ہاشم بخاریؒ آپ کے استاذ ہیں، جو بعد میں دارالعلوم

دیوبند میں استاذ ہوے۔

(۴) مظاہر علوم سہارن پور: ۱۳۷۶ھ تا ۱۳۷۸ھ حضرت علامہ صدیق احمد صاحب جموئیؒ، مولانا محمد یامینؒ صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری اور حضرت مولانا وقارعلی صاحب بجنوری رحمہم اللہ سے منطق وفلسفہ، نحواور دیگر علوم کی کتابیں پڑھیں۔

(۵) دارالعلوم دیوبند: شوال ۱۳۷۹ھ میں داخلہ لیا اور ۱۳۸۲ھ تک ہدایہ اولین، جلالین، الفوز الکبیر، تصریح، بست باب، شرح چغ مینی، رسالہ فتحیہ، شمسیہ، علم ہیئت کی کتابیں، مشکوٰۃ المصابیح، ہدایہ آخرین، تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں۔

اساتذہ: حضرت مولانا سیّد اختر حسین صاحب دیوبندی، حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلندشہری، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلندشہری، حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب کیرانوی، حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب، حضرت مولانا فخرالحسن صاحب مرادآبادی، حضرت مولانا محمد ظہور دیوبندی، حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادی، حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، حضرت مفتی مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندی، شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری رحمہم اللہ تعالیٰ۔

دورۂ حدیث شریف میں پہلی پوزیشن سے کامیابی حاصل ہوئی، صحیح مسلم میں نمبرات پینتالیس ہیں بقیہ ساری کتابوں میں پورے (صدفی صد) پچاس پچاس ہیں۔

۱۳۸۲ھ میں تکمیل افتاء میں داخلہ لیا، اسی سال شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصریؒ سے حفظ قرآن کا آغاز فرمایا اور اپنے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کو حفظ کرایا، اگلے سال ارباب انتظام نے فتویٰ نویسی کے لیے معاون افتاء کی حیثیت سے تقرر کیا، مستقل تقرر میں بعض لوگوں نے روڑے

اٹکائے تو حضرت علامہ بلیاویؒ نے فرمایا: ''مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اس سے اچھے آؤ گے''، چنانچہ نو سال بعد ۱۳۹۳ھ میں درجۂ وسطیٰ الف کے استاذ کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔

منصبِ شیخ الحدیث وصدر المدرسین: حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت اور معذرتِ تدریس کے بعد ۱۷؍ربیع الاوّل ۱۴۲۹ھ بروز چہارشنبہ مجلس تعلیمی نے صحیح بخاری جلد اوّل کی تدریس آپ سے متعلق فرمائی، اس کے بعد سے رجب ۱۴۴۱ھ تک آپ نے تیرہ سال بخاری شریف کا درس دیا، اس کے بعد اسی سال ۲۱؍شعبان المعظم کو مجلس شوریٰ نے پہلی نشست میں صدر المدرسین کا عہدہ تفویض فرماتے ہوئے دوسری نشست میں شرکت کی دعوت دی، الحمدللہ اس عہدے پر بھی وقار و تمکنت کے ساتھ وفات تک فائز رہے۔

زیر درس کتابیں: ۱-مسلم الثبوت، ۲-ہدایہ مکمل، ۳-سلم العلوم، ۴-ہدیہ سعیدیہ، ۵-جلالین مکمل، ۶-الفوز الکبیر، ۷-ملاحسن، ۸-شرح عقائد جلالی، ۹-مسامرہ، ۱۰-دیوان متنبی، ۱۱-میبذی، ۱۲-بیضاوی سورۂ بقرہ اور (پارہ ۲۱ تا ۲۵)، ۱۳-مشکوٰۃ المصابیح مکمل، ۱۴-نخبۃ الفکر، ۱۵-حسامی (بحث قیاس) ۱۶-سبعہ معلقہ، ۱۷-موطا مالکؒ، ۱۸-دیوان حماسہ، ۱۹-تفسیر مظہری (۱۶ تا ۲۰)، ۲۰-سراجی، ۲۱-نسائی، ۲۲-تفسیر مدارک (پارہ ۶ تا ۱۰)، ۲۳-موطا محمدؒ، ۲۴-ترمذی (جلد اوّل)، ۲۵-ابوداؤد، ۲۶-صحیح بخاری مکمل، ۲۷-مسلم (جلد اوّل)، ۲۸-مقدمہ ابن الصلاح، ۲۹-مناظرہ رشیدیہ، ۳۰-ابن ماجہ، ۳۱-طحاوی، ۳۲-حجۃ اللہ البالغہ۔

تدریس کے ساتھ ۱۳۹۵ھ اور ۱۴۰۲ھ میں دار الافتاء کی نگرانی اور فتویٰ نویسی کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کی نظامت: ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کی نظامت کا سہرا آپ کے سر تھا، مجلس کے قیام کے روز اول سے اپنی وفات تک آپ نے اس کو بحسن وخوبی انجام دیا اور زندگی کی آخری تقریر بھی ''ختم نبوت کے اثبات'' پر فرمائی۔

تصانیف: ۱-ہدایت القرآن (آٹھ جلد)، ۲-تحفۃ القاری (گیارہ جلد)، ۳-تحفۃ الالمعی (آٹھ جلد)، ۴-زبدۃ الطحاوی (عربی)، ۵-رحمۃ اللہ الواسعہ، ۶-تہذیب المغنی (غیر مطبوعہ)، ۷-افادات نانوتوی، ۸-افادات رشیدیہ، ۹-الفوز الکبیر (عربی)، ۱۰-العون الکبیر شرح عربی الفوز الکبیر، ۱۱-فیض المنعم، ۱۲-تحفۃ الدرر، ۱۳-حیات امام ابوداؤد، ۱۴-حیات امام طحاوی، ۱۵-مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویانِ کتب حدیث، ۱۶-مبادی الفلسفہ (عربی)، ۱۷-معین الفلسفہ، ۱۸-مبادی الاصول (عربی)، ۱۹-معین الاصول، ۲۰-مفتاح التہذیب، ۲۱-آسان منطق، ۲۲-آسان صرف، ۲۳-آسان نحو، ۲۴-آسان فارسی قواعد، ۲۵-محفوظات (بچوں کے لیے آیات واحادیث کا مجموعہ) تین حصے، ۲۶-آپ فتویٰ کیسے دیں؟، ۲۷-کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟، ۲۸-اسلام تغیر پذیر دنیا میں، ۲۹-نبوت نے اسلام کو کیا دیا؟، ۳۰-ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں، ۳۱-حرمت مصاہرت، ۳۲-تسہیل ادلۂ کاملہ حواشی وعناوین، ۳۳-ایضاح الادلہ، ۳۴-حواشی امداد الفتاویٰ (جلد اوّل)، ۳۵-تحقیق وتعلیق حجۃ اللہ البالغہ (عربی)، ۳۶-شرح علل ترمذی، ۳۷-وافیہ حاشیہ عربی کافیہ، ۳۸-ہادیہ شرح کافیہ، ۳۹-علمی خطبات (دوجلد)، ۴۰-دین کی بنیادیں اورتقلید کی ضرورت، ۴۱-عصری تعلیم، ۴۲-جلسۂ تعزیت اور اس کا شرعی حکم، ۴۳-ارشاد الفہوم شرح سلوم العلوم، ۴۴-کامل برہان الٰہی (چار جلد)، ۴۵- فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے۔ (متعدد کتابوں کے ترجمے فارسی، پستو، انگریزی، بنگالی، برمی اور دیگر زبانوں میں ہوچکے ہیں)

اولادواحفاد: ۱-مولوی مفتی حافظ رشید احمد مرحوم ان کے دوفرزند: (۱) مفتی حافظ مسیح اللہ، (۲) حافظ سمیع اللہ۔

۲- حافظ سعید مرحوم، ان کے دوفرزند: (۱) حافظ حبیب اللہ، (۲) مجیب اللہ اور دودختر: (۳) حافظہ نجیبہ، (۴) حافظہ فاطمہ۔

۳- مولوی حافظ وحید احمد، ان کے فرزند: (۱) حافظ سعد اللہ اور دختر: (۲) فرحہ۔

۴- مولوی حافظ حسن احمد، ان کے فرزند: (۱) حافظ حسان، دختر: (۲) حافظہ بشریٰ، (۳) حافظہ حسنیٰ، (۴) حافظہ سُعدیٰ۔

۵- مولانا حافظ حسین احمد، ان کے فرزند: (۱) محمد، دختر: (۲) حافظہ سلمیٰ۔

۶- مولانا حافظ ابراہیم، ان کے فرزند: (۱) حافظ یحییٰ، (۲) انیسہ، (۳) اریبہ۔

۷- حافظ قاسم احمد، ان کے فرزند: (۱) حافظ عاصم، (۲) رشدیٰ۔

۸- حافظہ عائشہ: ان کے فرزند: (۱) محمد، دختر: (۲) حافظہ فائزہ، (۳) حافظہ فوزیہ، (۴) حافظہ مبشرہ۔

۹- مولانا حافظ محمد: ان کے فرزند: (۱) رشید، (۲) حافظہ نجمہ۔

۱۰- مولانا حافظ احمد سعید: ان کے فرزند: (۱) حافظ حفیظ، (۲) یوسف، دختر: (۳) زینب۔

۱۱- حافظہ فاطمہ: فرزند: (۱) نعیم، دختر: (۲) نُعمی، (۳) عُظمی۔

۱۲- حافظ عبد اللہ: (۱) عائشہ، (۲) سعدیہ۔

۱۳- حافظ عبید اللہ۔ ان کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہے۔

صلبی اولاد تیرہ ہیں اور سب حافظ ہیں، پوتے، پوتی، نواسے اور نواسیوں میں اٹھارہ حافظ ہیں اور بہوؤں میں پانچ حافظہ ہیں، اس طرح خاندان میں کل چھتیس (۳۶) حفاظ ہیں۔

زیارت حرمین: آٹھ مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی، چار بار حج اور چار بار عمرے کے لیے، ایک عمرہ پچاس بار طواف کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، اہلیہ محترمہ ساتھ تھیں۔

اسفار: ہندوستان کے علاوہ بنگلہ دیش، پاکستان، افریقہ، امریکا، کناڈا، برطانیہ، ترکی، قطر، کویت، بحرین، متحدہ عرب امارات، فیجی اور سمرقند وغیرہ کے اسفار دینِ حنیف کی تبلیغ کے لیے کیے۔

بیعت وخلافت: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ سے بیعت ہوئے، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی مجالس میں شرکت کی، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہریؒ نے دیوبند تشریف لاکر اجازت بیعت عنایت فرمائی، پھر تحریری اجازت نامہ ارسال فرمایا۔

وفات حسرت آیات: ۲۵ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ر مئی ۲۰۲۰ء روز سہ شنبہ بہ وقت صبح: ساڑھے چھ پونے سات کے درمیان۔ بہ مقام: نیو سنجیونی ہاسپٹل ملاڈ، ممبئی۔

نماز جنازہ: ''محراب مسجد'' کے باہر؛ امامت فرزندار جمند: مولانا حافظ وحید احمد نے کی۔

تدفین: قبرستان اوشیورہ، جوگیشوری، ممبئی۔

❁...❁...❁

حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کے آخری چند ایام:

تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر اشتیاق احمد قاسمی صاحب
استاذ تفسیر وفقہ دار العلوم دیوبند

گرامی قدر محسن ومربی حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت پر پچیس دن گزر گئے؛ مگر اپنی طبیعت بحال نہیں پا رہا ہوں، وقفے وقفے سے یاد آتی رہتی ہے اور طبیعت بے چین ہو جاتی ہے، کبھی آنسو نکل آتے ہیں، کبھی بلکتے ہوئے سر بھاری ہو جاتا ہے، کبھی نیند میں ہی رونے لگتا ہوں اور دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہو پا رہا ہے، نہیں لگتا تھا کہ ممبئی کا یہ سفر ملکِ عدم کا سفر ہے اور اب کبھی نہیں آئیں گے، میں نے کہا تھا کہ اسباق بند ہو گئے ہیں خدمت کے لیے میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں؛ مگر اس کے لیے راضی نہ ہوئے، ''موت کا ایک دن معین ہے'' اس پر ایمان ہے؛ لیکن حضرت الاستاذ کی رحلت عجیب ادا سے ہوئی۔ ؎

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی ☆ ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ایسی حالت میں کیا لکھوں، ذہن، حواس اور قلم سب پر بے کیفی طاری ہے، حضرت مدیر محترم مولانا محمد سلمان بجنوری دامت برکاتہم کا حکم ہوا کہ ''علالت اور آخری ایام کی تفصیلات سپرد قلم کرو''! سوچا کہ شاید اسی طرح غم ہلکا ہو جائے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا، بیٹھتے ہی دل بیٹھنے لگا، آنسو ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے، وضو کیا، پھر بیٹھا؛ لیکن لکھ نہ سکا تو بیٹی کو سبق پڑھانے لگا، پھر آ کر بیٹھا لکھ رہا ہوں، قارئین سے بے ربطی اور بے ہنگم تعبیرات کے لیے معذرت خواہ ہوں، بہت سے شاگردوں نے کہا: اپنے عزیز وقریب کی رحلت پر بھی ہمیں اتنا غم نہ ہوا اور نہ ہم

اس قدر دل گرفتہ ہوئے جتنا کہ حضرت الاستاذؒ کی رحلت پر ہورہے ہیں۔

رجب کا مہینہ اسباق میں زیادہ انہماک کا ہوتا ہے، کئی دن سے ملاقات کے لیے خدمت میں حاضر نہ ہوسکا تھا، ۱۶؍رجب المرجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۲؍مارچ ۲۰۲۰ء روز پنج شنبہ کو ''مسجد رشید'' کے تہہ خانے میں سالانہ انعامی جلسہ تھا، حضرت مولانا محمد سلمان صاحب مدظلہ ناظم جلسہ تھے، بڑے ہی ادب واحترام سے حضرت شیخ الحدیث وصدرالمدرسین کو دعوتِ اسٹیج دی، حسبِ روایت حضرت کرسی پر تشریف فرما ہوے، طلبۂ کرام کے لیے تشجیعی بیان شروع فرمایا، پندرہ بیس منٹ کے بعد محسوس ہوا کہ زبان رک رہی ہے، رک کر اپنی عادت کے مطابق ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' پڑھا پھر بولنے لگے، گفتگو کا سلسلہ نہیں ٹوٹا، تھوڑی دیر بعد پھر رکاوٹ ہوئی، پھر اسی طرح رک کر اعوذ باللہ الخ پڑھا پھر بیان شروع کیا اور موضوع کو پھر سے دہرایا، تھوڑی ہی دیر بعد بندش ہوئی اکی بار سلسلۂ کلام ٹوٹ گیا پھر جب بندش ہوئی تو بات ختم کردی، آدھ پون گھنٹہ بیان ہو پایا تھا کہ کرسی سے اتر کر پیچھے زینت آرائے مسند ہوے اور حضرت مہتمم صاحب سے باتیں کرنے لگے، درمیان میں کئی اساتذہ نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا کہ شاید دوسال پہلے کی طرح شوگر زیادہ ہوگئی ہے، اس سے پہلے جب زبان کی بندش ہوئی تھی تو شوگر پانچ سو اٹھارہ تھی اور ایک بار تو مشین میں اِیرَرْ (شوگر کی حد بتانے سے معذرت کا اشارہ) آگیا تھا، علاج ہوا، شفایاب ہوگئے، گھر سے معلوم کیا تو بتایا گیا کہ گزشتہ کل (بدھ) سے یہ کیفیت ہورہی ہے؛ غرض یہ کہ خلافِ عادت جلسہ میں گیارہ بجے تک موجود رہے، اپنے دستِ مبارک سے انعامات بھی تقسیم فرمائے، پھر گھر تشریف لائے، مولوی محمد طفیل دربھنگوی سلّمہ ساتھ تھے، گھر سے فرزندار جمند جناب مولانا حسین احمد صاحب ڈاکٹر کے پاس لے گئے، وہاں سے ڈھائی بجے واپس آئے، ڈاکٹر کا خیال تھا کہ شاید زبان پر لقوے کا اثر ہے، اس کے لیے رپورٹ ضروری تھی، واپس آکر ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا کھا کر سوگئے، عصر بعد طلبۂ کرام آئے؛ مگر زبان بندی کی وجہ سے بار بار کوشش کرتے رہے؛ لیکن بات نہ کرسکے، مغرب بعد ماہنامے، رسائل وغیرہ کو اٹھا

اٹھا کر دیکھتے رہے، عشاء کی نماز پڑھی، تھوڑا کھانا تناول فرمایا، پھر دوا کھا کر سوئے، مگر مدتوں سے نیند بہت دیر سے آتی تھی، کبھی ایک دو بجے اور کبھی چار بجے آتی تھی، رات بھر پیروں کی جلن اور پیروں کے نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہوئے درد سے پریشان رہتے، ''یا اللہ، اے اللہ، اے میرے مولیٰ! رحم فرما'' کے جملے زبان پر ہوتے اور غالبؔ کی زبان میں۔ ؎

موت کا ایک دن معین ہے ☆ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کبھی تو آنسوؤں سے رونے لگتے اور فرماتے: ''اے اللہ! اگر آپ راضی ہیں اور بلانا چاہتے ہیں تو بلالیں اور مجھے اس تکلیف سے بچالیں!'' دعائیں پڑھ پڑھ کر جھاڑتے رہتے، آرام ہوجاتا پھر نیند آتے ہی تکلیف شروع ہوجاتی، جیسے کوئی پیر ہلا کر جگا دیتا ہو، علامتوں سے آپ کو سحر ہونے کا بھی یقین تھا، کبھی تکیہ کے نیچے، کبھی گدّے اور مسند کے نیچے، کبھی سرہانے، کبھی پائتانے الماری کے پاس تعویذ رکھے ہوئے ملتے، کبھی ٹوپی غائب ہوجاتی، ایک بار نئی صدری اتار کر لٹکائی تھی کہ غائب ہوگئی؛ یہ کرشمے دیکھنے کو ملتے رہتے تھے، اس سے ہم لوگوں کو بھی سحر کا شبہ رہتا تھا غرض یہ کہ یہ رات بھی اسی طرح گزری، فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کیا، پھر سوئے اور الحمدللہ نیند آئی، ساڑھے گیارہ بجے تک سوئے، اٹھنے کے بعد غسل کیا اور معمول کے مطابق ساڑھے بارہ بجے جمعہ کی نماز کے لیے امام باڑے کے قریب کی ''محبوب'' مسجد پہنچے، پھر گھر آکر کھانا کھایا اور قیلولہ کے لیے لیٹے، عصر سے پہلے اٹھ کر چائے پی، کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگے، پھر نماز پڑھی، اس دن عصر بعد طلبۂ کرام کو مجلس میں بیٹھنے سے منع کر دیا گیا، مغرب بعد بھی بیٹھے رہے، عشاء کی نماز کے بعد بخاری شریف پڑھانے کے لیے درس گاہ پہنچے، ساڑھے دس بجے تک سبق ہوا، زبان رکتی رہی؛ لیکن کام چل گیا، معمول سے ایک گھنٹہ پہلے ہی سبق موقوف کر دیا، گھر تشریف لے آئے، پھر رات معمول کی پریشانی میں بسر ہوئی۔

اگلے دن سنیچر کو چوتھے گھنٹے میں پڑھانے آئے، اور سبق ہوتا رہا، زبان کی بندش کبھی کھلتی، کبھی نہیں، جب

”باب برکۃ الغازي في مالہ حیًا ومیتًا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ (ص ۴۴۱ س ۵) پر پہنچے اور سمجھانا چاہا تو زبان بالکل بند ہوگئی، بار بار ”اعوذ باللہ“ پڑھنے کے بعد، کھلی تو فرمایا: یہ حدیث بڑی اہم ہے، سمجھانا ضروری ہے؛ مگر کیا کروں؟ چھوڑ و رہنے دو، آج چیک اَپ کے لیے جانا ہے؛ چنانچہ معمول سے ایک گھنٹہ پہلے ہی ساڑھے گیارہ بجے تک سبق ہوا، صاحب زادہ مولانا حسین احمد زید مجدہ کے ساتھ دارالعلوم زکریا کے قریب ایک ڈاکٹر کے پاس گئے، سیٹی اِسکین ہوا، رپورٹ نارمل آئی کہ دماغ کی ساری رگیں درست ہیں؛ البتہ خون کی رپورٹ میں نمک کی کمی کی بات آئی؛ مگر اس سے زبان کی بندش سمجھ میں نہیں آرہی تھی، زبان پر فالج کا خیال بھی غلط تھا۔

عشاء بعد درس گاہ تشریف لائے، میں نے محمد طفیل سلّمہ سے کہا کہ تم میری طرف سے کہو کہ اب جو بچا ہے اُسے اپنی عادت کے مطابق درایتاً (سمجھا کر) نہ پڑھائیں، روایتاً اور سرداً ہی پڑھا دیں، موصوف نے عرض کیا، الحمدللہ! عرضی قبول ہوگئی، درس گاہ پہنچے، طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی، سات آٹھ صفحے کے بعد اسّی فی صد زبان کھل گئی، پھر متعدد بحثوں کو سمجھایا بھی، اس طرح کتاب الجہاد ص ۴۵۲ پوری ہوئی، اسی پر بارہواں پارہ بھی پورا ہوا۔ پھر اگلے دن مجھے فون کیا: کہاں ہو؟ نظر نہیں آرہے ہو تو میں نے بتایا، حضرت آسام آیا ہوا ہوں، ختم بخاری شریف کا پروگرام ہے، کل حاضر ہو جاؤں گا، فرمایا: میں اِس بدعت کو ختم کرر ہا ہوں اور تم اس میں شریک ہو رہے ہو؟ میں نے کہا: حضرت! آئندہ احتیاط کروں گا، فرمایا: اچھا آوٗ، میں بھی ٹھیک ہوں۔ اگلے دن شام کو پہنچا اور عشاء بعد سبق میں حاضر ہوگیا، جب ساتھ ساتھ گھر تک پہنچا تو گیارہ بج رہے تھے، مجھے اصرار کے ساتھ آرام کرنے کے لیے واپس کیا، پھر صبح ہی خدمت میں پہنچا اور ممبئی رخصت ہونے تک ساتھ میں رہا غرض یہ کہ اتوار، دوشنبہ اور سہ شنبہ چوتھے گھنٹے اور عشا بعد دونوں وقت سرداً سبق ہوتا رہا، اگر زبان کام کرتی تو بولتے ورنہ خاموش سنتے رہتے، اس طرح سہ شنبہ کو دو محسن و مشفق رشتہ دار تشریف لائے ایک عمار بھائی برخوردار مولانا حسین احمد صاحب کے برادر نسبتی اور دوسرے برخوردار مولانا احمد سعید کے بردار نسبتی عبداللہ بھائی (محمد چچا کے لڑکے) تھے،

جب اِن دونوں نے مغرب بعد باریابی حاصل کی تو حضرت مفتی صاحب اپنے سمدھی (محمد چچا) کو یاد کر کے رونے لگے کہ وہ بڑے اچھے بھائی تھے، وہ (۱۸ر فروری ۲۰۲۰ء منگل کو) چلے گئے، عمار بھائی نے ڈاکٹری پڑھی ہے اس شعبے کی خدمات کے لیے لوگوں کا خوب تعاون کرتے ہیں، اگرچہ پیشے سے منسلک نہیں ہیں، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بھی خوب کی، دل کے آپریشن کے بعد سے وفات تک جب بھی طبیعت ناساز ہوتی خدمت میں حاضر ہو جاتے، اس بار بھی ممبئی لے جانے کے لیے آئے تھے، تین اسباق باقی تھے، تینوں میں ساتھ ساتھ رہے، سہ شنبہ کی شام کو چودھواں پارہ پورا ہوا، اب آخری پارہ (۳۰ صفحے) باقی بچا، چوتھے گھنٹے میں دس صفحے ہوے، عشاء بعد پورا کرنے کے ارادے سے بیٹھے، صفحہ ۵۴۲ سطر ۹ القسامة في الجاهلية سے عبارت شروع ہوئی، دارالحدیث میں بھیڑ بڑھتی گئی، جب چار یا تین صفحے بچے تو رونے لگے، بار بار رومال سے آنسو پوچھتے، بدن پر بھی رونے کا اثر ظاہر ہو رہا تھا، جب آخری حدیث پر قاری پہنچا تو بے اختیار ہو کر رو پڑے، طلبہ بھی رونے لگے پوری دارالحدیث سسکیوں سے گونج رہی تھی، اسی درمیان تین بار فرمایا: ''اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا'' میں نے اپنے کو سنبھالا اور کان کے قریب ہو کر کہا: طلبہ بے قابو ہو رہے ہیں، آپ اپنے کو سنبھالیں، تو سنبھالا لیا، دستی سے آنسو پوچھا، میں نے کہا: آپ ہاتھ اٹھائیں طلبہ سری دعا کر لیں گے اور میں نے عمار بھائی سے کہا: آپ تھرمس میں سے چائے لے کر پیش کریں، ہارٹ کمزور ہے (صرف تیس پینتیس فی صد متحرک رہا کرتا تھا) میں طلبہ کو سنبھالتا ہوں، میں نے مائک لیا، اتنے میں حضرت تخت سے اترنے لگے پھر دایاں ہاتھ ہلا کر طلبہ سے کہا: ''بھائیو! معاف کرنا''، اس پر طلبہ کے رونے کی آواز اور بلند ہوئی، غالباً: عمار بھائی نے کہا: ابّا آپ نے بہت اچھا پڑھایا (اس لیے کہ درمیان میں دو تین بار مختصر مختصر طور پر مسئلہ سمجھایا تھا، بالکل اخیر میں کچھ نصیحت اور وصیت کرنا چاہتے تھے وہ کر نہ سکے) اس پر فرمایا: ''کیا خاک پڑھایا''؟ غرض یہ کہ آہستہ آہستہ اترے، پھر چپل پہن کر باہر نکلے، بھیڑ سے بچا بچا کر کار تک لایا گیا، کار میں بھی مسلسل روتے ہی رہے، جب گھر پہنچے تو کرسی پر بیٹھے اور کہنے لگے: لگتا ہے کہ

''میں اگلے سال بخاری شریف نہیں پڑھا پاؤں گا!'' (قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید!) میں نے کہا: نہیں، ایسا نہ سوچیں، آپ ممبئی جائیں گے، مرض کی تشخیص ہوگی، پھر ٹھیک ہوکر آجائیں گے، ابھی طلبہ امتحانات دیں گے، پھر جائیں گے، آپ کی واپسی کے بعد ایک مجلس رکھی جائے گی، اس میں آپ وہ سب باتیں کہیں گے جو آج نہ کہہ سکے، اس پر فرمایا: ہاں! مجھے بھی لگتا ہے کہ میں جاتے ہی ٹھیک ہوجاؤں گا، اس کے بعد طلبہ وغیرہ واپس ہوے، مجھے (حضرت کے قدیم خادم اور محبوب ترین شاگرد) ابوبکر بھائی (بنگلہ دیش) نے کہا تھا کہ تم ساتھ میں ہی رہو؛ اس لیے میں رک گیا، لیکن حضرت نے اصرار کے ساتھ واپس کیا، برخوردار خورد: عبیداللہ بھائی کو کہا کہ گاڑی سے پہنچاؤ، رات زیادہ ہوگئی ہے، بہر حال میں آگیا، مجھے اچھی طرح نیند نہیں آئی پھر صبح کو حاضر ہوا، ممبئی کی تیاری چل رہی تھی، طلبۂ کرام خصوصاً دورۂ حدیث شریف کے طلبہ کے آنے کا سلسلہ جاری تھا، اکثر طلبہ محبت میں مصافحہ کرنا اور خدمت میں بیٹھنا چاہتے تھے، جگہ کم تھی اس لیے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد قسط وار ان سب کو ملاقات کے بعد رخصت کرتا رہا، اسی درمیان حضرت نے غسل کیا، کپڑے بدلے، موئے لب تراشے، خوشبو لگائی اور کرسی پر بیٹھے مسکراتے رہے، ''مصائب میں الجھ کر مسکرانا اُن کی فطرت تھی'' اتنے میں مظفر نگر کے ایک پرانے شاگرد ایک عامل کو لے آئے، وہ سحر کی کاٹ کرنا چاہ رہے تھے، بھائیوں سے مشورہ کیا، تو سب نے کہا: اگر معلوم ہوگا کہ سحر ہے تو شاید سفر ملتوی ہوجائے، اِدھر عامل صاحب بڑے دعوے کر رہے تھے، پھر حسین بھائی نے کہا: کس طرح کاٹیں گے؟ تو انھوں نے کاغذ منگوایا اور اس پر کچھ لکھا اور حضرت کے سر پر پھیرا، پھر جلا دیا اور پانی دم کر کے دیا، اسی درمیان کھانے کا دسترخوان بچھا، حضرت نے برائے نام تھوڑا کھایا، پھر اپنی بہوؤں کی طرف گئے، سب کو الوداعی سلام کیا اور کہا میں جلد ہی آجاؤں گا، پھر گاڑی میں بیٹھے، میں نے دم کیا ہوا پانی فرزند ارجمند عبداللہ کو دیا اور حضرت سے کہا: راستے میں اسی کو پیتے رہیں، پھر سلام کیا اور دروازہ بند کر کے رخصت کیا، گاڑی چل پڑی، یہ آپ کی الوداعی تقریب تھی اور آخری دیدار، یہ ۱۹/مارچ ۲۰۲۰ء مطابق ۲۳/رجب ۱۴۴۱ھ جمعرات کا دن تھا۔ دن

کے بارہ بجے کے قریب کا وقت تھا۔

اگلے دن ۲۰/ مارچ کو ''ملت ہاسپیٹل'' جوگیشوری ممبئی میں داخل ہوئے، مرض کی تشخیص ہوئی کہ کولسٹرول (خون میں چربی کی وجہ سے گاڑھا پن) کا اضافہ ہوگیا ہے، جب دماغ کی باریک رگوں میں خون کی گردش رک جاتی ہے تو دماغ کچھ سوچنا چھوڑ دیتا ہے، اس کی وجہ سے زبان پر بات نہیں آتی اور قلم سے بھی لکھنا ممکن نہیں رہتا، نہ تو زبان پر کوئی اثر ہے اور نہ ہی ہاتھ پر۔ (بخاری شریف کے سبق کے بعد حضرت نے مجھے اصرار کے ساتھ گھر؛ اس لیے بھیجا تھا کہ بخاری شریف کا پرچہ بنانا چاہ رہے تھے؛ لیکن بتایا کہ رات ڈھائی بجے تک کوشش کرتا رہا؛ مگر لکھ لکھ کر کاٹ رہا تھا بنا نہ سکا، پھر اس کی ذمہ داری حضرت مفتی محمد امین صاحب مدظلہٗ العالی کو دی کہ پہلے مولانا قمرالدین صاحب کے پاس جائیں اگر وہ بنادیں تو بہتر ہے ورنہ آپ بنائیں؛ چنانچہ حضرت مفتی امین صاحب مدظلہ کے ساتھ میں بھی مولانا قمرالدین صاحب کے گھر گیا؛ ہم دونوں دیر تک کھڑے رہے، دروازہ نہ کھلا تو یہ خیال ہوا کہ شاید آرام فرمارہے ہیں، اس لیے ہم واپس آگئے، وہ پرچہ حضرت محمد مفتی امین صاحب مدظلہٗ العالی نے ہی بنا کر جمع فرمایا۔)

غرض یہ کہ مرض کی تشخیص کے بعد علاج ہوا اور دھیرے دھیرے چار دن میں ٹھیک ہوگئے پھر ۲۳/ مارچ کو اپنی قیام گاہ (اپنے داماد بلال بھائی کے گھر) پر واپس آگئے، اب اچھی طرح بولنے لگے، دوائیں بھی چلتی رہیں اور مایوسی کی بات باقی نہ رہی، اب دیوبند واپس آنے کے لیے اصرار کرنے لگے، میزبان بیٹی (فاطمہ بہن) اسی بہانے خدمت کرنا چاہتی تھی، اُن سب کی رائے تھی کہ ابھی یہیں رہیں، دیوبند نہ جائیں، وہاں اسباق تو ہیں نہیں اور اِدھر ہم لوگوں کی بھی رائے تھی کہ جب تک اطمینان بخش صحت نہ ہوجائے تب تک نہ آئیں، چوں کہ وہاں لکھنے پڑھنے کے اسباب نہیں تھے؛ اس لیے جی نہیں لگ رہا تھا، اور آخری متوقع تصنیف ''دیوبندیت کیا ہے؟'' کی تکمیل کے لیے بے چین تھے، جس کا خاکہ آپ نے طے کرلیا تھا اور اس کے مختلف پہلو کو مرتب بھی کرلیا تھا، پھر کسی

عزیز کے یہاں کئی دنوں تک مہمان رہنا ان کے لیے بارِ خاطر کا باعث تھا، اصرار وانکار کا سلسلہ چلتا رہا، سنا کہ کسی ایک دن اصرار اتنا بڑھا کہ ناشتہ واپس کر دیا، پھر کھانا نہیں کھایا، جب بہت اصرار کیا گیا تو شام کو کھانا تناول فرمایا، اسی درمیان ایک دن جوگیشوری کے امدادی کیمپ میں دس پندرہ منٹ بیان فرمایا: ''لا عدویٰ'' (کسی کا مرض دوسرے کو نہیں لگتا) بہت مختصر اور جامع بیان ہے، پھر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ اِدھر ''کرونا وائرس'' کی وجہ سے پورے ملک؛ بلکہ پورے عالم میں ''لاک ڈاؤن'' (گھروں میں بندش) شروع ہو گیا، اب سفر کرنا مشکل ہو گیا، اپریل کے دوسرے عشرے کی کسی تاریخ میں فون آیا: کیا حال ہے؟ میں نے کہا: الحمدللہ! ٹھیک ہوں، بچے کیسے ہیں؟ بتایا، سب خیریت سے ہیں، ہم سب آپ کی صحتِ کاملہ کی دعائیں کرتے ہیں۔ فرمایا: میں بھی الحمدللہ ٹھیک ہو گیا ہوں، بالکل اچھی طرح زبان چلنے لگی ہے، اسی کی اطلاع کے لیے فون کیا، میں نے کہا: ۱۶/اپریل کو پلین کا ٹکٹ بنا ہوا ہے، اب تو دیوبند آجائیں گے؟ فرمایا: بنا ہوا تو ہے؛ مگر دیکھو ہمارا تیلی کیا کرتا ہے؟ وزیر اعظم اسی تحصیل کے ہیں جس کے حضرت مفتی صاحب ہیں؛ چنانچہ ٹکٹ کینسل ہو گیا اور سفر ملتوی، اب کار یا ایمبولینس سے آنے کی بات چلی؛ مگر اس میں مصلحت نہ سمجھی گئی، حضرت کو سمجھانے کے لیے شاگرد رشید رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند مفتی احمد خان پوری صاحب کے ذریعے کہلوایا گیا: انھوں نے گزارش کی حضرت مان گئے؛ اس لیے کہ دیوبند بھی ہاٹ اسپاٹ (کرونا کا حساس علاقہ) اور ممبئی بھی، سب کے کورنٹائین ہونے کا خطرہ؛ لیکن حضرت کا جی نہیں لگ رہا تھا، جب ۲۵/اپریل کو رمضان شروع ہونے والا تھا تو ممبئی میں رہنا طے کر لیا، ساتھ ہی آن لائن بیان کے اعلانات آنے لگے، بڑی خوشی ہوئی، محبین منتظر پہلی شب دس بجے سے گیارہ بجے تک ہوا، پھر ساڑھے دس سے بارہ بجے تک بیان ہوتا رہا اخیر کا آدھ گھنٹہ سوال وجواب کا تھا، پندرہ رمضان المبارک تک بیانات ہوے ہیں، بارہ رمضان کو طبیعت پھر ناساز ہوئی، موسمی بخار ہوا، سوئے رہے چار نمازیں قضا ہو گئیں تو تیرہ اور چودہ رمضان کو بیان نہ کر سکے، کل چودہ تقریریں ہوئیں ان کے عناوین درج ذیل ہیں: ''ثنا میں ائمہ کا

اختلاف، حدیثِ ثریا کی تشریح، ''الائمۃ من قریش'' کا مطلب، قرآن کے پاروں کی نئی تقسیم کی تردید، بنائے کعبہ کی مختصر تاریخ، سورۂ فاتحہ سے علاج، حدیث الحلال بینٌ والحرام بینٌ کی تشریح، ایمانیات کی تفصیل، تخلیق کے مراحل، دادی حوا کی پیدائش سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ، توحیدِ الوہیت اور توحید ربوبیت میں تلازم، آخرت اور رسالت، ایاک نعبدوایاک نستعین کی تشریح، جن بندوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، زمزم کے کنویں سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ، تقلید کا اثبات، قراءت خلف الامام، کرامات میں غلو، متقیوں کی تعریف، الطلاق مرتان کی تشریح، ستر کی تعیین، سونے اور چاندی کا نصاب، آخری بیان ''ختم نبوت کے اثبات'' پر ہوا، پھر مہر لگ گئی، (امید ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کا جوار رحمت نصیب ہوا ہوگا، فرشتوں نے استقبال کیا ہوگا، حور وغلمان کی خدمت نصیب ہوئی ہوگی!) بیانات سننے کے لیے آٹھ ہزار سے زیادہ نمبرات مربوط تھے پھر اس کو دوسرے گروپوں میں شیئر کیا جاتا تھا، وہ یورپ، امریکہ اور پورے عالم میں بڑی اہمیت سے سنے جارہے تھے؛ لیکن یہ سلسلہ پندرہ رمضان سے آگے نہ چل سکا۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا ☆ ''تمہیں'' سو گئے داستاں کہتے کہتے

اب ان کو مولوی محمد طفیل دربھنگوی کاغذ پر منتقل کر رہے ہیں، ان شاء اللہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوگی، تو اس کی افادیت مزید عام ہوگی۔ و باللہ التوفیق!

رمضان المبارک کی کسی تاریخ میں فون آیا/ یا میں نے فون کیا: خبر خیریت کے بعد پوچھا: کیا کر رہے ہو؟ تو بتایا کہ آپ نے جو ہدایت القرآن کے لفظی اور بامحاورہ ترجمہ کو سامنے رکھ کر آسان اسلوب میں ''ترجمۂ قرآن کریم'' کرنے میں لگا رکھا ہے، اسی میں لگا ہوں، چھ پارے ہوے ہیں، تو بہت خوش ہوئے اور آسانی کے ساتھ تکمیل کی دعا فرمائی، یہ آخری گفتگو تھی۔ اللہ کرے کہ یہ کام پورا ہو اور خدا اور خلقِ خدا تعالیٰ کے نزدیک قبول حاصل کرے! (آمین)

۱۶؍رمضان کی رات کو بخار آیا، سحری کے بعد بخار بڑھ گیا اور سانس میں تکلیف ہونے لگی کھانسی بھی ہونے لگی، گھر پر ہی رہے، رات میں بھی گھر پر ہی تھے، ۱۷؍رمضان کو چوں کہ ’’ملت ہاسپٹل‘‘ بند تھا؛ اس لیے ’’نیو سنجیونی ہاسپٹل ملاڈ‘‘ لے جائے گئے، جنرل وارڈ میں پورے دن رہے، رات کو دست آنے لگے، کمزوری بڑھنے لگی تو دوپہر کو آئی، سی، یو میں منتقل ہوے، رپورٹ آئی تو معلوم ہوا کہ دو دن پہلے ہارٹ کا اٹیک آیا تھا، اسی وجہ سے پھیپھڑے میں پانی آ گیا ہے، سانس کی تکلیف بھی اسی وجہ سے ہے، گردہ تو کئی سال سے کمزور تھا، کریٹنن کبھی بڑھتا کبھی گھٹتا تھا، ۲۱؍رمضان تک آئی سی، یو میں ہی رہے، دھیرے دھیرے طبیعت ٹھیک ہوگئی، ہسپتال کے کھانے کے بجائے گھر کے کھانے کی فرمائش کی، کھایا بھی، عبداللہ بھائی (فرزند برخوردار) آم لائے اس تھوڑی مقدار کو مزے لے کر کھایا، اسّی فی صد طبیعت ٹھیک ہوگئی، حضرت کے فرزند حافظ عبداللہ سلّمہ اس معنی کر خوش قسمت ہیں کہ آخری ایام علالت میں ان کو والد صاحب مرحوم کی خدمت نصیب ہوئی، اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازیں! (آمین)۔ میرے پاس اسی دن عمار بھائی نے فون کیا: ابا کی طبیعت بہت اچھی ہے، ماشاء اللہ، اب اصرار کرنے لگے کہ مجھے جنرل وارڈ میں لے چلو، یا گھر لے چلو، ٹھیک ہو گیا ہوں۔ دیوبند آنے کے لیے بہت اصرار کرنے لگے، خود سے موئے لب تراشا، کہنے لگے: مجھے نہلاؤ!

بہر کیف! ۲۲؍رمضان کو آئی، سی، یو سے جنرل وارڈ میں منتقل ہوے، ۲۳؍رمضان کی رات بہت اچھے رہے، نو بجے اپنی بہو (مولانا احمد سعید کی اہلیہ) کو فون کیا، خبر خیرت پوچھی اور دیوبند آنے کی خواہش کی تو کہا گیا کہ الحمدللہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے، ہاسپٹل سے نکلتے ہی آ جائیں گے، ان شاء اللہ کوئی انتظام ہو جائے گا، پھر رات ڈیڑھ بجے سے پہلے عمار بھائی سے بھی بات ہوئی، پھر اپنے عزیز القدر بھائی حضرت مفتی محمد امین صاحب کو سلام بھجوایا پھر سحری کے وقت دو بجے رات کو جامعہ نور العلوم گٹھامن پالن پور کے صدر مدرس مولانا یوسف قاسمی مدظلہٗ کو فون کیا کہ محمد بھائی مرحوم کے فرزند عبداللہ کو مدرسہ کا مہتمم بنایا جائے، میری یہ رائے سارے اراکین شوریٰ کو

پہنچا دیں! قضا نماز پڑھنے کے لیے اصرار کیا؛ مگر آئی سولیشن میں نگراں نرس وغیرہ نے توجہ نہ دی، اسی رات نیند کے لیے انجکشن دے دیا، اسی سے سوئے اور ہمیشہ کے لیے سو گئے، بظاہر یہی انجکشن موت کا سبب ثابت ہوا، ورنہ طبیعت تو اسّی فی صد ٹھیک ہوگئی تھی، حضرت نیند کی گولی وغیرہ سے خوف کھاتے تھے، بیمار ہوکر ممبئی جانے سے گھبراتے اور ہسپتال کی موت سے پناہ مانگتے تھے؛ مگر ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔ اور جو تقدیر میں لکھا تھا۔ غنودگی جیسی کیفیت رہی، جب اٹھایا جاتا تو کہتے: ''مجھے سونے دو'' جب چوبیس گھنٹے گزر گئے اور کچھ نہ کھایا تو ڈاکٹروں نے ناک سے پائپ کے ذریعہ معدے میں غذا پہنچائی اور ۲۴ر رمضان کو دوبارہ آئی سی یو میں منتقل کیا، کمزوری بڑھتی گئی، بلڈ پریشر گھٹتا گیا، آکسیجن میں کمی آتی گئی، پھیپھڑے میں پانی بڑھتا رہا، بخار تیز ہوتا رہا، رات ڈیڑھ بجے عمار بھائی نے مجھے کہا: سو گئے ہیں، میں نے خطرہ محسوس کیا، اس لیے کہ وہ تو دو دنوں سے سو رہے تھے، ساڑھے تین بجے مسلمان نرس نے ہاشم بھائی کو بتایا کہ کچھ پڑھ رہے ہیں، عمار بھائی گھر پر تھے، انھوں نے فون پر کہا کہ فون قریب کرو! پھر سنا گیا کہ کلمہ پڑھ رہے ہیں، عمار بھائی سحری کھا کر ساڑھے پانچ بجے ہاسپٹل پہنچے تو بڑی صاف اور قدرے تیز آواز میں پڑھ رہے تھے: ''أشهد أن لا اله الاّ اللّٰه و أشهد أن محمداً عبده و رسولهٗ'' کمرے میں موجود مسلمان نرس اور عمار بھائی وغیرہ سب نے سنا۔

غم میں بھی ہے سُرور، وہ ہنگام آگیا ☆ شاید کہ دَورِ بادۂ گلفام آگیا

اس کے بعد کمزوری بڑھتی چلی گئی، بلڈ پریشر گھٹ رہا تھا، آکسیجن بھی کم ہو رہا تھا، یہاں تک کہ ساڑھے چھ اور پونے سات بجے کے درمیان ڈاکٹر نے قفسِ عنصری سے روح کے پرواز ہونے کی تصدیق کر دی! إنا للّٰه و إنا إليه راجعون، للّٰه ما أعطى و للّٰه ما أخذ و كل شيئٍ لأجل مسمّىٰ۔ ۱۹ر مئی ۲۰۲۰ء مطابق ۲۵ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ روز منگل کی طاق رات میں غنودگی کی حالت میں رہے اور صبح سویرے ایک مسافر، محدث کبیر، مفسر عظیم، سنت کے شیدائی ولی اللہ کی روح اس طرح نکلی کہ احساس تک نہ ہوا، جیسے آٹے سے بال نکلتا ہے، بلڈ پریشر اور

آکسیجن دھیرے دھیرے کم ہوتے چلے گئے اور روح عالم ارواح کو سدھار گئی، اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو سکرات کی تکلیف سے محفوظ رکھا۔ ہائے! ہم میں سے کسی کو یہ احساس نہ تھا کہ صحت یابی کے بعد اچانک رخصت ہو جائیں گے، پھیپھڑے میں پانی اس سے پہلے بھی دوبار آ گیا تھا، پھر صحت ہو گئی تھی، کبھی کبھی گہری نیند بھی آتی تھی؛ اس لیے یہ بھی معمول کی بات لگ رہی تھی، بخار اور کھانسی تو معمولی بیماریاں ہیں، مسلسل بیانات ہو رہے تھے، اس سے بھی امید تھی کہ مشکل سے نکل گئے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے موت کا وقت کسی کو نہیں بتایا اور نہ موت کی جگہ اور نہ ہی سبب کسی کو معلوم ہے، اللہ تعالیٰ کی جو مرضی ہوئی اسی میں خیر ہے، اگر اس دنیا میں کسی کو رہنے کا حق تھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، انھیں کے لیے یہ دنیا بنائی گئی، وہی خلاصۂ کائنات ہیں، اگر ان کی رحلت ہوئی اور شدید ترین محبت کرنے والے صحابۂ کرامؓ نے صبر کیا تو ہم سب کو بھی صبر جمیل کرنا چاہیے! انھیں کا اُسوہ ہمارے لیے لائق عمل اور باعث نجات ہے۔

ہاسپٹل کا بل ساڑھے گیارہ لاکھ ادا کیا گیا، نماز کے فدیہ کے طور پر احتیاطاً دس ہزار روپے نکالے گئے۔ آٹھ بجے ڈیتھ سرٹیفکیٹ (تصدیق نامہ وفات) تیار ہوا، اور چوں کہ اٹیک کی وجہ سے پھیپھڑے میں پانی اتر آیا تھا، نمونیا بخار تھا، کھانسی تھی اور کافی عرصہ پہلے ٹی بی کا بھی حملہ ہوا تھا، یہ سب ''کرونا'' کے سمٹم ہیں؛ اس لیے ہاسپٹل سے اسی پروسیس سے باہر لانے کی اجازت ہوئی؛ مگر کافی رعایت دی گئی، مولانا حارث اور مولانا ہاشم صاحب نے غسل وکفن کی ذمہ داری نبھائی؛ پہلے وضو کرایا؛ پھر روئی بھگا بھگا کر پورے بدن کو صاف کیا، پھر نیا تولیہ بھگا بھگا کر پورے بدن کو آدھی بالٹی پانی سے پوچھا، سجدہ گاہوں پر کافور اور عطر لگایا، پھر سنت کے مطابق کفن پہنایا، زیارت کے لیے ایک ایک آدمی کو اجازت تھی، زیارت کرنے والوں نے پیشانی پر بوسے بھی دیے، عمار بھائی نے وفات کے بعد اور کفن پہنانے کے بعد کل تین بار بوسے دیے، ساڑھے دس بجے سے زیارت کا سلسلہ چار بجے تک چلتا رہا، ادھر قبر تیار ہو رہی تھی، چار بجے ملاڈ کی ''محراب مسجد'' کے پاس تقریباً دو سو لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی، فرزند

ارجمند مولانا حافظ: وحید احمد صاحب نے امامت کی، ساڑھے پانچ بجے تدفین عمل میں آئی، اس علاقے میں پوری قانونی رعایت کے ساتھ تدفین کی اجازت اقبال بھائی نے حاصل کی تھی، قبر میں اتارے جانے کے بعد اقبال بھائی اُترے اور انھوں نے خوب اچھی طرح پورے بدن کو مشرق کی دیوار سے لگا کر قبلہ رخ کیا، پھر ایک پلائیُ وڈ کا بڑا تختہ ترچھا کر کے رکھا گیا جس سے پورا سراپا ڈھک گیا، پھر مٹی دینے والوں نے مٹی دی۔ پھر قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا، ساڑھے چھ بجے تدفین سے فراغت ہوئی۔ چوں کہ قبرستان میں قبر کھودنے والا نہیں تھا؛ اس لیے حاضرین عزیز وقریب نے قبر کھودی ان سعادت مندوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: (محمد چچا کے لڑکے) حذیفہ، معاذ بن ہارون، انس، اسماعیل، سلیم، سہیل، عمران، عبدالستار اور مرکز المعارف میں پڑھنے والے چند فضلاء وغیرہ، قبر ساڑھے چھ تا سات فٹ کھودی گئی، جب کوئی اندر کھڑا ہوتا تو سر سے اوپر ڈیڑھ دو بالشت قبر ہو رہی تھی، جس کا اندازہ ساڑھے چھ تا سات فٹ ہوتا ہے۔ عبداللہ بن محمد چچا، مولانا حارث قاسمی، عمار بھائی سب نے یہی بتایا۔

تدفین کے بعد سرہانے ایک پتھر کھڑا کر دیا گیا، پھر دونوں صاحب زادے، داماد اور مولانا حارث صاحب اور بہت سے حاضرین نے سورۂ بقرہ کی شروع اور اخیر کی اور قرآنِ پاک کی دوسری آیتیں پڑھیں اور آب دیدہ واپس ہوئے۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے ☆ ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے

(امیرؔ مینائی)

حضرت کی زندگی کا سب سے ممتاز پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہر عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح کرنے کی کوشش کی، ہر عمل کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جانے کے لائق بنانے کا تصور ہر لمحہ غالب رکھا، کسی بھی حق کو ظاہر کرنے میں ذرا برابر کسی بندے کی خوشی اور ناراضگی کا ادنیٰ خیال بھی نہیں آنے دیا اور

موت کے لیے ہر وقت تیار رہے، ایک مرتبہ ایک بڑے استاذ دارالعلوم عیادت کے لیے تشریف لائے تو فرمایا: مولانا میں اللہ تعالیٰ کے پاس حاضری کے لیے بالکل تیار ہوں، کسی کا کوئی حق میرے ذمے نہیں ہے، میں نے کتب خانہ بچے بچیوں میں بانٹ دیا ہے، اپنے لیے صرف ہدایت القرآن رکھی ہے، جس سے میرا کھانا خرچہ چلتا ہے، پرانے مکان کو بھی کمرہ کمرہ کرکے تقسیم کردیا ہے، اب اس میں داخل نہیں ہوتا۔ ؎

آسماں کچھ بھی نہیں تیرے کرنے کے لیے
میں نے سب تیاریاں کرلی ہیں مرنے کے لیے

میں نے اتنا بڑا انسان نہیں دیکھا اور نہ دیکھنے اور برتنے کی امید ہے، جس کے ہر عمل اور ہر قول نے عقیدت کو بڑھایا اور متاثر کیا، علوم شریعہ کے ہر فن کی ہر کتاب کی مشکل ایسے حل ہوتی، جیسے اسی بحث کو ابھی دیکھا ہے! علماء کی وفات کے ساتھ علم کے رخصت ہونے کا کھلی آنکھوں ایسا مشاہدہ پہلی بار ہوا۔ ع

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

اللّٰهم اغفر له وارحمه وسَكّنهُ في الفردوسِ الأعلٰى يا ارحمَ الراحمين

❁ ... ❁ ... ❁

والدِ محترم کی خانگی زندگی

مولانا محمد سعید پالن پوری
استاذ جامعۃ الامام محمد انور شاہ کشمیری دیوبند

والد محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی وفات کے بعد سے تادم تحریر مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری ہے، ان مضامین میں ارباب قلم والد محترمؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈال رہے ہیں، ان گوشوں میں سے ایک گوشہ والد محترمؒ کی خانگی اور گھریلو زندگی بھی تھا، خانگی زندگی کے احوال پر روشنی ڈالنے کے لیے ہم بھائیوں کو حکم ہوا، اس لیے کہ عربی مقولہ ہے: ”صاحِبُ البیتِ أدرَیٰ بما فیه“ (گھر کے لوگ ہی گھر کی چیزوں کو اچھی طرح جانتے ہیں) اسی حکم کی تعمیل میں یہ چند اوراق لکھے جا رہے ہے۔

مساوات وبرابری

حضرت والد صاحبؒ کا خانوادہ کافی بڑا ہے، خود ہم بھائی بہن درجن سے زائد تھے، پھر ہماری اولاد سب مل کر چار درجن کے قریب ہیں، اتنا بڑا گھرانہ ہونے کے باوجود والد صاحب سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، سب کے ساتھ برابری اور مساوات کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، پوتوں پوتیوں میں جب کھانے کی کوئی چیز تقسیم کرنی ہوتی تو کسی ایک بچے کو بھیج کر پہلے سب کو اپنے کمرے میں بلا لیتے، پھر ان سب میں چیز کو برابر سرابر تقسیم فرماتے تھے، یہ نہیں ہوتا تھا کہ جن بچوں کی طرف طبعی میلان زیادہ تھا ان کو زیادہ دیتے ہوں یا الگ سے بلا کر صرف انھیں کو دیتے ہوں، نہیں! یہ آپ کے مزاج کے خلاف تھا۔ مساوات کا یہ عمل دیگر موقعوں پر بھی دیکھنے کو ملتا تھا، گھر کے

اضافی خرچوں کی تکمیل کے سلسلہ میں ایک معتد بہ رقم ہر سال والد صاحبؒ جب کتب خانہ کا حساب کرتے تھے اپنی اولاد کو عنایت فرماتے تھے، یہاں بھی عنایت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ صرف دیوبند میں مقیم وفروکش بچوں کو یہ رقم ملتی ہو، یا صرف نرینہ اولاد کو ملتی ہو، نہیں! سب بھائی بہنوں کو ملتی تھی، بہنوں کے باب میں یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ ان کو صرف میراث میں بھائیوں سے آدھا حصہ؛ ان کے حصہ شرعی کے مطابق ملا، باقی دیگر تمام جگہوں پر والد صاحبؒ نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکی کے حصوں میں فرق نہیں کیا، سب کو برابر عنایت فرماتے تھے۔

مساوات ہی نہیں عدل بھی

یہ جو مساوات و برابری والا عمل تھا اس پر والد صاحبؒ آنکھ بند کر کے عمل پیرا نہیں ہوتے تھے کہ ہر جگہ مساوات ہی فرماتے ہوں، بعض مواقع ایسے بھی تھے جہاں وہ مساوات کو چھوڑ دیا کرتے تھے، اور مساوات کا یہ چھوڑنا کسی بچے پر ظلم کے لیے نہیں؛ بلکہ عدل وانصاف کے حصول کے لیے ہوتا تھا، ان مواقع میں سے ایک موقع یہ تھا کہ سالانہ عنایتوں پر ملنے والی مذکورہ بالا رقم والد صاحبؒ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں برابر تقسیم نہیں فرماتے تھے، ظاہر ہے کہ متاہلانہ زندگی گزارنے والوں کے اخراجات کنواروں اور ناکتخداؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ اس فرق کو ملحوظ رکھا کرتے تھے، اسی وجہ سے متاہل کے مقابلے میں غیر متاہل کو ملنے والی یہ رقم کچھ کم ہوتی تھی۔

مشترکہ خاندان یا علاحدہ

یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان موضوع بحث رہتا ہے کہ شادی کے بعد والدین کا اپنی اولاد کو اپنے ساتھ رکھنے والا نظام زیادہ مفید ہے یا بچوں کو الگ کر دینے والا نظام، بالفاظ دیگر مشترکہ گھر کا نظام زیادہ مفید وکارآمد ہے یا الگ الگ گھر کا نظام، دونوں نظاموں کے فوائد بیان کرنے والے مل جاتے اور دونوں اپنے اپنے حق میں غور وفکر کو

دعوت دیتے؛ دلائل و براہین اور شواہد و نظائر بھی رکھتے ہیں، والد صاحبؒ نے ہم درجن بھر بھائیوں کے لیے ایک پیچ کی راہ نکالی جس کے دینی و دنیوی فوائد ہم سبھی نے محسوس کیے، وہ یہ کہ الگ بھی کر دیا اور الگ نہیں بھی کیا۔ عموم خصوص من وجہٍ کی نسبت ہوگئی، الگ کر دیا اس معنی میں کہ والد صاحبؒ نے شادی کے بعد سب بچوں کو اپنے پلو سے باندھے نہیں رکھا، ہوتا یہ تھا کہ جب چھوٹے بھائی کی شادی کی تاریخ متعین ہوتی تو تاریخ کا یہ متعین ہونا بڑے بھائی کے الگ کیے جانے کا الارم ہوتا، والدین اپنے ساتھ صرف چھوٹی بہو کو رکھتے تھے، اور جب تک اگلے لڑکے کی شادی نہ ہو اُس بہو کی تربیت فرماتے تھے، ڈیڑھ دو سال کے بعد جب اگلے لڑکے کی شادی ہوتی تو بڑے بھائی کو الگ بلا کر گفتگو کرتے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین فرماتے، کچھ مہینے کے راشن کے پیسے دیتے، چولہا، ضروری برتن، کپڑوں بستروں کے لیے الماری اور ایک فِرِج بھی دیتے، اور سب سے بڑھ کر حوصلہ دیتے کہ دیکھو ہم تمہیں صرف الگ کر رہے ہیں، ہم مر نہیں رہے ہیں، الگ اس وجہ سے کر رہے ہے کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکو، آج نہیں تو کل ہمارے مرنے کے بعد تمہیں الگ ہونا ہی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اپنا گھر چلایا کیسے جاتا ہے؟ اسے تم ہماری حیات ہی میں سیکھ لو، گھر کے چلنے میں کوئی مسئلہ یا پریشانی پیش آئے تو تم ہمارے پاس کبھی بھی آسکتے ہو۔ ان کے اس حوصلہ دینے اور آگے کے گھریلو امور میں مسلسل نگرانی فرماتے رہنے کے باعث ہم سبھی بھائی بحمد اللہ والد صاحبؒ کی حیات ہی میں برسر روزگار ہو کر اپنا اپنا گھر چلا رہے تھے، سب بھائیوں کی شادی ہوجانے کے بعد والد صاحب کے حکم وخواہش کے بموجب رسمی طور سے ان کے کھانے پینے کے جملہ امور برادرم احمد سعید سلّمہ کے گھر سے انجام دیے جاتے تھے اور غیر رسمی طور سے سبھی گھروں سے۔

یہ تو ہوا الگ الگ کرنا، اور الگ الگ نہ کرنا بایں معنی کہ والد صاحبؒ نے ہم بھائیوں کو جو الگ الگ مکان دیے، وہ الگ الگ محلوں یا پلاٹوں میں نہیں تھے؛ بلکہ ایک بڑے پلاٹ میں انگلش حرف تہجی یو (U) کی شکل میں بھائیوں کی تعداد کے بقدر درجن بھر درمیانے انداز کے (نہ بہت بڑے نہ بالکل چھوٹے) مکانات بنوائے جن کی

ہر چیز بشمول بجلی کا میٹر اور پانی کی پائپ لائن الگ الگ تھی، والد صاحبؒ نے اپنی رہائش بھی انھیں مکانوں میں سے ایک مکان میں رکھ لی۔ یوں ہم سب بھائی داخلی طور سے الگ الگ اور خارجی طور سے والد صاحبؒ کے ساتھ تھے، والد صاحبؒ کو بھائیوں میں سے اگر کسی کو بلانا ہوتا تو وہ کسی بھی بچے کو بھیج کر جب چاہتے بلا لیتے، ان کی طبیعت کبھی ہلکی سی بھی خراب ہوتی تو آن کے آن میں سارے بھائی ان کے کمرے میں جمع ہوجاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ برتن جب دو ہوتے ہیں تو وہ بجتے ہیں؛ جب کہ یہاں درجنوں کی تعداد میں برتن تھے؛ مگر والد صاحبؒ اپنے اس انوکھے نظام کے ذریعہ برتنوں کے بجنے کے اس احتمال کو زمین سے لگا گئے، دست بدعا ہوں کہ اللہ سبحانہ و تعالی اس کو زمین سے لگائے رکھیں، **اللّٰھم لا تفتنا بعدہ و لا تحرمنا اجرہ۔**

الگ الگ کرنے کا دینی فائدہ

بھائیوں کو الگ الگ گھر دینے کے دینی اور دنیوی ہر دو فوائد ہم سبھی نے محسوس کیے، دنیوی فوائد تو طوالت کے پیش نظر قلم زد کیے جاتے ہیں؛ البتہ دینی فائدوں میں سے ایک بڑے فائدہ کا تذکرہ فائدے سے خالی نہیں، وہ یہ کہ بھابھیوں کو جو حفظ کی سعادت حاصل ہوئی اس سعادت کے حصول میں اس الگ الگ گھر کے نظام کا بھی بڑا کردار رہا، آج بحمد اللہ وہ خود حافظہ بن کر نہ صرف اپنی اولاد کو حافظ بنا چکی اور بنا رہی ہیں بلکہ محلہ کے بچوں اور بچیوں کو بھی صحیح ادائیگی کے ساتھ ناظرہ خواں اور حافظ بنا کر والدین کے نامۂ عمل میں نیکیوں کے اضافہ کا موجب بن رہی ہیں، اس خامہ پرداز کی اہلیہ کو بھی شادی اور بچہ ہوجانے کے بعد اسی نظام کی برکت سے حفظ قرآن کریم کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد راقم کو پتہ بھی نہ چلا اور فقیر زادی کو بھی انھوں نے از خود حافظہ بنا دیا، جب راقم کی اہلیہ کا حفظ مکمل ہوا تو اس خوشی و سعادت کا اطلاعی مراسلہ خاص دوستوں کے ایک گروپ میں ارسال کیا تھا، دوستوں نے جہاں مبارک بادی اور دعاوں سے نوازا، وہیں یہ سوال بھی کیا کہ آخر شادی اور بچے ہوجانے کے بعد خاتونِ خانہ کے لیے حفظ کر لینا کیسے ممکن ہوتا ہے؟ اس پر روشنی ڈالی جائے، جواب میں جو پوسٹ لکھ کر گروپ میں

ارسال کی گئی تھی اسے افادۂ عام کے لیے یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ والد صاحبؒ کے جاری کردہ اس نظام کے دینی فائدے، کوئی سمیٹنا چاہے تو وہ سمیٹ سکے، بالخصوص مدارس اسلامیہ کے وہ اساتذہ جو مدرسہ کی جانب سے فراہم کردہ فیملی کواٹرز میں رہتے ہیں، ان کے لیے یہ نظام بالخصوص مفید و کارآمد ہوسکتا ہے کہ ان فیملی کواٹرز اور ہم بھائیوں کے مکانات ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں''سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ بندے کا اپنا چولہا ہو، گھر والوں سے ایک دم الگ۔ اپنا چولہا اپنی جلن۔ اپنا حقہ اپنی گڑ گڑ۔ دوسرے نمبر پر ضروری ہے: صحیح ٹائمنگ، اور اس باب میں مدرسے کی ٹائمنگ سے بڑھ کر کوئی ٹائمنگ نہیں، بڑی بابرکت ٹائمنگ ہے یہ، پرکھا تو جائے؛ چنانچہ ہم دارالعلوم کے گھنٹوں کو فولو کرتے ہیں، پہلے گھنٹے کی آواز آتے ہی پڑھائی شروع۔ آخری گھنٹہ لگتے ہی چھٹی۔ آیئے پڑھائی شروع کرتے ہیں۔ کہاں سے شروع کی جائے؟۔۔۔۔۔ چلئے مغرب سے شروع کرتے ہیں۔ مغرب بعد نیا سبق یاد کیا جاتا ہے عشا تک، اذان پر چھٹی، عشا کی اذان پر صرف پڑھائی سے چھٹی ہوتی ہے، امور خانہ سے نہیں۔ اذان کے بعد رات کے کھانے کی تیاری کرنی ہے، رات میں سالن نیا نہیں بنے گا، روٹی بھی ابھی نہیں بنے گی، وہ تو عصر میں بن جانی ہے، ہاں عشا کی اذان کے بعد سادہ سفید چاول ضرور بنائے جاسکتے ہیں جن کو بھیگنے کے لیے پہلے ہی رکھ دیا جاتا ہے، اذان کے آدھے گھنٹے بعد نماز ہونی ہے، نماز کے بعد کھانا کھایا جائے گا واضح رہے اگر آپ کا معمول مغرب بعد کھانا کھانے کا ہے تو اسے ضرور بالضرور تبدیل کرنا ہوگا۔ مغرب بعد کا وقت بڑا برکتی اور قیمتی ہے، اسے کھانے کی نذر نہیں کیا جاسکتا بی رات کا کھانا کھا چکنے کے بعد پندرہ بیس منٹ ادھر ادھر گھوم کر کھانا ہضم کرلیں۔ اس کے بعد جلدی سوجانا ہے؛ تاکہ فجر میں اٹھنا آسان رہے، فجر میں اٹھ کر سبق تازہ کریں۔ بعد نماز فجر سبق سنایا جائے گا۔ سنانے کے بعد ناشتہ کی تیاری میں لگنا ہے، واضح رہے کہ ناشتہ کے لیے روٹیاں تازہ نہیں بنیں گی، باسی ہوں گی رات والی؛ بلکہ عصر والی، ناشتہ اسی باسی روٹی سے ہوگا، ہاں اگر سبق سنانے کے بعد آپ کو کافی وقت مل رہا ہو تو ضرور تازہ روٹیاں بنائی جاسکتی ہیں، ناشتہ سے فارغ ہوکر اگر

بچے ہوں تو ان کو اسکول اور مدرسے کے لیے تیار کیا جائے گا۔ بچوں کو بھیج کر خود پڑھنے میں لگا جائے گا۔ پہلے گھنٹے سے چوتھے گھنٹے تک آموختہ یاد کیجیے۔ صبح میں آموختہ ہو کہ صبح میں وقت زیادہ ملتا ہے، شام میں سبقاً پارہ۔ جب آموختہ یاد ہو جائے یا یاد سا ہو جائے تو اس کو دہراتے وقت دوپہر کے سالن کے لیے پیاز لہسن سبزی وغیرہ ساتھ ساتھ کاٹ لیجیے۔ کپڑے بھی واشنگ مشین میں گھمائے جا سکتے ہیں۔ چوتھے گھنٹے کے آس پاس آموختہ سنایا جائے گا۔ سنانے کے بعد کھانے کی تیاری۔ واضح رہے دوپہر میں سالن اتنا بنانا ہے کہ وہ رات کو بھی چلے؛ بلکہ تھوڑا سا صبح ناشتے میں بھی، بارہ بجے تک ہر حال میں کھانا کھا لینا ہے۔ پھر قیلولہ نماز ظہر تک، نماز ظہر کے پندرہ منٹ بعد دارالعلوم کا گھنٹہ لگتا ہے، گھنٹہ لگتے ہی پڑھائی شروع، سبقاً پارہ یاد کیجیے؛ چونکہ سبقاً پارہ ہے؛ اس لیے نسبتاً جلدی یاد ہوگا، ایسے میں بچوں کے ''ہوم ورک'' میں تعاون بھی کر سکتے ہیں۔ عصر کی اذان کے آس پاس سبقا پارہ سنایا جائے گا، عصر کی نماز کے بعد رات کے کھانے کی روٹیاں بنانی ہیں، اور اتنی مقدار میں بنانی ہیں کہ وہ ناشتے میں بھی چلیں، روٹیوں کا بوجھ اگر زیادہ ہو رہا ہو تو سادہ چاول بھی روٹیوں کے ساتھ لگا لیں، کبھی طبیعت اگر ناساز ہو یا مہمانوں کے ساتھ گفتگو میں عصر بعد کا وقت چلا گیا ہو یا روٹیاں بنانے کا دل نہ کر رہا ہو تو روٹیاں اب بازار سے آئیں گی، اسی طرح مشکل سبق والے دن بھی روٹیاں یا پورا کھانا بازار سے آ سکتا ہے، عصر کے بعد مغرب آ گئی، مغرب ہی سے ہم نے آغاز کیا تھا، دن مکمل، معمول اور روٹین سے ہٹ کر جو کام ہیں جیسے سینا پرونا، گھر دھونا، کہیں آنا جانا، کسی کی دعوت کرنا، اس طرح کے امور یا تو عصر کے بعد انجام دیے جائیں گے، یا پھر جمعرات کے دن ظہر بعد سے جمعہ تک میں، یا پھر عورتوں کے اپنے مخصوص دنوں میں انجام دیے جائیں گے۔

تقسیم میراث

والد محترم اپنے مزاج کے مطابق اپنی زندگی ہی میں بچوں کو خود کفیل بنا کر اپنی ذمہ داریوں کو کم کرتے چلے جا رہے تھے، اسی تناظر میں انھوں نے اپنی میراث اپنی حیات ہی میں تقسیم فرما دی، راقم سطور کی نظر میں تقسیم میراث

کا یہ عمل بھی اسی درجہ اہم ہے جیسا اپنی اولاد کو الگ الگ گھر بنا کر دینا۔ رشتہ داروں کی وفات پر والد صاحبؒ کا معمول ہم نے یہ دیکھا کہ وفات کے تین چار دن بعد وہ مرحوم کی میراث تقسیم فرما دیتے تھے، تازہ ترین میراث انھوں نے تین چار مہینے پہلے ہی ہمارے مرحوم بھائی: حافظ سعید احمد رحمہ اللہ کی تقسیم فرمائی تھی، قارئین کرام جانتے ہوں گے کہ گھر کے بڑے کے گزر جانے کے بعد **اللّٰھم لا تفتنا بعدہ** پڑھ پڑھ کر جس فتنہ سے بچنے کی اور پس ماندگان کے درمیان اتحاد، یگانت اور بھائی چارگی کی دعا مانگی جاتی ہے، تقسیم میراث کا یہ عمل؛ اگر اس میں ذرا سی بھی اونچ نیچ رہ جائے تو اس اتحاد و یگانگت کو سبوتاژ کرنے کے لیے اکیلا ہی کافی ہوتا ہے، میراث میں مال و منال ہی نہیں؛ بعض دفعہ دل بھی تقسیم ہو جاتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ والد صاحب کے درجات بلند فرمائیں کہ وہ دلوں کو تقسیم کرنے والے اس مشکل مرحلہ کو اپنی حیات ہی میں بحسن وخوبی انجام دے گئے۔ اپنی وفات سے ڈیڑھ دو سال پہلے اپنے سارے بچوں کو عید الاضحیٰ کی تعطیلات میں دیوبند بلایا، پھر ایک رات سب کو اپنے کمرے میں جمع کیا اور ذاتی خرچہ کی تکمیل کے مد میں کچھ مال روک کر باقی کل اثاثہ بچوں اور بچیوں کے درمیان ان کے شرعی حصے کے مطابق تقسیم فرما دیا، جہاں تقسیم سیدھے سیدھے ہو سکتی تھی وہاں تقسیم سیدھے سیدھے کی، جہاں وجہ ترجیح نہ تھی وہاں حصے قرعہ اندازی کی وساطت سے تقسیم فرمائے، یوں یہ مشکل مرحلہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام پا گیا اور اس تقسیم پر کسی طرف سے آواز نہیں اٹھی۔ یہ اسی پیشگی تقسیم میراث کی برکت تھی کہ اپنی وفات سے پہلے کے آخری ہفتے میں والد صاحب نے دیوبند میں رہ جانے والے بچوں، گھر اور کاروبار کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، ان کو آخری ہفتے میں صرف دو باتوں کی فکر تھی، ایک گٹھامن مدرسہ کا نیا مہتمم اور تعلیمی ذمہ دار کون ہو، اسی مرض الوفات میں انھوں نے رات ڈھائی بجے مدرسہ کے ایک قدیم استاذ و صدر مدرس مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ کو فون کر کے نئے مہتمم کی تعیین فرمائی اور آئندہ کا لائحہ عمل دیا۔ دوسری چیز تھی نماز، انتہائی نگہداشت کی یونٹ میں ہونے کی وجہ سے آخری ہفتہ میں ان کی چند نمازیں قضا ہوئیں، جب بھی وہ بات کرنے کی حالت میں ہوتے تو نہ صرف

تیمارداروں سے قضاشدہ نمازوں کی تعداد کے بارے میں استفسار فرماتے؛ بلکہ نہلانے اور ہسپتال کے ڈریس کے بجائے اپنے معمولی کپڑے پہنانے پر اصرار بھی کرتے تاکہ جو نمازیں قضا ہوئی ہیں ان کو ادا کرسکیں۔ دیوبند میں پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں اگر انھوں نے کوئی پیغام بھجوایا تو وہ صرف یہ تھا کہ بھائی (عم مکرم حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب دامت برکاتہم) کو سلام کہنا!

تعلیم وتربیت

حضرت والد صاحبؒ کثیر العیال تھے، دار العلوم دیوبند میں ترمذی، بخاری اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی اہم اور وقیع کتابوں کی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے کاموں کی بے پناہ مصروفیت کے باوصف آپ نے سب بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ذاتی دلچسپیوں کی بنیاد پر انجام دی، تعلیم وتربیت کی یہ ذمہ داری آپ نے جو اپنی عملی زندگی کے آغاز سے انجام دینی شروع کی تو اسے تاحین حیات تیسری نسل تک انجام دیتے رہے، عملی زندگی کے آغاز میں ہمارے چچاؤں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا، اس تعلق سے تفصیل کی ضرورت نہیں کہ عم مکرم حضرت مولانا مفتی محمد امین پالن پوری صاحب دامت برکاتہم مرتب فتاوی واستاذ حدیث دار العلوم دیوبند تفصیل سے اس پر روشنی ڈال چکے، چچاوں کے بعد اولاد کا نمبر شروع ہوا تو ہمارے سب سے بڑے بھائی مفتی رشید احمد پالن پوری رحمہ اللہ کو حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ ہماری والدہ ماجدہ رحمہا اللہ کو بھی حفظ کرادیا، والدہ محترمہؒ کو حفظ کرانا آپ کا ایک نہایت مفید و مستحسن فیصلہ رہا، والدہ محترمہؒ کی شکل میں ایسا معاون ملا کہ باقی دیگر اولاد کو حفظ کرانے میں والد صاحبؒ کی ریاضت کم ہوگئی، اس کے بعد والد صاحبؒ بچے کو بسم اللہ کراتے، باقی کا کام والدہ ماجدہؒ کا ہوتا جب ناظرہ قرآنِ پاک ختم ہوجاتا تو حفظ شروع کراتے، فجر کی نماز کے بعد ہی والد صاحب سبق سنتے پھر آموختہ اور سبق کے پارے والدہ صاحبہ یاد کراتیں اور سنتیں۔ کہتے ہیں کہ ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ایسے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ درجن بھر اولاد دماغی قوی کے تناظر میں برابر ہو، کمی بیشی ہونا فطری تھا اور

وہ ہوا بھی، ہم میں سے بعض ایسے تھے کہ اپنے مخصوص دماغی قوی کے ساتھ والد صاحبؒ کے پاس حفظ نہ کر پاتے، حفظ کے باب میں جس صبر وتحمل اور ضبط و برداشت کی ضرورت ہوتی ہے وہ صبر و برداشت عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت زیادہ ودیعت کی گئی ہے، پھر وہ عورت اگر ان بچوں کی ماں بھی ہو تو اس کے ضبط و برداشت کا مستوی اور بڑھ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قوائے دماغی میں فرق ہونے کے باوصف والدہ ماجدہؒ سب کو حفظ کرا لے گئیں، جب ہمارا قرآن بالکل تیار ہو جاتا تو دور کے لیے والد صاحبؒ کے پاس بھیجا جاتا، والد صاحبؒ بڑی توجہ سے دور سنتے، اگر بچہ ان کے طے کردہ معیار کے مطابق دور سنا دیتا تو اب وہ اس کو اردو پھر فارسی پڑھانا شروع کرتے، تختی پر لکھنا سکھاتے، یہاں سے والد صاحبؒ کا کام شروع ہو جاتا، اردو، فارسی اور عربی کی کتابیں نصاب کے مطابق وہ بذات خود پڑھاتے، اگر کوئی آسان کتاب ان کے معیار پر نہ اترتیں تو کتاب تصنیف فرماتے، آسان صرف، آسان نحو اور آسان فارسی قواعد اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ذاتی تدریس کے پہلو بہ پہلو معاونین کا تعاون بھی لیتے، حضرت الاستاذ مولانا مفتی خورشید انور گیاوی صاحب دامت برکاتہم ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا قاری شفیق الرحمن صاحب دامت برکاتہم استاذ دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند مدظلہ تعاون ومعاونت کی اسی سلسلۃ الذہب کی آب دار و بارونق کڑیاں ہیں، درجہ دوم عربی یا کبھی درجہ سوم عربی تک تعلیم دی جاتی، اس کے بعد دارالعلوم کے داخلہ امتحان میں شرکت کرائی جاتی، داخلہ ہو جانے کے بعد بچہ کے تعلیمی امور کی نگرانی فرماتے رہتے، درس گاہ کی حاضری اور ششماہی وسالانہ امتحانوں میں ملنے والے نمبر و فیصد پر نظر رکھتے، مدارس میں رائج نصاب کے دوش بدوش ہندی، انگلش اور حساب کے ضروری مضامین اور بنیادی کتب بھی پڑھاتے، پھر فارغ ہونے کے بعد بچہ کو برسر روزگار بھی خود فرماتے، جو مدرسے کی لائن کے ہوتے ان کو مدرسے میں لگاتے، جب کہ دیگر کو کاروبار اور تجارت میں جماتے؛ چونکہ والد صاحبؒ مدرس بھی تھے اور تاجر بھی، دونوں میدانوں کے وہ گرم وسرد چشیدہ تھے؛ اس لیے اپنے بچوں میں ہر دو طبقہ کو ہر دو اعتبار سے ان کی عملی زندگی

کے لائحہ عمل اور طریقِ کار بتاتے اور اپنی زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کی روشنی میں افادہ وفیض رسانی فرماتے رہتے تھے۔

عظمت وعبقریت

آج جب کہ ہم بھی صاحب اولاد ہوگئے ہیں، اور دو دو چار چار بچوں کی تعلیمی ذمہ داریاں سر پر آن پڑی ہیں تو حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کی تعلیم وتربیت کے باب میں ان کی سرفروشانہ کوششوں اور جاں سوز جد وجہد کا اندازہ ہوتا ہے، کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے، درجن بھر اولاد کی صرف تعلیم وتربیت کا فریضہ خوش گوار طور پر انجام دے اور ان کو برسرِ روزگار کر کے اس حد تک خود کفیل بنا جائے کہ والد ومربی کے گزر جانے کے بعد وہ اولاد کسی کی دست نگر ومحتاج نہ رہے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کے کمال وامتیاز کے لیے کافی ہے۔ کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے، صرف تدریس کی وادی کا طویل، پُر پیچ، خم دار اور انتہائی دشوار راستہ اس انداز سے عبور کر جائے کہ وہ اکابر کے لیے بھی رشک بن جائے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کی انفرادیت ویکتائی کے لیے کافی ہے۔ کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے صرف تصنیف وتالیف کے میدان میں کارہائے نمایاں اور علمی وتحقیقی مآثر وخدمات کے دوش بدوش اتنا کام کر جائے کہ کثرتِ نگارش کے تعلق سے وہ اپنی جماعت کے گنے چنے خوش نصیبوں میں شمار ہونے لگے، کثرت تصنیف کے تناظر میں اگر کوئی اسے اپنے دور کا ''حیوانِ کاتب'' کہے تو اِس کہنے والے پر مبالغہ آرائی ورنگ آمیزی کی تہمت ہرگز نہ لگے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کے ممتاز ونمایاں ہونے کے لیے کافی ہے؛ لیکن اگر کسی شخص میں مذکورہ بالا سبھی اوصاف جمع ہوجائیں تو اس کی عظمت وعبقریت کا صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسے لفظوں کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا، اس کو کسی لفظی تعبیر کے ذریعہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ سچ ہے کہ قسام ازل نے والد محترمؒ میں عظمت وعبقریت اور کمال وامتیاز کے مذکورہ عناصر کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے دیگر اور بہت سے عناصر جمع فرما دیے تھے، **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء**۔

تربیت

والد محترمؒ کی شخصیت کے تناظر میں یہ باب مختلف الجہات اور کثیر شاخوں والا ہے جسے ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں، اولاد کی تربیت کے باب میں آپ کتنے فکرمند واقع ہوئے تھے اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ دورۂ حدیث شریف میں سنن ترمذی اور صحیح بخاری کی عبارت خوانی (جسے عام طور سے رواروی کی ایک چیز گردانا جاتا ہے) کے لیے بھی والد صاحبؒ طلبہ کی تربیت فرماتے تھے، ہر کہ ومہ کو ان کے گھنٹے میں عبارت خوانی کا شرف حاصل نہ ہوتا تھا، پہلے عبارت خوانی کا طریقہ صحتِ اعراب اور رفتار سے لے کر انداز تک بتایا جاتا، اس کی روشنی میں خواہش مند طلبہ اپنا نام لکھواتے، پھر ان طلبہ کا اپنی بیٹھک میں ٹیسٹ لیتے، جو نہ چلنے والے ہوتے ان کا نام وہیں کٹ جاتا، جو چلنے والے ہوتے اور ان میں کچھ خامیاں دیکھتے تو اس کی نشاندہی کر کے اسے دور کرنے کی تلقین فرماتے، اس ٹیسٹ کو پاس کرنے والے طلبہ کے نام ایک کاغذ میں لکھے جاتے، پھر یہ فہرست ترجمان کو سونپی جاتی تھی، سونپے جانے کا مطلب یہ نہیں تھا اب ان طلبہ کا نام اس فہرست سے نکل نہیں سکتا، نہیں! پورے سال ان طلبہ کی نگرانی فرماتے، عبارت خوانی کے دوران نحوی، صرفی اور تجویدی غلطیوں کی صورت میں یا طے کردہ معیار سے اِدھر اُدھر نکل جانے کی صورت میں نام کبھی بھی اس فہرست سے نکال دیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو شخص عبارت خوانی جیسی غیر اہم سمجھی جانے والی چیز میں تربیت کا اتنا اہتمام کرتا تھا وہ اپنی اولاد کی تربیت جیسے اہم کام میں کہاں تک فکرمند رہتا ہوگا! یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں کی دینی ودنیوی ہر دو اعتبار سے تربیت میں تا بہ زیست کوشاں رہے اور اس تعلیم وتربیت کے باب میں انھوں نے اپنی سرفروشانہ کوششوں اور جاں سوز جدوجہد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اس حوالے سے ان کے بہت سے واقعات مل جائیں گے، ان کی وفات کے بعد سوشل میڈیا پر آنے والے تعزیتی مضامین میں بھی بہتوں نے لکھے ہیں، ایک دو مجھ سے بھی سن لیجیے!

مدرسی کے زمانے میں میرا امتحان

عصر بعد کی کوئی مجلس تھی، یہ خامہ بردار بھی اس میں موجود تھا، مجلس میں سوال کرنے والا کوئی نہ تھا، قبرستان کا سا سناٹا، اس قسم کا سناٹا ہم جیسوں کے لیے بڑی آزمائش اور امتحان کی گھڑیاں لاتا کہ عام طور سے اس کے بعد والد صاحب کی طرف سے سوال آتا جو کہ خاصا مشکل ہوتا تھا۔ پوچھا: کون کونسی کتاب پڑھاتے ہو؟ کتابوں کے نام بتائے جن میں ایک نام شرح عقائد نسفی کا بھی تھا، پوچھا: شرح عقائد کتنی ہوئی؟ عرض کیا: اتنے صفحے! چند سیکنڈ خاموش رہے، اس کے بعد شرح عقائد کے ان صفحات میں سے جو پڑھائے جا چکے تھے کوئی عبارت زبانی پڑھی اور پوچھا کہ اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟ اللہ اکبر کبیرا، یہ سطور لکھتے وقت اب بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، ان کا رعب اتنا ہوتا تھا کہ آج کے پڑھائے ہوئے سبق میں سے اگر وہ کسی عبارت کے بارے میں سوال کرتے تو زبان تالو سے جا چپکتی، چہ جائیکہ ہفتے اور مہینے پہلے پڑھائے ہوئے سبق کی کسی عبارت کے بارے میں سوال کرنا، جیسے دیگر مدرسین ویسے ہم بھی، پڑھایا اور بھلایا، جواب نہ آنے کے باعث وہ صورت حال سمجھ گئے، عبارت تو چھوڑ دی، پہلے تو خوب سنائی، اس کے بعد اپنی مشہور زمانہ نصیحت: ''وقتی طور سے سبق حل کر کے پڑھانا کوئی کمال نہیں، یوں تو اگر بیس سال بھی ایک کتاب پڑھاوگے تو کتاب یاد نہیں ہوگی، مدرس کا کمال اس وقت ہے جب اس کو اپنی کتاب کے جملہ مباحث ایسے یاد ہوں کہ جب بھی اور جو بھی کتاب میں سے دریافت کرے تو وہ اسی وقت جواب دینے پر قادر ہو، شرح دیکھ کر یا پھر سے عبارت حل کر کے جواب دیا تو کیا جواب دیا''۔ اس کے بعد کتاب کے مضامین یاد رکھنے کے اپنے طریقے بھی بتائے، طریقے بھی وہ جن میں پتے پانی ہوتے ہیں۔

دیوبند کی مشہور چیز

یہ تو تھا خصوصی سوال، ایک عمومی سوال بھی سنیے! عصر بعد کی مجلس تھی، ہم طلبہ اس میں شریک، والد محترمؒ حسب معمول نیم دراز، ایک طالب علم سر میں تیل رکھ رہا تھا، آنکھیں بند، طلبہ کی طرف سے ہلکے پھلکے سوالات جاری، اسی

دوران والد محترمؒ نے ہمارے غیر اہم سوالات چھوڑ کر اپنی طرف سے ایک سوال اُچھالا: سنو! (قدرے خاموشی، سب طلبہ ہمہ تن گوش) ''ایک سوال ہے اس کا جواب دو!'' ایک آدمی دیوبند اپنے کسی کام سے آیا، ایک دو دن میں اس نے اپنا کام نمٹایا، آج شام کو اس کی واپسی کی گاڑی ہے، کچھ پیسے اس کے پاس بچ گئے ہیں، اس نے سوچا کہ واپس جاتے ہوئے ان اضافی پیسوں سے دیوبند کی کوئی مشہور چیز خریدتا چلوں؛ مگر اسے یہ معلوم نہیں کہ دیوبند کی مشہور چیز کیا ہے؟ وہ آپ کے پاس آیا ہے اور آپ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے دیوبند کی مشہور چیز کے بارے میں بتاؤ؛ تاکہ میں اسے خرید سکوں۔ بتاؤ کہ اسے کیا چیز خریدواؤ گے؟

ہم طلبہ نے اپنے دماغ میں ''دیوبند کی مشہور چیز'' کو سوچتے ہوئے جواب دینے شروع کیے، کسی نے کہا: حضرت فلاں ہوٹل کا حلوہ بہت مشہور ہے، حلوہ خریدوائیں گے۔ کسی نے کہا: حضرت دیوبند کے بیر بہت مشہور ہیں بیر خریدوائیں گے۔ کسی نے کہا: قاضی مسجد کے نیچے جو ''پلنگ توڑ'' ملتا ہے، وہ بہت زوردار ہوتا ہے، وہ خریدوائیں گے! والد محترمؒ ہر جواب کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اچھا اچھا! کہہ رہے تھے ایک صاحب نے کہا: حضرت پی پی خریدوائیں گے۔ والد محترمؒ نے وضاحت طلب کی کہ یہ پی پی کیا چیز ہے؟ مجیب نے وضاحت کی کہ حضرت یہ جو آپ کے محلے میں بنتی ہے، بچوں کا کھلونا، جسے بجاتے ہیں تو پی پی کی آواز نکلتی ہے۔ اس پر کھل کھلا کر ہنسے اور ماشاء اللہ! کہا، ان کے ہنسنے سے اہلِ مجلس بھی ہنسے اور اس ماشاء اللہ کہنے نے بھٹکے ہوؤں کو اور بھٹکا دیا، سب سے زیادہ بھٹکے وہ جنھوں نے یہ پی پی والا جواب دیا، ان کو لگا کہ میں نے میدان مار لیا، انھوں نے ابھی ہی سے داد طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا، ہماری کم عقلیاں دیکھیے کہ اس کے بعد تو ہم طلبہ نے خریدوانے کے لیے جن چیزوں کا انتخاب کیا ان کا معیار اور گرتا چلا گیا، ان جوابوں میں کوشش یہ نظر آ رہی تھی کہ ہم بھی حضرت کو ہنسائیں، والد محترمؒ اب اثبات میں صرف سر ہلا رہے تھے، زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے، ہم نے دیوبند کی مشہور چیز کے ذیل میں وہ وہ چیزیں خریدوا دیں جو مشہور بھی نہیں تھیں، جب سب طلبہ

اپنے اپنے حساب سے جواب دے چکے تو مجلس میں خاموشی ہوگئی، ابا نے آنکھ کھولے بغیر پوچھا: کیا سب کے جواب ہو گئے؟ عرض کیا گیا: جی حضرت! پھر خاموشی، اشتیاق کے مارے تھوڑی دیر کی خاموشی بھی گھنٹوں کی خاموشی سی لگ رہی تھی، پی پی والے طالب علم نے ازخود پوچھ بھی لیا کہ حضرت کونسا جواب سب سے صحیح رہا؟ پھر بھی خاموشی رہی، ہم طلبہ کان اور آنکھ دونوں ان پر جمائے ہوئے، کچھ دیر بعد آپ نے دایاں ہاتھ قدرے اٹھایا اور آنکھ کھولے بغیر ہی گویا ہوئے: ”بے قوفو! کتاب خروائیں گے، کتاب!۔۔۔۔ کیا تم لوگ دیوبند کی مشہور چیزوں میں کتاب کو شامل نہیں مانو گے؟ دیوبند کتابوں کا مرکز ہے، حلوؤں، پلنگ توڑوں اور پی پیوں میں تو تم لوگ لے جا رہے ہو، مگر کتاب خانہ میں نہیں گھسا رہے! اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔ یہ جواب سن کر ہم طلبہ ان کی بڑی سی میز کی آڑ میں سر جھکائے اپنی خفت مٹا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہم کہاں خاک میں تھے اور سوال کرنے والا کہاں ثریا پر تھا، ہر چند کہ یہ جواب آپ نے بصارت کی آنکھ کھولے بغیر دیا تھا؛ مگر یہ جواب ہماری بصیرت کی آنکھیں کھول گیا، اب پتہ چلا کہ وہ جو ہنسنا اور ماشاء اللہ کہنا تھا وہ پیرایۂ تبسم میں افسوس تھا، اسی سوال سے یہ بھی سبق ملا کہ ہم تو اصل جواب سے اتنا ہی دور تھے جتنا شِعریٰ ستارہ زمین سے دور ہے۔ اس سوال کے ذریعہ آپ نے ہمارا قِبلہ درست کیا اور ہماری ترجیحات میں علم اور متعلقاتِ علم کو سرِ فہرست رکھنے کا قیمتی سبق پڑھایا، اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے!

ڈرایا ہی ڈرایا

محلہ کی مسجد کے امام صاحب کی طبیعت ناساز تھی، موذن صاحب والد صاحبؒ کی موجودگی میں مصلیٰ پر جانے کو تیار نہ ہوئے، امام صاحب نے مجھ سے صورت حال بتا کر ایک دو دن کے لیے امامت کے فرائض انجام دینے کی گزارش کی میں نے قبول کر لی، فجر کی نماز میں راقم نے پہلی رکعت میں سورہ رحمن کے پہلے دو رکوع پڑھے، اور دوسری رکعت میں ائمہ کے عام معمول کے مطابق اذا الشّمس کورت پڑھی، سلام پھیرا، نماز ختم ہوئی، آیت الکرسی

پڑھنے کے بقدر خاموشی رہی، اس کے بعد والد صاحبؒ نے فرمایا: تم نے ہمیں بس ڈرایا ہی ڈرایا، پہلی رکعت میں بھی ڈرایا، دوسری رکعت میں بھی ڈرایا، پہلی رکعت میں جہنم کی ہولناکیوں سے ڈرایا (سورہ رحمن کے دوسرے رکوع کی طرف اشارہ) دوسری رکعت کے لیے اٹھتے وقت ہم سوچ رہے تھے کہ اب تم تیسرے رکوع: ولمن خاف مقام ربہ جنتان سے تسکین بخش وخوش کن جنت والا مضمون شروع کر کے اس ڈر کو کچھ کم کروگے مگر تم نے اذا الشّمس کورت پڑھ کر ایک بار پھر ڈرایا، اس بار قیامت کی ہولناکیوں سے ڈرایا، پس تم نے ہمیں دونوں رکعتوں میں ڈرایا۔ یہ صحیح نہیں، قرآن کریم میں تقابلات چلتے ہیں، جہاں جہنم کا مضمون آتا ہے وہاں ساتھ ہی جنت کا بھی آتا ہے، جہاں ترغیب کا مضمون آتا ہے وہاں ساتھ ہی ترہیب کا بھی آتا ہے، ایک تقابل کے دونوں مضمون نماز میں پڑھنے چاہئیں، یا تو دوسری رکعت میں سورۂ رحمن کا تیسرا رکوع بھی پڑھتے، اور اگر دو ہی رکوع پڑھنے تھے تو بجائے الرحمن سے شروع کرنے کے کل من علیہا فان سے شروع کرتے۔

ایک سانس میں دو دو تین تین آیتیں

امام صاحب تعطیل عید الاضحیٰ میں گھر گئے ہوئے تھے، نمازوں کی ذمہ داری راقم آثم کے سپرد تھی، کسی امامِ حرم کے طرز کا اتباع کرتے ہوئے بندہ سورہ فاتحہ کی دو دو تین آیتیں ایک سانس میں پڑھ رہا تھا، دو تین نمازوں تک تو والد صاحب نے برداشت کیا، اگلے دن عشاء کی نماز کے ختم پر فرمایا: حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ سورۂ فاتحہ میں ہر آیت کے بعد جواب دیتے ہیں؛ صف میں بیٹھے بیٹھے پہلے اس حدیث کی وضاحت فرمائی اور اللہ کی طرف سے دیے جانے والے جوابات سنائے، پھر راقم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: مگر تم نے قسم کھا رکھی ہے کہ اللہ کو بولنے نہیں دینا ہے، ایک سانس میں دو دو تین تین آیتیں پڑھ ڈالتے ہو! یہ صحیح نہیں ہے، آرام آرام سے پڑھو، ہر آیت پر ٹھہرو!

ولا الضالین کا مد

ایسے ہی کسی موقع پر سورۂ فاتحہ میں ایک اور چیز پر ٹوکا تھا، فرمایا: تمہارے سارے مد صحیح ہیں، مگر ولا الضالین میں معلوم نہیں تمہیں کیا ہوجاتا ہے کہ اسے اعتدال سے زیادہ کھینچتے ہو اور کھینچتے ہی چلے جاتے ہو، پہلے ولا الضالین میں ''ضا'' کو کھینچتے ہو، پھر ''لین'' کے ''لام'' میں وقت لگاتے ہو، اس کے بعد لین کو کھینچتے ہو، سب مل ملا کر اتنا کھینچتے ہو کہ پیچھے ہمارا منہ ''آمین'' کے لیے کھلا کا کھلا رہتا ہے، تم ختم کرو تو ہم آمین کہیں، تمہارا ہی ختم نہیں ہوتا، ولا الضالین کے مد کو بھی دیگر مدوں کے برابر معتدل کرو۔

اولاد کو حج کرانا

والدین محترمین نے سب بچوں کی شادیاں جس اہتمام وترتیب سے کیں اسی اہتمام سے ہم نے ان کو اپنے بچوں کو حج کراتے ہوئے بھی دیکھا، جب وہ بڑے لڑکے کو الگ کرتے تھے اور کچھ دنوں بعد اس کا گھر چلنے لگتا تھا تو اسے الگ بلا کر ہدایت کرتے تھے کہ خرچوں میں سے کچھ پس انداز کرو اور حج میں جانے کی رقم جمع کرو، تمہیں صرف اپنے حصہ کے بقدر حج کے پیسے جمع کرنے ہیں، تمہاری بیوی کے حصے کے پیسے میں دوں گا۔ فرماتے: حج میں بیوی کا ساتھ ہونا ضروری ہے، وہ بیچاری ساری زندگی خدمت کرتی ہے، بیوی جب زندگی کے سفر میں ساتھ ہے تو اس سفر میں بھی ساتھ رہنی چاہیے۔ یہ بھی فرماتے کہ حج کا مزا جوانی کے دنوں میں ہے، بھائیوں میں جو تدریسی فرائض انجام دے رہے ہوتے ان سے بالخصوص فرماتے تھے کہ تم لوگوں کا حج کرنا تو اور بھی ضروری ہے، حج کر لوگے تو حدیث وفقہ کی کتابوں میں آنے والا باب الحج پڑھانا آسان ہوجائے گا، ورنہ ٹامک ٹوئیاں مارو گے۔

عام طور سے دو دو بھائیوں کو ان کی بیویوں کے ساتھ بھیجتے تھے، بڑی بہن کو بھی اسی طرح ان کے شوہر کے ساتھ بھیجا، راقم سطور کی باری میں ہم تین بھائی ایک ساتھ تھے، دو بھائیوں نے تو حج کے پیسے مکمل جمع کر لیے تھے کہ اصلاً نمبر انھیں کا تھا، راقم چونکہ تدریسی خدمت انجام دینے لگا تھا اس لیے غالباً والد صاحبؒ نے مناسب سمجھا کہ اس کو بھی حج کرا دینا چاہیے، مجھے بلا کر کہا: تمہارے دو بڑے بھائی پیسے جمع کر چکے، تمہارے پاس اگر پیسے

ہوں تو تم بھی ان کے ساتھ چلے جاو! عرض کیا کہ میرے پاس پیسے پورے نہیں، کتنے ہیں؟ ۶۰ ہزار کے آس پاس ہوں گے (ان دنوں ایک بندے کے سفر کا خرچ ۹۰ ہزار تھا، یہ سن ۲۰۰۷ کی بات ہے) فرمایا: تم بھی فارم بھر لو، تمہاری بیوی کا حصہ تو میں ڈال ہی رہا ہوں، تمہارے حصے کے جو پیسے بچ رہے ہیں وہ بھی دے دیتا ہوں، حج سے فارغ ہونے کے بعد ادا کرتے رہنا۔ یوں ہم تین بھائیوں نے ایک ساتھ حج ادا کیا۔ حج کے بعد جب ادھار والے پیسے جمع کر کے والد صاحبؒ کو دینے گیا تو آپ اپنی بیٹھک میں حسبِ معمول لکھنے میں مشغول تھے، ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر مسودہ کی طرف متوجہ ہو گئے، اسی کی طرف متوجہ رہتے ہوئے پوچھا کہ کیوں آئے ہو؟ عرض کیا کہ وہ پیسے جو آپ نے حج سے پہلے دیے تھے دینے آیا ہوں، فرمایا: اچھا، ٹھیک ہے، ان کو اپنے خرچوں میں لے آو!

حج میں جانے والے بیٹوں اور بہوؤں کو ایک نصیحت یہ بھی فرماتے کہ حج کے سفر میں مشکلات پیش آسکتی ہیں، اور جب مشکلات پیش آتی ہیں تو لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں، حالات چاہے جیسے پیش آئیں تمہیں آپس میں لڑنا نہیں ہے، صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالی والدین کے درجات بلند فرمائیں کہ ان کی مدد و اعانت سے ہم کو بھرپور جوانی میں حج کی سعادت نصیب ہوگئی، حفظ قرآن کریم کے بعد یہ دوسری اہم ترین سعادت ہے جو والد صاحبؒ کی عنایتوں، نوازشوں اور توجہات کے طفیل ہم سب بھائیوں، بھابھیوں، بہنوں اور بہنوئیوں کو حاصل ہے۔ چھوٹے تین بھائی بہن (فاطمہ، عبداللہ اور عبیداللہ) کا حج باقی ہے، عبداللہ بھائی کی تیاری مکمل ہے، سب بھائیوں نے طے کیا ہے کہ ان سب کو بھی والد صاحبؒ کے طرز پر حج کرائیں گے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں اور ہم سب میں اتحاد و اتفاق باقی رہے (آمین)۔ حج کر کے معلوم ہوا کہ حج واقعی جوانی میں ہونا چاہیے، کاتب سطور کو سفرِ حج کے دس سال بعد اللہ تعالی کے فضل وکرم سے سفر عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی، اس سفر میں اہلیہ ساتھ نہیں تھیں تو اس سفر میں یہ بھی پتہ چلا کہ والد صاحبؒ کیوں بیوی کے ساتھ بھیجنے کا اہتمام فرماتے

تھے!

صبر و استقامت

استقامت کے باب میں راقم سطور کی گناہ گار آنکھوں نے والد صاحبؒ سے بڑھ کر حالات پر صبر کرنے والا نہیں دیکھا، مشکل حالات میں نہ صرف وہ خود صبر کرتے تھے؛ بلکہ دوسروں کو بھی صبر کرنے اور اللہ سبحانہ وتعالی سے لولگانے کی تلقین فرماتے تھے، ہر چند کہ ان کے دل کا بڑا آپریشن ہو چکا تھا، اس طرح کے لوگوں کو کسی حادثہ کی خبر دینے سے پہلے خبر کا مضمون اور خبر دینے کا طور وڈھنگ سوچنا پڑتا ہے کہ مبادا وہ خبر دلی صدمہ کا باعث بن جائے! مگر بحمد اللہ والد صاحبؒ کے تعلق سے اتنے اہتمام اور غور وفکر کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، ان کے ارد گرد کے لوگ ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو رہے تھے، اس طرح کی خبریں سن کر وہ کوئی بڑا صدمہ لینے کے بجائے آخرت کی اپنی تیاریوں کو اور بڑھا دیتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں ان کے دیرینہ رفیق حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوری صاحب رحمہ اللہ کا جب وصال ہوا تو والد صاحبؒ ان دنوں لندن میں تھے، یہ خبر والد صاحب کے لیے بڑی اندوہ ناک تھی، حسن بھائی آپ کے ساتھ تھے ان کا بیان ہے کہ جب میں نے حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کے انتقال کی خبر والد صاحبؒ کو دی تو وہ سن کر خاموش ہو گئے، کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا: ”اب میرا نمبر ہے“۔ اسی خبر کے بعد والد صاحبؒ نے آخرت کے سفر کی تیاریوں کے تناظر میں میراث اپنی حیات ہی میں تقسیم فرمائی، نیز آسان بیان القرآن پر رات دن اتنی تیزی سے کام کیا کہ اپنے کمپیوٹر آپریٹر حسن بھائی کی ساری توانائیاں نچوڑ لی، وہ بیمار ہو گئے تھے۔

ذاتی نقصان کے قبیل کی اسی طرح کی ایک بڑی خبر: والد صاحبؒ کے دنیوی کاموں میں ان کے سب سے بڑے معین ومددگار وسہولت کار، بھائی احمد سعید اور ہمشیرہ خورد کے خسر محترم، جامعہ نور العلوم گٹھامن کے بانی ومہتمم، گجرات کے سفر میں والد صاحبؒ کے واحد میزبان، ہم سب کے محسن: محمد چچا کے انتقال کی خبر بھی تھی، چچا مرحوم کی

طبیعت ایک دو برس سے کافی تولہ ماشہ ہوتی رہتی تھی، ان کے تعلق سے فکرمندی رہتی تھی کہ اگر چچا کا انتقال والد صاحبؒ کی حیات میں ہوا تو خبر کس طور سے دی جائے گی، تکوینی طور سے ہوا یہ کہ ان کا انتقال ایک دم ہوا، انتقال سے قبل والی رات ہی میں ان سے ان کی صاحب زادی نے بات کی تھی، پس انتقال کی خبر اچانک آئی اور ایسے وقت میں آئی کہ گھر میں کوئی مرد بھی نہیں تھا، پڑھانے والے بھائی اپنے اپنے مدرسوں میں تھے تو دکان والے اپنی دکان پر، خود والد صاحبؒ بھی بخاری کے گھنٹے کے لیے تیار بیٹھے تھے، اور چائے کے انتظار میں تھے، گجرات سے فون پر اطلاع دینے والوں نے پہلے نہ حضرت والد صاحبؒ کو اطلاع دی اور نہ چچا مرحوم کی صاحب زادی بیگم احمد سعید کو اطلاع دی، پہلی اطلاع بیگم قاسم کے پاس آئی، خبر اتنی بڑی تھی اور آنا فانا آئی تھی کہ انھوں نے بھائیوں کا انتظار نہیں کیا، بھابھیوں کو ساتھ لے کر رندھے گلے اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ والد صاحبؒ کو اطلاع دی کہ محمد چچاؒ کا انتقال ہو گیا ہے، والد صاحب نے إنا للہ وإنا إلیہ راجعون پڑھا، بھابھیوں کو تسلی دی کہ اس میں رونے والی بات نہیں، سبھی کو اللہ کے پاس جانا ہے، کوئی پہلے جاتا ہے کوئی بعد میں، پھر گٹھامن، پالن پور چچا مرحوم کے گھر فون کیا، اس کے بعد مرحوم کی صاحب زادی بیگم احمد سعید کو بلوایا، ان کو ان کے والد صاحب کے گزر جانے کی اطلاع دی، ساتھ ہی چند کلمات تسلی بھی کہے اور یہ کہہ کر بخاری شریف کا گھنٹہ پڑھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ابھی تو پڑھانے کے لیے جا رہا ہوں، واپس آؤں گا تو پالن پور جانے کے تعلق سے ترتیب بناؤں گا۔ حسبِ معمول آپ نے گھنٹہ پڑھایا اور چچا مرحوم کے لیے دعا بھی کرائی۔ جس خبر میں ہمیں والد صاحبؒ کے آپریشن اور عمر کی فکر تھی اسی خبر میں والد صاحبؒ ہماری فکر کر کے ہمیں کلمات تسلی اور صبر کی تلقین فرما رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی رحلت کے بعد ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔

❁...❁...❁

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

کی کتاب زندگی کے کچھ اوراق

مولانا محمد سعید صاحب پالن پوری
حال مقیم ممبئی

(حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی کتاب زندگی کے یہ چند واقعات ۲۶؍شعبان المعظم ۱۴۴۱ھ؍مطابق ۲۱؍اپریل ۲۰۲۰ء کو اپنے خاص میزبان جناب حافظ آصف صدیقی کے مکان کرشمہ اپارٹمنٹ، جوگیشوری ممبئی میں قیام کے دوران بڑے شرح صدر اور فراخ دلی کے ساتھ بیان فرمائے، جنھیں ریکارڈ کرلیا گیا تھا، ہماری دعوتی تحریک کے ایک رکن، اور مفتی صاحب کے عاشق صادق مولوی محمد سعید پالنپوری نے انہیں تحریر میں منتقل کیا۔) (بشکریہ ماہنامہ ارمغان)

شرح وقایہ کی چاروں جلدوں کا مطالعہ کر کے حل کیا اور جا کر کے حسین بخش مدرسہ میں شرح وقایہ کا امتحان دے کر ہدایہ میں داخلہ لیا، اتنی استعداد نیچے سے بنتی ہے اب یہ استعداد نہیں بنتی، اچھا اوپر جا کر مشکوۃ میں جلالین میں جا کر شوق پیدا ہوتا ہے مگر ''اب کیا ہووت ہے جب چڑیا چگ گئی کھیت'' کہ نیچے سے تو کچا ہے تو اوپر کیا ہونا ہے۔

سوال: اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس کی بہت سی وجہیں ہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ عربی اول سے چہارم تک کچے اساتذہ ہوتے ہیں جن کو خود پڑھنا بھی نہیں آتا، ایسوں کو بٹھا دیا جاتا ہے، پہلے ہمارے طالب علمی کے زمانے میں پہلا دُھورن ہیڈ ماسٹر پڑھاتا تھا، بچوں کو کیسے لے کر چلنا ہے وہ ہیڈ ماسٹر جانتا ہے، اب نیا فارغ ہے اس کو لا کر عربی اول

پڑھانے بٹھادیا، اس کو عربی پڑھنا ہی نہیں آتا وہ کیا پڑھائے گا، ایک سبب تو یہ ہے، اساتذہ ماہر ہوتے ہیں وہ جگہ جگہ پر اجراء کراتے ہیں، اسی سے پوچھیں گے، نہیں بتائے گا تو اس کا قاعدہ یاد کرائیں گے، اب اساتذہ کو پیچھے کی چیز یاد ہی نہیں تو ایک تو سبب یہ ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ طلباء اپنے لئے نہیں پڑھتے ابا کے لئے پڑھتے ہیں اپنے لئے پڑھنے کا مسئلہ اور ہوتا ہے، ابا کے لئے پڑھنے کا مسئلہ اور ہے، میں اپنی مثال دوں، کالیڑا میں مکتب میں پڑھا، ابا کے لئے پڑھا، ابا نے داخل کرایا تھا کہ پڑھنا ہے پڑھنا ہے، پھر چھاپی لے گئے ماموں، وہاں بھی پڑھا، پھر پالن پور میں چار سال پڑھا وہ بھی ابا کے لئے پڑھا، کچھ پڑھتے نہیں تھے، ڈھونگ کرتے تھے کھیل کود کرتے تھے اور اساتذہ کو دھوکہ دیتے تھے، اساتذہ کو دھوکہ کیسے دیتے تھے، الفیہ ابن مالک شروع ہوئی، تو حضرت مولانا محمد اکبر صاحب سبق نہیں سنتے تھے، تو کیوں یاد کریں جب وہ سبق ہی نہیں سنتے تھے، یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن پھر سبق سننے لگے تو اب اسکو یاد کرنا پڑھتا تھا۔

ہم دو ساتھی تھے، میں تھا، مولانا کے لڑکے مولوی عبدالقادر تھے، ہم دو ساتھی تھے، تو بعض مرتبہ ترجمہ پوچھنے کے لئے وہ جاتا اور ترجمہ پوچھ کر آتا تھا، بعض مرتبہ میں جاتا اور پوچھ کر آتا اور یاد کرتا تھا، چند دن میں اندازہ ہوا کہ جس دن ہم نے یاد کیا ہے پوچھ پوچھ کر، اس دن وہ سبق نہیں سنتے تھے اور جس دن ہم نے یاد نہیں کیا اس دن سبق سنتے تھے، بس ہم نے اسی وقت طے کیا کہ پریشان کرو، کیونکہ ہم اپنے لئے تو پڑھتے ہی نہیں تھے۔

مولانا بخاری صاحب تھے انہوں نے میرے ابا کو بلا کر کے کہا کہ اس کو دیوبند چھوڑ کر کے آؤ تو مجھے ابا دیوبند لے کر چلے تو پہلے پالن پور سے میٹر گیج، پھر دہلی میں گاڑی بدلی تو کوئی مولانا صاحب ملے ہوں گے ابا کو مجھے یاد نہیں، انہوں نے بات چیت میں بتایا کہ میں اس بچے کو دیوبند پڑھنے کے لئے لے کر جارہا ہوں، انہوں نے پوچھا کیا پڑھتا ہے، تو کہا کہ شرح جامی پڑھ کر آیا ہے اور پھر دوبارہ شرح جامی پڑھے گا، تو انہوں نے کہا پھر اس کو دیوبند میں داخل مت کرو، مظاہر علوم میں داخل کرو، وہاں شرح جامی اچھی ہوتی ہے، تو ابا یہاں اترنے کے بجائے

سہارن پور چلے آئے، اور جو کتابیں میں پڑھ کر آیا تھا انہی میں مجھے داخل کیا، خیر وہاں بھی پڑھا، وہاں سبق میں حاضر رہنا ضروری تھا، اور باقی وقت چھٹی ہوئی تو سائیکل لے کر چلے گئے، مجھے سائیکل چلانے کا بہت شوق تھا، تو سارے سہارن پور میں گھومتا تھا سائیکل پر، پھر ہو گیا مجھے ٹائفائڈ، اور ٹائیفائیڈ بہت خطرناک ہو گیا دو مہینے ہو گئے، اسی ٹائیفائیڈ کے زمانے میں حضرت مدنی کا انتقال ہوا، تو جب میں بے ہوش رہنے لگا تو مولوی محمد سورتی یہ میرے ساتھی ہیں ہمارے کمرہ کے شریک ہیں انہوں نے ابا کو ٹیلی گرام کیا کہ یہ صورت حال ہے، اگر اس کو زندہ دیکھنا ہو تو آجاؤ، اُدھر یہ ہوا کہ ہمارے گھر کے سامنے دو بڑے بڑے کھیت تھے اس میں گنّا تھا اور سردی کا زمانہ آرہا تھا، کولہو چلنے والے تھے اور مولوی امین اور میرے ایک بڑے بھائی تھے مولوی عبد المجید، دونوں نے بھینسیں چراتے ہوئے کہیں آگ جلائی اور وہ آگ کھیت میں لگ گئی اور وہ دونوں کھیت جل گئے، ابا اکیلے کیا بچاتے اس کو، یہ دن بھر پریشان ہو کر رات میں گھر آئے، اور یہ ٹیلی گرام پہنچا، تو کچھ بولے نہیں کسی کو، رات بھر نیند کیا آتی، صبح گھر والوں سے کہا کہ میں سہارن پور جا رہا ہوں اور وہ گنّے بچاتے بچاتے جو کپڑے کالے ہو گئے تھے وہی کپڑے پہن کر سہارن پور چل دیئے، تو دادی نے والدہ سے کہا کہ یہ حادثہ پیش آیا ہے وہ سہارن پور خواہ مخواہ نہیں جا رہے ہیں، ان کو کپڑے پہنچا دو، والدہ کپڑے لے کر گئیں ایک گاؤں تھا سینڈھنی، وہاں جا کر کے روکا اور کپڑے بدلوائے، خیر وہ آئے تو میں تو بالکل بے ہوش تھا اور ڈاکٹر نے کہا، وہ سکھ ڈاکٹر تھا اس کا علاج تھا، اس نے بھی کہا اس کو گھر مت لے جاؤ یہ تو مر جائے گا، ناظم صاحب مولانا اسعد اللہ صاحب نے بھی کہا کہ اس کو گھر مت لے جاؤ۔ والد صاحب نے کہا: مر جائے تو مرنا تو ہے ہی، لے جاؤں گا میں تو گھر میں، خیر وہ مجھے لے کر چلے، سہارن پور کے طلباء نے بٹھا دیا گاڑی میں، لیکن دہلی میں ایک پلیٹ فارم سے اتر کر دوسرے پلیٹ فارم جاتے ہوئے، ابا کو تو کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہیل چیئر ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا ہے، وہ مجھے چلا کر لے گئے، اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں، خیر اگلی گاڑی میں بٹھایا پھر مجھ سے پوچھا کچھ کھانا ہے؟ میں نے تو دو مہینے سے کھایا

نہیں تھا تو میں نے کہا ہاں کھانا ہے، وہ گئے اور پوری اور گوشت لائے اسٹیشن پر سے، میں نے خوب کھایا، پھر کہا اور کھاؤ اور دوسری مرتبہ لائے اور کھایا، پالن پور پہونچتے پہونچتے تین مرتبہ کھلایا، تو پالن پور پہونچتے پہونچتے اتنی طاقت آگئی کہ میں اسٹائل کر کے باہر نکلا تو مولانا نذیر صاحب کے پاس لے گئے، اس وقت وہ حیات تھے ان سے ملاقات ہوئی دوا وغیرہ لی، ڈاکٹروں نے یہ کہہ دیا تھا کہ اس کو کوئی چیز کھلایئے گا مت ورنہ یہ مرجائے گا، تو ابا نے کہا کہ مرجائے گا تو لاش لے جاؤں گا، بھوکا کیوں مرے، کھا کر کیوں نہ مرے، خیر ابا نے دوا لے لی، میں گھر گیا ایک ہفتہ ہو گیا، تو اتنی طاقت آگئی کہ میں خود چلنے پھرنے لگا۔

اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا، ہمارے گھر ہوتے ہیں لمبے جس میں کوٹھی رکھ کر پارٹیشن کرتے ہیں، میں کوٹھوں کی اُس طرف چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور اِس طرف کچن تھا اس طرف ابا اور ان کی امی میری دادی آپس میں دونوں باتیں کررہے تھے، میں یہاں سن رہا تھا، ابا نے اپنی امی سے کہا مجھے اب احمد کو پڑھانا نہیں ہے، میرا نام احمد ہے اصل، کہا اس کو پڑھانا نہیں ہے، امی نے پوچھا کیوں نہیں پڑھانا ہے، تو کہنے لگے دیکھو میں اسے چھوڑنے گیا تو اتنا خرچ آیا پھر بیمار ہو گیا تو بیماری کا اتنا خرچ آیا، پھر اس کو لایا تو اتنا خرچ آیا، میرا کھیت جل گیا اتنا نقصان ہوا، اب یہ پھر جائے گا اتنا خرچ آئے گا، پھر یہ دو مہینے کے بعد گھر آئے گا، اتنا خرچ آئے گا، پڑھا تو اس نے کچھ نہیں، یہ سب میں نے سنا۔

سوال: تو دادی اس کا کیا جواب دیتی ہیں؟

جواب: اس وقت میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مجھے پڑھنا ہے رات بھر مجھے نیند نہیں آئی، فجر کی اذان کے وقت میں اٹھا اور والدہ کی چارپائی پر بیٹھ گیا، والدہ کی آنکھ کھلی تو کہا کیا بات ہے؟ کچھ تکلیف ہے، میں نے کہا کوئی تکلیف نہیں ہے، میرا سامان تیار کردو، میں سہارن پور جارہا ہوں، کہنے لگیں، اسی حال میں، میں نے کہا اسی حال میں، انہوں نے سامان وغیرہ تیار کیا اور کھانا بھی، اس وقت گاڑیوں میں کھانا نہیں ملتا تھا، کھانا لے کر چلنا پڑتا تھا اور

جنتا(جنرل) میں کوئی ریزرویشن بھی نہیں ہوتا تھا ویسے ہی چلتے تھے،تو ابا کی آنکھ کھل گئی،سردیوں کا زمانہ تھا،مگر وہ اٹھے نہیں، میں جب سامان لے کر چلا اور والدہ ساتھ میں چلیں سامان لے کر،تو میں نے جاتے جاتے کہا، ابا میں سہارن پور جارہا ہوں،تو ہاتھ نکالے اور مصافحہ کیا، میں مصافحہ کر کے والدہ کیساتھ چلا گیا،سینڈھنی تک تو والدہ گئیں اس کے بعد ماموں آ گئے مجھے چھوڑنے کے لئے، میں پالن پور پہنچا اور عالمگیر ایک ہوٹل تھا، یہ ہمارے لوگوں کا تھا، میں وہاں باہر جا کر باکھڑے پر بیٹھ گیا، پیچھے سے میری دادی نے ابا کو بہت لعنت ملامت کی،تو دوسری بس سے والد صاحب آئے ،وہ بھی آکر میرے پاس بیٹھ گئے، مجھ سے کچھ بولے نہیں، جب گاڑی کا وقت ہوا،تو میں نے ایک مزدور کو بلا کر اپنا سامان اٹھوایا، والد صاحب بھی میرے ساتھ چلے، والدہ نے مجھے ڈیڑھ سو روپئے دئے تھے،تو میں نے جا کر ٹکٹ لیا والد صاحب دیکھتے رہے، میں جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا، وہ کھڑے رہے، گاڑی چل گئی ،وہ مجھ سے کچھ نہیں بولے، بس وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، اس کے بعد سے میں نے سائیکل کی دم بھی نہیں دیکھی، اور میں نے کتاب ہاتھ سے رکھی بھی نہیں، اسلئے اپنے لئے پڑھنے کی بات اور ہے ابا کی لئے پڑھنے کی اور ہے۔

سوال: یہ واقعہ کب کا ہے حضرت؟

جواب: یہ واقعہ شرح جامی کے سال کا ہے۔

سوال: اس وقت آپ کی عمر کتنے سال کی تھی؟

جواب: اس وقت میری عمر ۱۱ر سال کی تھی شرح جامی ۱۱ر سال میں ہی شروع ہوگئی تھی

سوال: پڑھنے آپ کب بیٹھے تھے؟

جواب: پڑھنا تو میں نے بچپن ہی سے شروع کر دیا تھا، مجھے یاد نہیں کہ میں کب بالغ ہوا،لیکن سہارن پور میں جب پڑھتا تھا اس وقت بالغ نہیں ہوا تھا۔

سوال: حضرت آپ نے حفظ کب کیا؟

جواب: حفظ کا قصہ یہ ہے، سوانح نذیر میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ یوپی کے کوئی عالم آئے تھے حضرت مولانا محمد نذیر صاحب کے پاس، مولانا نذیر صاحب نے ایک طالب علم سے کہا چند آیتیں ان کو حفظ سناؤ، تو اس کو چند آیتیں حفظ یاد ہوں گی سنادی، تو اس پر ان مولانا نے کہا کہ آپ کے یہاں حافظ نہیں ہوتے؟ تو حضرت نے کہا کہ ناظرہ پڑھ لیں یہی غنیمت ہے یہاں حفظ کون جانتا ہے، میرے بڑے ماموں تھے مولانا ولی محمد صاحب وہ وہاں طالب علم تھے، یہ سب سوانح نذیر میں لکھا ہوا ہے کہ مولانا ولی محمد صاحب نے کہا کہ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ حفظ بھی کوئی چیز ہے قرآن پورا حفظ کر سکتے ہیں، تو ماموں پالن پور سے پڑھنا چھوڑ کر ڈابھیل چلے گئے، ان کے چھوٹے بھائی تھے مولانا حبیب الرحمن وہ ڈابھیل سے فارغ تھے اور ماہی میں پڑھاتے تھے، بہت جوانی میں انتقال ہو گیا، اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر گئے اور ڈابھیل میں جا کر ان کو حفظ میں بٹھایا، یہ ہماری قوم کا پہلا حافظ ہے، اس سے پہلے ہماری قوم میں کوئی حافظ نہیں تھا، انہوں وہاں حفظ کیا پھر فارغ ہوئے، اور انہوں نے ہمارے خاندان میں سب سے پہلے حج کیا، اس زمانے میں چارسو روپئے میں حج ہوتا تھا، یہ چارسو روپئے انہوں نے، ان کو طالب علمی کے زمانے میں جو خرچہ ابا دیتے تھے اس میں سے بچا کر جمع کیے تھے، اور فارغ ہوتے ہی حج کا پروگرام بنایا اور پونے چارسو روپئے میں حج کر کے آ گئے اور پچیس روپئے بچا لئے، وہ بہت جید حافظ تھے اور رمضان میں ۲۴ گھنٹے میں ایک قرآن ختم کرتے تھے، اور اپنی والدہ کو ایصال ثواب کرتے تھے، ان کی موت کے وقت کا قصہ ہے، قرآن بہت زور زور سے پڑھتے تھے اور بہت پڑھتے تھے خاندان والوں نے کہا ان کو روکنا چاہئے وہ رکتے نہیں تھے مانتے نہیں تھے، تو سب نے کہا ان کے بڑے بھائی مولانا ولی محمد صاحب سے کہو، ان کو استاذ کی جگہ مانتے ہیں، انہوں نے کہا بھائی قرآن مت پڑھو، انہوں نے جواب دیا کہ قرآن نہ پڑھوں، انہوں نے کہا اتنا زور سے مت پڑھو، تو انہوں کہا ٹھیک ہے، پھر آہستہ پڑھنا شروع کر دیا اور اخیر تک پڑھتے رہے، تین

دن پہلے سے یہ کہنا شروع کیا، جمعہ کب ہے، گاؤں ہے وہاں جمعہ تو ہوتا نہیں تھا، تو بتایا گیا کہ ابھی تین دن باقی ہیں، تو ساری بہنوں اور بھائیوں کو جمعہ کے دن بلا لیا، جب ظہر کی اذان ہوئی، سب ظہر پڑھنے کے لئے گئے، گھر میں صرف میری والدہ اور ان کی بہن میری خالہ تھی، اور باقی سب مرد نماز پڑھنے چلے گئے، تو انہوں نے بہنوں سے کہا مجھے پیشاب کرنا ہے، پیشاب کرنے لئے کوئی انتظام تو تھا نہیں، تو دونوں بہنیں بازو سے پکڑ کر لے چلیں، دروازے پر پہنچے تو ایک دم کھڑے ہو گئے اور کہا وعلیکم السلام، وہیں کھڑے کھڑے ختم ہو گئے، پھر نمازی نماز پڑھ کر آئے تو سارا گھر خوشبو سے مہک رہا تھا، لوگوں نے کہا کہ کیا خوشبو لگائی یا جلائی ہے، انہوں نے کہا میں نے تو کچھ نہیں جلایا، وہ اللہ کے نیک بندے تھے حافظ قرآن تھے جید حافظ تھے، ان کے تین بچے تھے ایک میری اہلیہ تھی، جو سب سے بڑی لڑکی تھی اور ایک اس سے چھوٹی لڑکی وہ بھی حیات ہے اور کالیڑا میں ہے، اور ایک لڑکے تھے، ان کا انتقال ہو گیا، انہوں نے بیوی کو طلاق دیدی پھر اس بیوی کا نکاح ہوا تھا جسلینی میں مولانا نور محمد صاحب کے ساتھ، اور بچے اپنے ابا کے ساتھ رہتے تھے اور وہ ماہی میں پڑھاتے تھے، میرا رشتہ بچپن سے بڑے ماموں کی لڑکی سے ہوا تھا، انہوں نے مرنے سے پہلے والدہ سے یہ کہا کہ میرے ذہن میں یہ ہے کہ سفینہ کا رشتہ احمد (مفتی سعید احمد صاحب) سے کروں، بس اتنا ہی کہا، بات ختم ہو گئی، اب وہ بہن کے لئے بڑا مسئلہ بن گیا، اب رشتہ ٹوٹ کر میرا یہ رشتہ بن گیا، اور یہ میرے گھر آ گئیں، پھر ماموں نے بہن سے یہ بھی کہا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ اس کا رشتہ احمد سے کروں اور اس کو حافظ بناؤں، اتفاق ایسا ہوا کہ اس کا رشتہ میرے سے ہوا، اور وہ میرے گھر آ گئیں تو میں ان سے کہتا تھا، حفظ شروع کرو، کیونکہ انہوں نے مجھ سے یہ قصہ سنایا تھا، میں نے والدہ سے تو نہیں سنا تھا، انہی سے سنا تھا تو کہنے لگیں، میں کیسے حفظ کروں گی، یہ ہے وہ ہے، جب میرے بڑے بیٹے مولوی رشید احمد کے حفظ کرنے کا وقت آیا تو میں نے اس کی والدہ سے کہا کہ تم دونوں حفظ شروع کرو، ہمت کر کے انہوں نے بھی شروع کیا اسی درمیان میں دیوبند میں تقرر ہو گیا، تو میں لڑکے کو ساتھ لے کر آیا اور گھر والی کو گھر چھوڑ آیا، درمیان

میں چار سال کا وقفہ ہوا، انہوں نے چار سال پہلے حفظ کیا، اوران کا چار سال بعد حفظ ہوا، اسکے بعد سارے لڑکوں کو حفظ کروایا، لڑکیوں کو بھی حفظ کروایا پوتوں کو، بہوؤں کو بھی حفظ کروایا، جب تک زندہ رہیں حفظ کرواتی رہیں۔

سوال: خود ہی پہلے حفظ کرلیا؟

جواب: وہ بہت قرآن پڑھتی تھیں، راشدہ بتارہی تھی کہ شروع شروع میں جیسے جیسے کوئی پڑھتا ہے ویسے ہی خالہ رمضان میں بہت ہی قرآن پڑھا کرتی تھیں؟

سوال: اور آپ نے کب حفظ کیا؟

جواب: میرا قرآن صحیح نہیں تھا، ناظرہ بہت کچا تھا، جب میں فارغ ہوکر دارالافتاء آ گیا، ابا تو مجھ کو پہلے سے ہی پڑھوانا نہیں چاہتے تھے، لیکن میں پڑھتا رہا پڑھتا رہا اور فارغ ہوکر آیا، اب ابا کی اور بڑے ماموں کی رائے یہ ہوئی کہ اس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پڑھنے بھیج دیں اور یہ طب پڑھے اور مولانا نذیر صاحب نے جس طرح سے کام کیا وہی یہ بھی کرے، اور دو چار پیسے کمائے اور دین کی خدمت کرے، اس طریقہ سے یہ کام کرے، میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا میں یہ سمجھتا تھا کہ مولانا کی مثال شاذ مثال ہے یہ ممکن نہیں مجھے معلوم تھا کہ مولانا کے جیسا ہونا ممکن نہیں ہے، رمضان بعد مشورہ کرتے رہے کہ اس کو بھیجنا ہے اور پھر میرے متعلق بات کرتے رہے کہ رمضان کے بعد مجھے وہاں بھیجیں گے تو میں بعد رمضان تیاری میں لگا ہوا تھا، تو مجھ سے پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے تو میں کہا ، پڑھنے جانے کا ارادہ ہے، تو کہنے لگے دیوبند تو تم پڑھ چکے ہوں، اب کیا پڑھو گے؟ میں نے کہا کہ افتاء میں داخلہ لوں گا، اوران کا سارا پلان فیل ہو گیا، انہوں نے کہا کہ میں خرچہ نہیں دوں گا، میں نے کہا مت دیجئے، میں تو پہلے سے طے کر چکا تھا کہ مجھے پڑھنا ہے، تو انہوں نے کہا کہ میں جنگل میں رہتا ہوں میں نے تمہیں پڑھایا اور تمہارے پیچھے بھائی بہن ہیں، ان کو کون پڑھائے گا، میرے پیچھے عبدالرحمن بھائی تھے جو پڑھنے کی عمر سے آگے نکل گئے تھے، اس کے بعد عبدالمجید اور مولانا امین صاحب تھے، ان دونوں کی پڑھنے کی عمر تھی، میں نے کہا کہ ان

بھائیوں کو بھی ساتھ لیکر جاؤں گا اور انہیں بھی پڑھاؤں گا، تو میں دونوں کو لیکر ہم تین بھائی چلے آئے، مولانا عبدالمجید کی حفظ پڑھنے کی عمر تو نہیں تھی، میں نے ان کو اپنے پاس سے فارسی کی چار پانچ کتابیں پڑھادی تھیں اور مولانا امین صاحب کی حفظ کی عمر تھی میں نے انہیں حفظ کی کلاس میں ایک قاری صاحب تھے ان کے پاس بٹھایا، میں تو حافظ تھا نہیں، لیکن کبھی کبھی قرآن کھول کر سنتا تھا، بہت شاندار پڑھ رہا ہے، سنا رہا ہے، میں مطمئن تھا، ایک دن اتفاق سے ایسی سورت آئی جو مجھے یاد تھی، تو میں نے قرآن بند کر دیا اور مولانا امین پڑھتے پڑھتے ٹھپ ہو گئے، وہ میرے سامنے بیٹھتے تھے اور دیکھ کر پڑھتے تھے، تو مجھے شبہ ہوا، میں نے معلوم کیا تو کہا میں تو چار پارے حفظ کر چکا ہوں اور کچھ بھی یاد نہیں، تو میں نے مارا جتنا مار سکتا تھا اتنا مارا، میں نے سوچا مارنے سے کام نہیں چلے گا، تو اس دن سے میں نے حفظ کرنا شروع کیا اور اس کو بھی حفظ کرانا شروع کیا، اور وہ میرا افتاء کا سال تھا، پھر ہم تین بھائی گئے اور اس کے بعد ابا نے پیسے بھیجنا شروع کئے، مہینے کے پانچ روپئے بھیجتے تھے، اور میں نے کاروبار شروع کیا کہ عصر بعد کتب خانہ جاتا تھا اور وہاں سے کاپیاں لاتا تھا، سولہ صفحہ کا ایک روپیہ ملتا تھا اور آٹھ آنے میرے ہوتے اور آٹھ آنے اس کے ہوتے جو میرے ساتھ ہوتا تھا دوسرا طالب علم، اس سے ہمارا گذارا بہت شاندر چلتا تھا، اس زمانہ میں پالن پور سے سہارنپور کا کرایہ ۱۹/روپئے تھا، (مفتی امین صاحب ابھی دیوبند میں ہیں دورہ کی کتابیں پڑھاتے ہیں) میرے تو حفظ کا یہ قصہ تھا کہ مولانا امین صاحب کی وجہ سے میرا حفظ ہو گیا اور یوں ماموں کی جو خواہش تھی کہ ان کا رشتہ ان سے ہو وہ بھی ہو گیا اور میرا جوان کو حفظ کرانے کا وعدہ تھا وہ بھی ہو گیا۔

سوال: آپ کے کون سے ماموں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے؟

جواب: ان کا نام مولانا ولی محمد نام ہے، ڈابھیل کی روداد چھپی ہوئی ہے اس میں ان کا نام ہے، اصل ان کی تعلیم پالنپور میں ہوئی، وہاں ڈھنگ نہیں تھا پڑھانے کا تو وہاں سے ڈابھیل گئے۔

سوال: آپ کے دوسرے نمبر کے جو بھائی ہیں جن کا انتقال ہو گیا، ان کو فارسی پڑھائی! اور فارسی کے علاوہ

کوئی اور کتاب بھی پڑھائی آپ نے؟

جواب: فارسی بھی پڑھائی اور دوسری کتابیں بھی پڑھائیں اور اس کے دو سال کے بعد میں چلا آیا اور وہ پڑھتے رہے اور اشرفیہ سے فارغ بھی ہوئے۔

سوال: مولانا امین صاحب نے آپ سے کیا پڑھا؟

جواب: بہت کتابیں پڑھائیں، یہاں بھی پڑھایا راندیر میں تھا وہاں بھی پڑھایا اور پھر وہاں سے دیوبند گئے اور کئی سال تک پڑھتے رہے، جس وقت وہ فارغ ہوئے اور میں دیوبند میں مدرس بن کر آیا تو وہ اس وقت تکمیل ادب میں تھے۔

سوال: دیوبند میں پڑھاتے ہوئے کتنے سال ہوئے؟

جواب: مجھے دیوبند میں پڑھاتے ہوئے ۴۸ رسال ہو گئے، اور ۹ رسال راندیر میں پڑھایا۔

سوال: حضرت مولانا مدنیؒ کا انتقال ہوا آپ اس وقت کہاں تھے؟

جواب: مولانا کا انتقال ہوا تو میں اس وقت مظاہر علوم میں تھا تو اس وقت مظاہر علوم میں طلبہ میں بہت شور ہوا، میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تو بتایا کہ مولانا مدنی صاحبؒ کا انتقال ہو گیا۔

سوال: کیا آپ کی ان سے ملاقات ہوئی؟

جواب: میں نے کئی مرتبہ دیکھا تھا پالن پور میں، اور سہارنپور میں حضرت شیخؒ کے پاس آتے تھے۔

سوال: حضرت ہم سب کے لئے بھی دعا کر دیجئے؟ اللہ علم میں ترقی عطا فرمائے؟ علم وعمل کا جامع بنائے؟ اور رمضان کے لئے بھی دعا کیجئے کہ صحیح طور پر رمضان گزر جائے؟

جواب: اللہ تعالیٰ علم میں ترقی عطا فرمائے اور اپنا مقبول بندہ بنائے مقبولیت سے نوازے اور صحیح طور رمضان گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

❁...❁...❁

الوداع اے آبروئے علم وعرفاں الوداع

حضرت الاستاذ پالن پوریؒ کی زندگی کے چند گوشے

حضرت مولانا فضیل احمد ناصری صاحب
استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

کل ۲۵ رویں رمضان ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء کو حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس رحلت کا قلب پر اتنا اثر ہے کہ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا۔ وہ ہمارے لیے استاذ کے ساتھ مربی بھی تھے۔ وہ ایک روشن چراغ اور علم وفن کے قابلِ تقلید سالار بھی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی تدریسی شہرت کو انھوں نے چار چاند لگایا اور سلف کی روش پر چل کر خود بھی زندۂ جاوید ہوئے۔

حضرت الاستاذ کے حالاتِ زندگی پر ایک نظر

حضرت مفتی صاحب کا وطنی تعلق شمالی گجرات کے پالن پور سے تھا۔ پالن پور ایک بہت بڑے علاقے کا نام ہے، اس میں چار اضلاع ہیں: سابر کانٹھا، بناس کانٹھا، مہسانہ اور پٹن۔ ان کا گاؤں کالیڑا کے نام سے متعارف ہے، جو ضلع بناس کانٹھا میں واقع ہے۔ وہیں ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ والد صاحب نے احمد نام رکھا، بعد میں حضرت نے اس کے ساتھ سعید کا اضافہ کرلیا۔ ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: سعید احمد بن یوسف ابن علی ابن جیوا ابن نور محمد۔ آپ مومن برادری سے تعلق رکھتے تھے، یہ گجرات کی بہت بڑی برادری ہے۔ اسی برادری کی ایک شاخ ڈھکا کہلاتی ہے۔ آپ بھی اسی شاخ سے تھے۔

تعلیمی اسفار

آپ نے مکتب کی تعلیم اپنے وطن* کالیڑا میں ہی پائی۔ مولانا داؤد چودھری، مولانا حبیب اللہ چودھری اور مولانا ابراہیم جونکیہ رحمہم اللہ آپ کے مکتبی اساتذہ میں ہیں۔ مکتب سے فارغ ہوئے تو دارالعلوم چھاپی میں داخلہ لیا، جہاں ان کے ماموں مولانا عبدالرحمن شیرا پڑھایا کرتے تھے۔ وہاں ماموں سمیت متعدد اساتذہ سے دروس لیے۔ چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ ماموں کا تعلق چھاپی سے ختم ہوگیا اور وہ اپنے وطن جونی سیندھی میں اقامت گزیں ہوگئے، مفتی صاحب بھی ماموں کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے اور انہیں سے فارسی کی کتابیں پڑھیں۔

پھر عربی درجات کے لیے پالن پور ہی میں مصلح الامۃ مولانا نذیر میاں صاحب کشمیری ثم پالن پوریؒ کے ادارے مدرسہ دعوۃ الحق میں داخلہ لیا۔ یہاں مولانا اکبر میاں پالن پوریؒ اور مولانا ہاشم بخاری مہاجر مدنیؒ پڑھایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب نے بانیِ مدرسہ سے بھی پڑھا۔ چار سال تک ان حضرات سے خوب علمی فیضان سمیٹا۔ ابتدائی اور متوسط جماعتوں کی کتابیں پڑھیں۔ شرح جامی بھی یہیں پڑھی۔ مولانا ہاشم بخاری صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں بھی تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔

وطن سے باہر کے علمی اسفار

پالن پور سے نکلے تو مظاہرِ علوم سہارن پور پہونچ گئے۔ یہ ۱۳۷۷ھ تھا۔ یہاں اپنے تین سالہ قیام کے دوران منطق اور نحو کے امام مولانا محمد صدیق صاحبؒ سے نحو اور منطق کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ مفتی یحییٰ سہارن پوری، مولانا عبدالعزیز رائے پوری اور مولانا وقار احمد بجنوری رحمہم اللہ سے بھی کئی کتابوں کے دروس پڑھے۔

دارالعلوم دیوبند کی طرف

فقہ، تفسیر اور حدیث کی تحصیل کے لیے ۱۳۸۰ھ میں دیوبند پہونچے اور مولانا نصیر احمد خان صاحب بلندشہریؒ اور مولانا سید اختر حسین میاں صاحب دیوبندیؒ سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں فراغت پائی۔ نامور اساتذہ میں مولانا بشیر احمد خان بلندشہری، مولانا اسلام الحق اعظمی، مولانا ظہور احمد

دیوبندی، حکیم الاسلام قاری محمد طیب، مولانا سید فخر الدین مرادآبادی، مولانا فخر الحسن مرادآبادی اور علامہ ابراہیم بلیاوی اور مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوری رحمہم اللہ ہیں۔ سالانہ امتحان میں پہلی پوزیشن پائی۔

درجۂ افتا میں داخلہ

دورے سے فراغت کے بعد درجۂ افتا میں داخلہ لیا۔ اور حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ سے فتویٰ نویسی کے گُر حاصل کیے۔ یہ ایک سالہ نصاب تھا، مگر حضرت الاستاذ پالن پوری صاحبؒ کی مسلسل محنت اور شوق ولگن کے چلتے اس کا نصاب دوسالہ کر دیا گیا۔ دوسرے سال معینِ مفتی بنائے گئے۔ حفظ بھی اسی دورانیے میں کیا۔

عملی زندگی کا آغاز

درجۂ افتا سے فراغت کے بعد علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے مشورے پر گجرات کے مشہور ادارے دارالعلوم اشرفیہ راندیر ضلع سورت سے تدریسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مدرسِ علیا قرار دیے گئے۔ ۱۳۸۴ھ سے ۱۳۹۳ھ تک یہاں مسلسل درس دیا۔ ابوداؤد، ترمذی، مؤطائین، شرح عقائد، حسامی اور دیگر کتابیں ان سے متعلق رہیں۔ تدریس کے ساتھ یہاں تصنیف کا سلسلہ بھی شروع کیا اور متعدد علمی و اصلاحی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمتِ مصاہرت، العون الکبیر اور علامہ طاہر پٹنی کی مشہور کتاب **المغنی** کی عربی شرح لکھی۔ اسی زمانے میں **افاداتِ نانوتوی** کے نام سے ایک طویل مضمون لکھا، جو ماہ نامہ الفرقان میں قسط وار چھپا۔

حضرت الاستاذ کا دارالعلوم دیوبند میں تقرر

مفتی صاحب دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں اپنی تدریسی مہم نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے کہ اسی اثنا میں مولانا ہاشم بخاری صاحب کا پیغام پہونچا کہ دارالعلوم دیوبند میں استاذی کے لیے ایک جگہ خالی

ہے، تقرر کی درخواست پیش کردیں۔ مولانا بخاری مدرسہ دعوۃ الحق پالن پور میں مفتی صاحب کے استاذ رہ چکے تھے اور اب دارالعلوم میں علیا کے مدرس تھے۔ مفتی صاحب کو ان کا یہ مشورہ پسند آیا اور ضلع سورت کی با اثر شخصیت مولانا حکیم سعد رشید اجمیری صاحب کے مشورے سے ایک درخواست اور ایک خط دارالعلوم کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے نام روانہ کردیا۔ قاری صاحب نے اسے پڑھ کر امید دلائی۔ شعبان میں مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی اور استاذ کے تقرر کی بات آئی تو مناظرِ اسلام مولانا محمد منظور نعمانیؒ رکنِ شوریٰ دارالعلوم نے مفتی صاحبؒ کا نام پیش کردیا، جسے باتفاقِ رائے منظور کرلیا گیا۔ آپ کا تقرر ۱۳۹۳ھ میں عمل میں آیا اور درجۂ وسطیٰ کے استاذ منتخب ہوئے۔ مفتی صاحبؒ تازندگی اپنی اس ذمے داری کو ادا کرتے رہے۔

مفتی صاحب کی بحیثیت مفتی خدمات

دارالعلوم میں صرف عربی درجات میں ہی تدریس نہیں کی، بلکہ ۱۴۰۲ھ میں جب دارالعلوم انتشار میں مبتلا ہوا اور کئی اہم مفتیان علیحدہ اور کچھ رخصت پر چلے گئے تو طلبہ کو فتاویٰ نویسی کی مشق کرانے کے لیے حضرت الاستاذ کو نگراں بنایا گیا۔ آپ نے کئی سال تک یہ ذمے داری بھی شان دار طریقے سے نبھائی۔

ایک دلچسپ واقعہ

سورت میں مولانا حکیم سعد رشید اجمیری کے نام سے ایک بڑے بزرگ تھے، جن کا نام ابھی چند سطور پہلے بھی آپ نے پڑھا ہے۔ یہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے مرید تھے۔ سورت میں ہی مطب کرتے تھے۔ حضرت الاستاذ بھی چوں کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کے مرید تھے، اس لیے دونوں میں خوب بنتی تھی۔ انہیں کے مشورے پر مفتی صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کے نام خط بھی لکھا تھا۔ جب مفتی صاحب دارالعلوم آ گئے اور پڑھانے کے لیے کتابیں تفویض ہوئیں تو ان میں ایک کتاب ملا محب اللہ بہاری کی مسلم الثبوت بھی تھی۔ مفتی صاحبؒ نے دارالعلوم سے سب سے پہلا خط حکیم صاحبؒ کے نام لکھا، جس میں کتابوں کی تفصیل تھی۔ حکیم صاحب

نے جواب لکھا کہ الحمدللہ دارالعلوم میں آپ کا ثبوت مسلّم ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب کا یہ جملہ اس خلوص سے نکلا تھا کہ حضرت الاستاذ کی شخصیت آگے چل کر واقعی مسلّم الثبوت بن گئی۔

مفتی صاحب کی تدریس

حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ یوں تو ہمہ جہت کمالات کے حامل تھے، مگر تدریس اور تصنیف میں زیادہ عزت وشہرت کمائی۔ ان دونوں میدانوں میں کوئی مدرس ان کا شریک نہیں ہے۔ تدریس کی بات کیجیے تو وہ اس فن میں انفرادی صلاحیت کے مالک تھے، بلکہ اپنے طرزِ تفہیم کے موجد و خاتم دونوں تھے۔ آپ نے مؤطاین اور مسلم شریف کے دروس بھی دیے ہیں۔ کیمپ کے زمانے میں شیخ الحدیث بھی رہے، پھر شیخ نصیر احمد خان بلند شہریؒ واپس آ گئے تو بخاری ان کے پاس واپس چلی گئی۔ اس وقت سے ترمذی شریف کا درس متعلق رہا، جس کا سلسلہ ۱۴۳۲ھ تک چلا۔ ادھر چند سالوں سے بخاری شریف مستقل وابستہ ہوئی جو اختتامِ سال تک چلی۔ حضرت الاستاذ تدریس کے معاملے میں مقامِ اجتہاد پر فائز تھے۔ حلِ عبارت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ تفہیم کے لیے وہ ایسی ترتیب اپناتے کہ غبی سے غبی طالب علم کے لیے بھی مشکل مسئلہ مشکل نہ رہتا۔ بندے نے ان سے ترمذی شریف اور طحاوی پڑھی ہے۔ ان کا درسِ ترمذی دیکھ کر ایسا لگتا تھا گویا کہ امام ابوعیسیٰ ترمذی نے انہیں کی تدریس کے لیے اس کی تالیف فرمائی ہے۔ حدیث پر مفصل و مدلل کلام۔ موقع بہ موقع حوالجات۔ درسِ ترمذی کے دوران ان کی شانِ فقاہت خوب نمایاں ہوتی تھی۔ زیرِ بحث حدیث پر فقہی کلام اتنی بصیرت اور مرتب انداز میں کرتے کہ طبیعت جھوم جاتی۔ احناف کی ترجیح کے دلائل اس قوت سے دیتے کہ دوسرے طبقے کی طرف سے پیدا کردہ شبہات ہوا ہو کر رہ جاتے۔ متنِ حدیث پر کلام کے ساتھ سندِ حدیث پر بھی ایسا مضبوط تبصرہ کہ آنکھیں کھلی رہ جاتی تھیں۔ رجالِ حدیث پر کلام کے دوران جب حدیث کے مشہور ضعیف راوی عبداللہ ابنِ لہیعہ کا نام آتا، جسے غیر احناف نے بطور دلیل پیش کیا ہوتا، تو دونوں مونڈھوں کو کہنیوں سمیت اس طرح پھڑ پھڑاتے کہ غیر احناف کے استدلال کا بودا

پن صاف محسوس ہو جاتا۔

طلبہ میں درس کی مقبولیت

طلبہ کو عموماً دو چیزیں چاہییں۔فہمِ اسباق اور مرتب کلام۔مفتی صاحب کے درس میں یہ دونوں باتیں خوب پائی جاتی تھیں۔حلِ عبارت اس طرح فرماتے کہ مقصودِ مصنف بڑی سرعت سے الم نشرح ہو جاتا۔اس کے لیے ترتیب اور تمہید ایسی قائم کرتے جو ان کی مرادات تک بآسانی پہونچا دیتے۔اس کا لازمی اثر اسباق کی مقبولیت تھی۔ وہ آسان اور مختصر تعبیرات میں اپنی بات کی ترسیل کا عجیب وغریب ملکہ رکھتے تھے۔ان خوبیوں کی بنا پر ان کے اسباق میں پوری حاضری ہوتی۔وہ طلبہ جو دیگر اساتذہ کے گھنٹوں میں تساہل اور لا پروائی کرتے،مفتی صاحب کے گھنٹے میں بڑی مستعدی سے حاضر ہوتے۔ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی مقناطیس دارالحدیث میں رکھ دیا گیا ہے اور وہ سارے آہن ریزوں کو پل بھر میں کھینچ رہا ہے۔احقر نے ترمذی اور طحاوی کے درس میں دیکھا کہ پوری درس گاہ کھچا کھچ بھر جاتی تھی۔اس طرح کی مقبولیت راقم الحروف نے دارالعلوم میں کسی اور گھنٹے میں نہیں دیکھی۔

حسنِ قرآت کا زبردست اہتمام

مفتی صاحب کے یہاں عبارت خوانی پر بڑا زور تھا۔عبارت خواں طلبہ پر لازم تھا کہ تصحیحِ اعراب کے ساتھ میانہ روی اور بلند آہنگی کو ملحوظ رکھے۔ابتدائے سال میں باقاعدہ انتخاب بھی ہوتا اور جہیر الصوت وداؤد اللہجہ کو ترجیح دی جاتی۔جس کی عبارت خوانی میں کوتاہی ہوتی اسے ایسی نرم اور مشفقانہ ڈانٹ پلاتے کہ آئندہ کے لیے ایک دم سنبھل جاتا۔ان کے دروس میں تلاوت کرنے والے کا ذی استعداد،بلبل نوا اور بلند آواز ہونا لازم تھا۔ان کے سامنے کا کامیاب ہر جگہ کامیاب رہتا۔

مفتی صاحبؒ کی تعبیرات

حضرت الاستاذ اپنے درس کے دوران ایسی تعبیرات اختیار کرتے کہ طلبہ کئی کئی گھنٹے لگا تار بیٹھنے کے بعد بھی اکتاہٹ کا شکار نہ ہوتے۔ مثلاً جب امام ترمذی ایک سند پر کسی دوسری سند کو ترجیح دیتے ہوں تو مفتی صاحب فرماتے کہ: فلاں سند میں یہ خامی ہے، اسی لیے امام ترمذی نے دوسری سند کو راجح کہا ہے۔ حضرت کی عادت ہے کہ جہاں نشیب دیکھتے ہیں، ادھر پانی بہا دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی امام یا محدث کا تعارف کراتے تو کبھی کبھار درمیان میں فرماتے کہ ان کا وطنی تعلق گاگھیڑ ی سے ہے، جس پر طلبہ بے اختیار ہنس پڑتے۔ طلبہ عموماً ایسے خطیبوں یا مدرسین کو سننا پسند کرتے ہیں، جن کے یہاں تفریحِ طبع اور منورنجن کا سامان ہو، حضرت الاستاذ اس پر فرماتے کہ یہ دین کی طلب نہیں، کان کی عیاشی ہے۔ رجالِ حدیث میں کوئی راوی حد سے زیادہ کمزور ہوتا تو فرماتے کہ یہ راوی تو دو پیسے کا بھی نہیں ہے۔ کبھی کبھی مسئلے کی تفہیم کے وقت خود ہی کوئی استفتاء قائم کرتے تو کہتے: کیا فرماتے ہیں علمائے دین، مفتیانِ شرعِ متین مسئلۂ ذیل میں کہ آیا زید کا یہ عمل درست ہے؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو خاص انداز میں متصلاً فرماتے: اونہوں!! مجمع قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ کئی بار عبارت خواں غلطیاں کرتا تو کہتے: تیرے ساتھ سر ٹکرانے سے اچھا ہے کہ میں خود ہی عبارت پڑھ لوں۔ بھینس اللغات کی تعبیر بھی پہلی دفعہ انہیں کی زبانی میں نے سنی۔ غرض کہ اچھوتی اور نئی نئی تعبیرات لا کر طلبہ کو تازہ دم رکھتے۔

تفردات کے سلسلے میں حضرت الاستاذ کی وضاحت

حضرت الاستاذ جو کچھ فرماتے وہ ان کی اپنی تحقیق ہوتی تھی۔ کبھی کبھار ان کی تحقیق سب سے الگ تھلگ ہو جاتی اور تفردات کے خانے میں چلی جاتی تھی۔ کسی فقہی مسئلے پر اپنی کوئی بات رکھتے اور وہ بات جمہور کے خلاف ہو تو طلبہ سے صاف صاف کہہ دیتے کہ میری اس رائے پر تمہارا عمل درست نہیں۔ دار العلوم کا دار الافتاء ہی تم پر لازم ہے۔ فرمایا کرتے کہ میں ساری مرجوح حدیثوں پر زندگی میں کم از کم ایک بار عمل تو کر ہی لیتا ہوں۔ میں کبھی کبھار رفعِ یدین بھی کر لیتا ہوں۔

اپنی تشریحات سے رجوع

مفتی صاحب کے درس کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اگر کسی مسئلے کی تقریر ان سے غلط ہو جاتی تو اگلے دن فرماتے کہ میں نے پچھلے دن تقریر یوں کی تھی، وہ غلط ہے۔ صحیح تقریر وہ ہے جو ابھی بیان کر رہا ہوں۔ یہ ان کی امانت کی بات تھی۔ میری طالب علمی کے دوران سال بھر دو تین بار ایسی نوبت آئی تھی۔

درس گاہ میں حاضری سے متعلق حضرت الاستاذ کا اصول

حضرت الاستاذ طلبہ کو نظم وضبط کا پابند بننے پر خوب زور دیتے۔ چناں چہ ان کی جانب سے ابتدائے سال میں ہی صاف اعلان ہوتا کہ میرے آنے سے پہلے سارے طلبہ دارالحدیث میں آجائیں۔ یوں نہ ہو کہ میں سبق شروع کروں اور کچھ طلبہ اس رخ سے آئیں اور کچھ طلبہ اس جانب سے۔ یہ عمل بہتر نہیں ہے۔ اس سے ذہن منتشر ہوتا ہے۔ مفتی صاحب کے اس اعلان پر طلبہ کی جانب سے بھی حتی المقدور عمل ہوتا۔ کبھی ایسا ہوا کہ مفتی صاحب درس گاہ تشریف لائے تو طلبہ کم تھے اور بعض دوڑتے ہوئے درس گاہ میں گھس رہے تھے۔ حضرت الاستاذ کو یہ عمل اس قدر ناگوار ہوتا کہ اسی وقت الٹے پاؤں واپس چلے جاتے اور جب تک ترجمان اچھی طرح معافی تلافی نہ کر لے وہ درس گاہ میں نہیں آتے تھے۔ اس دن کا سبق تو ناغہ ہو ہی جاتا تھا۔

کوئی حدیث بغیر کلام کے جانے نہ دیتے

حضرت الاستاذ کی خاص ادا یہ تھی کہ کتاب کی ہر ہر حدیث پر کچھ نہ کچھ کلام ضرور کرتے۔ اگر حدیث بحث طلب ہے اور معرکۃ الآراء مسئلے پر مشتمل ہے تب تو تفصیلی کلام لازم تھا۔ اس کے ہر رخ سے پردہ ہٹاتے۔ اگر مسئلہ معرکۃ الآراء نہیں، مگر کسی نہ کسی درجے میں اہم ہے تو ضروری کلام کر کے آگے بڑھ جاتے۔ اور اگر وہ حدیث پہلے گزر چکی ہے تو فرماتے کہ اس حدیث پر کلام ہو چکا ہے۔ پوری کتاب اسی طرح مکمل ہوتی۔ حضرت الاستاذ کے

یہاں سرداً پڑھنے کا معمول نہیں تھا۔ تعلیمی ایام میں انہیں کسی سفر کی عادت نہیں تھی، اس لیے کتاب کی تکمیل میں انہیں کوئی دشواری نہیں آتی تھی۔ بہت کم سنا گیا کہ آج مفتی صاحب تشریف نہیں لائیں گے۔ اپنے مشن میں انہماک اور انہماک میں تواتر و تسلسل ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔

کوئی اشکال ہو تو پرچی بھیجو

استاذِ محترم کی یہ ادا بھی رہی کہ وہ دورانِ درس سوالیہ پرچی کے فوری جواب کے قائل نہیں تھے۔ ان کی واضح ہدایت تھی کہ اگر کوئی تقریر سمجھ میں نہ آئی ہو یا کوئی سوال واشکال ذہن میں آرہا ہو تو پرچہ لکھ کر ابھی دو، لیکن اس کا جواب کل دوں گا۔ پرچیوں پر فوری توجہ سے درس متاثر ہوتا ہے۔

درس گاہ میں بیٹھنے کا انداز

حضرت الاستاذ کے درس گاہ تشریف لانے کا انداز بڑا پرکشش تھا۔ وہ اپنے روایتی لباس میں تشریف لاتے۔ جبہ، جو نصف ساق تک دراز ہوتا۔ پاجامہ اور خاص قسم کی گجراتی ٹوپی، جو سفید، گول اور سر سے چپکی ہوتی تھی۔ اس پر سفید رومال۔ کبھی کبھار عمامہ اور اس پر سفید رومال۔ دیکھ کر لگتا کہ کوئی عربی النسل محدث تشریف فرما ہے۔ پروقار رفتار سے درس گاہ آتے اور چارزانو ہو کر بیٹھ جاتے۔ ان کے بیٹھنے کی یہ شکل درمیان میں کسی وقت بھی نہ بدلتی تھی، خواہ کتنا ہی وقت درس گاہ میں نہ لگ چکا ہو۔

حضرت الاستاذ اور احترامِ اسلاف

حضرت الاستاذ کی جن اداؤں نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دورانِ درس جب بھی کسی بزرگ، محدث یا فقیہ کا نام آتا، خواہ وہ ائمۂ اربعہ میں سے کسی بھی امام کے مقلد ہوں، بڑے احترام سے انہیں یاد کرتے۔ حضرت، رحمہ اللہ، قدس سرہ اور برد اللہ مضجعہ جیسے دعائیہ جملے ان کی زبان کا لازمی حصہ تھے۔ میں

نے کبھی بھی اس ادا میں تخلف نہیں پایا۔ حالانکہ ان کا علمی رد پورے شباب پر چل رہا ہوتا تھا۔ ان کی دلیلوں کی کاٹ پر پوری تقریر چلتی تھی، مگر اس کے باوجود ہوش وحواس اور احترام بہرصورت قائم۔ اپنے اساتذہ کے نام بھی اسی انداز سے لیتے۔ صرف مولانا مرحوم کہہ کر گزرتے انہیں نہیں دیکھا گیا۔ زندہ شخصیات میں سے بھی کسی محترم شخصیت کا نام لینا ہو تو بھی احترام کا پہلوان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔

مفتی صاحب اور خطابت

حضرت الاستاذ بہترین استاذ کے ساتھ بہترین خطیب بھی تھے۔ البتہ ان کی خطابت میں جوش، آواز کا ابھار، لہجے کا زیر و بم، حواس باختگی، کرسی شکنی اور ایک سانس میں کئی کئی جملے کی ادائیگی نہیں تھی، مگر وعظ وخطابت مؤثر بہت ہوتی تھی۔ یوں تو حضرت کی پوری توجہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف پر تھی۔ چھٹی بہت کم، برائے نام کرتے تھے۔ ہمیشہ وقت پر درس گاہ آتے۔ وعظ وخطابت کے لیے ایامِ تعطیل تھے۔ ان دنوں میں وہ اکثر دیوبند سے باہر رہتے تھے۔ دارالعلوم میں طالب علمی کے دوران انجمن کے کئی جلسوں میں، اسی طرح دارالعلوم کے سالانہ انعامی اجلاس میں حضرت الاستاذ کی تقریریں سننے کا شرف مجھ کو ملا ہے۔ ممبئی کے حج ہاؤس میں بھی ان کی خطابت دیکھی۔ وہ نہایت نرم ونازک اور خوب صورت وبلیغ انداز میں اپنی بات رکھتے۔ ان کے بیان میں علم وفضل کے ساتھ دل کش اور مزاحیہ تعبیرات اس قدر ہوتیں کہ سامعین میں سے کوئی بھی نہ اٹھتا۔ اپنی بات کو مخاطب کے ذہن میں اتار دینے کے فن سے خوب آشنا تھے۔ انزلوا الناس علیٰ قدر عقولہم پر ان کا کامل عمل تھا۔ قرآن وحدیث سے استدلال کرنے کا ڈھنگ بڑا ہی اچھوتا پایا تھا۔ ان کی تقریریں زیادہ تر نہی عن المنکر کے قبیل سے ہوتی تھیں۔ ان کے تلامذہ ان کی تقریروں کو درسِ ترمذی کا نام دیتے۔ اپنے اس فن سے انہوں نے بڑے بڑے ہنگامے سرد کیے ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک ان کے مواعظ سے براہِ راست مستفید ہو چکے ہیں۔

ان کے خطبات کے تین مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں، جن میں * علمی خطبات * دو جلدوں میں، * دین کی

بنیادیں اوران کی ضرورت* اور تیسرا مجموعہ*عصری تعلیم* ہے۔ان کے فرزندوں سے توقع رکھتا ہوں کہ غیر مطبوعہ تقریروں کے مجموعے بھی حسبِ سہولت شائع کریں گے۔

تصنیف وتالیف

درس وتدریس اوراس کے ساتھ کثرتِ تصنیف وتالیف کی بات جب بھی آئے گی، حضرت الاستاذ ہمیشہ صفِ اول میں نظر آئیں گے۔تدریس کے دوش بدوش کتب نویسی کا کام دارالعلوم کی تاریخ میں کسی نے اس کثرت سے نہیں کیا۔کئی کتابیں تو کئی کئی جلدوں میں ہیں۔تحفۃ القاری، رحمۃ اللہ الواسعہ،تحفۃ الالمعی ، برہانِ الٰہی ، ہدایت القرآن وغیرہ۔چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کتابیں ان کے قلم سے آئیں۔محفوظات سے لے کرتحفۃ القاری تک۔ان کتابوں میں سے زیادہ تر کا تعلق درسیات سے ہے۔جو کتاب بھی تدریس کے لیے ان سے متعلق ہوئی، اس کی شرح آ گئی۔ترمذی شریف کی شرح تحفۃ الالمعی ، بخاری شریف کی شرح تحفۃ القاری، حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ، الفوز الکبیر کی شرح العون الکبیر، رسم المفتی کی شرح آپ فتویٰ کیسے دیں؟ نخبۃ الفکر کی شرح وغیرہ۔ ان کا تعارف آئندہ کسی قسط میں پیش کروں گا۔تصنیف وتالیف میں حضرت الاستاذ کی عادت تھی کہ باقاعدہ وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے۔املا نہیں کراتے تھے۔زودنویس تھے۔کم وقت میں کئی کئی سطریں لکھ ڈالتے تھے۔کتب نویسی میں وہ ایسے مگن تھے کہ ان سے ملاقات کرنا آسان نہیں تھا۔ملاقات بات کے لیے عصر بعد کا وقت طے تھا، اس کے بعدان سے ملنا تقریباً محال تھا۔

حضرت الاستاذ سے ملاقات کا ایک واقعہ

چارسال قبل کی بات ہے۔میرے ایک رشتے دار حضرت مولانا وصی احمد قاسمی صاحب ممبئی سے دیوبند تشریف لائے۔وہ دارالعلوم کے فاضل تھے۔حضرت الاستاذ سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔دارالعلوم میں ان کی طالب علمی کا جو سال تھا، وہی حضرت الاستاذ کی مدرسی کا بھی سال تھا، یعنی ۱۹۷۳۔اسی سال آٹھ سالہ نصاب کی

درجہ بندی عمل میں آئی تھی۔ مولانا نے ان سے الفوز الکبیر، سلم العلوم، جلالین اور ہدایہ جلد اول پڑھی تھی۔ فراغت کے بعد ممبئی گئے تو چالیس سال کے بعد ہی دیو بند واپس آئے۔ وقت کم تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ حضرت مفتی صاحب سے ملنا ہے۔ میں نے کہا کہ مغرب کے بعد ملاقات ممکن نہیں۔ کہنے لگے: نہیں ملاقات کر ہی لیں۔ میں انہیں لے کر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت نے اجازت دی۔ ہم جوں ہی ان کے قریب ہوئے تو خیریت پوچھی۔ پھر فرمایا: مولانا! آپ غلط وقت پر آ گئے۔ یہ وقت میری تصنیف و تالیف کا ہے۔ میں ساری متعلقہ بحثیں دیکھ کر اپنے ذہن میں ایک خاص ترتیب بناتا ہوں اور پھر انہیں قلم بند کرتا ہوں۔ آپ تشریف لائے تو خوشی ہے، مگر میرے سوچے ہوئے سارے مضامین اڑ گئے۔ ساری محنت ضائع ہو گئی۔ یہ جملے درمیانِ گفتگو کئی بار دہرائے۔ مجھے بڑی ندامت ہو رہی تھی کہ بلا وجہ خیر کے ایک بڑے کام میں مخل ہو گیا۔ کہنے لگے: اب تو باتیں کرو، لیکن آئندہ خیال رکھو!

ایک بہترین نصیحت

میرے مہمان نے حضرت سے دعا کی درخواست کی تو فرمایا: اپنے اعمال درست کرلو، ایمان میں خود بخود استحکام آئے گا۔ فرمایا کہ جس درخت یا پودے کی کاٹ چھانٹ ہوتی رہے، ان کی تندرستی اور نمو چلتی رہتی ہے۔ ایمان کی مضبوطی کے لیے اعمال کی تزئین و آرائش ضروری ہے اور یہ اتباعِ سنت کے کمال سے ہی ممکن ہے۔

حفاظتِ وقت کا اہتمام

اس قصے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وقت کی قدر و قیمت ان کے نزدیک کیا تھی۔ سچ یہ ہے کہ وقت کے معاملے میں وہ انتہائی حساس واقع ہوئے تھے۔ وہ اسے متاعِ گراں مایہ خیال کرتے تھے۔ ایک لگی بندھی زندگی تھی۔ ایک اصولی طرزِ حیات۔ ایک ایک سکینڈ ان کی نظر میں ہیرے جواہرات سے زیادہ قیمتی تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر اور گن گن کر اسے صرف کرتے تھے۔ انہیں کبھی خالی نہیں دیکھا گیا۔ ایسے لوگ ہی کم وقت میں زیادہ کام کر

جاتے ہیں اور انقلاب ایسے ہی نفوس سے برپا ہوتا ہے۔ اسی حفاظتِ وقت کے پیشِ نظر طلبہ اور ملاقاتیوں سے ملاقات کا وقت عصر کے بعد کا وقت طے تھا، اس کے بعد ملنا مشکل، بلکہ محال۔ اور یہ وقت بھی علم وفن کی ترسیل و اشاعت میں خرچ ہوتا تھا۔ طلبہ پرچیاں دے کر سوالات کرتے اور حضرت الاستاذ بڑی بشاشت سے ان کے جوابات دیتے۔

تحفۃ القاری کی تصنیف کا دوبارہ آغاز

۲۰۰۵ء میں حضرت الاستاذ کے سینے میں درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق رپورٹ نکلوائی گئی تو پتہ چلا کہ دل کی تین رگیں بند ہوچکی ہیں۔ ایک سال تک علاج چلا، مگر طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ پھر شفا مل گئی، اگرچہ کمزوری دن بہ دن بڑھتی رہی۔ ۲۰۱۳ میں طبیعت پھر بگڑی اور ہارٹ اٹیک ہوا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کیا اور آرام کا مشورہ دیا۔ یہ ساری کارروائی ممبئی میں ہوئی۔ چند دنوں کے بعد صحت یاب ہوگئے، مگر معالجین کا مشورہ تھا کہ ابھی مزید آرام کریں، تھوڑے دن آرام کیا اور چلے آئے۔ دیوبند پہونچے تو اب بخار نے زوردار حملہ کیا۔ پھر بمبئی جانا پڑا۔ علاج سے طبیعت سنبھلی، تاہم ڈاکٹر کا اشارہ تھا کہ آپ ابھی یہیں رہیں۔ حضرت الاستاذ کو آرام کی یہ تجویز بھی وقت کا زیاں معلوم ہوئی۔ ممبئی سے جلدی چلے آئے اور تحفۃ القاری کا کام دوبارہ شروع کیا۔ تفصیل کے لیے تحفۃ القاری جلد نمبر ۹ دیکھیے۔

شعر وشاعری سے لاتعلقی

شعر وشاعری وقت کا خون بہت کرتی ہے۔ جتنے وقت میں ایک شاعر ایک نظم یا کوئی کلام مکمل کرتا ہے، اتنے وقت میں ایک اچھا مضمون ترتیب پا سکتا ہے۔ احقر کو اس کا بڑا تجربہ ہے۔ اب تو میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، مگر مبتدیوں کے لیے یہ بڑی مہلک چیز ہے۔ حضرت الاستاذ کا قلم پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اردو پر ان کی گرفت کس قدر شاندار تھی!! اگرچہ ان کی زبان سادہ اور لفظی صنعت گری سے آزاد تھی، مگر الفاظ اور جملوں کے برمحل

استعمال کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ ان کی کتابوں میں ایسے نمونے جگہ جگہ مل جائیں گے، مگر شاعری سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ بچپن میں اشعار یاد کرنے کا شوق انہیں ضرور تھا اور اسی شوق میں اپنا تخلص واصل بھی رکھ لیا تھا۔ تھوڑی بہت مشقِ سخن بھی جاری تھی، لیکن یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ تحفۃ الالمعی ج ۶ میں حضرت الاستاذ فرماتے ہیں کہ: جب میں مظاہرِ علوم سہارن پور میں طالب علم تھا اور ابھی نابالغ تھا، اس وقت جنون کی حد تک مشاعرے سننے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور خود بھی تک بندی کرتا تھا۔ واصل تخلص رکھ رکھا تھا۔ حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب قدس سرہ جو میرے سرپرست تھے، میرے حال سے واقف ہوئے۔ انہوں نے مجھے بلا کر یہ حدیث سنائی۔ اس کے بعد میرا حال یہ ہو گیا کہ میں نے وہ سب کاپیاں پھاڑ کر پھینک دیں، جن میں مشاعرے لکھ رکھے تھے۔ اور وہ ہزاروں اشعار جو مجھے یاد تھے، رفتہ رفتہ بھول گیا۔ اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ اشعار پڑھتا ہوں تو وزن ٹوٹ جاتا ہے۔ صحیح شعر نہیں پڑھ سکتا، پڑھتے پڑھتے بھول جاتا ہوں۔ **فالحمد للہ علیٰ ذالک و جزی اللّٰہ استاذی خیرا و غفر لہ و برد اللّٰہ مضجعہ۔** (۵۹۸)

وزن کی سلامتی واقعی باقی نہیں رہی

اشعار سے رشتہ ٹوٹا تو اس سے قدر دور ہوئے کہ کلام کی تخلیق تو کیا ہوتی، اشعار کا پڑھنا بھی ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کی ایک مثال ان کی کتاب تحفۃ القاری سے پیشِ خدمت ہے، اپنی سخت علالت اور ہارٹ اٹیک کی کیفیت قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۲۸/ اکتوبر پیر کا دن عملِ جراحی کے لیے طے کیا، مگر ۲۷ اکتوبر بروز اتوار دوپہر کے وقت سخت اٹیک آیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ساتھیوں نے فوراً ڈاکٹروں کو فون کیا۔ ڈاکٹر مع عملہ اتفاقاً شفاخانے میں موجود تھا۔ انہوں نے مجھے فوراً آپریشن کے لیے اٹھایا۔ اور خبر آناً فاناً ملک اور بیرونِ ملک پھیل گئی۔ اور ہر جگہ دعائیں شروع ہو گئیں۔ بعض جگہ ختم پڑھے گئے اور مکہ مکرمہ میں بعض حضرات طواف اور دعا میں لگ گئے:

ملک الموت اڑے ہیں جان لے کے جائیں گے
سر بسجدہ ہے مسیحا کہ میری بات رہے

اس شعر میں پہلا مصرع وزن سے باہر ہے۔ اور نقل بھی مطابقِ اصل نہیں۔ اصل شعر اس طرح ہے:

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں
سر بسجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے

ممبئی میں ایک مختصر ترین تقریر

وقت کی قدر و قیمت ان کی طبیعت میں اس قدر راسخ تھی کہ اپنے مخاطبین کو اس کی حفاظت کی تلقین ضرور کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ممبئی کے دارالعلوم عزیزیہ میں مدرس تھا، حضرت الاستاذ اس ادارے میں چند منٹوں کے لیے تشریف لائے۔ مہتمم حضرت مولانا مظہر عالم قاسمیؒ نے ان سے طلبہ کے درمیان خطاب کی فرمائش کی۔ حضرت الاستاذ نے اسے قبول کرتے ہوئے نہایت مختصر تقریر کی۔ خطبہ کے بعد فرمایا: عربی کا مقولہ ہے: من جد وجد پھر فرمایا کہ محنت اور جفاکشی انسان کو منزل تک پہونچا کر دم لیتی ہے، اس لیے آپ اپنے مقصد کے حصول میں اپنا وقت صرف کریں، منزل مل کر رہے گی۔ بس اتنی سی بات پر ان کا خطاب مکمل ہو گیا۔

مفتی صاحب اور نہی عن المنکر

کسی برائی کو دیکھ کر تکلیف کا ہونا زندہ ایمانی کی علامت ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ تم میں سے جو کوئی کسی گناہ کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی ہمت نہ ہو تو کم از کم زبان سے روک دے۔ یہ بھی اگر بس میں نہ ہو تو دل سے اسے گناہ سمجھے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور حصہ ہے۔ حضرت الاستاذ نہی عن المنکر کے باب میں بڑے عزیمت والے واقع ہوئے تھے۔ کسی گناہ پر خاموش رہنا ان کی طبیعت میں نہیں تھا۔ وہ جو کہتے، ڈنکے کی چوٹ پر کہتے۔ بلا خوفِ لومۃ لائم کہتے۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی کیا کہے گا۔ اس طبیعت کی بنا پر ان پر

سخت حالات بھی آئے، لیکن اپنے موقف سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔

مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ صاحب کی تحریک میں پیدا شدہ خامیوں پر گرفتیں

کم وبیش سو سال قبل حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی صاحبؒ نے مسلم عوام میں اسلامی ماحول بنانے کے لیے ایک گشتی نظام چلایا، جسے تبلیغی جماعت کا نام دیا گیا۔ اس جماعت سے اللہ نے بڑا کام لیا، لیکن آہستہ آہستہ اس میں کچھ خامیاں سر اٹھانے لگیں۔ جن علمائے امت نے اس کی خامیوں کی نشان دہی کی، ان میں حضرت الاستاذ بھی ہیں۔ وہ دورۂ حدیث کے اسباق میں کسی مناسب موقعے پر اس پر بھی اصلاحی تبصرے کرتے تھے۔ ملک و بیرونِ ملک کے دیگر جلسوں اور نشستوں میں بھی ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے اصحابِ جماعت کو متوجہ کیا۔ مولانا سعد کاندھلوی صاحب اور دارالعلوم دیوبند کے درمیان جو خطوط کا سلسلہ چلا ان میں حضرت الاستاذ کے دستخط بھی ہیں۔ پھر جب جماعت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی اور دارالعلوم میں دونوں پر پابندی لگی تو جملہ اساتذہ کی طرح حضرت الاستاذ بھی غیر جانب دار تھے۔ اور دونوں سے فاصلہ بنائے ہوئے۔ بعضوں نے انہیں شوریٰ والوں کا حامی سمجھا تو انہوں نے سختی سے تردید کی۔ دارالعلوم کے اس فیصلے کے بعد جن بڑے اساتذہ پر جارحانہ اور غیر اخلاقی تبصرے ہوئے، ان میں مفتی صاحب بھی ہیں، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

مفتی صاحب کا واضح موقف

مفتی صاحب صرف کہنے کی حد تک نہیں، جماعت کی غلطیوں پر قلم بھی چلاتے تھے اور بہت صاف الفاظ میں اپنا موقف رکھتے تھے۔ مولانا شعیب اللہ خان صاحب کی کتاب غلو فی الدین میں لکھتے ہیں کہ: یہاں ایک سوال ہے کہ جماعت کا غلو جماعت کے بڑوں کو سمجھانا چاہیے، اس کو پبلک کے سامنے نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پانی سر سے گزر گیا ہے۔ اب جماعت کے عوام وخواص انا انا و لا غیری کے زعم میں مبتلا ہو گئے ہیں؛ پس جب بات خواص تک محدود نہیں رہی تو قضیہ عوام کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ [ص ۲۰]

اسلام اعتدال کا نام ہے

منکرات کے باب میں حضرت الاستاذ کے اس تصلب کی وجہ ان کا یہ موقف تھا کہ اسلام افراط وتفریط سے پاک مذہب ہے، اس میں کمی بیشی اور خلافِ شریعت کوئی آمیزش نہیں چلے گی۔ جس جماعت نے بھی غلو کا راستہ اپنایا وہ منزل چوک گئی اور ایک نیا فرقہ تشکیل پا گیا، چناں چہ فرماتے ہیں کہ:

اسلام کے مزاج میں اعتدال ہے اور غلو اعتدال کے منافی ہے۔ اور عقائد کی خرابی اعمال کی خرابی سے ناشی ہوتی ہے۔ جس طرح عملِ صالح سے ایمان کو جلا ملتی ہے، اسی طرح اعتدال سے ہٹے ہوئے اعمال سے [اگر چہ وہ اعمالِ صالحہ ہوں] ایمان کو گھن لگ جاتا ہے اور وہ دن بدن کمزور ہوتا جاتا ہے، تا آں کہ وہ دائرۂ ایمان سے بالکل نکل جاتا ہے۔ جیسے قادیانی، غالی شیعہ اور منکرینِ حدیث وغیرہ فرقے اور جماعتیں حدود پار کر گئے ہیں اور ان کا اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہا۔ اور اسلامی فرقے اور جماعتیں اگر چہ حدود میں ہیں، مگر ان کا اپنے عقائد واعمال میں غلو کسی دن ان کے لیے وبالِ جان بھی بن سکتا ہے۔ [ایضاً، ص ۱۹]

ممبئی کے حج ہاؤس میں غیر مقلدین کے خلاف مفتی صاحب کا خطاب

میں نے دارالعلوم میں اپنی طالب علمی کے بعد بھی مفتی صاحب کے بیانات متعدد مقامات پر سنے ہیں۔ ایک بیان ۲۰۰۱ میں ممبئی کے حج ہاؤس میں سننے کا موقع ملا۔ یہ غیر مقلدیت کے خلاف جلسہ تھا جو جمعیۃ علمائے ہند کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ اس وقت غیر مقلدین عالمِ عرب میں چھائے ہوئے تھے اور پورے شباب میں چل رہے تھے۔ احناف کے خلاف ان کی مہم کسی منہ زور آندھی سے کم نہ تھی۔ سعودی عرب نے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تائید کے ساتھ شیخ الہند کا ترجمۂ کلام پاک چھاپ رکھا تھا، جو حاجیوں کو ہدیے میں دیا جاتا تھا۔ غیر مقلدین نے اپنی لگاتار کوششوں سے اسے ہٹوا کر محمد جونا گڑھی صاحب کا ترجمہ سعودی حکومت سے چھپوا لیا تھا۔ منکرینِ فقہ کے اس بڑھتے سیلاب پر بند ڈالنا ضروری تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند اسی غیر مقلدیت کو لگام

کسنے لیے ملک بھر میں تحفظِ سنت کانفرنس کے نام سے جلسے کر رہی تھی۔ یہ جلسہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ میں اس وقت دار العلوم عزیزیہ میں مدرس تھا۔ جلسے میں شرکت کے لیے میں بھی روانہ ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ حضرت الاستاذ بھی تشریف لا رہے ہیں، اس زمانے میں موبائل کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ان کی تقریر ٹیپ کرنے کے ارادے سے ایک ٹیپ ریکارڈ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مفتی صاحب کا خطاب شروع ہوا تو سب کی نگاہیں ان کی طرف ٹک گئیں اور کان ان کے الفاظ کی طرف ملتفت۔ خطاب بہتے دریا کی مانند رواں دواں تھا۔ بڑا علمی اور نہی عن المنکر سے لبریز۔ سلسلۂ کلام میں فرمایا کہ غیر مقلدین کے پاس علم و دلائل کچھ نہیں، بس پیسے کے بل پر اچھل رہے ہیں۔ جس دن تھیلی خالی ہو جائے گی ساری اکڑفوں ختم ہو جائے گی۔

ایک شان دار لطیفہ

اس موقع پر انہوں نے ایک لطیفہ بھی سنایا تھا جو نفحۃ الیمن میں کچھ یوں ہے: حضرت ابو بکر بن الخاضبہ محدث رات میں کچھ لکھ رہے تھے تو چوہے کا ایک جوڑا اچھلتا کودتا ان کے سامنے آیا، انہوں نے ایک کو پیالے سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد دوسرے چوہے نے بار بار ایک ایک اشرفی لا کر ان کے سامنے رکھنا شروع کیا یہاں تک کہ آخر میں ایک چمڑے کی تھیلی اٹھا لایا جس میں ایک اشرفی تھی۔ اس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ چوہے کے پاس اب کوئی اشرفی باقی نہیں رہ گئی ہے پھر انہوں نے پیالہ اٹھا لیا اور چوہا نکل کر اپنے جوڑے کے ساتھ اچھلتا کودتا بھاگ نکلا۔

تصویر کشی کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کا موقف

حضرت الاستاذ منکرات کے خلاف بہت سخت تھے اور بے انتہا مخالف۔ جہاں موقع پاتے، سختی سے ان کی نکیر کرتے۔ ممبئی کے اسی تحفظِ سنت کانفرنس میں میں نے دیکھا کہ جب کچھ صحافی اپنے کیمرے چلانے لگے تو مفتی صاحب نے بڑی شد و مد سے منع کیا اور فرمایا کہ اگر یہ سب چلے گا تو میں چلا جاؤں گا، چناں چہ پھر کسی کو ہمت نہیں

ہوئی۔اس وقت تک موبائل اکا دکا کسی کے پاس ہوتا تھا اور جس کے پاس ہوتا وہ بڑا مال دار سمجھا جاتا۔کیمرے اور چپ والے موبائل کا تو دور دور تک تصور نہ تھا۔

تصویر کشی پر دارالعلوم دیوبند کا شروع سے ہی فتویٰ یہ ہے کہ وہ حرام ہے اور اس کے جواز کی کوئی بھی صورت نہیں نکلتی۔حکومتی مجبوری اور بات ہے۔مفتی صاحب اس فتوے کے پرزور مؤید تھے اور پابندی سے اس پر عامل بھی۔تصویر کشی کے خلاف ہمیشہ شمشیرِ بے نیام رہتے۔اس کی قباحت و شناعت پر کھل کر اور پوری قوت سے بولتے تھے۔فوٹو ڈیجیٹل ہو یا منقوش، جامد ہو یا متحرک، سب کو حرام کہتے تھے۔اس بارے میں طلبہ کو بھی خاص تاکید تھی کہ کوئی بھی ان کا فوٹو نہ لے۔اور جو بھی تصویر کھینچے گا، قیامت کے دن میں اس کا دامن پکڑوں گا۔

ہم مسلک علما سے ناراضگی

وہ مسلکِ دیوبند سے وابستہ ان علما سے سخت نالاں بھی تھے جن کی تصویریں آئے دن اخبارات اور سوشل میڈیا میں شائع ہوتیں۔وہ کہتے تھے کہ عجیب بات ہے! ایک طرف دارالعلوم تصویر کی ہر شکل کو حرام کہتا ہے اور دوسری طرف اس کے منتسبین دھڑلے سے کھنچوا بھی رہے ہیں۔یہ دورنگی درست نہیں۔یا تو دارالعلوم حرمت کے فتوے دینے چھوڑ دے یا اس کے منتسبین کیمرے سے ہٹ جائیں۔فتوے اور عمل میں سخت تضاد کی وجہ سے دیوبندیت کے تئیں امت میں غلط پیغام جا رہا ہے۔اس سلسلے کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے۔

بدعات کے خلاف سخت ترین رخ

اتباعِ سنت سے مضبوط وابستگی نے انہیں بدعات کا سخت حریف بنا دیا تھا۔وہ دوسروں کے خلاف تو بولتے ہی تھے، اپنوں کے خلاف بھی سخت تبصرے موقع کی مناسبت سے کر جاتے تھے۔قبروں پر کتبے کو وہ حرام کہتے تھے۔درس کے دوران حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا ملفوظ مفتی صاحب کی زبانی میں نے خود سنا اور پھر ان کے قلم سے پڑھا بھی کہ دیوبندیت اور بریلویت میں پہلے بعد المشرقین تھا۔بریلویت بدعت کے ساتھ کھڑی تھی اور

دیوبندیت سنت کے ساتھ،لیکن اب فاصلے مٹتے مٹتے اتنے سکڑ گئے ہیں کہ دونوں میں صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا ہے۔انہیں کی زبانی سنیے: آج سے تقریباً ۳۰ سال پہلے حضرت اقدس مولانا محمد منظور نعمانی قدس سرہ سے میں نے براہِ راست سنا ہے،آپ بریلویت کی رگ رگ سے واقف تھے، انھوں نے الفرقان شروع میں بریلی سے ہی نکالا تھا۔انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ اب دیوبند اور بریلی میں ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا ہے۔یعنی بریلی دیوبند کے قریب نہیں آیا، وہ اپنے منہاج سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا۔دیوبند ہٹ کر ان کے قریب جا پہونچا ہے۔ [جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم،ص ۳۹]

تعزیتی اجلاس بھی ناجائز

سنت سے محبت اور بدعت سے سخت نفرت ہی کا ایک واضح اثر یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ جلسۂ تعزیت کو مسلکِ دیوبند کے خلاف کہنے لگے۔ان کے بقول: جب تک مسئلہ منقح نہیں ہوا تھا، میں بھی ان جلسوں میں جاتا تھا،لیکن اب نہیں جاتا۔ان کے اس موقف پر خوب علمی بحث ہوئی اور جواب، اور جواب الجواب کا دور چلا۔اس سلسلے کی پوری تفصیل کے لیے ان کی آخری تصنیف **جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم** ملاحظہ فرمائیں، اس کتاب میں بدعات کے خلاف ان کے تیور کچھ زیادہ نمایاں ہیں۔

دینی حمیت

بدعات وخرافات کے خلاف مہم پر مجھے یاد آیا۔ابھی دوسال قبل بابری مسجد کے مسئلے پر جب دینی حلقے کے بعض مذہبی افراد نے نامناسب مشورے دیے اور مسجد کی منتقلی پر اپنا زور صرف کیا تو اس وقت میں نے ایک نظم بڑی تیز وتند لکھی تھی۔ یہ نظم بڑی مشہور ہوئی۔شدہ شدہ حضرت الاستاذ تک بھی پہونچی تو بڑے خوش ہوئے۔اس پر مجھے انہوں نے ملاقات کے لیے بلایا۔مفتی صاحب مجھے نام سے جانتے تھے،مگر شکل سے نا آشنا تھے۔ مجھے بھی ان سے ملتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ان کا رعب وداب مجھ پر اتنا تھا کہ میری کل ملاقاتیں ۵ سے زیادہ نہیں تھیں۔مفتی

صاحب کے خادمِ خاص مولانا حکمت اللہ حنیف صاحب کا فون آیا کہ مفتی صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ وہ آپ کی نظم سے بہت خوش ہیں۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ فضل وکمال کے سلیماں جاہ نے مجھ ایسے بے بضاعت کو یاد کیا ہے۔ عصر بعد پہونچا تو مولانا حکمت اللہ حنیف صاحب نے خبر دی۔ مفتی صاحب کا چہرہ تمتمارہا تھا۔ فرمایا: تم نے نظم بڑی شان دار لکھی ہے، اسے اپنے ماہ نامہ میں شائع کرو، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچے۔ میں نے اثباتاً سر ہلا دیا۔

بنات کے اقامتی مدارس پر مفتی صاحب کا موقف

حضرت الاستاذ کی ان غیر مترقبہ بے پناہ شفقتوں نے مجھے کھل کر بات کرنے کا حوصلہ دیا۔ آج وہ بڑے خوش گوار موڈ میں بھی تھے۔ میں نے لگے لڑکیوں کے اقامتی مدارس پر ان کی رائے جاننی چاہی تو فرمایا کہ اقامتی ادارے کا کوئی جواز نہیں۔ بنات کے مدارس بس اس شرط کے ساتھ کھولے جاسکتے ہیں کہ لڑکیاں محرم کے ساتھ جائیں، واپسی پر بھی محرم ساتھ ہو، پڑھانے کے لیے معلمات ہوں۔ میں نے کہا: حضرت! حدیثِ رسول ﷺ میں رجال کا لفظ بتاتا ہے کہ علم کے لیے دور دراز کا سفر کرنا مردوں کا وظیفہ ہے، نہ کہ عورتوں کا، اس کا مطلب یہ کہ بنات کے اقامتی مدارس کی گنجائش نہیں۔ فرمایا: تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

مفتی صاحب اور قبولِ حق

حضرت الاستاذ مفتی صاحب علم ومعلومات کے معاملے میں خود کفیل واقع ہوئے تھے۔ ان کا جو بھی علم تھا وہ ان کے مطالعے کا کشید کردہ تھا۔ کسی بھی مسئلے پر وہ اپنی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی تحقیقات کی روشنی میں انہیں جو راجح معلوم ہوتا اس پر جم جاتے تھے اور اس وقت تک جمے رہتے تھے، جب تک کوئی مضبوط دلیل ان کے خلاف نہ آجائے۔ مضبوط دلائل کے بعد پھر وہ اپنی رائے بدل دیتے تھے۔ اہلِ حق کی پہچان یہی ہوتی ہے۔

تحفۃ الالمعی پر مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہ کی نقد

حضرت الاستاذ کی تصنیف تحفۃ الالمعی جب چھپ کر آئی تو کئی مقامات پر اس میں تعبیر کی غلطیاں تھیں، جن پر اہلِ علم کو سخت اشکال تھا۔ مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہ و دیگر نے ان کی نشان دہی کی، مفتی صاحب نے اگلی اشاعت میں انہیں درست فرمالیا اور ان کے تبصرے کو کتاب میں جگہ دی۔

حدیثِ جساسہ اور مفتی صاحب کا رجوع

ترمذی شریف میں دجال کے بیان سے پہلے جساسہ کا بھی تذکرہ ہے۔ مشہور صحابی حضرت تمیم رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں دجال سے مکالمہ سے پہلے جساسہ سے بات چیت کو بیان کیا ہے۔ یہ ایک جانور تھا، جس کے بدن پر اتنے بال تھے کہ حضرت تمیم کو اس کا اگلا پچھلا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ واقعہ ترمذی سمیت احادیث کی کتابوں میں تفصیل سے آیا ہے۔ مفتی صاحب کی تحقیق میں یہ حدیث قابلِ استدلال نہیں تھی، اس لیے تحفۃ الالمعی میں اس پر سخت جرح فرمادی۔ اس تبصرے سے اہلِ علم میں بے چینی پھیلی۔ حضرت الاستاذ مولانا نعمت اللہ اعظمی صاحب مدظلہ نے اس کے رد میں باقاعدہ ایک رسالہ لکھا، جس میں مضبوط حوالوں کی روشنی میں حدیثِ جساسہ کو قابلِ استدلال بتایا۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے بھی رجوع کر لیا۔ مفتی صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

پہلے تحفۃ الالمعی میں اس حدیث کی تشریح میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ نہایہ والے حاشیے سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ پھر غور کرنے پر یہ بات سامنے آئی کہ حدیث کی سند تو صحیح ہے، اس کے متابع اور شواہد بھی موجود ہیں، اس لیے وہ ساری تشریح حذف کردی گئی اور اس کی جگہ یہ نئی تشریح لکھی گئی۔ [ص ۶۳۰، ج ۵]

حدیث اور سنت میں فرق

حضرت الاستاذ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ طویل مطالعے کے بعد جو بھی موقف اپناتے، اس پر جم جاتے

تھے۔ پھرٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ان کا علمی رد اگر مضبوط دلائل سے آجاتا تو رجوع کرنے میں بھی انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔اس سلسلے کی کئی مثالیں پہلے پیش کی جاچکی ہیں۔اس کی ایک مثال **حدیث اور سنت کا فرق** بھی ہے۔مفتی صاحب کا موقف تھا کہ سنت اور حدیث میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ہر سنت حدیث ہوتی ہے، لیکن ہر حدیث سنت نہیں۔ اپنے اس موقف پر مضبوط دلائل بھی رکھتے تھے۔فرماتے تھے کہ سنت کہتے ہیں **الطریقة المسلوکة** کو۔ وہ راستہ جس پر امت مسلسل چلتی آئی ہو، یعنی اس حدیث سے امت کا عملی تعلق ہو، جب کہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل اور کسی واقعہ کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاموشی کو کہتے ہیں۔الطریقة المسلوکة والی شان ہر حدیث میں نہیں پائی جاتی۔تفصیل کے لیے علمی خطبات ملاحظہ فرمائیں۔ان کے اس موقف پر بعض اہلِ علم کی طرف سے قلمی نگارشات بھی آئیں، لیکن مفتی صاحب جمے رہے۔ان کے خیال میں وہ نگارشات کوئی وزن دار نہیں تھیں۔

مفتی صاحب، سلوک وتصوف اور اخفائے حال

حضرت الاستاذ کی ایک خصوصیت اخفائے حال بھی ہے۔اپنی جس خوبی کو وہ چھپا سکتے تھے، اسے چھپانے کی حتی الامکان سعی کرتے تھے۔کبھی ایسا ہوتا کہ کسی پہلو پر گفتگو فرمارہے ہیں، ضمناً ان کے کچھ کمالات بھی سامنے آنے لگے تو لاحول ولاقوۃ کہہ کر بات وہیں روک دی اور پوری تفصیل القط۔استاذِ اکبر کے بارے میں اب تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ وہ محض علومِ ظاہرہ کے شہ سوار تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔علومِ باطنہ یعنی سلوک و معرفت میں بھی انہیں درک حاصل تھا۔اس کمال کے حصول کے لیے انہوں نے اولاً جنیدِ زمانہ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی مجالس میں شرکت کی اور بار بار حاضری دی۔ پھر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کو اپنا مرشد بنایا اور آٹھ سال مسلسل رمضان میں ان کے ساتھ گزارے۔ایک سال تو ایسا بھی ہوا کہ کرائے پر مکان لے کر پورے اہل وعیال کے ساتھ رمضان کی ساعات بسر کیں۔کرایہ خود حضرت شیخ الحدیثؒ نے ادا کیا۔ان کے وصال کے بعد

از خود کسی سے مربوط نہیں ہوئے۔ ایک بار مفتی مظفر حسین مظاہریؒ دیوبند تشریف لائے تو حضرت الاستاذ سے ملاقات کر کے فرمایا کہ آپ جیسے اہلِ کمال کا میدان میں آنا ضروری ہے۔ میں آپ کو خلافت دیتا ہوں، مزید تفصیل کے لیے سہارن پور تشریف لائیں۔ حضرت الاستاذ جمعرات کو ترمذی شریف کا درس دے کر بذریعہ بس سہارنپور تشریف لے گئے۔ وہیں پیرو مرشد نے تحریری خلافت بھی عطا فرمائی۔ لیکن بیعت وارشاد کا سلسلہ گرم دمی کے ساتھ کبھی جاری نہیں رکھا۔ بیعت لی بھی تو صرف ان علما کی، جو دس سال کسی ادارے میں درس دے چکے تھے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ علما صرف اشارے سے سمجھ جاتے ہیں، جب کہ غیر علما کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے، اسی لیے بطور مرشد آپ کی سرگرمی برائے نام ہی رہی۔ فرماتے تھے کہ میرے پاس دینے کو بہت کچھ ہے، مگر وقت نہیں۔ لوگوں کو مرید کرلوں، مگر وقت نہ دے سکوں تو اس سلسلے کا فائدہ کیا، لہذا میں عوامی بیعت کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوا۔

حضرت الاستاذ کو ایک خلافت تو مفتی مظفر حسین مظاہریؒ صاحب سے ملی تھی اور دوسری خلاف مولانا محمود صاحبؒ خادم شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے۔ یہ حصول یابیاں بڑی اہم ہیں۔ اتنی بڑی کامیابی کسی کو مل جائے تو اس کی تشہیر سے نہیں چوکتا اور کسی نہ کسی بہانے سے اس کا ذکر کر ہی جاتا ہے۔ الا ماشاءاللہ۔ مگر مفتی صاحبؒ نے اس کی بھنک کبھی بھی لگنے نہیں دی۔ درسِ نظامی کی مشہور کتاب **الفوز الکبیر** کو جب عربی زبان کا لباس پہنایا تو ان کے بھائی حضرت مولانا مفتی امین پالن پوری مدظلہ نے **الخیر الکثیر** کے نام سے اردو میں اس کی شرح لکھی۔ آغازِ کتاب میں صاحبِ تصنیف یعنی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مفصل حالات قلم بند کیے تو اسے فارسی سے عربی میں منتقل کرنے والی شخصیت کا مفصل تعارف بھی مناسب سمجھا گیا۔ مفتی امین پالن پوری مدظلہ نے حالاتِ زندگی معلوم کیے تو بڑی مشکلوں اور منت سماجت سے آمادہ ہوئے۔ اسی موقع پر حصولِ خلافت کا یہ راز بھی کھلا۔ اخفائے حال کا یہ کمال سب کو نصیب نہیں ہوتا۔

حضرت الاستاذ کا ایک دل چسپ واقعہ

ترمذی شریف میں جمعہ کے فضائل میں ایک وجہ یہ بھی آئی ہے کہ اسی دن سیدنا حضرت آدم جنت سے نکالے گئے۔ اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ جنت سے اخراج فضیلت کی وجہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب حضرت الاستاذ یوں دیتے ہیں کہ کبھی کبھی اخراج بھی بڑی سعادتوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ اگر آدم جنت سے نہ نکالے جاتے تو خلافتِ ارضی کا منصب انہیں کیسے ملتا؟ پھر اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں مظاہرِ علوم میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس وقت مفتی مظفر حسین صاحبؒ کا درسِ جلالین بہت مقبول تھا۔ سال کے آخر میں طلبہ میں یہ بات پھیلی کہ اگلے سال جلالین کا درس مفتی مظفر حسین مظاہریؒ صاحب سے متعلق نہیں رہے گا۔ اس خبر سے اگلے سال جلالین میں جانے والے طلبہ میں بے چینی پھیل گئی۔ حضرت الاستاذ کے ہم جماعت کچھ طلبہ نے تعلیمات کو درخواست دی کہ آئندہ سال بھی جلالین مفتی صاحب کو دی جائے۔ اس درخواست پر جن تیرہ طلبہ کے دستخط تھے، ان میں میں بھی تھا۔ اس درخواست کا نقصان یہ ہوا کہ دستخط کنندہ سارے طلبہ کا اخراج ہوگیا۔ میرے والد مظاہرِ علوم کے شیدائی تھے۔ شوال میں مظاہر پہونچے اور مفتی یحییٰ صاحبؒ سے صورتِ حال عرض کی، انہوں نے تعلیمات کے نام سفارش لکھی، لیکن منظور نہ ہوئی۔ ناچار مولانا یحییٰ کاندھلویؒ نے فرمایا کہ یہاں داخلہ نہیں ہوا تو مایوسی کیوں! میں سعید احمد کو دارالعلوم میں داخل کرواتا ہوں۔ وہ دیوبند آئے اور داخلہ کروایا۔ حضرت الاستاذ کہتے ہیں کہ اگر مظاہر سے میرا اخراج نہ ہوا ہوتا تو آج اتنے بڑے مقامات تک کیسے پہونچ پاتا۔ معلوم ہوا کہ کبھی کبھی اخراج بھی بڑی نعمت بن جاتا ہے۔

مفتی صاحب سے میری پہلی ہم کلامی

میں نے دارالعلوم میں اپنی طالب علمی کے تین سال گزارے۔ اساتذہ کے رعب نے کبھی کسی سے قریب ہونے نہیں دیا۔ بس شیخ عبدالحق اعظمیؒ صاحب تک میری رسائی رہی، کیوں کہ وہ میرے والدِ مرحوم مولانا جمیل احمد

ناصری صاحب کے گہرے دوست اور مخدوم زادے تھے۔ مفتی صاحبؒ سے میری پہلی ہم کلامی ڈابھیل میں ہوئی۔ میں اس وقت جامعہ فیضان القرآن احمد آباد میں مدرس تھا۔ اس ادارے کے مہتمم مولانا حبیب احمد صاحب زید مجدہم جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی اس کے رکنِ رکین تھے۔ مولانا حبیب صاحب زید مجدہم شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈابھیل گئے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہیں حضرت الاستاذ سے پہلی بار ہم کلامی کا موقع ملا۔ دفترِ اہتمام میں ملاقات اور مختصر بات چیت ہوئی۔ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کی مسجد میں ہوا، ان کا بیان اب تک میرے حافظے میں ہے۔

حضرت الاستاذ کی خواب میں زیارت

اس ملاقات سے پہلے اور بعد میں دو تین خواب ایسے دیکھے کہ میں چونک گیا۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ دارالعلوم کے دارالحدیث میں ترمذی پڑھا رہے ہیں۔ طلبہ میں میرے ساتھ دو ساتھی اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک مفتی محمد شاہد قاسمی مدھوبنی، جو اس وقت ستپون میں تدریس کر رہے ہیں۔ دوسرا میرے ذہن میں نہیں۔ میں حیران ہوا کہ حضرت الاستاذ سے کبھی تعارف نہیں، حتیٰ کہ بات چیت بھی نہیں اور خواب ایسا!! میں اسے مبشرات مان کر خوش ہوتا رہا۔ اسی سے ملتا جلتا خواب سال دو سال کے عرصے میں ایک بار اور دیکھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان خوابوں کا میری زندگی سے جوڑ کیا ہے؟

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی زیارت

اسی عرصے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی بھی خواب میں زیارت ہوئی۔ دیکھا کہ حضرت کاندھلویؒ بہار میں ہیں اور میرے مکان میں تشریف فرما۔ شیخ الحدیث صاحب کو میں نے ان کی حیات میں نہیں دیکھا ہے۔ ان خوابوں سے مجھے بڑی حیرانی ہوتی تھی اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے کسی سے ان خوابوں کا تذکرہ بھی مناسب نہیں سمجھا۔

خوابوں کی تعبیر کیا نکلی؟

آگے بڑھنے سے پہلے بطور تحدیث بالنعمت عرض ہے کہ میرے خواب اکثر مبشرات کے قبیل سے ہوتے ہیں۔اوران کی تعبیر ضرور سامنے آتی ہے۔ ۲۰۰۸ میں بصیغۂ تدریس جب میں دیوبند پہونچا اور نسائی شریف متعلق ہوئی تو اس وقت وہ خواب تازہ ہو گئے اور میں نے اسے ان خوابوں کی تعبیر سمجھی کہ اشارہ خدمتِ حدیث کی طرف تھا۔تین سال کے بعد ترمذی شریف جلدِ اول ملی تو وہ خواب اور درست ثابت ہوا، کیوں کہ دارالعلوم میں وہ ترمذی پڑھا رہے تھے اور جامعہ امام محمد انور شاہ میں میں۔لیکن میں نے ان خوابوں کا تذکرہ دیوبند آکر بھی کسی سے نہیں کیا۔میرا خیال تھا کہ لوگ اسے ماحول سازی پر محمول کریں گے۔اب جب کہ حضرت الاستاذ دنیا میں نہیں ہیں، تو ان کے ذکر میں اب کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔

جامع الکمالات

معاصر آدمی جلدی کسی کی تحسین نہیں کرتا۔ہم عصروں سے پذیرائی کے کلمات حاصل کرنا گویا ہتھیلی پر سرسوں اگانا ہے، لیکن مفتی صاحب کی بات ہی جدا ہے، وہ ایسے خوش قسمت اور سعادت مند ہیں کہ معاصرین نے بھی انہیں خوب سراہا۔مشہور ناقد و مصنف مولانا ابوبکر غازی پوریؒ، جنھوں نے بعد میں تحفۃ الالمعی کی اغلاط پر کئی صفحات لکھ دیے تھے، زمزم میں ان کے قلم سے اعتراف کے ایسے ایسے جملے ہیں کہ ان پر رشک ہی کیا جا سکتا ہے۔ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں: حضرت مفتی صاحب نے تھوڑے عرصہ میں پورے ایک ادارے کا کام کیا ہے اور کرتے جا رہے ہیں۔ان کی عمر اگر ڈھل رہی ہے تو ان کے قلم کی جوانی اور اس کی رعنائی بڑھتی جا رہی ہے۔اور یہ سب اللہ کی توفیق و نصرت کے بعد برکت ہے کہ مفتی صاحب کو بلا وجہ کی مجلس جمانے سے مطلب نہیں ہے۔کثرتِ اختلاط سے ان کو اجتناب ہے۔ان کو اپنے وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے۔مکمل یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔سیاست سے مولانا کا دور کا واسطہ نہیں ہے۔علمی کام میں لگے رہنا اور مست رہنا یہی ان کا

مزاج اور یہی ان کی طبیعت ہے۔[تحفۃ الالمعی ، ج۶، ص ۶۲۳]

موجودہ زمانے کے سلطان القلم، عربی و اردو کے یکساں بطلِ جلیل حضرت مولانا نورِ عالم خلیل امینی نے کئی بار مجھ سے کہا کہ دار العلوم کے جس استاذ کے علم و تحقیق پر مجھے سب سے زیادہ اعتماد ہے وہ مفتی صاحب ہی ہیں۔ ان کے پاس تقریباً ہر سوال کا جواب رہتا ہے۔ علمی بات یا پیدا شدہ اشکال میں ان سے معلوم کر لیتا ہوں اور وہ بھی اچھی طرح مسئلے کی توضیح کر جاتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جو بات انہیں معلوم نہیں ہوتی تو اپنے عدمِ علم کا صاف صاف اعلان کر دیتے ہیں۔ میری نظر میں وہ ہر طرح کامل و مکمل عالم ہیں۔

مفتی صاحب کے تصنیفی کارنامے

حضرت الاستاذ مفتی صاحب کی تدریس شہرۂ آفاق تو تھی ہی، تصنیف کا انداز بھی بڑا مستند تھا۔ ان کے قلم سے ۴۴ کتابیں نکلیں۔ دیگر کتابوں پر حواشی اور تعلیقات کو بھی ملا لیا جائے تو یہ تعداد ۵۰ سے بھی اوپر پہونچتی ہے۔ مفتی صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کو مرجعیت مل گئی۔ ان کی قلمی خدمات کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے، جو اس مختصر سے مضمون میں نہیں سما سکتا۔ یہاں صرف چند کتابوں پر ہلکا پھلکا تبصرہ مقصود ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ

حجۃ اللہ البالغہ مُسند الہند الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصنیفِ لطیف ہے۔ اس میں مصنف نے کمالِ مہارت سے اسلامی تعلیمات اور احکام کی حکمتیں بیان کی ہیں۔ عبادات، معاملات، معاشرت وغیرہ مسائل پر کھل کر بحث کی ہے۔ متعارض احادیث کے درمیان خوب صورت تطبیق بھی دی گئی ہے۔ دین کی تفہیم کے لیے انہوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بڑا دل چسپ، لاجواب اور عدیم المثال ہے۔ کتاب میں متعدد ابواب کے تحت قیمتی مباحث ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور ابتدا سے ہی اہلِ علم کے نزدیک سرمۂ نورِ نظر۔

اس کتاب کی تدریس کا آغاز دار العلوم میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے کیا، ان سے پہلے یہ کبھی

داخلِ نصاب نہیں تھی اور اکثر وبیش تر انہیں سے متعلق رہی، حضرت حکیم الاسلام کا حکیمانہ طرزِ کلام ہمیشہ مقبول رہا ہے اوران کی حکمت وتعقل میں بلاشبہ اس کتاب کا بڑا حصہ تھا۔ مشہور عالم ومصنف مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ نے بھی دارالعلوم میں ایک دو برس اس کی تدریس کی ہے۔ پھر یہ کتاب حضرت الاستاذ سے متعلق ہوئی۔ اہلِ علم و مطالعہ جانتے ہیں کہ اسے پڑھانا جوئے شیر لانا ہے۔اس کتاب کی پیچیدگی کا عالم یہ ہے کہ دارالعلوم میں ایک مرتبہ اس کی تدریس کا مسئلہ کھڑا ہوا تو کوئی بھی سامنے نہ آسکا۔ ہمت کرکے ایک استاذ آئے بھی تو مراجع کی نشان دہی کی شرط کے ساتھ۔ کوئی معاون کتاب نہ دیکھ کر وہ بھی پیچھے ہٹ گئے، لیکن یہی کتاب جب حضرت الاستاذ کے پاس آئی تو انہوں نے اسے چیلنج کے طور پر لیا اور پھر پوری تن دہی سے اس کی تدریس سے عہدہ برآ ہوئے۔ بعض جگہ پر مشکلات پیش آئیں اور بے چینی بڑھی تو ان کا حل خواب کے ذریعے ملا۔ پھر تو اس کتاب سے ایسی محبت ہوئی کہ اس سے لپٹ کر رہ گئے۔ اس کو ایڈٹ کیا اور اپنے گراں قدر تعلیقات کے ساتھ اپنے مکتبہ سے شائع کیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے اس کی اردو شرح بھی لکھی، جو پانچ جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں، جب کہ اس کے حل کے لیے کسی بھی زبان میں کوئی معاون کتاب نہیں تھی، حضرت الاستاذ نے اپنی انتھک کوششوں سے اس کی شرح لکھی اور کیا لاجواب لکھی!! ان کی یہ شرح کسی بھی زبان میں اب تک کی واحد شرح ہے۔ جس طرح حجۃ اللہ البالغہ اربابِ فضل وکمال کی نگاہوں میں محبوب ومقبول رہی ہے، امید ہے کہ رحمۃ اللہ الواسعہ بھی اسی کے شانہ بشانہ اپنی اہمیت وافادیت درج کراتی رہے گی۔

رحمۃ اللہ الواسعہ کی تصنیف کے دوران عجیب وغریب واقعات

حجۃ اللہ البالغہ کا مختصر تعارف آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہ کتاب جب مفتی صاحب سے وابستہ ہوئی تو آپ نے پوری لگن سے اسے پڑھایا۔ پھر دن رات لگ کر سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد اس کی شرح بھی تیار کر ڈالی۔ اس کتاب کی تصنیف میں نصرتِ غیبی کا خاصا دخل رہا ہے۔ دارالعلوم کے استاذ محترم جناب مولانا اشتیاق احمد

دربھنگوی زید مجدہم کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ حضور! آپ اسے حل کیسے کرتے ہیں؟ اس کے لیے کوئی معاون کتاب بھی دیکھتے ہیں کیا؟ تو فرمایا: کچھ نہیں۔ حجۃ اللہ کے مسلسل مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ شاہ صاحب ساتویں آسمان کی بات کرتے ہیں۔ اس کے لیے بہت غور کرنا پڑتا ہے۔ مولانا دربھنگوی کے بقول: حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ کوئی عبارت سمجھ میں نہیں آئی۔ پورا زور لگا لیا، مگر عقدہ نہ کھلا، اسی حال میں آنکھ لگ گئی۔ دیکھا کہ کوئی صاحب تشریف لائے اور انہوں نے متعلقہ مقامات کی ایسی تشریح کر دی کہ طبیعت منشرح ہوگئی۔ آنکھ کھلی تو وہ مقامات حل تھے۔ ایک بار تو اور بھی عجیب قصہ ہو گیا۔ کسی مقام پر بری طرح پھنس گئے۔ بات کسی طرح نہ بن سکی۔ سوئے تو دیکھا کہ خاکی رنگ کے دراز کرتے میں ملبوس ایک بزرگ شخصیت تشریف فرما ہے اور متعلقہ بحث کی توضیح کر رہی ہے۔ مارے خوشی کے آنکھ جو کھلی تو دیکھا کہ خواب والے وہی بزرگ آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کے پاس سے واپس جا رہے ہیں، پھر آنگن کی طرف نکلے۔ ان کے پیچھے مفتی صاحب بھی گئے تو دیکھا کہ کوئی بھی نہیں تھا۔

تحفۃ الالمعی کا تعارف

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ترمذی شریف کے اسباق حضرت الاستاذ سے ۱۴۰۲ھ میں متعلق ہوئے۔ حضرت کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر سبق سے پہلے معقول تیاری کرتے تھے اور خاص ترتیب سے ان کا درس ہوتا تھا، جس کا عمومی اور نقد فائدہ یہ تھا کہ طلبہ کا ذہن ان کے دروس سے فوراً ہم آہنگ ہو جاتا تھا۔ حضرت الاستاذ نے بعد میں ہر سبق کو ریکارڈ کرانے کا بھی اہتمام کیا۔ تحفۃ الالمعی اور تحفۃ القاری کی کئی جلدیں اسی طرح تیار ہوئیں۔ تحفۃ الالمعی بڑے سائز میں آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد کم و بیش ساڑھے چھ سو صفحات لیے ہوئی۔ شروع کی تین چار جلدیں درسی تقریروں کا مجموعہ ہیں اور بقیہ جلدیں باقاعدہ تصنیف کردہ۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خالص درسی انداز لیے ہوئی ہے۔ پہلے ترجمۃ الباب ہے اور پھر اس کے ذیل میں آنے والی ساری حدیثوں پر پوری

بحث۔ پھران احادیث کا ترجمہ، پھر تشریح اوراس کے بعد متن۔ متن کے بعد راویوں پر کلام، لغات کی تحقیق و تشریح وغیرہ۔یعنی بالکل اسی ترتیب پر، جس پران کے اسباق کا التزام رہا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہر فقہی مسئلے پر تنقیحی کلام ہے۔مباحث کو مکمل طور پر الم نشرح کر دیا گیاہے۔تقریر کا سائز حسبِ ضرورت ہے۔نہ بلاوجہ طوالت ہے، نہ بےسبب اختصار۔

اس کتاب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اختلافِ ائمہ کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے لیے ایک نئی تعبیر بھی تراشی گئی ہے، جس کا عنوان ہے کہ **یہ اختلاف نص فہمی کا ہے، دلائل کا نہیں**، حالانکہ اس نئے نکتے پر بعض اہلِ علم نے سخت اشکالات وارد کیے ہیں، تاہم بہت سے اہلِ علم نے اسے قبول بھی کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ پوری بحثیں آسان الفاظ میں ہیں۔جن سے مفاہیم کا اخذ و التقاط سہل تر ہو گیا ہے۔موقع کی مناسبت سے جگہ جگہ تفریحی جملے بھی ہیں۔واقعات اور مشاہدات بھی ہیں۔عربی ضرب الامثال کی قریب الفہم تشریح بھی ہے۔مثلا: احادیث کے ذخیرے میں جا بہ جا ایک جملہ آتا ہے: یجر ثوبہ، جس کا لفظی معنیٰ ہوتا ہے کہ لنگی گھسیٹتے ہوئے فلاں کام کیا۔مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک اسلوبِ بیان ہے۔حقیقتِ لفظیہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔اس جملے کی غرض وغایت تیزی سے اٹھنے کو بتانا ہے۔آدمی لنگی پوش ہو یا پاجامے میں، زمین سے اس کا گھسٹنا پایا جارہا ہو یا نہیں، بہرصورت یہ تعبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔میری طالب علمی کے دور میں حلِ ترمذی کے لیے طلبہ کی تپائیوں پر درسِ ترمذی دیکھی جاتی تھی، اب تحفۃ الالمعی سکۂ رائج الوقت ہے۔یہ کتاب بلاشبہ حلِ ترمذی میں انمول اضافہ ہے اور خاص بات یہ کہ از اول تا آخر ترمذی کا کوئی متن کلام سے خالی نہیں ہے۔

تحفۃ القاری

حضرت الاستاذ کا ایک اور بڑا کارنامہ تحفۃ القاری کی تصنیف ہے۔یہ بخاری شریف کی اردو شرح ہے۔بارہ

جلدوں میں۔ اور اہلِ علم وفن میں بے حد مقبول۔ شروع کی پانچ جلدیں درسی تقریروں پر مشتمل ہیں۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جلدیں تصنیف بھی ہیں اور تقریر بھی، جب کہ نو سے بارہ جلدیں کل کی کل تصنیف ہی ہیں۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ رحمۃ اللہ الواسعہ اور تحفۃ الالمعی کی طرح یہ بھی مکمل بخاری کی شرح ہے۔ کوئی حدیث شرح سے خالی نہیں۔ ایجاز واطناب کے عیب سے پاک۔ ضروری مقامات پر مکمل کلام ہے اور جہاں کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں، وہاں سے اختصار کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ بقیہ دو شروحات کی طرح اس میں بھی متن پر اعراب لگا دیا گیا ہے۔ ترجمہ اور تشریح بھی ہے۔ بخاری شریف کے عنوانات کے بارے میں مشہور ہے کہ فقہ البخاری فی تراجمہ، یعنی امام بخاری کی شانِ فقاہت تراجمِ ابواب سے واضح ہوتی ہے۔ انہیں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ امام بخاری محض محدث ہی نہیں، مہتم بالشان فقیہ بھی تھے۔ حضرت الاستاذ نے بخاری کے تراجم پر بھی کھل کر کلام کیا ہے۔ جا بہ جا اصولِ حدیث پر بھی گفتگو موجود ہے۔ ترتیب واسلوب وہی تحفۃ الالمعی والا ہے۔ بہت سے مدرسین اسی کتاب کی مدد سے شیخ الحدیث بن گئے۔ کتاب بڑی مقبول ہے اور متداول۔

چند دیگر تصنیفات

یہاں صرف تین کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مختصر مضمون میں سب کے تعارف کی گنجائش کہاں! یہاں صرف چند مشہور کتابوں کے نام پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ۱: کامل برہانِ الٰہی۔ یہ اصلاً رحمۃ اللہ الواسعہ ہی ہے، فرق اتنا ہے کہ اس میں حجۃ اللہ البالغہ کا متن اور ترجمہ موجود نہیں۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ ۲: ہادیہ شرح اردو کافیہ۔ اس کتاب میں کافیہ کو نہایت آسان زبان اور ترتیب کے ساتھ حل کیا گیا ہے۔ ۳: آسان نحو۔ عربی کے ابتدائی بچوں کے لیے زبردست کتاب ہے، یہ دو حصوں میں لکھی گئی ہے۔ ۴: آسان صرف۔ یہ کتاب تین حصوں میں ہے اور ابتدائی طلبہ کے لیے مفید تر۔ ۵: آسان منطق۔ یہ کتاب تیسیر المنطق کی تسہیل ہے۔ ۶: فیض المنعم۔ مقدمۂ مسلم کی اردو شرح ہے۔ اصولِ حدیث کے طالب علموں کے لیے نایاب تحفہ۔ ۷: تحفۃ الدرر۔ یہ نخبۃ الفکر کی

کامیاب شرح ہے اور بے حد مقبول۔ ۸: مفتاح التہذیب۔ علامہ سعد الدین تفتازانی کی کتاب: تہذیب المنطق کی زبردست شرح ہے۔ شرح تہذیب کے حل میں بڑی معاون۔ ۹: آپ فتویٰ کیسے دیں؟۔ یہ کتاب علامہ محمد امین ابنِ عابدین شامی کی شرح عقود رسم المفتی کی اردو شرح ہے۔ ۱۰: حیاتِ امام ابوداؤد۔ اس میں مشہور محدث امام ابوداؤد سجستانی کے حالات تفصیل سے قلم بند کیے گئے ہیں۔

مفتی صاحب اور تجارت

بعید ترین ماضی کے اکابر علما درس وتدریس کے ساتھ تجارت سے بھی وابستہ تھے اور تجارت ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ یہ مزاج تقریباً اب ختم سا ہو گیا ہے۔ ادھر چند سالوں سے علمائے امت تجارت کی طرف بھی مائل ہوئے ہیں، جو بڑی خوش آئند بات ہے۔ حضرت الاستاذ نے بھی مکتبہ حجاز دیوبند کے پلیٹ فارم سے اسلافِ قدیم کے طرز پر کتابوں کی تجارت شروع کی، جس میں الحمد للہ بڑی کامیابی ملی۔ مرفہ الحالی آئی، حالات مزید بہتر ہوئے، پھر حجِ بیت اللہ کی سعادت بھی حصے میں آئی۔

پوری تن خواہ واپس کردی

مالی حالت مستحکم ہوئی تو تن خواہ لینی بند کر دی۔ ۱۴۲۳ھ سے بلا مشاہرہ پڑھاتے رہے۔ اپنی تدریس کے دور میں جتنی تنخواہیں پائی تھیں، سب متعلقہ مدارس کو واپس کر دیں۔ دارالعلوم اشرفیہ راندیر اور دارالعلوم دیوبند سے ہر ماہ جتنے روپے ملے، سب ایک ایک کر کے لوٹا دیے۔ واپس کی ہوئی کل رقم ۹ لاکھ ۴۹ ہزار آٹھ سو چار روپے پچھتر پیسے ہے۔ یہ ایک بہترین اور مثالی قدم تھا، جسے اربابِ فضل وکمال نے استحسان کی نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے اس عمل سے گویا یہ بتا دیا کہ اساتذہ کو چاہیے کہ مدارس پر بوجھ نہ بنیں اور وسعت کے وقت محض حسبۃً للہ اپنی خدمات پیش کریں۔

حضرت الاستاذ کی شادی اور اولاد

مفتی صاحب کی شادی ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۶۵ میں اپنے ماموں کی لڑکی سے ہوئی۔ ماموں کا نام مولانا حافظ حبیب الرحمٰن شیرا تھا۔ تین بچے اور ایک بیوہ چھوڑ کر جوانی میں ہی انہوں نے آخرت کی راہ لے لی تھی۔ ان کے بچوں کی کفالت ان کے بھائی مولانا عبد الرحمن شیرانے کی۔ مفتی صاحب کی اہلیہ کا نام سکینہ تھا۔ اپنے نام ہی کی طرح سکونِ قلب کی دولت سے نصیب یاب۔ بڑی پارسایانہ زندگی گزاری۔ اپنے نامور شوہر کے پاس ہی کلامِ مقدس سینے میں محفوظ کیا۔ ان عفیفانہ اور زاہدانہ زندگی کا اثر یہ تھا کہ مفتی صاحب کے سارے بچے اور بچیاں حفظ کی دولت سے مالا مال ہیں۔ حضرت الاستاذ کی کل چودہ اولادیں ہوئیں۔ ان میں سے گیارہ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ دو بیٹے صاحبِ اولاد ہو کر دنیا سے جا چکے، جب کہ ایک لڑکی بچپن میں ہی فوت ہوئی۔

سب سے بڑے بیٹے مولانا رشید احمد تھے، جو ایک سڑک حادثے میں شہید ہو گئے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۶ میں پیدا ہوئے اور ۷ مارچ ۱۹۹۵ ان کا یومِ شہادت ہے۔ کل ۲۹ برس کی زندگی پائی۔ ایک سال جامعہ حسینیہ راندیر میں بھی پڑھایا۔ کامیاب عالم تھے اور دار العلوم دیوبند کے فاضل۔ مصنف بھی تھے اور مفتی صاحب کی امیدوں کے مرکز بھی۔ دو فرزندان کی یادگار ہیں۔

دوسرے صاحب زادے کا نام مولوی حافظ سعید احمد ہے۔ ان کی پیدائش ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۸ میں ہوئی۔ نومبر ۲۰۱۹ میں وفات پائی۔

تیسرے صاحب زادے مولانا وحید احمد ہیں۔ ۲ اگست ۱۹۶۹ میں پیدا ہوئے۔ مکتبہ وحیدیہ کے نام سے دیوبند میں ایک کتب خانہ چلاتے ہیں۔

چوتھے فرزند مولانا حسن احمد ہیں۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۳ کی ولادت ہے۔ فاضلِ دار العلوم ہیں۔ کمپیوٹر کے بہترین آپریٹر ہیں۔ مفتی صاحب کی کتابوں کی کمپوزنگ اکثر وہی کرتے ہیں۔

پانچویں فرزند مولانا حسین احمد ہیں۔ ۲۴ جون ۱۹۷۴ میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم سے تعلیم پائی۔ بڑے ہی لائق وفائق اور جید الاستعداد ہیں۔ کئی اہم اداروں میں دینی خدمات پیش کرنے کے بعد اب دیوبند میں دارالافتاء چلا رہے ہیں۔ تحفۃ الالمعی اور تحفۃ القاری کی کئی جلدیں انہیں کی ترتیب سے آئی ہیں۔ ایضاح المسلم کے نام سے مسلم شریف کی شرح بھی لکھ رہے ہیں۔

چھٹے فرزند مولانا محمد ابراہیم ہیں۔ ولادت ۱۹۷۶ میں ہے۔ دارالعلوم کے فاضل اور میرے رفیقِ درس۔ اس وقت غازی آباد میں بصیغۂ تدریس مقیم ہیں اور اپنے والد کی نیک نامی میں اضافے کا ایک اور سبب۔ ساتویں بیٹے کا نام حافظ محمد قاسم ہے۔ ۱۹۷۸ میں پیدا ہوئے۔

آٹھویں فرزند کا نام مولانا محمد سعید ہے۔ 1981 کی ولادت ہے۔ فاضلِ دارالعلوم ہیں۔ اس وقت ہمارے ساتھ جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند میں استاذ ہیں۔ بہترین صلاحیتوں سے مالا مال۔

نویں بیٹے کا نام مولانا احمد سعید ہے۔ یہ بھی فاضلِ دارالعلوم ہیں اور جامعۃ الشیخ دیوبند کے مقبول مدرس۔ ان کی پیدائش ۲۱ نومبر ۱۹۸۲ میں ہے۔

دسویں بیٹے حافظ عبداللہ ہیں اور گیارہویں فرزند حافظ عبیداللہ۔ مفتی صاحب کے گیارہ فرزندوں میں سے سب کے سب حافظ ہیں، جب کہ چھ بیٹے عالم بھی ہیں۔

حضرت الاستاذ بحیثیت قوّام البیت

حضرت الاستاذ قوام البیت یا بالفاظِ دیگر گھریلو ذمے دار کی حیثیت سے بھی ممتاز ترین مقام رکھتے ہیں۔ بچوں کی دینی تربیت اس انداز سے کی کہ اس پر ہر نیک بندے کو رشک آ سکتا ہے۔ ان کے سارے فرزند حافظ ہیں۔ ساری بیٹیاں حافظہ ہیں۔ حتیٰ کہ ساری بہوئیں بھی۔ نظام الاوقات ایسا بنایا کہ گھر کی ساری مستورات حفظ کی دولت آسانی کے ساتھ سمیٹنے میں کامیاب رہیں۔ حافظ بیٹے، بیٹیوں اور بہوؤں کی اتنی بڑی تعداد کسی ایک مسلم

گھرانے میں شاید ہی مل سکتی ہے۔

صبرِ جمیل کا حسین عنوان

مفتی صاحب صبرِ جمیل کے باب میں بھی بڑے نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ان کے بڑے فرزند مولانا رشید احمد کی شہادت کے الم ناک سانحے کے وقت مفتی صاحب انگلینڈ کے سفر پر تھے۔واپس تشریف لائے تو اپنے گھر کے افراد کو جمع کیا۔دونوں یتیم پوتوں کو بھی بلایا۔پھر وصیت کی کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ دونوں پوتے میری پرورش میں رہیں گے۔میرے مرنے کے بعد میرے ترکے میں سے ان کو بھی اسی قدر حصہ ملے گا،جس قدر میرے بیٹوں کو۔یہ ترکہ میرے تہائی مال میں سے بطور وصیت کے ملے گا۔مفتی صاحب کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹوں کی تعداد بارہ ہو جائے،اس طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت الاستاذ نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرا ایک بچہ لے لیا،مگر اس کے بدلے میں دو بیٹے عنایت کیے۔اب میں بارہ لڑکوں کا والد ہوں۔ایسے غم آگیں ماحول میں استاذِ اکبر کا صبر،شکر اور علمی استحضار حیرت انگیز ہے۔

اہلیہ کی وفات پر مفتی صاحب کا ردِ عمل

۲۳ مئی ۲۰۱۱ میں ان کی رفیقۂ حیات بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ان کی وفات پر تعزیت کے لیے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ہمارے جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند سے بھی ایک وفد تعزیت کے لیے پہونچا، جس میں میں بھی شریک تھا۔میں نے مفتی صاحب کو دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح پُرسکون ہیں اور تبسم ریز بھی۔ہم سے اس طرح بات کررہے تھے،جیسے ان کے یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو،حالانکہ ان پر قیامت گزر چکی تھی۔

ٹھیک اسی دن حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوریؒ کی اہلیہ کا بھی سانحۂ ارتحال پیش آیا تھا،تعزیت کے لیے ان کے یہاں بھی پہونچے تو وہی طمانیت،وہی سکونِ دل اور وہی حسبِ معمول کیفیت تھی۔میں حیران تھا کہ اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی ان کا انداز وہ تھا،جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ایسے تھے ہمارے

اساتذہ۔

مفتی صاحب کی صحت

حضرت الاستاذ برسوں سے جادو کے شکار تھے۔ اس سے بڑے پریشان بھی رہتے۔ عرصے سے شوگر نے بھی جکڑ لیا تھا، ادھر کم وبیش پندرہ سال سے دل کی بیماری بھی لگ گئی تھی، مگر با ایں ہمہ ان کی صحت بحیثیتِ مجموعی قابلِ رشک تھی۔

بیماری کے عنوان سے ان کی چھٹیاں شاذ ونادر ہی ہوئی ہیں۔ وہ بڑی پابندی سے اسباق پڑھا رہے تھے۔ وہی طول طویل نشستیں۔ وہی لمبی چوڑی بحثیں۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح چلے جائیں گے۔

میں سب کو مار کر مروں گا

ادھر دوتین برسوں سے مفتی صاحب کی بیماری کبھی کبھی زیادہ بڑھ جاتی تو ان کی وفات کی افواہیں بھی گردش کرنے لگ جاتیں۔ ایک دن دارالحدیث آئے تو مزاحیہ لہجے میں کہا: تم سمجھتے ہو کہ میں مرجاؤں گا؟ سن لو میں ابھی نہیں مروں گا، بلکہ سب کو مار کر مروں گا۔ ان کے اس جملے سے اپنی صحت کے تئیں خود اعتمادی کو سمجھا جاسکتا ہے۔

بخاری شریف کا آخری درس

تین ماہ قبل رجب میں بخاری شریف کی آخری حدیث پڑھانے آئے۔ بالکل روایتی شان سے۔ نقاہت تھی، مگر اتنی بھی نہیں۔ سبق شروع ہوا۔ طالب علم کی قرات کے بعد مفتی صاحب نے بولنا چاہا تو زبان ہی نہ کھلی۔ بڑی مشکل سے بولے بھی تو صرف اتنا: جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی جب زبان نے کوئی ساتھ نہیں دیا تو مجبوراً سبق روک دیا۔ پھر ہچکیاں مار کر رونے لگے۔ یہ منظر بڑا ہی الم ناک تھا۔ بلبل کی طرح چہکنے

والے محبوب استاذ کی یہ بے بسی دیکھی تو کوئی بھی طالب علم اپنے کو نہ روک سکا۔ پورا دارالحدیث دیوارِ گریہ بن گیا۔ نالہ وشیون سے طلبہ کا مجمع قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ با دلِ ناخواستہ مفتی صاحب اٹھے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے درس گاہ سے نکل گئے:

اب کے جاتے ہوئے اس طرح کیا اس نے سلام
ڈوبنے والا کوئی ہاتھ اٹھائے جیسے

علاج کے لیے ممبئی روانگی

بوجھل قدموں اور ساکت زبان کے ساتھ دارالحدیث سے باہر نکلے تو اگلے دن بغرضِ علاج ممبئی پہونچ گئے۔ وہاں جا کر ابتدائی طبی نے ہی صحت یابی کی نوید سنائی۔ اسی دوران کورونا وائرس نامی عالمی وبا کی بنا پر لاک ڈاؤن لگ گیا۔ مفتی صاحب کی چھوٹی بیٹی وہیں رہتی ہیں۔ ان سمیت متعلقین کی غیر معمولی خدمات اور توجہات کے طفیل صحت میں دن بدن بہتری دیکھی گئی۔ رجب کے بعد شعبان بھی صحت کے ساتھ نکل گیا۔ رمضان آیا تو تراویح کے بعد بیان کا سلسلہ بھی شروع کیا، جو سوشل میڈیا پر براہِ راست نشر ہوتا رہا۔ وہی علمی باتیں، وہی تفہیم، وہی تسہیل۔ ہم نے یہی سمجھا کہ سب خیریت ہے۔ عید الفطر میں دارالعلوم کھلے گا تو ان کی تدریس کی مسند ایک بار پھر اپنی قسمت پر ناز کرے گی۔

مجھے کورونا نہیں ہے

حضرت الاستاذ کے بیانات کا مسعود سلسلہ ہنوز جاری تھا کہ ۱۵ ویں رمضان کو طبیعت بگڑنے کی خبر نے تلامذہ، متعلقین اور متوسلین کے ہوش اڑا دیے۔ اسی دوران مفتی صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ مجھے ہلکا سا بخار ہے۔ جو موسم کی تبدیلی سے عموماً آ جاتا ہے۔ خیال رہے کہ طبی تجزیے کے مطابق مجھے کورونا نہیں ہے۔ اسی بیان میں یہ بھی کہا کہ میری ناسازیٔ طبع کے چلتے مجھے مولانا عبدالرؤف غزنوی صاحب نے کراچی سے فون کیا ہے

کہ ان حالات میں آپ بیانات کم کریں۔ اسی طرح میرے ایک اور دوست نے درخواست کی ہے کہ بیان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔لیکن میں بیان کروں گا۔

پھیپھڑے میں پانی جمع ہوگیا ہے

پھر اتار چڑھاؤ کا دور شروع ہوا۔ دو دن کے بعد ان کے فرزند حافظ قاسم سعید صاحب نے خبر دی کہ پھیپھڑے میں پانی جمع ہو گیا ہے۔ اس خبر نے سب کو دہشت میں ڈال دیا۔ سارے متعلقین دعاؤں میں لگ گئے۔پھیپھڑے میں پانی کا جمع ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ حالات کی سنگینی کے باوجود دعاؤں کا دور جاری تھا۔اللہ نے چاہنے والوں کی لاج رکھ لی۔ وہ ایک بار پھر صحت کی طرف لوٹنے لگے۔تشویش کی بات ختم ہوگئی۔

کیا مفتی صاحب کی وفات کورونا سے ہوئی؟

لیکن بحالیٔ صحت کا یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ دو تین دن ہی گزرے تھے کہ ان پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ ہسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹروں نے ایڈمٹ کرنے کے لیے کورونا کی منفی رپورٹ پہلے پیش کرنے کی شرط لگا دی۔ کئی ہسپتال کے چکر لگائے گئے، مگر سب کا ایک ہی جواب تھا۔ اسی رواروی میں ڈیڑھ دو دن ضائع ہو گئے۔ اخیر میں ملاڈ کے سنجیونی ہسپتال میں آئی سی یو وارڈ میں داخل کیا گیا۔ مرض کی شدت اور اس پر بھی تاخیر در تاخیر۔ اس کے باوجود طبیعت میں سدھار ہوئی۔ آئی سی یو سے جنرل وارڈ میں لائے گئے۔ آم اور پان کھایا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہسپتال سے سالماً غانماً لوٹ آئیں گے، لیکن وا اسفاہ! صحت نے پھر بے وفائی کی۔ فرزندِ ارجمند حافظ قاسم سعید صاحب نے خبر دی کہ حالت تشویشناک ہے۔ دو تین روز سے ہوش میں نہیں ہیں۔ پھر چھبیسویں رمضان کو یہ روح فرسا خبر بھی کانوں سے ٹکرائی کہ مفتی صاحب داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ موت کے کئی اسباب ایک ساتھ جمع ہو گئے۔ پھیپھڑے میں پانی جمع تو ہوا ہی تھا، دل کے دورے کے بعد کورونا نے بھی حملہ کر دیا۔

کلمہ کے ورد کے ساتھ دنیا کو الوداع

ابھی مفتی صاحب بے ہوش ہی تھے۔ ناک میں وینٹی لیٹر لگا ہوا تھا۔ علاج کی کوشش جاری تھی کہ ہسپتال کی نرس کے بقول: اچانک رات کے دو تین بجے حضرت الاستاذ نے اسی بے ہوشی کے عالم میں وینٹی لیٹر ہٹا دیا۔ ساری ڈاکٹری چیزیں نوچ نوچ کر الگ کر دیں اور پھر کلمۂ طیبہ کا وظیفہ بآوازِ بلند زبان سے جاری ہو گیا، جس کا پہلا حصہ سراً تھا اور دوسرا جز جہراً۔ اللہ اللہ! بے ہوشی میں بھی کس قدر ہوش تھا!! کلمۂ طیبہ کا یہ ورد آخری سانس تک چلا۔

کتنی مبارک موت ملی!!

مفتی صاحب کی موت سعادتوں کا گنجینہ بن گئی۔ رمضان المبارک کے مسعود اوقات۔ ان پر مستزاد قدر کی امکانی رات۔ غریب الوطنی۔ پھر عالمی وبا بھی، جس میں مرنا شہادت کا مقام دلاتا ہے۔ اتنی ساری فضیلتیں اس محدث ومفسر کے حصے میں آئیں جو ساری زندگی گناہوں سے نفرت اور نیکیوں سے محبت کرتا رہا۔ سچ ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وفات کی خبر نے علمی دنیا میں صفِ ماتم بچھا دی

وفات کی خبر جوں ہی عام ہوئی، ایک کہرام مچ گیا۔ علمی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ لوگ قرآن کی تلاوت اور ایصالِ ثواب میں لگ گئے۔ ہند و بیرونِ ہند پر ایک جیسی ہی قیامت تھی۔ حقیقی فرزندوں ہی کیا، علمی فرزندوں کا حال بھی کچھ گفتنی نہ تھا۔ ہر زبان کہہ رہی تھی کہ ہمارے سروں سے ایک سائبان ہٹ گیا۔ علمِ نبوت کا ایک سفیر، سنتوں کا ایک عاشق، اسلاف کا ایک ترجمان اور دینِ قیم کا ایک اور منفرد، مستند ومقبول شارح ہمارے درمیان سے اٹھ گیا:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

چہرے پرانوار کی بارش

فارسی شاعر نے کہا ہے:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

یعنی مردِ مومن کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ موت کے وقت اس کے لب تبسم سے سجے ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کا چہرۂ انور بھی مردِ مومن کی اس نشانی سے آراستہ پیراستہ تھا۔ چہرے پر انوار کی برسات تھی اور لب پر تبسم اور سکون کی گل فشانی۔ بہجت وشادابی بھی خوب بلائیں لے رہی تھی۔ دیکھ کر کہا نہیں جا سکتا تھا کہ مفتی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

جنازے کی نماز کس طرح ادا ہوئی؟

وفات کا اہم سبب چوں کہ کورونا کو بتایا گیا، اس لیے طبی عملے نے سارے کام کورونا متاثرین والے انجام دیے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اہلِ خانہ نے انہیں غسل بھی دیا اور کفن بھی پہنائے۔ لاک ڈاؤن کے دوران میت کے ساتھ دس بارہ افراد سے زیادہ کو جمع ہونے کی اجازت نہیں، تاہم اس فقیہ النفس اور مردِ قلندر کی کرامت تھی کہ اس کی نمازِ جنازہ میں پسِ پردہ کافی افراد شریک ہوئے، جس کے لیے کئی کئی مکبرین کا بھی سہارا لیا گیا۔ نماز قبرستان سے متصل مسجد میں ہوئی۔ امامت فرزندِ ارجمند مولانا وحید احمد صاحب نے کی۔ اگر لاک ڈاؤن نہ ہوتا تو ممبئی جیسی جگہ میں بھی لاکھوں مسلمان جنازے میں شریک ہوتے۔ لیکن کیا کیجیے!

مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

جنازہ تدفین کے لیے قبرستان چلا تو ساتھ میں بس اتنے ہی لوگ تھے، جتنے کسی سنتی نکاح کی تقریب میں ہوتے ہیں۔ جسدِ خاکی اوشیوارہ گورستان پہونچا اور پھر علم وفضل اور فقہ وحدیث کا وہ آفتاب، جو پالن پوری مطلع پر ظاہر ہوا،

دیوبند کے افق پر چمکا، عالم کو روشنی بخشی، ممبئی میں غروب ہوگیا۔ اس طرح مدینۃ العلم دیوبند کا کوہِ نور عروس البلاد کی خاک میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ ہماری سیاہ نصیبی کہ انہیں کاندھا تو کیا دیتے، مٹی ڈالنے کی سعادت کیا معنی، ان کے آخری سفر کے کسی بھی حصے کے گواہ بھی نہ بن سکے۔ دل کی اس حسرت پر سینہ کوبی کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے!! ناقدری کی سزا بھی تو ملنی چاہیے!

مفتی صاحب کی خوش بختی کہ حفاظ اور علما سے آباد ایک پورا خاندان تو چھوڑا ہی تھا، ہزاروں ہزار تلامذہ اور متوسلین کا قابلِ رشک ہجوم بھی چھوڑا۔ جایئے استاذِ اکبر! اور جنت الفردوس کی گلگشت کیجیے!

خواب میں حضرت الاستاذ کا تازہ دیدار

ان کی وفات کے بعد میں نے منظوم مرثیہ لکھا، جس نے ہر پڑھنے اور سننے والے کو رلایا۔ پھر مضامین کا سلسلہ شروع کیا، جسے بارہ قسطوں میں بادلِ ناخواستہ مکمل کیا گیا۔ ان کی وفات کو چالیس دن ہونے کو ہیں، مجھے کبھی خواب میں نظر نہیں آئے۔ لیکن ذی قعدہ کی چوتھی تاریخ اور جمعہ کا دن میرے لیے خاص سعادت لے کر آیا۔ فجر کی نماز کے بعد کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ استاذِ اکبر اپنے معروف لباس میں ہیں اور اسی روایتی رنگ و آہنگ میں۔ ایک کشادہ میدان میں چار پانچ طلبہ کو لے کر پڑھانے بیٹھے ہیں۔ ان بیٹھنے والوں میں میں بھی ہوں۔ خواب میں بتایا گیا کہ مفتی صاحب کے خلاف سازشیں چل رہی ہیں اور اسی لیے انھوں نے میدان کو پکڑا ہے۔ میں نے از راہِ مشورہ ان سے کہا کہ کیوں نہ مسجد کو تدریس کے لیے اختیار کیا جائے! حضرت الاستاذ نے میرے مشورے کی تحسین کی اور مسجد کا رخ کیا۔ پھر چلتے ہوئے مجھے زبردستی پندرہ سو روپے دیے۔ میں نے دیکھا تو تقریباً سارے ہی نوٹ دس دس کے تھے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ تعبیر بالکل واضح تھی، پھر بھی مزید اطمینان کے لیے مفتی رئیس احمد خاں بھوپالی صاحب زید مجدہم سے رابطہ کیا، انھوں نے بتایا کہ اس میں اشارہ ہے کہ مفتی صاحب کا علم خوب پھیلے گا۔ سازشیں ہوں گی، مگر ان کے علوم کا فیضان عام ہوکر رہے گا اور اس میں آپ بھی معاون بنیں گے۔ مسجد اور پیسے کا دیکھنا آپ کی دینی و دنیوی ترقیات کو بتانے کے لیے ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین۔

عالم اسلام کے بلند پایہ محدث

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی ریاست علی قاسمی رام پوری
استاذ حدیث ومفتی جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ

عالم اسلام کے بلند پایہ محدث، محقق دوراں، ممتاز فقیہ اور مفتی، فکر نانوتوی کے امین، علوم شریعت کے نکتہ داں، علوم اکابر کے ترجمان، علوم ولی اللہی کے شارح، ہزارہا ہزار علماء، ارباب افتاء، اصحاب تدریس اور مصنفین و مؤلفین، ادباء کے استاذ اور مربی، نابغۂ روزگار بلکہ یکتائے روزگار شخصیت، لاکھوں عوام وخواص کے قلوب کی دھڑکن، ملت اسلامیہ کے عظیم سرمایہ، جامع علوم وفنون، از ہر الہند ام المدارس دار العلوم دیوبند کے عظیم سپوت اور مسند صدارت تدریس اور عہدہ شیخ الحدیث کے تاجور، بے شمار محاسن وکمالات سے متصف بزرگ عالم دین، استاذ الاساتذہ والعلماء والفقہاء حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہٗ و برد اللہ مضجعہ، آج مؤرخہ ۲۵ ؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح سات بجے کے قریب نماز اشراق کے وقت اپنی حیات سعید کی اسی بہاریں مکمل کر کے اپنے مالک حقیقی سے جاملے اور آپ وہاں تشریف لے گئے یہاں ہر متنفس کو جانا ہے۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، ان اللّٰہ ما اعطی و لہ ما اخذ و کل عندہ باجل مسمی فلتصبر و لتحتسب۔ اللّٰھم اغفر لہٗ، وارحمہ، واکرم نزلہٗ، و وسع مدخلہٗ، واجعل الجنۃ مثواہ، وادخلہٗ بحبوحۃ الجنۃ، واغسلہ

بالماء و الثلج، و نقہ من الذنوب و الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس، اللھم ابدلہ دارا خیرا من دراہ، و اھلا خیرا من اھلہ، اللھم اعذہ من عذاب القبر وعذاب النار، و ادخلہ الجنۃ جنت الفردوس، و ارفع درجتہ فی علیین، و الھم ذویہ الصبر و السلوان و الاجر و الغفران۔

نام ونسب، وطن، خاندان اور ولادت

آپ کا وطن موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا شمالی گجرات ہے، بناس ندی کا نام ہے اور کانٹھا گجراتی زبان میں کنارہ کو کہتے ہیں، بناس کانٹھا ایک علاقہ کا نام ہے جو اس وقت صوبہ گجرات کا ایک ضلع ہے اور بناس ندی کے جنوب میں واقع ہے، اس ضلع کا مرکزی شہر پالن پور ہے جو آزادی سے پہلے ایک مسلم ریاست تھی اور مسلمان نواب اس کا حکمراں اور والی تھا، اسی مرکزی شہر کی جانب نسبت کرتے ہوئے آپ کو پالن پوری کہا اور لکھا جاتا ہے۔آپ کا آبائی وطن کالیڑہ پالن پور شہر سے تیس میل کے فاصلہ جنوب مشرق میں واقع ہے، کالیڑہ پالن پور ضلع کی مشہور بستی ہے، اس بستی میں ''سلم العلوم'' نام سے ایک مدرسہ قائم ہے جس میں متوسطات تک عربی کی تعلیم ہوتی ہے۔آپ مومن برادری سے تعلق رکھتے ہیں جس کو غالباً گجراتی زبان میں چلیہ برادری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں آپ کا خاندان ڈھکا کہلاتا ہے۔

آپ کی ولادت کے بعد آپ کے والدین نے آپ کا نام احمد تجویز فرمایا اور آپ کے خاندان کے بوڑھے لوگ پوری زندگی آپ کو احمد بھائی کہہ کر پکارتے رہے، اگرچہ اب ایسے بوڑھے دو چار ہی ہوں گے مگر آپ نے خود اپنا نام سعید احمد رکھا اور مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں آپ نے سعید احمد نام لکھوایا تھا اور آج عالم اسلام میں اسی سعید احمد نام کو شہرت و دوام حاصل ہے؛ لیکن مظاہر علوم داخلہ سے پہلے سابقہ مدارس میں آپ کا نام احمد ہی مرقوم ہے اور مدارس اسلامیہ سے حاصل شدہ انعامی کتابوں میں انعام یوسف کالیڑہ لکھا ہوا ہے۔آپ کے والد کا یوسف دادا کا نام علی جو احتراماً ''علی جی'' کہلاتے تھے، پردادا کا نام جیوا بمعنیٰ یحییٰ اور پردادا

کے والد کا نام نور محمد ہے خود آپ نے اپنے احوال میں اپنا سلسلۂ نسب اس طرح تحریر فرمایا ہے:

خاکپائے علماء سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا بن نور محمد پالن پوری گجراتی ثم دیوبندی ۔آپ کی تاریخ ولادت محفوظ نہیں ہے مگر آپ کے والد محترم نے اندازے سے آپ کی تاریخ ولادت ۱۹۴۰ء کا آخر مطابق ۱۳۶۰ھ بتلائی ہے اور اسی تاریخ کو مدارس اسلامیہ میں داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں لکھوایا ہے۔

تعلیم وتربیت کا آغاز

جب آپ کی عمر پانچ چھ سال کی ہوئی تو والد محترم محمد یوسف جوڈ بھاڈ کے جنگل میں رہتے تھے،آپ کی تعلیم کا آغاز فرمایا مگر کھیتی کے کاموں میں زیادہ مصروفیت کی وجہ سے والد صاحب آپ کی تعلیم کی جانب زیادہ توجہ نہیں دے سکتے تھے،اس لیے کالیڑہ کے مکتب میں آپ کا داخلہ کرایا اور قرآن کریم ناظرہ اور ریاضی، حساب وغیرہ ابتدائی تعلیم اس مکتب میں مکمل ہوئی۔آپ کے مکتب کے اساتذہ کرام میں مولانا محمد داؤد صاحب چودھری، مولانا حبیب اللہ چودھری اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب جونکیہ قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم چھابی گجرات میں داخلہ

مکتب کی تعلیم مکمل کرکے آپ اپنے ماموں حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب شیرا نوراللہ مرقدہٗ کے ہمراہ دارالعلوم چھابی تشریف لے گئے اور دارالعلوم چھابی میں داخلہ لے کر اپنے ماموں اور دوسرے اساتذہ کرام سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔دارالعلوم چھابی میں آپ کا قیام تقریباً چھ ماہ رہا۔اس کے بعد آپ کے ماموں دارالعلوم چھابی چھوڑ کر اپنے وطن تشریف لے گئے تو آپ بھی اپنے ماموں کے ہمراہ آ گئے اور اپنے ننھیال ''جونی سیندھنی'' میں رہ کر اپنے ماموں سے فارسی کی کتابیں پڑھتے رہے۔

پالن پور میں داخلہ

اس کے بعد مصلح الامت حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحب پالن پوری قدس سرہٗ کے مدرسہ واقع شہر پالن پور میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے چار سال قیام کیا اور مکمل محنت و جفاکشی کے ساتھ ابتدائی عربی و فارسی سے شرح جامی تک جملہ علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ پالن پور کے قابل ذکر اساتذہ کرام میں حضرت مولانا محمد ہاشم بخاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند (موصوف دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہونے سے پہلے گجرات میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے) اور حضرت مولانا مفتی محمد اکبر میاں صاحب پالن پوری برادر خورد مولانا محمد نذیر میاں صاحب پالن پوریؒ قابل ذکر ہیں۔

مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ

پالن پور شہر میں شرح جامی تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۳۷۷ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا خود راقم السطور سے حضرت والا نے ایک موقع پر سہارن پور داخلہ کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا کہ حضرت مولانا محمد ہاشم بخاری صاحبؒ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد پالن پور تدریسی خدمات کے لیے جب تشریف لائے تو دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور اکابرین دارالعلوم دیوبند کے واقعات بہت اہمیت اور دلچسپی کے ساتھ بیان فرماتے تھے، جس کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کی عظمت کے نقوش عوام وخواص کے قلوب پر جاگزیں ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے والد صاحب دارالعلوم دیوبند داخلہ کے ارادہ سے گھر سے سفر کے لیے نکلے۔ جب ریل دہلی سے دیوبند کے لیے چلی تو والد صاحب کو کوئی صاحب ٹرین میں ملے، انہوں نے والد صاحب سے بتایا کہ ابتدائی اور متوسط درجات کی تعلیم دیوبند کے بجائے سہارن پور اچھی ہوتی ہے، آپ اپنے فرزند کو اولاً سہارن پور داخل کرائیں اور انتہائی درجات کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند داخل کرا دینا پھر والد صاحب کا ارادہ بدلا اور دیوبند کے بجائے سہارن پور مدرسہ مظاہر علوم میں داخلہ کرا دیا۔ مظاہر علوم سہارن پور داخلہ کے بعد آپ نے تین سال تک قیام کیا، یہاں آپ نے منطق و فلسفہ، نحو وصرف اور فصاحت و بلاغت اور

فنون کی تمام کتابیں انتہائی محنت اور جانفشانی سے پڑھیں۔ اکثر کتابیں امام النحو والمنطق حضرت مولانا علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری نوراللہ مرقدہٗ سے تعلیمی گھنٹوں میں اور خارج اوقات میں پڑھیں۔ علامہ محمد صدیق احمد کشمیری کے علاوہ مدرسہ مظاہرعلوم سہارن پور کے دیگر قابل ذکر اساتذہ کرام میں حضرت مولانا محمد یامین صاحب سہارن پوریؒ، حضرت مولانا مفتی یحییٰ صاحب سہارن پوریؒ (والد ماجد حضرت مولانا محمد سلمان صاحب مظاہری موجودہ ناظم مدرسہ مظاہرعلوم) حضرت مولانا وقارعلی صاحب بجنوری، حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری شامل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

مدرسہ مظاہرعلوم سہارن پور میں تین سال قیام کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، دارالعلوم دیوبند داخلہ کے بعد پہلے سال حضرت الاساتذہ مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلندشہری نوراللہ مرقدہٗ سابق صدرالمدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند سے آپ نے جلالین شریف، الفوز الکبیر، حضرت مولانا میاں اختر حسین صاحب دیوبندیؒ سے ہدایہ اولین اور حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلندشہریؒ سے تصریح بست باب، شرح چغمینی رسالہ فتحیہ اور رسالہ شمشیہ علم ہیئت کی کتابیں پڑھیں، اور دوسرے سال مشکوۃ شریف، ہدایہ آخرین اور تفسیر بیضاوی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد تیسرے سال شوال ۱۳۸۱ھ تا شعبان ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء دورۂ حدیث شریف میں داخل ہوکر صحاح ستہ پڑھ کر درس نظامی کے نصاب کی تکمیل فرمائی اور باضابطہ فارغ التحصیل قرار پائے۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کرام

دارالعلوم دیوبند میں علوم نبوت کے جن درخشندہ ستاروں سے آپ نے اکتساب فیض کیا ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب ہاپوڑ ثم مرادآبادی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، جامع معقول ومنقول حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ، حضرت مولانا محمد ظہور صاحب عثمانی دیوبندیؒ، حضرت مولانا جلیل احمد صاحب کیرانویؒ، حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب بلندشہریؒ، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلندشہریؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا معراج الحسن صاحب دیوبندیؒ، شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری قدس سرہٗ۔

آپ نے خود اپنی کتاب ’’مشاہیر محدثین وفقہاء کرام‘‘ میں دارالعلوم دیوبند میں خواندہ اسباق کی تفصیل اس طرح فرمائی ہے:

بخاری شریف حضرت فخر المحدثین مولانا سید فخر الدین صاحب مرادآبادی سے، مقدمہ مسلم، مسلم شریف، کتاب الایمان، ترمذی شریف جلد اول، علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ سے، مسلم شریف کا باقی حصہ حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلندشہریؒ سے، ابوداؤد شریف مکمل، ترمذی شریف جلد ثانی، شمائل ترمذی حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ سے، نسائی شریف، مولانا محمد ظہور صاحب عثمانی دیوبندیؒ سے، طحاوی شریف مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ سے، موطا امام مالک حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سے، مؤطا امام محمد حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ سے، مشکوۃ شریف اولاً مولانا سید حسن دیوبندیؒ سے اور ان کی وفات کے بعد جلد اوّل حضرت مولانا سید جلیل احمد کیرانویؒ اور جلد ثانی حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ سے پڑھی۔ دیگر کتابوں کی تفصیل حضرت والا نے اپنے قلم سے نہیں لکھی ہے۔

آپ بچپن ہی سے انتہائی ریزک وہوشیار اور اعلیٰ درجہ کے ذہین وفطین تھے، کتب بینی اور محنت کرنے کے

عادی تھے، پھر مثالی اساتذ کرام کی تعلیم وتربیت اس پر مستزاد جس کی وجہ سے آپ کی صلاحیت واستعداد بام عروج پر پہنچ چکی تھی اور اسی صلاحیت واستعداد اور محنت وجفاکشی کے نتیجہ میں دارالعلوم جیسی معیاری عظیم دینی درس گاہ کے سالانہ امتحان میں دورۂ حدیث شریف میں آپ اعلیٰ نمبرات اور اولا پوزیشن سے کامیاب ہوئے اور علاوہ مسلم شریف کے دورۂ حدیث شریف کی تمام کتابوں میں آپ کے نمبرات پچاس تھے، صرف مسلم شریف میں ۴۵ نمبرات تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے خصوصی انعام میں آپ کو تفسیر بیان القرآن مکمل اور عمومی انعام میں شرح عقائد نسفی ملاحسن اور قرآن کریم مجلد دیا گیا۔

دارالافتاء دارالعلوم میں داخلہ

شوال ۱۳۸۲ھ میں آپ نے دارالافتاء میں داخلہ کی درخواست پیش کی اور یکم ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ کو دارالافتاء میں آپ کا داخلہ مکمل ہوگیا اور اس وقت کے صدر مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری قدس سرہٗ کی نگرانی میں کتب فقہ کا مطالعہ اور فتویٰ نویسی کی مشق کا آغاز فرمادیا اور پورے سال میں صرف ایک کتاب شرح عقود رسم المفتی کا درس حضرت مفتی صاحب مذکور الصدر کے پاس ہوا ورنہ تمام اوقات صرف کتب فقہ وفتاویٰ کا مطالعہ، استخراج مسائل اور فتویٰ نویسی کی مشق وتمرین میں مصروف رہتے تھے۔ اس سال آپ نے شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری استاذ دارالعلوم دیوبند سے حفظ شروع کیا جو قرآن کریم کے جید حافظ اور مصری قاری تھے اور جامعۃ الازہر قاہرہ کی طرف سے دارالعلوم دیوبند تدریس کے لیے مبعوث تھے۔ اس طرح آپ نے اپنے بھائیوں کی تعلیم وتربیت کی جانب توجہ فرمائی اور ۱۳۸۲ھ میں مولانا مفتی محمد امین صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند صغرسنی ہی میں دیوبند لاکر حفظ شروع کرادیا اولاً قاری محمد کامل صاحب دیوبندی کی درس گاہ میں بٹھایا اور جب وہاں نہیں چل سکے تو خود ہی حفظ کرایا۔ یہ سال آپ کا بیحد مصروف تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے جملہ امور مفوضہ کے ساتھ خود اپنا حفظ کرنا اور چھوٹے بھائی مفتی محمد امین صاحب کو حفظ کرانا حد درجہ محنت طلب کام تھا۔

اسی مصروفیات کی وجہ سے ماہ رمضان میں وطن بھی نہیں گئے۔

دارالافتاء کے داخلہ میں مزید ایک سال کی توسیع

شوال ۱۳۸۳ھ، شعبان ۱۳۸۴ھ میں افتاء کمیٹی نے آپ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے دارالافتاء کے داخلہ کی توسیع کردی اور آپ کو مزید ایک سال دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں استفادہ کرنے اور اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو پختہ کرنے کا موقع ملا تو اس سال آپ نے دوسرے بھائی مولوی عبدالمجید کو بھی دارالعلوم دیوبند میں بلایا اور ان کو فارسی کتابیں پڑھانی شروع کر دیں، اس سال آپ کی مصروفیات میں حددرجہ اضافہ ہوگیا خود فتویٰ نویسی کی مشق کرتے تھے، خود اپنا حافظ کرتے تھے اور دونوں بھائیوں کو بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ پڑھاتے تھے اور اس قدر محنت فرمائی کہ چھ ماہ بعد معین مفتی کے لیے آپ کا تقرر کر دیا۔ اس کے بعد دارالافتاء میں مستقل تقرر کی بات بھی چلی اور اس کے لیے ابتدائی کارروائی بھی عمل میں آئی مگر بعض خاص حالات کی وجہ سے وہ کارروائی آگے نہ بڑھ سکی۔ آپ کے مربی و مشفق استاذ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کو اس کا صدمہ بھی ہوا مگر حضرت علامہؒ نے فرمایا صبر کرو ان شاءاللہ جلد ہی دوبارہ دارالعلوم شان وشوکت سے آؤ گے۔

دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں تقرر

شوال ۱۳۸۴ھ میں حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کے توسط سے دارالعلوم اشرفیہ راندیر ضلع سورت گجرات میں آپ کا درجہ علیا کے استاذ کی حیثیت سے تقرر ہوگیا اور آپ ۲۱؍شوال ۱۳۸۴ھ کو دارالعلوم دیوبند سے اولاً وطن تشریف لے گئے اور والدین واہل خاندان کی زیارت سے مشرف ہوئے اس کے بعد مفتی محمد امین صاحب، مولانا عبدالمجید صاحب جو دونوں دارالعلوم دیوبند میں آپ سے پڑھتے تھے اور تیسرے بھائی مولوی حبیب الرحمن صاحب کو لے کر راندیر تشریف لے گئے اور جامعہ اشرفیہ راندیر میں تدریس کا آغاز فرمایا۔

ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ تا شعبان ۱۳۹۳ھ مکمل ۹؍سال تک آپ نے دارالعلوم اشرفیہ راندیر گجرات میں تدریسی

خدمات انجام دیں اور ساتھ ہی تصنیف وتالیف کے کام میں بھی مصروف رہے۔نو سالہ قیام کے دوران آپ نے دارالعلوم اشرفیہ میں ابوداؤدشریف، ترمذی شریف، طحاوی شریف، شمائل ترمذی، مؤطین، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، مشکوۃ شریف، جلالین شریف، الفوز الکبیر، ترجمہ قرآن کریم، ہدایہ آخرین، شرح عقائد نسفی اور حسامی وغیرہ مختلف کتابیں پڑھائیں؛ نیز اسی زمانہ میں آپ نے متعدد کتابیں ''داڑھی اور انبیاء کی سنتیں''، ''حرمت مصاہرت''، ''العون الکبیر عربی شرح الفوز الکبیر'' اور شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ کی کتاب ''المغنی'' کی عربی شرح ''تہذیب المغنی'' تصنیف فرمائیں۔اول الذکر تینوں کتابیں شائع شدہ ہیں البتہ تیسری کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔اسی زمانہ میں حجۃ الاسلام قاسم العلوم والمعارف بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے علوم و معارف اور ان کی کتابوں کی تسہیل وتشریح کا آغاز فرمایا اور افادات نانوتویؒ کے نام سے تفصیلی مضمون ارقام فرمایا جو ماہنامہ ''الفرقان'' میں قسط وار شائع ہوا۔آپ کے دارالعلوم اشرفیہ راندیر گجرات کے ممتاز اور قابل فخر شاگردوں میں گجرات کے مفتیٔ اعظم مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل ورُکنِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں تقرر

اکابر واساتذہ کے مشورہ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب قدس سرہ ،رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی تجویز وتحریک پر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند منعقدہ شعبان ۱۳۹۳ھ میں دارالعلوم دیوبند نے تدریس کے لیے آپ کا تقرر منظور فرمایا اور شعبان ۱۳۹۳ھ ہی میں آپ کو تحریری اطلاع دے دی گئی اور شوال ۱۳۹۳ھ کو آپ دارالعلوم دیوبند مدرس وسطی کی حیثیت سے تشریف لے آئے اور تدریسی کام کا آغاز فرمادیا۔

دارالعلوم دیوبند میں وسیع خدمات

شوال ۱۳۹۳ھ تا شعبان ۱۴۴۱ھ مکمل اڑتالیس سال تک مکمل انہماک، یکسوئی اور ذمہ داری کے ساتھ آپ

نے دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہ کر درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور دوسری علمی خدمات انجام دیں۔ اس اڑتالیس سالہ دور میں آپ نے معقولات میں سلم العلوم، ہدیہ سعیدیہ، ملاحسن، میبذی، عقائد و علم کلام شرح عقائد، مسامرہ، عقیدۃ الطحاوی، اصول فقہ میں حسامی و مسلم الثبوت، عربی ادب میں دیوان متنبی، حماسہ، سبعہ معلقہ، فقہ میں ہدایہ اولین، ہدایہ آخرین (تمام ہی جلدیں) تفسیر و اصول تفسیر میں جلالین شریف، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، تفسیر مدراک (پارہ ۶، ۱۰) تفسیر مظہری (پارہ ۱۶ تا ۲۰)، بیضاوی شریف (پارہ ۲۱ تا ۲۵)، (پارہ ۲۶ تا ۳۰)، مناظرہ میں رشیدیہ، اصول حدیث میں شرح نخبۃ الفکر، مقدمہ ابن صلاح حدیث شریف میں مشکوۃ شریف، صحاح ستہ کی تمام کتابیں بشمول طحاوی شریف، شمائل ترمذی اور مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد پڑھائیں، سب سے زیادہ ترمذی شریف جلد اول طحاوی شریف، بخاری شریف جلد اول پڑھائی۔

صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث کے لیے انتخاب

استاذ الاساتذہ حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلندشہری قدس سرہٗ سابق صدرالمدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ میں آپ کو عارضی طور سے شیخ الحدیث منتخب کر کے بخاری شریف جلد اول کا درس آپ سے متعلق کیا گیا اگرچہ اس سے پہلے بھی حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی علالت و اعذار کی وجہ سے متعدد مرتبہ آپ نے بخاری شریف کا درس دیا ہے پھر اسی سال مجلس شوریٰ میں آپ کو مستقل طور سے عہدۂ شیخ الحدیث و صدرالمدرسین تفویض کیا گیا جس پر تاحیات مسلسل بارہ سال تک متمکن رہے ؎

سبزہ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

دارالعلوم دیوبند میں دیگر ذمہ داریاں

دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی و تدریسی خدمات کے ساتھ دوسری خدمات بھی آپ نے پوری ذمہ داری کے

ساتھ انجام دی ہیں۔ ۱۳۹۵ھ اور اس کے بعد ۱۴۰۲ھ میں مفتیان دار العلوم دیو بند کے اپنے اعذار کی وجہ سے طویل رخصتوں پر تشریف لے جانے کی وجہ سے دار الافتاء کی عارضی نگرانی اور ذمہ داری آپ کو تفویض کی گئی اور آپ نے پوری ذمہ داری کیساتھ استفاءات کے جوابات تحریر فرمائے جو دار الافتاء کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔ اسی طرح ۱۴۰۷ھ میں دار العلوم دیو بند میں تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے عالمی اجلاس منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند دوسرے ممالک سے بھی مندوبین نے شرکت فرمائی، رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے بھی اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے بطور خاص شرکت فرمائی اور وہ اجلاس توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ اس کے بعد قادیانیت کے تعاقب کے لیے باقاعدہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے ایک شعبہ دار العلوم دیو بند میں قائم کیا گیا تو اس شعبہ کا ناظم اعلیٰ آپ کو تجویز کیا گیا، جس پر آپ تاحیات فائز اور متمکن رہے جبکہ اس شعبہ کا صدر دار العلوم دیو بند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو منتخب کیا گیا (اور اب شعبہ کے صدر عالی وقار حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہ مہتمم دار العلوم دیو بند ہیں) اور حضرت الاستاذ مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری استاذ حدیث دار العلوم دیو بند وصدر جمعیۃ علماء ہند کو اس کا ناظم بنایا گیا۔ اس شعبہ سے وابستہ رہ کر آپ نے اندرون ملک اور بیرون ملک متعدد اسفار کیے اور مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت کی دسیسہ کاریوں سے عوام وخواص کو اپنے دلنشین انداز میں واقف کرایا اور آپ کی ذات باجود سے اس شعبہ کے وقار میں اضافہ ہوا اگرچہ ایک مرتبہ ۱۴۱۹ھ میں مذکورہ شعبہ سے علیحدگی کے لیے مجلس شوریٰ میں درخواست بھی دی مگر شوریٰ نے آپ کی درخواست نامنظوری فرمادی۔

تصنیفات وتالیفات

درس وتدریس کے ساتھ ابتداء ہی سے آپ نے تصنیف وتالیف کا محبوب مشغلہ بھی اختیار فرمایا اور اس طویل عرصہ میں انتہائی بیش بہا قیمتی تالیفات آپ کے اشہب قلم سے وجود پذیر ہوئیں جن سے امت مسلمہ اور خاص طور

سے علماء امت دیر تک ان شاء اللہ استفادہ کرتے رہیں گے، اگرچہ ان تصانیف کی مجموعی تعداد چار درجن کے قریب ہے مگر آپ کی بعض تالیفات متعدد مجلّات میں تین چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ اگر ہر جلد کو مستقل تصنیف قرار دیا جائے تو یہ تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہو جائے گی۔ راندیر قیام کے زمانہ میں آپ کے قلم سے العون الکبیر عربی شرح الفوز الکبیر، حرمت مصاہرت داڑھی اور انبیاء کی سنتیں اور تہذیب المغنی عربی شرح المغنی وجود میں آئیں اور دارالعلوم دیوبند کے اڑتالیس سالہ قیام کے زمانہ میں آپ کی چھوٹی بڑی تصنیف کردہ چالیس سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے، جو ضخیم پانچ مجلدات پر مشتمل ہے۔ صفحات کی مجموعی تعداد چار ہزار سے متجاوز ہے۔ اس کتاب کو عالم اسلام میں زبردست پذیرائی ملی، مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہو کر شائع ہوئے، وقت کے اکابر علماء اسلام نے اس کتاب کی تصنیف پر آپ کو خراج عقیدت وخراج تحسین پیش کیا جو یقینا آپ کی زندگی کا تاریخی اور شاہکار کارنامہ ہے۔ نیز آپ کے درس حدیث کے افادات کو آپ کے لائق وہونہار فرزند مولانا حسین احمد صاحب پالن پوری مدظلہ نے مرتب کر کے آپ کی نظر ثانی اور تہذیب کے بعد تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی اور تحفۃ القاری شرح بخاری کے نام سے شائع فرمایا جو یقینا علماء اور طلبہ کے لیے قیمتی سوغات ہیں۔ تحفۃ الالمعی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، صفحات کی مجموعی تعداد چار ہزار کے قریب ہے۔ تحفۃ القاری بارہ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ بھی مجموعی طور سے کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر ہدایت القرآن (آٹھ جلدیں) آسانی بیان القرآن (چار جلدیں) کامل برہان الٰہی (چار جلدیں) عربی حاشیہ حجۃ اللہ البالغہ، زبدۃ الطحاوی، تعریب الفوز الکبیر، فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، شرح علل الترمذی، مبادی الفلسفہ، معین الفلسفہ شرح مبادی الفلسفہ، ہادیہ شرح اردو کافیہ، وافیہ شرح عربی کافیہ، مفتاح التہذیب شرح اردو تہذیب، آسان نحو (دو حصے)، آسان صرف (دو حصے)، محفوظات (تین حصے)، اسلام تفسیر پذیر دنیا میں، مفتاح العوامل شرح شرح مأۃ عامل، گنجینہ صرف شرح

پنج گنج، ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم، دین کی باتیں اور تقلید کی ضرورت، حیات امام طحاوی، حیات امام ابو داؤد، مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے، افادات نانوتوی، افادات رشیدیہ، فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے، آسان فارسی قواعد (دو حصے)، مبادی الاصول، معین الاصول، آسان منطق، تسہیل ادلہ کاملہ، حواشی وعنوانات ایضاح الادلہ، حاشیہ الفتاویٰ جلد اول، کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے، مسلم پرسنل لاء اور نفقہ مطلقہ، مشاہیر محدثین وفقہاء اور تذکرہ راویان حدیث، آپ فتویٰ کیسے دیں شرح اردو شرح عقود رسم المفتی، مبادیات فقہ وغیرہ قیمتی کتابیں آپ کے خامہ مبارک سے صادر ہوکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں جن سے امت برابر استفادہ کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری تالیفات بھی ہیں جو اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔

تصوف وسلوک

آپ سلوک وتصوف اور تزکیۂ نفس کے لیے اولاً زمانہ طالب علمی میں ہی شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے دست حق پرست پر مدرسہ مظاہر علوم کی طالب علمی کے دور ہی میں بیعت ہوگئے اور آپ کے بتلائے ہوئے اوراد ووظائف کو پورا کرنے لگے تھے اسی زمانہ طالب علمی میں رائے پور جاکر حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی مجالس میں بھی شرکت فرماتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد مختلف مشائخ سے رابطہ رہا مگر باقاعدہ کسی سے تعلق قائم نہیں فرمایا۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کے تلقین کردہ اوراد ووظائف کی پابندی کے ساتھ پورے کرتے رہے۔ آخر میں فقیہ الاسلام مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے دست مبارک سے بیعت ہوئے اور انہی کی جانب خرقۂ خلافت آپ کو عنایت کیا گیا۔ حضرت ناظم صاحبؒ نے ۲۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ کو باقاعدہ تحریری طور پر آپ کو خلافت عطا فرمائی اور مجاز بیعت بنایا۔ یہ تحریری اجازت نامہ الخیر الکثیر

شرح الفوز الکبیر کے مقدمہ میں چھپا ہوا ہے۔

حرمین شریفین کی زیارت

آپ متعدد مرتبہ حج وعمرہ کے ارادہ سے زیارت حرمین شریفین زادہا اللہ شرفا وکرامۃ وعزا کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ سب سے پہلی مرتبہ آپ نے ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں اہلیہ محترمہ کے ساتھ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے سفر کیا اور مناسک حج کی تکمیل فرمائی پھر دوسری مرتبہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۶ء میں افریقہ سے واپسی پر دوسرا حج کیا کیونکہ اس سے پہلے آپ فریضۂ حج ادا کر چکے تھے۔ اس لیے آپ نے دوسرا حج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حج بدل کے طور پر کیا۔ اس کے بعد ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں تیسرا حج آپ نے سعودی وزارت حج واوقاف کی جانب سے مہمان کی حیثیت سے کیا۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ میں عمرہ کی سعادت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوئے۔

دعوتی اور تبلیغی اسفار

تعلیمی اور تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ملک وبیرون ملک آپ نے دعوتی وتبلیغی اسفار بھی فرمائے ہیں۔ ان اسفار میں بڑے اور چھوٹے اجتماعات سے آپ خطاب فرماتے تھے۔ مختلف علمی اجتماعات میں بھی آپ نے خطاب فرمائے اور مقالات ومحاضرات پیش فرمائے۔ ہمارے طالب علمی کے دور میں امام بخاریؒ پر ایک سیمینار بخارا میں منعقد ہوا اس سیمینار میں آپ نے عربی زبان میں مقالہ پیش کیا جو بعد الداعی مجلہ میں شائع ہوا۔ بیرون ملک پڑوسی ممالک بنگلہ دیش اور پاکستان کے علاوہ انگلینڈ، افریقہ، امریکہ، کناڈا، ترکی، سعودی عرب، قطر، کویت، بحرین، متحدہ عرب امارات، فیجی وغیرہ کے آپ کے اسفار ہوئے۔ ماہ شعبان کی تعطیلات کے بعد عام طور سے آپ تعطیل کلاں ماہ رمضان وغیرہ برسہابرس سے یورپ کے کسی ملک میں گزارتے تھے اور جدید وقدیم ہر طرح کے لوگ آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ بیرونی ممالک کے آپ کے خطبات علمی خطبات کے نام سے شائع

بھی ہو چکے ہیں۔آپ کے بیرونی ممالک کے خطابات سے عوام وخواص کو بیحد فائدہ ہوا۔ان کی زندگیوں میں انقلاب پیدا ہوااور وہ شرعی زندگی گزارنے والے،تقویٰ وصلاح سے متصف نیک انسان ہو گئے،کوئی صاحب قلم مستقبل قریب میں بیرونی ممالک کے اسفار پر تفصیل سے ان شاءاللہ روشنی ڈالے گا۔

کمالات اور محاسن

آپ بے پناہ کمالات اور خوبیوں کے حامل انسان تھے،تضیع اوقات اور خواہ مخواہ کی مجلس نشینی سے ہمیشہ گریز کرتے تھے،مردم سازی اور رجال سازی میں خود کو مکمل طور سے منہمک رکھتے تھے،آپ کا انداز خطابت نہایت مؤثر اور درس بے انتہاء مقبول اور عام فہم ہوتا تھا،آپ کی تدریس اور تقریر کی طرح تمام تصانیف بھی نہایت آسان،عام فہم اور مقبول خاص وعام ہیں،آپ کی عوام وخواص کے اجتماعات میں تقریریں انتہائی مبسوط،مدلل اور علمی نکات سے پُر ہوتی تھیں اور تحریرات نہایت واضح،مرتب اور جامع ہوتی تھیں،اسی وجہ سے آپ کی بعض تصانیف دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ میں داخل درس اور شامل نصاب ہیں۔مشکل ترین مسائل کو حل کرنا آپ کے لیے نہایت آسان تھا۔ ہر طالب اور سامع کو آپ کے درس اور تقریر وتحریر سے انتہائی درجہ تشفی اور اطمینان قلب ہوتا تھا۔

آپ کے محاسن اور کمالات میں یہ بھی ہے کہ آپ کے مزاج میں استقلال اور اعتدال ہے اور آپ ذوق لطیف اور سادہ نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔سلامتی فکر اور ذہن رساء کے بھی مالک ہیں،زدونویس اور خوش نویس ہیں،حق وباطل اور خطاء وصواب کے درمیان امتیاز کی وافر صلاحیت آپ رکھتے ہیں،حقائق ومعارف کے ادراک میں یکتائے روزگار ہیں۔حالات زمانہ کے نباض اور ان سے جوانمردی سے مقابلہ کرنے کی پوری قوت واستعداد آپ رکھتے ہیں،محنت،مجاہدہ،جفاکشی اور اوقات کی حفاظت آپ کا وصف خاص ہے۔

عادات واخلاق اور خودنوازی

آپ اخلاق جمیلہ اور بہترین عادات وخصائل سے متصف نامور شخصیت تھے، بدعات و رسومات سے حد درجہ تنفر فرماتے تھے اور بلاخوف لومۃ لائم ان پر نکیر فرماتے تھے۔ مرجع الخلائق تھے، اپنے تلامذہ اور خوشہ چینوں سے خندہ پیشانی اور طلاق وجہ کے ساتھ ملتے تھے اور ان کے معمولی علمی کاموں پر بھی حد درجہ اظہار مسرت اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ حقیر راقم السطور نے شوال ۱۴۰۵ھ تا شعبان ۱۴۰۶ھ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف پڑھا ہے۔ حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ سے متعلق ہماری ترمذی شریف جلد اول اور طحاوی شریف دو کتابیں تھیں اور پورے تعلیمی سال کے بیشتر ایام میں عبارت خوانی اور حدیث شریف کی تلاوت کی سعادت اس حقیر کو میسر رہ اور بندہ حضرت والا کی تقریر بھی نوٹ کرتا تھا، حضرت والا اپنے معمولی طالب علم کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ جب کاپی پر قلم رک جاتا تھا اس کے بعد عبارت آگے پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔ دورۂ حدیث شریف سے پہلے بیضاوی شریف سورۂ بقرہ پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ حضرت والا کا درس سننے کے بعد پوری تقریر مع حل عبارت ذہن میں فٹ ہوجاتی تھی۔

حضرت والا کے درس کی بہت سی باتیں عرصہ دراز گزرنے کے بعد آج بھی اسی لب ولہجہ کے ساتھ ذہن میں منقش ومرتسم ہیں یہ بھی عجیب حسن اتفاق ہے کہ حضرت کے درس حدیث کے آخری سال بخاری شریف کی تلاوت وعبارت خوانی کی سعادت زیادہ تر بندہ کے برخوردار عزیزم محمد اخلد سلّمہ کو حاصل رہی بلکہ حضرت کی حیات سعید کے آخری درس بخاری کی عبارت بھی برخوردار نے پڑھی جس میں گریہ وزاری کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی جس کی ویڈیو بے شمار لوگوں نے دیکھی۔ بندہ سے حد درجہ تعلق رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے اندر اور دوسرے شہروں میں عظیم اجتماعات وسمیناروں میں جب ملاقات ہوتی، دور سے ہی پہچان لیتے تھے اور برملا اظہار محبت اور ظہار مسرت فرماتے تھے۔ مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ قیام کے زمانہ میں جب بھی اس علاقہ کا سفر فرماتے تھے، بندہ ملاقات کرتا بہت زیادہ خوشی کا اظہار فرماتے تھے، ایک مرتبہ ہاپوڑ مدرسہ تشریف لائے بندہ ایک اصلاحی پروگرام کے لیے فیض

آباد کے سفر پر تھا، بندہ کو موجود نہ پا کر ذمہ داران مدرسہ سے میرے بارے میں معلوم کیا اور جب تک ذمہ داران سے معلوم نہ کرلیا آپ کو سکون قلبی حاصل نہ ہو جس زمانہ میں آپ رحمۃ اللہ الواسعہ تصنیف فرما رہے تھے اور مرحلہ وار جلدیں مرتب ہو کر شائع ہو رہی تھیں، احقر دو جلدوں کا مطالعہ بالاستیعاب کر چکا تھا۔ تیسری جلد کے حصول کا انتظار تھا، حضرت والا کا ہاپوڑ علاقے کے ایک مدرسہ میں جلسہ کا پروگرام تھا، بندہ نے فون کرکے حضرت والا سے تیسری جلد کے بارے میں معلوم کیا تو فرمایا کہ چھپ چکی ہے۔ اس کے بعد جب ہاپوڑ تشریف لائے تو میرے لیے تیسری جلد ساتھ لے کر آئے اور فرمانے لگے کہ تیرے شوق مطالعہ کے جذبہ نے مجھے کتاب ساتھ لانے پر مجبور کردیا۔

۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۸ء میں احقر نے ایک چھوٹی کتاب قرآن کریم ایک عظیم دولت، مرتب کی تو حضرت والا نے پورے شوق وتوجہ سے پوری کتاب کے مسودہ کا مطالعہ کیا پھر بعض مقامات پر مضمون بدلنے کا حکم دیا پھر دوبارہ حضرت والا کو دکھایا اس کے بعد وقیع الفاظ میں اپنی رائے تحریر فرمائی اور کتابت کی تصحیح میں مکمل وقت دیا، یہ تمام شفقت ورافت سے بھرپور واقعات جب یاد آتے ہیں تو دل بے قابو ہو جاتا ہے اور آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علمی دنیا میں مجھ جیسے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ حضرت کے تشریف لے جانے سے یتیم ہو گئے ہیں، آج ان کا کوئی سہارا اور مرجع نہیں ہے، وہ اپنے علمی مسائل اور اشکالات کو کیسے حل کریں گے اور اپنی علمی گتھیوں کو کہاں سلجھائیں گے، اللہ تعالیٰ حضرت والا کو آخرت کی بھرپور راحت سے سرفراز فرمائے اور علمی دنیا میں آپ کے جانے سے جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی فرمائے۔ آمین۔

اولاد احفاد و پسماندگان

آپ کی اہلیہ محترمہ تقریباً دس سال پہلے وفات پا چکی ہیں، ان کے بطن سے حضرت والا کے کل چودہ بچے

ہوئے، تین لڑکیاں اور گیارہ لڑکے۔ ایک بچی صغر سنی ہی میں دو سال کی عمر میں انتقال کر گئی، بڑے صاحب زادہ مولانا رشید احمد مرحوم اب سے ۲۵؍سال پہلے ایک حادثہ میں شہید ہو گئے، جنھوں نے اپنے پیچھے اہلیہ اور دو بچے چھوڑے تھے۔ اہلیہ کا دوسری جگہ نکاح ہو گیا اور دونوں پوتے حضرت والا کی تربیت میں رہے۔ ماشاء اللہ جوان عالم فاضل اور شادی شدہ ہیں۔ دوسرے صاحب زادہ حافظ سعید مرحوم تقریباً چھ مہینہ پہلے طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، بوقت انتقال حضرت کی صلبی اولاد میں ۹ صاحب زادگان مولانا وحید احمد، مولانا حسین احمد، مولانا حسن احمد، مولانا محمد ابراہیم، حافظ محمد قاسم، مولانا محمد، مولانا احمد، مولانا عبد اللہ، مولانا عبید اللہ اور دو لڑکیاں مسماۃ عائشہ خاتون، مسماۃ فاطمہ خاتون اور ان گنت تعداد میں پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، برادران، بھتیجے، بھتیجیاں موجود ہیں، صلبی اولاد و احفاد کے علاوہ آپ کے پسماندگان میں آپ کے لاکھوں تلامذہ، لامحدود تعداد میں متعلقین و مسترشدین ہیں جو آپ کے فراق کے غم میں نڈھال ہیں، اللہ تعالیٰ سبھی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

علالت، وفات اور تدفین

آپ کافی زمانہ میں مختلف عوارض و بیماریوں میں مبتلا تھے، کئی دفعہ آپ کے کامیاب آپریشن بھی ہوئے اور آپ شفایاب ہو کر اپنے امور مفوضہ میں مصروف و منہمک ہو جاتے تھے۔ سال رواں بھی پوری توجہ و انہماک کے ساتھ درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں مشغول رہے مگر کبھی کبھی بیماری کی وجہ سے آپ کی زبان مبارک رُک جاتی تھی، آخری درس میں بھی یہ کیفیت طاری ہوئی، اختتام درس کے بعد آپ علاج کے لیے عروس البلاد ممبئی تشریف لے گئے، جہاں آپ کا پہلے سے علاج جاری تھا اور ماشاء اللہ شفایاب ہوئے؛ لیکن حد درجہ اشتیاق کے باوجود پورے ملک میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے دیوبند تشریف نہ لا سکے اور ممبئی میں قیام پذیر رہتے ہوئے دینی مجالس اور وعظ و تقریر کا سلسلہ جاری رکھا جو انٹرنیٹ اور موبائل سے جاری ہوتا رہا اور کثیر تعداد میں لوگ عوام و خواص اس سے مستفید ہوتے رہے۔ ثریا ستارہ کے بارے میں علمی تحقیق آپ نے ماہ رمضان ہی میں پیش فرمائی۔ آخری وعظ

آپ کا رمضان المبارک کی پندرہویں شب کو ہوا۔

اس کے بعد اچانک آپ کی طبیعت بگڑی فوراً ہسپتال میں داخل کرایا گیا اور طبیعت تشویش ناک حد تک بگڑتی چلی گئی، بالآخر وقت موحود آ گیا اور ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت اشراق صبح سات بجے کے وقت آپ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد فرما دی اور آپ کی روح سعید قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور آپ نے دنیا میں رہنے پر بقاء رب کو ترجیح دی جو اہل اللہ اور عارفین کی محبوب چاہت ہوتی ہے۔ کاغذی کارروائی کے بعد شام بجے کے قریب آپ کی نماز جنازہ ہوئی اور دو مرتبہ نماز جنازہ ہوئی، ایک مرتبہ مولانا مبین الحق گریڈہی قاسمی فاضل دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور دوسری مرتبہ آپ کے صاحب زادہ مولانا احمد نے نماز پڑھائی۔ اس کے بعد جوگیشوری کے معروف قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ پورے ملک میں لاک ڈاؤن کے نفاذ کی وجہ سے محدود لوگ ہی تدفین اور نمازِ جنازہ میں شرکت کر سکے ورنہ عام حالات میں یہ تعداد لاکھوں میں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کاملہ نصیب فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

خدا بخشے بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

❁...❁...❁

ایک نابغۂ روزگار شخصیت

ڈاکٹر محمد کلیم علیگ صاحب
پرنسپل مدرسۂ بشارت القرآن، ہردوئی

دارالعلوم دیوبند ہندوستان کا ایک عظیم ادارہ ہے جس نے جیدالاستعداد اساتذہ اور مختلف علوم وفنون کی ماہر شخصیات پیدا کی ہیں، فضلائے دارالعلوم دیوبند علوم وفنون، درس وتدریس، اصلاحی وسماجی میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے ہیں، ان فضلاء میں بڑے خوش قسمت وہ فارغین ہیں جنہیں دارالعلوم سے استفادہ کے بعد وہیں درس وتدریس کا فریضہ بھی انجام دینے کی سعادت ملی اور ان میں کچھ ایسے باصلاحیت اور صاحب استعداد اساتذہ ہوئے جو درس وتدریس کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے اور انہیں دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث و صدرالمدرسین منتخب کیا گیا یہ اعلیٰ مناصب ان کی قابلیت وصلاحیت اور علمی استعداد کا بہترین ثبوت ہیں۔ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ بھی انہیں چنندہ اور منتخب شیوخ حدیث اور صدور مدرسین میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اس اعلیٰ منصب پر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، علامہ انورشاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا فخرالدین مرادآبادیؒ، مولانا نصیر احمد خاںؒ فائز رہ چکے تھے۔ مولانا شیخ نصیر احمد خاں کے انتقال کے بعد ذمہ دارانِ دارالعلوم نے اس اعلیٰ اور اہم منصب کیلئے مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا انتخاب کیا آپ کی شخصیت عصر حاضر کی اہم شخصیت تھی، مختلف علوم وفنون میں آپ کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی آپ کی خدمات مُسلَّم ہیں۔

آپ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث صدرالمدرسین اور اہم علمی ودینی شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی

ولادت ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) میں ہوئی، کالیڑہ پالن پور کی ایک مشہور بستی ہے، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی محمد یوسف، دادا کا نام محمد علی ہے جو احتراماً علی جی کہلاتے تھے، آپ کا خاندان ڈُھکّا اور برادری مومن ہے۔ والد محترم نے آپ کی بسم اللہ کرائی، اس کے بعد ناظرہ اور دینیات وغیرہ کی تعلیم آپ نے وطن کے مکتب میں حاصل کی۔ پھر آپ دارالعلوم ''چھاپی'' تشریف لے گئے اور وہاں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اور اس میں چھ مہینہ تک پڑھنے کے بعد آپ پھر مولانا نذیر احمد پالن پوری کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور وہاں عربی درجہ کی شرح جامی تک تعلیم حاصل کی۔ وہاں محمد اکبر میاں پالن پوری اور مولانا ہاشم بخاری آپ کے خاص استاذ تھے۔ ۱۳۷۷ھ میں آپ نے سہارن پور، مظاہر علوم میں داخلہ لے کر تین سال امام نحو والمنطق مولانا صدیق احمد جموی قدس سرہ سے نحو اور منطق وفلسفہ کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ پھر ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حدیث وتفسیر اور فقہ کے علاوہ دیگر کئی فنون کی کتابیں آپ نے یہیں پڑھیں۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے۔ پھر اگلے تعلیمی سال میں شعبۂ افتاء میں آپ کا داخلہ ہوا اور آپ نے فتاویٰ نویسی کی تربیت حاصل کی۔

مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے دارالعلوم دیوبند میں جن مشاہیر سے علمی استفادہ کیا، اس کی تفصیل خود یوں بیان فرماتے ہیں:

خاکپائے علماء:

سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا (یعنی یحییٰ) بن نور محمد پالنپوری، گجراتی ثم دیوبندی، تاریخ ولادت محفوظ نہیں، والد ماجد رحمہ اللہ نے، اندازہ سے ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء بتائی ہے، درالعلوم دیوبند میں داخلہ ۱۳۸۰ھ میں لیا، اور ۱۳۸۲ھ میں فاتحۂ فراغ پڑھا، بخاری شریف حضرت فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ سے، مقدمۂ مسلم شریف ومسلم شریف کتاب الایمان وترمذی شریف جلد اول حضرت علامہ بلیاویؒ

سے، باقی مسلم شریف، حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحبؒ بلند شہری سے، ترمذی جلد ثانی مع کتاب العلل وشمائل اور ابوداؤد شریف، حضرت علامہ فخر الحسن مراد آبادیؒ سے، نسائی شریف حضرت مولانا محمد ظہور صاحبؒ دیوبندی سے، طحاوی شریف حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہؒ جہاں پوری سے، مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا سید حسن صاحبؒ دیوبندی سے، ان کے انتقال کے بعد جلد اول حضرت مولانا عبد الجلیل صاحبؒ دیوبندی سے، اور جلد دوم حضرت مولانا اسلام الحق صاحبؒ اعظمی سے پڑھی، اس سال مؤطا مالک حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اور مؤطا محمد حضرت مولانا عبد الاحد صاحبؒ دیوبندی کے پاس تھی‘‘۔ا؎

ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ سے شعبان المعظم ۱۳۹۳ھ تک دار العلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں آپ نے ابوداؤد، ترمذی، طحاوی، شمائل، مؤطین، ابن ماجہ، مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف مع الفوز الکبیر، ترجمہ قرآن کریم، ہدایہ آخرین، شرح عقائد نسفی اور حسامی وغیرہ پڑھائیں، اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ پھر دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے معزز رکن مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی تجویز پر شوال ۱۳۹۳ھ میں دار العلوم دیوبند کے مسند تدریس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ آپ نے دار العلوم دیوبند میں ۱۳۹۳ھ سے ۱۴۲۹ھ تک مسلم الثبوت، ہدایہ اول، ثالث، سلم العلوم، ہدیہ سعدیہ، جلالین شریف نصف اول مع الفوز الکبیر، ملاحسن، شرح عقائد جلالی، جلالین شریف نصف ثانی، مسامرہ، دیوان متنبی، میبذی، تفسیر بیضاوی، مشکوٰۃ شریف جلد ثانی، نخبۃ الفکر، حسامی سبعہ معلقہ، ہدایہ رابع ثانی، مؤطا امام مالک، دیوانِ حماسہ، تفسیر مظہری، سراجی، نسائی شریف، تفسیر مدارک، مؤطا امام محمد، ترمذی شریف جلد اول، ابوداؤد شریف، بخاری شریف جلد ثانی، طحاوی شریف وغیرہ اس کے بعد سے آپ ترمذی شریف جلد اول اور طحاوی شریف کے اسباق سالہا سال تک پڑھاتے رہے، پھر دار العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء سے بخاری شریف جلد اول کا درس بھی آپ سے متعلق کردیا گیا، اس وقت آپ دار العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے۔ آپ

کی درس حدیث کی خصوصیات ومقبولیت کے بارے میں فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات کے مصنف لکھتے ہیں:

’’دارالعلوم میں مختلف فنون کی کتابیں پڑھانے کے ساتھ سالہا سال سے ترمذی شریف جلد اول اورطحاوی شریف کے اسباق آپ سے متعلق ہیں، آپ کے اسباق بے حد مقبول، مرتب اور معلومات سے بھرپور ہوتے ہیں ،طلباء کو عموماً آپ کی تقریر نوٹ کر لینے میں کسی طرح کی دشواری پیش نہیں آتی، دارالعلوم کے شیخ الحدیث اورصدر المدرسین حضرت مولانا نصیراحمد خاں صاحبؒ کی علالت کے بعد (۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء) سے بخاری شریف جلد اول کا درس بھی آپ سے متعلق کر دیا گیا، اس وقت آپ دارالعلوم کے شیخ الحدیث اورصدر المدرسین ہیں، اوقات کی پابندی اور کاموں میں انہماک آپ کے اہم قابل تقلید اوصاف ہیں‘‘۔ ۲؎

آپ درس وتدریس کی خدمات کے علاوہ دارالافتاء میں بھی نگرانی اورفتاویٰ نویسی کا کام انجام دیتے تھے،آپ تدریسی مصروفیات کے باوجود ملک وبیرونِ ملک کے دورے کرتے رہتے تھے،اور جو حضرات دینی باتیں سننے کے مشتاق ہوتے، ان کو اپنی نوا سنجیوں سے نوازتے رہتے تھے،آپ دارالعلوم دیوبند کی تدریس کو بحسن خوبی انجام دیتے ہوئے اور تصنیفی کام جاری رکھتے ہوئے، درمیان سال میں وقتاً فوقتاً ملک وبیرون ملک کے مختصر دورے کرتے رہتے تھے اوررمضان المبارک کی طویل تعطیل میں کبھی برطانیہ،کبھی کناڈا،کبھی افریقہ اورامریکہ تشریف لے جاتے تھے ایک دن میں کئی کئی تقریریں کرتے ہیں،سعادت مند سامعین کو اللہ اوراس کے رسولؐ کی اطاعت،خوف خدا وفکر آخرت اوراعمال صالحہ پر ابھارتے رہتے تھے،حرام اورمنکر باتوں سے نہایت مؤثر انداز میں باز رہنے کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔

آپ نے حضرت اشرف علی تھانویؒ کے مجموعۂ فتاویٰ ’’الفتاویٰ‘‘ پر گرانقدر حاشیہ بھی لکھا ہے،آپ نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں،آپ کی بہت سی کتابیں دارالعلوم سمیت مختلف دینی مدارس میں شامل نصاب ہیں، چنانچہ موصوف کی جو تصانیف شائع ہو کر مشرق ومغرب میں پھیل چکی

ہیں وہ یہ ہیں:

ہدایت القرآن، ۵؍جلدیں-تحفت الالمعی شرح ترمذی، ۸؍جلدیں-تحفۃ القاری شرح بخاری، ۱۰؍جلدیں -رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ، ۵؍جلدیں- حجۃ البالغہ عربی حاشیہ، ۲؍جلدیں-حیات امام طحاویؒ-حیات امام ابوداؤد-

محفوظات، ۳؍جلدیں-شرح علل الترمذی -الفوز الکبیر-فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم-العون الکبیر شرح الفوز الکبیر-تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر-ادلۂ کاملہ-سنت کی عظمت اور بدعت کی قباحت وغیرہ مفتی صاحب کی تصنیفی خصوصیات کے بارے میں محمد حماد کریمی ندوی لکھتے ہیں:

’’جس طرح موصوف کا انداز خطابت نہایت مؤثر، درس نہایت مقبول اور عام فہم ہوتا ہے، اسی طرح آپ کی تمام تصانیف نہایت آسان، عام فہم اور مقبول عام وخاص ہیں، آپ کی تقریریں نہایت مبسوط اور علمی نکات سے پر، اور تحریریں نہایت مرتب، واضح اور جامع ہوتی ہیں، اسی لئے آپ کی کئی تصانیف دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب درس میں داخل ہیں۔ آپ کے تمام شاگرد جانتے ہیں کہ آپ کا درس کتنا مقبول ہے؟ اور جن حضرات کو آپ کی تصانیف دیکھنے، اور تقاریر سننے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ آپ کی تصانیف اور تقاریر کتنی پر مغز، مرتب اور جامع ہوتی ہیں؟ اور آپ کے خدام جانتے ہیں کہ حضرت اقدس اپنی اور اپنے متعلقین کی کتابوں کی تصحیح وطباعت کا کتنا اہتمام فرماتے ہیں‘‘۔ ۳؎ رواں سال بخاری شریف کا آخری درس طلبائے دارالعلوم دیوبند کے لئے بڑا کربناک اور حیرت انگیز تھا، شیخ الحدیث مفتی سعید احمد کے سامنے بخاری شریف کی آخری احادیث کی قرأت ہوئی، شیخ الحدیث نے احادیث کے سلسلہ میں کلام کرنے کی کوشش کی تو زبان ہی ساکت ہوگئی، دو چار بار وردخداوندی زبان سے نکلا اسکے علاوہ زبان سے کوئی بات نہ نکل سکی اور بخاری شریف کا یہ آخری درس بغیر احادیث کی تشریح قیمتی نصائح اور اختتامی رقت آمیز دعاء کے بغیر ہی مفتی صاحب کے اس جملہ

پر ختم ہوا ’’اب جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا‘‘۔آخری درس کی یہ کیفیت شیخ الحدیث کی کسی سنگین اور جان لیوا بیماری کی طرف اشارہ کررہا تھا چند ہی دنوں کے بعد علاج کی غرض سے بمبئی تشریف لے گئے ابتدائی دنوں میں علاج ومعالجہ سے کچھ افاقہ ہوا مگر اندیشہ بدستور برقرار رہا مخلصین ،محبین، متعلقین اور طلباء دارالعلوم دیوبند و مسلمانان عالم اسلام شیخ الحدیث کی صحتیابی کیلئے دعاء گو ہے مگر طبیعت زیادہ ناساز ہوجانے کی وجہ سے انتہائی نگہداشت والی یونٹ میں داخل کئے گئے ،قدرت کی طرف سے جو زندگی انہیں عطاء کی گئی تھی وہ ۲۵ ؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بمطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء کو پوری ہوگئی اور بوقت صبح شیخ الحدیث مفتی سعید احمد مالک حقیقی کو پیارے ہوگئے۔

مفتی سعید احمد پالن پوری اپنے طویل تدریسی تجربہ کی بنا پر اس بات کا اچھا شعور رکھتے تھے کہ درس وتدریس کی کتابوں میں طلباء کے لئے ضرورت کی کیا چیزیں ہیں۔اپنی تصانیف وتالیفات میں مفتی صاحب نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ جتنا طلباء ہضم کرسکتے ہیں اتنا ہی مواد شروحات میں فراہم کیا جائے ۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق وفلسفہ، صرف ونحو، اصول تفسیر، اصول فقہ، اصول حدیث تمام علوم وفنون کی درسی کتابوں کی شروحات لکھتے ہوئے آپ نے اسی بات کو ملحوظ رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی تمام کتب طلباء واساتذہ کے درمیان متداول اور مقبول ہیں آپ کی تصانیف کی اہمیت وافادیت اور مقبولیت کے بارے میں مولانا عبدالرؤف قاسمی رقمطراز ہیں:

’’تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ دامت برکاتہم سے خوب کام لیا۔آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کی مشہور ومعروف کتاب ’’حجۃ اللہ البالغۃ‘‘ کی شرح ’’رحمۃ اللہ الواسعۃ‘‘ کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی جس نے علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کرلی، یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۳، ۱۴؍صفر ۱۴۲۵ھ نے اس کتاب سے متعلق ایک تحریری تجویز پاس کی جس میں حضرت مفتی صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کو پوری جماعت کی طرف

سے شکریہ وتحسین کا مستحق قرار دیا ہے۔اسی طرح آپ نے ''تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی'' کے نام سے سنن ترمذی کی اردو شرح تحریر فرمائی جو آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے،اور چونکہ اردو زبان میں ترمذی شریف کی یہ پہلی مکمل شرح ہے جس میں پوری کتاب بشمول ''کتاب العلل''و''شمائل ترمذی'' کی تشریح کی گئی ہے،اس لئے اساتذۂ کرام اور طلبۂ عزیز کے درمیان اس کی خوب پذیرائی ہوئی،''تحفۃ الالمعی'' کی تکمیل کے بعد حضرت الاستاذ نے بخاری شریف کی شرح ''تحفۃ القاری'' کے نام سے لکھی ہے''۔[۴]

نصف صدی سے زائد علم وفن کے موتی لٹاتے ہوئے قرآن وحدیث اور علوم عقلیہ ونقلیہ سے لاکھوں طالبانِ علومِ نبوت کو سیراب کرتے ہوئے اَسّی سال کی عمر میں یہ آفتاب غروب ہوگیا اور سرزمین ممبئ آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔دنیا بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں شاگرد محبین ومخلصین آپ کی مغفرت اور درجات کی بلندی کیلئے دعا گو ہیں۔آپ کی خدمات جلیلہ کو اللہ رب العزت قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔آپ کی گرانقدر اہم اور مفید کتابوں کو آپ کے لئے ذریعۂ نجات بنائے اور طالبان علومِ نبوت اور شائقینِ علوم وفنون کو مفتی صاحب کی کتابوں سے استفادے کی توفیق نصیب فرمائے۔

حوالہ جات

۱۔مختصر سوانحی خاکہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری،مصنف مولانا مفتی امین صاحب،ص ۳،بحوالہ مشاہیر محدثین وفقہائے کرام،ص ۲۷۔۲۸

۲۔فضلائے دیوبند کی فقہی خدمات،آفتاب غازی قاسمی،عبدالحسیب قاسمی،کتب خانہ نعیمیہ دیوبند،ص ۳۷۵

۳۔روشن چراغ،محمد حماد کریمی ندوی،مکتبۃ الشباب العلمیہ لکھنؤ،ص ۱۵۲

۴۔حکایت مہر ووفا،مؤلف مفتی عبدالرؤف غزنوی،ناشر مکتبہ غزنوی کراچی،ص ۲۰۳

فقہ وحدیث کا بحر بیکراں

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

مفتی خلیل الرحمن قاسمی برنی

۱۹ رمئی ۲۰۲۰ء مطابق ۲۵ ررمضان المبارک ۱۴۴۱ھ صبح سویرے سوشل میڈیا کے ذریعہ اطلاع ملی کہ فقہ وحدیث کے بحر ناپیدا کنار اور امام المعقول والمنقول استاذ محترم حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کئی دنوں کی علالت کے بعد دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت فرما گئے۔ بے ساختہ زباں پر استرجاع کے کلمات جاری ہو گئے۔ آنسوؤں کا ایک سیل رواں تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بہت دنوں کے بعد ایسی کیفیت ہوئی کہ کافی دیر تک اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

حضرت الاستاذؒ کی وفات پر حسرت کی خبر نے ان تمام دلوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے، جن میں علم وفن کی عظمتیں جاگزیں ہیں آج پوری جماعتِ دیوبند اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہی ہے کیوں کہ حضرت الاستاذ موجودہ دور میں جماعت دیوبند کے سب سے بڑے سرخیل تھے آپ استاذ تھے، استاذ الاساتذہ تھے، بڑے تھے، بڑوں کے بھی بڑے تھے، آپ کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہوتی تھی، آپ بقیۃ السلف اور یادگار صالحین تھے۔

راقم کو جن عظیم المرتبت شخصیات اور بلند پایہ ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کا حسین موقعہ ملا اور ان کے جاوداں نقوش سے قلب ابھی تک متأثر ہے ان میں حضرت الاستاذؒ کی ذات گرامی خاص طور پر شامل ہے۔ آپ کے اس طرح اچانک رحلت فرمانے سے دیوبند سے وابستہ ہر شخص پر غم واندوہ کا کوہ گراں گر پڑا ہے۔ پوری فضا سوگوار

ہے۔درودیوار ماتم کناہیں۔ ہرایک رورہا ہے سب کی آنکھوں میں آنسوں ہیں۔والدمحترم حضرت مولانا قاری شفیق الرحمن صاحب بلندشہری استاذ دارالعلوم دیوبند کا ابھی فون آیا،آواز بھرارہی تھی،روتے ہوئے پوچھا،بیٹا کچھ اطلاع ہے۔میں نے کہا کہ مجھے اطلاع مل چکی ہے۔یہ کہہ کرہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کردیا اور کہا کہ بیٹا! حضرت کیلئے جتنا ہوسکے ایصال ثواب کرو۔حضرت الاستاذ کے ہمارے اوپر بہت احسانات ہیں۔اتنا کہہ کرسلسلہ منقطع کردیا۔کون کس سے کیا کہے۔سب غمزدہ ہیں سب مغموم ہیں،تمام تلامذہ اورتمام وابستگان دیوبند کے لئے یہ حادثہ یکساں ں نوعیت کا ہے۔ہرایک کوتسلی کی ضرورت ہے اور ہرایک کوتعزیت کی ضرورت ہے۔اللہ آپ کے تمام شاگردوں،محبین اوراہل وعیال کوصبرجمیل نصیب فرمائے۔یقیناآپ کی رحلت اس دورقحط الرجال میں امت کے لئے بہت بڑے خسارہ کا سبب ہے۔یہ ایساعظیم سانحہ ہےجس کوفضلائے دارالعلوم اوروابستگانِ دیوبند شایدہی کبھی بھلاسکیں۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے جڑی مادوں اور باتوں کا ایک طویل سلسلہ ہےمگرآج کی تحریر میں حضرت رحمہ اللہ کے مختصرسوانحی نقوش پیش کئے جارہے ہیں:-

ولادت

تقریباً۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی) گجرات میں پیدا ہوئے،آپ کا نام والدین نے صرف"احمد"رکھا تھالیکن جب"مظاہرالعلوم سہارنپور"میں داخلہ لیا تو آپ نے اپنا نام"سعیداحمد" خودلکھوایا تھا،بناس کانٹھاایک ضلع ہےجس کا مرکزی شہر پالنپور رہےموضع کالیڑہ پالنپورکی مشہوربستی ہے جو پالنپور سے جنوب مشرق میں تیس میل کے فاصلے پر ہے۔

تعلیم وتربیت:

پانچ یاچھ سال کے ہوئےتوآپ کے والدمحترم نے گاؤں کے مکتب میں تعلیم کے لئے بٹھادیا،مکتب کی تعلیم

مکمل کرنے کے بعد موصوف اپنے ماموں مولانا عبدالرحمن صاحب کے ساتھ ”چھاپی“ تشریف لے گئے، یہاں چھ ماہ تک اپنے ماموں اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے، چھ ماہ کے بعد ماموں چونکہ تدریس چھوڑ کر گھر واپس آ گئے تھے۔اس لئے آپ بھی ماموں کے ساتھ گھر تشریف لے آئے اور چھ ماہ تک ماموں کے گھر ان سے فارسی کی کتابیں پڑھتے رہے، اس کے بعد چار سال تک پالنپور کے مدرسہ میں حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاری اور مفتی محمد اکبر میاں صاحب سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں۔

۱۳۷۷ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیکر تین سال تک نحو و منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، پھر فقہ، تفسیر، حدیث اور فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ۱۳۸۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔دارلعلوم دیوبند میں آپ کے اساتذہ میں مولانا سید محمد اختر حسین صاحب، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا سید فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ، مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ، مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ، مولانا بشیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ، اور حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ شامل ہیں۔

حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب سے آپ نے دو کتابیں پڑھیں ”الفوز الکبیر، جلالین شریف“ آپ بچپن ہی سے ذہین، فطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے، دارالعلوم دیوبند کی طالبعلمانہ زندگی میں بھی کمال شوق، لگن اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم میں مشغول رہے، اسی لئے دورۂ حدیث میں آپ نے اول نمبر سے کامیابی حاصل کی۔

۱۳۸۳ھ اور ۱۳۸۴ھ میں آپ نے حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحبؒ کی نگرانی میں فتوی نویسی کی مشق کی، جس میں مہارت کے سبب ارباب دارالعلوم دیوبند نے آپ کو ”معین مفتی“ کی حیثیت سے دارالعلوم میں مقرر کر دیا۔

تدریسی زمانہ:

ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ میں بحیثیت مدرس علیا آپ دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) تشریف لائے، موصوف نے یہاں ”ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، طحاوی شریف، شمائل، موطین، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، مشکوٰۃ شریف جلالین شریف مع فوز الکبیر“ اور دیگر کتب پڑھانے کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مبارک مشغلہ بھی جاری رکھا، یہاں رہتے ہوئے آپ نے ”داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت، العون الکبیر“ اور علامہ طاہر پٹنی کی ”المغنی“ کی شرح عربی زبان میں تحریر فرمائی نیز اسی زمانہ میں آپ نے حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کی تسہیل اور تشریح کا گراں قدر کام کا آغاز فرمایا۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریس

۱۳۹۳ء میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں ہوا اور بحمد اللہ اس وقت سے آج تک دارالعلوم دیوبند میں تسلسل کے ساتھ تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

۹۸-۱۳۹۷ میں با قاعدہ حدیث کا درس ارباب دارالعلوم دیوبند نے آپکو تفویض کیا، پہلے سال مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر کا سبق آپ سے متعلق رہا پھر اگلے سال مشکوٰۃ شریف کے ساتھ موطا امام مالکؒ اور نسائی شریف کا سبق متعلق ہوا، پھر ۱۴۰۲ھ سے تقریباً ۱۴۳۰ھ تک ترمذی شریف کا سبق مکمل جاہ وجلال کے ساتھ پڑھاتے رہے پھر اپنے استاذ محترم حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ کے بعد سے بخاری شریف کا سبق بھی اسی شان وشوکت سے پڑھاتے رہے۔

درس کی خصوصیات:

حضرت مفتی صاحب دام اقبالہ کے درس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ رسوخ فی العلم کے ساتھ مرتب مضامین کو سلیقہ مندی اور سلجھی ہوئی زبان میں اس طرح بیان فرماتے تھے کہ طالب علم آپ کا سبق با آسانی سمجھ لیتا ،طلبہ حدیث آپ کے درس میں حاضری کے لئے خصوصی شوق کا مظاہرہ کرتے نظر آتے تھے، دیکھا گیا ہے کہ اکثر

طلبہ آپ کی ہر بات نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوران درس سنت کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر کلام فرماتے تھے اور ائمہ ٔسلف، ائمہ ٔمجتہدین اور محدثین کرام کا ذکر انتہائی ادب وعظمت سے کرتے تھے۔

درس میں فقہاء کے مذاہب اور دلائل کی وضاحت میں جو طریقہ اختیار کرتے، وہ عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ انوکھا اور نرالا ہوتا تھا۔ اسی طرح اقوال مختلفہ کی تنقیح اس انداز پر کرتے تھے کہ ہر امام کا قول حدیث شریف کے قریب نظر آتا تھا اور ہر طالب علم محسوس کرتا کہ اکثر مسائل میں اختلاف کی بنیاد نص فہمی کا اختلاف ہے، دلائل کا اختلاف نہیں۔ ایک بڑی خوبی آپ کے درس کی یہ بھی تھی کہ پورے سال درس اس ٹھہراؤ اور ترتیب سے ہوتا کہ کتاب بحسن وخوبی مکمل ہوجاتی، یہ نہیں ہوتا کہ مشہور مباحث میں وقت صرف کرکے بقیہ کتاب پر ضروری توجہ نہ دی جائے، آپ کے یہاں اختلاف ائمہ کے بجائے مدارک اجتہاد (یعنی اختلاف کی بنیادیں، بیان کرنے پر زیادہ زور تھا۔ آپ کے درس کی یہ خصوصیت ترمذی شریف کے درس کے دوران کھل کر سامنے آتی تھی اور یہ بات تو آپ کا ہر شاگرد جانتا ہے کہ سبق کے دوران آپ صرف مسائل ہی بیان نہیں کرتے بلکہ کتاب بھی پڑھاتے ہیں اور فن بھی سمجھاتے ہیں۔

تصنیفی خدمات:

حضرت والا دامت برکاتہم کی جملہ تصانیف مقبولیت عامہ حاصل کرچکی ہیں۔ آپ کی بیشتر تصانیف کثرت سے شائع ہوکر مشرق ومغرب میں پہونچ چکی ہیں، جن کو ہر جگہ کے علماء نے قدر کی نگاہ سے دیکھا، آپ کی تصانیف میں جو زیادہ مشہور ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:-

”تفسیر ہدایت القرآن، العون الکبیر، (الفوز الکبیر کی عربی شرح) فیض المنعم شرح مقدمۂ مسلم، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، مبادیا لفلسفہ، معین الفلسفہ، اسلام تغیر پذیر دنیا میں، داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، تسہیل ادلۂ کاملہ، رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ (مکمل پانچ جلدوں میں) تہذیب المغنی (المغنی کی عربی شرح) زبدۃ

الطحاوی، تحفۃ الالمعی شرح ترمذی (مکمل آٹھ جلدیں) تحفۃ القاری شرح بخاری" حضرت والا دامت برکاتہم کی مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ بھی اور تصانیف ہیں، آپ کی تمام تصانیف اور تمام تحریروں کا قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں ترتیب، توضیح اور جامعیت خوب ہے، اسی لئے آپ کی کئی تصانیف دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب میں شامل ہیں۔

اوصاف وکمالات:

قدرت نے آپ کو بے شمار خوبیوں اور عمدہ اوصاف وکمالات سے نوازا ہے، اس تعلق سے آپ کے برادر صغیر حضرت مفتی امین صاحب پالنپوری کی تحریر ملاحظہ ہو:

"استاذ محترم کو اللہ جل شانہٗ وعم نوالہٗ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے، آپ کا ذوق: لطیف، طبیعت: سادہ اور نفیس ہے، مزاج میں استقلال اور اعتدال ہے، فطرت میں سلامت روی اور ذہن رسا کے مالک ہیں، زودنویس اور خوشنویس ہیں، حق وباطل اور صواب وخطاء کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت رکھتے ہیں اور حقائق کے ادراک میں یکتائے زمانہ ہیں۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موصوف اپنے کاموں میں نہایت چست اور حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے والے ہیں، میں نے حضرت اقدس جیسا شب وروز محنت کرنے والا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، آپ کے تمام شاگرد جانتے ہیں کہ آپ کا درس کتنا مقبول ہے۔ آپ کی تصانیف اور تقاریر کتنی پرمغز، مرتب اور جامع ہوتی ہیں"

حضرت الاستاذ دامت برکاتہم کی ذات گرامی کا ایک بڑا وصف خوردنوازی بھی تھا اپنے چھوٹوں کی اصلاح وتربیت اور ان کو آگے بڑھانے کے لئے راہ کی تعیین اور ان کے دینی علمی تخلیقی کارناموں پر ان کی تحسین وحوصلہ افزائی بھی آپ کی خصوصی عادات میں شامل تھیں۔

تصوف وسلوک سے آپ کا تعلق:

حضرت والا دامت برکاتہم زمانہء طالبعلمی میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ سے بیعت ہوے۔ اسی کے ساتھ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمہ اللہ کی عرفانی واصلاحی مجالس میں شرکت کرتے رہے، اور آخر میں حضرت مولانا مفتی محمد مظفرحسین صاحب قدس سرہٗ سے تعلق قائم کیا۔ حضرت مفتی مظفرحسین صاحب قدس سرہٗ نے باقاعدہ آپ کو اجازت بیعت وارشاد سے نوازا۔

اہل وعیال کی تربیت:

اہل وعیال کی تربیت آپ نے جس طریقہء کار کو سامنے رکھ کر انجام دی تھی، وہ ایک انوکھی مثال ہے، آپ نے سب سے پہلے اپنی اہلیہ محترمہ (نوراللہ مرقدہا) کو قرآن کریم حفظ کرایا، پھر تمام بچوں کے حفظ کی ذمہ داری اہلیہ محترمہ (نوراللہ مرقدہا) کے سپرد کی۔ ماشاء اللہ انہوں نے تمام صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کو حفظ قرآن مکمل کرادیا نیز صاحبزادوں کی دلہنوں کو بھی حفظ قرآن کی دولت سے بہرہ مند کیا۔

حضرت الاستاذ دامت برکاتہم کو اللہ تعالیٰ نے کثرت اولاد کی نعمت عظمیٰ سے بھی نوازا ہے، چنانچہ گیارہ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہوئیں جن میں بڑے صاحبزادے جناب حافظ مولوی مفتی رشید احمد صاحب ۱۹۹۵ء کے ایک حادثہ میں شہید ہو گئے اور ایک صاحبزادی بچپن میں انتقال کر گئیں۔ ماشاء اللہ دس صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں بقید حیات ہیں، اہلیہ محترمہ چند عرصہ پہلے اللہ کو پیاری ہو گئیں بلاشبہ حضرت کی علمی ترقیوں میں ان کا بھی حصہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے. آج حضرالاستاذ کے اس طرح چلے جانے سے پوری علمی دنیا سوگوار ہے اور ہر ایک اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہا ہے. خدا آپ کی حسنات کو قبول فرمائے اوراور دارالعلوم دیوبند کو آپ کا نعم البدل نصیب فرمائے (آمین)

❁...❁...❁

آتی ہی رہے گی ہردم تیرے انفاس کی خوشبو

حضرت الاستاد مفتی سعید احمد پالن پوریؒ: کچھ یادیں کچھ باتیں

مولانا شعیب عالم قاسمی

۲۵ ؍رمضان المبارک صبح کے وقت موبائل اٹھایا تو سوشل میڈیا پر حضرت الاستاد مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کے سفر آخرت کی خبر دیکھ کر دل کو ایک دھچکہ سا لگا اور قلب وجگر اس خبر کی تصدیق کے لیے تیار نہ ہوئے، پھر علم وکتاب واٹس ایپ گروپ میں بعد سلام مسنون حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری نقشبندی دامت برکاتہم کا یہ صوتی پیغام موصول ہوا ’’تمام حضرات کو یہ اطلاع دینی ہے کہ حضرت مولانا مفتی سعید صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند جوار رحمت حق میں منتقل ہوچکے ہیں۔۔‘‘ انا للہ وانا الیہ راجعون۔اس اندوہناک پیغام کو سنتے ہی ’’اشک غم دیدۂ پرنم سے سنبھالے نہ گئے‘‘۔اور پھوٹ کر رونے لگا، پورے دن یہی کیفیت رہی کبھی آنسوؤں پر ضبط کرتا تو کبھی خطا کرجاتے۔اسی کیفیت کے درمیان دوستوں نے ایصال ثواب کے لیے ختم قرآن کا پروگرام بنایا تو، اس آثم نے بھی اس میں حصہ لیا، لیکن اس وقت خامہ فرسائی پر قادر نہ ہوسکا۔اور لالہ مادھورام جوہر کی اس نصیحت پر عمل کیا کہ:

تھمے آنسو تو پھر تم شوق سے گھر کو چلے جانا

زیارت اور استفادہ

راقم الحروف آپ کی زیارت سے مشرف تو اسی وقت سے ہوتا رہا جب حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد ۲۰۰۷

ءمیں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ فارسی میں داخل ہوا،لیکن آپ سے استفادہ کا موقع پہلی بار ۲۰۰۸ءمیں اس وقت ملا جب شیخ طریقت حضرت مولانا مفتی افتخار الحسن کاندھلوی نوراللہ مرقدہٗ کی زیرصدارت ردقادیانیت کے عنوان پرمظفرنگر میں ایک عظیم الشان کانفرنس کا انعقاد کیا گیا،جس میں ملک کے ممتاز اور جید علماء کرام نے شرکت فرمائی۔ کانفرنس میں حضرت الاستاذؒ بھی مدعو تھے،اس اجلاس میں حضرت نے ایسامدلل اور جامع وعظ فرمایا کہ اس بندہ آثم کوبھی کل کی طرح یاد ہے،جس نے اس وقت زندگی کی صرف ۱۵ بہاریں ہی دیکھی تھی،حضرت اقدس مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اس وعظ میں بدیہی مثالوں کے ذریعہ قادیانیوں کی طرف سے پیدا کیے جارہے شکوک وشبہات کوعوام الناس کے دلوں سے اس طرح رفع کیا کہ بہت سے مشکوک قلوب کوتسکین خاطر نصیب ہوئی،مثلا: حضرت نے فرمایا کہ قادیانی آپ سے پوچھیں گے،نبوت رحمت ہے یازحمت ہے؟ ظاہرسی بات ہے آپ جواب دیں گے کہ رحمت ہے،پھروہ سوال کریں گے کہ رحمت بند ہونی چاہیے یاجاری رہنی چاہیے؟ آپ کہیں گے جاری رہنی چاہیےتو آپ پھنس جائیں گے۔مفتی صاحب نے فرمایا آپ جوابا دریافت کیجئے،بارش رحمت ہے یازحمت؟ وہ کہیں گے رحمت ہے،سب دعا کرتے ہیں یااللہ باران رحمت نازل فرما،اب آپ کہیے اگر مسلسل بارش ہوتی رہےتو رحمت ہوگی یازحمت؟۔

شرف تلمذ

بفضلہٖ تعالیٰ راقم کوتقریبا ۱۲ سال ازہرہند دارالعلوم دیوبند میں جرعہ نوشی کی سعادت نصیب ہوئی،اس دوران افتتاحی،اصلاحی اور انعامی تمام ہی اجلاس میں حضرت الاستاذؒ کے نصائح غالیہ اورمواعظ حسنہ سے مستفید ہوتا رہا،مگرآپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی خوش نصیبی دورۂ حدیث شریف میں ہی میسر آئی،اورآپ سے **اصح الکتب بعد کتاب اللہ ’’الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ و ایامہ‘‘** المعروف ب’’صحیح البخاری‘‘ کے درس کی بختاوری کا موقع ہاتھ آیا۔

ایک جبال العلوم شخصیت

حضرت الاستاذؒ کی ذات میں علوم کا ایک دریا موجزن تھا، عموما انسان کسی ایک میدان میں درجۂ کمال تک پہنچتا ہے، لیکن مبدأ فیاض نے حضرت الاستاذؒ کی شخصیت میں بہت سے فضائل وکمالات مجتمع فرما کر آپ کو متنوع وگوناگوں اوصاف وخصائل سے آراستہ فرمایا تھا، آپ ایک بے مثال مفسر، مستند محدث، عظیم فقیہ، کامیاب مدرس، بے بدل مصنف، بہترین واعظ اور فلسفہ وعلم کلام کے رمز شناس ہونے کے ساتھ دیگر علوم وفنون میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے، دارالعلوم کے مؤقر اساتذہ بھی آپ کی عظمت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ آپ کے علم کے معترف اور مداح تھے، حدیث اور سنت میں فرق کے سلسلے میں اختلاف ہوا تو دوستوں نے استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی یوسف صاحب تاؤلی زید مجدہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کو پرچی دے کر مفتی صاحب کی رائے جاننا چاہی، مفتی صاحب نے فرمایا: ”ایک طرف ” بحر العلوم“ دوسری طرف ” جبال العلوم“ درمیان میں یہ ”حمار العلوم“۔

ولادت وتعلیم

آپ کی ولادت ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) میں ہوئی۔ کالیڑہ پالن پور سے تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق میں واقع علاقہ پالن پور کی مشہور بستی ہے۔ جب آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو والد صاحب نے آپ کی تعلیم کا آغاز فرمایا، لیکن کھیتی باڑی کے کاموں کی وجہ سے آپ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکتے تھے اس لیے آپ کو کالیڑہ کے مکتب میں بٹھا دیا۔ ناظرہ ودینیات کی تعلیم مکمل کر کے آپ اپنے ماموں مولانا عبدالرحمن صاحب کے ہمراہ چھاپی تشریف لے گئے، اور دارالعلوم چھاپی میں اپنے ماموں اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں چھ ماہ تک پڑھیں، اس کے بعد مصلح الامت مولانا نذیر میاں پالن پوری قدس سرہٗ کے مدرسہ پالن پور میں داخلہ لیا اور چار سال تک مولانا مفتی محمد اکبر میاں پالن

پوری اور مولانا محمد ہاشم بخاریؒ سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں، شرح جامی تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے آپ نے ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء میں سہارن پور (یوپی) کا سفر کیا۔ مظاہر علوم میں داخلہ لے کر تین سال امام النحو والمنطق مولانا صدیق احمد جموی قدس سرہٗ سے نحو اور منطق وفلسفہ کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ مولانا محمد یامین صاحبؒ، مولانا مفتی یحیٰ صاحب سہارن پوریؒ، مولانا عبد العزیز صاحب رائے پوریؒ اور مولانا وقار علی صاحب بجنوریؒ سے بھی درس لیا، پھر فقہ وحدیث، تفسیر اور فنون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۳۸۰ھ میں دار العلوم دیوبند کا رخ کیا، دار العلوم دیوبند میں داخل ہو کر پہلے سال مولانا نصیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ سے تفسیر جلالین مع الفوز الکبیر، مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندیؒ سے ہدایہ اولین اور مولانا بشیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ سے تصریح بست باب، چغمینی، رسالہ فتحیہ، رسالہ شمسیہ اور علم ہیئت کی کتابیں پڑھیں، اور دوسرے سال مشکوٰۃ شریف، ہدایہ آخرین، تفسیر بیضاوی پڑھیں۔ اور ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل فرمائی۔ اور سالانہ امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کیے، آپ نے مولانا سید اختر حسین دیوبندیؒ، مولانا بشیر احمد خان بلند شہریؒ، مولانا اسلام الحق اعظمیؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب دیوبندیؒ، مولانا فخر الحسن مراد آبادیؒ، مولانا محمد ظہور صاحب دیوبندیؒ، مولانا فخر الدین احمد صاحب مراد آبادیؒ، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، مفتیٔ اعظم مولانا سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوریؒ، شیخ محمود عبد الوہاب محمود مصریؒ وغیرہ حضرات اکابر سے کسب فیض کیا۔ فراغت کے بعد آپ کا دار الافتاء میں داخلہ ہو گیا، مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوریؒ کی نگرانی میں کتب فتاویٰ کا مطالعہ اور فتویٰ نویسی کی مشق کے ساتھ اسی سال آپ نے حفظ قرآن کی بھی تکمیل فرمائی۔

درس وتدریس اور حدیثی خدمات کا آغاز

تعلیم سے فراغت کے معا بعد ہی حق جل مجدہٗ نے آپ کو خدمات حدیث کے لیے منتخب فرمایا اور ۱۳۸۴ھ میں دار العلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں آپ درجہ علیا کے مدرس مقرر ہوئے اور وہاں ۱۳۹۳ھ تک (تقریبا

۹/سال) آپ نے ابو داؤد، ترمذی، طحاوی، شمائل، مؤطائین، نسائی، ابن ماجہ، مشکوۃ شریف،جلالین مع الفوز الکبیر،ترجمہ قرآن کریم، ہدایہ آخرین،شرح عقائد نسفی اور حسامی وغیرہ اہم کتابوں کا درس دیا،اوراسی زمانے میں الفوز الکبیر کی عربی شرح العون الکبیر،علامہ طاہر پٹنی کی کتاب المغنی کی عربی شرح تہذیب المغنی (غیر مطبوعہ)اورحرمت مصاہرت وغیرہ بھی تصنیف فرمائیں۔

دارالعلوم میں تقرر

مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی تحریک پر شوال ۱۳۹۳ھ نومبر ۱۹۷۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے آپ کا انتخاب عمل میں آیا،اور دارالعلوم میں تفسیر،حدیث،فقہ،منطق وفلسفہ وغیرہ کی متعدد اہم کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔دورۂ حدیث میں دیگر کتابوں کے ساتھ آپ نے ایک طویل عرصہ تک ترمذی شریف کا درس دیا جو طلبہ کے درمیان انتہائی مقبول تھا۔۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء میں حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ کے علالت کی وجہ سے مستعفی ہونے کے بعد آپ کو دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث کے باوقار عہدہ کے لیے منتخب کیا گیا،اور تاوفات آپ دارلعلوم دیوبند کی مسند حدیث کو زینت بخشتے رہے،اس طرح نصف صدی سے زائد آپ نے علوم ومعارف کے جواہر پاروں سے طالبان علوم نبوت اور تشنگان علوم حدیث کی سیرابی کا سامان کیا۔

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

درس کی خصوصیات

آپ کا درس بے حد مقبول،مرتب اور معلومات سے بھرپور ہوتا،افہام وتفہیم کا اللہ نے ایسا خاص ملکہ عطاء فرمایا تھا کہ غبی سے غبی طالب علم بھی اقرب الی الفہم ہوئے بغیر نہ رہتا،بلکہ آپ کے خوان علم سے متمتع ہوتا،اور

آپ کے اسباق کو ذہن ودماغ میں بآسانی راسخ کرلیتا تھا، اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ درس میں سنت کے مطابق ٹھہر ٹھہر کلام فرماتے، زبان میں شستگی، تقریر میں اتنا ٹھہراؤ اور شفافیت ہوتی کہ طلبہ لفظ بلفظ آسانی سے نوٹ کر لیتے، دقیق مضامین دو تین بار بیان فرماتے، کبھی بلفظہ مکرر بیان کرتے ہیں اور کبھی الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مضمون کا اعادہ فرماتے، اس لیے دقیق علمی مضامین بھی قابل فہم بن جاتے۔ وقتاً فوقتاً دوران درس طلبہ، علماء، اور مدارس کی کوتاہیوں نیز معاشرتی برائیوں وغیرہ پر آپ بلا خوف لومہ لائم تنبیہ فرماتے۔ شاگرد اور استاذ کے مابین تعلق کے سلسلے میں حضرت الاستاذ قدس سرہٗ یہ فرماتے تھے کہ استاذ اور طالب علم کے درمیان ساتھیوں اور صاحبوں کا سا تعلق ہونا چاہیے، تبھی کما حقہ استفادہ ممکن ہے، لفظ شاگرد کو بالکل پسند نہیں فرماتے تھے، فرماتے تھے کہ شا مخفف ہے شاہ کا، اور گرد، دھول اور گرد وغبار کو کہتے ہیں۔ مفتی صاحب فرماتے دیکھو، اللہ کے نبی کریم ﷺ استاذ ہیں اور صحابہ آپ کے تلمیذ ہیں، تلمیذ کے لیے صاحب اور صحابہ کا لفظ استعمال کیا گیا، ہمارے یہاں یہ بڑی خرابی پیدا ہوگئی کہ طلبہ استاذ سے سوال نہیں کرتے، جب تک سوال نہیں کریں گے اور استاذ اور طلبہ کے درمیان بے تکلفی نہیں ہوگی مکمل استفادہ نہیں کیا جاسکتا، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اندر آج بھی اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت مفتی صاحب اس کے سخت خلاف تھے کہ طلبہ اساتذہ کی مشایعت اختیار کریں (پیچھے پیچھے چلیں)، طلبہ کو اپنے پیچھے قطعاً نہیں چلنے دیتے تھے، اس سلسلے میں بھی نبی کریم ﷺ اور صحابہ کی مثال دیتے کہ آپ کے صحابہ دائیں بائیں اور آپ ﷺ درمیان میں چلتے تھے، اسی طریقے کو حضرت مفتی صاحبؒ پسند فرماتے تھے۔

تصانیف

درس وتدریس، وعظ وتلقین اور اصلاح وتبلیغ کے ساتھ تصنیفات وتالیفات میں بھی آپ کی خدمات سے آپ کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کی کتابوں میں تحفۃ القاری شرح بخاری، تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی، تفسیر ہدایت القرآن، العون الکبیر الفوز الکبیر کی عربی شرح، فیض المنعم، تحفۃ الدرر، مبادیٔ الفلسفہ، معین الفلسفہ، مفتاح

التہذیب، آسان منطق، آسان صَرف، آسان نحو (دو حصے)، محفوظات، آپ فتوی کیسے دیں؟ کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ حیات امام ابوداؤد، مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویان کتبِ حدیث، حیات امام طحاوی، اسلام تغیر پذیر دنیا میں، نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟ ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت، تسہیل ادلہ کاملہ، حواشی وعناوین ایضاح الادلہ، حواشی امداد الفتاویٰ، شرح معانی الآثار کی عربی تلخیص زُبدۃ الطحاوی وغیرہ، وہ تصنیفات ہیں جو شائع ہو کر مشرق ومغرب میں پھیل چکی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی اردو شرح رحمۃ اللہ الواسعہ آپ کی علمی تحقیقات کا شاہکار اور آپ کے بلند پایہ علمی مقام کا آئینہ دار ہے۔ مسلم شریف کی انتہائی جامع شرح ایضاح المسلم بھی وفات سے قبل ہی منصۂ شہود پر آچکی ہے۔ قاسم العلوم حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف سے آپ کو گہرا لگاؤ اور مناسبت تھی۔ حضرت نانوتوی کی متعدد تصانیف آپ کی تسہیل وتشریح کے ساتھ شائع ہوئیں۔ آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے آپ کو ۲۰۱۱ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا۔

بالآخر ۲۵؍ رمضان المبارک کو علوم حدیث کا یہ بحر بیکراں اور آسمان علم وفضل کا نیر تاباں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، مگر آپ کے کمالات واوصاف، اخلاق وکردار، تصنیفات وتالیفات اور راہنما زریں نقوش ہمارے دلوں میں ان شاء اللہ زندہ وتابندہ رہیں گے۔

آتی ہی رہے گی ہردم تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

❁...❁...❁

اسنادِ حدیث باعتبار قراءت

مولانا محمد معاذ صاحب
جامعہ مدینہ کریم پارک لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر نظر مضمون میں حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نور اللہ مرقدہ کے حالات لکھنا مقصد نہیں وہ تو بہت سے حضرات لکھیں گے اور لکھ رہے ہیں۔ ناچیز اپنے مضمون میں حضرت مفتی صاحب کی اسنادِ حدیث باعتبار قراءت درج کرنا چاہتا ہے۔ اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ اس میں ہر واسطہ قراءت پر مشتمل ہو خواہ سند طویل ہی کیوں نہ ہو جائے۔

سند صحیح البخاری

قال شیخ المحدثین و صدر المدرسین سعید احمد البالنبوری: قرأت صحیح البخاری علی فخر المحدثین فخر الدین احمد الھابوری اخبر نا شیخ الھند محمود حسن الدیوبندی اخبرنا حجۃالاسلام والدین محمد قاسم النانوتوی اخبرنا شیخ المحدثین الشاہ عبد الغنی المجددی اخبرنا الشیخ الشاہ محمد اسحاق الدھلوی ثم المکی اخبرنا جدی الأمہ ناصیۃالعلماء الشاہ عبدالعزیز الدھلوی اخبرنا والدی الشاہ ولی اللہ الدھلوی۔

سند سنن الترمذی (الاول)

قال شیخ المحدثین وصدرالمدرسین سعید احمد البالنبوری: قرأت سنن الترمذی

المجلدالاول علی شیخنا جامع المعقول والمنقول العلامة محمد ابراهیم البلیاوی اخبرنا شیخ الهند محمود حسن الدیوبندی اخبرنا حجةالاسلام والدین محمد قاسم النانوتوی اخبرنا شیخ المحدثین الشاہ عبد الغنی المجددی اخبرنا والدی زکی القدر الشاہ ابو سعید المجددی عن الامام ناصیةالعلماء الشاہ عبدالعزیز الدہلوی اخبرنا والدی الشیخ الشاہ ولی اللہ الدہلوی۔

سند سنن الترمذی (الثانی)

قال شیخ المحدثین و صدرالمدرسین سعید احمد البالنبوری: قرأت سنن الترمذی المجلدالثانی علی الشیخ فخرالحسن المراد آبادی، اخبرنا شیخ الاسلام و المسلمین سید حسین احمد المدنی، اخبرنا شیخ الهند محمود حسن الدیوبندی، اخبرنا حجةالاسلام محمد قاسم النانوتوی، اخبرنا الشیخ الشاہ عبد الغنی المجددی ثم المهاجر المدنی، اخبرنا زکی القدر الشاہ ابو سعید المجددی عن الشیخ ناصیةالعلماء عبدالعزیز الدہلوی، اخبرنا والدی الشیخ ولی اللہ الدہلوی۔

سند شمائل الترمذی

قال شیخ المحدثین و صدرالمدرسین سعید احمد البالنبوری: قرأت الشمائل المحمدیة للترمذی علی الشیخ فخرالحسن المراد آبادی اخبرنا شیخ الادب اعزازعلی الامروهوی اخبرنا شیخ الهند محمود حسن الدیوبندی اخبرنا حجةالاسلام محمد قاسم النانوتوی اخبر نا الشیخ الشاہ عبد الغنی المجددی اخبرنا والدی زکی القدر ابو سعید المجددی عن الشیخ مولانا الشاہ عبدالعزیز الدہلوی اخبرنا الشیخ الشاہ ولی اللہ۔

سند سنن أبی دأو د

قال شیخ المحدثین سعید احمد البالنبوری: قرأت سنن ابی داود علی الشیخ مولانا فخر الحسن المراد آبادی اخبرنا الشیخ السید میاں اصغر حسین الدیوبندی اخبرنا شیخ الهند مولانا محمود حسن الدیوبندی اخبرنا حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم النانوتوی اخبرنا شیخ المحدثین احمد علی السهارنفوری، اخبرنا الشاہ محمد اسحاق الدهلوی اخبرنا جدی ناصیۃ العلماء الشاہ عبد العزیز الدهلوی اخبرنا والدی الشیخ الشاہ ولی اللہ الدهلوی.

سند الصحیح للامام مسلم (مقدمہ و کتاب الایمان)

قال شیخ المحدثین سعید احمد البالنبوریؒ: قرأت مقدمۃ الصحیح للامام المسلم و کتاب الایمان له علی شیخنا العلامہ ابراهیم البلیاوی اخبرنا الشیخ حکیم محمد حسن العثمانی الدیوبندی اخبرنا فقیه النفس رشید احمد الکنکوهی، اخبرنا الشیخ الشاہ عبد الغنی المجددی اخبرنا والدی زکی القدر ابو سعید المجددی اخبرنا الشیخ رفیع الدین الدهلوی اخبرنا الشیخ ناصیۃ العلماء الشاہ عبد العزیز الدهلوی اخبرنا الشیخ ولی اللہ الدهلوی.

سند الصحیح للامام مسلم

قال شیخ المحدثین سعید احمد البالنبوری: قرأت الصحیح للامام المسلم علی الشیخ شبیر احمد خان البلندشهری اخبرنا الشیخ محیی الدین البلندشهری اخبرنا الشیخ السید احمد حسن الامروهوی اخبرنا شیخ المحدثین احمد علی السهارنفوری اخبرنا الشیخ الشاہ محمد اسحاق الدهلوی اخبرنا جدی الشیخ الشاہ عبد العزیز الدهلوی اخبرنا الشیخ الشاہ ولی اللہ الدهلوی.

سند سنن المجتبی للامام النسائی

قال شیخ المحدثین سعید احمد البالنبوری :قرأت سنن النسائی علی الشیخ العلامة ظهور احمد الدیوبندی اخبرنا الشیخ العلامه شبیر احمد العثمانی اخبرنا الشیخ المفتی عزیز الرحمن العثمانی الدیوبندی اخبرنا فقیه النفس رشید احمد الکنکوهی اخبرنا الشیخ الشاه عبد الغنی المجددی اخبرنا والدی زکی القدر ابو سعید المجددی عن الشیخ مولانا الشاه عبد العزیز الدهلوی اخبرنا الشیخ مولانا الشاه ولی اللہ الدهلوی.

سند شرح معانی الآثار طحاوی

قال الشیخ سعید احمد البالنبوری: قرأت شرح معانی الآثار للامام الطحاوی علی الشیخ المفتی السید مهدی حسن الشاه جهان فوری عن شیخ الهند محمود حسن الدیوبندی اجازةً عن حجة الاسلام مولانا محمد قاسم النانوتوی اجازةً عن الشیخ الشاه عبد الغنی المجددی اجازةً عن الشیخ الشاه محمد اسحاق الدهلوی اجازةً عن الشیخ عبد العزیز الدهلوی اجازةً عن الامام الحجة الشاه ولی اللہ الدهلوی اجازةً.

❁ ... ❁ ... ❁

باب سوم:

امتیازات و خصوصیات

اے علم! ترا قافلہ سالار کہاں ہے؟

حضرت مولانا محمد سلمان بجنوری صاحب
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

۲۵/رمضان ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/مئی ۲۰۲۰ء منگل کا دن، پوری ملت اسلامیہ اور بالخصوص اُس کے مرکزِ ثقل دارالعلوم دیوبند کے لیے رنج والم کا پیغام لایا کہ اُس کے شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین اور علوم وفنون کی جامعیت میں نمونۂ سلف حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری چند روزہ علالت کے بعد مسافرانِ آخرت میں شامل ہوگئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔ إن العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول إلا ما یرضیٰ ربنا وإنا بفراقک یا شیخنا لمحزونون۔

یہ جانکاہ خبر چند منٹوں میں دنیا کے طول وعرض میں پھیل گئی اور تمام دینی طبقوں کو سوگوار کرگئی۔ سب لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرنے لگے، اُن کے تلامذہ کو یتیمی کا احساس ستانے لگا، بڑے بڑے علماء خراج عقیدت پیش کرنے لگے اور تمام اہلِ نظر ایک عجیب خلا محسوس کرکے فکرمند نظر آنے لگے اور سبھی کی زبانِ حال سے گویا یہ مضمون ادا ہونے لگا۔ ؎

عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے، افق پہ مہرِ مبیں نہیں ہے
تری جدائی پہ مرنے والے! وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے؟

حضرۃ الاستاذؒ کی وفات پر تحریری وزبانی تاثرات اور اظہار رنج وغم کا ایک غیر معمولی سلسلہ جاری ہے،

مضامین پر مضامین چلے آرہے ہیں، رسائل کے خصوصی نمبر نکل رہے ہیں، خود ہمارے پاس اشاعت کے لیے اچھے اور معیاری مضامین اتنی تعداد میں آچکے ہیں کہ ان کو رسالہ کے چار شماروں کی ضخامت میں بھی سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ ایسی صورت حال میں اس مدیر عاجز کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ نہایت اختصار کے ساتھ اپنے جذبات وتاثرات پیش کرکے دیگر اہل قلم کی تحریرات سے استفادے کی راہ ہموار کرے۔

حضرۃ الاستاذ قدس سرہٗ کے امتیازات وخصوصیات پر لکھنے والوں نے اپنے اپنے بہترین انداز میں روشنی ڈالی ہے، جس کے نمونے آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئیں گے، اس کوتاہ بیں نے اس عظیم شخصیت کی انفرادیت کو جس انداز میں محسوس کیا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

(۱) مثالی مدرس:

حضرت کی شخصیت مبارکہ کی شاہ کلید، احقر کی نظر میں تدریس ہے، وہ فطری اور بنیادی طور پر مدرس تھے، معلم تھے اور اگر آپ غور سے دیکھیں تو صاف محسوس ہوگا کہ اُن کا ملکۂ تدریس صرف درسگاہ تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ وہ اپنی تصنیفات اور تقریر وتحریر میں بھی ایک سنجیدہ اور مشفق وماہر استاذ ہی نظر آتے ہیں، جو اپنے فن پر پوری طرح حاوی ہوکر اپنے قاری اور سامع کو بھی اُسی طرح مضمون سمجھاتے ہیں جس طرح وہ درسگاہ میں گہر افشانی فرماتے ہیں۔

تدریس کے لیے حضرت کی سنجیدگی اور محنت مثالی تھی، وہ فریضۂ تدریس کی انجام دہی اس طرح فرماتے تھے جیسے اس کو مقصد زندگی سمجھتے ہوں۔ اسی کی یہ برکت تھی کہ اللہ رب العزت نے اُن کے سبق کو بے نظیر مقبولیت سے نوازا جس کی شہرت ملکوں ملکوں پہنچی۔

یہ سطور لکھتے ہوئے اچانک یاد آیا کہ ہم نے تعلیمی سال ۱۴۰۷ھ-۱۴۰۸ھ میں حضرت سے ترمذی شریف اور طحاوی شریف پڑھی اس کے اگلے سال (۱۴۰۸ھ-۱۴۰۹ھ) میں ہم لوگ تکمیل ادب سے فارغ ہوئے تو

النادی الادبی کے دفتر میں ایک الوداعی تقریب منعقد کی گئی، اس میں ہمارے ایک ساتھی (مولانا ظفر احمد اعظمی) نے ایک الوداعی نظم پیش کی جس کا پہلا مصرع اس طرح تھا۔ ع

یہ ہنستے کھیلتے منظر تو ہوں گے، ہم نہیں ہوں گے

اس نظم میں انھوں نے حضرات اساتذۂ کرام کے بارے میں بھی اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا، اس میں حضرۃ الاستاذ سے متعلق شعر اس طرح تھا۔ ؎

وہ کس پر درسگاہِ جامعہ مغرور ہے یارو!
سنو! وہ افتخارِ ارضِ پالن پور ہے یارو!

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اب سے تیس پینتیس برس پہلے بھی ان کا درس طلبہ کے درمیان مقبولیت کی کس معراج پر تھا، اور اب تو بلا شبہ اُن کے درس کی مقبولیت ملکوں کی سرحدوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئی تھی اور عالم یہ ہوگیا تھا کہ (میرؔ کے شعر میں ترمیم کرکے) کہا جاسکتا ہے۔ ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے   سب اُسی کے درس کے اسیر ہوئے

(۲) جہد مسلسل:

حضرۃ الاستاذ قدس سرہ کی دوسری صفت جس کو اس کوتاہ ہمت نے سب سے زیادہ محسوس کیا وہ اُن کی انتھک محنت اور مسلسل کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ ان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ چوبیس گھنٹے میں کوئی وقت کسی بامقصد کام کے بغیر گزارنے کے قائل ہی نہیں تھے۔ ان کی تدریس کی طرح تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی سارے سال جاری رہتا تھا، یہاں تک کہ سفر میں مسودات کی تصحیح اور پروف ریڈنگ وغیرہ کا کام کرتے رہتے تھے۔ پھر تدریس صرف دارالعلوم کے اسباق تک محدود نہیں تھی؛ بلکہ گھر پر، پہلے بیٹوں اور پھر پوتوں کو پڑھانے کا معمول ہر دور میں جاری رہا۔ اسی کے ساتھ ان کا تجارتی مکتبہ (مکتبہ حجاز) جب تک صاحبزادوں نے نہیں سنبھالا،

اس کے بھی سارے کام خود ہی کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ باری تعالیٰ نے اُن کو قوت عمل اور توفیقِ عمل عطا فرمانے میں خصوصی رحمت سے کام لیا ہے۔

(۳) جامعیت:

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا سب سے اہم امتیاز اُن کی جامعیت ہے۔ یہ جامعیت، مختلف پہلوؤں سے سمجھی جاسکتی ہے۔ سب سے پہلے تو جامعیتِ علوم وفنون ہے کہ وہ بیک وقت ایک ممتاز محدث، مفسر اور فقیہ تو تھے ہی۔ اس کے علاوہ منطق وفلسفہ اور نحو وصرف جیسے علوم آلیہ میں بھی گہری نظر اور مہارت کے حامل تھے۔ پھر یہ جامعیت، تدریس اور تالیف میں بھی نمایاں ہے، وہ ان تمام علوم وفنون کی کتابیں بے تکان پڑھاتے تھے اور تقریباً ان تمام ہی علوم میں ان کی تالیفات ہیں جن میں سے بہت سی کتابیں مدارس کے نصاب میں داخل درس ہیں۔ زبانوں کو دیکھا جائے تو وہ عربی، اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان تمام صلاحیتوں کے ساتھ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے علوم سے گہری واقفیت اور اُن کی تدریس وتشریح نے ان کی شخصیت کی علمی گیرائی وگہرائی کو عمومی اعتراف اور قبول عام عطا کردیا تھا۔

جامعیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ شریعت وطریقت دونوں کے شناور تھے، اسی طرح وہ اعلیٰ درجہ کے مدرس، مقبول مقرر اور عالی مقام مصنف تھے۔ اور ان تینوں میدانوں بالخصوص تدریس وتصنیف میں اُن کا مقام بلند، اُن کے نام کو زندۂ جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔

(۴) خوداعتمادی اور صبر وہمت:

حضرت الاستاذ کی ایک نمایاں صفت جو ہمیشہ احقر نے محسوس کی وہ ان کی خوداعتمادی اور ہمت وحوصلہ تھا، خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھی اپنی بات پیش کرنے میں جھجکتے نہیں تھے، ہم نے اُن کو ایسی مجالس میں بھی گفتگو کرتے دیکھا جہاں اُن کے اساتذہ واکابر موجود ہوتے؛ لیکن ان کی خوداعتمادی میں کوئی فرق نہ آتا، بسا اوقات وہ عام رائے

سے مختلف کسی رائے کا اظہار فرماتے تو اس میں بھی ان کی بے پناہ خود اعتمادی کارفرما رہتی۔

جہاں تک ہمت وحوصلہ کی بات ہے تو اس باب میں ان کی نظیریں کم ملیں گی۔ مشکل سے مشکل حالات اور بڑے سے بڑا صدمہ پیش آنے پر بھی اُن کی ہمت اور صبر دیکھنے کی چیز ہوتی۔ احقر کو اس کا سب سے پہلا تجربہ اُس وقت ہوا جب شوال ۱۴۱۵ھ میں اُن کے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد رحمہ اللہ کی ایک حادثہ میں شہادت ہوئی اور حضرۃ الاستاذ سفر میں ہونے کی وجہ سے جنازہ میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ پھر جب تشریف لائے تو اگلے دن احقر تعزیت کے لیے حاضر ہوا، اُس وقت چند مقامی اور بیرونی حضرات بھی تعزیت ہی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ خود میری طبیعت پر اس حادثہ کا اثر تھا؛ لیکن جیسے ہی حضرت سے تعزیت کا ایک آدھ جملہ کہا تو حضرت نے کئی منٹ تک تسلی آمیز گفتگو فرمائی جس پر احقر نے عرض کیا کہ: حضرت! ہم تو آپ کی تعزیت کے لیے حاضر ہوئے تھے؛ لیکن آپ سے مل کر ہماری تعزیت ہوگئی اور ہمیں سکون ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس دن رضا بالقضاء کا اعلیٰ ترین نمونہ ہم نے دیکھا۔ آخر میں (وفات سے چند ماہ پہلے) دوسرے صاحبزادے حافظ سعید احمد صاحب رحمہ اللہ کے انتقال کا صدمہ بھی اُسی صبر و ہمت کے ساتھ برداشت کیا۔

یہی حوصلہ بیماری اور تکلیف میں سامنے آتا تھا، آخر کے آٹھ دس سال مختلف امراض اور تکالیف میں گزرے؛ لیکن اُن سے بات کر کے یا اُن کے کام دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔ اسی ہمت وحوصلہ کی وجہ سے بسا اوقات بیماری اور علاج پر ضروری توجہ نہ ہونے کی صورت بھی پیش آتی تھی۔ ایسے بعض مواقع پر، جب اصاغر کا توجہ دلانا کافی نہ ہوا تو اہل تعلق نے حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نور اللہ مرقدہ کے ذریعہ متوجہ کرایا، جن کی بات کا معاصرین میں سب سے زیادہ لحاظ کرتے تھے اور اُن کو بھی حضرت الاستاذ سے محبت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ کی شخصیت اس دور میں اُن شخصیات میں تھی جن سے علم وفن کی آبرو قائم رہتی ہے اور خلق خدا کے دلوں میں اُن کی عظمت بیٹھ جاتی ہے اور اُن کے نام اور کام زندۂ جاوید رہتے ہیں۔

استاذنا حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ؛

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

حضرت مولانا اسجد قاسمی ندوی صاحب
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

اس دور قحط الرجال میں بالعموم یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ علمی مسندیں مسند نشین اہل علم وتحقیق کے لئے عظمت و وقار اور وجاہت ومقبولیت کا باعث ہوتی ہیں، ایسا خال خال اور شاذ ونادر ہی ہوتا ہے کہ مسند نشین شخصیت علم وفضل کے حوالے سے اتنی باوزن اور باعظمت ہو کہ وہ بجائے خود مسندِ علمی کے وقار کو چار چاند لگادے اور اس کے دم سے اس مسند کا وقار واعتبار قائم وباقی رہ جائے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

استاذنا حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ انہیں نابغۂ روزگار اور عظیم شخصیات میں تھے، بلکہ بے جانہ ہوگا اگر کہا جائے کہ متنوع کمالات کی جامعیت، علمی رسوخ اور عملی صلاح، انہماک اور انضباط اوقات، بے مثال اور منفرد انداز تفہیم وطرز تدریس اور حق گوئی کی جرأت وقوت کے حوالے سے ان کی ذات گرامی موجودہ علمی افق پر ''بدر مبین اور ماہِ کامل'' کا مقام رکھتی تھی ؎

وَلَيْسَ عَلَى اللّٰهِ بِمُسْتَنْكِرٍ
أَنْ يَجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدِ

حضرت کے امتیازات وخصوصیات کا ذکر ایک مختصر مضمون میں کیا ہی نہیں جاسکتا، اس کے لئے مبسوط کتاب

درکار ہے، ان سطور کے حقیر راقم نے ان کی شخصیت میں جو سب سے بنیادی اور نمایاں کمالات وامتیازات دیکھے اور محسوس کئے، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہی قارئین کی نذر ہیں۔

(۱) علمی جلال ووقار

اللہ رب العزت نے حضرت کو متانت، وقار اور وجاہت کا ایسا پیکر مجسم بنایا تھا کہ ہر چھوٹے بڑے پر آپ کے علمی جلال اور عظمت کی ہیبت اور رعب ضرور طاری ہوتا تھا، اوصاف نبوت میں یہ مذکور ہے:

مَنْ رَآهُ بَدِيْهَةً هَابَهُ وَمَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً أَحَبَّهُ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اچانک ملتا تھا اس پر آپ کی ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور جو شناسائی کے ساتھ ملتا جلتا تھا وہ آپ کا گرویدہ بن جاتا تھا۔

ان اوصاف کی تجسیم حضرت مفتی صاحب کی ذات میں خوب خوب نظر آتی تھی، اول وہلہ میں ہر ملنے اور آنے والا مرعوب ہو ہی جاتا تھا، مگر بار بار کی ملاقاتوں اور رفاقت اور مصاحبت کے بعد کیفیت یہ ہوتی تھی کہ حضرت اپنی سادگی، بے تکلفی، خورد نوازی اور وسعتِ ظرف سے اپنی محبت کا اسیر اور اپنا گرویدہ بنادیتے تھے، اس کا تجربہ ان کے تلامذہ اور خوردوں کو بار بار ہوتا تھا، اور ہر مرتبہ دل ان کی عقیدت سے لبریز اور دماغ ان کی عظمت و رفعت کے آگے خمیدہ ہوجاتے تھے۔

ان سطور کے حقیر راقم کو بھی ربع صدی تک حضرت سے وابستگی کی سعادت میسر رہی، اس دورانیے میں پہلا سال (دورۂ حدیث کا سال) باضابطہ تلمذ اور باقی اوقات مسلسل (براہ راست بھی، ٹیلی فونک رابطے کے ذریعہ بھی اور حضرت کی بلند پایہ تالیفات کے واسطے سے بھی) استفادہ واستفاضہ کا شرف حاصل رہا، حضر میں بار بار اور سفر میں گاہے گاہے ملاقات، زیارت، خدمت میں حاضری اور مقالات، مضامین، کتب اور تراجم پر نظر ثانی اور اصلاح کے عنوان سے دیر دیر تک علمی مجالست کے علاوہ متعدد بار طویل اسفار میں کئی کئی دنوں تک خادمانہ رفاقت

کا زریں موقعہ دستیاب ہوا، اور ہر بار حضرت کی شفقت وعنایت، سادہ مزاجی، بے تکلفی، اپنائیت، مربیانہ وناصحانہ اصلاح، علمی نکتہ آفرینی، ہمت افزائی اور ترغیب وتشویق جیسی خصوصیات کا خوب خوب تجربہ ہوتا رہا۔

جلال وجمال یا یوں کہیئے کہ وقار ومتانت اور بے تکلفی واپنائیت کا یہ خوب صورت امتزاج (جو بہ ظاہر دھوپ اور چھاؤں کا سہانا منظر رکھتا ہے) حضرت کی حیات وسیرت کا بے انتہا امتیازی گوشہ ہے، اور اسی کا نتیجہ ہوتا تھا کہ ان کے تلامذہ، مستفیدین، اور زائرین کے دل بیک وقت ان کی عظمت اور محبت دونوں سے آباد وسرشار رہا کرتے تھے، کسی شخصیت میں محبوبیت اور عظمت دونوں کا اجتماع خاص انعام الٰہی ہوتا ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۲) تشجیع اور خردنوازی

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ بڑے اور باعظمت ہوتے ہیں، اپنی ذات کے حصار میں بند ہوجاتے ہیں، پھر ان کی مصروفیت اور مزاج کی ساخت دونوں انہیں دوسروں سے فاصلے کا عادی بنادیتے ہیں، مگر حضرت مفتی صاحبؒ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، ان کا حال تو ''باہمہ اور بے ہمہ'' دونوں کا جامع اور انداز ع ''شمع محفل کی طرح سب سے جدا، سب کا رفیق'' ہوتا تھا۔

ان کی بے پناہ مصروفیات ایک طرف کہ دم لینے کی بھی فرصت نہ تھی، مگر خردوں کے ساتھ تشجیع، ہمت وحوصلہ افزائی، اصلاح وتشویق اور ترغیب وتحریض کا سلسلہ بھی جاری رہا کرتا تھا، اور یہ کبھی کبھار کا نہیں روزمرہ کا معمول تھا، چھوٹوں کو آگے بڑھانا، انہیں آگے جانے کے ہنر بتانا، انگلی پکڑ کے انہیں راہ سجھا دینا، بے تکلف اپنے تجربات سے آگاہ کردینا اور ان کی نقائص سے لبریز کاوشوں کی تحسین کرکے ان کا دل بڑھا دینا اور حوصلہ جما دینا حضرت کی ادائے دل نواز اور خوئے نادر مثال تھی۔

اس حوالے سے اس حقیر کو اپنے ذاتی متعدد تجربات لوح دماغ پر تازہ نظر آرہے ہیں، اس حقیر کو دورۂ حدیث کے سال میں حضرت سے جامع ترمذی اول اور شرح معانی الآثار پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، ترمذی میں امتحان سالانہ میں حضرت کے قلم سے مجھے پورے ۵۰ر نمبر حاصل ہوئے، اس سال دورۂ حدیث کی جماعت میں ترمذی میں اتنے نمبر حاصل کرنے والا اتفاق سے تنہا میں ہی تھا، آئندہ شوال میں جب حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی تو حضرت نے ہر ہر کتاب کے نمبرات دریافت کئے، میں نے ترمذی کا نمبر ذکر کیا تو حضرت چونکے اور فرمایا: وہ تمہاری کاپی تھی؟ پھر کچھ توقف کے بعد بولے: تم نے جوابات بہت سلیقے سے لکھے ہیں، ترتیب بھی اچھی ہے، عربی بھی اچھی ہے، تحریر بھی مناسب ہے جسے اور بہتر بنانا چاہئے، ماشاء اللہ: تمہاری کاپی نمایاں تھی، اسی لئے تم کو پورے نمبر ملے، اب تم کو میری طرف سے انعام بھی ملنا چاہئے، پھر حضرت نے کچھ نقد اور کچھ کتابیں انعام کے طور پر عنایت فرمائیں۔ ایک حقیر طالب علم کی کاپی اور انداز کیا، من آنم کہ من دانم، مگر اس واقعے سے حضرت کی خردنوازی اور تشجیع کی ادا بہت نمایاں ہوتی ہے۔

احقر نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء میں تخصص ادب عربی میں داخلہ لیا، ابتدائی مرحلے میں اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں بہت چیزیں منتقل کیں، اخباری تراشوں کے بجائے میں نے اپنے اکابر اور اساتذہ کے افادات کی تعریب پر خاص توجہ رکھی، چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی مایہ ناز کتاب ''علوم القرآن'' کا عربی ترجمہ کیا جو استاذ گرامی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی صاحب دامت برکاتہم نے ازراہِ شفقت ''البعث الاسلامی'' میں مکمل بالاقساط اپنی اصلاح کے بعد شائع فرمایا۔

حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ کا ایک رسالہ ''فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے'' مجھے بے حد پسند آیا، میں نے لگے ہاتھوں اس کا بھی ترجمہ کر دیا جو دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے عربی ترجمان ''النہضۃ ال اسلامیۃ'' اور جامعہ عربیہ یہ مراد آباد کے عربی آرگن ''الحرم'' میں طبع ہوا، اس کے بعد سفرِ دیوبند کے موقع سے ناشتے کے وقت حضرت

کی اجازت سے درِ دولت پر حاضری ہوئی، اور یہ مضمون ''ہدیۂ مور پیش سلیماں'' کے طور پر پیش کیا، تو حضرت نے دسیوں صفحات کا یہ مضمون اسی مجلس میں مکمل پڑھا اور پھر فرمایا: ''ماشاء اللہ: تمہاری عربی سلیس ہے، مشق خوب جاری رکھو، اور ''زوائد'' کے بجائے اس طرح کی علمی چیزوں کا ترجمہ کرتے رہو''۔

حضرت کے ان کلمات سے اور پھر دعائیہ جملوں سے دیر تک احقر پر سرشاری اور بے حد فرحت وانبساط کی کیفیات طاری رہیں۔

کرناٹک کے ایک سفر میں کئی دن حضرت کے ساتھ رہنے کی سعادت میسر آئی، یہ سفر ''تحفظ شریعت'' کی ایک کانفرنس کے لئے تھا جس میں کئی نشستیں صرف علماء کرام کی موضوعاتی تربیت کے لئے اور ایک نشست عوامی اجلاس کی تھی، حسن اتفاق سے منتظمین اجلاس نے احقر کی قیام گاہ کا نظم حضرت کی جائے قیام سے بالکل متصل کیا تھا، اس موقع پر انفرادی نشستوں، اجتماعی مجلسوں، خطابات ومحاضرات میں مکمل شرکت کے ساتھ، دسترخوان پر ہم طعامی کا شرف بھی حاصل ہوا، اور سچی بات یہ ہے کہ بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور حضرت کی بلند نگاہی اور سادہ مزاجی کے نقوش ذہن ودماغ پر مرتسم ہوئے، علمی محاضرات کے سلسلے میں جو عنوان اس حقیر سے متعلق کیا گیا تھا، اس پر میں نے بالارادہ اور منتظمین سے گذارش کر کے ترتیب یہ رکھی تھی کہ میری ٹوٹی پھوٹی گفتگو حضرت کی استراحت کے اوقات میں ہو، مگر اجلاس عام میں احقر کو بڑی آزمائش کا سامنا ہوا، حضرت شروع میں ہی اسٹیج پر تشریف لے آئے، کلیدی خطاب آخر میں آپ کا ہی ہونا تھا، احقر کو ''اصحاب رسول کی علمی وعملی عظمت اور اس سلسلے میں امت سے شریعت کے مطالبات'' پر چالیس منٹ خطاب کرنا تھا، بالآخر خدا خدا کر کے یہ مرحلہ تمام ہوا، میری بے ربط اور ناقص گفتگو جاری تھی اور حضرت میری طرف مکمل متوجہ، اس صورت حال نے مجھے ''آزمائش در آزمائش'' سے دوچار کر دیا تھا، چونکہ مجمع میں ایک بڑا طبقہ ان افراد کا بھی تھا جن کے ہاں متعدد معتبر احادیث کو بھی ''ضعیف'' کے خانے میں ڈال دینے کا مزاج نمایاں ہوتا ہے، اس لئے ان کی رعایت بھی احقر نے ملحوظ رکھی تھی، اور عظمت صحابہ

کے اثبات کے لئے خطبہ میں بھی اور خطاب کے دوران بھی مشہور حدیث ''أَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ، فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ إِهْتَدَيْتُم'' کے بجائے صحیح مسلم کی روایت ''أَنَا أَمَنَةٌ لأَصْحَابِیْ وَأَصْحَابِیْ أَمَنَةٌ لأُمَّتِیْ الخ'' کو پیش کیا تھا اور اسی کی روشنی میں امت کی ذمہ داریوں اور صحابہ سے وابستگی کے صلے میں حاصل ہونے والی تائید الٰہی ، امان وحفاظت ونصرت اور فتنوں سے سلامتی کا تذکرہ کیا تھا، حضرت نے ازراہِ خردنوازی اپنے کلیدی خطاب میں اپنے اس حقیر وتہی دامن شاگرد کی تحسین بلند الفاظ میں فرمائی تھی اور پھر اجلاس کے بعد دستر خوان پر حضرت نے بشاشت کے عالم میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا:

> ''تم نے حسب موقع اہم ترین حدیث کو بنیاد بنایا، اور مغز ہی مغز پیش کیا، ایسی ہی بات ہونی چاہئے، اسی کی مشق رکھو کہ مغز ہی بیان کرنا ہے، مضبوط بات ہی پیش کرنی ہے، چھلکا اور کچی بات نہیں پیش کرنی ہے۔''

ظاہر ہے کہ کہاں حضرت کا مقام بلند اور کہاں یہ طفل مکتب اور کودکِ ناداں: مگر یہ حضرت کا بڑکپن اور اندازِ تشجیع تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس ادا سے مخاطب کی کیسی دل بستگی ہوتی تھی اور اس کی رگوں میں جهد مسلسل کے لئے کیسے خونِ تازہ دوڑ پڑتا تھا، اسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے، الفاظ کے پیکر میں ڈھالا نہیں جاسکتا۔

دورۂ حدیث کے سال میں ایک دن سبق سے فارغ ہونے کے بعد حضرت تخت سے نیچے اترے، استاذ کی دائیں جانب دوسری تپائی پر احقر کی نشست ہوتی تھی، آپ گذرے اور میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے، میرا معمول حضرت کی درسی تقریر من وعن کاپی میں ضبط کا تھا، میں اسی میں مشغول تھا، حضرت رک کر دیکھنے لگے، طلبہ متوجہ ہوگئے، میں نے آہٹ محسوس کی تو مرعوب ہوکر کھڑا ہوگیا، حضرت نے خیریت دریافت کی، بات کرتے ہوئے چل پڑے، میں بھی ساتھ ہوگیا، میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ کی خیریت پوچھی اور فرمایا: تمہیں شاید معلوم نہ ہو، تمہارے والد کا دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوگیا تھا، معاملات طے پاگئے تھے، کتابیں نامزد ہوگئی تھیں، مگر وہ نہ آسکے، تو پھر میرا تقرر ہوا، اس طرح میں تمہارے والد کی جگہ پڑھا رہا

ہوں۔

میں بتا نہیں سکتا کہ حضرت کے ان الفاظ اور خرد نوازی کے اس انداز نے کس طرح سے مجھے گھائل کیا اور حضرت کی عظمت ومحبت نہاں خانۂ قلب میں کس طرح پیوست ہوتی چلی گئی۔اب ان یادوں کو قرطاس پہ منتقل کر رہا ہوں تو احساس ہو رہا ہے کہ ع

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

(۳) تربیت کا بے مثال اہتمام

حضرت کی زندگی میں اپنے متعلق ومنسلک افراد کی تربیت کا خاص اہتمام تھا، اور اس میں حضرت کا انداز پدرانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، آپ کے تلامذہ کی ایک بڑی ٹیم ہے جو آپ کے فیضان تربیت سے کندن بنی، اور جس نے حضرت سے وابستگی اور حضرت کے زیر تربیت رہنے کو اپنے لئے مایۂ عزت وافتخار سمجھا، اور اس کی برکت سے اسے علمی وعملی برکات وفتوحات کے خزانے میسر آئے۔

ان سطروں کے راقم کو-اپنی تمام ترکم علمی کے باوجود-کسی نہ کسی درجے میں یہ خوش نصیبی حاصل رہی، میں اپنی غیر مطبوع یا مطبوع کوئی کاوش جب بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا تو اس کا ایک حصہ تو آپ اسی وقت ملاحظہ فرماتے، باقی بعد میں دیکھتے، اور جو کمی یا خامی نظر آتی فوراً متنبہ فرماتے، اصلاح کرتے، مضمون کو کیسے ادا کیا جائے، رہنمائی فرماتے اور کون سے مراجع پیش نظر رہیں، رہبری کرتے۔

اس حقیر نے ''اہل علم کے مجمع میں ہونے والے اپنے ایک مفصل خطاب ومحاضرہ'' کو بعض ذمہ دار اہل علم کی توجہ دہانی پر کتابی شکل میں ''فقہ حنفی میں اتباع احادیث کا جائزہ'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا، ارادہ یہ تھا کہ یہ کتاب حضرت کی نظر ثانی اور کلمات مبارکہ کے بعد ہی طبع ہوگی، دیوبند حاضر ہوکر کتاب کا مسودہ خدمت میں پیش کیا اور درخواست رکھ دی، حضرت نے ازراہِ ذرہ نوازی گذارش قبول فرمائی اور فرمایا: تین دن بعد ٹیلی فون پر

بات ہوگی۔تین دن بعد میں نے رابطہ کیا تو حضرت نے فرمایا:

''تم اسلامیات پر اچھا لکھتے ہو مگر خلافیات پر اچھا لکھنے کے لئے ابھی اور ریاضت درکار ہے۔''

اس اصولی بات کے بعد آپ نے مذکورہ کتاب کے حوالے سے نمبر وار نشان دہی فرمائی اور اصلاح و ترمیم کے بعد دوبارہ دکھانے کو کہا، میں نے حسب ہدایت و اصلاح کام پورا کیا اور پیش کیا، حضرت نے بہ نظر غائر ملاحظہ فرمایا اور فرمایا:

''اب میں حضرت عمر کا قول دہراتا ہوں: اَلآنَ إِسۡتَرَحۡتُ (اب مجھے راحت ملی)۔''

پھر خوب دعاؤں سے نوازا، تقریظ لکھی، جس میں اس حقیر کے لئے از راہِ خرد نوازی تحسین کے خوب کلمات ارقام فرمائے، سوء اتفاق یہ کتاب اب تک بعض اسباب سے زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔

یہ حقیر دار العلوم الاسلامیہ بستی میں تدریسی خدمات سے وابستہ تھا، جامعہ عربیہ یہ مراد آباد میں ہنگامی تدریسی ضرورت پیش آئی، جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا معین الدین گونڈویؒ علاج کے سلسلے میں گجرات منتقل ہوگئے تھے، بڑوں کے حکم پر ۲۰۰۶ء کے اوائل سے مجھے ''صحیح بخاری'' کی خدمت کے لئے مراد آباد آنا پڑا، یہ خدمت -اپنی تمام تر نا اہلی کے باوجود- بڑوں کے امتثال حکم میں تا حال جاری ہے، اللہ اسی خدمت پر خاتمہ بخیر فرمائے۔

اس خدمت سے وابستگی کے بعد یہ حقیر پہلی بار دیوبند حاضر ہوا، اور حضرت کی بارگاہ میں پہونچا اور پوری بات عرض کی تو حضرت نے فرمایا: تم نے اس سے پہلے کون سی کتابیں پڑھائی ہیں؟ میں نے بطور خاص کئی سال سے ''مشکوۃ المصابیح'' پڑھانے کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا: دیگر فنون کی کیا کتب زیر درس رہی ہیں؟ میں نے نحو، صرف، ادب و انشاء اور فقہ و تفسیر تمام فنون کی اپنے زیر درس رہ چکی کتب کی تفصیل عرض کی، یہ سن کر حضرت نے دو باتیں فرمائیں:

(۱) تم نے معقول کی کتابیں پہلے پڑھائی ہیں، اب تم معقول سے گزر کر منقول کی طرف آئے ہو، یہ فالِ نیک ہے، میرا تجربہ ہے کہ یہ ترتیب ہر قدم پر فکری و عملی گمراہی سے محفوظ رکھتی ہے اور مسلکِ حق پر ثابت قدم رکھتی ہے۔

(۲) دورۂ حدیث کی تمام کتب کا از اول تا آخر بالاستیعاب مطالعہ کر ڈالو، بخاری کے لئے دیگر شروح کے ساتھ بالالتزام ''فیض الباری'' بہ غور دیکھو، پڑھانے میں ''تفصیل واختصار یا درایت وروایت'' کے حوالے سے ''اعتدال'' اور ''خَيْرُ الْكَلَامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ'' کے طریقے کی پابندی رکھو، طلبہ کو ان کے معیار سے آگے کی بات نہ بتاؤ، وہی خوراک دو جو وہ ہضم کرسکیں، یہ دعا بھی اپنے لئے اور ہم سب کے لئے کرتے رہو کہ دین اور حدیث کی خدمت میں عمر تمام ہوجائے۔

گذشتہ دو یا تین سال قبل احقر ''رابطہ مدارس اسلامیہ'' کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں دیوبند گیا تھا، اجلاس کے بعد مہمان خانے میں لفٹ سے اترتے ہوئے حضرت سے ملاقات کی، حضرت نے خیریت دریافت کی، اسی وقت دولت کدے پر لے گئے، تحفۃ القاری مکمل اور ہدایت القرآن کی کئی جلدیں عطا فرمائیں اور فرمایا:

''عمامہ سنت ہے، تم حدیث پڑھاتے ہو، اب عمامہ باندھنا شروع کردو، روز نہ باندھ سکو تو جمعہ کے دن باندھ لو، یہ سنت کسی نہ کسی شکل میں حدیث کے خادم کی زندگی میں باقی وجاری رہنی چاہئے۔''

احقر کو ایک مسئلے میں علمی اشکال تھا، عرض کیا، حضرت نے مفصل جواب دیا اور اپنی دعاؤں کے حصار میں رخصت کیا۔ احقر نے اپنی کتاب ''اسلام میں عفت وعصمت کا مقام'' میں ''آیت حجاب'' پر لکھا تھا، حضرت نے ملاحظہ فرمایا اور دیر تک اس موضوع پر گفتگو فرمائی، اس دن عصر کے بعد مجلس میں مجمع بھی زیادہ تھا، کئی اساتذۂ دار العلوم بھی تشریف رکھتے تھے، پوری مجلس میں یہی موضوع رہا، مغرب کی نماز ساتھ ادا کی، اس کے بعد بھی کئی منٹ اسی موضوع پر بات کی اور بہت نفیس نکتوں کی طرف توجہ دلائی، حوصلہ افزائی بھی کی، تحسین بھی فرمائی اور تربیت و

اصلاح بھی کی۔

(۴) حفظانِ صحت کے اصول کا اہتمام

حضرت کے ہاں حفظانِ صحت کے حوالے سے بھی خاص اہتمام اور توجہ تھی، متعلقین کو اس پہلو سے توجہ دلاتے رہتے تھے، وقت پر سونا، کھانا پینا اور تمام کام، بہ جائے خود تحفظ صحت کے لئے بنیاد کا مقام رکھتے ہیں، حضرت اس پر پوری طرح کاربند رہتے تھے اور کبھی اس میں تخلف نہیں آنے دیتے تھے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ کا مستقل معمول روزانہ بعد فجر کم از کم ایک گھنٹہ بہت تیز قدموں سے چلنے کا تھا (عموماً اس دورانیے میں وہ ۵ رکلومیٹر تفریح کر لیتے تھے اور چونکہ تفریح تنہا کرتے تھے اس لئے قرآن کے اچھے خاصے حصے کی تلاوت اور تسبیحات کا اپنا معمول اسی دوران مکمل کر لیتے تھے) میرے دورۂ حدیث کے سال (۱۹۹۶ء) میں حضرت والد صاحب کی حضرت مفتی صاحب سے سالہا سال کے بعد ملاقات ہوئی، والد صاحب نے اپنی تفریح اور چہل قدمی کا ذکر کیا تو پہلے مفتی صاحب نے ازراہ مزاح فرمایا:

''آپ مہتمم آدمی ہیں، آپ کے پاس وقت ہے، میں تو مدرس ہوں، یہی مطالعے کا وقت ہوتا ہے، میں اتنی لمبی تفریح نہیں کر سکتا۔''

پھر فرمایا:

''میں دن میں ایک بار اور بعد مغرب ایک بار اپنے گھر سے (جو دار العلوم سے کافی فاصلے پر ہے) دار العلوم پیدل جاتا اور آتا ہوں، اس طرح اچھی خاصی چہل قدمی ہو جاتی ہے۔''

ظاہر ہے کہ حضرت کے پیدل آنے جانے کا یہ معمول (جو علالت اور امراض کے ہجوم سے پہلے تک سالہا سال جاری رہا) حفظانِ صحت کی رعایت کے پیش نظر ہی تھا۔

ایک مرتبہ دیوبند حاضری کے موقع پر احقر نے اپنی کچھ تحریری کاوشیں پیش کیں، حضرت نے فرمایا:

''تم زمین پر بیٹھ کر لکھنے کا کام کرتے ہو یا کرسی اور میز کا استعمال کرتے ہو''۔

میں نے کرسی کا ذکر کیا، حضرت نے فرمایا:

''مستقل بیٹھ کر کام کرنا بسا اوقات مختلف پہلوؤں سے صحتِ جسمانی کے لئے بہت مضر ہوتا ہے، اس لئے یا تو کرسی میز کا استعمال ہونا چاہئے، یا اگر زمین پر بیٹھ کر کام کرنا ہے تو پھر تھوڑی دیر کے بعد وقفہ دینا چاہئے اور اٹھ جانا چاہئے''۔

مزید فرمایا:

''میں زمین پر بیٹھ کر کام کرتا ہوں اور مراجع (جن کی ہر دم ضرورت ہوتی ہے) اپنے قریب نہیں رکھتا، دو الماریوں میں رکھتا ہوں، اور اس بہانے بار بار اٹھتا ہوں، تا کہ صحت پر منفی اثر نہ پڑے''۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ روحانی صحت کے ساتھ اللہ نے حضرت کو جسمانی صحت کے تحفظ کی بھی خوب فکر عطا فرمائی تھی۔

(۵) تواضع

حدیث نبوی کی صراحت کے مطابق تواضع میں انسان کی رفعت کا راز چھپا ہوتا ہے، حضرت مفتی صاحب کو عالمی مقبولیت اور قافلۂ علم کی سالاری کا مقام بلند اور ''حسن قبول'' کا مرتبہ حاصل تھا، اس کی پشت پر دیگر محرکات کے پہلو بہ پہلو آپ کے اندرون کی تواضع، بے نفسی اور خاکساری بھی کلیدی طور پر شامل ہیں۔

اپنے معاصرین کے فضل وکمال کا اعتراف انسان کی وسیع الظرفی، تواضع اور اخلاص باطن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم (جو حضرت مفتی صاحبؒ کے معاصر بزرگوں میں ہیں اور علم وفضل کے حوالے سے پورے عالم کے علمی افق پر آفتابِ عالم تاب اور ''تو چیزے دیگری'' کا مصداق کامل ہیں) پر قاتلانہ حملے کے بعد حضرت مفتی صاحب نے اپنے دوسطری تأثرات کا اظہار فرمایا تھا، یہ تأثر ایک

طرف طویل تأثراتی اور جذباتی مضامین پر ہزار درجہ بھاری بھی ہے اور دوسری طرف حضرت مفتی صاحب کے صفائے باطن، معاصر کے فضل کے بے لاگ اعتراف اور تواضعِ کامل کا نمایاں ثبوت بھی ہے۔

اس تأثر کا عنوان تھا ''ہزار جانیں آپ پر قربان''

اور مضمون یوں ہے:

''تہنیت بخدمت سید المسلمین شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ادام اللہ فضلہ آپ سرمایۂ ملت ہیں، اور مایہ پر ہمیشہ چوروں کی نظر رہتی ہے، مگر اَللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظًا وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ، اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے حملے سے آپ کو بال بال بچالیا، اس پر ہم ارحم الراحمین کا شکر بجالاتے ہیں''۔(البلاغ: شعبان ۱۴۴۰ھ اپریل ۲۰۱۹ء: ص ۷۵)

حضرت مفتی صاحب کی رحلت پر تأثرات رقم کرنے والے ان کے متعدد تلامذہ نے نقل کیا ہے کہ مختلف تالیفی ذوق رکھنے والے علماء کو حضرت یہ مشورہ دیتے تھے کہ اپنی علمی اور قلمی کاوشیں حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ (جو حضرت کے ہم عصر بلند پایہ عالم اور استاذ الاساتذہ تھے) کو ضرور دکھایا کریں، اس لئے کہ زبان وادب کے حوالے سے موصوف کی شخصیت بہت اہم اور سند ہے، ظاہر ہے کہ معاصرین کے کمال کا یہ اعتراف واظہار بجائے خود حضرت مفتی صاحب کی خوئے متواضعانہ اور پاکیزگیٔ قلب واندرون کی بیّن دلیل ہے۔

(۶) غیبت اور بدگوئی سے مکمل اجتناب

حضرت کو اللہ نے یہ خوبی عطا فرمائی تھی کہ آپ کے دروس، خطابات، مجالس اور نشستیں ''غیبت اور بدگوئی'' کے رواجِ عام پاچکے رذائل سے بالکل محفوظ اور پاک رہتی تھیں، ذاتیات پر تبصرہ اور معائب کے پروپیگنڈہ سے وہ کوسوں دور رہا کرتے تھے، ان کو اپنے باتوفیق اور اہل دل اساتذہ کے فیض صحبت وتربیت سے، اپنے والدین کے صلاح وتدین اور حسن تربیت، متواتر دینی خدمت اور علمی اشتغال نیز اپنے مرتب اور جامع ومنضبط نظام الاوقات

کی برکت سے غیبت و بدگوئی جیسے سفلی کاموں سے نفرت تھی، انہوں نے علمی موسوعاتی کاموں کا ایسا بیڑا ہمیشہ اٹھائے رکھا کہ ان کی زندگی میں کبھی ان جیسے کاموں کی فرصت بھی نہیں تھی۔

ان کے مفسرانہ قلمِ فیض رقم نے ''غیبت'' کے ذیل میں لکھا ہے:

''پھر غیبت کی تغلیظ (بھاری گناہ ہونا بیان کرنے) کے لئے اس کو تشبیہ دی مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے، جس سے ہر کوئی گھن کرتا ہے، کوئی اس کو کھانے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اور مردہ بھائی کے گوشت کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ زندہ بھائی کا گوشت اول تو کوئی کھا نہیں سکتا، اور کھانے کی کوشش کرے تو وہ مدافعت کرے گا، اور لاش کو کھائے تو کون مدافعت کرے گا؟ اسی طرح دوسرے کی عدم موجودگی میں غیبت کرے تو وہ کیا مدافعت کرے گا؟ ہمت ہو تو سامنے برائی کر کے دکھائے، اس صورت میں منہ کی کھائے گا''۔ (ہدایت القرآن: ۷/۵۰۶)

واقعہ یہ ہے کہ ان کا حال ان کے قلم وقال کے مطابق غیبت، بدزبانی اور بدگوئی سے بالکل پاک اور سلامت تھا، وہ اپنے خوردوں کا بھی غائبانے میں ذکر خیر کرتے تھے، اصلاح طلب امور کی اصلاح سامنے اور مشفقانہ مربیانہ اصولی لہجے میں فرماتے تھے، اور یہ ان کی عظمت کی بہت کھلی دلیل تھی۔

(۷) جادۂ اعتدال پر ثابت قدمی

حضرت کی کتاب زندگی کا نمایاں عنوان ''اعتدال'' ہے، یہ اعتدال دروس وخطابات میں بھی نمایاں رہتا تھا، شخصیات سے اظہار تعلق میں بھی دکھائی دیتا تھا، انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک، خلوت سے لے کر جلوت تک اور سفر وحضر ہر جگہ اس اعتدال کا عکس نظر آتا تھا، ان کی ''حق گوئی'' اور ''تصلّب'' کچھ ظاہر بینوں کو ''غلو'' نما معلوم ہوتے تھے، مگر یہ سطحی مشاہدہ کی وجہ سے ہوتا تھا، ان سے قریب ہو کر، ان کی مجالس میں شریک ہو کر اور ان کے ساتھ کچھ وقت گذار کر بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ''غلو'' سے کس قدر نفور اور ''اعتدال'' کے کس

درجہ پیکر ہیں۔

حضرت کے اسباق علمیت کا مظاہرہ کرنے والے نو واردوں کی طرح اطناب وتطویل سے بھی پاک تھے، اور حقِ علم ادا کرنے کے بجائے صرف ایک بوجھ اتارنے والوں کی طرح ایجاز واختصار اور سرسری انداز سے بھی محفوظ تھے، آپ کے دروس ''اطناب مِمل'' (اکتا دینے والی بلکہ بسا اوقات افادیت سے خالی تفصیل وتطویل) اور ''ایجازِ مخل'' (مضمون کو خبط کردینے والے اختصار) دونوں سے پاک سراپا اعتدال تھے، اور سال کی ابتداء سے انتہا تک یہ اعتدال اور یکسانیت باقی رہتی تھی۔

یہی اعتدال حدیث کی عبارت خوانی میں بھی ہوتا تھا، احادیث کے متون نہ اتنے تیز پڑھے جاتے کہ واضح نہ ہوسکیں، اور نہ اتنے اطمینان سے پڑھے جاتے کہ ترتیل کا گماں ٹھہرے، بلکہ میانہ روی کا مکمل لحاظ رہا کرتا تھا۔

حضرت کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ ''اکابر پرستی'' اور ''اکابر بیزاری'' کی انتہاؤں سے الگ اور دور شاہراہ اعتدال پر گامزن رہتے تھے، عقائد وکلامیات میں انہیں اکابر کی تشریح پر کامل اعتماد تھا، اور ان کا دل اکابر کے سچے احترام سے ہمہ وقت لبریز رہتا تھا، مگر اس کے باوجود وہ اکابر کی ہر ہر بات پر آنکھ بند کرکے یقین، دوسرے لفظوں میں اندھی تقلید کے قائل کبھی نہیں رہے، بصیرت ان کے علمی وفکری سفر میں ہمیشہ ان کا زادِ راہ رہی۔

اپنے بعض معاصرین (جن سے متعدد علمی وفکری مباحث میں ان کا اختلاف رائے رہا کرتا تھا) کے ساتھ ان کے معاملات اور سلوک ورویے ہمیشہ اعتدال کا نمونہ رہے، اختلاف رائے انہیں معاصرین کی خوبیوں کے اعتراف سے کبھی نہیں روکتا تھا، وہ اپنی رائے پر قائم بھی رہتے تھے، اس کی وکالت بھی کرتے تھے، اور مخالف دلائل کا جواب بھی دیتے تھے، مگر مقابل کی تحقیر وتنقیص سے ہمیشہ اپنے قلب وقالب دونوں کو محفوظ بھی رکھتے تھے، اس جوہر اعتدال نے ان کو امتیازی خوبی عطا کردی تھی، آج یہ خوبی نایاب ہوتی جارہی ہے، حضرت کی حیات کا یہ ورق ان کے تمام اخلاف کے لئے اس حوالے سے خصوصیت کے ساتھ مشعل راہ ہے، اور ہم سب کو ''ادب

الخلاف" (اختلاف رائے کا شائستہ طریق) سیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

(۸) حق گوئی، استقامت اور تصلّب

حضرت مفتی صاحب کی سیرت کا سب سے جلی اور روشن پہلو (جو انہیں اپنے معاصرین میں نمایاں امتیاز عطا کرتا ہے) ان کی حق گوئی، استقامت اور تصلّب کی خصوصیت ہے، وہ ہمیشہ حق کا اعلان ڈنکے کی چوٹ پر کرتے تھے، انہیں عواقب اور لومۃ لائم کی پرواہ نہیں ہوتی تھی، حق گوئی کی جرأت رندانہ رکھنے والے اور اس راہ میں ہر صعوبت انگیز کرنے کا جگر رکھنے والے اسلاف کی طرح ان پر نہ کبھی مرعوبیت طاری ہوتی تھی، نہ مصلحت آمیز اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کا خیال بھی آتا تھا۔

ان کی ساخت اور ترکیب جن عناصر سے ہوئی تھی ان میں اپنے کو صلح کل بنائے رکھنے اور "متفق علیہ" اور "غیر متنازع" بنے رہنے کے لئے تلخ کو شیریں اور غلط پر خاموش رہ جانے اور حق کو مشتبہ کر دینے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں تھی، وہ انکار منکر اور ابطال باطل کو وقت گذاری کا مشغلہ یا اپنی دلچسپی کا موضوع نہیں، اپنا مشن اور فرض منصبی باور کرتے تھے، جس چیز کے حق اور درست ہونے پر منصوص و مضبوط دلائل کی روشنی میں انہیں انشراح ہو جاتا تھا، وہ اس کا اظہار کرنے سے نہ گریز کرتے تھے، اور نہ مخالفانہ رائے رکھنے والوں کی وجہ سے اس کے اعلان میں انہیں کوئی باک ہوتا تھا، ان کا مزاج یہ تھا کہ وہ کبھی زہر ہلاہل کو قند نہیں کہہ سکتے تھے، حق گوئی ان کی سرشت تھی، احقاق حق ان کی طبیعت تھی، ابطال باطل ان کا مزاج تھا اور انکار منکر ان کا ہدف تھا، وہ اپنی مثال آپ تھے، انکار منکر اور ابطال باطل کے حوالے سے جب وہ مجلس یا اجلاس میں گفتگو کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ ان میں کوئی فولادی قوت پیدا ہو گئی ہے، ان کا اسلوب بالکل بے لچک اور دلائل کے ہتھیاروں سے مسلح ہو جاتا تھا، ان کی زبان قال حق کا اعلان اور منکر کا انکار کر رہی ہوتی تھی اور زبانِ حال گویا یہ کہہ رہی ہوتی تھی ؎

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا

جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

اوران کا انداز یہ صدا لگا رہا ہوتا تھا ؎

یہ بیانِ حال یہ گفتگو، ہے میرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کبھو، نہ سنوگے ایسی کہانیاں

قبرستانوں میں لگائے جانے والے کتبوں کے تعلق سے حلقۂ دیوبند میں جو غلو پیدا ہوتا جار ہا ہے، وہ حضرت کے لئے بڑی فکر اور کڑھن کا باعث تھا، وہ کھل کر اس پر نکیر کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا کہنا تھا کہ بریلویت اور دیوبندیت میں اب صرف ایک بالشت کا فرق رہ گیا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ اب یہ فرق بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

مروجہ تعزیتی جلسوں اور مجالس کے بارے میں حضرت کا موقف بالکل واضح تھا، وہ ان کو غلط اور نا مناسب باور کرتے تھے، ان کا موقف مختلف دلائل کی روشنی میں یہ تھا کہ اس سلسلہ میں بعض پیش رو اکابر کی طرف سے اس طرح کے اجلاسات کے انعقاد اور شرکت کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا، اکابر کے تمام تر احترام کے باوجود حضرت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ مسئلہ ان اکابر کے سامنے منقح نہیں ہوا تھا، اس لئے تنقیح سے پہلے کے ان کے عمل کو ثبوت میں نہیں پیش کیا جانا چاہئے۔

''چھوٹا منھ بڑی بات'' سہی، مگر یہاں یہ عرض کیا جانا ضروری ہے کہ تعزیتی مجالس کے سلسلے میں مسلک دیوبند کے نمائندگان کا باہم اختلاف حق و باطل، درست و نادرست، صحیح اور غلط کا نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ اختلاف عزیمت و رخصت یا انسب وغیر انسب کے درجے کا ہے، حضرت مفتی صاحب راہِ عزیمت کے سالک بلکہ رہبر تھے، اس لئے بجا طور پر ان کا وہی موقف ہونا چاہئے تھا جو انہوں نے پوری قوت سے ظاہر فرمایا۔

جماعت تبلیغ میں اور بہ طور خاص اس سے متعلق دین کے عمیق علم سے نا آشنا پر جوش افراد کی طرف سے مختلف

جہات میں پایا جانے والا غلو (جس کے ڈانڈے دین کے صرف ایک شعبہ کی تعظیم اور باقی شعبوں اور محاذوں کی قدرناشناسی سے مل جاتے ہیں) اسی طرح ''فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح کو کارتبلیغ پر منطبق بلکہ منحصر کردینے اور جہاد وقتال جیسے اہم دینی شعبے کی حق تلفی پر مبنی بے اعتدالی، نیز بعض ذمہ دارانِ جماعت کی طرف سے تفسیر آیات اور تشریح احادیث وغیرہ میں صادر ہونے والی لغزشیں اوران پر کسی نہ کسی صورت میں اصرار کی روش حضرت مفتی صاحب کے لئے بڑے قلق اور تشویش کی بات تھی، ایسے مواقع پر ان کا احقاق حق اور تصیح غلط کا جذبہ خوب بیدار ہوجاتا تھا، اور وہ اپنے تلامذہ کو بطور خاص دروس میں اور حسب ضرورت عمومی مجالس میں شرکاء کو متنبہ بھی فرماتے تھے، اور اسے اپنی دینی مسئولیت سمجھتے تھے۔

قبرستانوں میں مراقبہ، قبروں پر تلاوت، تصوف کے نام پر افراط وتفریط اور اکابر پرستی میں غلو وہ امور ہیں جن پر حضرت مفتی صاحب نے کھل کر نکیر کی ہے، ان میں سے بعض معاملات میں بعض جزئیات پر حضرت مفتی صاحب کے نقد واحتساب سے متعدد علماء ومشائخ کو اتفاق نہ ہوسکا، مگر حضرت مفتی صاحب نے دلائل کی روشنی میں جس عمل کو درست نہیں سمجھا اور خیر القرون میں جسے متوارث نہیں پایا اس پر احتساب کا فرض ضرور انجام دیا۔

حضرت کو حلقۂ دیوبند سے منسلک مدارس میں قرآن مجید سے بے اعتنائی پر بہت دکھ ہوتا تھا، واضح رہے کہ درس نظامی میں تفسیر کے نام پر صرف ایک کتاب ''جلالین'' داخل نصاب ہے، حضرت فرماتے تھے:

> **''ہمارے ہاں سب سے زیادہ مظلوم قرآن ہے، دیگر تمام فنون پر کئی کئی کتب داخل نصاب ہیں، مگر قرآن کے نام پر صرف ایک ہی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔''**

حضرت کی رائے یہ تھی کہ نفس قرآن شرح وبسط کے ساتھ اس طرح پڑھایا جانا چاہئے کہ استاذ کسی خاص تفسیر کو سامنے نہ رکھے، وہ تمام معتبر تفاسیر کو مرجع بنائے، ان کا مطالعہ کرے، اور حاصل مطالعہ کو تمام نکتوں اور افادات و مباحث کے ساتھ طلبہ تک منتقل کرے، اس کے بغیر طلبہ میں قرآن میں تدبر کا ذوق پیدا نہیں ہوگا۔

اسی طرح دورۂ حدیث کے سلسلے میں حضرت کی رائے یہ تھی کہ اس کے لئے ایک سال کا دورانیہ بالکل ناکافی ہے، دوسال ہونے چاہئیں کیونکہ اس کے بغیر فہم حدیث نہیں ہوسکتا، نیز ہر کتاب سے بحث ودرایت کے لئے الگ الگ ابواب منتخب ہونے چاہئیں تاکہ کوئی پہلو تشنہ بھی نہ رہے، اور محض تکرار پر اکتفا بھی نہ ہو، (ایک سال سے دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ دورۂ حدیث میں تمام کتب مکمل پڑھائی جائیں، البتہ درایت و بحث کے لئے الگ الگ ابواب کا انتخاب کیا گیا ہے، خدا کرے کہ یہ تجربہ کامیاب ہو اور اس پر استقامت کے ساتھ اہل مدارس عمل کرسکیں)۔

کئی دہائی قبل دارالعلوم دیوبند کے یوم تاسیس پر سالانہ جشن کی بات آئی، تو حضرت نے دلائل کی روشنی میں پوری قوت سے اس کا رد بھی کیا، اہل انتظام کو توجہ بھی دلائی اور اسے بدعت کا پیش خیمہ بتایا بالآخر یہ بات ختم ہوئی۔

حضرت اپنے ان تلامذہ سے (جو مدارس اور اداروں میں اہتمام وانصرام کے منصب پر فائز ہوتے تھے) یہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ منصب آگ پر چلنے کے مرادف ہے، اگر یہ ہمت اور صلاحیت ہو تو اس پر باقی رہنا چاہئے ورنہ ع اگر خواہی سلامت بر کنار است (اس معنیٰ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا یہ فقرہ معروف ہے کہ منصب اہتمام مقامِ مبغوض ہے)۔

اسی رمضان ۱۴۴۱ھ میں وفات سے چند ایام قبل حضرت نے ''ثریا ستارہ اور کرونا وائرس'' کے حوالے سے جاری ایک بحث میں پوری وضاحت سے اپنا موقف پیش کیا اور ثریا کے طلوع کو کرونا کے خاتمے سے جوڑنے والی فکر کو قوت کے ساتھ رد فرمایا، آپ کا یہ رد اس درجہ مضبوط اور استدلالی تھا کہ مخالفانہ موقف رکھنے والوں کے لئے لمحۂ فکریہ ثابت ہوا بلکہ ایک مخلص اور راسخ العلم شخصیت نے حضرت کے خطاب ورد کی روشنی میں اپنے موقف سے رجوع بھی کیا اور تواضع کا ثبوت دیتے ہوئے رجوع کا اظہار بھی کیا۔

تصویر سازی اور ویڈیو گرافی کے منکر پر حضرت مفتی صاحب اپنی مجالس سے لے کر بڑے بڑے عوامی

اجتماعات میں قوت کے ساتھ نکیر اور اظہار حق کا فرض انجام دیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ایک طرف اہل افتاء اس کے ناجائز ہونے کے فتوے صادر کرتے ہیں، اور دوسری طرف ان کا اور دیگر متعدد اہل علم کا عمل اس کے خلاف سامنے آتا ہے، اس سے دین کی بے وقعتی اور شرعی احکام کی بے توقیری ہوتی ہے، ایسے ماحول میں جب اس حوالے سے بڑے بڑوں کا انداز سکوت کا ہو، اور مصالح پیش نظر ہوں، حضرت اپنی جرأت رندانہ، عزیمتِ عالمانہ اور بصیرت فقیہانہ کا ثبوت دیتے ہوئے بار بار اس منکر کے خلاف اعلان حق کرتے تھے اور دعوتِ فکر وعمل دیتے تھے، گویا ان کا پیغام یہ تھا کہ ؎

کب سے ہوں نغمہ بلب، بزم کے سناٹے میں
کیا سنے ہے کوئی آواز، کوئی جاگے ہے

(۹) دلوں میں اتر جانے والا خطاب

حضرت مفتی صاحب باضابطہ اسٹیج کے آدمی نہیں تھے، ان کا خطاب جذباتی باتوں، شعلہ نوا انداز، تصنعات و تکلفات، آورد اور بناوٹ سے بالکل پاک ہوتا تھا، لب ولہجہ مجلسی ہوتا تھا، آمد ہی آمد کا منظر ہوتا تھا، الفاظ پر شکوہ نہیں ہوتے تھے، انداز پیشہ ورانہ نہیں ہوتا تھا، پھر بھی سامعین کا تاثر یہ ہوتا تھا ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ ان کا امتیاز تھا کہ وہ اپنے خطاب میں موضوع (اور بالعموم موضوع علمی اور خشک ہوتا تھا) سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتے تھے، نہ لطیفے سناتے نہ اشعار پڑھتے، سنجیدہ اسلوب میں باوقار خطاب ہوتا تھا، مگر تاثیر قیامت کی ہوتی تھی، یہ ان کے اخلاص اور پاکیزہ باطنی کا اثر تھا۔

(۱) لب ولہجہ کی انفرادیت

(۲) بات پیش کرنے، موقف ثابت کرنے اور مدعا بیان کرنے کی بے مثال و مستحکم قوت

(۳) علمی مضامین کو سہل ترین انداز میں اور خشک ترین موضوعات کو تر و تازہ اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا خداداد سلیقہ

(۴) ایک مضمون کو ہر بار نئے پیرائے اور پیرہن میں بیان کرنے اور جدت پیدا کرنے کی خاص ادا

(۵) اس پر مستزاد موضوع کے تمام گوشوں کو سمیٹ لینے، حق ادا کرنے اور احاطہ و جامعیت کا ہنر

(۶) لب و لہجے میں اطمینان اور ٹھہراؤ اور عجلت سے گریز، ایک ایک حرف واضح، ایک ایک جملہ نمایاں

(۷) استدلالی رنگ، معقول و منقول دلائل کا اجتماع

(۸) اور ان سب کے ساتھ اجتہادی نہ کہ تقلیدی منفرد انداز و طرز

(۹) مزید برآں ''قلندروں کے طریق'' کے مطابق زبان و دل کی رفاقت، الفاظ دل کی آواز اور ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق

یہ سب حضرت کے خطاب کی خصوصیات تھیں۔

(۱۰) ان کے خطاب میں موضوع پر ارتکاز کے ساتھ سابق خطباء کی جادۂ اعتدال سے منحرف باتوں اور فکروں کا شائستگی کے ساتھ مدلل رد بھی ہوتا تھا، اور اصلاح پر زور بھی، ہر خطاب حق گوئی کا شاہکار ہوتا تھا، اور ہنگامی حالتوں میں تو آپ کے خطاب کا رنگ دو آتشہ ہو جاتا تھا۔

دارالعلوم کے احاطہ میں ہنگامی احوال میں طلبہ کے درمیان ان کا خطاب ''مشتعل جذبات کی تسکین، دماغوں کی تسخیر، خیالات کی تطہیر، افکار کے تزکیہ، دلوں کی تسلی اور کایا پلٹ دینے'' کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔

فقہی، علمی اور کلامی مسائل میں بھی عوام کے درمیان آپ کا خطاب ایسے اسلوب میں ہوتا تھا جو ان کے ذہنوں کو اپیل کرتا تھا اور ان کے دماغوں کو حق پر مطمئن و منشرح کر دیتا تھا، اور ان کا یہ تاثر ہوتا تھا کہ حضرت کی

باتیں گویا ان کے دلوں میں اترتی اور دماغوں میں جاگزیں ہوتی جارہی ہیں، گویا ایک نہر سلسبیل جاری ہوتی تھی جو سامعین کو اپنے ساتھ بہالے جاتی تھی، ان کے یہ خطابات عوام اور عصری تعلیم یافتہ افراد کے دماغوں سے ''شریعت اسلامی، فقہ اسلامی، مسلک دیوبند، تقلید ائمہ وغیرہ'' کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کی گرد بالکل صاف کردیا کرتے تھے اوران میں ''اطمینان وانشراح'' کا تازہ لہو دوڑا دیا کرتے تھے۔

محفل ومجلس کوئی بھی ہو، اگر حضرت موجود ہیں تو وہی جان محفل اور میر مجلس ہوتے تھے، انہیں کا خطاب کلیدی، سب سے اہم اور فیصلہ کن ہوتا تھا، اوراب ان کے جانے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ؎

ساتھ عاجز کے گیا سوزِ سخن، سازِ سخن
پھر کوئی ایسا غزل خواں نہ زمانے سے اٹھا

(۱۰) بے مثال تدریس

حضرت مفتی صاحب کا اصل شغل، موضوع، مذاق ومزاج اور غذا ''درس وتدریس'' تھی، بلاشبہ وہ عبقری اور نابغۂ روزگار علماء اور معلمین میں تھے، دارالعلوم دیوبند کے حلقۂ تدریس میں کئی دہائیوں سے وہی ''ریڑھ کی ہڈی'' کا مقام رکھتے تھے، اور بلا مبالغہ پورے ملک میں علم وتحقیق کے کارواں کے سالار کا مرتبہ انہیں کو حاصل تھا، ان کی رحلت سے تدریس، علم اور تحقیق کی یہ مسند سونی ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ ماتم کناں ہے، مگر حضرت گویا یہ کہہ کر رخصت ہوچکے ع

ڈھونڈوگے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

حضرت جب حیات تھے، مسند درس کی رونق وآبرو تھے، پروانے ان کے گرد ہجوم لگاتے تھے، ان کا فیضان علمی مسلسل جاری رہتا تھا، ان کے سینے سے علوم ومعارف کے موتی خوشہ چینوں کے سینوں اور سفینوں میں فروانی سے منتقل ہوتے تھے، ایک طبقہ اس وقت ان کے علمی اکتسابات اور نتائج تحقیق سے مطمئن نہ تھا، واہموں اور

خدشوں کا شکار تھا (اگر چہ اس طبقے کے اخلاص اور فکر و تڑپ میں شک نہیں کیا جا سکتا) مگر حضرت ناقدین کے نقد کی پرواہ کئے بغیر ؎

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

کے مطابق ''وقت کم ہے اور کام زیادہ'' کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے علمی اور تحقیقی سفر میں اپنے اصل ہدف و منزل کی طرف تیزی سے محوِ خرام رہے، ہاں مگر زبانِ حال سے یہ ضرور کہتے رہے ؎

دلِ پرُغم نہیں ہوں گے، دیدۂ پرُنم نہیں ہوں گے
اندھیرا ہوگا اس محفل میں جس میں ہم نہیں ہوں گے
زمانہ قدر کر، ہاں قدر کر ہم کج کلاہوں کی
کہ پیدا اس نمونے کے جواں ہر دم نہیں ہوں گے

ذکر تھا حضرت کی بے مثال مدرسانہ اور معلمانہ شان کا، وہ ہر فن پر یکساں عبور رکھنے والے بے بدل عالم تھے، ہر فن کے مزاج شناس تھے، ہر فن کے مراجع و مصادر اور مآخذ و اصول پر ان کی گہری نظر تھی، وہ درس نظامی کی تقریباً تمام کتب کا درس دے چکے تھے، نحو و صرف، منطق و فلسفہ، بلاغت و ادب سے لے کر فقہ و حدیث و تفسیر تک کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں انہیں نبوغ و رسوخ کا مقام حاصل نہ ہو، تقریباً ہر فن پر انہوں نے خامہ فرسائی بھی کی ہے، نحو و صرف و منطق و فلسفہ پر انہوں نے درسی انداز کی ''سہل ممتنع'' اسلوب کی حامل نصابی کتب تیار کیں، الفوز الکبیر کا عربی ترجمہ کر کے اصول تفسیر کے موضوع پر خدمت انجام دی، ترمذی و بخاری و حجۃ اللہ و سراجی کی مبسوط شروح تیار کر دیں، تفسیر پر وقیع کام انجام دیا، یہ خدمات ان کے ذوقِ علم و تدریس و تحقیق کی آئینہ دار بلکہ شاہ کار کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔

ان کے درس کا رنگ کیا ہوتا تھا، وہ لکھنے، بیان کرنے اور سننے سے زیادہ دیکھنے اور براہ راست حاضری سے تعلق رکھتا تھا۔

(۱) اللہ نے انہیں گھول کر پلا دینے، پیچیدہ مباحث کی تسہیل اور سنگلاخ مباحث کو پانی کرنے کا بے مثال ملکہ اور ہنر ودیعت فرمایا تھا، مشکل سے مشکل بحث کو وہ انتہائی آسان لفظوں میں اور چٹکیوں میں حل کر دیا کرتے تھے۔

(۲) علمی گہرائی و گیرائی اور عمق و بصیرت ان کی درسی تقریر کے ایک ایک فقرے سے نمایاں ہوتی تھی۔

(۳) متعلقہ موضوع کی جامعیت اور احاطہ و استیعاب ان کا خاص مزاج تھا۔

(۴) ان کا درس اعتدال کا نمونہ ہوتا تھا، پورے سال یکساں انداز، وہ اطناب وتطویل کے قائل نہیں تھے، اور بہت اختصار وایجاز کو بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے، میانہ روی کا رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا، وہ موضوع کا پورا حق ادا کرتے تھے، کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے تھے، انہیں سمندر کو کوزے میں سمیٹنے کا ہنر آتا تھا، اور اس ہنر کو وہ درس میں کامیابی سے آزماتے تھے۔

(۵) ان کا درس روایت ودرایت اور عقل ونقل کے امتزاج واجتماع کی خوب صورت مثال ہوتا تھا۔

(٦) موضوع پر ارتکاز، انحصار اور اِدھر اُدھر نہ بھاگنا ان کی خاص شناخت تھی۔

(۷) دوران درس ان کی گفتگو انتہائی مرتب ومدلل ہوتی تھی۔

(۸) وہ پوری تیاری اور مطالعے اور قابو یابی کے بعد ہی سبق پڑھاتے تھے، رواروی اور بوجھ اتار پھینکنے کو وہ خیانت باور کرتے تھے۔

(۹) ان کے درس میں مخاطب کی ترکیز سو فیصد ان کی طرف ہی ہوتی تھی، یہ ان کا ساحرانہ کمال تھا، طلبہ کے دل ان کی طرف کھنچتے تھے، سماعتیں ان کی صدائے دل نواز کی عاشق رہتی تھیں، اور بصارتیں ان کے سراپا کے دیدار کی آرزو مند رہتی تھیں، ان کے اسباق میں طلبہ کی توجہ وسکون کا حال "كَأَنَّ عَلَى رُؤُوسِهِمُ الطَّيْرَ" (گویا ان کے سروں پر پرندے ہوں) کی منظر کشی کرتا تھا۔

(۱۰) ان کے درس میں گویا علم کی بارش ہوتی تھی، نفیس افادات، نایاب نکتے، علمی جواہر، بیش قیمت فوائد اور

دلوں کی کھڑکیاں کھول دینے اور دماغوں کے دریچے وا کردینے والے حقائق ومعارف، کیا کچھ نہ ہوتا تھا، اسی لئے تو وہ ’’درس وتدریس‘‘ کی سلطنت کے بے تاج بادشاہ کا مقام رکھتے تھے۔

(۱۱) ان کے درس کی سب سے منفرد ادا ان کا دل نشیں، مؤثر ترین اور بے نظیر انداز تفہیم تھا، وہ جس لہجے میں بات کہتے تھے، جس انداز سے موضوع پیش کرتے تھے اور جس اسلوب میں بحث کرتے تھے وہ بالکل جداگانہ ہوتا تھا، درس میں اول سے آخر تک ان کے دل نشیں انداز واسلوب کی شگفتگی باقی رہتی تھی، اور یہی رنگ نمایاں رہتا تھا، ہر ہر بات نہاں خانۂ دل میں اترتی اور دماغ میں محفوظ ہوتی چلی جاتی تھی۔

(۱۲) دوران درس مختلف مسائل میں اپنی رائے پیش کرنے مزاج بھی تھا، ان کے یہ تفردات (جنہیں قبول کرنے کا پابند کسی کو نہیں بناتے تھے، بلکہ طلبہ کو معروف اور اجتماعی رائے اور مسلک کا پابند رہنے کی تلقین کرتے تھے، اور یہ ان کے اخلاص کا بین ثبوت بھی تھا) اگرچہ دیگر اہل علم کے ہاں قابل قبول نہ بھی ہوں، ان کے علمی مقام بلند، وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق وتدقیق اور وفورِ علم کے لوازم میں سے ہیں، اور ان تفرادات پر بے جا نقد کرنے اور اپنا عدمِ اتفاق ظاہر کرنے کے بجائے انہیں اس تناظر میں دیکھا جانا چاہئے کہ علمی سفر میں کتنی صعوبت آزما گھاٹیاں عبور کرنے اور کتنی ریاضتوں کے بعد حضرت کو یہ مقام ملا ہوگا، ’’تفرداتِ علمی‘‘ باعثِ تنقید ہونے کے بجائے باعثِ تحقیق اور دعوتِ مطالعہ وجہدِ مسلسل ہونے چاہئیں۔

حضرت کے معاصرین تو ہم سب کے بڑے ہیں، ان کا مقام بہت اونچا ہے، مگر ہم خردوں کو اپنی سمتِ سفر درست رکھنے کے لئے ’’علمی تفردات‘‘ پر چیں بہ جبیں ہونے اور بے اطمینانی کا اظہار کرنے کے بجائے ان کے بین السطور میں مضمر ’’محنت اور مسلسل محنت‘‘ کے زندہ وتازہ پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

حضرت کے دروس اب صرف یادگار رہ گئے ہیں، جن کو ان سے تلمذ کی سعادت میسر نہیں آئی، ان کو تو ان دروس کا اصل رنگ دکھایا اور بتایا ہی نہیں جاسکتا، مگر جن کو تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور جن کی سماعتیں حضرت کے

دروس کی آوازوں سے شادکام ہوتی رہیں یقیناً ان سب کا حضرت کے بارے میں یہی تأثر ہوگا کہ ؎

مسلسل یاد آئیں گے، پیہم یاد آئیں گے
کوئی موسم رہے، بے قیدِ موسم یاد آئیں گے

(۱۱) جہد مسلسل اور انضباط اوقات

حضرت مفتی صاحب کی علمی عظمتوں کا اصل راز آپ کی ’’جہد مسلسل‘‘ اور انضباط اوقات کی خصوصیات ہیں، ان کی زندگی متواتر محنت، مسلسل ریاضت، مستقل کوشش اور تعب نا آشنا ذوقِ مطالعہ کے حوالے سے اسوہ ونمونہ ہے، انہوں نے دور طالب علمی سے لے کر تا دمِ زیست علمی اشتغال کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، انہیں محفل پسندی، عیش کوشی، تن آسانی اور کام چوری سے کبھی مناسبت ہی نہیں رہی، انہوں نے محنت اور جفاکشی میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی، کام اور صرف کام ان کا شعار رہا، دوران طالب علمی ’’افتاء‘‘ کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے اپنے ذوق اور محنت سے خود مکمل قرآن حفظ کیا، ان کا شوق مطالعہ اور کتابوں سے عشق ’’وَخَيْرُ جَلِيْسٍ فِي الزَّمَانِ كِتَابٌ‘‘ (زمانے میں سب سے بہتر ساتھی کتاب ہے) کی یاد تازہ کرتا تھا، عربی شاعر کے شعر ؎

بِقَدْرِ الْكَدِّ تُكْتَسَبُ الْمَعَالِيْ
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلَىٰ سَهِرَ اللَّيَالِيْ

(محنت کے تناسب سے ہی عظمت ملتی ہے، عظمتوں کا طالب راتوں کو جاگتا اور محنت کرتا ہے) کے مطابق ان کی کاوش پیہم ہی ان کی عظمت ورفعت کا بنیادی سبب تھی۔

قرآن مجید کی آیت ’’وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا‘‘ (جب انہوں نے صبر سے کام لیا تب ہم نے ان کو پیشوا بنایا) سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کامل اور جہد مسلسل سے ہی پیشوائی اور امامت وسیادت کا مقام ملتا ہے، اسی لئے ’’قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوْا‘‘ (مقام سیادت ملنے سے پہلے بھی) اور ’’بَعْدَ أَنْ تُسَوَّدُوْا‘‘ (مقام سیادت ملنے کے بعد بھی) مستقل محنت وعلمی ریاضت کی تاکید آئی ہے۔ (بخاری: العلم)

حضرت نے مشکل حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہوئے صبر و جہد کی خو کبھی نہیں بدلی، ان کا یہ رنگ طالب علمی کے دور میں بھی رہا، مدرسی کے زمانے میں بھی رہا، شیخ الحدیث بننے کے بعد بھی رہا، وہ کسی مرحلۂ حیات میں محنت و مطالعہ سے غافل نہیں ہوئے، اور اسی وصف نے انہیں علمی سیادت و امامت کا یہ مقام بخشا کہ وہ ام المدارس کے صدر المدرسین بھی ہوئے، شیخ الحدیث بھی بنے، علماء کے لئے مرجع و مرکز بھی بنے، قافلۂ علم کے میر و سالار بھی بنے، علماء کے لئے وقار اور شان بھی ثابت ہوئے، ہر طرف ان کا طوطی بولتا رہا، اور ہر جانب ان کا ڈنکا بجا، علامہ زمخشری کا یہ شعر حضرت کی علمی ریاضتوں کے حسب حال ہے اور ان پر پوری طرح راست آتا ہے ؎

سَھَرِیْ لِتَنْقِیْحِ الْعُلُوْمِ أَلَذُّ لِیْ
مِنْ وَصْلِ غَانِیَۃٍ وَطِیْبِ عِنَاقٍ

(کسی علمی مسئلہ کی تحقیق اور عقدہ کشائی کے لئے پوری رات جاگنا مجھے دنیا کی تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہے)

اور پھر زمخشری کی زبان ہی میں حضرت کا یہ پیغام ہم جیسے کوتاہ علم و عمل خردوں کے نام ہے ؎

أَ أَبِیْتُ سَھْرَانَ الدُّجیٰ وَتَبِیْتُہٗ
نَوْمًا وَتَبْغِیْ بَعْدَ ذَاکَ لِحَاقِیْ

(میں رات بھر جاگتا رہوں اور تم رات بھر سوتے رہو، اور پھر تم چاہو کہ تم کو میرا مقام مل جائے، ایسا نہیں ہوسکتا)

حضرت مفتی صاحب نے انضباط اوقات، حفظ اوقات، اصول کی پابندی اور متواتر محنت، شبانہ روز مطالعہ و تحقیق اور علمی اشتغال بلکہ علمی انہماک و اعتکاف کی برکات سے عظمت کا مقام بلند حاصل کیا تھا، ان کی سیرت کا یہ گوشہ ان کے اخلاف و تلامذہ کے لئے بہت نصیحت آموز اور فکر انگیز ہے اور یہ سبق دیتا ہے کہ راہِ علم کے مسافروں کو یہ مرحلے سر کئے بغیر منزل نہیں ملا کرتی، اور عمل پیہم اور جہد مسلسل کے بنا رفعت اور سیادت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر

نہیں ہوسکتا۔

حضرت کے ساتھ راقم کا رشتۂ عقیدت

ان سطور کے حقیر راقم کا حضرت مفتی صاحب سے دیرینہ عقیدت ومحبت کا اٹوٹ رشتہ تھا، میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ حضرت مفتی صاحب سے سینئر تھے، حضرت مفتی صاحب کا سن فراغت ۱۹۶۲ء ہے اور حضرت والد صاحب کی فراغت ۱۹۵۶ء میں ہوئی ہے، اس کے باوجود دونوں میں محبت اور ایک دوسرے کی خدمات کے اعتراف کا جذبہ ہم خردوں کے لئے مشعلِ راہ تھا، حضرت مفتی صاحب نے بارہا میرے سامنے بھی اور غائبانے میں بھی حضرت والد صاحب کا ذکر خیر بلند الفاظ میں فرمایا، حضرت والد صاحب کے دور اہتمام میں جامعہ عربیہ یہ مرادآباد کو ظاہری ومعنوی جو نمایاں ترقیات حاصل ہوئیں اور بطور خاص شہر سے متصل وسیع قطعۂ اراضی کا حصول اور اس پر تعمیر کا جو کام انجام پایا، حضرت مفتی صاحب اسے بڑی وقعت کی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے اور تحسین بھی فرماتے تھے۔

دار العلوم الاسلامیہ بستی کا قیام اور اس کا قابل رشک وتقلید نظام ونصاب ومعیار تعلیم اور ہر چہار جانب سے اس کے لئے داد وآفریں کا لامتناہی سلسلہ، بلاشبہ حضرت والد صاحب کی شبانہ روز جہد مسلسل، سوز دروں، خلوص باطن اور اکابر کی دعاؤں کا فیض اور ان کے حق میں صدقۂ جاریہ ہے، اس خدمت، خدمت گاہ اور خادم کے سچے قدردانوں میں بہت نمایاں نام حضرت مفتی صاحب کا تھا، مجالس میں (خواہ عصر کے بعد کی ہوں، یا اندرون دار العلوم تعلیمی امور سے متعلق غور وخوض اور مشورے کی) حضرت مفتی صاحب ''دار العلوم بستی'' اور حضرت والد صاحب کی کھلے دل سے برملا توصیف وتحسین تو کرتے ہی تھے، اور عملی تحسین کا انداز یہ تھا کہ اپنے ایک صاحبزادے کی تعلیم کے لئے دار العلوم بستی کا انتخاب کیا اور انہیں وہاں کچھ عرصہ کے لئے بھیجا۔

احقر نے کئی بار کوشش کی کہ حضرت کا دار العلوم بستی کا سفر ہوجائے مگر ہر بار نظام طے ہونے کے بعد یا ہوتے ہوتے کوئی رکاوٹ آجاتی

تھی، یہ سفر نہ ہوسکا، وَ کَانَ أَمْرُ اللّٰہِ قَدَراً مَقْدُوْراً۔

احقر کے برادر گرامی حضرت مولانا محمد اسعد قاسمی صاحب دامت برکاتہم (جو دارالعلوم بستی کے ناظم اعلیٰ ہونے کے ساتھ وہاں کے تعلیمی امور کے بھی سربراہِ اعلیٰ اور وہاں کے ترجمان ''دوماہی فکر اسلامی'' کے مدیر عالی قدر بھی ہیں) حضرت مفتی صاحب کے تلامذہ میں ہیں، انہوں نے حضرت سے موطأ کا درس لیا ہے، اور غالباً یہ سال حضرت مفتی صاحب کے دورۂ حدیث میں تدریس کے آغاز کا سال تھا، حضرت مفتی صاحب سے ان کا گہرا عقیدت کا تعلق تھا اور حضرت بھی تقریباً ہر ملاقات میں ان کی خیریت دریافت کرتے اور حسنِ تعلق کا اظہار فرماتے تھے۔

میرے برادر زادے عزیزم مولانا مفتی محمد احمد قاسمی ندوی استاذ دارالعلوم الاسلامیہ بستی نے بھی حضرت سے تلمذ وعقیدت کا شرف پایا، اس طرح دیکھا جائے کہ اس حقیر کے خانوادے کا تین پشتوں سے حضرت مفتی صاحب سے تعلق استوار رہا، حضرت والد صاحب کئی سال مقدم اور سینئر معاصرین میں ہیں، برادر گرامی اور اس حقیر کو اور پھر برادر زادۂ عزیز کو حضرت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت میسر آئی۔

دردِ فراق

یوں تو حضرت کے جانے پر پورے کاروانِ علم نے اجتماعی یتیمی کی ٹیس محسوس کی مگر اس حقیر کے لئے قدیم، عقید تمندانہ اور اٹوٹ تعلق اور رشتۂ محبت کی بنا پر حضرت کا سانحہ وفات بے انتہا صاعقہ اثر ثابت ہوا، جس صبح کو یہ آفتاب علم وفضل غروب ہوا، اس سے پہلے کی رات شدید علالت کی خبروں کی وجہ سے بے قراری اور کروٹ بدلنے اور مسلسل دعا میں گزری، حضرت نے مسافرت اور غریب الدیاری میں وطن سے دور لاک ڈاؤن کے ماحول میں ''مہتاب سے تابندہ تر زندگی'' گزار کر صبح کے تاروں سے بھی خوب تر سفر آخرت شروع کیا، اللہ نے انہیں ایسے وقت اپنے دربار میں بلایا جب رمضان کا مقدس موسم بہار سایہ فگن تھا، عشرۂ اخیر کی رونقیں سب کو شاداب کر رہی

تھیں، رحمت کے انوار برس رہے تھے اور کرم نوازیاں عروج پر تھیں، اور ایسے ماحول میں بلایا جب پورا ملک بند تھا، نقل وحرکت پر پابندی تھی، گنتی کے چند لوگ آخری آرام گاہ تک پہونچانے میں شریک ہوسکے، ان کا مزاج ہنگاموں سے نفور رہتا تھا، گویا اس سفر میں بھی منجانب اللہ ان کے اسی مزاج کی رعایت رکھی گئی ہو۔

ہم جیسے نہ جانے کتنے عقیدت مندان کی رحلت پر غمزدہ اور مزید برآں آخری مرحلے میں شرکت کی سعادت نہ مل سکنے پر دل مسوس کررہ گئے، اور آج ایک ماہ سے زائد کی مدت گزر جانے کے بعد بھی قبر پر حاضر ہوکر دعا کی صورت عقیدت کی سوغات پیش کرنے کی راہیں مسدود ہیں، دل چاہتا ہے کہ عقیدت ومحبت کے پروں سے پرواز کرتے ہوئے ممبئی کے اس گورستان تک حاضری دوں جسے حضرت کی آخری آرام گاہ بننے کا شرف میسر آیا اور وہاں پہونچ کر آنسوؤں اور دعاؤں کا نذرانہ پیش کرکے پہلے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

اور پھر شاعر کی زبان میں خاکِ قبر کو مخاطب کرکے یوں گویا ہوں ؎

اے خاکِ تیرہ: دلبرِ ما را نگاہ دار
ایں نورِ چشم ماست کہ در بر گرفتہ ای

اور پھر یہ کہتے ہوئے بادیدۂ نم اور بادل پُرغم رخصت ہوں ؎

تری لحد پہ خدا کی رحمت
تری لحد کو سلام پہونچے

غَفَرَ اللّٰہُ لَهُ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ شَآبِيْبَ رَحْمَتِهِ وَأَسْكَنَهُ جَنَّاتِهِ الْعُلٰى وَنَعِيْمَهُ الْمُقِيْمَ۔

❁...❁...❁

نایاب ہیں ہم

بیاد: استاذ الاساتذہ، محدثِ کبیر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نور اللہ مرقدہ
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیو بند
(ولادت ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۲ء، وفات: ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۰۲۰ء)

حضرت مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب
استاذ حدیث وفقہ جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد

رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی ۲۵ رتاریخ اور ۱۹ رمئی ۲۰۲۰ء منگل کا دن ہمارے لئے اور ہم جیسے ہزاروں افراد کے لئے بہت صدمہ اور افسوس کا دن تھا، جب صبح اشراق کے وقت ہمارے محبوب و مشفق اور مہربان استاد گرامی قدر، فکر ولی اللہ کے ترجمان علوم نانوتوی کے امین، دار العلوم دیو بند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین، محدث کبیر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ تعالی ممبئی کے ایک اسپتال میں اپنے خالق و مالک کے دربار میں بصد عجز و نیاز حاضر ہو گئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جو بھی دنیا میں آیا ہے، اسے بہر حال یہاں سے جانا ہے لیکن بعض حضرات کا جانا دیر تک محسوس کیا جاتا ہے، اور ان کی یادیں سالہا سال ذہن و دماغ میں رچی اور بسی رہتی ہیں، اور انکے خلا کو بہت زیادہ محسوس کیا جاتا ہے، بالخصوص کسی عالم ربانی کا دنیا سے اٹھ جانا ایسا نقصان ہے جس کی تلافی قیامت تک نہیں ہوسکتی۔ امیر المؤمنین، خلیفۂ رابع سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالی وجہ کا مقولہ ہے: **إِذَا مَاتَ الْعَالِمُ اِنْثَلَمَ فِيْ الْإِسْلَامِ ثَلْمَةً لَايَسُدَّهَا شَيْءٌ إِلىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ** (کشف الخفاء للعجلوني ۱/ ۸۷ وله شواهد) (یعنی جب کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو اسلام

میں ایسا خلا ہو جاتا ہے، جسے قیامت تک کوئی چیز نہیں پر کر سکتی) وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر عالم کی ایک امتیازی شان ہوتی ہے جو اسکے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے۔ دیکھنے میں بظاہر سب کام جاری رہتے ہیں لیکن قدم قدم پر جانے والے کی کمی کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے۔

ایسے ہی نایاب علماء ربانین میں حضرت الاستاذ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی شمار ہے۔ آپ نے قمری اعتبار سے ۸۰ رسال اور شمسی اعتبار سے ۷۸ رسال کی عمر پائی، اور نصف صدی تک دارالعلوم دیوبند کی مسند ِتدریس پر فائز رہ کر ہزار ہا ہزار تشنگانِ علوم نبوت کو جی بھر کر سیراب فرمایا، اور نہ صرف یہ کہ تدریس؛ بلکہ بیش قیمت نہایت مفید اور نافع تصانیف اور شروحات لکھ کر امت پر احسان فرمایا۔ اس اعتبار سے آپ کی ذات عالی زندہ جاوید بنی رہے گی، ان شاء اللہ تعالی۔

سرور عالم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے **(اذا مات الانسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: الا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له)** (صحیح مسلم ۲/۴۱) (یعنی جب انسان دنیا سے چلا جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے لیکن تین چیزیں ایسی ہیں جن کا اجر وثواب بعد میں بھی جاری رہتا ہے: (۱) صدقہ جاریہ (۲) علم نافع (۳) دعاء خیر کرنے والی نیک اولاد)

اللہ تبارک وتعالی نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان تینوں سعادتوں سے بہرہ ور فرمایا تھا، صدقہ جاریہ کے ساتھ ساتھ علم نافع اور صالح اولاد (جو سب ماشاء اللہ قرآن کریم اور علم دین سے وابستہ ہیں) آپ کے لئے اجر وثواب میں اضافے اور آخرت میں رفع درجات کا ذریعہ بنتی رہیں گی۔

نبی اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ: "اُذْكُرُوا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ" ------ الخ (سنن ابی داؤد رقم: ۴۹۰۰) (یعنی اپنے مرحومین کی خوبیوں کو اجاگر کیا کرو) خاص طور پر ایسے حضرات جن کی زندگی بعد والوں کے لئے مشعل راہ اور بہترین نمونہ ہو، ان کی قابل تقلید باتوں کو سامنے لانا بجائے خود بہت نفع کی بات ہے۔ اس

لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی چند نمایاں صفات کو اختصار کے ساتھ عرض کریں تاکہ ہمارے اندر بھی انکو اپنانے کا جذبہ پیدا ہوسکے:

(۱) اوقات کی حفاظت:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا بہت ہی قیمتی اور روشن پہلو یہ ہے کہ آپ نے اپنی عمر عزیز کو بالکل ضائع نہیں ہونے دیا، اور ایسے مشاغل ومصروفیات سے اپنے کو دور رکھا جن کی وجہ سے آپ کے علمی سفر میں کوئی خلل پڑ سکتا تھا۔ جن حضرات نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے، وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ طبعی تقاضوں اور دنیوی ضروریات کے علاوہ آپ کی چوبیس گھنٹے کی پوری زندگی کسی نہ کسی خیر اور فائدے کے کام ہی میں گذرتی تھی۔

مدرسہ کا وقت: تدریس یا بوقت ضرورت تعلیمی وانتظامی مشوروں میں گذرتا، جب کہ گھر میں درس کی تیاری، مطالعہ یا تصنیف وتالیف میں دیر رات تک مشغول رہا کرتے تھے۔ درمیان میں اگر وقت ملتا تو گھر کے بچوں کو بھی چھوٹی بڑی کتابیں خود ہی پڑھا دیا کرتے تھے۔ الغرض آپ نے پورا ماحول اس طرح کا بنا رکھا تھا کہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ فضول ضائع نہ ہو، اس کی برکات تھیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان کاموں کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی، جن کی تیاری کے لئے پوری پوری اکیڈمی کی ضرورت پڑتی ہے۔

حضرت الاستاذ کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جو شخص بھی اپنے مقصد زندگی کو متعین کرکے نظام الاوقات بنا کر یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ محنت میں لگے گا، وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اوقات اور خداداد صلاحیتوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

(۲) ٹھوس استعداد:

حضرت مفتی صاحب کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے استعداد کی پختگی اور قابل رشک علمی گیرائی سے بھی سرفراز فرمایا

تھا۔نحووصرف سے لے کر فقہ وحدیث اور تفسیر تک تمام علوم پر آپ کی نظر تھی، اور برموقع حسب ضرورت ان باتوں کو مرتب کرنے کا سلیقہ بھی آپ کو عطا ہوا تھا۔

اورظاہر ہے کہ عالم اسباب میں یہ علمی رسوخ اچانک حاصل نہیں ہوجاتا؛ بلکہ اس کے لئے شروع سے ہی محنت اور جدوجہد ضروری ہوتی ہے۔آپ کی استعداد کیسے بنی؟ اس کا تذکرہ فرماتے ہوئے مدرسہ شاہی مرادآباد کے اجلاس دستاربندی (منعقدہ: ۴ جون ۲۰۱۳ء بروز منگل) میں خطاب کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:

”مدرسہ میں محض پڑھنے سے علم نہیں آتا، آپ کہیں گے کہ ہم تو پڑھ رہے ہیں؟ امتحان دے رہے ہیں؟ تو بات یہ ہے کہ پڑھنا دوطرح سے ہوتا ہے۔ ایک پڑھنا ہے اپنے لئے اور ایک پڑھنا ہے ابا کے لئے، ابا کے لئے پڑھنے سے علم نہیں آئے گا۔“

میں نے چہارم تک ابا کے لئے پڑھا، شرح جامی میں میں نے سہارنپور مظاہر علوم میں داخلہ لیا، چناں چہ سہارنپور کی کوئی گلی ایسی نہیں ہے جس میں میں نے سائیکل نہیں چلائی ہو، اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے ”ٹائی فائڈ“ ہوگیا، ٹیلی گرام کیا گیا، ابا لینے کے لئے آئے اور مجھے گھر لے گئے، یہ یاد رہنا چاہئے کہ میں انتہائی غریب گھر کا تھا، میں نے سنا کہ اپنی والدہ سے میرے بارے میں باتیں کررہے تھے کہ مجھے اس لڑکے کو اب نہیں پڑھانا ہے؛ کیوں کہ یہ بیمار ہوا اس پر اتنا خرچ ہوا، میں لینے گیا، اب یہ واپس جائے گا، اوراس پر اس قدر خرچ ہوگا، اس نے پڑھا تو کچھ نہیں، میری دادی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا، میں یہ سب باتیں سن رہا تھا، مجھے احساس ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے پڑھنا ہے، مجھے پوری رات نیند نہیں آئی، میں صبح کو والدہ کے پاس آیا اور میں نے کہا میرا سامان تیار کرو اور مدرسہ آگیا۔اس دن سے آج تک میں ۲۷ سال کا ہوگیا ہوں، میں اپنے لئے پڑھ رہا ہوں۔(ندائے شاہی جولائی ۲۰۱۳ء)

اس خطاب سے آپ کے عزم وہمت اور تادم آخر طلب علم میں حوصلہ مندی کا پتہ چلتا ہے، جو ہم سب

کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

علاوہ ازیں آپ نے حالات زمان کو پیش نظر رکھتے ہوئے بقدر ضرورت گجراتی اور انگریزی زبان بھی سیکھی، اور اپنے تلامذہ کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہے۔ مدرسہ شاہی کے اجلاس دستار بندی (منعقدہ: نومبر ۲۰۰۳ء) میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

میں نے بچپن میں گجراتی زبان بالکل نہیں پڑھی تھی، اور میرا گجرات میں رہنے کا ارادہ بھی نہیں تھا؛ لیکن قسمت نے مجھے راندیر (گجرات) ہی پہنچادیا، تو میں نے سوچا کہ اب زندگی بھر گجرات میں رہنا ہے تو دین کا کام کرنے کے لئے گجراتی پڑھنا ضروری ہے، چناں چہ میں نے راندیر میں مدرسی کے دوران ایک غیر مسلم ماسٹر سے ڈبل اُجرت دے کر باقاعدہ گجراتی سیکھی اور اس قدر سیکھی کہ میں نے پانچ کتابیں گجراتی زبان میں تصنیف کیں، جو اب بھی موجود ہیں اور چھپی ہوئی ہیں۔

پھر مجھے خیال آیا کہ انگریزی بھی پڑھنی چاہئے، اسکے بغیر دنیا میں کام نہیں چل سکتا، چناں چہ میرا ایک طالب علم جو ساؤتھ افریقہ کا رہنے والا اور اچھا انگریزی تعلیم یافتہ تھا، تو میں نے اس سے کہا کہ "احمد! تم مجھے انگریزی پڑھاؤ"۔ چناں چہ میں اسے ہدایہ اولین پڑھاتا تھا، اور وہ مجھے عصر کے بعد انگریزی پڑھایا کرتا تھا۔ اور میں نے اس سے اتنی انگریزی پڑھی کہ میرے اندر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ میں ڈگری حاصل کرنے کے لئے علیگڑھ میں امتحان دوں، اگر چہ بعد میں عین وقت پر یہ ارادہ ترک کر دیا، اس خطرہ سے کہ کہیں یہ ڈگریاں راستہ بدلنے کا ذریعہ نہ بن جائیں لیکن الحمدللہ آج میں انگریزی زبان میں اپنی ضرورتیں پوری کرنے پر قادر ہوں۔ تو اگر ہم سب یہی طریقہ اختیار کریں کہ جو بھی کمی اپنے اندر پائیں اسے دور کرنے کی کوشش کریں تو اعتراض کرنے والوں کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملے۔ (ندائے شاہی دسمبر ۲۰۰۳)

حضرت کے اس طرز عمل میں بھی بعد والوں کے لئے بہترین رہنمائی موجود ہے۔

(۳) بے مثال انداز تفہیم:

حضرت الاستاذ کی وہ امتیازی صفت جسکا لوہا مانا گیا اور تسلیم کیا گیا، وہ آپ کا بے نظیر انداز تفہیم وتدریس تھا، اسی بنا پر آپ کو طلبہ کے درمیان انتہائی محبوبیت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ آپکا درس بلاشبہ ایک شاہکار درس کی حیثیت رکھتا تھا۔

اللہ تعالی کی توفیق سے ہمیں ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۷ء میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے درس ترمذی شریف طحاوی شریف میں شرکت کی سعادت ملی، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دور علمی اعتبار سے حضرت والا کے عروج کا دور تھا، صحت وقوت بھی قابل رشک تھی، درس کی پابندی بھی مثالی تھی، اگر پورے سال کا حساب لگایا جائے تو شاید ہی دو ایک روز ایسے ہوں گے جن میں آپ کسی عذر کی وجہ سے درس کے لئے تشریف نہ لائے ہوں، ورنہ روزانہ بلا ناغہ اور بلا تکان دو ڈھائی گھنٹے انتہائی نفع بخش اور عالمانہ شان والا درس ہوتا تھا۔ بڑی سے بڑی گنجلک بحثوں کو آسان سے آسان تر کر کے گویا کہ سامعین کو گھول کر پلا دینے کا فن اللہ تعالی نے آپکو عطا فرمایا تھا۔ اسی لئے ادنی سے ادنی طالب علم کو آپ کے درس سے انتہائی دلچسپی ہوتی تھی، آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہی دارالحدیث طلبہ سے بھر جاتی، اور جو کچھ دیر میں آتا اسے دروازوں پر ہی جگہ ملتی تھی۔

درس میں آپ کا طرز گفتگو ایسا دل موہ لینے والا ہوتا تھا کہ شروع سے آخر تک ہر شخص ہمہ تن گوش رہتا، پوری درس گاہ میں سناٹا چھایا رہتا۔ ائمہ مجتہدین کے کامل احترام کے ساتھ ساتھ انکے مابین اختلافی مسائل کی ایسی وضاحت فرماتے کہ بات دل میں اترتی چلی جاتی، اور شروع کتاب سے لے کر اخیر تک علوم ومعارف کا ایسا فیضان ہوتا کہ ہر نکتہ پر طبعیت عش عش کر اٹھتی۔ حدیث کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اہم مباحث کو بھی ایسے دلچسپ انداز میں پیش فرماتے کہ ساری بحث بسہولت ذہن نشیں ہوجاتی۔ انہیں امتیازات کی وجہ سے آپکا درس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا تھا، اور کوئی طالب علم بھی اسکا ناغہ پسند نہیں کرتا تھا۔ اکثر طلبہ آپ

کے درس کو با آسانی کاپی میں نوٹ کرتے، اور علمی جواہر پاروں کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

آپ کے یہاں حدیث کی عبارت پڑھنے والے طلبہ بھی شروع سال ہی میں منتخب ہوجاتے تھے، جو اعراب اور تلفظ کے ساتھ حدیث کی قرأت کرتے اور ساتھ میں آپ کے مزاج شناس بھی ہوتے کہ کب پڑھنا ہے اور کہاں رکنا ہے؟

(۴) نافعیت:

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالی نے اپنی ذات کو خلق خدا بالخصوص طالبان علوم نبوت اور علماء کے لئے نافع بنانے پر بھی مسلسل کوشش فرمائی۔ درس وتدریس کا نفع تو ظاہر ہے، اس کے علاوہ آپ نے جو گراں قدر تصنیفات اور شروحات مرتب فرمائیں، جن سے طلبہ اور اساتذہ بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں، وہ ضرور آپ کے حسنات میں بے حد اضافے کا ذریعہ اور سبب بنتی رہیں گی۔

یوں تو آپ نے چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں مرتب فرمائیں؛ لیکن ان میں ”حجۃ اللہ البالغہ“ کی ضخیم اردو شرح ”رحمۃ اللہ الواسعہ“ (۵ر جلدیں) کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ حضرات اہل علم واقف ہیں کہ یہ کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) اعلی ترین علمی وفکری مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عوام تو کجا؟ بڑے بڑے علماء کی گرفت سے بھی باہر سمجھی گئی ہے، اور ہما شا کو تو اس سے کما حقہ فائدہ اٹھانے کا حوصلہ بھی نہ تھا، اور چوں کہ اس کے مضامین عموماً اس طرح کے ہیں کہ انہیں حل کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ کتاب بھی دستیاب نہ تھی، اس لئے آج تک کسی نے اس کی شرح کرنے کی بھی ہمت نہ کی تھی مگر یہ عظیم سعادت اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے مقدر فرما رکھی تھی کہ آں موصوفؒ نے اپنے اعلیٰ حکیمانہ علمی ذوق کا مظاہرہ فرماتے ہوئے نہایت جانفشانی کے ساتھ اس عظیم اور بے نظیر خدمت کا بیڑا اٹھایا، اور صرف ۵ سال کے عرصے میں بڑی تختی کی ۵ ضخیم جلدوں اور ۳۶۰۰ر صفحات میں اس شرح کو مکمل فرمایا۔

بلا شبہ یہ دور حاضر کا عظیم ترین علمی کارنامہ ہے، اور فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کی شاہکار خدمات میں سے ایک ہے۔ حضرت موصوف نے علوم ولی اللّٰہی کی تسہیل وتشریح فرما کر علماءِ حق پر ناقابل فراموش احسان فرمایا ہے، جسے برابر یاد رکھا جائے گا۔ اس عقلیت پسندی کے دور میں ایسی کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ نت نئے پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا بہتر انداز میں جواب دینے کی صلاحیت پیدا ہوسکے۔

اسی طرح آپ کی تفسیر ہدایت القرآن بھی عظیم کارنامہ ہے، جس میں بہت دلنشیں انداز میں قرآنی مضامین کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں بخاری شریف اور ترمذی شریف کے آپ کے درسی افادات، جنہیں آپ کی نگرانی اور سرپرستی میں آپ کے صاحبزادے جناب مولانا حسین احمد صاحب پالن پوری زیدعلمہ نے بالترتیب "تحفۃ القاری" (۱۱ جلدیں) اور "تحفۃ الالمعی" (۸ رجلدیں) کے نام سے مرتب فرمایا، وہ بھی بڑی گراں قدر خدمت ہے، جس سے طلبہ اور اساتذہ بھرپور فائدہ اٹھارہے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالی آپ کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائیں، آمین۔

(۵) عالمانہ وقار:

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے پوری زندگی مکمل عالمانہ شان کے ساتھ گذاری، اور جو علم اللہ تعالی نے آپ کے سینے میں ودیعت فرمایا تھا، اس کی پوری لاج رکھی۔ ایک واقعی عالم کی زندگی جیسی ہونی چاہئے، اس کا نمونہ آپ کی حیات میں ہمیں نظر آتا تھا۔ کئی سال ہم لوگ حضرت کے مکان کے قریب دیوبند کے محلہ "بیرون کوٹلہ" میں مقیم رہے، اور ایک ہی مسجد میں حضرت کے ساتھ نماز پڑھنے کی سعادت میسر آئی، اس وقت حضرت اپنے دولت خانے سے پیدل دارالعلوم تشریف لے جاتے تھے، اکثر سر پر عمامہ اور اس پر سفید رومال، جھکی ہوئی نظریں اور جو بھی سامنے نظر آئے اس کو سلام کی ابتدا: یہ آپ کا خاص وصف تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ کسی دوسرے کو آپ سے سلام میں سبقت کا موقع ملے۔ اللہ تعالی نے آپ کو خاص رعب بھی عطا فرمایا تھا، ہر ایک کو آپ سے بات

کرنے کی بھی جلدی سے ہمت نہ ہوتی تھی، ہر روز عصر کے بعد آپ کی عام مجلس ہوتی، جس میں صرف علمی گفتگو اور نصیحت کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔

اکثر آپ طلبہ کو نصیحت فرماتے ہوئے اپنے استاد گرامی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ علیہ کی ہدایات کا خاص طور پر ذکر فرماتے تھے۔ایک موقع پر فرمایا کہ:

"میں جب پڑھانے کے لئے راندیر جانے لگا تو حضرت الاستاذ علامہ ابراہیم بلیاوی قدس سرہ سے میں نے نصیحت کی گذارش کی، حضرت نے کہا: مولوی صاحب صبح آئیو! میں صبح ۴ بجے حاضر ہوا، حضرت نے کھڑے کھڑے معانقہ کیا اور کہا کہ: (۱) "فن دیکھ کر پڑھائیو علم آئے گا" یعنی فقہ پڑھانا ہے تو پورا فن دیکھو، اوپر بدائع اور شامی تک اور تعلیم الاسلام تک؛ کیوں کہ بعض اوقات تعلیم الاسلام اور بہشتی زیور میں مسئلہ کی ایسی تعبیر مل جاتی ہے جسے ہم جھک مار کر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ (۲) اور فرمایا کہ: "سنت کی پیروی کرنا تمہاری قدر بڑھے گی"۔ (۳) اور فرمایا کہ "طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا"۔ (ندائے شاہی دسمبر ۲۰۰۳ء)

حضرت مفتی صاحبؒ اکثر فرماتے کہ: "یہ حضرتؒ کی انتہائی قیمتی نصیحتیں ہیں، جن سے مجھے بہت فائدہ پہنچا، میں حضرت کا احسان نہیں بھول سکتا"۔

اسی طرح استغناء اور خودداری بھی آپ کی سرشت میں داخل تھی۔ بار بار فرماتے تھے کہ: "کسی بھی شخص کو **"عبدالدینار والدرھم"** (روپیہ پیسہ کا غلام) نہیں بننا چاہئے، حدیث میں بھی اسکی ممانعت وارد ہے۔"

آپ کی خواہش یہ رہتی تھی کہ مدارس کے فضلاء زندگی بھر علمی مشغلے ہی میں لگے رہیں، اور اپنی مصروفیات کو تبدیل نہ کریں۔ کئی مرتبہ آپ کے سامنے ایسے عصری اداروں کا تذکرہ ہوا، جن میں فارغین مدارس کے لئے عصری تعلیم کی سہولیات فراہم کی گئی تھیں، تو آپ فرماتے تھے کہ مدارس میں پڑھنے والے اعلی ذہن کے طلبہ اگر ایسے اداروں کی طرف متوجہ ہوں گے تو دین کی ضرورتیں کیسے پوری ہوں گی؟ اس لئے کہ عصری تعلیم

کے بعد معمولی دینی خدمت پر قائم رہنا آدمی کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے۔

(۶) مسلک پر تصلب:

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ اپنے فقہی مسلک یعنی فقہ حنفی پر پوری ثبات قدمی کے ساتھ قائم رہے، اور کسی بھی مسئلے میں فقہی جزئیات واصول سے اعراض آپ کو گوارا نہ تھا۔ اسی طرح اکابر علماء دیوبند کے نظریات وافکار پر بھی آپ کی گہری نظر تھی، اور اپنی دانست میں ان سے سرموانحراف بھی آپ کو منظور نہ تھا۔

آپ فرق باطلہ سے کبھی بھی مرعوب نہیں ہوئے؛ بلکہ جب بھی اس موضوع پر گفتگو فرماتے تو پورے اعتماد کے ساتھ مضبوط گفتگو کرتے تھے۔ اور اس بارے میں کسی کی اچھائی یا برائی کی کوئی پرواہ نہیں فرماتے تھے، اور اپنے تلامذہ کا بھی یہی ذہن بناتے تھے کہ وہ حق پر قائم رہیں اور اکابر کے نقش قدم پر ثابت قدم رہیں۔ اور اس سلسلے میں جہاں کوئی کوتاہی دیکھتے تو بروقت تنبیہ بھی فرماتے تھے۔

آزادروی اور سلف صالحین کے منہج سے دوری کو آپ ساری خرابی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے مولانا مودودی کے افکار ونظریات اور غیر مقلدین کی حرکتوں پر آپ سخت نکیر فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا واضح موقف یہ تھا کہ یہ کج فکری آدمی کو اہل سنت والجماعت کے دائرے سے خارج کردیتی ہے۔ ایک مرتبہ جمعیۃ علماء ہند کے زیراہتمام حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد صاحب مدنی کی صدارت میں دہلی میں "تحفظ سنت کانفرنس" منعقد ہوئی، تو حضرت مفتی صاحبؒ نے اس میں جامع اور مختصر خطاب کرتے ہوئے عدم تقلید کی خطرناکی کو واضح فرمایا، یہ خطاب ایسا مؤثر تھا کہ اسے کانفرنس کا خلاصہ اور ماحصل سمجھا گیا۔

(۷) خوردنوازی:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خاص صفت بھی تھی کہ آپ اپنے اصاغر اور تلامذہ کی زبانی اور تحریری طور پر بہت حوصلہ افزائی فرماتے تھے، جس کی وجہ سے لوگوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا تھا۔ جب بھی

آپ کو اپنے کسی شاگرد کی علمی ودینی خدمات کا علم ہوتا تو آپ نہایت مسرت اور خوشی کا اظہار فرماتے، اور دعاؤں سے نوازا کرتے تھے۔ دوران سفر آپ کا ساتھیوں کے ساتھ بہت ہی بے تکلفی کا معاملہ رہتا تھا، جس کی وجہ سے سفر میں کوئی کلفت نہ ہوتی تھی۔ اس ناکارہ کو بھی متعدد مواقع پر آپ کے ساتھ سفر کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ ممبئی میں "مدرسہ معراج العلوم چیتا کیمپ" کا اجلاس تھا، اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مقررین میں حضرت مولانا شوکت علی صاحب بستوی استاذ دارالعلوم دیوبند اور اس ناکارہ کا بھی نام شامل تھا، جب ہم لوگ مدرسہ سے جلسہ گاہ کے لئے روانہ ہونے لگے، تو گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہم دونوں کو ایک کنارے لے گئے، اور فرمایا کہ: بے خوف ہو کر تقریر کرنا، میرے لحاظ میں تقریر میں کوئی کمی نہ کرنا"۔ ظاہر ہے کہ حضرت کے سامنے لب کشائی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن حضرت نے ہمت بندھائی، چناں چہ جلسہ میں ڈرتے ڈرتے ایک مختصر حدیث کا ترجمہ پیش کیا گیا، پھر بعد میں جب حضرت کا بیان ہوا تو آپ نے بھی انہیں باتوں کا حوالہ دیا، یہ خورد نوازی نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ نے احقر کی متعدد تالیفات پر بہت ہی حوصلہ افزا تحریرات لکھیں۔ احقر کا ایک مضمون "ایک جامع قرآنی وعظ" کے نام سے ندائے شاہی میں ۲۷ رقسطوں میں شائع ہوا، پھر بعد میں اسکو کتابی شکل دی گئی، تو حیدرآباد کے فقہی اجتماع سے واپسی میں ہوائی جہاز میں احقر نے حضرت کی خدمت میں اسکا مسودہ برائے ملاحظہ پیش کیا، حضرتؒ نے پورے مسودے پر سرسری نظر ڈالی، اور پوچھا کہ "یہ ایک ہی آیت: (اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ)........... الخ سے مربوط مضمون ہے؟ جب احقر نے اثبات میں جواب دیا تو بہت مسرت کا اظہار فرمایا، اور دیوبند واپسی کے بعد ایک دعائیہ تحریر" آیت قرآنی پر سلمانی وعظ کے نام سے ارسال فرمائی، جسے پڑھ کر خود احقر کو شرم آگئی، اور فون پر عرض کیا کہ حضرت کا یہ حسن ظن ہمارے لئے بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ حضرت نے بہت دعائیں دیں اور خوشی کا اظہار فرمایا۔

آپ "ندائے شاہی" کا اہتمام سے مطالعہ فرماتے تھے، اور ملاقات پر مضامین کے بارے میں تذکرہ اور تبصرہ بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "میں ندائے شاہی کے وفیات کا کالم ضرور پڑھتا ہوں، جس سے بہت سے حضرات کی وفات کے بارے میں علم ہوجاتا ہے، اور انکے لئے دعاء خیر کرنے کا موقع ملتا ہے"۔

تحفظ ختم نبوت

۱۹۸۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں جب "عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت" قائم ہوئی تو آپ کو اس کا ناظم اعلیٰ بنایا گیا۔ جب کہ والد محترم حضرت اقدس مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم ناظم بنائے گئے۔ تو حضرت والد صاحب مدظلہ کی انتھک محنت اور دلچسپی اور حضرت مفتی صاحب کی مشاورت سے الحمد للہ تحفظ ختم نبوت کا کام پورے ملک میں حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا گیا۔ اور افراد سازی کے لئے جابجا تربیتی کیمپوں کا انعقاد ہوا، جن میں حسب موقع حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ بھی تشریف لے جاتے، اور "ردمرزائیت" کے موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں مدلل اور مؤثر گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے کی آپ کی بعض تقریریں شائع بھی ہوچکی ہیں۔

فقہی اجتماعات میں شرکت

جمعیۃ علماء ہند کے "ادارۃ المباحث الفقہیہ" کے اجتماعات میں بھی اکثر آپ اہتمام سے ازاول تا آخر پوری دلچپی کے ساتھ شرکت فرمایا کرتے تھے۔ تمام مقالات اور بحثوں کی سماعت فرماتے، اور اپنے علم اور رائے کی روشنی میں ان پر تبصرے بھی فرماتے تھے۔ بہت سی مرتبہ رائے کا اختلاف بھی ہوتا تھا، اور بسااوقات آپ کے تلامذہ آپ کے سامنے مخالف دلائل بھی پیش کرتے تھے، لیکن اکثر آپ اپنی رائے پر ثابت قدم رہتے، اور اختلاف رائے کے باوجود کسی کی بات کا برا نہیں مانتے تھے۔

ایک مرتبہ احقر دولت خانہ پر حاضر ہوا، تو دوران گفتگو ارشاد فرمایا کہ: "عالم اور جاہل میں یہی فرق ہے کہ

جاہل شخص اختلاف رائے کی وجہ سے تعلقات ختم کرلیتا ہے، جب کہ عالم دلائل کی روشنی میں اختلاف کو اختلاف تک رکھتا ہے۔اس سے قدیم تعلقات پر فرق نہیں آنے دیتا“۔

بلاشبہ حضرت کا یہ ارشاد ایک روشن نصیحت ہے، جسے ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے۔آپ کا عام طور پر مدرسہ وغیرہ کے جلسوں میں شرکت کا معمول نہ تھا لیکن تلامذہ یا ہم عصر علماء کے اصرار پر بعض جلسوں میں تشریف لے جاتے تھے۔ کئی سال مرادآباد میں شہری جمعیت کی طرف سے منعقد ہونے والی سالانہ ”سیرت خاتم النبیین “ کانفرنس میں تشریف لاکر گراں قدر ملفوظات سے نوازتے رہے۔

آپ سالوں سے شعبان کے آواخر میں بیرون ملک (لندن،کنیڈا اورامریکہ) کے طویل سفر پر تشریف لے جاتے ،اور وہاں مختلف شہروں میں حضرت کا قیام رہتا، اور علمی واصلاحی افادات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اکثر اس سفر سے شوال کے اخیر میں واپسی ہوتی تھی ،اس ذریعہ سے آپ کا فیض ملکوں ملکوں تک پہنچ رہا تھا۔

علالت اور وفات

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحت اگر چہ عام طور پر بہتر رہی؛ تاہم ایک عرصہ سے شوگر کا مرض تھا، اور”انسولین“ استعمال فرماتے تھے۔ چندسال قبل قلب کے عارضہ کی وجہ سے آپریشن کی نوبت بھی آگئی، اسکے بعد طبعیت بحال ہوگئی، البتہ چندسالوں سے سماعت پر معمولی اثر تھا، جو اکثر محسوس نہ ہوتا تھا، اسی کے ساتھ کبھی کبھار زبان الفاظ کا ساتھ نہ دیتی تھی۔

اسی طرح کا واقعہ اس سال رجب کے وسط میں بخاری شریف کے ختم پر دارالحدیث میں پیش آیا کہ آپ کوشش کے باوجود ختم پر کوئی کلام نہ فرماسکے،اور یہ کہہ کر تشریف لے آئے کہ”اب جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا“۔ یہ منظر دیکھ کر طلبہ میں ہیجان اور گریہ وزاری کا عالم برپا ہوگیا اور جسنے بھی اس واقعہ کو سنا وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اگلے دن آپ علاج کے لئے بھی تشریف لے گئے،اللہ تعالی نے صحت عطا فرمائی، اور وہ کیفیت جلد ہی ختم ہوگئی،

لیکن چوں کہ ۲۴مارچ ۲۰۲۰ء سے پورے ملک میں "لاک ڈاؤن" نافذ ہوگیا تھا، اسلئے آپ واپس دیوبند تشریف نہ لاسکے۔اسی دوران رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا،تو متعلقین نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے آپ سے علمی استفادے کی درخواست کی، جسے آپ نے قبول کرلیا،اور ہر دن تراویح کے بعد آپ کے آن لائن بیانات اور سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا، جو ۱۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ تک جاری رہا۔جس میں بہت سی قیمتی باتیں آپ نے ارشاد فرمائی، جو یوٹیوب پر محفوظ ہیں۔

اس کے بعد آپ کو شدید بخار آیا مرض کی زیادتی پر "ملاڈ اسپتال" میں داخل کیا گیا، اولاً طبعیت میں کافی سدھار تھا؛ لیکن دو دن قبل یعنی ۲۳م/رمضان المبارک کو اچانک حالت تشویش ناک ہوگئی، اور گہری نیند کی کیفیت طاری ہوگئی، ڈاکٹروں نے پھیپھڑوں میں انفیکشن تجویز کیا۔

بالآخر اسی حالت میں ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

اسپتال میں ہی آپ کو غسل وکفن دیا گیا اور قریبی مسجد کے میدان میں آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالوحید صاحب مدظلہ کی اقتداء میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی، اور شام کو عصر کے بعد جوگیشوری ویسٹ کے عام مسلم قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃً واسعۃً۔

اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بے حد بلند فرمائیں، امت کو آپ کے نعم البدل سے نوازیں، اور آپ کی خدمات کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائیں متعلقین کو صبر جمیل سے نوازیں، اور ہم سب کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین ثم آمین۔ (شائع شدہ ماہنامہ ندائے شاہی جون ۲۰۲۰ء)

❁...❁...❁

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر

مولانا مفتی عمران اللہ قاسمی صاحب
استاذ عربی دارالعلوم دیوبند

علمی گیرائی، فنی مہارت، تصنیف وتحریر کا نفیس ذوق، تفہیم کا عمدہ ملکہ، تدریس کا اچھوتا اسلوب، کسی بھی مضمون کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر فہم مخاطب کے قریب تر کردینے کا ہنر، بافیض وباتوفیق استاذ، گفتگو میں ٹھہراؤ، تہذیب وشائستگی، لہجہ میں وقار واعتماد، حدیثِ نبوی سے خصوصی مناسبت، تفسیر قران کا محبوب اشتغال، بلند پایہ محدث ،مفسر، بالغ نظر فقیہ، کثیر المطالعہ، کثیر التصانیف، محنت وجدوجہد امتیازی وصف، ہمہ وقت علمی مصروفیت، تلامذہ اور مستفیدین کا جم غفیر، عقیدت مند ومحبین کی بہتات، مگر رہن سہن، لباس ووضع سادہ، آرام وتنعم سے دور، شانِ استغنائی نمایاں، ایسے ہی تھے ہمارے ہر دل عزیز استاذ محترم، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ، جو عالم اسلام کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے، ان سے ربط وانتساب باعث فخر، اور استفادے کے مواقع کو غنیمت شمار کیا جاتا تھا۔

۱۹۹۳ء کی بات ہے، راقم مادر علمی جامعہ عربیہ اعزاز العلوم ویٹ میں زیر تعلیم تھا، امتحان نزدیک تھے، امتحانات کی تیاری میں عمدگی اور تیزی لانے کی ترغیب دیتے ہوئے محترم اساتذہ کرام نے خبر سنائی، کہ اس مرتبہ امتحان کے لئے ہم لوگوں کے استاذ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری بھی تشریف لا رہے ہیں اسی لمحہ پہلے پہل حضرت والا کے نام سے آشنائی ہوئی، اس کے بعد دن بدن اساتذہ کرام کی مجالس میں حضرت والا کا محبت بھرا تذکرہ سننے کو ملتا، متعین تاریخ میں دیگر ممتحنین کے ساتھ حضرت مفتی صاحب رونق افروز ہوئے۔

سردی کا موسم تھا عربی رومال، گرم عبایا، پیروں میں پشاوری جوتا، رفتار وگفتار سے وقار جھلکتا ہوا۔ اساتذہ وطلبہ شاداں وفرحاں نظر آتے۔ حسن اتفاق ہماری جماعت سال دوم عربی کی ایک کتاب ہدایۃ النحو کا امتحان بھی حضرت سے متعلق ہوا، اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت والا نے احقر سے ہدایۃ النحو میں ایک مقام سے مکمل دوصفحہ کی عبارت پڑھوا کر ترجمہ سنا اور دوسرے مقام پر چند لائن عبارت وترجمہ کے بعد مطلب بھی دریافت کیا، امتحان کی یہ سعادت مدرسہ میں ہم لوگوں کے لئے باعث افتخار تھی، اسی وقت سے احقر کے ذہن میں حضرت والا کی پر وقار شخصیت اور عظمت کا نقش قائم ہوگیا، جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔ پھر چند سال بعد دار العلوم میں داخل ہو کر حضرت والا سے ترمذی شریف اور طحاوی شریف پڑھنے کی سعادت ملی اور اس کے بعد تو قریب سے دیکھنے، برتنے کے کثیر مواقع ملے، یقینا حضرت والا کی ذات متعدد اہم خصوصیات کا مرقع تھی آپ کی بدولت مسند حدیث کو عظمت واعتماد حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات کو محبین، تلامذہ ایک نہ پر ہونے والا خلا گردانتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ کو موضع کالیڑا ضلع بناس کانٹھا گجرات میں پیدا ہوئے تھے، والد صاحب نے از خود تعلیم کا آغاز کرایا، مگر وہ اپنی مصروفیات کے سبب زیادہ توجہ نہ دے سکے اس وجہ سے انھوں نے آپ کو گاؤں کے مدرسہ میں ہی داخل کر دیا، یہاں پر آپ نے مکتب کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد چند ماہ دار العلوم چھاپی میں رہے پھر شہر پالنپور کے مدرسہ میں داخل کر دئے گئے، وہاں تقریبا چار سال فارسی ،عربی کی ابتدائی کتب پڑھیں، بعد ازاں مزید تعلیم کے لئے سہارنپور کا رخ کیا، اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں چند سال داخل رہ کر اساطین علم وفن اساتذہ سے مختلف فنون کی تعلیم پائی، بالآخر فقہ وحدیث وتفسیر اور دیگر فنون میں اعلی تعلیم کے لئے ۱۳۸۰ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا، ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں جو دار العلوم کا سوواں سال ہے دورہ حدیث سے فراغت پائی، اس کے اگلے سال اساتذہ کی تربیت میں رہ کر فتوی نویسی کی مشق کی، اس تعلیمی سلسلہ کی تکمیل کے بعد آپ نے اساتذہ کرام کے مشورے سے ۱۳۸۴ھ میں تدریس کا آغاز کیا، اور دار

العلوم اشرفیہ راندیر میں آپ کا تقرر ہوا، جہاں پر نو سال تک مختلف فنون اور حدیث کی اعلی کتابیں زیر درس رہیں اس کے بعد اکابر واساتذہ کے مشورے سے ۱۳۹۳ھ میں دار العلوم دیوبند تشریف لے آئے، یہاں تقریبا ۴۸ سال مسند علم کو زینت بخشی، یہ حضرت والا کی زندگی کا سوانحی اختصار ہے۔

حضرت والا کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے سبھی اس بات کے معترف ہیں کہ حضرت مفتی صاحب کی زندگی تابندہ نقوش اور ایسے جلی عنوانات سے عبارت تھی جو علم کے متلاشی کیلئے لازم تقلید ہیں، کامیابی کی طلب رکھنے والوں اور سرخ روئی کے جویا کو ان عناوین کی روشنی میں ہی سفر شروع کرنا چاہئے۔۔

جدوجہد، علمی انہماک وہمہ وقتی مصروفیت

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور امتیازی وصف محنت وجدوجہد ہے، بلکہ آپ کی پوری زندگی جدوجہد سے عبارت تھی، آپ اکثر اوقات تصنیف ومطالعہ اور درس کی مصروفیت رہتی، اپنے مقصد کو پانے کے لئے بہت جدوجہد کرتے، کبھی فارغ نہ رہتے، مطالعہ، علمی مذاکرہ، درس وتدریس، خطاب وتقریر، تصنیف وتالیف، ہمہ وقت کوئی نہ کوئی شغل رکھتے تھے، محنت وجدوجہد کا یہ شغف زمانہ طالب علمی ہی سے تھا۔ استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالنپوری جو حضرت مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی بھی ہیں، حضرت کی دور طالب علمی کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلاتے ہیں۔ ''حضرت بھائی صاحب مجھ سے تقریبا دس سال بڑے تھے وہ شروع ہی سے محنتی مزاج واقع ہوئے تھے جس وقت وہ دار العلوم دیوبند میں تکمیل افتاء کے طالب علم تھے مجھے اپنے ساتھ دیوبند لے آئے اور میرا حفظ قرآن شروع کرادیا، بھائی صاحب اپنی درسی مصروفیت، کتب کے تکرار ومطالعہ اور فتاوی تحریر کرنے کے ساتھ مجھے حفظ کراتے تھے، میرا سبق اور آموختہ خود سنتے تھے اور خود بھی حفظ کرتے تھے۔ مسجد قدیم سے متصل، باب قاسم سے باہر والا وہ کمرہ جس کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے اور جو آج کل شعبہ صفائی وچمن بندی کا دفتر ہے، آپ کی رہائش گاہ تھا، رات کو اس کے باہر والے چبوترے پر بیٹھ کر

مطالعہ کرتے، وہیں پر پھر اپنے قرآن کریم کے حفظ کا سبق یاد کرنے لگتے، جسے صبح کو اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب محمود مصری کو سناتے تھے، نیز اپنے تعلیمی امور، شعبہ افتا کی مصروفیات، میرے (مفتی محمد امین صاحب) اسباق حفظ وآموختہ کو سننے، اور خود اپنا حفظ قرآن کا سبق یاد کر کے سنانے کے ساتھ وہ بہت پابندی سے اساتذہ کرام خصوصاً حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہجہاں پوری صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور شیخ عبدالوہاب محمود مصری استاذ عربی دارالعلوم دیوبند کی خدمت بھی انجام دیتے تھے" مذکورہ مصروفیات وقت اور محنت کی متقاضی ہوتی ہیں، حضرت مفتی صاحب اپنی محنت، لگن اور شوق کے ساتھ ضروری اشیاء کی فراہمی، غذائی سامان کی خریداری کر کے لاتے، اور دوسرے کام بھی برضا ورغبت کرتے، اور ان میں عموماً ناغہ نہ ہوتا تھا۔

میرِ کارواں حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں: کہ ۱۳۸۲ھ میرا دار العلوم میں داخلہ کا سال ہے اور یہی حضرت مفتی صاحب کا دورہ حدیث سے فراغت کا سال ہے ۱۳۸۳ھ میں وہ تکمیل افتاء کے طالب علم تھے، ان کی محنت ویکسوئی مثالی تھی وہ اس وقت دارالعلوم کے نمایاں ممتاز طلبہ میں شمار ہوتے تھے، یکسوئی کے ساتھ اپنے تعلیمی امور میں مصروف رہتے تھے، ایک کام پورا کر کے دوسرا شروع کر دیتے تھے اپنے مقصد کے علاوہ دوسری طرف بالکل متوجہ نہ ہوتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر ایک مرتبہ وہ اپنے کمرے سے دارجدید کی طرف جارہے تھے، احاطہ مولسری میں میری ملاقات ہوئی فرمانے لگے، ابو القاسم جی چاہتا ہے کہ آج دارجدید دیکھ لوں، کئی ماہ سے ادھر آنا نہیں ہوا، یہ ان کی محنت ویکسوئی کا حال تھا۔ جبکہ ان کے رہائش والے کمرے سے دارجدید کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے کہ وہاں تک پہنچنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہو، اس لحاظ سے حضرت مفتی صاحب کا یہ واقعہ موجودہ وقت کے طلبہ کے لئے کسی استعجاب سے کم نہیں ہے۔ دور طالب علمی کی یہی محنت، یکسوئی اور جدوجہد حضرت مفتی صاحب کے کامیاب ہونے کی کلید اور علمی دنیا میں عظمت

محبوبیت کے حصول کا سبب ہے اسی محنت وجد وجہد کی بدولت آپ اعلی مقام پر فائز ہوئے۔

عموماً تعلیمی مرحلہ کی تکمیل کے بعد مزاج بدل جاتا ہے، طلب علم کے زمانے میں یکسوئی کے ساتھ محنت وجد وجہد کرنے والے بیشتر افراد تدریس کے میدان میں قدم رکھتے ہی محنت کا شغف باقی نہیں رکھ پاتے، آرام وراحت کے اسباب کا حصول یا دیگر مصروفیات فطرت ومزاج کو بدل دیتی ہیں، مشاہدہ اس کا گواہ ہے، مگر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا معاملہ مختلف تھا، یکسوئی اور جہد مسلسل فطرت اور مزاج کا حصہ بن گئی تھی آپ نے دور طالب علمی کی طرح تدریس کے زمانے میں بھی انہماک ویکسوئی، اور جد وجہد کو جاری رکھا اور کوئی بھی چیز کوئی بھی صورتحال آپ کے سعی پیہم میں خلل انداز نہ ہوئی، دار العلوم اشرفیہ راندیر میں مدرسی کے زمانے کی کیفیت یہی بیان کی جاتی ہے، جبکہ دار العلوم دیوبند میں تو
اساتذہ وطلبہ سبھی اس کے مشاہد ہیں۔

مہمانوں اور طلبہ سے ملاقات کے لئے عصر کے بعد کا وقت متعین تھا، اس وقت بھی عموماً علمی مشغلہ جاری رہتا، طلبہ کی طرف سے پیش کردہ سوالات کے جوابات یا شبہات کا ازالہ، کسی علمی مسئلہ کا مذاکرہ رہتا۔ دیگر اوقات میں ملنے کی اجازت نہ تھی البتہ کوئی اہم اور ضروری معاملہ درپیش ہونے کی صورت میں ملاقات ممکن تھی۔ کسی اہم وجہ یا سخت بیماری کی وجہ سے ہی علمی مشغلہ موقوف ہوتا ورنہ بیماری کے ایام میں بھی بقدر استطاعت مصروف رہتے اور اپنا مشغلہ جاری رکھتے تھے۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ سن ۲۰۰۲ء میں حضرت مفتی صاحب کی ایک آنکھ پر لقوہ کا اثر ہو گیا تھا، آنکھ پر ورم کی وجہ سے وہ آنکھ بند رہتی تھی، کھل نہیں پاتی تھی، علاج سے افاقہ نہیں ہو رہا تھا، عام تشویش اور بے چینی کی صورت تھی، ان ایام میں بھی آپ نے درس موقوف نہ کیا۔ انھیں دنوں استاذ محترم حضرت مولانا قاری شوکت علی صاحب مہتمم جامعہ عربیہ اعزاز العلوم ویٹ حضرت مفتی صاحب کی عیادت کے لئے دیوبند وارد ہوئے، عصر کے بعد حضرت مفتی صاحب کے در دولت پر حاضری ہوئی احقر بھی ساتھ تھا، تو دیکھا کہ حضرت

مفتی صاحب ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کی کمپوزشدہ جلد پر ایک طالب علم کی مدد سے نظر ثانی فرمارہے ہیں، علیک سلیک کے بعد حضرت نے کاغذات ایک طرف رکھے، مزاج پرسی کے بعد گفتگو کا بے تکلف دور چلا، حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ اس پریشانی کے وقت میں آپ کو آرام کی زیادہ ضرورت ہے، تصنیف وغیرہ کا یہ کام صحت یابی تک موقوف کردیجئے، حضرت مفتی صاحب کا جواب تھا، قاری صاحب! ابھی ایک آنکھ سلامت ہے اس سے میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں شاید اللہ تعالی نے اس آنکھ کو اسی لئے سلامت رکھا ہو کہ میں اپنے باقی ماندہ کام پورے کرلوں، لہذا میں اپنے بقیہ کاموں کو پورا کرنے میں لگا ہوں۔ پھر جلد ہی حضرت مفتی صاحب نے قاری صاحب سے اجازت لے لی، اور اپنے کام میں مصروف ہوگئے، بعد میں ڈاکٹر کی تبدیلی ہوئی دوسرے ڈاکٹر نے لقوہ تجویز کر کے علاج کیا اور جلد ہی شفا ہوگئی۔ احقر مذکورہ مجلس میں حاضر تھا، اس وقت بھی مفتی صاحب کے جواب سے سبھی متحیر ہوئے، اس کے بعد جب بھی اس مجلس کی یاد آتی ہے تو حضرت مفتی صاحب کے الفاظ کانوں میں کھٹکنے لگتے ہیں، اپنی کاہلی وسستی پر ندامت کے ساتھ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی جدوجہد، وقت کی قدردانی اور سعی پیہم پر رشک آنے لگتا ہے۔

ایک مرتبہ ششماہی امتحان کے بعد وطن سے واپسی ہوئی تو ہم چند ساتھی حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے باری باری تعطیل کے ایام کی مصروفیت دریافت کی کہ ان دنوں میں تم نے کیا کیا؟ لاشعوری اور بے پرواہی کا غلبہ تھا، کسی کے پاس معقول جواب نہ تھا، حضرت نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے مختصر الفاظ میں وقت کی قدردانی کی تلقین کی پھر اس کے بعد بتلایا کہ ان تعطیل کے ایام میں میں نے کافیہ پر عربی حاشیہ کی تکمیل کی ہے، جو طباعت کے لیے گئی ہوئی ہے۔ درس نظامی سے وابستگی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ کافیہ فن نحو کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے، حضرت رحمہ اللہ نے امتحان کے درس کا سلسلہ موقوف ہونے کے ایام میں یہ وقیع حاشیہ تحریر فرمایا جو الوافیہ کے نام سے دستیاب ہے۔

تفہیم کا انفرادی اسلوب اور درس کی مقبولیت

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اصلاتدریس کا مشغلہ ہی اختیار کیا، اور اپنی جدوجہد، علمی پختگی، حسن بیان کی بدولت علمی دنیا میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ حضرت مفتی صاحب خطاب کے دوران اکثر یہ واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب میں تدریس کے لئے راندیر جانے لگا تو استاذ محترم حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوکر نصیحت کی درخواست کی، آپ نے چلتے وقت آخری نصیحت فرمائی: مولوی صاحب تین باتیں یاد رکھنا (۱) جو بھی پڑھانا فن دیکھ کر پڑھانا اس سے علم میں اضافہ ہوگا (۲) سنت کی پیروی کرنا عوام میں مقبولیت ہوگی (۳) طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا۔ حضرت مفتی صاحب فرماتے تھے کہ میں اپنے استاذ کی ان قیمتی نصائح پر زندگی بھر عمل پیرا رہا ہوں اور جو کتاب بھی پڑھانے کیلئے ملتی ہے میں اس کو فن دیکھ کر ہی پڑھاتا ہوں، چنانچہ حضرت مفتی صاحب پوری تیاری اور حسن ترتیب کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں درس دیتے تھے، وہ تفہیم کی انفرادی صلاحیت رکھتے، اس کے لئے تمہید اور اس طرح مقدمات قائم کرتے کہ اصل مقصود تک ذہن کی رسائی ہوجاتی، آسان ومختصر جملوں والی تعبیرات کے ذریعہ اپنی بات پیش کرنے کا عجیب ملکہ ان کو حاصل تھا۔ احقر نے ترمذی شریف اور طحاوی شریف حضرت والا ہی سے پڑھی، ان دونوں کتابوں کے درس میں ان کا محدثانہ طرز اور شانِ فقاہت خوب اجاگر ہوتی، حدیث پر مفصل کلام، مرتب گفتگو، متن پر کلام کے ساتھ سند پر بحث، دیگر مسالک کے دلائل، واردشدہ شبہات کا ازالہ اور مسلکِ احناف کے ترجیحی دلائل، ائمہ مذاہب کے نظریات ودلائل کی وضاحت کرنے کے ساتھ حضرت مفتی صاحب اقوال مختلفہ کا تجزیہ ایسے اچھوتے اسلوب میں پیش کرتے کہ ہر قول حدیث شریف کے قریب نظر آتا اور بآسانی سمجھ میں آجاتا کہ یہ اختلاف نص فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ دھیمی آواز، باوقار لہجہ گفتگو میں ٹھہراؤ کے ساتھ درس کی تقریر جاری رہتی اور پورے سال اسی طرح تسلسل رہتا، نص سے مسئلہ کے استنباط کی تفہیم پر کلام کرتے ہوئے ایسا سہل اسلوب اپناتے کہ کسی کے لئے کوئی دشواری نہ رہتی، انہیں

خصوصیات کی بدولت آپ کا درس بے پناہ مقبول تھا، طلبہ جوق در جوق کھنچے چلے آتے اور ہمہ تن گوش ہوکر سیرابی حاصل کرتے، احقر نے غبی، لا پرواہ، سست ہر نوع کے طالب علم کو آپ کے درس میں شرکت کا حریص پایا، باہر سے آنے والے مہمانان جن میں دیگر مدارس کے طلبہ اور اساتذہ بھی ہوتے وہ بھی آپ کے درس میں شرکت کا شوق رکھتے تھے، اور آپ کی شان محدثانہ کے قائل ہوتے۔ آپ نے تدریس کے پورے دورانیے میں جو تقریبا ساٹھ سالوں پر محیط ہے مختلف فنون کی متعدد کتابوں کا درس دیا مگر ترمذی شریف، طحاوی شریف بخاری شریف اور حجۃ اللہ البالغہ کے اسباق کو خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

تقریر و خطابت

متعلقین و احباب کی طلب پر فارغ اوقات میں مختلف مقامات پر خطاب کے لئے بھی تشریف لے جاتے تھے، علمی اور بصیرت افروز فرمایا کرتے تھے۔ عام فہم لب ولہجہ، مجلسی انداز، تکلفات سے پاک، آورد سے خالی، انداز بیان سادہ، نہ پرشکوہ الفاظ اور نہ انوکھی تعبیرات کہ گفتگو سامعین کے سروں سے گذر جائے، موقع اور احوال کی مناسبت سے گفتگو کے معیار میں اتار چڑھاؤ رہتا تھا، اہل علم کی مجلس میں ان کے علم کے مطابق اور عوام الناس کے مجمع میں ان کے فہم کے مناسب۔ حضرت والا خشک عنوان کو تر و تازہ بنا کر پیش کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے، اور بعض مواقع پر تو صرف حضرت والا کا خطاب ہی بہتر اور مناسب معلوم ہوتا تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی سال کے آغاز پر اساتذہ کرام کی خصوصی نشست میں، مدرسہ ثانویہ میں تعلیمی سال کے آغاز پر ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کے مابین، پھر مسجد رشید میں تمام طلبہ کے مابین آپ کا خطاب ہی متعین طور پر ہوتا تھا، جس میں عموماً سورہ علق کی ابتدائی آیات تلاوت فرما کر تعلیم کی اہمیت، طلب علم کے مراحل بیان کئے جاتے، اسی طرح رابطہ مدارس عربیہ کے اجلاس اور دیگر مواقع پر بھی کلیدی خطاب آپ ہی کا ہوتا تھا، اکثر منتخب آیات قرآنیہ کی تلاوت سے خطاب شروع ہوتا، آیات کی تشریح کرتے ہوئے مضمون کا حالات حاضرہ سے انطباق، ان سے ملنے والا سبق و رہنمائی بیان کرتے،

معاشرے کی برائیوں اور کج روی کو اجاگر کرتے، اس سلسلے میں ان کی بے باکی بھی خوب دیکھنے میں آتی۔

حضرت مفتی صاحب کی تفہیم کا جوہر درس کے علاوہ، خطاب میں بھی خوب ظاہر ہوتا تھا، بعض فقہی مسائل، شرعی اصول بہت آسانی وسلیقہ سے عوام کے ذہن نشیں کر دیتے تھے، پروگرام اور اجلاس کا مقصد واضح کر دیتے۔ جب ایک مخصوص فرقہ کی ریشہ دوانی اور دریدہ دہنی پر بند لگانے کی نیت سے جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ کی صدارت میں تال کٹورہ اسٹیڈیم نئی دلی میں تحفظ سنت کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، عوام وخواص کا مجمع، علماء وعوام کا جم غفیر تھا، پروگرام کی تمہیدات کے بعد اظہار خیال وخطاب کا سلسلہ جاری تھا، ناظم اجلاس حضرت مولانا عبد العلیم صاحب فاروقی مدظلہ نے حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری کا نام پکارا، آپ نے بڑے سلیقہ سے مقاصد اجلاس کو سمجھایا پھر مرتب ومدلل گفتگو کرتے ہوئے سنت کی وضاحت، اس کی تحفظ کی ضرورت، تقلید وعدم تقلید کی توضیح اور اہل سنت والجماعت سے اس مخصوص فرقے کے اصولی اختلاف کو ظاہر کر کے سامعین کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا، اس خطاب کے بعد سامعین کی تشنگی دور ہوئی، اس فرقہ کی ریشہ دوانیوں کے تدارک سے آگاہی ہوئی۔ حضرت کے خطاب کے بعد سامعین کے چہروں سے اطمینان کا احساس اور کسی مشکل بات کو سمجھ جانے کی خوشی صاف ظاہر ہوتی تھی۔

تصنیف وتالیف

تصنیف وتالیف بھی آپ کا محبوب مشغلہ تھا، تدریس کی طرح آپ کا اسلوب تحریر صاف، سادہ اور دل نشیں ہوتا تھا، تسہیل کو ہی ترجیح ہوتی تھی، آپ کے قلم سے نکلی ہوئی تمام کتابوں میں اسی ضرورت کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جس کی بنا پر تقریبا سبھی کو قبول عام حاصل ہے، چھوٹی بڑی تمام تصانیف پچاس کے قریب ہیں، اس اعتبار سے آپ کثیر التصانیف کی فہرست میں شامل ہیں، احقر کی کوتاہ نظر میں تدریسی مصروفیت کے ساتھ اتنا کثیر تصنیفی کام کرنے کی کوئی دوسری مثال ہمارے طبقہ میں نہیں ہے، درس نظامی کے فنون میں سے اکثر پر آپ نے خامہ فرسائی

کی اور وقیع قابل قدر کتابیں تصنیف فرمائیں، بعض فنون میں ایک سے زائد کتابیں منظر عام پر آئیں، مثلاً تفسیر میں: ہدایت القرآن کی آٹھ جلدیں۔ اصول تفسیر میں: الفوز الکبیر کا عربی ترجمہ اور اس کی شرح العون الکبیر۔ فن حدیث میں: تحفۃ القاری شرح صحیح بخاری بارہ جلدیں، تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی آٹھ جلدیں، ایضاح المسلم شرح صحیح مسلم تا کتاب الایمان، زبدۃ شرح معانی الآثار، محفوظات اول دوم سوم۔ اصول حدیث میں: فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، شرح علل الترمذی۔ حکمت شریعت میں: رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغہ پانچ جلدیں، تعلیق حجۃ اللہ البالغہ (حاشیہ عربی) دو جلدیں، کامل برہان الٰہی چار جلدیں۔ فقہ میں: حاشیہ الفتاوی، آپ فتوی کیسے دیں۔ اصول فقہ میں: مبادی الاصول، معین الاصول۔ نحو میں: آسان نحو، ہادیہ شرح کافیہ، الوافیہ حاشیہ عربی بر کافیہ۔ صرف میں: آسان صرف، گنجینہ صرف شرح پنج گنج۔ منطق میں: آسان منطق، مفتاح التہذیب شرح التہذیب، ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم۔ فلسفہ میں: مبادی الفلسفہ، معین الفلسفہ۔ تذکرہ وسوانح میں: حیات امام طحاوی، حیات امام ابوداؤد، تذکرہ مشاہیر محدثین۔ مذکورہ کتب کے علاوہ ''دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت'' ''تسہیل ادلہ کاملہ'' ''ایضاح الادلہ'' ''آسان فارسی حصہ اول، دوم'' وغیرہ قابل ذکر ہیں، حضرت کی تصنیف کردہ کتب کے جملہ صفحات کی تعداد تیتیس ہزار چھ سو بیس بنتی ہے جو ان کی مکمل زندگی کے جملہ ایام سے زائد ہے جبکہ کسی بھی انسان کی عمر کے ابتدائی بیس سال تعلیم وتربیت اور کھیل کود کی نذر ہو جاتے ہیں اگر یہ بیس سال نکال کر صرف عملی زندگی کے ساٹھ سال باقی رکھے جائیں اور ان کے ایام کا تقابل تصنیفات کے صفحات سے کیا جائے تو صفحات کی تعداد کافی بڑھ جاتی ہے۔ آج کل اس قدر کثیر صفحات کا مطالعہ بھی دشوار ہوتا ہے، لہٰذا حضرت رحمہ اللہ کا تدریسی مصروفیت کے ساتھ اتنا تصنیفی کام کر دینا عظیم کارنامہ ہے۔

تصانیف کے ذیل یہ پہلو بھی نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ جہاں آپ کے قلم گہر بار سے، تحفہ القاری، تحفۃ الالمعی، رحمۃ اللہ الواسعہ، کامل برہان الٰہی، ہدایت القرآن جیسے عظیم شاہکار وجود پذیر ہوئے وہیں ابتدائی اور

مبادی حیثیت کی کتب بھی منظر عام پر آئیں جن میں محفوظات، آسان منطق، آسان نحو، آسان صرف، آسان فارسی، مبادی الاصول وغیرہ شامل ہیں، جبکہ عام طور پر عظیم وضخیم کتابوں کے مصنفین ابتدائی کتب کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے ان کا مطمح نظر زیادہ تر بڑی تصانیف ہوتی ہیں، اس حوالے سے آپ کی ذات میں جامعیت پائی جاتی ہے۔ کہ آپ نے مبادی، ابتدائی، متوسط، اور اعلی ہر درجہ کی کتابیں تصنیف فرمائیں، مختصر کتابچے، متوسط معتدل کتابیں اور ضخیم مطولات بھی تحریر کیں۔ ایسی جامعیت کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

علمی مسائل میں چھوٹوں سے تبادلہ خیال

علم واستعداد کی پختگی، محدثانہ شان، فقیہانہ بصیرت، نصف صدی سے زائد تدریسی تجربہ، پچاسوں کتابوں کے مصنف، ہرفن پر بابصیرت نگاہ رکھنے کی بنا پر علمی دنیا میں آپ کو اعتبار واستناد حاصل تھا مگر پھر بھی بہت سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتے تھے، آپ کی ایک عادت تو ہر کسی کے اپنانے کے قابل ہے وہ یہ کہ مطالعہ یا تصنیف کے دوران اگر کہیں ضرورت محسوس کرتے بلا تکلف اپنے چھوٹوں کے ساتھ تبادلہ خیال کر لیتے اور بشاشت کے ساتھ چھوٹوں کی رائے کو بھی قبول کر لیتے، اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے، حضرت مفتی خورشید انور صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، مفتی اشتیاق احمد صاحب، مفتی کلیم الدین صاحب اساتذہ دارالعلوم، مفتی محمد نعمان مفتی دارالعلوم دیوبند وغیرہ سے اکثر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا، اسی طرح اساتذہ تجوید وقرآت سے بھی قواعد تجوید، اختلاف قرآت وغیرہ پر مذاکرہ کر لیتے، اس میں ذرا بھی جھجھک کا اظہار کرتے نہ بڑا پن جتلاتے، اس کا مقصد اطمینان کا حصول اور دوسروں کو ترغیب دینا ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں جبکہ تفوق وبرتری کا مزاج غلبہ پا چکا کسی بھی مسئلہ سے متعلق دوسروں سے گفتگو کرنا قصر شان تصور کیا جاتا ہے اور مسئول عنہ بھی تنقیص سائل میں مبتلا ہو جاتا ہے، ایسے دور میں حضرت والا کا یہ طرز عمل بہت معنویت رکھتا ہے، بلکہ علم کے ہر خوشہ چیں کیلئے حرز جان بنانے کے لائق ہے۔

استغناء وبے نیازی

آپ نہایت حلیم، قانع اور مستغنی واقع ہوئے تھے، آپ کے رہن سہن،لباس ووضع سے استغنائی شان نمایاں رہتی تھی، کثیر العیال ہونے کے سبب گھریلو مصارف زیادہ ہوگئے مگر کبھی کسی کے سامنے اس کا ذرا بھی اظہار فرمایا بلکہ استغنا کا دامن تھامے رکھا، جب وسعت وفراخی ہوئی تب بھی کبھی دولت وجائداد کو اہمیت نہ دی۔ کافی دنوں پہلے کی بات ہے جب آپ دیوبند میں اپنا مکان تعمیر کرا رہے تھے، آپ کے پڑوسی نے معمار سے کہا کہ اس دیوار میں ہماری طرف تھوڑی جگہ چھوڑ کر ایک طاق بنا دینا تا کہ ہم رات میں یہاں چراغ وغیرہ رکھ لیا کریں، معمار نے سنی ان سنی کردی اور طاق نہیں بنایا، دیوار اوپر تک تعمیر ہو چکی تھی، اگلے روز پڑوسی نے حضرت مفتی صاحب سے کہا ہم نے اس معمار سے یہاں پر دیوار میں ایک طاق بنانے کو کہا تھا؟ حضرت والا نے معمار سے کہا کہ بھائی ان کے لئے جہاں پر یہ کہتے ہیں طاق بنا دو۔ معمار نے ازراہ ہمدردی عرض کیا حضرت آپ بہت بھولے آدمی ہیں، یہاں کا ماحول نہیں سمجھتے ہیں کل کو اس طاق کی وجہ سے یہ لوگ دیوار پر دعوی کردیں گے کہ یہ دیوار ہماری ہے اس لئے میں نے نہیں بنایا، یہ بات سن کر حضرت برہم ہوگئے، اور کام موقوف کرا کر پہلے وہ طاق بنوایا، اور پھر معمار سے بولے اگر یہ لوگ کل کو اس طاق کی وجہ سے دیوار پر مدعی ہوئے اور دیوار کا مطالبہ کرنے لگے تو میں اپنی اولاد سے کہہ جاؤں گا کہ ان کو یہ دیوار دے دینا۔

حضرت مفتی صاحب کی ابتدائی زندگی عسرت میں گذری تھی، بعد میں جب وسعت وفراخی ہوئی تو امور خیر میں خاموشی کے ساتھ حصہ لیتے، اور بہت کثرت سے خرچ کرتے تھے، محلہ کی مسجد، نادار طلبہ اور دیگر ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے تھے، جب بچوں کی تعلیم وشادی اور ضروریات رہائش وغیرہ سے فارغ ہوگئے تو دار العلوم اشرفیہ راندیر اور دار العلوم دیوبند سے وصول کردہ اپنی مکمل تنخواہ کا حساب لگا کر واپس فرمادی، پھر حسبتاً للہ بلا تنخواہ درس دینے لگے، اور تادم واپسیں یہی معمول رہا، اس پر صابر وشاکر رہتے۔ اسی طرح مکان وجائداد میں سب بچوں کے حصے متعین کر کے ہر ایک کو سپرد کر کے خود فارغ کر لیا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ایسی ہی خوبیوں وکمالات کا مجموعہ تھی، وہ ایسے وقت میں رخصت ہوئے جبکہ ان کے متعلقین ومستفیدین اور ہم جیسے نااہلوں کو پہلے سے زیادہ ان کی ضرورت تھی، حضرت والا کی وفات سے دنیا ایک محدث، فقیہ اور عالم باعمل سے محروم ہوگئی، مگر یقین ہے کہ اللہ کے بندوں کے درمیان وہ سرخ رو اور با عزت رہے آخرت میں اللہ تعالی کے نزدیک بھی سرخ رو اور دنیا سے زیادہ عزت یافتہ ہوں گے۔اللہ تعالی درجات بلند فرمائے۔آمین۔ ؎

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا رات کے تاروں سے بھی تیرا سفر

❁...❁...❁

❁...❁...❁

وقت کی قدر واہمیت اور حضرت الاستاذ مفتی صاحب قدس سرہ

حضرت مولانا توحید عالم قاسمی بجنوری
خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

سلطان العلماء، استاذ الاساتذہ، حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی وفات کا عظیم سانحہ ملت اسلامی کے لیے ایک ایسا عظیم خسارہ اور نقصان ہے جس کی تلافی بڑی مشکل ہے، بالخصوص مادر علمی دارالعلوم دیوبند اور ابناء دارالعلوم دیوبند کے لیے ایسا گہرا زخم ہے جس کے علاج ومعالجہ کے لیے ایک مدتِ دراز درکار ہے اور اس زخم کے بھرنے میں ایک لمبا عرصہ لگ جائے گا۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

الغرض حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی وفات حسرت آیات خود حضرت الاستاذ قدس سرہ کے لیے تو باعث صد افتخار وسعادت ہے کیوں کہ مہینہ بھی ایسا مبارک جس میں دوزخ کے دروازے بند اور بہشت کے دروازے وا ہوجاتے ہیں اور اس مبارک ماہ میں وصال نصیب وروں کو میسر ہوتا ہے، حالت بھی سفر اور غُربت کی جس میں انتقال کرنا شہادت کا درجہ رکھتا ہے، بیماری بھی وہ جس سے شہادت کا رُتبہ نصیب ہوتا ہے اور سب سے فائق اور بڑھی ہوئی جو چیز راقم کو متاثر کرتی ہے وہ ہے آخری ایام اور اوقات تک قرآن وسنت اور دین ومذہب کی ترویج واشاعت میں مصروف رہنا جو تمام اللہ والوں کی آرزو اور تمنا رہتی ہے۔

ان سب کے باوصف گرامی قدر حضرت اقدس استاذ محترم قدس سرہٗ کا وصال حضرت الاستاذ کے خوشہ چینوں،

روحانی ونسبی اولاداوراہلِ تعلق وارادت کے لیے بڑاالمناک اوردردناک حادثۂ فاجعہ ثابت ہواہے، ہرایک اپنے کوایسامحسوس کررہاہے جیسے بس یتیم وبےسہاراہوگیاہے، اب علمی وفکری سرپرستی کون کرے گا؟ ہرمیدان میں اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک ومنہج کی بےلاگ اور بلاخوف وخطرترجمانی کون کرے گا؟ باطل کے سامنے مردِمیدان بن کرکون کھڑاہوگا؟ وغیرہ۔

خیردین ومذہب اورقرآن وسنت کی حفاظت خودخالقِ کائنات کرتے ہیں اورخودانھوں نے اس کا ذمہ لیاہے۔اس لیے افرادوشخصیات کوکھڑاکرنااللہ کاکام ہےاوران شاءاللہ تاقیامت ایسی شخصیات آتی رہیں گی۔ بس ہم جیسے کم ہمت انسانوں کوایسالگتاہے جیسے یہ خلااب پُرہوناناممکن ہے؛ جب کہ خودحضرت الاستاذقدس سرہٗ ایساجملہ کہنےاورایسی بات زبان سے نکالنے پرناراض ہوتے تھےاوراپنی عادت کے عین مطابق برملاٹوکتے تھے کہ ایسامت کہو! اللہ تعالیٰ اہلِ علم وفضل کووفات دیتے رہتے ہیں اوردنیاکاکام بھی چلتاہی رہتاہے۔

قلم کے شہسواراوراس میدان کے تجربہ کارحضرات اس موقع پربہت کچھ لکھ رہے ہیں اورلکھیں گےاورہرہر پہلوپرارباب بصیرت کی نگاہ ہے، وہ حق ادافرمائیں گے، حضرت الاستاذقدس سرہٗ کی ہمہ جہت اورجامع کمالات ذات کے لیے ضخیم کتابیں وجودمیں آنے کی توقع ہے؛ لیکن میرے جیسے کم لکھنے والوں کوبھی دشواری پیش آرہی ہے اوربڑی دقّت درپیش ہے کہ کیالکھاجائے؟ اورکیانہ لکھاجائے؟ کیوں کہ اربابِ قلم نے تمام گوشوں اورشوشوں کا حق کردیاہوگا؛ لیکن پھربھی حقِ شاگردی اورادنیٰ تعلق بھی کچھ نہ کچھ لکھنے پرمجبورکررہاہےاورراقم السطورحضرت الاستاذقدس سرہٗ کی حیات وزندگی کے قابلِ تقلید پہلوؤں اورروشن اوصاف وکمالات جیسے درس وتدریس اورافہام و تفہیم کانرالاانداز، وعظ ونصیحت اوربیان وتقریرکادل چسپ اسلوب، تصنیف وتالیف کی گراں قدرخدمات، اہلِ حق اوراہلِ السنۃ والجماعۃ کی سب سے معتبرتعبیرعلماءدیوبند کے مسلک ومنہج کی بلاخوف وخطرترجمانی اوربلاکسی رورعایت کے حق گوئی وغیرہ کوبہ نظرغائردیکھتاہےتوان تمام میں وہ پہلوجوسب سے زیادہ متاثرکرتاہے وہ ہے

وقت کی قدر ومنزلت، اس کی حفاظت اور پھراس کا صحیح استعمال اور یہ وصف وخوبی حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہی ہے، ایسا نہیں ہے کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے بالغ النظر، کامل العقل ہونے کے بعد متاعِ وقت کی اہمیت کو سمجھا ہو؛ بلکہ آپ کی زندگی کا ہر دور خواہ بچپن ہو یا جوانی، کہولت ہو یا بڑھاپا ہر دور میں آپ اس وصف سے متصف نظر آتے ہیں۔ لہٰذا آپ قدس سرہ کے طالب علمی ہی کے دور سے یہ وصفِ محمود آپ کی زندگی کا جزء لاینفک بن چکا تھا۔

واقف کار حضرات اور حضرت الاستاذ قدس سرہ کی ادنیٰ معرفت رکھنے والے بھی اتنا تو جانتے ہی ہیں کہ حضرت نے اپنی جوانی سے اخیر وقت تک وقت کو ضائع کرنے اور ہونے سے حد درجہ گریز فرمایا ہے، اسی لیے درس وتدریس کی مشغولیت کے باوصف دورِ حاضر میں تصنیف وتالیف میں آپ اپنے معاصرین میں نمایاں ہیں، چھوٹی بڑی پچاس سے متجاوز کتابیں آپ کے قلم گہر بار کا نتیجہ ہیں جن میں چند بڑی ضخیم ونمایاں ہیں مثلاً (۱) رحمۃ اللہ الواسعہ شرح اردو حجۃ اللہ البالغہ پانچ جلدیں، (۲) ہدایت القرآن اردو زبان میں قرآن کریم کی تفسیر آٹھ جلدیں، (۳) تحفۃ الالمعی شرح اردو سنن ترمذی شریف چھ جلدیں، (۴) تحفۃ القاری شرح اردو بخاری شریف بارہ جلدیں، (۵) امداد الفتاویٰ کی چھ جلدوں پر حاشیہ، (۶) فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب جدید پر آخری عمیق نظر اور حواشی، (۷) تسہیل بیان القرآن پر نظر ثانی وغیرہ۔

یہ تو آپ کی جوانی اور بڑھاپے کی خدمات ہیں جن سے اخیر اور وسط زندگی میں ضیاعِ وقت سے پرہیز واضح ہوتا ہے اور طالب علمی میں وقت کی حفاظت حضرت کیسے فرماتے تھے اس کا اندازہ دو واقعات سے ہوتا ہے جو نہایت باوثوق اور معتبر شخصیات کے واسطے سے پہنچے ہیں۔

(۱) مخدوم گرامی، میر کارواں حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند بیان فرماتے ہیں (راقم نے حضرت سے کئی دفعہ یہ واقعہ سنا ہے) کہ مفتی سعید احمد صاحب کا کمرہ صدر

دروازہ کے باہر والا تھا جو آج کل شعبۂ صفائی کا دفتر ہے اور میرا کمرہ اس کے اوپر تھا مفتی صاحب کا افتا تھا اور میں ابتدائی جماعت میں تھا، سہ ماہی یا ششماہی امتحان سے فراغت کے بعد مفتی سعید احمد صاحب نے فرمایا کہ ابوالقاسم آؤ آج دارِ جدید کی طرف چلتے ہیں شوال سے ادھر جانا نہیں ہوا۔

واضح رہے کہ تکمیل افتا کے اسباق دارالافتا میں ہوا کرتے تھے، لہٰذا مولسری پار کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی درس گاہ، مسجد اور مطبخ سب ضرورتیں صدر دروازے کی طرف ہی تھیں اب اندازہ لگائیں دارالعلوم میں رہتے ہوئے دارجدید دیکھے ہوئے کئی ماہ گزر گئے یہ وقت کی کس قدر حفاظت ہے۔

(۲) استاذ گرامی حضرت اقدس مفتی محمد امین صاحب پالن پوری دامت برکاتہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند بیان فرماتے ہیں کہ بھائی صاحب دارالافتاء کے سال مجھے حفظ قرآن کریم کے لیے دیوبند لے آئے تھے اور میرا سبق، سبق کا پارہ اور آموختہ پارہ خود سنا کرتے تھے اسی میں محسوس فرمایا کہ حفظ سننے کے لیے سننے والے کا بھی حافظ ہونا ضروری ہے لہٰذا خود حفظِ قرآن کریم شروع فرما دیا اور ایک بھائی اور ساتھ تھے ان کو ابتدائی نحو وصرف وغیرہ کی کتابیں پڑھاتے تھے، نیز تین اساتذہ کرام حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مفتی مہدی حسن صاحب قدس سرہ مفتی دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا محمود عبدالوہاب محمود مصری قدس سرہ استاذ دارالعلوم دیوبند کی مستقل خدمات کرنا بھی بھائی صاحب کا عمل تھا۔ اب اندازہ لگائیں افتاء کے اسباق کا مطالعہ، تمرین فتاوی، میرا سبق، سبق کا پارہ اور آموختہ پارہ سننا اپنا حفظ قرآن کرنا، دوسرے بھائی کو کتابیں پڑھانا اور سننا اور تین تین اساتذہ کرام کی خدمات بجالانا یہ سب وقت ضائع کرنے کے ساتھ ممکن ہی نہیں ہے؛ بلکہ وقت کی قدر اور اہمیت کا ادراک کر کے اس کی حفاظت اور صحیح استعمال کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

اس لیے یہ تمام خُردوں اور خوشہ چینیوں کو حضرت اقدس استاذ محترم قدس اللہ سرہٗ کے تمام اوصاف کو اور

بالخصوص اس اہم خوبی اور وصف کو اپنانے کی ضرورت ہے اور یہ بھی حضرت والا قدس سرہٗ کو سچا خراج تحسین ہے۔

اللہ تعالیٰ استاذ گرامی قدس سرہٗ کی بال بال مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہم تمام شاگردوں اور ارادت مندوں کو آپ کے اوصاف اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین!

الاستاذ العبقری؛ چند اوصاف وکمالات

حضرت مولانا احمد سعد قاسمی صاحب
المعہد العلمی الاسلامی دیوبند

پوری علمی دنیا اس وقت سونی ہوگئی آنکھیں نم ہوگئیں دل ودماغ کی دنیا میں ایک زلزلہ سا آگیا، جب خبر وحشت اثر ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء کی صبح بوقت اشراق کانوں میں پڑی کہ عالم اسلام کے بڑے عالم دین دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس وشیخ الحدیث حضرت الاستاذ الکبیر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری راہی آخرت ہوگئے نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ وَبَرَّدَ مَضْجَعَہٗ وَاَسْکَنَہٗ بُحْبُوحَۃَ جِنَانِہٖ۔

کھوکے اپنی بزم سے احباب مے خانہ مجھے
عمر بھر ڈھونڈا کریں گے کہ کے دیوانہ مجھے
جان کر منجملۂ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

آپ کی رحلت کوئی عام واقعہ نہیں بلکہ علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے ایک عظیم نقصان ہے، بہت سے اساتذہ اور شخصیات اٹھتی ہیں اوران کا خلا کبھی ان کے لائق اولاد اور اکثر ان کے تلامذہ کے ذریعہ پیشگی پُر رہتا ہے مگر ۔۔۔یہاں دیر تک اور دور تک سناٹا ہے حضرت الاستاذ العزیز کے اندر فیاض ازل نے وہب وکسب کے متعدد علمی عجائبات ونوادرات، عادات وصفات کے امتیازات ودیعت کئے تھے۔

ملکوں ملکوں ڈھونڈوگے ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

دراز قد، خضاب سرخ سے ملون گھنی ڈاڑھی، نصف ساق تک کا جبہ دائمی لباس، سر پر کلاہ مدور، کبھی سر پر تاج

عمامہ، زیادہ تر سفید رومال کا ھالہ، جس سے آنکھوں کا پردہ کرتے، چہرہ پرکشش، مگر وجاہت ورعب سے مالا مال ،آواز بھاری اور مرعوب کن ، گفتگو نہایت فصیح وبلیغ وباوقار، حرف حرف واضح ، ہر بات دل نشین مثالوں سے پُر، سوچ کر اور تول کر مرتب بولتے اور دل میں اتار دیتے، خورد وکلاں کو سلام میں سبقت کرنے میں ممتاز، علم کے دھنی ،انضباط وقت کی نادر مثال ،کثرت علائق ومجلس آرائی سے بیزار، مزاج میں عالمانہ شان کا استغناء ،تملق وخوشامد سے کوسوں دور، اور بہت کچھ اوصاف اور خوبیاں، آپ کے گلشن حیات کے نمایاں اور خوش رنگ پھول تھے۔

ایک واقعی عالم کی پہچان صرف یہی نہیں کہ کسی مدرسے کی چہار دیواری میں مخصوص مدت اور مخصوص نصاب پڑھ لیا بلکہ علم کی چاشنی سے بہرور ہو، مطالعہ کا خوگر ہو، علمی اشتغال کو مادیت پر ترجیح دینے کا مزاج ہو، علم کی بقاواضافہ کے لیے حالات کی تلخ کامیوں پر صبر وشکیب رکھتا ہو، علمی ترقی کے مواقع کا متلاشی ہو- یہ ایک عالم کی متوسط درجے کی کیفیت ہے ورنہ اہل علم وکمال نے تو سخت ترین شدائد میں صبر واستقامت کے ساتھ عجائبات ونوادرات کو وجود بخشنے میں ایسی تاریخ رقم کی ہے کہ قلم وزباں سے اس کی ترجمانی بھی ناممکن ہے۔

مگر اب تو علم وعالم کا مفہوم حقیقت سے کوسوں دور صرف عرفی مفہوم میں باقی ہے چمکتے ضرور نظر آتے ہیں مگر سونا نہیں ہوتے۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ میں چند خاص اوصاف ایسے تھے کہ سارے تلامذہ اس کو محسوس کرتے تھے اور ان کو قابل تقلید نمونہ سمجھتے تھے۔

قابل تقلید معلم

ان کی زندگی کا ایک نمایہ گوشہ یہ تھا کہ وہ ایک قابل تقلید باکمال نادر مثالی مدرس ومعلم تھے، یہ کلمہ اپنے وسیع تر مفہوم کے ساتھ ان پر منطبق تھا، ایک باکمال مدرس کی خوبی یہ ہے کہ عبارت کو پوری گہرائی سے سمجھ کر اس پر حاوی

ہوجائے، شارحین کے قیل وقال کے منتشر جواہر کو چھان پھٹک کرکے مخاطب کی سطح کے مطابق لڑی میں پروکر ایک پرکشش تمہید کے ساتھ مسئلہ کا مالہ وماعلیہ دل نشین مثالوں کے ذریعے طلبہ کے دل میں اس طرح اتار دے کہ غبی اور کم ذہن بھی بالکل محروم نہ رہے، ساتھ ہی وقت کا پابند ہو، دیر حاضری وغیر حاضری سے سختی سے مجتنب ہو، طلبہ کے ذہنوں میں وارد ہونے والے اعتراضات کے جوابات سے بھی نوازتا ہو، نصاب کو توازن سے لے کر چلتا ہو، ایسا نہ ہو کہ شروع سال میں (بطئی السیر) پسنجر ہو اور آخر میں (سریع السیر) سپر فاسٹ ہو۔

یہ ساری خوبیاں تو حضرت الاستاذ میں تھی ہی مزید یہ تھی کہ ان کا تکلم بڑا فصیح وبلیغ تھا، اس کے باوجود ہر بات سنت کے مطابق تین مرتبہ دہراتے یہاں تک اچھی طرح مفہوم سمجھ میں آجاتا تھا، اور خداداد خاص چیز یہ تھی کہ ان کی بیان کردہ بات یاد ہوجاتی تھی، برسہا برس گزرنے کے بعد بھی آج تک ان کی بہت سی تعبیرات اور انداز سخن ذہن میں محفوظ ہے۔

درس میں ان کا ایسا ساحرانہ انداز تھا کہ تمام طلبہ گوش برآواز رہتے اور (کأَنَّمَا عَلٰی رُؤُسِنا الطَّیورُ) کا منظر ان کے درس میں سامنے آجاتا۔

دارالحدیث میں پہونچنے کے بعد مسند کے قریب پہونچ کر سب کو زور سے سلام کرتے، سلام کی کثرت، خورد وکلاں کو سلام میں سبقت ان کے امتیازات میں تھی، حدیث کے درس سے پہلے وہ خطبہ پڑھتے، بعدہ دلنشیں تمہید قائم کرتے، حدیث کا پس منظر ذکر کرتے، اور صاف وشفاف مفہوم سیاق وسباق، اقتضاء مقام کی رعایت سے دل میں بٹھادیتے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت الاستاذ تفہیم کے بادشاہ تھے، لوہے کو موم کردیتے کوئی بات ایک بار کہہ کر نہ گزرتے بلکہ اکثر وہ تین مرتبہ بات دہراتے اور ہر دفعہ الفاظ بھی وہی رہتے جس سے طلبہ کو لکھنے میں بڑی سہولت ہوتی بلا مبالغہ سیکڑوں امالی ان کے درس کی طلبہ کے پاس محفوظ ہیں، بات کو سہل تر کرنے میں ان کے متعدد طریقے تھے: ایک تو یہ کہ وہ مضمون پہلے مرتب کرکے آتے، دوسرے یہ کہ فصاحت کے ساتھ سنبھال کر

بولتے اور مکرر سہ کرر دہراتے، تیسرے یہ کہ: ہر مسئلہ کو دل نشیں مثال سے بدیہی بنادیتے، مثال کے بغیر شاید ہی ان کی کوئی بات مکمل ہوتی ہو۔

چوتھے یہ بھی ان کی مؤثر خصوصیت تھی کہ: درمیان کلام میں جب کوئی خاص محاورہ، یا ضرب الامثال آتیں تو یہ بھی بتاتے کہ اس محاورہ کا استعمال کب اور کیوں کیا جاتا ہے، اس مثل کا پس منظر، اور مطلب کیا ہے، مثلاً اگر انہوں نے مثل استعمال کی ''نہلا پہ دہلا'' تو اس کی تشریح بھی کرتے کہ یہ جواریوں کی اصطلاح ہے، ایک جواری ایک تاش پھینکتا ہے جس پر نو نشان ہوتے ہیں اس کو ''نہلا'' کہتے ہیں اور دوسرا جواری اس کے توڑ کے لئے اس سے طاقت ور دس نشان کا تاش پھینکتا ہے، اس کو ''دہلا'' کہتے ہیں، دوسرا کامیاب ہوجاتا ہے، معترض کی دلیل سے زیادہ مضبوط دلیل جب دی جائے جس سے وہ لاجواب ہوجائے تو یہ محاورہ بولتے ہیں، اب بات پوری سمجھ میں آئی، محاورے کا صحیح استعمال سمجھ میں آیا۔

پانچواں یہ کہ: ان سب کے بعد بھی اگر تشنگی باقی رہتی اور پرچیوں پر اعتراضات پہونچتے تو ان کا بھی اتنا ہی اطمینان سے جواب دیتے۔

چھٹا وصف یہ تھا کہ: وہ طلبہ کی نفسیات تاڑنے میں ماہر تھے، طالب علم کو عبارت میں کسی جگہ دقت پیش آنے والی ہے اس جگہ اسی اعتبار سے وضاحت کرتے اسی لیے ان کا درس مقبولیت میں ضرب المثل تھا۔

ایک مرتبہ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ: میں نے دو استاذوں کے طریقوں کو ملا کر درس کا طرز اپنایا ہے: ایک تو امام النحو حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جمویؒ (استاذ مظاہر علوم سہارنپور) ان کی خصوصیت تھی کہ بات کو بالکل نیچے سے اٹھاتے (عام فہم مثالوں سے سمجھانا) شروع کرتے، دوسرے استاذ حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ قدس سرہ کہ وہ مسئلہ کے سب سے اہم پہلو کو مختصر جامع انداز سے بیان کرتے اور آگے بڑھ جاتے، میں نے دونوں کو ملایا کہ بات نیچے سے شروع کرتا ہوں پھر اہم بات بتا کر ختم کرتا ہوں جس سے ہر طالب علم کو کچھ نہ کچھ مل

جاتا ہے۔

کسی استاذ یا مؤلف کے مزاج واسلوب سے آشنائی ہوجائے تو اس کی تحریر وتقریر سمجھنا آسان ہوجاتا ہے ،حضرت الاستاد کا انداز عام شارحین ومدرسین سے ہٹ کر تھا ، قیل وقال کا مزاج بالکل نہیں تھا کہ فلاں نے یہ کہا ، فلاں نے یہ کہا، فلاں نے یہ جواب دیا، فلاں نے یہ جواب دیا الا ماشاء اللہ کبھی ضرورت ہوتی تو نام لے کر بھی بیان کرتے ،لیکن ان کی خصوصیت یہ تھی کہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ بذات خود مفہوم سمجھنے پر زور صرف کرتے ، پھر جو منقح ہوتا اس کو شرح صدر سے بیان کرتے اور جو کچھ کہتے اس میں تشکیک بالکل نہیں ہوتی تھی ، پوری بصیرت اور اعتماد کے ساتھ زور دیکر کہتے تھے (خواہ دوسروں کی تحقیق میں وہ قول راجح نہ بھی ہو) ۔

یہ امر واقعہ ہے کہ استاذ اگر غیر یقینی اور ڈھل مل انداز سے بات کرے تو طالب علم کو قلبی اطمینان نہیں ہوتا اور محنت پر پانی پھر جاتا ہے،غرض وہ اقوال کے پھول بکھیرنے کے بجائے اس کا رس چوس کر شہد بنا کر پیش کرتے ، پھراس کی چاشنی کس کو محسوس نہ ہوگی ؟!ان کا یہ جاذب انداز واسلوب ہزاروں تلامذہ کے لیے نقش دوام ثابت ہوا ہے

جو طرز فغاں کی ہم نے قفس میں ایجاد
فیض گلشن وہی طرز بیاں ٹھیری ہے

استاذ کی ظاہری وضع وہیئت، نشست وبرخاست ، نظافت، متانت ، نیز تخاطب کا انداز بھی ایک تاثیر رکھتا ہے، حضرت مفتی صاحب کے اندر یہ ساری چیزیں بھی بدرجہ اتم تھیں، نصف ساق کا جبہ، گول ٹوپی ، رومال تو دائمی لباس تھا۔کبھی کبھی وہ عباء میں آتے کبھی عمامے میں، ان کی ظاہری وجاہت کی بھی دھاک بیٹھ جاتی۔

حضرت الاستاذ کے درس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ: جو دیگر درسی تقریروں میں نہیں ملتی کہ وہ صرف احکام ومسائل کی احادیث ہی پر کلام نہیں کرتے تھے بلکہ معاشرتی ، معاملاتی حدیثوں پر بھی اسی اہمیت سے کلام کرتے

تھے اوراس سے متعلقہ امور کی حالات حاضرہ کی روشنی میں وضاحت کرتے ، اورحدیث کی عبارۃ النص کوخوب واضح فرماتے ۔طریقہ درس یہ تھا کہ: آنے والی عبارت کا مطلب پہلے سمجھاتے، خاص الفاظ وتعبیر کی وضاحت کرتے پھرحدیث کی تلاوت ہوتی تو حدیث قراءت کے ساتھ ہی سمجھ میں آجاتی۔

پورے سال میں کبھی ان کونشست بدلتے نہیں دیکھا، چارزانو بیٹھ جاتے پھر پورے درس میں (خواہ وہ دو گھنٹے بھی ہوا) ایک ہی ہیئت پر رہتے، چہرہ ایک ہی طرف نہ رکھتے بلکہ دائیں بائیں ہرطرف نظر رکھتے، درس بھی خشک ترکی مثال تھا، جب وہ پوشیدہ مسائل سے متعلق مسئلہ سمجھاتے توکسی کو ہنسنے کی قطعاً گنجائش نہ تھی مگر وہ طلبہ کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے درمیان میں لطائف وظرائف کا حصہ بھی رکھتے جس سے طلبہ میں ایک نشاط پیدا ہوجاتا۔

اب جواستاذ اسباق کے اتنے آداب برتتا ہواس کوطلبہ کے لااُبالی پن سے بھی سخت وحشت ہونا بھی طبعی بات ہے اس لیے حضرت کے درس میں سبق شروع ہونے کے بعد درسگاہ میں داخل ہونا جرم تھا،عبارت پڑھنے کے بھی آداب تھے،اس کی تعیین بھی وہ خود ہی کرتے تھے،درس حدیث کے دوران ادنی درجے کا خارجی عمل انہیں بالکل برداشت نہیں تھا، دفتر اہتمام یا تعلیمات سے آئی ہوئی تحریر یا گشتی بھی درمیان میں دکھانی ممنوع تھی۔

انھیں صلاحیتوں کی وجہ سے جب وہ دارالعلوم آئے تو ان کے کئی اساتذہ اوردیگر قدآورشخصیات موجود تھیں مگر ان کے درس کا امتیاز اوراس کی کشش طلبہ کے دل ودماغ پر چھانے لگی مقبولیت کے پھریرے اڑنے لگے پھر وہی ہوا جو ہوتا آرہا ہے کہ

محسود بھی ہوئے اور مسحور بھی مگر کوہ گراں
بنے رہے کہ تم تیر آزماؤ ہم جگر آزمائیں

پھر جب دارالعلوم میں صدارت تدریس اورشیخ الحدیث کا منصب ان کی صلاحیتوں نے انھیں دلوایا تو پھر یہی

سوغات حسد وسحر دوبارہ ملی اورتادم واپسیں وہ سحر کے اسی کرب کو بے شکوہ شکایت جھیلتے رہے یہاں تک کہ روح کو حوالہ اجل کر کے کاشانہ فردوس کونشیمن بنالیا علیین سے ان کی روح کہتی ہوگی ؎

تو مرا حوصلہ تو دیکھ داد تو دے کہ اب مجھے
شوق کمال بھی نہیں خوف زوال بھی نہیں

شان خودی

حضرت والا کی یہ ادا بھی معروف تھی، سچ تو یہ ہے کہ اس وصف کی کمی ایک عالم دین کی زندگی کا نقص ہے ،حضرت والا کواس سے بھی حظ وافر حاصل تھا، وہ یہ کہ وہ مزاج کے بڑے مستغنی تھے مال ہو کہ منصب انہوں نے دونوں سے ساری عمر پورا استغناء برتا ،طلب اور حسن طلب سے کوسوں دور رہے بس وہ دور سے ہی شاہ وگدا سب سے صاحب سلامت رکھتے ،سب سے الگ تھلگ ہونا گو مستغنی ہونے کے لوازم میں سے نہیں ہے لیکن انہوں نے اپنے کو علم میں ایسا فنا کیا تھا کہ علم کی لذت آشنائی نے ان کو سب سے بیگانہ کر دیا تھا، ان کی فرودگاہ بھی دارالعلوم سے اتنے فاصلہ پر ایسے گوشہ گم نام میں تھی کہ محض ارادہ نہیں بلکہ عزم وقصد کے بغیر وہاں تک رسائی کا سوال ہی نہ تھا پھر جناب والا کی طرف سے بعد عصر تا مغرب کے علاوہ ممنوع الدخول کا اعلان تھا۔ کیونکہ وہ وقت کا بھر پور خراج وصول کرتے تھے (بقول حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ،علیہ الرحمۃ : مروت واصول جمع نہیں ہوسکتے)اس لئے غالبا باوجود سخاوت نفس کے ان کے یہاں وسعت دسترخوان اورلذت کام ودہن کا سلسلہ کبھی نظر نہیں آیا۔

تقوی کا بہت اہم پہلو جس کا تذکرہ بڑے اور پرانے اکابر کے یہاں سننے کو ملتا ہے اس میں بھی حضرت والا نے اتباع کی نظیر قائم کی کہ دارالعلوم اوراس سے پہلے مدرسے سے لی ہوئی تنخواہ مکمل حساب کر کے واپس کردی ،بات صرف یہی نہیں کہ ان کو وسائل حاصل ہو گئے تھے، وہ تو اوروں کو بھی ہوتے ہیں، بلکہ قابل عبرت ان کا جذبہ

اخلاص ہے، حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''اِنْ أَیْسَرْتُ قَضَیْتُ'' اگر مجھے سہولت وسعت ہوگی تو میں بیت المال سے لیا ہوا مال و تنخواہ واپس کردوں گا۔ (اسلام اور سیاسی نظریات ص ۲۹۳، مئولفہ حضرت مفتی تقی صاحب بحوالہ طبقات بن سعد)

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

ملنے ملانے میں ان کے یہاں فرق مراتب رہتا تھا، بعد عصر صلائے عام تھا خورد و کلاں اغیار احباب سبھی طرح کے لوگ وارد وصادر ہوتے دارالعلوم کے طلبہ واساتذہ بالخصوص مستفید ہونے جاتے، مدرسین پیچیدہ عبارتوں کے حل کے لئے بھی آتے، کتاب کا تعلق علم عقلی (منطق وفلسفہ) سے ہو یا نقلی (نصوص قرآنی یا حدیثی یا فقہی) چند منٹ میں چٹکی بجاتے وہ حل کرتے، اس وقت ان کی ژودفہمی عبارت پر گرفت کا اندازہ ہوتا اور مختلف فنون کی اصطلاحات کے استحضار کا پتہ چلتا سرعت فہم بھی مثالی تھی، کیا؟ کیوں؟ کیا مطلب؟

اس کی نوبت شاید ہی آتی ہو، ادھر سوال ہوا اُدھر جواب حاضر، لیکن اس کے ساتھ ہی ادّعاء کلی بھی نہ تھا بلکہ بہ کثرت وہ صاف صاف یہ بھی کہتے ''مجھے معلوم نہیں''، ''مجھے اس کی تحقیق نہیں''، ''میرے علم میں نہیں'' مطلب یہ کہ زبردستی کا جواب نہیں تھوپتے تھے۔

درس وخارج درس ان کی گفتگو میں پوست کم اور مغز زیادہ ہوتا (**خیر الکلام ماقلَّ و دلَّ**) کا مصداق، غالباً وجہ اس کی یہ ہے کہ اساتذہ میں جن کے اثر کو انہوں نے زیادہ قبول کیا اور جن سے ان کی طبیعت زیادہ ہم آہنگ ہوئی وہ نابغہ روزگار وفخر زمانہ استاذ جن کو فضلاء دھر نے علامہ کے لقب سے بجا طور پر ملقب کیا یعنی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ وخلیفہ) تھے، حضرت مخدوم اکتساب فیض کے علاوہ ان کے خدمت گزار بھی رہے، زباں زد خاص وعام ہے کہ علامہ کی بات جوامع الکلم کے انداز کی ہوتی تھی، ان کے ایک

جملہ میں پورا ایک مضمون پنہا ہوتا، حضرت مفتی صاحب ان کے اقوال عظمت واہمیت سے نقل کیا کرتے تھے۔

علمی مقام

ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کسی کو مبدأ فیاض سے تفسیر و حدیث و فقہ تینوں میں درک حاصل ہوجائے اور ہر سہ علوم سے پوری مناسبت ہو مطالعہ ہواور اس کی کسی بھی گتھی کو سلجھانے پر قدرت ہو، یہاں تک بھی اشتراک آسان نہیں لیکن نادر بھی شاید نہ ہو، مگر منطق وفلسفہ پر بھی ویسا ہی عبور ہو اس کی عقلی وادیوں فلسفیانہ موشگافیوں کا بھی شناور ہو ان معقول ومنقول کے تلازم کے بعد قحط الرجالی سامنے آئی ہے مزید برآں ان سارے علوم کو ہر دو زبان وقلم سے شگفتگی کے ساتھ مرتب کرکے قلب وقرطاس پر ثبت کردے اور رب کے بخشے ہوئے ان انعامات کے شکر میں تادم زیست ان کی نشر واشاعت میں لگا رہا ہو، اوران کو حسن طباعت کے اعلی ذوق سے چھاپ کر عام بھی کیا ہو، ان قیود کے ساتھ آں مرحوم ومغفور کی انفرادیت مسلمہ بن جاتی ہے۔

کچھ ایسے بھی پروانے ہیں اس بزم میں جن کو
تم ڈھونڈنے نکلوگے مگر پا نہ سکو گے

اسی جامعیت کیوجہ سے ان کی تحریر وتقریر میں بعض بڑے پتے کی باتیں مل جاتیں ہیں جو ذہن کی گرہ کھول دیتیں ہیں۔

مزاج وافتادطبع

جہاں تک ان کے مزاج کی بات ہے طبیعت کھلی ہوتی تو معاصرین ہی نہیں اپنے عام تلامذہ سے بھی بلاتکلف گفتگو کرتے تبصرے، تجزیے، تجربے، لطیفے، چٹکلے سب ہوتے، لیکن مزاجاً اصول پسند تھے اور مشاہدہ ہے کہ اصول پسند آدمی نازک مزاج ہوتا ہی ہے اور عام طلبہ کے ساتھ ان کا معاملہ (شاید طلب صادق دیکھنے کے لیے، یا موڈ نہ ہوتا تو) یہ بھی ہوتا کہ شروع میں خشونت آمیز انداز سے جواب دیتے جس سے طالب علم کو جھٹکا سا لگتا اب اگر عزت

نفس کا مغلوب ہوتا تو بیک بینی و دو گوش ایسا لوٹتا کہ پھر رخ نہ کرتا اور جو علم کے لیے اس تلخ کامی کو دواء طبیب سمجھ کر کڑوا گھونٹ پی لیتا وہ فائدہ اٹھاتا رہتا، ان کے اوقات کی رعایت سے ملاقات واستفادے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ بنیادی طور پر ان کے مزاج میں دو باتیں بطور خاص تھیں ایک محنت جفاکشی دوسرے اصول پسندی ،محنت و جفاکشی کی مثال ایک تو ان کا فراغت کے بعد حفظ کرنا ہے جو عادۃ بڑی عمر میں بہت مشکل سے ہوتا ہے دوسرے باقاعدہ انگریزی زبان پڑھنا قدیم اساتذہ میں انگریزی میں ان جیسی استعداد کا حامل دارالعلوم میں کوئی نہیں تھا فراغت کے بعد(واضح ہو کہ مرحوم لفظ فراغت ہی کے مخالف تھے فرماتے تھے اس لفظ نے ریڑھ ماردی)ایسا ہاتھ پیر ڈالا جاتا ہے کہ اب آگے طلب گویا ممنوع ہے یا اب اس کا زمانہ ختم ہوگیا ایک مرتبہ حضرت نے دارالعلوم کے سالانہ انعامی جلسے میں جو ہمیشہ نہایت وقار کے ساتھ منعقد ہوتا ہے،کلیدی خطاب کرتے ہوئے (جو ہمیشہ انہیں کا ہوتا تھا اور علم و تعلم کے حوالے سے بہت پر مغز ہوتا تھا، اتفاق کہ زندگی کا آخری خطاب بھی رحاب جامعہ میں انعامی اجلاس کا ہی ہوا) فرمایا تھا کہ آٹھ سال تو تمہارے اندر علم حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی گئی ہے اب جاکر پندرہ سال پڑھاؤ اس کے بعد علم آنا شروع ہوگا۔

چونکہ اصول وضابطہ ان کے مزاج میں شامل تھا بلکہ بعض اصولوں میں وہ بہت مضبوط تھے، انہیں میں سے ایک یہ کہ وہ حدیث کی اجازت دینے میں محدثین کی شرائط معتبرہ کے سختی سے قائل تھے جب تک وہ حدیث کی قرأءت اور اس کے فہم پر مطمئن نہ ہوجاتے بالکل اجازت نہ دیتے، ایک مرتبہ ملک قطر سے چند عرب اہل علم آئے ، دیوبند، سہارنپور کے تمام بڑے علماء سے اجازت حدیث لی، حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں گئے مگر انہوں نے اجازت دینے سے معذرت کردی کہ جب تک میں حدیث دانی پر مطمئن نہ ہوجاؤں اجازت کا معمول نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے حضرت کو قطر دعوت دی وہاں حدیث سنکر اور پڑھا کر اجازت مرحمت فرمائی اور وہاں عربوں میں حضرت کے، حجۃ اللہ البالغہ، کے دروس بھی ہوئے جسمیں یہ بات بھی فرمائی کہ محدث ناصرالدین البانی نے

حدیث کی سند اور اس پر حکم کے بارے میں حدیث ضعیف اور موضوع کو ایک ہی درجے میں کر کے اور صحاح ستہ کی حدیثوں پر اپنا حکم تھوپ کر اس کے مولفین سے اعتماد کو مجروح کیا ہے ان چیزوں کا نقصان دوسو سال تک رہے گا۔

اولاد کی تربیت میں بھی جو جد وجہد انہوں نے کی وہ بھی ایک ریکارڈ ہے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی بھی علم وفن میں جو فنا ہو جاتا ہے وہ اولاد سے غافل ہو جاتا ہے کسی مدرسے میں داخل کر دیا اور پدری ذمہ داریوں سے بری الذمہ، مفتی صاحبؒ تمام تر علمی تدریسی وتالیفی انہماک کے ساتھ اس فریضے سے مطلق غافل نہیں ہوئے بلکہ اس میں بھی نظیر قائم کی کہ تمام لڑکوں کی سال سوم تک کی تعلیم دینے کا انہوں نے بذات خود اہتمام کیا اپنے نظام الاوقات کا اہم جزبنایا، اس طرح نامناسب ماحول سے بھی بیت واہل بیت کو بچانے کی پوری سعی کی، حد یہ کہ اپنی زوجہ محترمہ مرحومہ کو انہوں نے گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ حفظ کروایا یہی نہیں پھر اہلیہ محترمہ نے اپنے اکثر صاحب زادوں اور دو فرزندیوں اور پانچ بہوؤں کو حفظ کروایا، ڈگریوں کی دوڑ میں سبقت لیجانے کے اس ماحول میں کتاب اللہ کی یہ قدر وعظمت اور اس کے لیے جفاکشی ایک نادر نمونہ ہے۔

دیوبندیت کیا ہے؟

مسائل شرعیہ، اعمال دینیہ کی تنقیح کر کے ما انا علیہ وأصحابی کے ٹھیٹھ متوارث مفہوم پر افراط وتفریط سے بچتے ہوئے نظریہ اور عمل کو منطبق کرنا ہی دیوبندیت ہے حضرت مفتی صاحب قدس سرہ اس بارے میں بہت حساس واقع ہوئے تھے اب اس کی تنقیح وتفصیل کا وہ قطعی فیصلہ کر چکے تھے مگر پیغام اجل آ گیا اور یہ موضوع ''دیوبندیت کیا ہے'' تشنہ رہ گیا۔

دیوبندیت کے نام پر جو بدعت آمیز اعمال شروع ہوئے ہیں ان پر وہ بجا طور پر سخت برہم تھے جیسے ختم بخاری، مروجہ طرز کا اجتماعی اعتکاف، خواص کی قبر عمومی قبرستان سے ہٹکر بنانا، وغیرہ اس باب میں انہوں نے بے لاگ لپیٹ، بے خوف لومۃ لائم بدعت زدہ اعمال پر ڈٹ کے رد کیا، فرماتے تھے کہ میں اکابر کا متبع ہوں اکابر

پرست نہیں ہوں، تبلیغی جماعت کے مروجہ نقائص و بے اعتدالیوں پر جتنے دوٹوک جرأت مندانہ بیانات انہوں نے دیے وہ کوئی اور نہیں دے سکا بلکہ اکثر حضرات مفاد و مصلحت کے خول میں ہی پناہ گزیں رہے، اسی طرح مشائخ کے اور مروجہ تصوف کے انداز پر انہیں اعتراض تھا اس لیے بذات خود بھی انہوں نے محدثین کے طرز کا تصوف ومسلک اختیار کیا تھا مشیخت کے عرفی لوازمات سے بہت دور تھے۔

بحیثیت مؤلف

طبعاً وہ تالیفی مزاج کے حامل تھے اسی لئے شروع سے ہی انہوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ رکھا مختصر ومطول، درسی، غیر درسی، شرح یا متن عربی میں یا اردو میں ان کے آہوئے قلم سے مفید و تحقیقی چیزیں سامنے آتی رہیں (تالیفات کا تعارف ان کی سوانح کا اہم باب ہے) ان میں چند کتابیں جو ان کی زندگی کی محنت کا نچوڑ تھیں ان کی شہرت کو بلندیوں تک پہونچایا اور ان کے علمی مقام کا ایک زمانے نے اعتراف کیا، وہ جامع ترمذی کی مفصل مکمل شرح جس کو انہوں نے تیس برس تک پڑھایا تھا، بخاری شریف کی مکمل شرح جس کو انہوں نے تیرہ برس پڑھایا (لیکن معلوم رہے کہ اس سے قبل بھی دومرتبہ موصوف نے دارالعلوم میں بخاری پڑھائی ہے ایک مرتبہ سن ۸۰ر کے انقلاب کے سال میں جس کو کیمپ کا سال کہتے ہیں، دوسرے حضرت الاستاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلند شہریؒ نے علالت طبع کی وجہ سے خود ہی ایک سال کے لیے سپرد کردی تھی)

اس کے علاوہ ان کی زندگی کا تالیفی شاہ کار، ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' ہے جو ہندوستان کی تاریخ کی عظیم المرتبت کتاب بلکہ تصنیفی ذخیرہ کا گل سرسبد، یعنی حجۃ اللہ البالغہ، کی مفصل ومکمل شرح ہے، جو دور آخر کے قائم الزمان، موھوب ومنتخب مبعوث شخصیت، مسند الہند امام اکبر احمد بن عبدالرحیم المعروف شاہ ولی اللہ الدہلوی کی فخر زمانہ تالیف ہے۔

جس کی تالیف کا حکم خود حضرت رسالت مآب - علیہ افضل الصلوات و التحیات - نے فرمایا حضرات

حسنین کریمین کے ذریعہ قلم عنایت کیا گیا تھا، جس کی تفصیل خود حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے شروع میں لکھی ہے، ملاء اعلی سے جس کتاب کی تصنیف اور مصنف کا فیصلہ کیا گیا ہو پھر اس کے کیا کہنے!!

کتاب کے مصنف امام نے جو مجتہدانہ طرز واسلوب اختیار کیا تھا اسرار وحکم کے جو الہامی واردات بطون اوراق میں ودیعت کیے تھے عربیت کے ذوق بلند کی رعایت سے ایک روشناس زبان نے جس بلیغ انداز میں نگارش کی تھی اس کی فہم وتفہیم کے سامنے عام علماء نے تو پہلے ہی گھٹنے ٹیک دیے اور جو ماہرین جوہر شناس تھے چاہت کے باوجود ان کو فرصت میسر نہ آئی اس کی تشریح کی تمنا لیے ہوئے آسودۂ خاک ہو گئے۔

وَ کَمْ حَسَرَاتٍ فِیْ بُطُوْنِ الْمَقَابِرِ

اصل میں تقدیر کے قلم نے جس کے حصے میں جو چیز لکھ دی نگاہ ظاہر بین جو کچھ بھی دیکھے، اس کی تکمیل اسی سے ہوگی پھر کہا جائے گا کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

غرض حضرت الاستاذ مرحوم نے پہلے تو دنیا کے مشہور مقامات سے اس کے مخطوطے حاصل کیے پھر اس میں مقارنہ کر کے متن کی تصحیح کی اب کہا جا سکتا ہے کہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا سب سے صحیح متن یہی ہے۔

ڈھائی سو سال کا یہ قرض جو خوان ولی اللہی کے جرعہ نوشوں پر چلا آ رہا تھا پوری جماعت اس کی جواب دہ تھی کاتب تقدیر حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے نام اس اعزاز کو لکھ کر فارغ ہو چکا تھا، اس کا بیڑا اٹھانا بھی کچھ کھیل نہیں تھا، جوئے شیر نکالنی تھی جس کے لئے محض متداول علوم میں مہارت ہی کافی نہیں تھی بلکہ علوم ولی اللہی سے گہری مناسبت اس کے معقولی ومنقولی فلسفیانہ پیچ وخم پر پوری دسترس ہو، مصنف کے اجمال سے تفصیل کو، کنایہ سے تصریح سمجھے، متن سے شرح کا استنباط کرے، ذہن آخاذ ہو وقت نظری ایسی ہو کہ زمین کے اوپر سے پانی اور پانی کی تہ

میں موتی کو دیکھ لے اور پھر اس کو لڑی میں پروکر ایسا ہار تیار کردے جو نور افزائے دیدۂ دل ہو ان سب کے بعد کام کی ایسی وارفتگی ہو کہ اس کو اوڑھ لے، یہ کہکر پیچھے نہ ہٹ جائے کہ: ؎

ترے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

حضرت ممدوح نے طویل ترین عرصہ تک حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا بعد اس کے کہ انہوں نے حکمت ریز زبان وقلم کے مالک حکمت قاسمی کے امین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحب طاب ثراہ جیسے استاذ سے درس لیا، ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ دوران درس اعتراض کیا گھنٹہ ختم ہوا اگلے دن پھر تیسرے دن میرا اشکال جاری رہا حضرت جواب دیتے رہے پھر حضرت نے فرمایا اور طلبہ کا نقصان ہوگا تم گھر پر پوچھ لینا۔

غرض ماہر فن سے پڑھنے سے ایک ذکی طالب علم کی صلاحیت دوآتشہ ہو جاتی ہے یہ چیز بھی حضرت شارح کو حاصل تھی پھر وقت آیا اور چھ ضخیم جلدوں میں ایک وقیع وعظیم شرح منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی برصغیر میں جس کا غلغلہ مچ گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ سے منسوب تمام مکاتب فکر کی طرف سے نعرہ تحسین بلند ہوا سب نے اس گراں قدر نادر علمی خدمت کے انجام دینے پر ہدیہ تشکر پیش کیا۔

حضرت مفتی صاحب ممدوح بعض مسائل میں اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے۔لیکن واضح ہو یہ امر متفق علیہ ہے کہ تفردو انفرادی رائے صاحب رائے کی ذات تک محدود رہیگا خواہ کتنے ہی بڑے عالم وامام کا ہو پورے طبقے اور جمہور کا جو فیصلہ ہوگا وہی لائق اتباع قابل قبول ہوگا، ذاتی رائے دوسرے پر حجت نہیں ہوتی واٹسپ پر حضرت علیہ الرحمہ کے غمگساران کی جو تحریریں آئیں ان میں مفتی صاحب کے کسی شاگرد کی ایک تحریر آئی تھی (جو اگرچہ اس وقت سامنے نہیں ہے مگر) اس کا خلاصہ یہ تھا کہ: حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے دوران درس وضاحت سے فرمایا تھا جس کو میں نے جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے کہ: میری کسی بھی ذاتی رائے پر تمہارے لیے اس وقت تک عمل

کرنا جائز نہیں جب تک دارالافتاء اس بات کی تصدیق نہ کردے۔ یہ بات نہایت دیانت پر مبنی ہے اور بعد والوں کے لئے ایک وصیت ہے۔

غرض حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے ایک فعال ومتحرک مثالی زندگی گزاری حالات زمانہ سے بالکل نہیں گھبرائے کثیر العیال تھے مگر دست غیب کے منتظر نہیں رہے علمی انہماک کے ساتھ انہوں نے اپنے کو کتابوں کی تجارت سے جوڑا بغیر دکان کے ہی صرف گھر سے ہی اپنا کاروبار رکھا خوددار اصول پسند معاملات کے صاف تھے دیوبند کے مروجہ نظام سے ہٹ کر نقد لین دین کرتے خود دہلی جاکر کتابیں چھپواتے اللہ تعالی نے اس میں اتنی برکت دی کہ سارے صاحبزادگان برسر روزگار، صاحب مکان، صاحب حیثیت ہیں۔

المرحوم جمع کتب کے ذوق سے بطریق اختصاص بہرہور تھے ہزاروں کتابوں کا عظیم ذخیرہ نہایت سلیقے اور قرینے سے محفوظ کیا، اگر اس سے استفادہ میں صلائے عام کیا جائے تو صدقہ جاریہ بھی ہو جویان علم وتحقیق کے لئے نعمت کبریٰ بھی۔

وحید العصر استاذی حضرت مولانا وحید ازماں صاحب کیرانویؒ کے سانحہ ارتحال کے بعد ملک میں بالعموم مادر علمی میں بالخصوص اتنا بڑا خلا محسوس نہیں کیا گیا۔

ام المدارس مادر علمی دارالعلوم دیوبند تاریخ اسلام کا وہ بے شمار خدارسیدہ ہستیوں صدیقین وصالحین اقطاب وابدال کی دعاء نیم شبی، گریہ وابتہال کا مظہر بن کر وجود میں آیا پھر اسی معدن سے ایسے شموس واقمار نکلے جن سے عالم کا عالم روشن ہوا۔

یقین واثق ہے کہ خدائے حیی قیوم نے جس طرح دارالعلوم پر نظر کرم فرمائی تھی ان کی لم یزل ولا یزال کریم ذات آئندہ بھی ستودہ صفات شخصیات اس عزیز ادارے کو نوازے گی۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

مربی جلیل حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا

انداز تدریس و تفہیم حدیث

مولانا احمد نادر القاسمی
اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، دہلی

اللہ تعالی کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو مختلف قسم کی خصوصیات اور متنوع صلاحیتوں کے ساتھ اس دارفانی میں پیدا کرتا رہتا ہے، اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رکھے گا اور گیتی آب وگل میں انسانوں کا آنا وجانا لگا رہے گا، یہ انسان اپنی حقیقت اور ماہیت میں ایک قطرہ ضرور ہے، مگر اس کی صلاحیت ولیاقت مانند سمندر ہے،،"**فتبارک الله احسن الخالقین**" جس بندے سے جس نوعیت کا اور جتنا کام لینا چاہتا ہے وہ بھی لے لیتا ہے، علمی اور دینی خدمات تو ہمیشہ ایسے پاک طینت ہستیوں سے لیتا ہے، جنھیں پہلے تفقہ فی الدین سے نوازتا ہے، دنیا وآخرت دونوں میں ان کے ساتھ خیر وبھلائی کا معاملہ مطلوب ہوتا ہے،"**ومن یرد الله خیرا یفقه فی الدین**" (متفق علیہ)

اب جبکہ وحی ربانی اور خدائی پیغام رسانی کا سلسلہ بند ہوگیا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین کی تکمیل بھی ہوگئی، اور احکام کے ورود کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا، تو اب دنیا میں صرف اور صرف دین وشریعت کی تشریح اور تبلیغ باقی رہ گئی ہے اور اسی کو قیامت تک باقی رہنا ہے، اسلئے جو انسان جس قدر بھی علم وحکمت اور فہم وفراست کی دولت سے معمور کیا جائے گا، خواہ جس قدر بھی وسیع اور عمیق ہو وہ کتاب الہی، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال، تقریرات اور سیرت وکردار کی تشریح تک ہی محدود رہ سکتا ہے اس سے آگے نہیں جا سکتا، اس ذمہ داری کو نبھانے والے، افراد، خادم

قران مفسر، خادم سنت رسول، متبع دین وشریعت، محدث، خادم علوم شرعیہ، حاملین دین متین اور فقہاء کہلائیں گے اور ایسے ہی لوگوں کو دربار نبوت سے یہ اعزاز ملا ہے: "**علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل**" اس زاویہ سے دیکھا جائے تو حضرت مفتی صاحب موصوف اس صدی کے باکمال ،باوثوق،مستند،منبع علم وحکمت،جامع الکمالات، مستحضراوراعلی درجہ کی دینی اور علمی بصیرت رکھنے والے عبقری عالم ،فقیہ اور عظیم محدث تھے، جوکم وبیش ساٹھ سالوں تک اپنی ذات سے علم وہدایت کی روشنی بکھیرتے تشنگان علم وفن کوفیضیاب کرتے ،اوراپنے علم وتقوی کی خوشبو سے ایک جہاں کو دیراور دورتک منور کرتے رہے،یہی وجہ ہے کہ اس وقت چالیس سے پچاس ہزار کی تعداد میں حضرت کے شاگردان وتربیت یافتہ افراد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ،جنھوں نے مشرق ومغرب اورشمال وجنوب میں علم کی شمع روشن کررکھی ہےاورلوگو۔

"ایں سعادت بزور بازو نیست"

علماء کاعظیم کارنامہ

علماء یوں تو بہت سے کام انسانیت کی ترقی اورفلاح وبہبود کے انجام دیتے ہیں ،مگر دو کام ایسے انجام دیتے ہیں جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔(۱) کتاب وسنت کی صحیح تشریح اورافہام وتفہیم (۲) اس سلسلہ کوآگے بڑھانے کے لئے رجال سازی اورافراد کی تربیت اورانھیں دونوں چیزوں کوسامنے رکھتے ہوئے ان کے مقام اور دنیاوی لحاظ سے لوگ حیثیت کاتعین کرتے ہیں،جس شخصیت کی خدمات کا دائرہ جتنا وسیع ہے اسی قدر ان کا شخصی قدبھی بلندوبالاہے،حضرت الاستاذ کے علمی تفوق اورمقام پرایک شاگردلب کشائی کرسکتاہے،اس کو یہ زیب بھی نہیں دیتا کہ وہ اپنے روحانی باپ کے مقام پرقلم اٹھاکر گستاخی کامرتکب ہو،،بس اتنا کہ سکتاہے جو اللہ نے کہا ہے،:"**ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء**" (سورہ جمعہ، ۳) البتہ بیٹے کواپنے باپ اورماں کی خوبیوں کے اعتراف کاحق ہے،جومجھے بھی ہے۔

افہام وتفہیم کا انوکھا انداز:

استاذ گرامی کو اللہ تعالی نے افہام وتفہیم کا بڑا زبردست اورانوکھا ملکہ عطا کیا تھا جب ترمذی شریف کے درس میں حدیث کے معنی ومصداق کلام کرتے یا حدیث کے کسی راوی کی شخصیت پر گفتگو کرتے، تو بات بہت مختصر مگر جامع، تمام گوشوں کو احاطہ کرنے، والے، اور مصداق حدیث تک رسائی حاصل کرنے والے جچے تلے، ادبی و مہذب اور فرحت بخش الفاظ استعمال کرتے، تھے اور اس جامع انداز سے کرتے تھے کہ کہیں سے اعتراض اور تشنگی کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی اور طلبہ عش عش کرتے رہ جاتے، اور کبھی کبھی تو اتنی انوکھی بات ہوتی تھی کہ ہم جیسے لاپرواہ طالب علم بھی اس کو قلم بند کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا،، راوی کی شخصیت کا نقشہ اسی انداز اتنے ہی الفاظ میں کھینچتے تھے جتنا فن اسماء الرجال اور اسناد الحدیث کے ماہرین نے لکھی ہے تاکہ سلف ہونے کی حیثیت سے گستاخی اور "**والذین جاؤامن بعدھم یقولون ربنااغفر لنا ولإخواننا الذین سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلاللذین آمنوا ربنا إنک رؤف رحیم**" (سورہ حشر، ۱۰) کے خلاف نہ ہوجائے، جیسا کہ آج کے دور میں سند پر بات کرتے ہوئے کسی راوی کے بارے ایسا انداز اختیار کرجاتے ہیں جس سے اس راوی کی توہین تک بات جاپہونچتی ہے، اس باب میں حضرت کا لب ولہجہ اور انداز بہت محتاط ہوتا تھا، کیونکہ فن حدیث میں کسی راوی کا کمزور ہونا اور بات ہے، اور اس راوی کی شخصی تنقیص الگ بات ہے، اسی لئے اسماء رجال اور جرح وتعدیل کی کتابوں میں بعض راویوں کے بارے میں جس طرح کے الفاظ لکھے گئے ہیں، وہ حلق سے نیچے نہیں اترتے اور بسا اوقات تو نامناسب تک معلوم ہوتے ہیں، جیسے کذاب، دجال، لپاڑی وغیرہ۔

محدثانہ اور فقیہانہ انداز:

ہمیں چونکہ حضرت سے صرف ترمذی جلد اول پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس لئے بات وہیں تک محدود رہے گی ، ہمارے زمانے یعنی ۸۰ اور ۹۰ کی دہائی میں، ترمذی اول حضرت مفتی صاحبؒ، جلد ثانی، حضرت قائد ملت

،استاذی ارشد مدنی حفظہ اللہ، بخاری اول، حضرت شیخ الحدیث ،نصیر احمد خاںؒ، بخاری ثانی حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ ،مسلم شریف استاذی بحرالعلوم مولانا نعمت اللہ اعظمی حفظہ اللہ، سے متعلق تھی،تمام ہی اساتذہ ہمارے اپنے وقت کے علم وفن کے بحر ذخار تھے اورجن سایہ ابھی ہم لولوگوں پر ہے،وہ یقینا علم وعمل پیکر ہیں،،ہم کسی کو ایک وسرے پر فوقیت اور موازنہ کا حق نہیں رکھتے ،سب برابر کے اپنے شاگردوں کے محسن وہمدرد ہیں اور تھے، بات انداز تکلم اورطریقہ تدریس کی ہے۔

بہرحال ترمذی شریف فقہی ترتیب کی وجہ سے جامع سنن میں شمار ہوتی ہے،اس لئے ترمذی کے درس کا مزاج فقیہانہ ہوتاہےاوررائے بھی ایک فقیہ کی طرح ہی قائم کرنی ہوتی ہے،اس لئے حضرت مفتی صاحبؒ، جب درس دیتے تو ایک جلیل القدرفقیہ محدث،اوردرجہ اجتہاد پر فائز ہوکر گفتگو فرماتے تھے،ائمہ اربعہ کی فقہی آراء ان کی مستنداورامہات الکتب سے دیتے تھے،ان پر دلائل وبراہین کی روشنی میں نقد بھی کرتے تھے اوراحناف کے موقف کومضبوطی کے ساتھ طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے،،اوربسا اوقات ان مسائل میں انفرادی رائے کا رجحان بھی ظاہر کرتے تھے،جس کا انہیں،ایک عظیم محدث، کہنہ مشق مدرس، وسیع المطالعہ، کتاب وسنت کے دلائل وبراہین پر گہری نظراور درجہ اجتہاد پر فائز فقیہ ہونے کی وجہ حق بھی تھا،،حدیث کے بعض انوکھے اور نادر نقطے بھی بیان کرتے تھے،،اوراس پر گفتگو اتنا تحمل ،اعتماد،اوراتنی پختگی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس حدیث پر اب گفتگو کی گنجائش ہی نہیں ہے، یہ تھا حضرت کی تدریس کا نرالا پن، جو بہت دیکھے کوملتا ہے۔

درس اتنا مقبول کہ یہ عام بات تھی کہ کوئی طالب علم کبھی ترمذی کا درس چھوڑنا گوارانہیں کرتا تھا، یہ احساس عام تھا کہ پورے سال اگرترمذی کا درس سنتے توتشریح حدیث کے ناحیہ سے اس باب سے متعلق حدیث کی دوسری کتب مثلاً مسلم ،ابوداودنسائی ،ابن ماجہ، بخاری کے اسباق سے طلبہ خود کو بے نیازی محسوس کرتے ،اس حدتک مطمئن ہوجاتے تھے، کہ اگران کتابوں کے سنق میں استاذ نے پوری تقریر نہ بھی کی توکوئی حرج نہیں ہے،سماعت

حدیث کافی ہے، کیونکہ تشریح ترمذی میں سن چکے ہیں،، یہی وجہ تھی کہ مختلف کتب کے امتحانات میں ترمذی میں سنی تقریر کے مطابق طلبہ جواب لکھ کر آجاتے تھے، امتحان میں ان کتابوں میں بھی اعلیٰ نمبرات حاصل کر لیتے تھے۔

میرا ذاتی تاثر ہے کہ میری فراغت کو آج ۲۷/سال گزر گئے ہیں، مگر آج بھی حضرت کے الفاظ اور اندازِ تکلم دماغ میں اسی طرح گردش کرتے رہتے ہیں، ہر استاذ اپنے شاگرد کی نظروں میں کوئی آفتاب ہے تو کوئی ماہتابد، کوئی ثاقب ہے تو کوئی ثریا، کسی کوئی فوقیت نہیں دے سکتا، مگر:

"لاؤں کہاں سے ایسا کہ تجھ سا کہوں جسے"

بات کہنے کی جرأت:

حضرت کے اندر اپنی بات اور اپنا موقف رکھنے کی بڑی جرات تھی، اور یہ بات اسی وقت انسان میں پائی جاتی ہے جب اندر سے پختہ اور پر ہو، اور حضرت اپنے ۵۵، ۶۰ سالہ تدریسی دور میں اس قدر مطالعہ کیا تھا، اور اپنے وقت کا صحیح استعمال کیا تھا کہ علم ومعرفت اور آگہی انکی عادت اور ملکہ میں تبدیل ہو گیا معلوم ہوتا تھا، جب بھی کوئی، بات حدث، تفسیر کی عقائد، خلافیات کی، معانی اور بلاغت کی، لغت اور ادب کی، فقہ اور اصول فقہ، منطق کی یا فلسفلہ اور جرح وتعدیل کی حضرت سے پوچھتا تو ادھار نہیں چھوڑتے تھے، فورا بتایا اور مطمئن کر دیا، یہ ساری چیزیں تھیں جس نے یہ جرأت بے باکی کی یہ صفت دے دی تھی۔

لہجہ نرالا:

لہجہ میں پیار بھی تھا، سختی بھی، ہمدردی اور محبت بھی تھی، اور تھوڑا علمی ناز بھی تھا، مگر کبر وانا اور عنانیت ورعونت سے بالکل پاک، چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ اور ہونٹوں پر تبسم کے آثار، کھلتی پیشانی، دراز قد، جب چلیں تو، ایک مجسم علم وکمال کی طرح پر وقار آگے آگے اور ان کے پیچھے تشنگان علوم کی ایک بھیڑ، وقت کا صحیح استعمال کوئی حضرت کی زندگی سے سیکھے، ان سارے کمالات واوصاف کی وجہ سے اللہ تعالی نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علوم ومعارف

کے بےلوث خادم کو ہر چہار جانب محبوب العلما والصلحا بنادیا تھا،ان کے جانے کا احساس اور غم ایک جہاں کو ہے،اس وقت اور دور قحط الرجال میں ان کا رخصت ہونا یقیناایک عظیم خسارا ہے۔

آج حضرت کی جدائی سے ایک عالم غم زدہ ہے،دارالعلوم دیوبند کی درودیوار اور دارالحدیث سونی ہے،ان کی جدائی کا ملال افریقہ،برطانیہ،کناڈا،انڈیا،بنگلہ دیش،برما بھوٹان،انڈونیشیا،ملیشیا،پاکستان اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے،ان کے روحانی سپوتوں اور شاگردوں کو ہے،اللہ صبر جمیل عطافرمائے،اوراز ہرہند وامت کوان کانعم البدل عطا کرے۔

حزن وخسارے کا سال:

گزشتہ دوڈھائی مہینے سے امت جسنطرح اپنے بےلوث جیالوں اور علما سے محروم ہوتی جارہی ہے،اور تقریبا مختصر مدت میں رخصت ہونے والے علما اور اہل اللہ کی تعداد سوتک پہونچ رہی ہے،خالق ارض وسما کو ہی معلوم کیسا وقت انسانیت پرآنے والا ہے،یقینا یہ حزن وغم کا سال ہے،ایک وقت تھا جب محبوب کبریا صاحب لولاک سید المرسلین خاتم النبیین ،ہادی عالم کا دنیا سے وصال ہوااور پوری کائنات پژمردہ ہوگئی،اورآج تک دنیا اس صدمہ سے باہرنہیں آئی،اورنہ قیامت تک آسکتی ہے،،محبوب کے محبوب یار غار تسلی دینے کے لئے آگے آئے،تعزیت کی اورآیت کی تلاوت کی:”ومامحمدإلارسول قدخلت من قبله الرسل أفإمات أوقتل انقلبتم على أعقابكم ،ومن ينقلب على عقبيه فلين يضر الله شيئا“(سورہ نسا،۱۴۳)اورتسلی دی پھروہ وقت امت پرآیا جب جنگ جمل وصفین میں ہزاروں میں ہزاروں صحابہ حفاظ اورقراءشہید ہوئے امت کوغم سے باہرنکالنے کوئی رہا،پھرامت پر برصغیر کے سقوط کی شکل میں آزمائش آئی،ہزاروں علما شہید کردئے گئے،تختۂ دار پر لٹکادئے گئے،امت کوتسلی دینے والا کوئی نہیں تھا،،اب یہ وقت بھی امت آن پڑاہے روزکسی نہ کسی بڑی علمی شخصیت کی انتقال کی خبرآرہی ہے،”إنالله وإنا إليه راجعون“ کوئی تسلی دینے والانہیں ہے،کون ڈھارس

بندھائے گا؟ بس اب اللہ کی ذات کے کوئی نہیں، مدارس مقفل ہیں، رحمتوں کے چشمے بند کردئے گئے ہیں، روئے زمین پر چاروں طرف نحوستوں نے اپنی چادریں تان دی ہیں، انسانی افکار وادراک اور شعور کے سوتے خشک ہورہے ہیں، دنیا سے برکتیں رفتہ رفتہ واپس اپنے رب کی طرف لوٹتی جارہی ہیں، اللہ علیم وخبیر کو ہی معلوم یہ قیامت کی عظیم نشانی تو نہیں؟ ایسا لگتا ہے بس اتنا ہی فاصلہ رہ گیا ہے،: "کلا إذا دکت الارض دکا دکا، وجاء ربک والملک صفا صفا، وجیئ یومئذ بجھنم، یومئذ یتذکر الانسان وأنی له الذکری" (سورہ الفجر)

اللہ تعالی سے دعا فرمائیں، وہ رب ہے انسانیت سے محبت کرتا ہے، اللہ تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے ، حضرت مفتی صاحب کی دینی علمی اور اصلاحی خدمات کو بطور صدقہ جاریہ قبول فرمائے، ازہر ہند دار العلوم کو اورامت کو نعم البدل عطا فرمائے۔

ایں دعا از من وجملہ جہاں آمین باد

❁...❁...❁

علوم ولی اللہی کے امین رئیس المحدثین کی رحلت

مفتی احمد عبید اللہ یاسر قاسمی
امام وخطیب مسجدِ محی الدین ونستھلی پورم، حیدر آباد

موت ایک اٹل حقیقت ہے نہ اس سے کوئی پیغمبر مستثنیٰ ہیں نہ ہی کوئی صحابی وولی، تقدیر کی نوشتہ میں ہر شخص کی ایک متعین مدت طے ہے جس میں نہ آرزو وتمنا سے کمی بیشی ممکن ہے اور نہ ہی کسی الم اور صدمے سے، خواہ اسکی شخصیت کتنی ہی دلکش، پر بہار اور ہر دل عزیز ہو لیکن اسے ایک نہ ایک دن اس دار فنا سے دار بقا کی طرف کوچ کرنا ہی ہے اور باقی رہنے والی ذات تو صرف اللہ کی ہے لیکن انسانی عقل اپنے ظاہری مفاد اور سطحی آرزوؤں کے تلے سوچتی ہے اور اپنی فہم سے ایک تنگ دائرے میں محدود رہ کر قضا وقدر کے ان فیصلوں کو بھلا بیٹھتی ہے جسکا کڑوا گھونٹ ایک نہ ایک دن حلق کے نیچے اترنا ہی ہے جس سے کسی کو مفر نہیں خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے کیا خوب حقیقت بیان کی ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ تو کل ہماری باری ہے

لیکن بعض مرتبہ موت ہمارے عہد کے ان نایاب ہستیوں کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے جن کا نفس وجود ہی پوری امت کے لیے باعث رحمت ہوتا ہے، جو علم وفضل میں باکمال اور جہد وعزیمت کی اعلی مثال ہوتے ہیں، جن کے چلے جانے سے امت یتیم ہوجاتی ہے اور ملت کا ایک ایسا تناور درخت جسکی چھاؤں میں بڑے بڑے علماء وصلحاء سکون پایا کرتے تھے اپنی چھاؤں سے محروم کر دیتا ہے، رئیس المحدثین علوم ولی اللہی کے امین حضرت اقدس

مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کا شمار دعوت و عزیمت کے اسی قافلہ سے تھا جس نے برصغیر میں دین حق کی آبیاری کے لیے ہر ممکن کوششیں کر کے اسلام کے بقا کی فکر کرتے رہے اور آخر کار ۲۶/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء کو اس فانی دنیا سے راہی ملک بقا ہو گئے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت الاستاد رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ گونا گوں خصوصیات سے مالا مال فرمایا تھا آپ کی ذات والا ذات والا صفات اخلاص وللّٰہیت کی پیکر تھی، دیانت و امانت کی خوگر تھی، علم وعمل کا سنگم آپ کی ذات میں موجود تھا، آپ ایشیا کے سب سے ممتاز اسلامی یونیورسٹی دار العلوم دیوبند کے بے مثال محدث تھے، اس عظیم فن کے تئیں آپ کی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں، نہ صرف درس وتدریس بلکہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ اس فن میں تحفۃ القاری وتحفۃ الالمعی لکھ کر امت کو ایسا عظیم سرمایہ فراہم کیا جن سے کوئی طالب علم یا مدرس بے نیاز نہیں ہوسکتا، جہاں آپ نے فن تفسیر میں ہدایت القرآن جیسی بے نظیر تفسیر رقم فرمائی تو وہیں حجۃ اللہ البالغہ جیسی بلیغ کتاب کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ کے ذریعہ علوم ولی اللہی کے ماننے والوں پر ڈھائی سو سالہ قرض کا حق ادا کر دیا، اور اسلامی علوم وفنون میں کئی ایسی کتابیں ترقیم کر دی جو آئندہ نسلوں کے لیے ذریعہ نجات ہیں، اس کے علاوہ آپ کی ذات گرامی میں اور بھی بہت سے امتیازات وکمالات موجود تھے۔

(۱) اخلاص وللّٰہیت

خاص طور پر حضرت الاستاد کی اہم ترین امتیازی صفت اخلاص اور للّٰہیت تھی، مرضی مولی از ہمہ اولی کو آپ ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے، آپ کا ہر کام اور آپ کا برتاؤ صرف اس لئے اور اس نیت سے ہوتا تھا کہ پروردگار اس عمل سے راضی ہو جائے، نام ونمود اور ریاکاری سے آپ کا ہر عمل پاک وصاف ہوتا تھا، دراصل اسلام میں یہی اخلاص و

للّٰہیت ہی مقصود ہے۔

(۲)علوم میں تبحر اور فاضلانہ بصیرت ومہارت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو ہر فن میں یدطولیٰ عطا فرمایا تھا،تفسیر قرآن، حدیث وعلوم حدیث، اُصول تفسیر، اُصول حدیث، اُصول فقہ، بیان، معانی، ادب، ہر فن میں کامل عبور حاصل تھا،علوم معقولات ومنقولات کے آپ جامع و مانع تھے۔ اسرار، معارف، حقائق اور واقعات کے آپ ماہر تھے، انداز تدریس ایسا کہ ہر صلاحیت کا طالب علم مضمون کتاب کو بآسانی سمجھ لیتا، آپ کے درس میں نہ صرف طلبہ دارالعلوم بلکہ اطراف واکناف کے تمام طلبہ کا ہجوم رہتا، اصابت رائے ایسی کہ سامنے والا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، ہر حدیث میں فقہی بصیرت کوملحوظ رکھ محدثانہ شان سے گفتگو فرماتے تھے، آپ کا سینہ درحقیقت علوم ومعارف کا گنجینہ تھا۔

(۳)فکری اعتدال اور مشرب دیوبند کی پاسداری

حضرت والا کے عمدہ اوصاف میں سے یہ ایک عظیم صفت ہے کہ مشرب دیوبند کے سالار تھے قرآن وحدیث اور قرون ثلاثہ کی فکر سے ذرہ برابر انحراف اور فکری بے راہ روی کو آپ بڑے فتنے کو دعوت دینے کے مترادف گردانتے تھے، آپ کی نظر اعتدال میں ’ دیوبندیت کوئی فرقہ کا نام نہیں تھا بلکہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ دیوبندیت اہل سنت والجماعت کا دوسرا نام ہے، ہر وہ شخص جو بدعات وخرافات اور رسم ورواج سے بچے اور سنت رسول کا پیروکار رہے وہ ’’ دیوبندی‘‘ ہے‘، اور آپ کا یہ قول ہے کہ اہل سنت کا مدار قرآن وسنت اور قرون ثلاثہ (صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین) کے عمل پر ہے، جو باتیں قرآن وسنت کے خلاف ہیں اور قرونِ ثلاثہ کے بعد شروع ہوئی ہے وہ بدعت ہے، فقہی جزئیات اگر حدیث کے خلاف ہیں تو وہ نا قابل قبول ہے۔ (ماخوذ از علمی خطبات)

(۴)حق گوئی وبے باکی

صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین اگر کسی شخص کو حاصل ہو جائے تو وہ حق گوئی میں جھجھک محسوس نہیں کرتا حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے حق گوئی کی یہ خاص صفت عطا فرمائی تھی، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر برسر عام کرتے، شریعت مطہرہ پر عمل آوری میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرتے

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(۵) تصنیفات وتالیفات

رئیس المحدثین مفتی سعید احمد پالنپوری رحمہ اللہ نے جہاں اپنی زبان سے حدیثِ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے دِلوں میں نقش کیا وہیں اپنے قلم سے بیش بہا علمی ذخیرہ اُمت کے سپرد کیا۔آپؒ نے بہت سی کتب تحریر فرمائیں جن میں ہدایت القرآن، تحفۃ القاری، تحفۃ الالمعی، رحمۃ اللہ الواسعۃ، فیض المنعم جیسی شہرہ آفاق کتب بھی شامل ہیں ۔آپ کے قلم حقیقت رقم کے کتابی موتیاں اور نایاب تالیفات صدیوں تک ہمارے درمیان موجود رہیں گے اور آپ کی قلمی کاوشیں آنے والی نسلوں کے لئے ماخذ اور مصادر کی حیثیت اختیار کئے رہیں گی

الغرض رئیس المحدثین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہؒ کی ذات گرامی علمی، تحقیقی، روحانی اور عرفانی میدانوں سرگرم تھی بیک وقت ہندوستان کے سب سے بڑے تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، عظیم کتابوں کے مصنف، خالص محدثانہ اور محققانہ ذوق رکھنے والے فرد فرید، قرطاس قلم کے بادشاہ، دینی اور اسلامی سیاست کے سپوت اور گونا گوں صفات ومحاسن کے علاوہ امانت ودیانت، تقوی وطہارت، خلوص وللٰہیت، استغناء وبے نیازی، سیاسی بصیرت، ایمانی فراست، صاحب درک وادراک، عالم باعمل اور ملت اسلامیہ کا فکرودرد اپنے دل میں رکھنے والے شخص تھے۔تبحر علمی، وسعت معلومات، جامعیت اور علوم نقلیہ وعقلیہ کے احاطہ میں آپ کا کا کوئی نظیر نہیں تھا، فکر دارالعلوم کے فروغ میں جو کردار اور لازوال کارنامہ آپ نے انجام دیا

تاریخ اس کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور لیل ونہار کی گردشیں آپ کی خدمات اور لازوال کارناموں پر کبھی اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

دعا ہے کہ اللہ پاک حضرت والا کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور آپ کے جملہ خدمات اور کارناموں کو قبول فرمائے آمین ثم آمین

حضرت استاذ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

فقہی بصیرت و فکری اعتدال

مولانا نوراللہ جاوید قاسمی
فاضل دارالعلوم، دیوبند

۲۴ رسالہ دور طالب علمی میں کئی درجن اساتذہ سے پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملا ہے، تمام اساتذہ قابل احترام اوران کی عظمت مسلم ہے۔ استاذ اور شاگرد کا رشتہ دنیا کے بہترین رشتوں میں سے ایک ہے۔ بلکہ یہ رشتہ کبھی کبھی خونی رشتے پر بھی فوقیت لے جاتا ہے۔ اساتذہ صرف درسی کتابیں ہی نہیں پڑھاتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے تجربے سے عملی زندگی میں درپیش حالات، مسائل ومشکلات کا مقابلہ کرنے کا ہنر بھی سکھا جاتے ہیں۔ ان کی نصیحت، تجربات اور مشاہدات اس وقت فضول سی معلوم ہوتی ہے مگر وہ باتیں لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں اور وقت آنے پر اساتذہ کی نصیحتیں اوران کی باتیں ذہن و ماغ پر دستک دیتی ہیں اور صراط مستقیم پر گامزن کر جاتی ہے۔ زندگی کے اس سفر میں چند ایسے اساتذہ کرام سے واسطہ پڑتا ہے کہ ان کی عظمت و رفعت اور شفقت ومحبت اور علمی حیثیت ذہن و دماغ پر ہمیشہ ہمیش کیلئے ذہن و دماغ پر نقش بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کی یادیں، باتیں وقت کے دھول کا حصہ نہیں بنی ہیں بلکہ زندگی کے سفر کے ساتھ وہ بھی سفر کر رہی ہیں۔ میرے ان ہی اساتذہ میں سے ایک محدث کبیر، محقق اور درالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین، مقبول ترین استاذ، شیخ الحدیث حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ کی ذات گرامی ہے۔ جنہیں دنیا سے رخصت ہوئے کئی دن گزر چکے ہیں مگر اس کا غم دل و دماغ پر اب بھی چھایا ہوا ہے۔

۲۰ ؍سال بیت گئے، جب ہم نے حضرت استاذ سے ترمذی شریف پڑھی تھی۔ان دو دہائیوں میں زندگی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔سوچ وفکر کے زاویے تبدیل ہوگئے اور ترجیحات بدل گئی۔میدان کار بدل گیا۔درس وتدریس اور مدارس کے روح پرور ماحول سے کہیں دور صحافت سے وابستہ ہو چکا ہوں۔ان ۲۰ ؍سالوں میں براہ راست ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔مگر اس کے باوجود حضرت استاذ کے انتقال کی خبر سن کر دل بیٹھ سا گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ بہت بڑی نعمت سے محروم ہوگئے۔ ؎

یہ جو ملتی ہے ترے غم سے، غمِ دہر کی شل
دل نے تصویر سے تصویر اُتاری ہوگی

ایک بار پھر دارالعلوم دیوبند میں قیام کے چار سالہ دور کی یادوں کے نقوش ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔حضرت استاذؒ کا احاطہ دارالعلوم میں داخل ہونا ہے۔احاطہ مولسری سے گزرتے ہوئے دارالحدیث تک پہنچنا اور پھر پورے وقار کے ساتھ مسند درس پر بیٹھ کر درس حدیث کا انداز دلبرانہ،حسن بیان، افہام وتفہیم، تحقیق وتنقید اور دلائل اور مختصر مگر جامع گفتگو سے طلبا کو مسحور کردینا۔۔ ایشیا کی عظیم دینی درس گاہ درالعلوم دیوبند کی ایک تاریخ ہے۔یہاں کے اساتذہ علم وفن تقویٰ وللّٰہیت،ایثار وقربانی کیلئے مشہور رہے ہیں۔دارلعلوم دیوبند کے مسند درس کو امام ربانی مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا یعقوب نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، محدث کبیر مولانا فخر الدینؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا معراج الحق دیوبندیؒ، مولانا حسین احمد ملا بہاریؒ اور مولانا نصیر احمد خانؒ جیسی صاحب علم شخصیتوں نے رونقیں بخشی ہیں۔یہ تمام حضرات اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔باکمال اساتذہ کا ایک سلسلة الذہب ہے۔حضرت استاذ مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کی ذات گرامی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی اور اکابرین کی یاد تھے۔علوم دینیہ اور عقلیہ پر گہری گرفت کے ساتھ خلوص وللّٰہیت کے اعلیٰ

مقام پر فائز تھے۔اس دور میں درالعلوم دیوبند کے مسند درس کے آبرو تھے۔اکابرین کے سنہرے روایات و اقدار کے پاسبان تھے۔دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث کا خاص اسلوب تھا۔دارالعلوم دیوبند شاہ ولی اللہ اور شیخ سرہندی دونوں بزروگوں کے "مکاتب حدیث" کا ماحصل ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کے درس حدیث کا انداز یہ تھا کہ "طلبہ سے خود ہی نیا سبق پڑھوایا کرتے تھے اور پھر اس کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر نہایت جامع اور سیر حاصل بحث کیا کرتے تھے۔فقہی مسائل کو طلبہ کے سامنے پیش کرتے وقت آپ کی تمام تر توجہ اور کوشش اس امر کی جانب مرکوز رہتی کہ بالعموم مختلف اور بالخصوص حنفی اور شافعی مسلک کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو حتی المقدور کم کیا جائے"۔کم وبیش یہی اسلوب حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا بھی تھا کہ "اختلافی مسائل کو اچھالنے کی بجائے ان پر غور وفکر کر کے ان کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کرتے تھے۔

درس حدیث میں ائمہ اربعہ کے فقہی اختلافات کو ضرور بیان کرتے تھے مگر حنفی کو ترجیح دینے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ترجیح حدیث کے مسئلہ کو ہی دیتے تھے۔طلبا میں تنگ نظری کی بجائے وسعت نظری اور تحقیق وجستجو کا جذبہ پیدا کرنے کی آپ کی کوشش ہوتی ہے۔اسی وجہ سے ان کے سبق میں طلبا بہت ہی ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے۔

دنیا میں ایسے بہت ہی خوش نصیب ہیں جن کی پوری زندگی قرآن و حدیث کی خدمت کیلئے وقف رہی ہو۔تدریس بذات ایک بڑا مشغلہ ہے، گھنٹوں مطالعہ کا متقاضی ہے۔علالت، خوانگی مصروفیات کے باوجود حضرت استاذ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے غیر معمولی علمی وتالیفی نقوش چھوڑے ہیں۔جو معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے بہت ہی زیادہ ہیں۔حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی معرکۃ الآرا کتاب حجۃ اللہ واسعہ کی شرح "رحمۃ اللہ واسعہ، قرآن کریم کی تفسیر، ترمذی شریف کی شرح اور بخارح شریف کے شروحات کے علاوہ درجنوں کتابیں شامل

ہیں۔ یہ کتابیں آپ کی علمی بصیرت، تحقیق وجستجو، فراست اور یکسوئی کی آئینہ دار ہے۔ چناں چہ ان کے انتقال کو علم وفن اور کمالات کے کاررواں کے رخصت ہو جانے سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ عربی شاعر امرؤالقیس کا یہ شعر ؎

وما کان قیس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

کے مصداق اسی طرح کی شخصیات ہوتی ہیں۔ میں یہ بات لکھ بھی نہیں سکتا ہوں کہ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ خالق کائنات سے کچھ بھی بعد نہیں ہے۔ حضرت استاذؒ تو گفتگو اور تحریر میں حد درجہ اعتدال کے قائل تھے، مدح سرائی میں غلو کے وہ سخت مخالف تھے۔ اس لئے حضرت استاذ کی عظمت و رفعت اور ان کا علمی مقام کا تعین کئے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت استاذ کا انتقال صرف ایک خاندان کا غم نہیں ہے، ایک ادارے کا نقصان نہیں ہے۔ لاکھوں شاگردوں اور ہزاروں عشاقان حدیث اور سب سے بڑھ کر ایشیا کی عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند ایک ایسے عظیم استاذ سے محروم ہو گیا ہے جو اس کی آبرو اور علمی قیادت وسیادت کے مرتبے پر فائز تھا۔ باری تعالی کی قدرت سے یہ امید ہے کہ اکابرین کے خلوص وللّٰہیت کے تاج محل دارالعلوم دیوبند کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے تدارک کیلئے اسباب وحالات پیدا فرمادے۔

حضرت کے علمی تفوق، اسلوب درس، علوم حدیث پر دسترس اور تصنیفی خدمات پر بہت کچھ لکھا جارہا ہے اور لکھا بھی جائے گا۔ ضرورت بھی اس بات کی ہے کہ حضرت کی تفسیر 'ہدایت القرآن"، ترمذی شریف کی شرح 'تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی'، بخاری شریف کی شرح "تحفۃ القاری شرح بخاری" اور حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور زمانہ اور معرکۃ الآراء کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی شرح "رحمۃ اللہ واسعہ" اور دیگر تصنیفات کا علمی جائزہ لیا جائے، ان کے تصانیف پر سمینار کا انعقاد اور بحث ومباحثہ کا دور چلے تاکہ ان کتابوں کی رسائی عام لوگوں تک ہو اور مجھے قوی امید ہے کہ حضرت کے لاکھوں شاگردوں میں سے کوئی نہ کوئی کار خیر کو ضرور انجام دے گا۔ مگر علمی تحریف، بدعات اور غلط آمیزش کے خلاف حضرت استاذ کی خدمات ناقابل فراموش ہے۔ ایسے حضرت مفتی سعید

احمد پالن پوری کی زندگی کا ہر پہلو روشن ہے مگر اس معاملے میں مفتی احمد سعید پالن پوریؒ اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل ہے۔علوم نبوت کے حاملین کی صفت بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ

”یہ علم ہر نسل سے آنے والی نسل کے بہترین عادل افراد وصول کریں گے پھر وہ اس علم سے تحریف، بدعات اور غلط آمیزش کو مٹا ڈالیں گے“۔

علوم نبوت میں تحریف اور بدعات وخرافات کی آمیزش کے خلاف مفتی سعید احمد پالن پوری کی کوششوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔انہیں جب یہ محسوس ہوا کہ تمسک بالسنہ اور اعتدال کی راہ ترک کر کے افراط وتفریط اور مداہنت کی راہ کی جارہی ہے تو وہ لومۃ لائم کی پرواہ کئے بغیر حق کو واضح کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے،اس کیلئے انہوں نے اپنوں کو بھی ہیں بخشا ہے۔ان کے فکر وخیال اور تحقیق سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر ان کے وسعت نظر،قوت حافظہ اور کثرت مطالعہ اور سب سے بڑھ کر ان کے خلوص وللّٰہیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

”جلسہ تعزیت اور شخصیات پر سیمینار“ کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرت مفتی صاحب نے حدیث وسیرت کی روشنی میں جلسہ تعزیت اور شخصیات پر منعقد ہونے والے سمیناروں میں افراط وتفریط اور غلط روایات کی آمیزش پر مواخذہ کرتے ہوئے علمی بحث کا آغاز کرتے ہوئے تحقیق وجستجو کی نئی راہ کھول دی۔گرچہ بعض نادانوں نے پوری بحث کو ذاتی دشمنی اور تعصب سے تعبیر کر کے ایک علمی بحث کو متنازع بنادیا۔دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم اداروں میں اس طرح کی علمی بحثیں نہیں ہوں گی تو پھر کہاں ہوگی؟ مثبت ماحول میں تحقیق وتنقید اور ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے علمی اشکلات سے تخلیق کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔تحقیق وجستجو کی نئی راہیں کھولتی ہیں۔تنگ نظری کے بجائے وسعت نظری پیدا ہوتی ہے۔

بدعات کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی کہ بدعت کا آغاز کس ماحول میں ہوتا اور پھر سماج ومعاشرہ میں اس کی

کونسی شکل اختیار کرجاتی ہے اس سے وہ بخوبی واقف تھے چناں چہ تمسک بالسنہ اور بدعات کے معاملے میں وہ انتہائی سخت تھے۔۔ ربیع الاول کے مہینے میں ہونے والے میلا دالنبی کے جلسے اب مستقل ایک تہوار کی شکل اختیار کرچکا ہے۔عید میلا النبی کو دین سمجھ کر ہندوستان بھر میں جلوس نکالے جاتے ہیں اور طرح طرح کے خرافات و بدعات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ابتدا میں علمائے دیوبند بھی میلا د کے پروگراموں میں یہ کہہ کر شریک ہوتے تھے کہ اس کی وجہ سے سیرت کے پیغام کو عام کرنے کا موقع مل جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آج میلا د کی وہی صورت ہے جو دس بیس سال قبل تھی ظاہر ہے کہ نہیں۔

ایسا بھی نہیں حضرت مفتیؒ نے پہلی مرتبہ اس طرح کی بحث کا آغاز کیا ہے، کئی دہائی قبل حضرت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے دوراہتمام میں بھی دارالعلوم دیوبند کے یوم تاسیس پر دیگر عصری اداروں کے طرز پر جشن اور یادگار منانے کی تجویز پر غور وفکر شروع ہوا اور منتظمین دارالعلوم دیوبند اس کیلئے راضی بھی ہوگئے۔حضرت استاذؒ دارالعلوم دیوبند میں اس وقت وسطیٰ علیا کے استاذ تھے۔اس کے باوجود حضرت مہتممؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حدیث وسیرت کی روشنی میں اس طرح کے پروگرام کے خلاف دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ ”دارالعلوم دیوبند“ جیسے فکری ونظریاتی ادارے میں اگر اس طرح بدعت کی شروعات کی جائے گی تومستقبل میں اچھی نیت سے شروع کیا جانے والا کام غلط رسم کے طور پر معاشرے میں جڑ پکڑلیں گی۔حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ قاسم العلوم والخیرات امام محمد قاسم نانوتویؒ کے نہ صرف صلبی اولا دہیں بلکہ ان کے علوم ومشن کے وارث بھی تھے۔ چناں چہ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت مفتیؒ کے دلائل سے اتفاق کیا اور سالانہ جشن کے پروگرام کوملتوی کردیا۔دارالعلوم دیوبند کے صدسالہ تقریبات کے موقع ایک

عجیب وغریب قصے کا حضرت استاذؒ نے اپنی کتاب ”جلسہ تعزیت کا شرعی حکم“ میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”الہ آباد کے ایک بزرگ روپے کے پانچ سکے لے کر آئے اور حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ کو دیئے اور کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس بیداری میں آئے اور یہ روپے دیئے اور فرمایا: ایک اجلاس صد سالہ میں دینا، ایک حضرت حکیم الاسلام کو دینا الخ۔ اسی شام کو دارالحدیث تحتانی میں جلسہ منعقد ہوا اور حضرت مولانا سالم قدس سرہ نے تقریر فرمائی اور خوب چندہ ہوا۔ دوسرے دن صبح میں کتابیں لے کر حضرت حکیم الاسلام کے پاس گیا اور ”التعلیق الصبیح“ میں حالت بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کیلئے جو شرائط تھیں وہ دکھائیں اور میں نے عرض کیا کہ ’نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسری دنیا میں ہے اور دوسری دنیا کی چیز اس دنیا میں آسکتی ہے، حجر اسود کے بارے روایت ہے کہ وہ جنت کا پتھر ہے، مگر انڈیا کی ٹکسال میں ڈھلا ہوا سکہ، جن پر تین شیروں کا فوٹو بھی ہے، اور سن بھی چھپا ہوا ہے، یہ سکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں کیسے پہنچے، اور آپ نے ان بزرگ صاحب کو کیسے عنایت فرمائے، ضرور ان کو دھوکہ ہوا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ نے میری یہ بات قبول فرمائی اور دوسرے دن دارالحدیث فوقانی میں جلسہ ہوا اور حضرت مولانا سالم صاحب قدس سرہ نے تقریر کی اس میں صاف فرمایا کہ کہ کل کی بات ہم نے غلبہ محبت میں مان لی تھی اس کو آگے نہ بڑھایا جائے۔“

علوم نبوت کے حاملین کی جو صفات حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیش گوئی جو فرمائی ہے اسی کا یہ عملی مظہر ہے۔ قرآن وحدیث اور قرون ثلاثہ کی فکر سے ذرہ برابر انحراف اور فکری بے راہ روی بڑے فتنے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے اس فریضہ کو بخوبی نبھایا اور یہی وجہ سے ان سے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ اس دور میں ”مسلک دیوبند“ کے علمی سالار رہیں۔

مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی فکر تھی کہ ’دیوبندیت کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ اہل سنت والجماعت کا دوسرا نام ہے۔ ہر وہ شخص جو خرافات، بدعات اور رسومات سے مجتنب اور سنت رسول کا پیروئے کار ہے وہ

"دیوبندی" ہے۔اہل سنت کا مدار قرآن وسنت اور قرون ثلاثہ (صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین) کے عمل پر ہے۔ جو باتیں قرآن وسنت کے خلاف ہیں اور قرن ثلاثہ کے بعد شروع ہوا ہے وہ بدعت ہے۔ فقہی جزئیات اگر حدیث کے خلاف ہیں تو وہ نا قابل قبول ہے۔(ماخوذ علمی خطبات)

قبروں پر کتبہ، قبرستانوں میں مراقبہ اور قبروں پر قرآن کی تلاوت، اسی طرح تصوف کے نام پر افراط وتفریط اور اکابر پرستی میں غلو پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے تھے دیوبندیت اور بدعتیوں کے درمیان صرف ایک پالشت کا فرق رہ گیا ہے۔ جب کہ یہ چیزیں قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے تو پھر مسلک دیوبند داعیان ان حرکتوں کا ارتکاب کس طرح کر سکتے ہیں؟ ۔ ؎

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز ، عمل زاروں زبوں
ہوگیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

خود احتسابی اور اپنے فکر ونظر کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھنے کا عمل اگر بند کر دیا جائے تو کوئی بھی تحریک اور جماعت صراط مستقیم سے بھٹک جاتی ہے اور اس کا مشن پس پشت چلا جاتا ہے اور خرافات حاوی ہوجاتی ہے۔"تحریک دارالعلوم دیوبند" ان تحریکوں میں سے ایک جس نے کئی محاذوں پر کام کیا ہے اور ہر محاذ پر کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومی ہے۔ڈیڑھ سو سال بعد بھی اگر یہ تحریک اپنی معنویت اور اہمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تحریک دارالعلوم دیوبند سے وابستگان میں ہمیشہ ایک ایسی افراد رہے ہیں جنھوں نے خود احتسابی اور جماعت کے فکر وعمل کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھا اور اپنوں کا بھی مواخذہ کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ ساتھ ہی خرافات، لغویات کی آمیزش پر تنبیہ کر کے تحریک دیوبند کو اپنے مقاصد سے منحرف نہیں ہونے دیا ہے۔امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، حکیم الامت حضرت

مولانا اشرف علی تھانویؒ، محدث کبیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ، حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ اور ماضی قریب کی عظیم شخصیت محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق حقی ہردوئیؒ سے لے حضرت مفتی سعید احمد پالنپوریؒ تک ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے تحریک دیوبند کی حفاظت کی ہے۔ خامیوں وکوتاہیوں کی برملا نشاندہی کر کے تحریک کو صراط مستقیم پر گامزن رکھا ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں ایسی شخصیات پیدا ہوں گی جو اس عظیم فریضے کو انجام دیتی رہیں گی۔

حضرت مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کی عظمت و رفعت کو جو باتیں دوبالا کرتی ہیں ان میں یہ بات تھی کہ وہ اپنی رائے قائم کرنے سے قبل قرآن وحدیث اور علما کی کتابوں کا غائرانہ مطالعہ ضرور کرتے تھے اور مزید تحقیق کی راہیں بھی کھلی رکھتے تھے۔ چناں چہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے سیمینار کے موقع پر جو علمی بحث شروع ہوئی تھی اس موقع پر بھی انہوں نے واضح لفظوں میں کہا تھا کہ ”ابنائے دار العلوم آگے آئیں اور مسئلہ کو مثبت یا منفی پہلو سے واضح کریں“۔ مگر افسوس ہے کہ حضرت نے جس علمی بحث کی شروعات کی وہ تعصب اور ضد کی شکل اختیار کر لی اور لوگوں نے لعن طعن اور دشنام طرازی کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہوئے ماضی کے زخموں کو کریدنے لگے۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ کئی دہائیوں تک ترمذی شریف پڑھانے والا شخص اگلے دن سبق میں آئے اور کہے کہ ”کل میں نے جو میں ایک طالب کے سوال پر کے جواب میں جو باتیں کہیں تھیں وہ غلط تھی اصل مسئلہ یہ ہے“۔ آج درس گاہوں میں سوال وجواب کا سلسلہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ سوال کرنے والے طالب علم کی حوصلہ افزائی کرنے بجائے سوال پر ہی سوال کھڑا کر کے طالب علم کو خاموش کر دیا جاتا ہے۔ چناں چہ آج ہمارے اداروں سے تحقیق وجستجو ختم ہو گیا ہو گیا ہے اور تخلیقی ذہن کے حاملین سامنے نہیں آ رہے ہیں۔

حضرت مفتی سعیدؒ مسلک کی تبلیغ کے داعی نہیں تھے۔ مگر وہ حق کے اظہار میں ہچکچاہٹ کو بھی برداشت کرنے

کا مزاج نہیں رکھتے تھے ان کی سوچ تھی کہ ”ملکی مسائل ملک کے تمام باشندوکومل کر بیٹھنا چاہیے اور ملک کی سالمیت کیلئے متفقہ فیصلہ کرنا چاہیے، جنگ آزادی کے وقت ہندو مسلم اتحاد اس کی مثال ہے۔ملی مسائل میں ملت کے تمام فرقوں کومل کر بیٹھنا چاہیے اور ملک کی سلامتی کیلئے ایک آواز بلند کرنی چاہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کا اتحاد اس کی مثال ہے۔مسلک ومشرب کے اختلاف میں ہر ایک کو اپنی رائے پر رہ کر نزاع سے بچنا چاہیے“۔یادش بخیر میرے دورہ حدیث کے سال میں ایک دن حضرت استاذ آئے اور کہا کہ کیرالہ کے کچھ طلبا میرے گھر آکر یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ میرے دلائل سے متاثر ہو کر حضرت اما شافعیؒ کی تقلید چھوڑ کر امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کرنا چاہتے ہیں“۔حضرت استاذ نے فرمایا میں یہاں لوگوں کو حنفی بنانے کیلئے نہیں آتا ہے۔چوں کہ میں فقہ حنفی پر عمل کرتا ہوں اس لئے درس دیتے وقت احادیث سے مطابقت کرتا ہوں۔اس لئے میں اپنے عزیزوں سے کہتا ہوں کہ وہ میرے دلائل سے متاثر ہو کر اپنے امام کی تقلید نہ چھوڑیں“۔ایک جگہ لکھتے ہیں

”دارالعلوم دیوبند مسلک کی دعوت نہیں دیتا، اہل السنہ والجماعت کے مسلک معتدل کی حفاظت کرتا ہے، چار فقہی مسالک ہیں اور دارالعلوم دیوبند میں ہر مسلک کے طالب علم پڑھتے ہیں، جوب میں شوافع بڑی تعداد میں ہیں مگر دارالعلوم کی ڈیڑھ سوسالہ تاریخ میں ایک بھی شافعی طالب علم دارالعلوم میں پڑھ کر حنفی نہیں ہوا، اس لئے کہ دورہ حدیث کے اساتذہ مسلک کی دعوت نہیں دیتے“۔(جلسہ تعزیت کا شرعی حکم: ص ۸۲)

حضرت استاذؒ فکر ونظر میں اعتدال کے قائل تھے، ساتھ ہی وہ اپنی بات اور موقف واضح کرنے میں جری بھی تھے، اس معاملے میں کسی ملامت کرنے والوں کی ملامت، دوستوں کی ناراضگی اور اپنوں کی بے اعتنائی کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی آواز ضرور بلند کرتے تھے۔تحقیق وتخلیق اور اجتہاد جاری رکھنے کے حق میں تھے۔مخاطب کی ذہنی استعداد اور قابلیت کے لحاظ سے اپنی بات رکھنے میں وہ ماہر تھے، ان کی باتیں سادہ ہوتی تھیں مگر معانی دقیق ہوتی تھیں۔حضرت علی بن طالب کرم اللہ وجہہ کا حکیمانہ قول ہے: **کلموا الناس علی قدر عقولھم أتریدون أن یکذب اللہ**

ورسولہ (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق خطاب کیا جائے تا کہ وہ نادانی سے اللہ ورسول کی بات کی تکذیب نہ کریں) حضرت استاذ اس کے عملی مصداق تھے۔

اللہ کے ولیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ قسم کھالیتے ہیں تو اللہ اس کو پورا کرنے کے اسباب پیدا فرماتے ہیں۔حضرت استاذ مختلف مواقع پر قبروں پر کتبہ، مہینوں تعزیتی جلسے کے انعقاد کے شدید مخالف تھے۔قدرت کا کرشمہ دیکھئے ان کی موت ایسے حالات اور وقت میں ہوئی کہ خاموشی سے ممبئی کے ایک عام قبرستان میں علم وصلاح کے گنجینے کو یہ خاک کر دیا گیا۔چوں کہ کورونا وائرس کی وجہ سے اجتماعات کے انعقاد پر مکمل پابندی ہے۔تو پھر تعزیتی جلسوں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟۔مگر حضرت استاذ کا مشن اب بھی باقی ہے اور ان کی روح شاگردوں سے مخاطب ہے۔ ؎

جنوں، اہل جنوں کے لئے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا، میرے بعد

❁…❁…❁

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

کی لائقِ تعریف انتہاء اور قابلِ تقلید ابتداء

مولانا محمد سلمان
استاذ مدرسہ حسینیہ مصطفی آباد، اتراکھنڈ

۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء منگل کا دن امتِ مسلمہ ہندیہ کے لیے عموما اور علمی حلقوں کے لیے خصوصا غم کا سبب بنا، کہ شیخ العلماء، مفسرِ قرآن، محدثِ جلیل، فقیہ النفس، شارحِ حجۃ اللہ البالغہ، ماہرِ ہرفن حضرت الاستاذ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔ باذن اللہ۔ داغِ مفارقت دے گئے، یوں تو حضرت کی شخصیت ویسے بھی محتاجِ تعارف نہیں تھی مگر آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد آپ کی ذات گرامی پر اتنا کچھ لکھا جاچکا کہ اب تو جو نہیں جانتے تھے وہ بھی جان گئے، خود اس عاجز بندے نے بھی تقریبا دو ماہ قبل حضرت سے متعلق ایک مختصر سی تعارفی تحریر لکھی تھی؛ اس لیے عام سوانحی حالات کو چھوڑ کر چند وہ باتیں لکھنے کی جسارت کی جارہی ہے جو ہر طالب علم بلکہ ہر صحیح الفطرت آدمی کے لیے نمونہ ہیں اور اپنانے کے قابل ہیں، دعاء ہے کہ اللہ ہم سب کے لیے نافع بنادے۔

عجیب اتفاق ہے کہ راقم السطور کا دورہ حدیث شریف کا سال وہی (۲۰۰۸) ہے، جس سال شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب بلند شہری نور اللہ ضریحہ نے اپنی پیرانہ سالی، ضعف ونقاہت اور مسلسل علالت کی وجہ سے دورانِ سال ہی بخاری شریف کی تدریس سے عذر کردیا تھا اور بخاری شریف منتقل ہوکر حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس آگئی تھی، گویا کہ ہم وہ کم نصیب ہیں جن کی بخاری کی تکمیل شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد

خان صاحبؒ نہ کرا سکے یا یوں کہیے کہ ہم وہ خوش نصیب ہیں جنہیں بخاری شریف تین تین شیوخ الحدیث سے پڑھنے کا موقع ملا یعنی (۱)۔ بخاری شریف جلد اول کا کچھ حصہ حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ سے (۲)۔ مابقیہ حصہ حضرت مفتی صاحبؒ سے (۳)۔اور جلد ثانی شیخ الحدیث حضرت مولانا شیخ عبدالحق صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہ سے؛افسوس کے اب یہ تینوں ہی اکابر جوارِ رحمت میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ؎

یا رب وہ صورتیں اب کس دیس بس رہی ہیں
اب جن کے دیکھنے کو انکھیاں ترس رہی ہیں
اللھم انزل علیھم شآبیب رحمتک

اس طرح ہم لوگوں کو (یعنی شرکاء دورۂ حدیث شریف ۲۰۰۸ کو) بخاری شریف جلد اول کا معتد بہ حصہ، ترمذی شریف جلد اول اور شرحِ معانی الآ ثار یعنی طحاوی شریف کا معتد بہ حصہ اسی مسند آرائے حدیث سے پڑھنے کا موقع ملا۔**و ذلک فضل اللہ یؤ تیہ من یشاء**

یہ طول طویل تفصیل لکھنے کا حاصل یہ ہے کہ حضرتؒ کے بارے میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ محض شنیدہ نہیں بلکہ بہت حد تک دیدہ بھی ہے؛**و شتان ما بینھما**۔۔۔بہر حال اس تمہید کے بعد آیئے ایک نظر حضرت مفتی صاحبؒ کی ان صفات پر ڈالتے ہیں جو اختیار کرنے کے قابل ہیں، بلکہ دارین کی کامیابی کے لیے انہیں اختیار کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔

(۱) مسلسل محنت اور منصوبہ بندی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ کے ایک ملفوظ کا خلاصہ ہے کہ جو اکابر کی انتہا کو دیکھے گا وہ کبھی کامیاب نہ ہوگا اس لیے کہ آخر عمر میں تو عموماً راحت و آرام، فتوحات، عزت، شہرت اور واہ واہ ہی نظر آتی ہے مگر جو اکابر کی ابتدا کو دیکھے گا اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرے گا وہ ضرور

کامیاب ہوگا ان شاء اللہ، اس لیے کہ ابتدا میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں مجاہدات کرنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر کوئی مقام حاصل ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم جیسے لوگ اونچے اونچے مقامات کے حصول کی تمنا تو کرتے ہیں مگر اس کے لیے محنت کچھ نہیں کرتے یا بہت کم کرتے ہیں، ہمارا حال تو عربی کے اُس مقولے کے مانند ہے ''صَلیّ الْحَائکُ وَانْتَظَرَ الْوَحْیَ'' (ناکارہ لوگ دو رکعت نماز پڑھتے ہی وحی نازل ہونے کا انتظار کرنے لگتے ہیں) یعنی تھوڑی سی محنت کر کے بہت جلد نتیجے کے حصول کی تمنا کرنے لگتے ہیں، پھر اگر ہماری محنت کا نتیجہ ہمارے موافق آجائے تو پھولے نہیں سماتے گویا کہ قرآن کے الفاظ میں فَرِحٌ فَخُورٌ بن جاتے ہیں اور خدانخواستہ نتیجہ ہمارے مخالف آجائے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں یعنی قرآن کے الفاظ میں یَئُوسٌ قَنُوطٌ بن جاتے ہیں۔

استاذِ مکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ کی زندگی کا سب سے نمایاں وصف ''محنت'' ہے، حضرت کی زندگی میں سہل پسندی، عیش کوشی اور کام چوری نام کو نہیں تھی، آپ نہایت جفاکش اور مسلسل محنت کے عادی تھے، اور آپ کی یہ محنت محض درس و تدریس تک محدود نہیں تھی بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی آپ اتنے ہی جفاکش تھے۔

ایک مرتبہ مطالعہ اور تجارت کے لیے کتابیں خریدنے نیز جفاکشی کی زندگی گزارنے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا کہ: تم لوگ بڑے تو بننا چاہتے ہو مگر محنت مشقت کچھ نہیں کرتے ایک دم سے بڑے بننا چاہتے ہو ایسا نہیں ہوا کرتا میں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ جب تجارت کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے کئی کام کیے۔

۱۔ گجرات سے جب میں دیوبند آتا تھا تو میری رشتے دار خواتین از راہ شفقت کھانے پینے کا بہت سا سامان دیا کرتی تھیں اور اس سامان میں بڑی مقدار میں (خوب یاد ہے کہ حضرت نے کنستر کا لفظ استعمال کیا تھا) ''دیسی گھی'' بھی ہوتا تھا دیوبند آ کر میں زائد سامان بیچ کر کتابیں خرید لیتا تھا، کچھ مطالعے کے لیے کچھ تجارت کے لیے۔

۲۔ فارغ اوقات میں کتابوں کی تجارت کرتا تھا۔

۳۔ کتب خانے سے آرڈر کی کتابیں ڈاک خانے پہنچاتا تھا۔

۴۔ ردی اخبار خرید کر اہل خانہ کے ساتھ مل کر کاغذ کے لفافے بنا کر دکانوں پہ پہنچاتا تھا۔

۵۔ مدرسے سے بھی تنخواہ ملتی تھی۔

ان تمام ذرائع آمد سے حاصل شدہ آمدنی سے اپنا اور اپنے متعلقین کا خرچ بھی اٹھاتا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ پس انداز بھی کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک چھوٹا سا مکتبہ "مکتبہ حجاز" کے نام سے قائم کرلیا اور پھر تو اللہ نے خوب برکت دی۔

الفاظ میں ممکن ہے کچھ تفاوت ہو مگر مفہوم تقریبا یہی تھا جو عرض کیا گیا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو آدمی دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے میں ذمہ دارانہ بلکہ مقبول ترین تدریس کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی زندگی کو بھی اس طرح منظم رکھتا ہو کامیابی اس کے قدم آخر کیوں نہ چومتی، عادت اللہ یہی ہے کہ محنت کرنے والوں کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتے نعم اجر العاملین اس پر شاہد اور تاریخ انسانیت اس کی گواہ ہے۔

آیئے مسلسل محنت کا عزم کریں، جفاکشی کے عادی بنیں اور اپنی اجتماعی وانفرادی زندگی منصوبہ بند طریقے پر گزارنے کا تہیہ کریں۔

(۲) حوصلہ مندی اور ثابت قدمی

حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا دوسرا نمایاں وصف، صبر وثبات اور مشکل سے مشکل حالات سے نبرد آزمائی ہے، زندگی اور مشکلات کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہذا آپ کی زندگی میں بھی مشکلات آئیں، ابتدائی دور کے مشکل ترین حالات، معاصرانہ چشمک اور آپ کے دو صاحبزادگان کا آپ کے سامنے انتقال، مگر رنج وغم کے جذبات اور مشکلات سے مغلوب ہوکر آپ نے کبھی اپنے مقاصد ومعمولات کو متاثر نہیں ہونے دیا بلکہ کمال ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے، دریا کے پانی کی طرح، جو چٹانوں سے الجھتا بھی نہیں مگر اپنا سفر

موقوف بھی نہیں کرتا، بلکہ راستہ بدل کر یہ کہتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوجاتا ہے ۔

میں تو دریا ہوں مجھے اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑوں گا راستہ ہوجائے گا

بے حوصلہ آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھبرا جاتا ہے مگر حوصلہ مند آدمی خوش اسلوبی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ جما رہتا ہے ایسوں ہی کے بارے میں کہا جاتا ہے؛ **الاستقامة فوق الف کرامة**

(۳) حق گوئی و بے باکی

آپ بہت سوچ سمجھ کر کوئی رائے قائم کرتے تھے پھر جس چیز کو حق سمجھتے تھے بلا تردد اسے کہ گزرتے تھے، کوئی مصلحت، خوف یا طمع آپ کی راہ میں حائل نہیں ہوتی تھی مگر عموماً اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ کہتے تھے کہ سننے والے کو برا بھی نہ لگے اور بات بھی ہوجائے، آپ کی حق گوئی کسی کی تحقیر یا محض اپنی بڑائی جتانے کے لیے نہیں ہوتی تھی بلکہ آپ ایک عظیم منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے عنداللہ احساس جواب دہی اور شفقت علی الخلق کے جذبے سے سرشار ہوکر کہتے تھے اسی لیے آپ کی بات نہ صرف یہ کہ سنی جاتی تھی بلکہ مانی بھی جاتی تھی، خصوصاً طلباء، اساتذہ اور ذمہ دارانِ مدارس کو بڑی دل سوزی کے ساتھ مختلف پیرایوں میں ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتے رہتے تھے، آپ کو طلباء کی بدشوقی اساتذہ کی سہل انگاری اور بہت سے ذمہ داروں کی بدمعاملگی کا بڑا قلق تھا، اکثر اس مضمون کو بیان فرماتے تھے۔

(۴) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

آپ کا امتیازی وصف تھا، خصوصاً نہی عن المنکر، کسی لاگ لپیٹ کے بغیر معروفات کا حکم دیتے تھے اور منکرات سے روکتے تھے، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ کے سامنے کسی شرعی حکم کو پامال کیا جا رہا ہو اور آپ روک ٹوک نہ کریں، آپ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ سامنے والا کیا سوچے گا آپ کی توجہ اس پر رہتی تھی کہ صحیح بات

بتا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہماری ذمہ داری ہے، کوئی مانے یا نہ مانے۔

(۵) سادگی اور بے تکلفی

آپ کے یہاں ٹیپ ٹاپ، تصنع تکلف یہ سب کچھ نہیں تھا، عالم اسلام کی عظیم الشان دینی درس گاہ کے عظیم منصب پر فائز ہونے کے باوجود آپ کی سادگی اور بے تکلفی مثالی تھی، اگرچہ آپ کی طبیعت میں نظافت اور نفاست بھی اعلی درجے کی تھی، عموماً سادگی اور نفاست کو متضاد سمجھا جاتا ہے مگر آپ کے اندر یہ دونوں خوبیاں علی الوجہ الاتم موجود تھیں، اسی طرح بے تکلفی بھی، آپ کے یہاں بحمد اللہ کبر وغرور بھی نہیں تھا مگر وہ عرفی تواضع بھی نہیں تھی کہ زبان وقلم پر احقر افقر ہو اور دل میں کچھ اور، جسے محقق تھانویؒ نے ''کبرِ تواضع'' کا نام دیا ہے، آپ کے اعمال میں ریاء بھی نہیں تھا مگر وسوسۂ ریاء کے شائبہ سے ترکِ اعمال بھی نہیں تھا، بلکہ حقیقت پسندی اور حقیقت بیانی ہی آپ کا شیوہ تھی۔

(۶) اتباعِ سنت واجتناب عن البدعات

اتباع سنت تو گویا حضرتؒ کا حال بن گیا تھا، خوب یاد ہے کہ ترمذی شریف کے پہلے ہی سبق میں طلباء کو عمامہ پہننے کی ترغیب دلائی، نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس دن سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قمیص مبارک (جسے عرف عام میں جبہ بھی کہتے ہیں) قدرے گول اور اتنی طویل تھی کہ گھٹنوں سے نیچے تک آتی تھی اسی دن سے میں نے روایتی کرتا پہننا چھوڑ دیا، اسی طرح ایک دن ترمذی شریف کا سبق پڑھا کر گھر جانے کے لیے نکلے، احاطۂ مولسری میں پہنچے تو وہاں کچھ دیہاتی لوگ کھڑے ہوئے تھے، طلباء کی تو ہمت مصافحہ کرنے کی عموماً نہیں ہوتی تھی، مگر وہ دیہاتی احباب۔۔۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔۔۔ بہت سرعت کے ساتھ حضرت کی طرف بڑھے اور حضرت سے مصافحہ کرنا شروع کر دیا، ہم طلباء نے بھی موقع غنیمت جان کر مصافحہ کرلیا، مصافحہ کے بعد وہیں کھڑے کھڑے مجلسِ ارشاد شروع ہوگئی، حضرت نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: دیکھو بھائی حدیث شریف میں ہے ۔اذا

التقی المسلمان، فتصافحا، وحمدا اللہ، و استغفراہ غفر اللہ لھما'' فرمایا: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو مسلمان آپس میں ملیں اور چار کام کریں ۱۔سلام کریں ۲۔مصافحہ کریں ۳۔اللہ کی حمد کریں ۴۔اللہ سے مغفرت طلب کریں یعنی مصافحہ کی دعا ''یغفر اللہ لنا و لکم'' پڑھیں تو ان کی مغفرت کردی جاتی ہے، صرف مصافحہ ملانا کافی نہیں ہے یہ چار کام کرنے ضروری ہیں تب مغفرت ہوگی، (یہ بھی فرمایا کہ حدیث میں سلام کا ذکر نہیں ہے مصافحہ کا ذکر ہے مگر مصافحہ سلام کے بغیر مشروع نہیں اس لیے سلام کا ثبوت خود بخود ہو جائے گا) یہ کہ کران دیہاتیوں کو اور تمام موجود طلباء کو سنت کے مطابق سلام مصافحہ کرنے کی تاکید فرمائی اور گھر تشریف لے گئے۔

آہ! کہ اب یہ یادیں سینے کا داغ ہیں۔۔۔خلاصہ یہ کہ اتباع سنت کا بہت اہتمام فرماتے تھے، ہر قسم کی بدعات وخرافات سے سخت نفرت تھی، بدعات سے خود بھی بچتے اور اپنے متعلقین کو بھی بچنے کی تلقین فرماتے تھے، بعض مباح چیزوں کو بھی سدأللباب گوارا نہیں فرماتے تھے، اور اگر کسی وجہ سے گوارا فرما بھی لیں تو اس طرح کی چیزوں کی حوصلہ شکنی ضرور فرماتے تھے، مثلاً: تعزیتی جلسے، افتتاحی واختتامی تقریبات میں غیر معمولی اہتمام، اربابِ تصوف کے بعض معاملات اور دعاؤں میں حد سے زیادہ غلو کو پسند نہیں فرماتے تھے، ان میں سے بعض چیزوں کو بدعت اور بعض کو بدعت کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔

(۷) تصلب فی الدین

اتباع سنت ہی کا لازمی نتیجہ ہے تصلب فی الدین یعنی راہِ حق پر بلا خوف لومۃ لائم مضبوطی سے جم جانا، حضرت مسلک اہلِ سنت والجماعت مسلک دیوبند کی خود بھی مضبوطی کے ساتھ پابندی فرماتے تھے، اور اپنے متعلقین سے بھی اسی کی توقع رکھتے تھے، واضح ہو کہ تصلب (حق پر مضبوطی سے جم جانا) ایک مطلوب صفت ہے بعض لوگ تصلب کو تعصب (ہٹ دھرمی) کا مترادف سمجھتے ہیں اس لیے اس صفت کو قدامت پسندی یا تنگ نظری سے تعبیر کرنے لگتے ہیں، جب کہ تصلب اور تعصب دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، تصلب محمود ہے، لہذا مطلوب

ہےاور تعصب مذموم ہے، اس لیے مطلوب بھی نہیں ہے، بحمداللہ مکمل شرحِ صدر کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت متصلب تھے متعصب نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی اپنی کسی رائے کا غلط یا مرجوح ہونا ظاہر ہوجاتا تو فوراً رجوع فرماتے، دورانِ درس کئی مرتبہ سننے میں آیا فرماتے تھے: بھائی کل میں نے ایک بات کہی تھی مگر ایک طالب علم نے توجہ دلائی وہ بات غلط تھی، صحیح بات یہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ حضرت کی بہت بڑی صفت، اور اپنے متعلقین کے لیے ایک خاموش نصیحت ہے، آج کے دین بیزار دور میں جب کہ ہر تیسرا آدمی مجتہدِ مطلق بنا بیٹھا ہے، اہلِ سنت والجماعۃ کا مسلک ہی ایک ایسا حصنِ حصین ہے جو فتنوں سے بچا سکتا ہے، اسی لیے آپ نہ صرف یہ کہ مسلک اہل سنت والجماعت کے پابند تھے بلکہ اس کے مقابل تمام فرقوں کا خوب تعاقب بھی فرماتے تھے۔

(۸) ترکِ لایعنی

حضرت کو کبھی بھی لایعنی قول وفعل میں مشغول نہیں دیکھا گیا، یہ اتنی بڑی خوبی ہے کہ اسے حدیث میں حسنِ اسلام کہا گیا ہے اور بحمداللہ اسلام کا یہ حسن آپ کو خوب ہی حاصل تھا، سبق میں نپی تلی پر مغز گفتگو، غیر متعلق باتیں نہ دارد، پھر کسی کی کردار کُشی یا توہین وتحقیر کا تو تصور ہی کیا ہوتا۔۔۔ ہاں! کبھی کبھی دوران درس کسی اہم تربیتی، سماجی، معاشرتی اور مفید مضمون کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے تو ضرور توجہ دلاتے، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے آپ سے بہت کام لیا۔

(۹) امیدیں قلیل مقاصد جلیل

مال کی محبت انسانی فطرت ہے، اور یہ ایک حد تک ہو تو کوئی حرج بھی نہیں ہے مگر حد سے نکل جائے تو زہرِ قاتل ہے، کسی عارف کے بقول: کشتی پانی میں ہو پانی کشتی میں نہ ہو، جب حضرت کو اللہ نے کسب معاش کے کچھ دیگر وسائل مہیا فرمادیے اور آپ کی تجارت میں آپ کی اولاد بھی آپ کی دست وبازو بن گئی تو آپ نے دارالعلوم اشرفیہ راندیر، سورت، گجرات اور دارالعلوم دیوبند کی تمام تنخواہ بفضل اللہ واپس کردی، اور مال کی محبت کے رذیلے

سے خود کو بچا کر اپنے مالک و مولی کے حضور تشریف لے گئے، اور کوئی شک نہیں کہ یہ وہی کر سکتا ہے جس کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوں اور دنیا سے بے رغبتی جس کی گھٹی میں ہو۔

(۱۰) الاعتدال فی مراتب الرجال

ہر عظیم شخصیت کے جلو میں کچھ نہ کچھ تفردات اور معاصر علماء سے کچھ نہ کچھ اختلافات بھی ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے اس کی ذات معاصرین میں موضوع بحث بن جاتی ہے، حضرت مفتی صاحب کو بھی ہند و پاک کے معاصر علماء سے۔۔۔ بلکہ عرب علماء سے بھی۔۔۔ کئی مسائل میں اختلاف رہا، مگر اختلاف رائے کے باوجود حضرت نے بڑوں کے ادب، ہم عمروں کے احترام اور چھوٹوں پر شفقت کی جو مثال قائم کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ مثال بے مثال ہے، اختلاف رائے کے باوجود معاصرین کی خوبیوں کو فراخ دلی کے ساتھ تسلیم کرنا آپ کی زندگی کا ایک روشن باب ہے؛ امید ہے کہ اس سلسلے کی کچھ تفصیلات ان کے سوانح نگار لکھ دیں گے ان شاء اللہ

(۱۱) رجال سازی

آپ نے کمالِ شفقت، حسنِ معاملہ، شوقِ علم، ذوقِ تربیت اور سوزِ دروں سے اپنے تلامذہ کو ایک رخ دیا، جو آپ کے لیے تا قیامت صدقۂ جاریہ ہوں گے ان شاء اللہ، دارالعلوم دیوبند سمیت ملک کے ممتاز اداروں کے، اکثر بڑے بڑے علماء بالواسطہ یا بلاواسطہ آپ کے شاگرد ہیں، اور شاگرد نہیں بھی ہیں تو آپ سے متاثر ضرور ہیں، غالبا شیخ حسن البناء شہیدؒ سے پوچھا گیا تھا، **ماصنفتَ کتابا؟** (کیا آپ نے کوئی کتاب نہیں لکھی) نہایت عارفانہ جواب دیا: **یُصنفون الکتاب و اُصنف الرجال** (لوگ کتابیں لکھتے ہیں میں رجال سازی کرتا ہوں، کام کے آدمی تیار کرتا ہوں) پھر حضرت مفتی صاحب نے تو رجال سازی بھی خوب کی اور تصنیف و تالیف بھی کمال درجے کی، رجال سازی ہی کا ایک شعبہ قرار دیجیے یا مستقل صفت کہیے کہ آپ نے کثیر العیال ہونے کے باوجود اپنی تمام اولاد کی خوب تعلیم و تربیت فرمائی (آپ کے بارہ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، جن میں سے دو بیٹے آپ کی زندگی میں ہی

وفات پاگیے، باقی بحمد اللہ بخیر و عافیت موجود ہیں) ایک دن دورانِ درس فرمایا کہ میں نے اپنے بھائیوں، اپنی اہلیہ اور بچوں کو قرآن حفظ کرایا اور اب میری اہلیہ اپنی بہوؤں کو قرآن حفظ کرا رہی ہے؛ ماشاءاللہ! اور نہ صرف حفظِ قرآن بلکہ ایک آدھ کے علاوہ آپ کی اکثر اولاد بحمد اللہ عالم بھی ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۱۲) وقت کی حفاظت اور انضباط

یہ تو آپ کا ایسا مشہورِ عالم وصف ہے جس کا ایک زمانہ قائل ہے، اور اسی کی برکت ہے کہ آپ نے ہزار ہا ہزار شاگردوں کے علاوہ سیکڑوں اہم مہم علمی تصانیف بھی بطور یادگار چھوڑیں، وقت کی حفاظت اور تقسیم کار کے بغیر کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، حضرت اس نکتے سے خوب واقف تھے اسی لیے ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام مقرر فرما رکھا تھا، درس و تدریس کا سارا زمانہ پابندی کے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں گزارا، ایک مرتبہ فرمایا کہ میرا ترمذی شریف کا ایک سبق ناغہ ہوگیا تھا جس کی خلش آج تک محسوس کرتا ہوں، پھر سبق ناغہ ہونے کی وجہ بیان فرمائی کہ میرا کمرہ صدر دروازے کے پاس تھا، حضرت الاستاذ امام المعقولات والمنقولات علامہ محمد ابراہیم بلیاوی قدس سرہ جب سبق پڑھانے کے لیے آتے تو ان کے عصاء کو زمین پر ٹیکنے کے آواز سن کر میں کمرے سے نکل کر ساتھ ہو جاتا تھا، ایک دن مطالعہ میں ایسا منہمک تھا کہ حضرت الاستاذ کے آنے کی خبر ہی نہیں، پھر فرمایا: آج تک اس غیر حاضری کا دکھ محسوس کرتا ہوں، یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ جب میں گھر سے درسگاہ میں پڑھانے کے لیے آتا ہوں کوئی طالب علم میرے ساتھ نہ آیا کرے، میں راستے میں مطالعہ کرتا ہوا آتا ہوں، کوئی ساتھ ہوتا ہے تو خلل ہوتا ہے، سبحان اللہ! گھر سے دارالحدیث آنے میں جو چند منٹ صرف ہوتے تھے ان کو بھی کام میں لایا جا رہا ہے یہ ہے وقت کی حفاظت (پھر فرمایا کہ میرے استاذ علامہ ابراہیم بلیاویؒ فرمایا کرتے تھے کہ اب ہم لوگوں کا مطالعہ ورق گردانی والا نہیں رہا، اب تو سبق سے متعلق معلومات کو ذہن میں مرتب کرنا یہی

مطالعہ ہے۔

(۱۳) یکسوئی

حضرت تھانوی قدس سرہ کا ملفوظ ہے کہ ”یک سوئی کے بغیر تو ایک سوئی بھی حاصل نہیں ہوتی“ حضرت مفتی صاحبؒ کی طبیعت میں بھی یکسوئی، کم آمیزی، گوشہ نشینی اور عزلت پسندی بہت زیادہ تھی، مگر اس کا مقصد صرف اور صرف حصول علم کے لیے اپنے آپ کو فارغ کرنا تھا، پھر یہ چیز آپ کی ایسی عادت بنی کہ بے ضرورت ملنے ملانے، بلا وجہ کی مجلس بازی اور بھیڑ بھاڑ سے ہی طبیعت نفور ہوگئی اور غالباً اللہ کو بھی آپ کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ آپ کے سفرِ آخرت کے انتظامات بھی اسی طرح کے فرما دیے، کہا جاتا ہے کہ حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے خلیفہ ومجاز حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی قدس سرہ جب آخری حج پر تشریف لے جا رہے تھے تو بڑے درد کے ساتھ اپنے رفقاء سے کہہ رہے تھے ؎

پھول کیا ڈالوگے تربت پہ مری
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

اور پھر یوں ہی ہوا کہ جدہ پہنچنے سے پہلے سمندری جہاز میں ہی آپ کا انتقال ہوگیا، آپ کے جسد مبارک کو تجہیز وتکفین اور نماز جنازہ کے بعد حکم شریعت کے مطابق سمندر کے ہی حوالے کر دیا گیا، تاکہ سمندر بھی اللہ والوں کے وجود کی برکتوں سے محروم نہ رہے، حضرت مفتی صاحب کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا، آخر اہل ممبئی کو بھی تو ان کی وفاداریوں کا کچھ صلہ ملنا تھا؛ نیز اس مردِ قلندر کی شانِ بے نیازی اور کم آمیزی کا بھی تو کچھ لحاظ رکھا جانا تھا؛ عجب نہیں کہ اسی لیے وطن سے دور، شور وشغب اور ہجوم کے ہنگاموں سے بے نیاز، رمضان المبارک کے آخری عشرے کی مبارک ساعات کو اس شہید علم کی رحلت کے لیے مقدر فرمایا گیا ہو، تاکہ آپ کی علمی وجاہت اور طمطراق لوگوں کے دلوں میں باقی رہے؛ اللہ ہی اپنی حکمتوں کو بہتر جانتا ہے۔ **ان الحکم الا للہ**

بہر حال راقم نے حضرت کی عبقریت، ذہانت وفطانت، علمی تعمق وتبحر، وسعتِ مطالعہ، ملکۂ افہام وتفہیم اور کثرت تصانیف جیسی صفات کو بیان نہیں کیا بلکہ یہ حضرت کی بارہ تیرہ وہ صفات بیان کی گئی ہیں جن کو ہر بندہ تھوڑی سی محنت کر کے حاصل کر سکتا ہے، شریعت کا مزاج بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب لوگوں کی تعریف کرنے سے زیادہ ان صفات کو

حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جن کو حاصل کر کے وہ کامیاب ہوئے، اس لیے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے اللہ کی توفیق اور بڑوں کی دعاء وتوجہات کے بعد، ان کی اپنی جاں توڑ جدوجہد، قربانی، محنت اور کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں، کسی شاعر کے بقول ؎

جو ساز سے نکلی ہے وہ دھن سب نے سنی ہے جو تار
پہ گزری ہے وہ کس دل کو پتہ ہے

آخر میں بہت صفائی کے ساتھ یہ بھی عرض ہے کہ راقم کا قلبی تعلق حضرت سے خواہ کتنا ہی گہرا ہو مگر ظاہری تعلق محض درس گاہ تک محدود تھا، خارج درس ایک آدھ مرتبہ کے علاوہ کبھی بالمشافہ ملاقات کی نوبت نہیں آئی، اس لیے بہت ممکن ہے کہ حضرت کی شخصیت کے کسی پہلو کو سمجھنے میں مجھ سے کوئی دانستہ نادانستہ غلطی ہوگئی ہو، بہر حال ایک کم فہم اور نالائق طالبِ علم جو سمجھ سکا وہ عرض کر دیا، باقی حضرت کے مزاج شناس، لائق تلامذہ اور بھی بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے ان شاء اللہ۔ راقم کا تو اصل مزاج یہی ہے کہ اپنے موجود علماء، صلحاء، اکابر، مشائخ اور اساتذہ کی وفات کے بعد، طول طویل قصیدہ خوانیوں سے بہتر ہے کہ حین حیات اپنے بڑوں کی خوبیوں کو تسلیم کر کے ان سے فائدہ اٹھایا جائے، اور مرحوم اکابر کی ایسی مبالغہ آمیز صفات بیان کرنے کے بجائے کہ جن سے وہ ایک مافوق الفطرت ہستی معلوم ہوں، اور قاری یہ سمجھ کر ہمت ہار جائے کہ بھائی ہمارے لیے ایسا بننا کہاں ممکن ہے۔۔۔ مناسب یہ ہے کہ ان کی ایسی صفات بیان کی جائیں جو دوسرے بھی۔ اگر چاہیں تو۔ اختیار کر سکیں، اسی لیے اس

مضمون میں انہیں صفات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا حصول بہت زیادہ مشکل نہیں ہے، بس مضبوط قوتِ ارادی، مسلسل محنت اور توجہ الی اللہ کی ضرورت ہے۔

آیئے ان صفات کو حاصل کرنے کا عزم کریں اور حضرت کے مشن کو زندہ رکھیں یہی ہم سب کی طرف سے حضرت الاستاذ کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔ ان شاءاللہ

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

اللہ حضرت الاستاذ کو حلۂ مغفرت سے آرستہ فرمائے، قرب کے اعلی درجات عطا فرمائے، آپ کے تمام متعلقین کو عموما اور اہلِ خانہ کو خصوصا صبر جمیل عطا فرمائے، امت کو بالخصوص دارالعلوم دیوبند کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے، ہم سب کے لیے بھی خاتمہ بالخیر مقدر فرمائے اور منجملہ دیگر مسلمانوں کے اس نابکار کو بھی زمرۂ مغفورین میں محشور فرمائے آمین۔

❁...❁...❁

علم وفن سے عشق تھاان کی طبیعت کا خمیر

(اکابرواسلاف کےعلوم کے ترجمان، کاروانِ علم وعرفاں کے قافلہ سالارمحدث جلیل، فقیہِ بےنظیرحضرت الاستاذمولانامفتی سعیداحمد صاحب -نوراللہ مرقدہ- کی تدریسی خصوصیات وامتیازات سے متعلق ایک تاثراتی تحریر)

مولانامحمدذکوان دیوبندی
متعلّم تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند

اس سینۂ گیتی پر قافلۂ انسانی ہزاروں سال سے محوِ خرام ہے، کروڑ ہا کروڑ انسان گلشن ہستی میں وجود پذیر ہوئے اوراس دارِفانی میں اپنی حیاتِ مستعار کی متعینہ ساعات گذار کر دار بقا کی طرف کوچ کر گئے، باری تعالیٰ کے سوا ہر وجود کا انجام عدم، ہر ہست کی انتہا نیست اور ہر حیات آشنائے موت ہوا کرتی ہے، خالق کائنات کا یہ ازلی فیصلہ اوراٹل قانون ہے،لیکن فطرت کی صنّاعی کا کرشمہ اورقدرت کی بازی گری کا ایک عجیب مظہر یہ بھی ہے کہ جس طرح سمندر میں بارش کے بے شمار ولاتعداد قطرے ہر سال گرتے ہیں،لیکن ان ہی میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوشِ صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاج سلطانی کا زیور بنتے ہیں، اسی طرح اس کرۂ ارض پر وجود پذیر ہونے والے کچھ اشخاص اپنی اصل کے اعتبار سے تو صرف ایک ''شخص'' اور ''فانی وجود'' کی حیثیت رکھتے ہیں؛لیکن ان کی جہد مسلسل ، سعی پیہم ، اعلیٰ کردار، بلنداخلاق، نمایاں خدمات اور ناقابلِ فراموش کارناموں کے ذریعے ایک ایسی ''شخصیت'' تشکیل پاتی ہے جو اپنے وجودِ اصلی کے فنا ہوجانے کے باوجود بھی اپنے جاننے اور چاہنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے،اس کی نغمہ سرائی کے ختم ہوجانے کے بعد بھی گلشن ارضی کی فضا اس کی صدائے بازگشت سے ہمیشہ گونجتی ہے، دنیا سے رخصت ہوجانے کے باوجود اس کی

خدمات اور کارنامے زبان زدِ خاص وعام رہا کرتے ہیں، یہ غیر فانی ''شخصیت'' ہی اس ''شخص'' کا حقیقی تعارف ہوا کرتی ہے، جو نہ گردشِ لیل ونہار اور صبح وشام کی الٹ پھیر میں گم ہوتی ہے، نہ ہی تاریخ اسے فراموش کرسکتی ہے اور نہ وقت کی دبیز چادر اسے چھپا سکتی ہے۔

ان ہی شخصیات میں سے ایک نمایاں اور ممتاز شخصیت مردِ حق آگاہ، قافلۂ حق کے خضرِ راہ، بحرِ علم وعرفاں کے گوہرِ آبدار، علوم عالیہ وآلیہ کے شناور، محدثِ جلیل، فقیہِ بے نظیر، یادگارِ سلف، مسندِ حدیث کی آبرو، حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ کی ذات گرامی بھی ہے، وہ ملت بیضاء کے قافلۂ تعلیم وتعلّم کے سالار بھی تھے اور سفینۂ علوم ومعارف کے کھیون ہار بھی، حق شناس بھی تھے اور حق سپاس بھی، وہ نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو رہتے تھے، ان کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل تھے، وہ رزم اور بزم دونوں ہی میں پاک دل اور پاک باز تھے، حق گوئی وبے باکی ان کا شیوہ تھا اور اس سلسلے میں وہ ''لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم'' کی عملی تصویر تھے، وہ صرف ''یافت'' پر قناعت کے قائل نہ تھے؛ بلکہ ''دریافت'' کے خوگر تھے، وہ بحرِ علم کے نکالے ہوئے لعل وگہر پر اکتفا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ سمندرِ علم کی تہوں سے خود گوہرِ آبدار تلاش کر کے لایا کرتے تھے، وہ صرف شہد کے کھانے پر قانع نہیں تھے؛ بلکہ خود علم وتحقیق کے غنچہ وگل کا عطر کشید کر کے دوسروں تک پہنچاتے تھے، ان کی تمام خصوصیات کو الفاظ کے تنگ دامن میں سمیٹنا ایک مشکل امر ہے؛ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ: ''حضرت الاستاذ نے ایک نہایت کامیاب، حقیقی معنی میں بامقصد، انتہائی جامع اور ایسی کامل ومکمل زندگی گزاری ہے جو ان کے بعد آنے والوں کے لیے نمونۂ عمل بھی ہے اور شاہراہِ زندگی پر کامیابی کا سفر طے کرنے کے لیے ایک عمدہ کلید بھی، وہ درج ذیل شعر کے بجا طور پر مصداق ہیں:

زندگی ایسے گزاری کہ سُبک سر نہ ہوئے
یعنی اس دور میں جینے کا ہنر ہوگئے ہم

اور:

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین ودنیا کا سبق تیری حیات

حضرت الاستاذؒ کا ایک اہم امتیاز علمی اعتبار سے ان کی جامعیت اور ہمہ گیریت تھی، وہ ایک بصیرت مند فقیہ اور اسرارِ شریعت کے رمز شناس بھی تھے اور علم حدیث کے شناور بھی، قرآنیات اور تفسیر پر بھی وہ عمیق نگاہ کے حامل تھے اور علوم آلیہ (نحو، صرف، منطق وفلسفہ) میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے، وہ اسلام کے داخلی اور خارجی فتنوں سے آگاہی بھی رکھتے تھے اور ان کی تردید وبیخ کنی کے لیے ہمہ وقت کوشاں بھی رہتے تھے، اکابر واسلاف کے علوم سے ان کو گہری وابستگی بھی تھی اور ان علوم کی بھرپور ترجمانی کا سلیقہ بھی انہیں حاصل تھا۔ ان تمام اوصاف وکمالات کا حامل ہونے کے باوصف حضرت الاستاذ کی سب سے بڑی خصوصیت اور عملی زندگی میں ان سب کا بڑا امتیاز ان کی بے مثال تدریس ہے، ان کے میخانۂ علم وعرفاں سے سے فیض یاب ہونے والا ہر بادہ خوار اس بات کا معترف ہے کہ ان کا اصل میدان تدریس ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے اندران کا درس ایک منفرد، بے مثال، ممتاز اور نرالا درس تھا، وہ صرف کتاب نہیں پڑھاتے تھے؛ بلکہ علم کا پیکر تراشتے تھے، بولتے تھے توحسن بیان کے موتی رولتے تھے، ان کی تقریر علم وفن کی خشک زمین کے لیے برسات اور سننے والے کے دل پژمردہ کے لیے آبِ حیات ہوا کرتی تھی۔ ان کا درس طلبہ کے درمیان بے پناہ مقبول تھا، جوں ہی ان کے سبق کا وقت قریب آتا، طلبہ جوق درجوق تیز گامی؛ بلکہ برق رفتاری کے ساتھ دارالحدیث کا رخ کرتے، اور انتہائی دل چسپی اور جوش وخروش کے ساتھ ان کے درس میں حاضر ہوتے۔ متعینہ وقت پر حضرت الاستاذ دارالحدیث میں داخل ہوتے، عصا کے سہارے میانہ رفتار سے چلتے ہوئے مسند تک تشریف لاتے اور طلبہ کی طرف رخ کر کے واضح انداز میں سلام کرتے، تمام طلبہ باآواز بلند جواب دیتے

(حضرت کی اس عادت کی وجہ سے جہاں طلبہ کے دل میں اس سنت نبوی کی اہمیت جاگزیں ہوجاتی، وہیں ان کے سلام کرتے ہی دارالحدیث کا ماحول انتہائی پرُسکون ہوجاتا اور پوری فضا پر سکوت چھا جاتا، گویا ان کے درس کا آغاز مسند پر تشریف فرما ہونے کے بعد سے نہیں؛ بلکہ دارالحدیث میں داخل ہوتے ہی ہوجایا کرتا تھا) پھر مسند پر جلوہ افروز ہوتے اور کتاب کا درس شروع ہوتا۔ جب وہ اپنے مخصوص اور منفرد لب ولہجہ میں گفتگو شروع فرماتے تو تمام طلبہ گوش برآواز ہوجاتے اور پورا دارالحدیث ''کأنَّ علٰی رؤوسھم الطَّیر'' کا منظر پیش کرتا۔

سنا ہے اس کو سخن کے اصول آتے ہیں
کرے کلام تو باتوں سے پھول آتے ہیں

حضرت الاستاذ کی حیات مبارکہ کے مختلف گوشوں، پہلوؤں اور نوع بہ نوع خصوصیات پر سینکڑوں ارباب قلم اور تاج داران سخن لکھ رہے ہیں اور خراج تحسین کا یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا، راقم الحروف کی بھی یہ فیروز بختی ہے کہ دورۂ حدیث شریف سال (۲۰۱۷ء) میں حضرت سے بخاری شریف (جلد اوّل مکمل) پڑھنے کا موقع ملا اور بفضلہٖ تعالیٰ پورے سال پابندی اور بلاکسی ناغے کے تمام اسباق میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، اس لیے راقم حضرت الاستاذ کا ایک ادنیٰ شاگرد ہونے کے ناطے ذیل کی سطور میں حضرت کے بے مثال درس کی کچھ خصوصیات وامتیازات سپردِ قرطاس کرنے کو اپنا ایک خوش گوار فریضہ تصور کرتا ہے، اگرچہ ان تمام خصوصیات کو الفاظ کے تنگ دامن میں سمیٹنے اور ان کی بھرپور ترجمانی سے راقم کا قلم عاجز ہے؛ لیکن ان سے براہِ راست استفادے کی بنیاد پر یہ خصوصیات شنیدہ نہیں؛ بلکہ دیدہ ہیں اور ذاتی تجربے کی حیثیت رکھتی ہیں:

بے مثال قوت افہام وتفہیم:

تعلیم وتعلّم اور درس وتدریس سے وابستہ ہر شخص پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تدریس کا خمیر جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے ان میں سب سے اہم اور بنیادی عنصر مدرس کی قوت افہام وتفہیم اور ترسیلی صلاحیت ہے،

کوئی بھی مدرس مکمل طور پر کامیاب اسی وقت کہلاتا ہے جب وہ متعلقہ مضامین پر مکمل عبور اور دست رس کے ساتھ ساتھ، ان مضامین کو طلبہ کے ذہن میں اتار دینے کا ملکہ رکھتا ہو، حقیقت یہ ہے کہ حضرت الاستاذؒ کو مبدأ فیاض نے افہام وتفہیم کی ایسی ہی صلاحیت سے نوازا تھا جس کی نظیر اس دور میں ملنا ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور ہے۔

یوں ہزاروں مے کدے ہیں پر کہاں پائیں گے ہم
ساقیا تیری شراب کہنہ کا کیف وسرور

مشکل سے مشکل ترین اور دشوار سے دشوار ترین مضامین کو، خواہ علوم عقلیہ سے متعلق ہوں یا علوم نقلیہ سے، اس خوش اسلوبی سے بیان فرماتے کہ غبی سے غبی طالب علم بھی مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لینے کی بنیاد پر قلبی انشراح محسوس کرتا اور مسئلے کی دشواری اور پیچیدگی کا خیال تک نہ آتا۔ اس انداز تفہیم میں وہ کسی کے مقلد نہیں تھے، خود ہی اس کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ ان کی اس خداداد صلاحیت کا اعتراف ان کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کرنے والے ہر طالب علم اور ان کے میخانۂ فیض سے سیراب ہونے والے ہر میکش کو ہے، ان کی درسی تقریرات (تحفۃ القاری، تحفۃ الالمعی وغیرہ) کو علمی حلقوں میں بہ طور خاص حل کتاب کے حوالے سے بے پناہ پذیرائی ملی، جو ان کی اس صلاحیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

حسن ترتیب:

کسی بھی مدرس کا کلام خواہ مواد سے بھر پور ہو؛ لیکن اگر حسنِ ترتیب کے زیور سے آراستہ نہ ہو تو بسا اوقات طلبہ کے لیے طویل ابحاث اور تفصیلی مضامین کو ضبط کرنا اور یاد رکھنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے، اس لیے انداز تفہیم کے ساتھ حسن ترتیب کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ حضرت الاستاذؒ کا درس اس اعتبار سے بھی انتہائی ممتاز؛ بلکہ ایک ''شاہ کار'' کی حیثیت رکھتا تھا، وہ جس موضوع پر بھی گفتگو کرتے انتہائی مرتب اور مربوط انداز میں گفتگو کرتے، حتی کہ ''رفع الیدین'' اور ''قراءت خلف الامام'' جیسی طویل الذیل ابحاث، جن پر وہ بسا اوقات دو دو دن بھی کلام

کرتے، ان میں بھی ان کی ترتیب کا حسن لائقِ دید ہوتا، احادیث کی تشریح وتوضیح ہو یا کسی اعتراض کا جواب، مذاہب ائمہ کا بیان ہو یا ان کے دلائل کا تذکرہ، کسی بھی موقع پر کلام بے ترتیبی اور خلط کا شکار نہ ہوتا اور ہر دو جملے ایک دوسرے سے مربوط اور ہر دو مضمون یکے بعد دیگرے ایک ہی سلسلے کی دو کڑی محسوس ہوتے۔

غیر ضروری طوالت سے گریز:

حضرت الاستاذ کے درس کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ غیر ضروری طوالت اور ہر قسم کے رطب ویابس سے مکمل پرہیز اور کلی اجتناب کرتے تھے، ان کا درس کمیت سے زیادہ کیفیت کی بنیاد پر ممتاز تھا، بسیط سے بسیط مضامین کو مختصر جملوں میں سمودینے کا ہنر انھیں معلوم تھا، کسی حدیث کی شرح اور مرادِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعیین کے لیے شارحین حدیث کے اقوال کا انبار لگانے کے بجائے اپنے وسیع مطالعے اور قوت استنتاج کے نتیجے میں جو قول انھیں راجح معلوم ہوتا اس کو ذکر کرتے، کسی خاص مسئلے میں اگر ان کی کوئی الگ رائے ہوتی تو اس کو بھی ذکر فرماتے؛ لیکن بارہا یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ''یہ میری رائے ہے، تمھیں اس سے اختلاف کا حق حاصل ہے''۔ اختلافی مسائل میں دلائل ائمہ کے ڈھیر نہ لگاتے، صرف بنیادی اور ضروری دلائل پر اکتفاء کرتے اور بطور خاص ائمہ کے درمیان اختلاف کے اسباب کی تنقیح فرماتے، ان کا یہ جملہ تو ان کے تمام شاگردوں کے ذہن میں گردش کرتا ہوگا کہ ''اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان نص فہمی کا اختلاف ہے، دلائل کا نہیں''۔

تفصیلی اور طویل الذیل ابحاث پر سیر حاصل گفتگو اور طویل کلام بھی کرتے، بسا اوقات ایک ہی مسئلے (مثلاً رفع الیدین، قراءت خلف الامام وغیرہ) پر دو دو دن بھی گفتگو جاری رہتی؛ لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ سبق میں حشو وزوائد یا موضوع سے غیر متعلق باتیں در آئیں۔ طویل بحث کے آخر میں عموماً مرتب خلاصہ بھی ذکر کرنے کا اہتمام فرماتے؛ چناں چہ تراویح کے مسئلے پر انتہائی مبسوط ومفصل گفتگو فرمائی پھر اس پوری بحث کا خلاصہ چند منٹوں میں ذکر فرمایا اور پھر اس کا بھی خلاصہ دو جملوں میں فرماتے ہوئے کہا کہ: ''غیر مقلدین کے آٹھ رکعات تراویح کا

قائل ہونے کی بنیاد دو چیزیں ہیں: (۱) قلت تادّب (۲) قلتِ تعبُّد۔

جامعیت:

کسی بھی استاذ کا درس جامع اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ متعلقہ کتاب کے مضامین پر دست رس کے ساتھ ساتھ، اس فن پر بھی مکمل عبور رکھتا ہو، قسام ازل نے حضرت الاستاذ کو اس خوبی سے بھی نوازا تھا؛ یہی وجہ ہے کہ وہ مدرس کو یہ نصیحت بھی فرماتے تھے کہ ''صرف کتاب کے متعلقات دیکھ کر پڑھاؤ گے تو علم نہیں آئے گا، فن دیکھ کر پڑھاؤ گے تو علم آئے گا''؛ چناں چہ ہم نے حضرت الاستاذ کے درس میں اس بات کا بھی خوب مشاہدہ کیا کہ کتاب کو بھرپور حل کرنے کے ساتھ متعلقہ مضامین ومباحث پر جامع اور بصیرت افروز کلام فرماتے، حدیث کی تشریح درپیش ہو یا الفاظ حدیث کی لغوی وضاحت، ائمہ کرام کے مذاہب کا بیان ہو یا ان کے دلائل کا تجزیہ، کسی روایت کی تاویل وتوجیہ ہو، یا کسی اعتراض کا جواب، غرض کسی بھی بحث کو تشنہ نہ چھوڑتے، صلاۃ کسوف وخسوف سے متعلق ابحاث بخاری کی مغلق اور مشکل ابحاث میں سے ہیں، امام بخاری نے باب میں مختلف روایات کو اس طرح سے جمع کیا ہے کہ طالب علم کا ذہن الجھن کا شکار ہوجاتا ہے؛ لیکن ہمیں یاد ہے کہ اس باب کے آغاز ہی میں حضرت الاستاذؒ نے ایسی جامع تقریر فرمائی تھی کہ بحث کی ہر قسم کی پیچیدگی بھی دور ہوگئی تھی، اور مختلف روایات کے جمع کرنے کا مقصد اور ان کا محمل بھی واضح طور پر سامنے آگیا تھا۔

پورے سال ایک ہی انداز میں کتاب کی تدریس:

برصغیر پاک وہند میں کتب حدیث اور بالخصوص بخاری شریف کی تدریس کا جو طریقہ رائج ہے وہ یہ کہ ابتدائے سال میں تو درایۃً پڑھانے کا اہتمام ہوتا ہے، طویل بحثیں کی جاتی ہیں؛ لیکن آخر میں جب وقت کم ہوتا ہے اور کتاب مکمل کرنی ہوتی ہے تو صرف روایۃً اور سرداً پڑھا کر کتاب مکمل کی جاتی ہے؛ لیکن حضرت الاستاذ کے درس کی شان ہی کچھ الگ تھی، وہ مکمل کتاب درایۃً پڑھاتے تھے؛ یہی وجہ تھی کہ وہ غیر ضروری طویل گفتگو کے

قائل نہیں تھے؛ بلکہ اصل توجہ اس بات پر رہتی کہ طلبہ مکمل کتاب سمجھ کر پڑھیں اور تشنگی باقی نہ رہے۔اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت کا درس پورے برصغیر میں ایک منفرد اور ممتاز درس تھا۔

نصاب پر قابو:

کامیاب مدرس کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس کو کتاب حل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے نصاب پر مکمل قابو اور گرفت ہو، بخاری شریف درس نظامی کی آخری کتاب ہے، جو کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے سب سے بڑی کتاب تصور کی جاتی ہے؛ لیکن اس کے باوجود بھی حضرت الاستاذ کو اس کے نصاب پر جو قابو اور کنٹرول حاصل تھا وہ بے مثال ہے، مکمل کتاب حل کر کے اور سمجھا کر پڑھاتے؛ لیکن دورانِ سال جب رفتہ رفتہ سبق کی مقدار بڑھتی تو بھی حل کتاب کے حوالے سے کسی بھی قسم کی تشنگی کا احساس نہ ہوتا اور نہایت اطمینان سے کتاب مکمل ہوجاتی۔

سہل اور واضح تعبیر درس:

چوں کہ درس وتدریس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طلبہ کتاب مکمل طور پر سمجھ لیں اور اس کے جملہ مباحث ان کو اچھی طرح ذہن نشیں ہوجائیں، اس لیے درس وتدریس کی زبان نہایت آسان اور تعبیر بالکل واضح ہونا امر لابدی ہے، اگر مدرس کی تعبیر ہی سہل نہ ہوتو طلبہ کے لیے کتاب اور اس کے مباحث ’’عقدۂ لاینحل‘‘ بن جائیں گے اور درس وتدریس کا بنیادی مقصد ہی فوت ہوجائے گا، یہی وجہ تھی کہ حضرت الاستاذ نہایت آسان اور سہل زبان اور سوچی سمجھی ہوئی واضح تعبیر درس اختیار فرماتے تھے؛ چناں چہ طلبہ کے لیے ان کے درس کو ہضم کرنا اور ان کی بات سمجھ لینا بہت آسان کام تھا اور انھیں مغلق اور پیچیدہ مسائل کے سمجھنے میں بھی کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔تعبیر کے سلسلے میں حضرت کی اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے طلبہ کی آسانی کے لیے بہت سی ایسی اصطلاحات وضع کی تھیں کہ جو کسی اور یہاں ہم نے نہیں سنی، خود ہی وہ ان کے موجد تھے۔راقم کو اس وقت ان کی

دو مثالیں یاد آرہی ہیں۔(۱) اختلافی مسئلے میں سبب اختلاف کی تنقیح فرماتے ہوئے عموماً فرماتے کہ: یہ اختلاف نص فہمی کا ہے، یعنی فلاں حدیث کو فلاں امام نے اس طرح سمجھا اور دوسرے نے اسی حدیث کو دوسری طرح سمجھا تو اختلاف ہوگیا۔ کبھی فرماتے: یہاں اختلاف دلائل کا ہے، یعنی اس مسئلہ میں مختلف متعارض دلائل ہیں، فلاں امام نے فلاں دلیل کو لیا اور باقی میں تاویل کی اور فلاں نے دوسری پر عمل کیا اور باقی دلائل میں تاویل کی۔(۲) بہت سے مواقع پر فرماتے کہ یہ ''ترخیص عندالتشریع'' ہے، یعنی جس وقت یہ فعل مشروع ہوا تو ابتدائی زمانے میں جو رخصتیں ہوا کرتی ہیں ان میں سے یہ بھی ہے؛ لہٰذا بعد کے لیے اس کو دلیلِ جواز نہیں بنایا جاسکتا، جیسا کہ مشروعیت صلاۃ کی ابتدا میں صحابہؓ کا دورانِ نماز گفتگو کرنا یہ بھی تشریع کے وقت کی ترخیص ہے۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جو ان کی درسی تقریرات میں بھی جابجا موجود ہیں۔

گفتگو میں ربط اور ٹھہراؤ:

روایات واحادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز گفتگو کی منظر کشی جو صحابۂ کرامؓ نے فرمائی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب گفتگو فرماتے تو انتہائی سکون واطمینان اور ٹھہراؤ کے ساتھ فرماتے، حتی کہ اگر کوئی آپ کی گفتگو کے کلمات کو شمار کرنا چاہتا تو شمار کرلیتا۔ حضرت الاستاذؒ نے اس سنت نبویہ کو اپنی حیات سعید کا جزو لازم بنالیا تھا، جب بھی لب کشائی کرتے ٹھہر کر اور اطمینان سے بولتے، دورانِ درس بھی یہ خصوصیت کارفرما نظر آتی، دھیمے اور ہلکے سے مترنم لہجے میں مربوط، مسلسل اور ٹھہر کر واضح انداز میں گفتگو کرتے؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا انداز کلام طلبہ کے لیے بجائے خود ایک درس کی حیثیت رکھتا تھا، تو غلط نہ ہوگا، مثال کے طور پر جب بھی درود شریف پڑھتے تو عام لوگوں کی طرح سرعت کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' نہ پڑھتے کہ جس میں بعض حروف کی ادائیگی صحیح طور پر نہیں ہو پاتی ہے؛ بلکہ ''صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم'' پڑھتے اور الفاظ کی واضح اور صاف ادائیگی فرماتے، یوں محسوس ہوتا کہ جیسے عشق نبوی میں ڈوب کر اور لذت لے کر ان کلمات کو ادا کر رہے ہیں۔ حضرت

الاستاذؒ کا انداز گفتگو بے حد پرکشش اور دلوں کو موہ لینے والا تھا، اس پر مستزاد ان کے علمی نکات و جواہر پارے، جو بھی سنتا ان کا گرویدہ ہو جاتا

اس کی باتیں کہ گل ولالہ پہ شبنم برسے
سب کو اپنانے کا اس شوخ کو جادو آئے

حضرت الاستاذ کے اسی طرز کلام ہی کا نتیجہ تھا کہ جہاں ان کے درس کو سمجھنا طلبہ کے لیے نہایت آسان تھا، وہیں ان کے سبق کو کاپی میں نوٹ کرنا اور درسی افادات کو قلم بند کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا؛ چناں چہ راقم السطور کے بڑے بھائی مولوی محمد صفوان (متعلّم حال تخصص فی الافتاء دارالعلوم دیوبند) نے دورانِ درس ہی حضرت والا کا مکمل درس عربی زبان میں قلم بند کیا۔

مضامین کا استحضار:

حضرت الاستاذ کا ایک نمایاں امتیاز یہ تھا کہ خداوند قدوس نے ان کو مضبوط قوت حافظہ کی دولت سے نوازا تھا، جس میں ان کی سعی پیہم اور مسلسل محنت نے چار چاند لگا دیئے تھے، بخاری شریف جیسی مبسوط کتاب کے جملہ مباحث کا ہمہ وقت ازبر ہونا ان کے بے نظیر استحضار کی روشن دلیل ہے، اخیر سال میں بھی اگر ان سے کسی ایسے مضمون کے متعلق سوال کیا جاتا جو ابتدائے سال میں گزر چکا ہو تو بھی وہ مکمل مضمون کو بعینہٖ الفاظ کے ساتھ دہرانے پر قادر رہتے تھے، حالاں کہ اتنی مدت تک نفسِ مضمون کا ہی کما حقہ مستحضر رہنا کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ خود ان ہی کا قول تھا کہ: ''اگر تم مجھ سے آج کسی چیز کے متعلق سوال کرو اور پھر ۳؍سال بعد اسی کے بارے میں سوال کرو تو میرے جواب کے الفاظ میں بھی فرق نہ پاؤ گے''۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ مدرس جو بھی کتاب پڑھائے اس کو متعلقہ کتاب کے مباحث اس طرح ازبر ہونے چاہئیں کہ وہ ہمہ وقت کتاب کے کسی بھی حصے سے متعلق زبانی صحیح جواب دینے پر قادر ہو، اس سلسلے میں حضرت کے صاحب زادے مولانا محمد سعید صاحب استاذ

جامعۃ الامام محمد انور شاہ کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت والد محترم نے سوال کیا: کون کون سی کتابیں پڑھاتے ہو؟ جواب میں چند کتابوں کے نام بتائے جن میں شرح عقائد بھی تھی، معلوم کیا: کتنی ہوئی؟ عرض کیا کہ اتنے صفحات، پھر کچھ سکینڈ کے وقفے کے بعد ان صفحات میں سے جو گذر چکے تھے ایک عبارت زبانی پڑھی اور اس کا مطلب دریافت کیا، ایک تو حضرت الاستاذ کی شخصیت کا رعب اور دوسرے یہ کہ اس بحث کو پڑھائے ہوئے بھی ایک عرصہ گزر چکا تھا، بہر حال! جواب نہیں آیا تو وہ صورت حال سمجھ گئے اور پہلے تو اچھی طرح تنبیہ فرمائی، اس کے بعد یہ نصیحت کی کہ: ’’وقتی طور سے حل کر کے اگر بیس سال بھی کتاب پڑھاؤ گے تو کتاب یاد نہیں ہوگی، مدرس کا کمال یہ ہے کہ اسے کتاب کے جملہ مباحث ایسے یاد ہوں کہ جب بھی اور جو بھی کتاب سے دریافت کرے وہ اسی وقت جواب دینے پر قادر ہو‘‘۔

قوتِ استنتاج اور رائے کی پختگی:

حضرت الاستاذ کی ذات کو دوسروں سے ممتاز کرنے والی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کسی بھی قول، فکر یا رائے کو اپنے گہرے مطالعے اور علم وتحقیق کی چھلنی میں چھان پھٹک کر دیکھتے تھے، پھر اسے اپنے ذوق ووجدان کی کسوٹی پر پرکھتے اور کھرا کھوٹا الگ کر دیتے تھے اور غور وفکر کے بعد جو رائے قائم کرتے اس پر پختگی کے ساتھ جم جاتے تھے، وہ راہِ علم وتحقیق میں بذات خود آبلہ پائی اور صحرا نوردی کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بعض مسائل میں وہ الگ رائے قائم کرتے تھے، جن میں سے ہر ایک سے اگرچہ اتفاق کرنا تو ضروری نہیں؛ لیکن بہر حال وہ ان کی وسعت نظر، تعمق فکر، علمی کدو کاوش اور امانت دارانہ تحقیق کی دلیل ضرور ہیں؛ چناں چہ ایک مرتبہ حدیث ’’شهرا عيد لا ينقصان۔۔‘‘ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی شارحین نے دس توجیہیں کی ہیں، میرے نزدیک وہ سب صحیح نہیں؛ اس لیے کہ میں نے گیارہویں توجیہ کی ہے اور اگر آپ حضرات کو وہ سمجھ میں نہ آئے تو آپ کو بارہویں توجیہ کا بھی اختیار ہے۔

حضرت الاستاذ نے جو توجیہ کی تھی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: مقصود ماہِ رمضان کی فضیلت کا بیان ہے کہ رمضان خواہ اُنتیس دن کا ہو یا تیس دن کا، ثواب پورا تیس دن کا ملے گا۔ اور ماہِ ذی الحجہ کا تذکرہ طرداً للباب ہے، جیسے: "أسودین" کا اطلاق کھجور اور پانی پر، تو کھجور تو کالی ہوتی ہے، مگر پانی نہیں؛ لیکن چوں کہ کھجور کے ساتھ پانی پیا جاتا ہے؛ اس لیے پانی کا بھی تذکرہ تبعاً کر دیا گیا۔ اور عید کے دوسرے مہینے (ذی الحجہ) کے تذکرے کا مقصد بنائے حکم کی طرف ذہن منتقل کرنا ہے کہ ثواب اس لیے نہیں گھٹے گا کہ وہ عید (خوشی) کا مہینہ ہے، ایسے موقع پر اگر ثواب گھٹا دیا جائے تو خوشی کرکری ہو جاتی ہے۔

موقع کے لحاظ سے علمی ظرافتیں:

حضرت الاستاذ کے درس کا دورانیہ بالعموم ڈھائی گھنٹے (اور بسا اوقات اس سے بھی زیادہ) طویل ہوا کرتا تھا، اس دوران یہ ممکن تھا کہ طلبہ سستی یا سبق سے غفلت کا شکار ہو جائیں؛ لیکن حضرت الاستاذ طلبہ کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف تھے، چناں چہ وہ موقع بہ موقع ایسے علمی لطیفے سناتے یا مزاحیہ جملے بولتے کہ پوری محفل زعفران زار ہو جاتی، سب طلبہ کی سستی و کاہلی کافور ہو جاتی اور درس کے لیے مطلوبہ بشاشت ونشاط عود کر آتی۔

طلبہ کی فکری و مسلکی رہنمائی:

حضرت الاستاذ عمر کے آخری بارہ سالوں میں دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین بھی تھے اور شیخ الحدیث بھی، گویا اس اعتبار سے وہ کاروانِ دیوبندیت کے قافلہ سالار بھی تھے اور مسلک دیوبند کے ترجمان ومحافظ بھی، اس لیے مسلک کی توضیح وتشریح ان کی ذمے داری بھی تھی، جس کو وہ بخوبی نبھاتے تھے، دورانِ درس بھی وقتاً فوقتاً طلبہ کی فکری ومسلکی رہنمائی فرماتے کہ دیوبندیت کس چیز کا نام ہے، فلاں چیز دیوبندیت میں داخل ہے اور فلاں چیز نہیں، طلبہ میں فکری ومسلکی شعور بیدار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کسی قسم کا اشتباہ نہ پیدا ہو اور راہِ حق کے راہرو اپنی منزل مقصود سے ہم کنار ہو سکیں۔ حضرت کے درس کی یہ وہ نمایاں خصوصیت تھی جو دیگر حضرات کے یہاں بالعموم

نہیں نظر آئی۔

حضرت الاستاذؒ کے درس کی یہ چند خصوصیات ہیں، جنھیں اب چراغ رخ زیبا کر بھی ڈھونڈھ پانا مشکل ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان خصوصیات وامتیازات میں ان کے ''زور بازو'' سے زیادہ ''خدائے بخشندہ'' کی عطا کار فرما تھی۔ ان کی رحلت سے مسند تدریس سونی ہوگئی اور گرمیِ محفل ماند پڑھ گئی ہے۔

محفل میں اب وہ گرمی محفل نہیں رہی
نازاں تھی جس پہ شمع وہ پروانہ چل بسا

آج کے اس دور میں جب کہ علمی انحطاط روز افزوں ہے، ممتاز ارباب علم اور اصحابِ فضل وکمال یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہوتے جارہے ہیں، علم کی چمک دمک ماند پڑ رہی ہے اور بزم علم وادب سونی سونی نظر آرہی ہے، حضرت الاستاذؒ کی وفات حسرت آیات علمی دنیا کے لیے ایک بہت عظیم حادثہ ہے۔ امت اسلامیہ نے اس نادر شخصیت، اس جامع کمالات اور اس حیرت انگیز نمونۂ عمل کی وفات سے کیا کچھ کھودیا، الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی ان کے فضل وکمال، تبحر علمی اور خصوصیات وامتیازات کے بہت سے گوشے تشنۂ بیان ہیں۔ ان کے علمی خزانے وجواہرات ان کی تالیفات وتصنیفات میں پوشیدہ ہیں، جن سے افادہ واستفادہ آگے بھی جاری رہے گا۔ ان شاءاللہ۔

بہر حال! آسمانِ علم کے افق پر آج سے تقریباً آٹھ دہائیوں قبل طلوع ہونے والا یہ آفتابِ عالم تاب، ہزاروں تشنگانِ علوم نبوت کو فیض یاب کرنے کے بعد اب روپوش ہو چکا ہے؛ لیکن اس کی ضیاء بار کرنیں اس کے جاننے اور چاہنے والوں کے دلوں کو ہمیشہ منور کرتی رہیں گی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

❁ ... ❁ ... ❁

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ

ایک عالم گیر شخصیت امتیازات وخصوصیات

مولانا عبدالرحمن چمپارنی
متعلم دارالعلوم وقف دیوبند

یہ بات بہ مثل شمس وقمر کے واضح ہے کہ اسلام ابدی اور خدا کا پسندیدہ دین اورامت مسلمہ اس کا شاداب اور سدابہار درخت ہے، یہ خدائی ترکش ہے کہ نہ اس کے تیر ختم ہوتے ہیں اور نہ نشانہ خطاء ہوتا ہے سب سے بڑا ثبوت اس امت میں ایسے مصلحین ومجاہدین، خداداد صلاحیتوں سے مالا مال، مؤید من اللہ، نادرہ روزگار، اوراسلام کے لیے باعث صدافتخار شخصیتیں ہیں، جو ہر دوراور ہر زمانہ میں امت مسلمہ کی قیادت اوراس کی صحیح رہنمائی کرتی رہی ہیں، جن کے علوم وفنون، تالیفات وتصنیفات، درس وتدریس سے امت مسلمہ سیراب ہوتی رہی ہے، اوراپنی علمی وعملی تشنگی بجھاتی رہی ہے، ان عظیم ترین اور ہمہ جہت وعالم گیر شخصیتوں میں سے ایک شخصیت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی تھی، آپ رحمۃ اللہ علیہ متنوع صفات اور خصوصیات کے حامل تھے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کم گو، تنہائی پسند، قانع، مرنجاں مرنج، اوربے آزار انسان تھے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کی طاقت کا اصل سرچشمہ فطرت سلیم، دل کی پاکیزگی، روح کی بالیدگی، دینی غیرت وحمیت، اسلام کے لیے اضطراب وبےچینی، اس زمانے کے فاسد ماحول پران کے بےچینی اورتشویش، اخلاص وللّٰہیت، عبادت کا ذوق وشوق اوردل کے ٹارچ کوذکرودعاء، توبہ واستغفاراورآہ سحرگاہی کے سلس بھرنا تھا۔

چندنمایاں امتیازات وخصوصیات

آپ رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ ملی خصائص اور مزاج کا نقطۂ عروج تھے، عقل پر محبت کی فرماں روانی، شمع کی جاں گدازی، اور پروانہ کی جاں نثاری، ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و شگیفتگی، عالم اسلام و ملت اسلامیہ کی حد سے بڑھی ہوئی فکر کے حامل تھے، آپ رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم محدث، بلند پایہ مفسر، خوش نویس و خوش خط مصنف تھے۔

شیخ الحدیث و درس حدیث

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی درس حدیث نہایت ہی سلیس، عمدہ، آسان اور عام فہم زبان میں ہوتی، ایک دیہاتی شریک درس ہوتو پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ سے بہرہ ورہو، رواۃ پر مکمل کلام، آسان ومشکل ہر مسئلہ کی وضاحت اوراس پر مزید گفتگو اگر کوئی حدیث جس کا ذکر ترمذی میں گذر گیا ہوتا، پھر وہی حدیث شریف بخاری شریف میں دوبارہ آتی، تواس کی مکمل توضیح فرماتے، سابقہ بیان پر اکتفاء نہیں کرتے، کمال کی بات یہ ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے، جب آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ذمہ درس بخاری و درس ترمذی دونوں تھیں۔

ماہر درس وتدریس

آپ رحمۃ اللہ علیہ زبان وادب کا خداداد ذوق، ان کی تعلیم کا فطری ملکہ، تعلیم میں جاں گدازی ودل سوزی کی کیفیت جو مدت دراز سے تعلیمی وتدریسی حلقوں سے مفقود اور تاریخ کے اوراق میں مدفون ہوکر رہ گئی ہے، اپنے طلباء وشاگردوں سے پدرانہ بلکہ مادرانہ محبت وانس، اپنے ذوق نظر کو اپنے طلباء تک منتقل کردینے اور ان کے رگ و ریشہ میں اتار دینے کی عجیب وغریب قابلیت، زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، ماہر فن میں ہوتی ہے، یہ قابلیت کسبی نہیں وہبی تھی۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف خوبیوں سے پر

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف ایسی ہیں جیسا کہ اس میں شبلی - رحمۃ اللہ علیہ کا قلم کارفرما ہو، غزالی وابن تیمیہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا جوش واخلاص ہو، اس پر مستزاد یہ کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف میں خود آپ کی فکر اور روح اس طرح گھل مل گئی ہے، جیسے پھول میں خوشبو اور ستاروں میں روشنی، آپ جب کوئی مضمون لکھتے تو آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کی ساری خوبیاں، آپ کا پورا بانکپن اور اس کی پوری رنگینی موجود ہوتی، آپ رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے بے ساختہ اور بے تکلف مسجع عبارتیں، اور ادبی استعارے اور تشبیہیں قلم سے نکل جاتی۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی انہماکیت ومشغولیت

آپ رحمۃ اللہ علیہ کا قاعدہ تھا کہ جس چیز کی طرف توجہ کرتے تو وہ ان پر پورے طور پر طاری ہوجاتی اور وہ اس میں ڈوب جاتے، ہر وقت اس کا مطالعہ، ہر اس وقت اس کا تذکرہ اور اس کے ماہر اساتذہ سے مشورہ طلب فرماتے رہتے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی جاذبیت

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ میں زندہ دلی اور شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی، وہ اپنے لطیفوں اور بذلہ سنجیوں سے روتوں کو ہنساتے اور راستے چلتوں کو ٹھہرا لیتے، ہر بات میں کوئی پہلو ہوتا نئے نئے نام رکھتے تھے اور مزے مزے کی چٹکیاں لیتے تھے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی شرافت

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی طبعی شرافت، محبت کے فطری عنصر، اور تواضع وسادگی جو ان کی جبلت بن گئی تھی، اس کے بغیر ان کی سیرت اور جوہر کا سمجھنا مشکل ہے۔

کینہ سے کوسوں دور

ان کا دل آئینہ کی طرح صاف تھا، نہ وہ ذاتی کینہ پرور کے مفہوم سے آشنا تھے، نہ سیاسی کینہ پروری سے، جو کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے، ان سے ملنے والا محسوس کرتا تھا کہ وہ دل کھول کر ملتے ہی اور کم از کم اس وقت تمام اختلافات اور پچھلے واقعات کو بھول جاتے ہیں، اس طرح ان کے اندر ایک موہنی تھی، جو دلوں کو موہ لیتی تھی، اس نے جہاں ان کے پیشہ کو کامیابی کا عنصر عطا کیا، جس نے آپ کو تادم حیات مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین بنائے رکھا۔

عاجزی وانکساری کا پیکر

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ جہاں اہل دنیا اور اول اول کے سامنے بڑے خوددار اور غیور واقع ہوے تھے، اہل دین اور خصوصیت ساتھ ان حضرات کے سامنے جن کو اپنے مشائخ اور اکابر کی صف میں شمار کرتے تھے، غایت درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، آپ رحمۃ اللہ علیہ پیدائشی طور پر صحت مند، جفاکش، عالی ہمت، نہایت سادہ سپاہانہ زندگیگزارنے کے عادی تھے، ہر طرح کی جسمانی تکلیف اٹھالیتے تھے، اپنے فرائض منصبی بھی بڑی مستعدی اور انہماک کے ساتھ ادا کرتے تھے، اور عبادت وشب بیداری میں بھی چاق وچوبند تھے، ہر طرح کے تکلفات وتمدن کے لوازم سے بری تھے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی عاجزی وسادگی کا ایک نایاب مثال

ماقبل میں جیسا کہ ذکر ہوا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نہایت ہی عاجز ومتواضع تھے، جس کا تذکرہ ہم بارہا سنتے چلے آرہے تھے، لیکن آپ رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی اور عاجزی کا اندازہ راقم الحروف کو اس وقت ہوا جب مولانا جمال الدین صاحب بلندشہری رحمۃ اللہ علیہ استاد دارالعلوم دیوبند کا سال گذشتہ انتقال ہوا (سن ۲۰۱۹ء بہ مطابق ۱۴۴۰ھ) ہم دارالعلوم میں مولانا جمال الدین صاحب بلندشہری رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ میں شریک ہوے، جنازہ میں کچھ دیر تھا، ہم مسجد قدیم کے سامنے والی گلی میں نودرہ کے قریب کھڑے انتظار کر رہے تھے، آپ رحمۃ

اللہ علیہ بھی ہمارے بغل میں کھڑے تھے، دیر ہونے کی وجہ سے وہی بیٹھ کر انتظار کرنے لگے، نہ کسی کرسی کا انتظار کیا اور نہ ہی کسی گدے کی فرمائش کی، ہم سب طلباء آپ رحمۃ اللہ علیہ کی اس عاجزی کی وجہ سے محو تعجب ہوے اور عبرت لیا، جزاہ اللہ احسن الجزاء آمین۔

آپ کی علمی وروحانی مجلس

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس گوناگوں روحانی ودبستانی تعلقات، مذاق وخیالات کے اتحاد، ان کی پرکشش ذات، علوے نسبی، فطری شرافت اور ایک طرح کی معصومانہ طبیعت کی وجہ سے ان سے ایسی محبت اور انس ہوتا، جو بہت کم معاصرین رفقاء اور اعزاء سے محسوس ہوتا تھا، ان کے آنے سے خوشی ہوتی، ان کے جانے سے رنج، ان کی مجلس سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا، ان کے رہنے سے ایک عجیب طرح کی رونق اور دل بستگی محسوس ہوتی، آپ رحمۃ اللہ علیہ کی انہیں خصوصیات وامتیازات کے بناء پر سب آپ کے شیدائی اور دلدادہ تھے اور آپ رحمۃ اللہ علیہ سب کے چہیتے۔

آپ عام وخاص سب کے چہیتے

آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے روایتی عربی اخلاق، کریں گفتاری وطلاقت لسانی، زندہ دلی، سبک روحی، ذہانت و حاضر جوابی، باہمہ اور زود آشنا طبیعت اور سادگی بے تکلفی کی بناء پر جو ان کے خمیر میں تھی، صف اول کے اساتذہ سے گی کر عام طلباء تک کہ نہ صرف مقبول وہر دل عزیز تھے، بلکہ اکثر موقعوں پر شمع انجمن اور رونق محفل ہوتے۔

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

بالآخر جس وقت کا اندیشہ تھا، وہ ۱۹ رمئی ۲۰۲۰ء بہ مطابق ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی صبح کو پیش آگیا ، شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ اس جہان فانی سے اس عالم جاودانی کو رخصت ہوئے،

جہاں اخلاص و درد متاع بڑی قیمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اور جہاں کریم نکتہ نواز، رب غفور وشکور سے واسطہ ہے، نہ کہ زود رنج اور زود فراموش ملت اور ظاہر بیں اور کوتاہ نظر مؤرخوں سے شیخ الحدیث صاحب کے ساتھ ایک دور کا خاتمہ اور تاریخ کا ایک باب کی تکمیل ہوگئی، جس کے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے اس صدی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، ع

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

❁...❁...❁

باب چہارم:

علمی خدمات

مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی علمی خدمات

مولانا محمد کمال اختر قاسمی
رکن ادارہ تحقیق و وتصیف اسلامی، علی گڈھ

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر جاندار کو دو چار ہونا ہوتا ہے لیکن بعض حادثات ایسے ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے نا قابل تلافی نقصانات چھوڑ جاتے ہیں، استاذ گرامی حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری کی وفات بھی علمی دنیا کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی گراں قدر علمی خدمات ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی، تفسیر، حدیث اور فقہ تینوں علوم میں ان کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا، احادیث کے مشکل ترین مقامات اور ابہامات کو بہت ہی آسان ترین اسلوب میں حل کر دیتے تھے۔ منطق و فلسفہ اور نحو وصرف میں بھی ان کا درک نمایاں ہے۔

درس وتدریس

درس وتدریس ان کا اہم میدان تھا، وہ نہایت کامیاب مدرس اور شفیق مربی تھے، ۱۳۸۴ھ بمطابق ۱۹۶۵ء سے آخری عمر (۵۵ سال) تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، طویل عرصہ سے مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں ترمذی شریف جلد اول اور طحاوی شریف پڑھا رہے تھے، شیخ الحدیث شیخ نصیر احمد خان کی رحلت کے بعد بخاری جلد اول ان کے ذمہ کی گئی اور وہ شیخ الحدیث کے منصب پر بھی فائز ہوئے اور انہیں صدر المدرسین کی ذمہ داری بھی سپرد کی گئی۔

طرز تدریس

طرز تدریس میں سادگی اور بے پناہ سلاست تھی، افہام کی ایسی خداداد صلاحیت حاصل تھی کہ معمولی توجہ سے سننے والا بھی بات کو پورے طور پر سمجھ لیتا تھا، گفتگو میں شفافیت کے ساتھ دل کشی تھی اور طرز تخاطب محبت والفت سے بھرا ہوا تھا۔ احادیث کی تدریس میں فقہاء کی آراء اور ان کے دلائل اور طرز استدلال کے ذکر کے ساتھ اجتہادی طریقہ اختیار کرتے اور تحقیقی مواد سے بھرپور گفتگو کرتے۔ تفسیر وحدیث میں مہارت کے ساتھ فقہ اور اصول فقہ کی تمام باریکیوں پر ان کی گہری نظر تھی، ملک وبیرون ملک کے فقہی سیمیناروں میں ان کی رائے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی فتاویٰ کمیٹی کے صدر تھے۔ تصنیف وتالیف، درس وتدریس میں مہارت کے ساتھ تصنیف وتحقیق میں بھی امتیازی مقام رکھتے تھے، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ، علم کلام اور فلسفہ ان سب موضوعات پر ان کی تصانیف موجود ہیں۔ تفسیر میں ''ہدایت القرآن'' نہایت اہم ترین تفسیر ہے، جس میں آیات احکام اور قصص القرآن پر تفصیلی بحث کے ساتھ قرآن مجید کے تذکیری پہلو پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، اصول تفسیر میں ''الفوز الکبیر'' (جو شاہ ولی اللہ کی فارسی تصنیف ہے) کو مرحوم نے عربی میں منتقل کیا ہے، پھر اس کی اردو شرح بھی کی جو ''العون الکبیر'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر کے ساتھ حدیث اور اصول حدیث میں انہوں نے گراں قدر تصنیفی خدمات انجام دیں اور اس سے متعلق متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں، ان میں سے مقدمہ مسلم کی اردو شرح ''فیض المنعم'' کافی اہم ہے، ان کے دروس ترمذی کا مجموعہ ''تحفۃ الالمعی'' کے نام سے آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، اس میں برسوں کی محنت سے گراں قدر علمی ذخیرہ کو جمع کیا گیا ہے، الفاظ حدیث کی تشریح کے ساتھ اور تمام احادیث کی مدلل ومفصل تحقیقی معلومات سے معمور شرح پیش کی گئی ہے، کتاب العلل کی علمی وفنی تشریح کے ساتھ قیمتی مقدمہ سے اس کتاب کو مزین کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ حدیث میں متعدد تصانیف ہیں، بطور خاص امام طحاوی کی شرح ''شرح معانی

الآثار‘‘ کی عربی تلخیص ’’زبدۃ الطحاوی‘‘ دروس بخاری کا مجموعہ ’’تحفۃ القاری شرح بخاری‘‘ نہایت مقبول اور ہیں۔علم اصول حدیث میں مرحوم کی تصانیف ریفرنس کی حیثیت رکھتی ہیں خاص کر تحفۃ الدررشرح نخبۃ الفکر،شرح علل الترمذی اورتہذیب المغنی (جوعلم رجال میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے) مقبول ترین ہیں۔

فقہ اوراصول فقہ کے ممتاز استاذ تھے،اس میدان میں وہ بہت بلند مقام پر نظر آتے ہیں،فقہ وافتاء کی تدریس کے ساتھ ان کی تصنیفی کاوشیں دنیائے فقہ کے لیے گراں قدر سرمایہ ہیں۔ان میں سے ’’حواشی الفتاوی‘‘ نہایت اہم ہے،اسی طرح ’’حرمت مصاہرت‘‘ تحقیقی مواد پر مشتمل اہم تصنیف ہے،اس میں سسرالی اور دامادی رشتوں کے متعلق مفصل اور مدلل احکام بیان کیے گئے ہیں،اصول فقہ میں ان کی متعدد معرکۃ آراء تصانیف ہیں،ان میں سے کئی کتابیں دارالعلوم دیوبند کے علاوہ متعدد دینی مدارس میں شامل نصاب ہیں،بطور خاص ’’مبادی الاصول‘‘ اور اس کی شرح ’’معین الاصول‘‘ اصول فقہ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت اہم ہیں۔افتاء کے آداب اور اس کی بنیادی شرائط کی رہنمائی کے لیے مرحوم کی کتاب ’’آپ فتویٰ کیسے دیں‘‘ افتاء کے طالب علموں کے لیے نہایت قیمتی رہنمائی ہے۔جو بنیادی طور پر علامہ شامی کی شہرہ آفاق کتاب ’’شرح عقود رسم المفتی‘‘ کی نہایت عمدہ شرح ہے۔

منطق اور فلسفہ میں بھی ان کو درک حاصل تھا،اس فن میں بھی ان کے تصنیفی جواہر بے مثل ہیں،ان میں سے ’’مبادی الفلسفہ‘‘ کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی،جس میں فلسفہ کی تمام اصطلاحات کی عربی زبان میں مختصراور سلیس وضاحت کی گئی ہے،مبادی الفلسفہ کی شرح ’’معین الفلسفہ‘‘ کو بھی بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہے،جس میں حکمت وفلسفہ کے دقیق مسائل کی آسان اسلوب میں وضاحت کی گئی ہے اور فلسفہ کی فنی بحثوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے،ان کے علاوہ مفتاح التہذیب،آسان منطق،منطق کی معروف کتاب ’’سلم العلوم‘‘ کی مقبول ترین شرح ’’ارشاد الفہوم‘‘ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صرف ونحو میں بھی مرحوم کو مکمل مہارت حاصل تھی، چنانچہ صرف ونحو سے متعلق ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، خاص طور سے ابتدائی درجات کے لیے'' آسان نحو'' اور'' آسان صرف'' بے حد مفید ہیں۔فن نحو کی معروف کتاب'' کافیہ'' کی نہایت آسان اسلوب میں انہوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شرح لکھی ،اردوشرح ''ھادیہ'' کے نام سے اورعربی شرح'' وافیہ'' کے نام سے شائع ہوئیں۔معروف محدثین،فقہاء اور راویان کتب کے تفصیلی سوانح پر مشتمل نہایت مبسوط دستاویز تیار کی ہے، جو'' مشاہیر محدثین وفقہاء کرام اورتذکرہ راویان کتب حدیث'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے،جس میں خلفائے راشدین ،عشرہ مبشرہ، ازواج مطہرات، بنات طیبات، مدینہ کے فقہاء سبعہ ،مجتہدین، محدثین ،راویان کتب حدیث، شارحان حدیث،معروف فقہاء و مفسرین، متکلمین اسلام اور دیگر مشہور ترین شخصیات کے جامع ترین تذکرے پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ مشہور محدثین کی تفصیلی حالات زندگی پر مشتمل متعدد تصانیف ہیں،ان میں حیات امام ابو داود، حیات امام طحاوی وغیرہ معروف ومقبول ہیں۔ان کی تالیفات میں ''محفوظات'' جوتین جلدوں پر مشتمل ہے، طالبان علوم نبوت کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے،اس میں ان منتخب آیات و احادیث کو جمع کیا گیا ہے جو بطور خاص طالبان علوم دینیہ کے ایمانیات واخلاقیات کی درستگی کے لیے نہایت اہم ہیں،''محفوظات'' میں موجود آیات واحادیث کو مدارس میں حفظ یاد کرایا جاتا ہے اور یہ اکثر دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سیمیناروں میں پیش کیے گئے چار اہم مقالوں کا مجموعہ'' اسلام تغیر پذیر دنیا میں'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنجز اور ان چیلنجز زدہ حالات میں اسلام کے قائدانہ کردار کی بحالی پر نہایت تفصیل سے مدلل اور محقق گفتگو کی گئی ہے،ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کی اور بھی قیمتی تالیفات ،شروحات اور حواشی ہیں، جو متعلقہ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم کے لیے مفید ہیں۔ان میں سے تسہیل ادلہ کاملہ،حواشی وعناوین ایضاح الادلہ،افادات نانوتوی، رحمۃ اللہ

الواسعۃ، کامل برہان الٰہی، حجۃ اللہ البالغۃ عربی، مجموعہ علمی خطبات، دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، مسلم پرسنل لاء اور نفقہ مطلقہ وغیرہ اہم ترین علمی وتحقیقی تالیفات ہیں۔ایک طرف جہاں وہ کثیر التصانیف محقق اور باکمال مدرس تھے وہیں متنوع علمی جہات پر کامل دسترس رکھتے تھے، مدارس دینیہ میں متداول تمام فنون میں ان کی حیثیت ایک مرجع کی تھی، ان کا درس نہایت مقبول اور عام فہم ہوتا تھا، معلومات سے پر اور نہایت موثر گفتگو کرتے تھے، انداز ہ تحریر اور اسلوب بیان بھی اسی طرح آسان، عام فہم، معلومات سے پر اور نہایت موثر تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات سے دنیا کو فیض یاب کرے اور ان کے لیے باعث مغفرت اور بلندی درجات کا ذریعہ بنائے۔آمین۔

❁...❁...❁

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

کی تصنیفی خدمات کا تعارف

ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی سنبھلی
ڈائریکٹر النور پبلک اسکول سنبھل

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے ۲۵ رمضان ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء کو وفات سے قبل تک ۵۷ سال مدارس اسلامیہ بشمول ۴۸ سال ایشیاء کی عظیم اسلامی درسگاہ ''دارالعلوم دیوبند'' میں قرآن وحدیث کی وہ عظیم خدمات پیش فرمائی ہیں کہ صدیوں تک علماء کرام ودانشورانِ قوم اُن سے سیراب ہوکر امت مسلمہ کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ دارالعلوم دیوبند میں ۳۰ سال سے زیادہ حضرت نے حدیث کی مشہور کتاب ترمذی شریف اور ۲۰۰۸ء سے وفات تک تقریباً ۱۲ سال بخاری شریف کا درس دیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ جیسی معرکۃ الآراء کتاب کو آپ نے بیس سال سے زیادہ عرصہ تک پڑھایا۔ غرضیکہ مفتی صاحب نے بیسیوں کتابیں پڑھا کر اُن کا حق ادا کیا۔ ایک طرف حضرت کے لاکھوں شاگرد دنیا کے چپہ چپہ میں دینی علوم کے پیاسوں کو اپنے علوم سے فیضیاب اور سیراب کررہے ہیں، دوسری طرف آپ کی تصانیف سے دنیا کے شرق وغرب میں استفادہ کیا جارہا ہے۔ آپ نے عربی، اردو اور فارسی میں تفسیر قرآن، شرح حدیث، سیرت، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسماء الرجال، تاریخ، نحو، صرف، منطق وفلسفہ، اختلافی مسائل اور جدید مسائل پر ایسی مایۂ ناز تصانیف تحریر فرمائی ہیں کہ اُن میں سے اکثر متعدد مرتبہ شائع ہوئی ہیں بلکہ حضرت کی بعض کتابوں کے لاکھوں نسخے شائع ہوچکے ہیں۔ آپ کی تمام ہی تصانیت خاص کر حدیث

سے متعلق کتابیں برصغیر میں بڑی قدر ومنزلت سے پڑھی جاتی ہیں اور آئندہ نسلوں کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گی ان شاء اللہ۔ آپ کی بعض تالیفات دارالعلوم دیوبند اور ہزاروں دیگر مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ استاذ محترم کی تالیفات کا مختصر تعارف اپنی استطاعت کے مطابق پیش کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبولیت ومقبولیت سے نوازے۔ آمین۔

تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری: دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خانؒ کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء سے بخاری جلد اوّل کا درس مفتی سعید احمد پالن پوریؒ سے متعلق کردیا گیا تھا جو ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۰۲۰ء میں آپ کی وفات تک جاری رہا۔ ۱۴۰۲ھ میں کیمپ کے سال آپ نے بخاری جلد دوئم بھی پڑھائی تھی۔ حدیث کی سب سے مستند کتاب کی عربی، اردو اور مختلف زبانوں میں شرحیں لکھی گئی ہیں اور سید الانبیاء وسید البشر کے اقوال وافعال یعنی حدیث نبوی کی شروحات ہر زمانہ میں لکھی جاتی رہیں گی ان شاء اللہ۔ مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع شدہ ۱۲ جلدوں پر مشتمل صحیح بخاری کی اردو زبان میں یہ شرح مفتی صاحب کے صحیح بخاری کے دروس کا مجموعہ ہے جو نہ صرف بخاری شریف پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے نہایت مفید ہے بلکہ حدیث کی دیگر کتابوں کو سمجھنے کے لئے بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ شرح نہ تو اتنی طویل ہے کہ پڑھنے والے کو اکتاہٹ محسوس ہو اور نہ اتنی مختصر ہے کہ مسائل کی وضاحت بھی نہ ہوسکے۔ ہر جلد بڑے سائز کے تقریباً ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی: مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے دارالعلوم دیوبند میں تقریباً ۳۰ سال حدیث کی اہم کتاب ''ترمذی'' پڑھائی۔ میں نے بھی استاذ محترم سے ۱۹۹۳ھ۔ ۱۹۹۴ء (۱۴۱۴ھ) میں ترمذی جلد ا پڑھی ہے۔

استاذ محترم مغرب اور عشاء کے درمیان ایسی خاص توجہ اور اہتمام سے ترمذی شریف پڑھاتے تھے کہ طلبہ

حضرت کے درس میں پورے سال ایک مرتبہ بھی غیر حاضر نہیں رہنا چاہتے تھے کیونکہ ترمذی شریف کے درس کی پابندی سے دیگر کتب حدیث کو سمجھنا بھی آسان ہوجاتا تھا۔ ۸ ضخیم جلدوں پر مشتمل ترمذی کی مذکورہ شرح استاذ محترم کے دروس کا مجموعہ ہے، جو اُن کے صاحبزادے اور شاگرد مفتی حسین احمد صاحب نے والد صاحب کے حکم سے جمع کیا ہے۔ ہر جلد بڑے سائز کے تقریباً ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں موجود ترمذی کے نسخے بہت قدیم تھے، حضرت نے ابواب واحادیث کے نمبرات کے ساتھ عربی عبارت کو صحیح طریقہ سے ترتیب دیا تاکہ استفادہ سے آسانی ہوجائے۔ شرح کا مقدمہ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں کتاب العلل کی شرح بھی شامل کردی ہے۔ استاذ محترم محدث ہونے کے ساتھ فقیہ بھی تھے اس لئے ان کے دروس اور کتابوں میں عصر حاضر کے تقاضہ پر ضروری مسائل کا حل بھی ملتا ہے۔

شرح علل الترمذی: یہ حدیث کی مشہور کتاب ''ترمذی'' کے ''کتاب العلل'' کی عربی شرح ہے۔ علۃ کی جمع علل ہے جس کے معنی کمزوری اور بیماری کے ہیں۔ کتاب العلل میں کسی حدیث کی سند میں موجود ضعف پر بحث کی جاتی ہے۔ اس شرح میں نہایت آسان زبان میں کتاب العلل کو سمجھایا گیا ہے۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے متعدد ایڈیشن مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع ہوئے ہیں۔

رحمۃ اللہ الواسعہ: برصغیر کی اہم علمی شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۶۲ء) کی عربی زبان میں تحریر کردہ ایک کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے، جو ابتداء اسلام سے اَب تک ۱۴۰۰ سال میں لکھی گئیں چند اہم کتابوں میں سے ایک ہے، جسے تمام مکاتب فکر کے علماء پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ مگر مشکل عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس کتاب سے استفادہ عام نہیں ہوسکا۔ ۲۵۰ سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود اس کتاب کی مبسوط اردو شرح تحریر نہیں کی جاسکی۔ دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں فضلاءِ مدارس کو مختلف کورسوں میں یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے دارالعلوم دیوبند میں تقریباً ۲۰ سال تکمیلات کے

طلبہ کو یہ کتاب پڑھائی ہے۔ حضرت جیسا بصلاحیت استاذ ہی شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اس کتاب کی شرح لکھنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ چنانچہ استاذ محترم نے پانچ جلدوں پر مشتمل ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے نام سے اردو زبان میں یہ شرح تحریر فرمائی ہے۔ اہل علم نے اس کتاب کی بہت پزیرائی فرمائی ہے۔ جس طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصانیف میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو خاص اہمیت حاصل ہے اسی طرح مفتی صاحب کی شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کا اُن کی تالیفات میں مقام ہے۔ ہر جلد بڑے سائز کے تقریباً ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

تحقیق وتعلیق حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' مفتی صاحب کی تحقیق وتعلیق کے بعد دو جلدوں میں مکتبہ ابن کثیر، دمشق (سوریا) اور مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ عربی داں حضرات کے لئے اس اہم کتاب کو سمجھنے میں استاذ محترم کا حاشیہ کافی مفید ہے۔ ہر جلد بڑے سائز کے تقریباً ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

تفسیر ہدایت القرآن: مولانا محمد عثمان کاشف ہاشمیؒ ۳۰ویں پارہ اور ایک تا ۹ پارے کی تفسیر لکھنے کے بعد بعض اعذار کی وجہ سے قرآن کریم کی تفسیر مکمل نہ کرسکے۔ قاضی انوار الٰہی صاحب کی درخواست پر مفتی صاحب نے اس تفسیر کو نہ صرف مکمل کیا بلکہ اپنی گرانقدر خدمات سے شائع بھی فرمایا۔ اب یہ تفسیر مقبول تفاسیر میں شمار کی جاتی ہے۔ ۸ جلدوں پر مشتمل قرآن کی یہ تفسیر مکتب حجاز دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ ہر جلد بڑے سائز کے تقریباً ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

آسان بیان القرآن: حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳ء۔ ۱۹۴۳ء) نے ۳ جلدوں پر مشتمل اردو زبان میں قرآن کریم کی تفسیر ''بیان القرآن'' تحریر فرمائی ہے۔ دار العلوم دیوبند کے فاضل مولانا عقیدت اللہ قاسمی نے اس کی تسہیل کی، یعنی آسان زبان میں ترتیب دی۔ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے مکمل تفسیر پر نظر ثانی

فرما کر اپنے تجارتی مرکز ''مکتبہ حجاز دیوبند'' سے ''آسان بیان القرآن'' کے نام سے شائع فرمائی، جس کی ۵ جلدیں ہیں اور ہر جلد بڑے سائز کے تقریباً ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

فیض المنعم: حدیث کی دوسری اہم کتاب ''صحیح مسلم'' ہے، جس کا مقدمہ حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مقدمہ فن اصول حدیث کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی مستقل شروح بھی تحریر کی گئی ہیں۔ مفتی صاحب کی فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم طلبہ واساتذہ میں کافی مقبول ہے۔ اردو زبان میں تحریر کردہ یہ شرح ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ایضاح المسلم: صحیح مسلم کی مکمل شرح بھی موصوف نے تحریر کرنا شروع کردی تھی، جس کی پہلی جلد شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے تقریباً ۶۰۰ صفحات پر مشتمل پہلی جلد کتاب الایمان سے متعلق ہے۔

زبدہ شرح معانی الآثار: مشہور مصری حنفی عالم ابوجعفر امام طحاویؒ (۲۳۸ھ۔۳۲۱ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب ''شرح معانی الآثار'' ہے، جس کو مدارس میں طحاوی شریف کہتے ہیں۔ اس کا کتاب الطہارۃ جو تقریباً ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے کتاب الطہارۃ کی عربی شرح ''زبدہ شرح معانی الآثار'' تحریر فرمائی ہے جو ۱۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: اصول تفسیر سے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی فارسی زبان میں تحریر شدہ کتاب کا چند حضرات نے عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا مگر ہر ترجمہ میں کچھ خامیاں موجود تھیں۔ مفتی صاحب نے تہذیب وتصحیح فرما کر حاشیہ کے ساتھ یہ کتاب دوبارہ شائع کی۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ (سابقہ تعریب کی تہذیب) دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

العون الکبیر شرح الفوز الکبیر: یہ ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' کی ۳۱۲ صفحات پر مشتمل عربی شرح ہے۔

اس شرح کے ذریعہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مشہور کتاب ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

مفتاح التھذیب: یہ علامہ سعد الدین تفتازانیؒ کی منطق کی مشہور کتاب ''تہذیب المنطق'' کی اردو شرح ہے جو مذکورہ کتاب کے دروس کو ان کے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد پالن پوریؒ نے قلمبند کیا تھا اور دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا خورشید احمد گیاوی نے مرتب کیا ہے۔ صرف ۱۵۲ صفحات پر مشتمل یہ ایسی عمدہ شرح ہے کہ مدارس کے نصاب میں شامل دوسری مشکل کتاب ''شرح تہذیب'' بھی اسی سے حل ہو جاتی ہے۔

الوافیہ بمقاصد الکافیہ: مصر کے علامہ ابن الحاجبؒ (۵۷۰ھ۔۶۴۶ھ) نے نحو (Arabic Grammer) میں معرکۃ الآراء کتاب ''الکافیہ'' تحریر کی ہے جو آج بھی مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ کتاب کے مشکل ہونے کی وجہ سے طلبہ کو سمجھنے میں دشواری آتی ہے۔ مفتی صاحب نے عربی زبان ہی میں حواشی اور تعلیقات تحریر کر کے نحو کی اس اہم کتاب کو طلبہ و اساتذہ کے لئے سمجھنے اور سمجھانے میں کسی حد تک آسانی پیدا کر دی ہے۔ یہ کتاب ۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

ہادیہ شرح کافیہ: نحو کی اہم کتاب ''الکافیہ'' کی یہ اردو شرح ہے۔ ۳۵۸ صفحات پر مشتمل اس شرح کے ذریعہ اساتذہ و طلبہ کے لئے اب کافیہ جیسی مشکل کتاب کا سمجھنا اور سمجھانا کافی حد تک آسان ہو گیا ہے۔ مفتی صاحب نے نہ صرف کافیہ کو مفصل و مرقم کیا، بلکہ اس کے ہر قاعدہ کو علاحدہ کیا اور اس کی آسان شرح لکھی۔ ابتدا میں کافیہ پڑھانے کا طریقہ بھی بیان کیا اور قدیم طرز سے ہٹ کر طلبہ کو ذہن نشین کرنے کے لئے مشق میں سوالات بھی لکھے۔

مبادئ الفلسفہ: برصغیر کے مدارس اسلامیہ میں قرآن وحدیث اور قرآن وحدیث سے ماٴخوذ علوم کے

علاوہ منطق وفلسفہ بھی پڑھایا جاتا ہے۔فلسفہ کی عربی زبان میں تحریر کردہ کتابیں طلبہ کو سمجھنے میں کافی دقت پیش آتی ہے۔دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی طلب پر مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔اس کتاب میں فلسفہ کی تمام اصطلاحات کو عربی زبان میں مختصر اور عمدہ طریقہ سے تحریر کیا گیا ہے۔فلسفہ کی بڑی، دقیق اور مشکل کتابوں سے پہلے یہ کتاب طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے تاکہ طلبہ فلسفہ کے اصول ومبادی سے واقف ہوسکیں جس کے بعد پھر وہ فلسفہ کی بڑی کتابوں کو سمجھ سکیں۔ ۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

معین الفلسفہ: یہ مبادئ الفلسفہ کی بہترین اردو شرح ہے جس میں حکمت وفلسفہ کے پیچیدہ مسائل کی عمدہ وضاحت کی گئی ہے۔اس کے ذریعہ ''میبذی'' جیسی مشکل کتاب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔یہ کتاب ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔غرضیکہ عربی کی اصل کتاب ''مبادئ الفلسفہ'' اور اس کی اردو شرح ''معین الفلسفہ'' دونوں مفتی صاحب کی تحریر کردہ ہیں۔

مبادئ الاصول: عربی زبان میں تحریر کردہ اصول فقہ کی کتابوں (اصول الشاشی ونورالانوار وغیرہ) کو سمجھنے میں طلبہ کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔مفتی صاحب نے اصول فقہ کی بنیادی اصطلاحات پر مشتمل عربی زبان میں یہ کتاب تحریر فرمائی ہے تاکہ اس کو پڑھنے کے بعد اصول فقہ کی مشہور ومعروف کتابوں کا سمجھنا آسان ہوجائے۔ ۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

معین الاصول: یہ مبادئ الاصول کی آسان اردو شرح ہے جس میں اصول فقہ کی اصطلاحات کو اچھے طریقہ سے سمجھایا گیا ہے۔اس اردو شرح سے اصل کتاب ''مبادئ الاصول'' اور اصول فقہ کی دیگر کتابوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔یہ کتاب ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

آپ فتوی کیسے دیں؟: مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نہ صرف ایک محدث تھے بلکہ آپ فقیہ بھی تھے۔ آپ کا تفقہ فی الدین قابل تعریف تھا۔ حنفی مکتب فکر کے مشہور عالم دین ''علامہ شامیؒ'' کی عربی کتاب ''شرح عقود رسم المفتی'' کا استاذ محترم نے سلیس اردو ترجمہ کرکے ''آپ فتوی کیسے دیں؟'' نام سے شائع کیا۔ یہ شرح ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ حضرت نے مباحث کی ضروری وضاحت اور مفید عنوانات کے اضافہ کے ساتھ فقہاء اور فقہ کی مشہور کتابوں کا مختصر تعارف بھی کتاب میں شامل کردیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں چار چاند لگ گئے۔

آسان صرف: تین حصوں پر مشتمل یہ کتاب متعدد مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ ان تینوں کتابوں کو ابتدائی طلبہ کے لئے مفتی صاحب نے آسان زبان میں اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ان کے پڑھنے کے بعد عربی زبان میں علم الصرف کی کتابیں بآسانی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ پہلا حصہ ۴۰ صفحات، دوسرا حصہ ۶۴ صفحات اور تیسرا حصہ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

آسان نحو: دو حصوں پر مشتمل یہ کتاب متعدد مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ ان دونوں کتابوں کو ابتدائی طلبہ کے لئے آسان زبان میں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ان دو حصوں کے پڑھنے کے بعد عربی زبان میں علم النحو کی کتابیں بآسانی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ پہلا حصہ ۴۰ صفحات اور دوسرا حصہ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

آسان فارسی قواعد: مدارس کے ابتدائی درجوں میں فارسی پڑھانے کے لئے دو حصوں پر مشتمل یہ نہایت مفید اور آسان کتاب ہے۔ پہلے حصہ میں ۳۲ صفحات جبکہ دوسرے حصہ میں ۶۴ صفحات ہیں۔ بہت سے مدارس میں تیسیر المبتدی کی جگہ یہ کتاب نصاب میں داخل ہے۔

آسان منطق: یہ کتاب اصل میں مولانا حافظ عبداللہ گنگوہیؒ کی کتاب ''تیسیر المنطق'' کی ترتیب وتسہیل ہے جو استاذ محترم نے کی ہے۔ ۷۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دارالعلوم دیوبند اور بہت سے مدارس اسلامیہ میں

''تیسیر المنطق'' کی جگہ نصاب میں داخل ہے۔

تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر: مشہور محدث علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کی اصول حدیث کی مشہور ومعروف کتاب ''نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر'' کی یہ اردو شرح ہے۔ کتب حدیث خصوصاً مشکوٰۃ شریف پڑھنے والوں کے لئے نہایت قیمتی سوغات ہے۔ مفتی صاحب کی یہ کتاب ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

مفتاح العوامل شرح مئۃ عامل: امام عبدالقاہر جرجانیؒ کی کتاب ''شرح مئۃ عامل'' فنِ نحو کی مشہور ومعروف کتاب ہے۔ حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادیؒ نے اس کتاب کی گرانقدر شرح تحریر فرمائی تھی، مگر شائع نہیں ہوسکی تھی۔ اس کا مسودہ حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ کے پاس محفوظ تھا۔ مفتی صاحب نے قابل قدر خدمات پیش فرما کر اس کتاب کو شائع فرمایا۔ یہ کتاب ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو منظر عام پر لانے کے لئے مولانا خورشید انور گیاوی کی بھی خدمات ہیں۔

گنجینۂ صرف: یہ صرف کی فارسی زبان میں مشہور کتاب ''پنج گنج'' کی اردو شرح ہے، جو حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادیؒ نے لکھی تھی، مگر شائع نہیں ہوسکی تھی۔ اس کا مسودہ حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ کے پاس محفوظ تھا۔ مفتی صاحب نے اس کی نظر ثانی کی اور اس کو مرتب ومکمل کر کے مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع فرمایا۔ یہ کتاب ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

علمی خطبات: یہ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی اُن تقاریر کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بیرون ملک میں کیں۔ آپ کے صاحبزادوں نے ان کو قلمبند کیا اور مفتی صاحب نے لفظ بلفظ ان کو پڑھا۔ دو حصوں میں یہ تقریریں شائع کی گئیں۔ پہلا حصہ ۳۰۴ اور دوسرا حصہ ۲۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

تذکرۂ مشاہیر محدثین وفقہاء کرام اور تذکرۂ راویان کتب حدیث: ۸۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب

میں خلفاء راشدین، عشرۂ مبشرہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں اور بیٹیوں، مدینہ منورہ کے سات بڑے فقہاء، حدیث کے راویوں، کتب حدیث کی شرح لکھنے والوں، مشہور مفسرین ومحدثین ومجتہدین وفقہاء اور متکلمین کا مختصر جامع ذکر ہے۔

دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت: تقلید ائمہ کے موضوع پر چند تقاریر کا مجموعہ ہے جو مفتی صاحب کی نظر ثانی اور ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' سے دین کی بنیادی باتوں کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا۔ ۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں تقلید کی ضرورت کو عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

داڑھی اور انبیاء کی سنتیں: ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں داڑھی پر اعتراضات کے مدلل جوابات کے علاوہ انبیاء کرام کی اہم سنتوں (ناخن تراشنا، بغل کے بال صاف کرنا، مسواک کرنا، کلی اور ناک صاف کرنا، حجامت بنوانا، ختنہ کرانا، مونچھے تراشنا اور استنجا کرنا وغیرہ) کے احکام ومسائل بیان کئے گئے ہیں۔

اسلام تغیّر پذیر دنیا میں: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے سمیناروں میں پیش کئے گئے چار قیمتی مقالوں (اسلام تغیر پذیر دنیا میں، فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ، فقہ حنفی میں فہمِ معانی کے اصول اور نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟) کا یہ مجموعہ ہے جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

حرمت مُصاہرت: ۸۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سسرالی اور دامادی رشتوں کے احکام ومسائل اور ناجائز انتفاع کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

حیاتِ امام طحاوی: ۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مشہور مصری حنفی عالم ابو جعفر امام طحاویؒ کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کے ساتھ ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''شرح معانی الآثار'' کا تعارف اور اس کی شروح پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

حیاتِ امام ابوداود: ۸۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں حدیث کی مشہور کتاب ''سنن ابی داود'' کے مصنف امام ابوداود سجستانیؒ کی سوانح حیات، سنن ابی داود کا تفصیلی تعارف اور اس کی تمام شروح کا مفصل جائزہ عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم: ۸۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں تعزیتی جلسوں کے انعقاد کا شرعی حکم بیان کیا گیا ہے۔ مفتی صاحب کا موقف کسی شخص کے انتقال پر تعزیتی جلسوں کے انعقاد کے حق میں نہیں تھا، اگرچہ دیگر علماء کرام نے حضرت کے اس موقف سے اختلاف کیا ہے۔

تسہیل ادلہ کاملہ: شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے غیر مقلدین کے ۱۰ سوالات کے تحقیقی جوابات پیش کئے تھے۔ مفتی صاحب نے اس کی تسہیل فرمائی ہے جس کو شیخ الہند اکیڈمی (دارالعلوم دیوبند) نے شائع کیا ہے جس میں ۲۳۲ صفحات ہیں۔

تحقیق وتحشیہ ایضاح الادلہ: غیر مقلدین کے ۱۰ سوالات کے تحقیقی جوابات کی شرح خود شیخ الہند نے تحریر فرمائی تھی۔ مفتی صاحب نے اس پر حواشی تحریر کئے ہیں، نیز کچھ ذیلی عناوین کا اضافہ کیا ہے۔ ۶۷۱ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بھی شیخ الہند اکیڈمی (دارالعلوم دیوبند) سے شائع ہوئی ہے۔

کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟: مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتاب ''توثیق الکلام والدلیل المحکم'' کی یہ آسان فہم شرح ہے۔ ۱۵۹ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے کے متعلق قرآن وحدیث کے دلائل کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم: ہندوستان (بہار) کے قاضی محب اللہؒ نے فن منطق کی عربی زبان میں تقریباً ۳۰۰ سال قبل ایسی دقیق کتاب تحریر فرمائی کہ طلبہ اس کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ مفتی صاحب

نے اس کتاب کی ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ایک ایسی شرح تحریر فرمائی ہے کہ کتاب کے مشکل مقامات بھی سہل انداز میں حل ہو جاتے ہیں۔

کامل برہان الٰہی: ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے ہر باب کے شروع میں اس کے مشمولات کو سمجھانے کے لئے مفتی صاحب نے کچھ مفید باتیں تحریر فرمائی ہیں۔ ان مفید مضامین کو اس کتاب میں ذکر کر کے شائع کیا ہے تا کہ جو لوگ شاہ ولی اللہؒ کی عربی عبارت کے بغیر اُن کی مراد کو سمجھنا چاہیں تو وہ اس کتاب کو پڑھ لیں۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد میں تقریباً ۶۰۰ صفحات ہیں۔

محفوظات: یہ تین کتابچے ہیں جن میں مفتی صاحب نے آیاتِ قرآنیہ واحادیث نبویہ اردو آسان ترجمہ کے ساتھ تحریر فرمائی ہیں تا کہ چھوٹے بچے انہیں سمجھ کر یاد کر لیں۔ بعض مدارس و مکاتب میں داخل نصاب ہیں۔ تینوں حصوں کے مجموعی صفحات کی تعداد ۱۱۲ ہے۔

مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے: دار العلوم دیوبند کے شعبہ ''کل ہند تحفظ ختم نبوت'' سے شائع شدہ ۶۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ردِّ قادیانیت اور مسئلہ ختم نبوت پر قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

تعدد ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراضات کا علمی جائزہ: حدیث کے درس کے دوران مذکورہ موضوع پر مفتی صاحب کی یہ تقریر ہے جو بنگلادیش کے مولانا کمال الدین شہاب قاسمی نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ یہ کتاب ۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

تہذیب المغنی: ہندوستان کے علامہ محمد طاہرؒ نے اسماء الرجال پر ''المغنی'' نامی ایک اہم کتاب عربی زبان میں تصنیف کی تھی۔ مفتی صاحب نے اس کتاب کی عربی زبان میں شرح لکھنا شروع کی تھی، صرف باب الراء تک لکھ

سکے تھے۔اس وجہ سے شائع نہ ہوسکی۔

زبدۃ الطحاوی: یہ امام طحاویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''شرح معانی الآثار'' کی عربی تلخیص ہے۔ مدارس میں یہ کتاب ''کتاب الطہارۃ'' تک پڑھائی جاتی ہے، مفتی صاحب ابھی وہیں تک کام کر سکے تھے۔اس لئے یہ کتاب شائع نہیں فرمائی۔

مفتی صاحب کے بہت سے فتاوی اُن کے ذاتی رجسٹروں اور دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔ دیگر علمی کاموں سے فرصت نہ ملنے کی وجہ سے مفتی صاحب انہیں مدوَّن شائع نہ کر سکے۔

آخر میں حضرت مفتی صاحب سے متعلق چند اہم باتیں تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل کر کامیابی کے منازل طے کرسکیں۔ پہلی بات حضرت کے والد صاحب نے کبھی انہیں حرام لقمہ نہیں کھلایا، دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے پوری زندگی یعنی ۵۷ سال بغیر تنخواہ کے تدریسی خدمات انجام دیں حتی کہ جو تنخواہیں پہلے وصول کر چکے تھے وہ سب بھی واپس کیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ کا درس بے حد مقبول تھا، طلبہ کا ازدحام آپ کے درس میں رہتا تھا۔ چوتھی بات عرض ہے کہ آپ کی تحریر کردہ کتابوں کے صفحات کی تعداد تقریباً ۳۵۰۰۰ ہے جو موصوف کی زندگی میں برکت اور اللہ کی طرف سے قبولیت کی واضح علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔آمین۔

❁...❁...❁

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ
کی تدریسی خدمات

مولانا خورشید عالم داؤد قاسمی
زامبیا، ساؤتھ افریقہ

ماہ رمضان کی مبارک ساعت میں حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (رحمہ اللہ) اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ حضرت الاستاذؒ کی قدر و قیمت ہمارے اور ہم جیسے حضرت کے ہزاروں شاگردوں کے دلوں میں اسی وقت سے تھی، جب ہم نے ان کے سامنے زانوے تلمذ طے کیا۔

اب ان کی وفات کے بعد، عالم عرب وعجم سے جس طرح اہل علم حضرات نے آپ کی وفات پر رنج وغم کا اظہار کیا اور اپنے تعزیتی مکتوبات و بیانات میں، آپ کی علمی خدمات کو سراہا کہ آپ کی قدر و قیمت ہمارے دلوں میں مزید بیٹھ گئی۔ آپ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ کتب بینی ومطالعہ، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، وعظ ونصیحت اور ردّ بدعات میں صرف میں کیا۔

آپ نے ایشیائی ممالک سے لے کر یورپی وافریقی ممالک تک بغیر لومۃ لائم کی پروا کیے ہوئے، قرآن و سنت کی تشریح وتوضیح، نشر واشاعت اور بدعات وخرافات کے رد کے حوالے وہ خدمات انجام دی کہ بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ جیسی شخصیت برسوں میں پیدا ہوتی ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ☆ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حضرت الاستاذؒ کی تدریسی خدمات کا سلسلہ:

حضرت الاستاذؒ کی خدمات کے متعدد نمایاں پہلو ہیں۔ آپ مدرس و معلم، مصنف و مولف، خطیب وواعظ، داعی ومبلغ اور تاجر و بزنس مین سب کچھ تھے۔ آپ ہمارے لیے ایک قابل تقلید، محترم و معظم اور شفیق وکریم استاذ تھے۔ اس راقم کو اللہ تعالی نے حضرت سے سنن ترمذی (جلد اول) اور شرح معانی الآثار پڑھنے کا موقع عطا فرمایا۔ ہم اس تحریر میں، آپ کی تدریسی خدمات اور درسی خصوصیات کو مختصراً پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

تعلیم وتدریس کے میدان میں آپؒ اپنے منفرد اسلوب اور نادر انداز کی بنا پر اپنی مثال آپ تھے۔ آپ اس حوالے سے کسی کے مقلد نہیں؛ بلکہ مجتہد تھے۔ آپ کی اس خوبی کا اعتراف ہر کسی کو تھا۔ آپ کے جن تلامذہ کو بھی تدریسی خدمات کا موقع میسر ہوتا، ان کی یہ پہلی خواہش ہوتی تھی کہ دوران تدریس، آپ کے طرز اور اسلوب کو اپنا کر، تدریسی خدمات انجام دیں؛ تاکہ طلبہ ان کے درس سے مطمئن ہوسکیں۔ حضرت الاستاذؒ نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز، طالب علمی کے دور سے ہی کردیا تھا۔ آپ جب دار العلوم دیوبند سے سن ۱۳۸۲ھ میں فراغت کے بعد، افتا کی تعلیم کے غرض سے دار العلوم میں داخلہ لیا، اسی سال سے آپ نے اپنی تدریس کا آغاز کردیا تھا۔ آپ نے اپنے چھوٹے بھائی، حضرت الاستاذ مفتی امین صاحب پالن پوری -حفظہ اللہ- (استاذ حدیث: دار العلوم دیوبند) کو دار العلوم میں رکھ کر حفظ شروع کرایا۔

حضرت مفتی امین صاحب حفظہ اللہ رقم طراز ہیں: راقم الحروف کو ۱۳۸۲ھ میں اپنے ہمراہ دیوبند لائے اور حضرت قاری کامل صاحب دیوبندی کی درس گاہ میں احقر کو حفظ قرآن کریم کے لیے بٹھایا، مگر میں اپنی نااہلیت کی وجہ سے قاری صاحب مرحوم سے ٹھیک سے استفادہ نہ کرسکا؛ تو میرے حفظ قرآن کریم کی پوری ذمہ داری آپ نے سنبھالی اور ڈیڑھ سال میں مجھے حافظ بنایا۔" (الخیر الکثیر، ص:۴۸)

دار العلوم اشرفیہ، راندیر میں تدریسی خدمات:

تکمیل افتا کے بعد، آپؒ آئندہ سال، دار العلوم، دیوبند میں کچھ مہینے معین المفتی رہے۔ اس کے بعد حضرت

علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کے توسط سے، سن ۱۳۸۴ھ میں، آپ کی تقرری دارالعلوم اشرفیہ، راندیر، سورت، گجرات میں ہوئی۔

ذوالقعدہ ۱۳۸۴ھ سے شعبان ۱۳۹۳ھ تک، یعنی مستقل نو سال حضرتؒ نے اشرفیہ، میں تدریسی خدمات انجام دی۔ اس تدریسی دورانیہ میں، بہت سی اہم کتابیں آپ سے متعلق رہیں، مثلا: سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، طحاوی، موطین، نسائی، ابن ماجہ، مشکاۃ، جلالین، الفوز الکبیر، ترجمہ قرآن کریم، ہدایہ آخرین، شرح عقائد، حسامی وغیرہ۔ (الخیر الکثیر، ص: ۵۰) دارالعلوم، دیوبند میں تقرری: اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحبؒ کے دل و دماغ میں تفہیم وتدریس کا وہ ملکہ ودیعت کر رکھا تھا، جو بہت سے کم لوگوں کے حصے میں آیا ہوگا۔ آپ کی اس صلاحیت سے آپ کے اساتذہ وطلبہ سب بخوبی واقف تھے۔ چناں چہ جب ۱۳۹۳ھ میں دارالعلوم، دیوبند میں، عربی درجات کے لیے ایک مدرس کی ضرورت محسوس کی گئی؛ تو آپ کے استاذ، حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاریؒ نے، جو اس وقت دارالعلوم، دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، آپ کو اطلاع دی کہ دارالعلوم میں، ایک مدرس کی ضرورت ہے۔ آپ اپنی درخواست برائے تدریس ارسال کریں۔ آپؒ نے درخواست بھیج دی۔ اسی سال شعبان میں مجلس شوری کا اجلاس منعقد ہوا؛ تو اسی مجلس میں، آپ کی تقرری ہوگئی اور آپ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ پھر آپ نے شوال ۱۳۹۳ھ سے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات شروع کی اور یہ سلسلہ تا دم واپسیں (سن ۱۴۴۱ھ تک) جاری رہا۔ (ملخصا از: الخیر الکثیر، ص: ۵۰-۵۱) دارالعلوم، دیوبند میں آپ کی تدریسی خدمات کا دورانیہ تقریبا ۴۸ر سالوں پر محیط ہے۔ اس دوران جن کتابوں کی تدریسی ذمہ داری آپ نے انجام دیں، وہ خود اس بات کی شہادت ہے کہ آپ ایک باصلاحیت اور قابل مدرس و معلم تھے۔ ادارہ کی انتظامیہ نے بھی آپ کی صلاحیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اہم کتابوں کی تدریس کی ذمے داری آپ کو سپرد کرتی رہی۔ دارالعلوم میں جو کتب آپ کے زیر تدریس رہیں وہ یہ ہیں: سلم العلوم، ملاحسن، ہدیہ سعیدیہ، میبزی، ہدایہ اول، ثالث، رابع، حسامی، مسلم

الثبوت، الفوز الکبیر، تلخیص الاتقان، شرح عقائد جلالی، سراجی، رشیدیہ، مسامرہ، حجۃ اللہ البالغۃ، دیوان متنبی، دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، جلالین، تفسیر بیضاوی، تفسیر مظہری، تفسیر مدارک، نخبۃ الفکر، مقدمہ ابن صلاح، مشکاۃ، طحاوی شریف، موطا امام مالک، موطا امام محمد، سنن ابن ماجہ، سنن نسائی، سنن ترمذی، سنن ابی داؤد، مسلم، جلد اول، بخاری۔ ابھی تقریباً بارہ سالوں سے آپ دار العلوم، دیوبند میں شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے اہم عہدے پر فائز تھے۔

حضرت مفتی صاحب کی درسی خصوصیات:

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے نادر اسلوب، اچھوتے طرز اور مجتہدانہ تدریسی انداز کے لیے جانے جاتے تھے۔ آپ کے درس میں بہت سی ایسی خصوصیات تھیں، جو عام طور پر یکجا کسی ایک مدرس میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ آپ کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں: آپؒ سبق کے بڑے پابند تھے۔ آپ وقت پر درس گاہ میں تشریف لاتے اور اس طرح سبق کی پلاننگ کرتے تھے کہ جو مقدار آپ کو پڑھانا ہوتا، آپ گھنٹہ کے دوران پڑھا لیتے اور گھنٹہ بجتے ہی درس گاہ سے نکل جاتے۔ سال کے درمیان میں، جب سبق جاری رہتا، ان دنوں آپ بہت حد تک کسی لمبے سفر سے گریز کرتے؛ تا کہ سبق کا ناغہ نہ ہو اور طلبہ کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ آپ کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ دوران درس آپ جس انداز سے سال کے شروع میں کلام فرماتے تھے، اسی رفتار اور انداز سے سال کے اخیر تک کلام کرتے، تا آں کہ کتاب مکمل کرا دیتے۔

آپؒ سال کے شروع میں ہی طلبہ کو کچھ رہنما ہدایات دے دیتے۔ پھر طلبہ پورے سال آپ کے بتائے ہوئے ہدایات پر پابندی سے عمل کرتے۔ آپ کے دار الحدیث میں قدم رکھنے سے پہلے ہی، طلبہ حاضر ہو جاتے اور وہ خوب صورت سی وسیع وعریض دار الحدیث بھر جاتی۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ سال کے شروع میں طلبہ کو اسمائے حسنی اور کچھ احادیث شریفہ یاد کراتے۔ مزید طلبہ سے یہ بھی نصیحت کرتے کہ تم بھی اپنے شاگردوں کو یاد کرانا؛

تا کہ یہ صدقہ جاریہ رہے۔آپ کا یہ بھی معمول تھا کہ سال کے شروع میں مبادیات حدیث بیان کرتے تھے۔اس ضمن میں آپ بہت سی علمی بحثیں، مثلا: حدیث، تدوین حدیث، وحی اور وحی کی قسمیں، حجیت حدیث، اجماع، قیاس، تقلید وعدم تقلید، اہل سنت والجماعت وغیرہ وغیرہ کو بخوبی بیان کرتے۔ الحمدللہ، آپ کی یہ قیمتی باتیں ''تحفۃ الالمعی''، جلد اول کے شروع میں محفوظ ہوگئیں ہیں۔آپ نے اپنے قیمتی اوقات کی قدر کی اور ایک ایک منٹ کتب بینی ومطالعہ، تصنیف وتالیف وغیرہ میں صرف کیا۔آپ ایک کہنہ مشق، منفرد لب ولہجہ اور اسلوب کے ایک کامل ومکمل معلم ومدرس تھے۔آپ طلبہ کی نفسیات کو بخوبی سمجھتے تھے؛ لہذا آپ اس طرح کلام کرتے کہ طلبہ آسانی سے آپ کی بات سمجھ جاتے۔اللہ پاک نے آپ کو تفہیم کا وہ ملکہ عطا فرمایا تھا کہ کسی بھی بات کو سمجھانے کے لیے آپ ایک دو مثالیں پیش کرتے اور آسانی سے بڑے سے بڑے پیچیدہ مسائل کو اس طرح پیش کرتے کہ ایک غبی اور کند ذہن طالب علم بھی بسہولت سمجھ لیتا اور مطمئن ہوجاتا۔آپؒ اپنے آسان، مرتب اور قابل فہم اسلوب تدریس کی وجہ سے طلبہ کے درمیان مقبول ترین اساتذہ میں تھے۔ ہر طالب علم آپ سے دل وجان سے محبت کرتا۔ ہر طالب علم آپ کے گھنٹے میں پابندی سے حاضر ہوتا۔ دوران تدریس آپ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کلام کرتے تھے کہ جو طالب علم آپ کی درسی تقریر نوٹ کرنا چاہتا، وہ آسانی سے نوٹ کر لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ترمذی شریف کی تدریس کے دوران، آپ کے ہزاروں شاگردوں نے آپ کی تقریریں قلم بند کی۔ جب کسی مختلف فیہ فقہی مسئلہ پر کلام کرتے، تو آپ تقابل اور ترجیح سے اجتناب کرتے؛ بل کہ آپ کی یہ کوشش ہوتی کہ طلبہ کے سامنے اختلاف کی بنیادیں بیان کی جائیں؛ تا کہ طلبہ سمجھ سکیں کہ ایک امام نے فلاں موقف اور دوسرے امام نے فلاں موقف کیوں اختیار کیا۔ترمذی شریف کے سبق میں ہر کسی کو عبارت پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی؛ بلکہ جو طلبہ عبارت پڑھنا چاہتے تھے، آپ ان کا امتحان لیتے۔ امتحان میں جو طلبہ ٹھہر ٹھہر کر، صاف ستھری، سریلی متوسط آواز میں، بغیر صرفی ونحوی غلطی کے عبارت پڑھنے میں کامیاب ہوجاتا، آپ ان طلبہ کو منتخب کرتے، پھر وہی طلبہ سال کے اخیر تک عبارت

پڑھتے۔

سال کے اخیر میں جب آپ کتاب کی تکمیل کراتے، اس موقع سے آپ طلبہ کو چند دنوں تک جو نصیحتیں کرتے وہ بھی بہت اہم ہوتی تھیں۔ آپ اپنی نصیحت میں فارغ ہونے والے طلبہ کو مختلف کٹیگریوں میں تقسیم کرتے۔ پھر وہ طلبہ جن کو مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ہوتا، ان سے کچھ اور باتیں کہتے، جن طلبہ کو تدریس سے منسلک ہونے کا ارادہ ہوتا، ان کو کچھ اور نصیحتیں کرتے، جن طلبہ کو تجارت کرنے کا ارادہ ہوتا، ان کو اس حساب سے مخاطب کرتے، جن طلبہ کا تبلیغی جماعت میں جانے کا ارادہ ہوتا، ان کو اس کے اعتبار سے ایڈریس کرتے۔

حضرت الاستاذؒ مختلف علوم وفنون میں ید طولی رکھتے تھے۔ آپ ایک کہنہ مشق مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ، آپ ایک مایہ ناز فقیہ اور مفتی بھی تھے۔ آپ نے سیکڑوں فتاوے کے جوابات اپنے قلم سے تحریر کیے جو رجسٹر میں محفوظ ہیں۔ آپ ایک بہترین منتظم بھی تھے؛ چناں چہ آپ دار العلوم کی ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کے ناظم اعلی بھی رہے۔ الحمدللہ، اس ادارہ نے ردقادیانیت کے حوالے حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا۔

آپ ایک بہترین داعی وخطیب بھی تھے؛ چناں چہ آپ نے ملک وبیرون ممالک کے بہت سے اسفار کیے۔ خاص طور آپ رمضان کی طویل تعطیل میں کبھی برطانیہ، کبھی امریکہ، کبھی کنیڈا اور کبھی افریقی ممالک کا دورہ کرتے اور اپنے وعظ ونصیحت سے ہزاروں لوگوں کو سیراب کرتے۔ اللہ پاک آپ کی ان خدمات کو قبول فرمائے! حضرت مفتی صاحب (رحمہ اللہ) کی عمر تقریبا اسی سال تھی۔ آپ کئی سالوں سے ایک نہ ایک بیماری سے دوچار رہتے تھے۔ مگر اللہ تعالی نے ہر بار آپ کو شفا عطا فرمایا۔ عام طور پر آپ علاج کے لیے اپنے محبین ومخلصین کے مشورے سے ممبئی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بار بھی آپ کی طبیعت رجب کے مہینے میں خراب ہوئی۔ صحیح بخاری کے آخری سبق کے وقت طبیعت کچھ زیادہ ہی ناساز ہوگئی تھی۔ آپ ممبئی پہنچے اور علاج شروع ہوا۔

آپ رمضان المبارک کے پہلے دو عشرے میں، اس پوزیشن میں تھے کہ تراویح کے بعد بیان بھی کرتے

تھے۔ مگر پھر طبیعت ناساز ہوئی اور وہی ہوا جو اللہ پاک کو منظور تھا اور یہ علوم وفنون کا انسائیکلو پیڈیا ہمیشہ ہمیش کے لیے بہ روز: پیر، ۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ = ۱۹/مئی ۲۰۲۰ء کو، صبح کے وقت، عروس البلاد ممبئی کے سنجیونی ہوسپیٹل، ملاڈ (ایسٹ) میں، ہم سب سے جدا ہو گیا۔

آپ کی وفات کی خبر سنتے ہی آپ کے محبین و متعلقین اور تلامذہ میں مایوسی چھا گئی، سوشل میڈیا پر دعا وایصال ثواب کی خبریں اور تعزیتی مکاتیب کا تانتا بندھ گیا۔ گویا سب یہی کہہ رہے تھے کہ عآنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا! وفات ہی کے دن، وطن سے سیکڑوں میل دور، اوشیوارہ مسلم قبرستان، جوکیشوری (ویسٹ)، ممبئی میں، آپ سپرد خاک کر دیے گئے۔

آپ کی نماز جنازہ، آپ صاحب زادے مولانا احمد سعید صاحب (حفظہ اللہ) نے پڑھائی۔ اللہ تعالی حضرت الاستاذ کی خدمات کو قبول فرمائے! رب ذوالجلال آپ کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے! آمین!

❀...❀...❀

باب پنجم:

نقوش و تأثرات

شیخ الحدیث وصدر مدرس دارالعلوم دیوبند

عالمِ یگانہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

کچھ تأثرات، کچھ حالات

۱۳۶۰ھ/۱۹۴۰ء - ۱۴۴۱ھ/۲۰۲۰ء

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں "کم یاب" ہیں ہم
جو یاد نہ آئے بھول کے پھر، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

(علی محمد شاد عظیم آبادی: ۱۸۴۷-۱۹۲۷ء)

بہ قلم: حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب
چیف ایڈیٹر "الداعی" عربی واستاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

چہارشنبہ وپنج شنبہ (بدھ-جمعرات): ۲۲-۲۳/رجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۸-۱۹/ مارچ ۲۰۲۰ء کی شب میں عشا کی نماز کے بعد مفتی صاحب نے بخاری شریف کا آخری درس دیا۔ جب درس گاہ یعنی دارالحدیث: دار العلوم کے کتب خانے کی نئی عمارت کے زیریں ہال میں حاضری ہوئی، تو حسبِ معمول انھوں نے حمد وصلاۃ کے بعد سبق کا خلاصہ ذکر کیا، اس کے بعد متعینہ طالب علم نے بخاری شریف کی متعلقہ حدیثیں پڑھیں۔ آپ نے حدیثوں کے مطلوب ومفہوم پر حسبِ توفیق گفتگو کی۔ پھر طالب علم نے آگے کی عبارت پڑھی اور آپ نے حسب منشا گفتگو کی ۔اس کے بعد پھر طالب علم نے آگے کی حدیثوں کی خواندگی کی؛ لیکن اس کے بعد آپ نے جو کچھ کہنا چاہا، اس پر

قادر نہ ہوسکے، زبان ودماغ نے ساتھ نہیں دیا۔

خاصی دیر تک یہ ہوا کہ بخاری شریف کے صفحات آپ کے سامنے کھلے رہے لیکن ان کے اپنے ارادے اور کوشش کے باوجود ان کی زبان بندی ختم نہ ہوسکی، دیر تک خاموش نشستگی کی حالت میں جب ان کا دل بہت متاثر اور پرغم ہوگیا تو یہ کیفیت چشم تر سے چہرے پر ٹپکتے ہوئے آنسوؤں سے عیاں ہونے پر ۱۵۰ طلبۂ دورۂ حدیث کی جماعت، جو شریک درس تھی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد قاسمی دربھنگوی نے (جو مفتی صاحب کے محبوب اور ہمہ وقت حاضر باش، دکھ درد میں شریک رہنے والے شاگرد رشید ہیں) جو مفتی صاحب کی زندگی کے اس آخری درس میں موجود تھے۔ مفتی صاحب سے گزارش کی کہ آپ دعا کے لیے ہاتھ اٹھالیں، تاکہ طلبہ خاموش طور پر آپ کے ساتھ دعا کرلیں لیکن مفتی صاحب نے دھیمی آواز میں ہی آخری جملہ ارشاد فرمایا "اب جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا"۔

گویا درس گاہ میں ان کے آخری درس کا یہ آخری جملہ تھا، جو اَب طلبہ کی زبان پر عرصۂ دراز تک جاری رہے گا اور وہ بطور ہدیۂ ثمینہ ایک دوسرے کو پیش کرتے اور غم کُشی کا ذریعہ سمجھتے رہیں گے۔ پھر انتہائی شکستہ دلی کی حالت میں کتاب بند کر کے فوراً کھڑے ہوگئے اور مسند درس سے اتر کر، ہال کے باہر کھڑی کار میں بیٹھ اپنے گھر آگئے۔ مولانا اشتیاق نے کار میں بیٹھتے ہی اُن سے عرض کیا کہ حضرت! ابھی دارالعلوم میں تعلیمی سال کے ختم پر ہونے والی سالانہ تعطیل کلاں نہیں ہوئی ہے، آپ کل ممبئی تشریف لے جارہے ہیں، ان شاء اللہ چند ہی روز میں شفایاب ہوکر جب تشریف لے آئیں گے، تو اس آخری درس کا باقی ماندہ عمل فرمادیں گے اور طلبہ کو جو آخری نصیحت کرنی ہوگی وہ بھی ان شاء اللہ کردیں گے۔ یہ سن کر ان کے چہرے پر اطمینان وانبساط کی لکیریں ابھر آئیں۔

گھر (جو اندرون کوٹلہ میں واقع ہے) پہنچ کر اپنے دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھتے ہی غم زدہ واُداس لہجے میں فرمایا کہ لگتا ہے کہ میں آئندہ سال بخاری شریف کا درس نہیں دے سکوں گا۔ مولانا اشتیاق نے انھیں تسلی دی

اورعرض کیا کہ حضرت! آپ خاطر جمع رکھیں، آپ ان شاء اللہ آئندہ سال بھی اپنی تعلیمی علمی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہیں، گزشتہ سال بھی آپ کو زبان بندی کا عارضہ لاحق ہوا تھا؛ لیکن دوا وعلاج سے آپ بحمد اللہ بہ عجلت صحت یاب ہوکر اپنے تدریسی وتحریری مشاغل اور دیگر واجباتِ زندگی میں سرگرم عمل ہو گئے تھے، تا آں کہ دوبارہ یہ صورت حال پیش آئی ہے، ان شاء اللہ آپ اس مرتبہ بھی جلد ہی شفایاب ہوں گے۔ مفتی صاحبؒ ہمت وحوصلے کے آدمی تھے، تسلی دہندہ کی ان باتوں کو سن کر بڑی حد تک مطمئن ہو گئے۔

آئندہ کل یعنی جمعرات: ۲۳ رجب ۱۴۴۱ھ = ۱۹ مارچ ۲۰۲۰ء کو علاج کے لیے ممبئی تشریف لے گئے، جہاں ان کی صاحب زادی، داماد، اُن کے اہل خانہ اور دیگر اعزاء واقربا کی بودوباش ہے۔ دوسرے روز یعنی جمعہ: ۲۴ رجب = ۲۰ مارچ کو ان لوگوں کے مشورے سے ممبئی کے ''مومن'' برادری کے ہسپتال ''ملت'' میں علاج کے لیے داخل ہوئے۔ وہاں تشخیص ہوئی کہ کولسٹرول بہت بڑھا ہوا ہے اور موجودہ ساری پریشانیاں اسی کی وجہ سے ہیں۔ وہاں بھرپور توجہ کے ساتھ علاج ہوا اور ۴ روز بعد ہی، یعنی دوشنبہ ۲۷ رجب ۲۳ مارچ کو شفایاب ہوکر بیٹی کی قیام گاہ واپس آ گئے۔

۲۸ رجب = ۲۴/ مارچ کو ہندوستان کے وزیر اعظم نے ''کورونا وائرس'' کے پھیلاؤ پر قابو پانے کے لیے پہلے قدم کے طور پر ''جنتا لاک ڈاؤن'' کا اعلان کیا، چناں چہ اس دن باشندگانِ ملک نے اس فرمان کی مکمل تعمیل کی۔ اُسی روز، یعنی ۲۸-۲۹/ رجب = ۲۴-۲۵ مارچ کی رات میں وزیر اعظم نے ملک گیر مکمل لاک ڈاؤن کا اعلان کر دیا اور ۱، ۲ بجے رات سے اس کا نفاذ عمل میں آ گیا؛ لہذا پورے ملک میں جو جہاں تھا وہیں پھنس گیا؛ کیوں کی آمدورفت کے سارے ذرائع بالکلیہ موقوف کر دیے گئے۔

مفتی صاحبؒ کو مجبوراً ممبئی ہی میں مقیم رہنا پڑا۔ انھوں نے وہاں کے قیام کو طبی ہدایات کے تحت آرام اور محض وقت گزاری کی نذر نہیں ہونے دیا؛ بل کہ پردیس میں میسّر وسائل سے کام لے کر علمی مشاغل کو بھی حتی الامکان

جاری رکھا؛ کیوں کہ یہ ان کی روح کی غذا اور بیماریوں کی دوا تھے۔ نیز رمضان مبارک کے آغاز سے ہی انھوں نے نماز تراویح کے بعد، آن لائن مواعظ کا سلسلہ بھی شروع کیا، جس سے خلق خدا کو بہت فائدہ ہوا۔

دوشنبہ: ۱۳ رمضان = ۱۱ رمئی کو انھیں بخار محسوس ہوا، جس سے خاصی کمزوری پیدا ہوگئی۔ جمعرات: ۱۸ رمضان - ۱۲ رمئی کو انھیں ممبئی کے ''ملاڈ کے'' نیو سنجیونی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا، وہاں تشخیص ہوئی کہ پھیپھڑے میں پانی بھر گیا ہے، جس کی وجہ سے سانس لینے میں پریشانی ہو رہی ہے، چناں چہ سخت نگرانی کے یونٹ ''آئی سی او'' میں انھیں منتقل کر دیا گیا۔ دو تین روز بعد افاقے کی کیفیت محسوس ہوئی لیکن پھر بیہوشی کا عالم طاری ہو گیا اور بالآخر سہ شنبہ: ۲۵ رمضان ۱۹ رمئی کی صبح کو تقریباً ۶:۳۰ ساڑھے چھ بجے آنھوں نے آخری سانس لی اور ربّ کریم کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ انا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

۲۵ ر رمضان ہی کو ان کی پہلی نماز جنازہ مذکور الصدر ہسپتال کے قریب ایک مسجد کے باہر ادا کی گئی جس کی امامت ان کے صاحب زادے مولانا وحید احمد نے کی۔ دوسری نماز، جو تدفین سے قبل قبرستان میں ادا کی گئی، جس کی امامت ان کے ایک دوسرے صاحب زادے حافظ قاری عبداللہ نے کی۔ شام کے سوا چھ بجے اس گنجینۂ علم وفضل کو ممبئی کے ''جوگیشوری'' کے ''اوشیورہ'' قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ لاک ڈاؤن کے باوجود معتد بہ تعداد نے نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور شہدا وصالحین وصدیقین کے ساتھ جنت الفردوس میں اعلی مقام سے نوازے اور تمام پس ماندگان ومحبین وتلامذہ ومتعارفین کو صبر میل واجر جزیل سے بہرہ یاب کرے۔

ذرائع ابلاغ کی برق رفتاری کی وجہ سے مفتی صاحب کی وفات کی خبر نہ صرف ہندوستان و برصغیر میں؛ بل کہ پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دارالعلوم اور قاسمی برادری کے حلقے کو خصوصاً اور دینی علمی حلقے کو عموماً اس حادثۂ جاں گسل سے جو حزن وملال ہوا، اس کو کسی لفظی تعبیر کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دارالعلوم کو ان کی

وفات سے جو خسارہ لاحق ہوا ہے، اس کی تلافی کی بہ ظاہر کوئی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی، البتہ خدائے قادر وہّاب کی رحمت سے ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ دارالعلوم میں شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد نور اللہ مرقدہ (۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء - ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء) کے بعد سے ہی شیخ الحدیث کا منصب اُن جیسے عالی مقام محدث کے لیے ترستا رہا ہے، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مفتی سعید احمد پالن پوری نے اپنے کئی پیش رووں کے بعد اپنے عہد میں اس خلا کو پر کر دیا تھا لیکن یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اُن کی وجہ سے اُن کے فیض یافتگان کو خاصی علمی فکری تسلی محسوس ہوتی تھی، جس کی بنا پر اُن کے ذہنوں میں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد قدس سرّہ العزیز جیسے عظیم الشان مشائخِ حدیث کی دھندلی سی تصویر گردش کرنے لگتی تھی۔

مفتی صاحب کی علمی شخصیت تعمیر ذات وصفات میں جہد مسلسل کے طفیل خاصی بھاری بھرکم اور باوقار وبااعتبار بن گئی تھی۔ وہ دارالعلوم کے موجودہ ماحول میں علم وفضل کی ترازو کا بہترین پاسنگ تھے، جس کی غیر معمولی اہمیت ہوا کرتی ہے، کیوں کہ وہ ترازو کے توازن کا ضامن ہوتا ہے۔

محنت، قدردانی اوقات، انہماک عمل، ذہانت وقوت حافظہ، سرعت فہم، کمال کی استنتاجی صلاحیت، مسائل کی تہوں تک زودرسی اور تقریر وتحریر میں ترتیب وانضباط اور تفصیل وتسہیل کا اہتمام جیسی صفات، ان کو بہت سے معاصر علماء ومدرسین سے ممتاز کرتی تھیں۔ تاثیری انفرادیت، زبردست ترسیلی قوت اور تفہیمی لیاقت ان کی شناخت تھی۔ وسعت مطالعہ (جس کو پیہم وناآشنائے تکان تدریسی وتحریری سرگرمیوں نے پختگی واستحضاری اور مزید وسعت پذیری عطا کی تھی) کی وجہ سے وہ علمی مسائل کے حوالے سے تازہ دم وتازہ کار رہتے تھے۔

خوداعتمادی وخدا اعتمادی، جرأت وبے باکی، صبر واستقامت، بیدار مغزی اور ہمت وحوصلے کی فراوانی؛ معرکۂ حیات میں ان کی شمشیریں تھیں۔ کتاب وسنت کے گہرے مطالعے سے کشید، اپنی علمی ودینی اعتقادی آرا پر ثبات واصرار اور دلائل وبراہین کی روشنی میں اہل علم سے اختلاف کا اظہار اور بہ وقت ضرورت ان کے علمی

استنتاجات کی تردید وتصحیح میں وہ کبھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ دینی واعتقادی مسائل میں شخصی روایات کی تقلید پر کتاب وسنت کی اصلی تصریحات اور واضح ہدایات کی علمی ترجیح وتائید اور عملی توثیق میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔

اپنی علمی بلند قامتی کی وجہ سے نہ صرف دارالعلوم کے ماحول میں؛ بل کہ سارے دیو بندی حلقے اور عام علمی ودینی برادری میں علمی وعملی رویّوں کے حوالے سے، بعض دفعہ رونما ہونے والی ناہمواریوں اور عدم توازن کی کیفیتوں کے بالمقابل؛ وہ توازن کا واضح استعارہ تھے۔

اُن کی قدآور علمی شخصیت کے طفیل، دارالعلوم میں جو علمی ہل چل تھی، تحقیق وجستجو کے باب میں خوب سے خوب تر حد تک پہنچنے کی جو تگ وتاز رہا کرتی تھی، ان کی علمی تحقیق کی چٹان سے بعض دفع نتائج مطالعہ وفکری اکتسابات کی موجیں جس طرح ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہتی تھیں، اب اس منظر کو دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ جانے کب تک ترستی رہیں گی۔

درس گاہوں میں دیے گئے ان کے تدریسی وعلمی محاضرات، فرق باطلہ کی تردید میں کی گئی ان کی علمی تحقیقی تقریریں اور عام مجلسوں میں ان کے واعظانہ ارشادات بھی علمی نکتہ آفرینیوں، عالمانہ ژرف نگاہیوں اور متکلمانہ درازنفسیوں کا نمونہ ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی عوامی تقریر میں بھی خواص ہی کے لیے زیادہ مفید ہوتی تھیں۔ سنجیدگی وبالیدگی اور دانش ورانہ طرز ادا اُن کی ساری لسانی تخلیقات وبخشایشوں کی شناخت ہوتی تھی۔ اس کے باوجود ان کے عوامی خطابات سے عوام کو بہت فائدہ ہوا؛ کیوں کہ انھوں نے ان میں سادہ وعام فہم الفاظ و تعبیرات سے کام لینے کی کوشش کی۔

علمی مسائل کو حل کرنے، یا سائل کو اُن کا جواب دینے میں کبھی عجلت پسندی، تاویلِ ناروا اور کھینچ تان سے کام نہ لیتے۔ اگر کوئی بات واضح طور پر معلوم نہ ہوتی، یا اگر اس کا کوئی گوشہ ان کے ذہن میں واضح نہ ہوتا تو وہ

توقّف کرتے اور سائل سے فرماتے کہ مجھے اس سلسلے میں تامّل ہے یا میں اس سے ناواقف ہوں۔ پھر علمی مراجعے کے بعد ہی وہ تسلّی بخش جواب دیتے؛ اِسی لیے راقم کو اُن کے مطالعاتی اور علمی رویّے پر بڑا اعتماد تھا اور اُس کو اُن کے اِس طرزِ عمل سے بے حد خوشی ہوتی تھی۔

''اہل علم'' کی شناخت یا شہرت کے حامل افراد بالعموم علمی مسائل کا عاجلانہ جواب دینے اور مسائل کے گوشوں کے مُبہم یا نامعلوم ہونے کی صورت میں بھی سائل کو تاویلاتِ بے جا کے ذریعے مطمئن کرنے کی کوشش کے ذریعے اپنی شخصیت کے حوالے سے بھی غیر مطمئن بنا دیتے ہیں۔ عربی کا مقولہ ہے (جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے): ''إِنَّ مِنَ الْعِلْمِ إِذَا سُئِلَ الرَّجُلُ عَمَّا لا يَعْلَمُ أَنْ يَقُوْلَ: ''اَللّٰهُ أَعْلَمُ'' (طبقات الحنابلة، ج ا ص ۱۰)۔ یعنی یہ بھی علم ہے کہ کسی آدمی سے ایسی بات معلوم کی جائے جس سے وہ لاعلم ہے، تو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا زیادہ علم ہے۔

مفتی صاحبؒ سے راقم نے بارہا بہت سی حدیثوں کے متن یا شرح یا کسی خاص لفظ کا مدلول جاننا چاہا، تو متعدد مرتبہ اُنھوں نے فوراً جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے فرمایا: مولانا! میں آپ کو اِس سلسلے میں کل بتا سکوں گا؛ چناں چہ دوسرے دن یا اُس کے بعد وہ بہ ذریعہ فون راقم کو اس سلسلے میں اطمینان بخش جواب دیتے۔

خود راقم کا بھی ان کے ساتھ یہی رویّہ رہا کہ اگر وہ کسی صرفی یا نحوی یا لغوی اِشکال کے متعلق تدقیق چاہتے، تو معلوم ہونے کی صورت میں، راقم اُنھیں اُسی وقت راہِ صواب بتا دیتا؛ ورنہ مطالعے کے بعد، وہ اس حوالے سے گرہ کشائی کی توفیق پاتا، سچ یہ ہے کہ ہم دونوں اِس مشترکہ طرزِ عمل سے ایک دوسرے سے بے انتہا مطمئن تھے۔

دارالعلوم میں الحمدللہ، ذی علم و باکمال واصحاب قال وحال اساتذہ کی کمی نہیں؛ لیکن مفتی صاحب کی ممتاز علمی شخصیت سے طلبہ کو اُن کے طویل تدریسی دورانیے میں جو علمی وفکری فائدہ ہوا، وہ مقدار و معیار کے اعتبار سے مثالی

رہا۔ دارالعلوم کا دارالحدیث، اس کی درس گاہیں؛ بل کہ اس کے در و بام اور وہاں وقتاً فوقتاً سجنے والے بڑے بڑے اجتماعات کے اسٹیج، اُنھیں عرصے تک ڈھونڈتے رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ایسی علمی عظمت کا خمیر، بڑی مشکل سے، لیل ونہار کی درازنفس گردشوں، غیر معمولی پاکیزہ پس منظروں اور والدین سمیت لا تعداد صلحاء واتقیاء کی دعاؤں اور نگاہ ہاے مومنانہ کے ساحرانہ فیضان اور سب سے بڑھ کر خداے کریم کی توفیقِ خاص سے اٹھتا ہے۔

اِس لیے اُن کی رحلت سے جو خلا دارالعلوم میں پیدا ہوا ہے، وہ غیر معمولی ہے اور آسانی سے پر ہونے والا نہیں ہے؛ لیکن چوں کہ یہ درس گاہِ علم و دین خداے عظیم کے خصوصی فضل وکرم کا ثمرہ ہے، جو شب زندہ دار علماے ربّانیین کی آو سحر گاہی اور عرصۂ دراز تک اُن کی گریہ وزاری کی وجہ سے اس خطۂ زمین کی طرف متوجّہ ہو کر مدرسہ اسلامی عربی، دیو بند کی شکل میں مجسّم ہوا؛ اس لیے اللہ تعالی کی رحمتِ واسعہ سے امید ہے کہ ان شاء اللہ، اِس خسارے کی تلافی وہ غیب سے ضرور کرے گا۔ **وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيْز.**

مفتی صاحبؒ میں ایک بہت اچھی بات یہ تھی کہ علمی وقار واعتبار کے باوجود، ان میں اِحساسِ برتری کی برائی نہ تھی، جو اہلِ علم میں عموماً پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ تکلّفانہ رعب داب سے بھی کام نہ لیتے تھے۔ اِسی لیے طلبہ اُن سے خاصے مانوس رہتے تھے اور درس گاہوں کے علاوہ بھی، اُن کے لیے اُن سے استفادہ وفیض یابی آسان ہوا کرتی تھی۔ ہمہ وقتی مشغولیت کے باوجود عصر کے بعد اور دوسرے اوقات میں بھی ملنے جلنے کے لیے آنے والوں کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے جو اُن کی وسعتِ ظرفی وتحمل مزاجی کی بات تھی۔

وہ عام زندگی میں بھی سادہ، بے تکلف اور حلیم الطبع تھے۔ سختی، کرختگی، ترش روئی، سخت گیری اور تلخ گوئی سے ہمیشہ بچتے تھے۔ بعض اہلِ علم بہ ظاہر خوش مزاج وخوش طبع و بذلہ رنج ہوتے ہیں، لیکن وہ نکتہ سنجیوں کے رویّے کی تہ داریوں میں مخاطب کو بعض دفعہ اپنی ناوک افگنیوں سے بُری طرح گھائل کرجاتے ہیں۔ مفتی صاحبؒ کا اندازِ

کلام اور زندگی کا عام طریقۂ کار ایسا رہا کہ کسی کو کبھی بھی ان سے دلی تکلیف نہیں پہنچی۔

اسی کے ساتھ وہ زود درس، زودِ حس، زود نویس اور زود فکر تھے۔ تردّد، اضطراب اور شش و پنج سے اُن کی بیاضِ حیات بالکل خالی تھی، پیش آمدہ کسی بھی مسئلے میں بروقت اور صائب فیصلہ لیتے اور اس کو بروقت برپا کرنے کی کوشش کرتے۔ زود نویسی کا یہ عالم رہا کہ ہمہ گیر مشغولیتوں کے باوجود، انتہائی کارآمد فیض بخش تصنیفات کا ڈھیر لگا گئے۔ راقم بھی چوں کہ قرطاس قلم کی راہ کا ہی ناتواں مسافر رہا ہے؛ اِس لیے وہ بہ خوبی جانتا ہے کہ کام کی چند سطریں بھی تحریر کرنی کتنی مشکل ہوتی ہیں؛ بل کہ بعض دفعہ ایک صفحہ لکھنے کے لیے سیکڑوں صفحات کا مطالعہ بھی ناکافی ہوتا ہے۔ مفتی صاحبؒ پر یہ راقم اس حوالے سے بہ طور خاص رشک کرتا تھا۔ وہ اُن سے ہمیشہ کہتا تھا کہ آپ ''رجل مُوفّق''، یعنی باتوفیق آدمی ہیں، آپ کے وقت اور قلم دونوں میں بے پناہ برکت ہے۔ یہ راقم تمام تر عزلت نشینی؛ بل کہ مردم بے زاری کی حد تک علائق سے بالکلیہ پرہیز کے باوجود، اِس سلسلے میں اُن کی گردِ راہ کو بھی نہ پاسکا؛ کیوں کہ وہ سست نگار اور مطالعہ و نتائجِ مطالعہ سے فائدہ اٹھانے میں سست قدم واقع ہوا ہے۔

اپنے مشہور تدریسی کارناموں کے ساتھ، انھوں نے مفید تر تصنیفات و تحقیقات کا اپنے پیچھے ایک بھرا پُرا اسلامی کتب خانہ چھوڑا ہے، جو اُنھیں حیاتِ دوام دینے کے لیے کافی ہے، اُس کے ذریعے اُن کی یادوں کے چراغ دل و دماغ میں روشن رہیں گے اور استفادہ کرنے والوں کی زبانوں پر اُن کا تذکرۂ جمیل نغمۂ جاوید کی طرح مچلتا رہے گا اور وہ صدقۂ جاریہ بن کر اُن کی میزانِ حسنات کو باوزن بنا تا رہے گا۔

اپنے سارے علمی و تعلیمی مشاغل کے باوجود، بال بچوں کے حقوق کی ادائیگی، ان کی تعلیمی و تربیتی ذمے داریوں کی کما حقہ انجام دہی میں چست رہنا اور خانگی امور سے ماہرانہ طور پر نمٹنا، اُن کا وجہِ امتیاز تھا۔ دسیوں سال پہلے کی بات ہے یہ راقم اُن کی طرف سے طے کردہ وقت کے مطابق، ان کے گھر پہنچا، تو ڈھیر سارے بچے ان کے سامنے ان کی بیٹھک میں اپنے اسباق بلند آواز سے یاد کر رہے تھے، ایسا لگتا تھا کہ بڑا مکتب یا چھوٹا موٹا مدرسہ اُن

کی نگرانی میں اُن کے گھر میں چل رہا ہے۔ راقم کے ساتھ جو صاحب تھے وہ ان کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے، اُنھوں نے راقم کو بتایا کہ یہ سب مفتی صاحب ہی کے بچے ہیں مغرب تا عشاء مفتی صاحب خود ہی سب بچوں کو پڑھاتے ہیں، چوں کہ کثیر الاولاد ہیں؛ اِس لیے آپ کو محسوس ہوا کہ اُن کے یہاں کوئی باقاعدہ مکتب چلتا ہے، جس میں اُن کے اور محلے کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔

یہ راقم، مشاغلِ خیر سے اُن کی بھری پُری زندگی پر، اُن کے حسنِ حیات بھی رشک کرتا تھا کہ توفیق الٰہی کے بغیر، اُن کی ایسی اِتنی پُر زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ اہل علم کے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ علمی سرگرمیوں کا حق تو بہ قدرِ توفیق ادا کر لیتے ہیں، لیکن امورِ زندگانی میں پھوہڑ ہوتے ہیں بل کہ جو جتنا بڑا ذی علم ہوتا ہے، وہ زندگی کے معاملات میں اتنا ہی بدسلیقہ و بے ہنر ہوتا ہے۔

مفتی صاحبؒ کی ایک انفرادیت جو اُنھیں دیگر معاصر علماء سے ممتاز کرتی ہے، یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنی اولاد کو اپنے بعد، لوگوں کا دستِ نگر نہیں چھوڑا، بل کہ انھیں ''اغنیا'' چھوڑا ہے۔ اِس طرح اُنھوں نے ارشاد نبوی پر عمل کیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ تم اپنی اولاد کو اغنیا (مال دار و بے نیاز) چھوڑ کر جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اُنھیں محتاج چھوڑ کر جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۵۶۶۸)۔

مفتی صاحبؒ کی یہ خصوصیت اِس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اُنھوں نے بہت سے معاصر ''علمائے دین'' کی طرح اپنے کو سیم و زر کا غلام نہیں بنایا اور زر کشی کے لیے وہ ہتھکنڈے نہیں اپنائے جو عام طور پر غلامانِ مال و زر اپنایا کرتے ہیں۔ اُن کے کسی طرزِ عمل سے کسی کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا ہوگا کہ وہ مال و منال اندوزی کے لیے اسباب سازی کی تگ و دو میں لگے رہے ہوں اور زندگی کے گراں مایہ لمحات کا کوئی حصہ اُس کوشش میں پامال کیا ہو۔ اُن کی شناخت ہمیشہ ایک خوگرِ علم عالمِ صالح، مطالعہ و تحقیق کے رسیا، قرطاس و قلم کے ساتھی، وسیع النظر محدث، دقیق النظر

فقیہ ومفتی اورفنِّ تدریس کے ماہرمستری کی ہی رہی؛ لیکن اللہ تعالی نے اپنے خاص فضل وکرم سے، اُن کے لیے کشادگیِ رزق کے دروازے وا کردیے، اُن کی تصنیفات بھی بہت مقبول ومتداول اور کثرت سے فروخت ہوتی رہیں، جواُن کی آمدنی کا مستقل ذریعہ رہیں اوراُن کی وفات کے بعد، اُن کے بچوں اورپس ماندگان کے لیے بھی؛ اِن شاء اللہ خود کفالتی کا یقینی وسیلہ رہیں گی۔

اُنھوں نے کئی سال پہلے اپنے سارے بچوں کے لیے دیو بند ہی میں الگ الگ مکانات بنوادیے جن سے ایک محلّہ سا آباد ہوگیا ہے۔ یہی نہیں؛ بل کہ اُنھوں نے دارالعلوم اشرفیہ عربیہ راندیر (گجرات) جہاں اُنھوں نے ۱۳۸۴ھ سے ۱۳۹۳ھ تک تدریسی خدمت انجام دی اوردارالعلوم دیو بند جہاں شوال ۱۳۹۳ھ سے تاحیات ۱۴۴۱ھ تک سرگرم تدریس وفیض رسانی رہے، دونوں اداروں سے جو تنخواہیں لی تھیں، وہ سب واپس کردیں۔ دارالعلوم دیو بند سے انھوں نے ۱۴۲۳ھ میں حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد، ۳۰سال تین ماہ تک جو کچھ لیا تھا وہ ساری رقم لوٹادی، اس کے بعد سے تاحیات دارالعلوم کے لیے ان کی ساری خدمات بلا معاوضہ رہیں۔ دارالعلوم اشرفیہ راندیر سے انھوں نے نوسالہ مدتِ تدریس میں تئیس ہزاردوسوپچاس روپے(۲۳۲۵۰) تنخواہ لی تھی، جواس کے خزانے میں ۲۸/اپریل ۲۰۰۳ کو جمع کرادی۔

دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۹۳ھ سے ۱۴۲۳ھ تک تنخواہ کی شکل میں، اُنھیں کل نولاکھ انچاس ہزار آٹھ سو چار روپے پچھتر پیسے (۹۴۹۸۰۴٫۷۵) ملے تھے، جواُنھوں نے متعدد مرتبہ میں اس کو واپس کردیے۔ محرم ۱۴۲۴ھ سے وفات تک دارالعلوم سے کوئی تنخواہ لی نہ کوئی مادی فائدہ اٹھایا۔ تَقَبَّلَ اللّٰہُ حَسَنَاتِہٖ، وَ کَثَّرَ اَمْثَالَہٗ.

اِن کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اجتماعی دعوتوں میں شرکت سے بالکلیہ پرہیز کرتے تھے کہ اس سے وقت بہت ضائع ہوتا ہے اور طے کردہ التزامات ومعمولات میں ضرور خلل واقع ہوتا ہے۔

اُن کی ایک قابلِ ذکر خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے سے بڑے دل گداز واستخواں سوز حادثے کے وقت بھی، اپنے

اعصاب پر جس طرح قابو یافتہ رہتے تھے، اُس کی نظیر راقم نے بہت کم دیکھی ہے۔ وہ مشکل حالات کا ایک سچے مومن کی طرح جواں مردی سے مقابلہ کرتے اور کبھی جزع فزع کی کیفیتوں کا شکار نہ ہوتے۔ راقم نے پہلے بھی کہا ہے کہ وہ اعصاب شکن نازک حالات میں بھی صحیح اور بروقت عملی رائے قائم کرتے اور چاک داماں ہونے اور سینہ کوبی کرنے کی بہ جاے مطلوبہ سمت میں پیش قدمی کر کے وہ کام کرتے جو وقت کا تقاضا اور مستقبل سازی کا ذریعہ ہوتا۔

۱۴۱۵ھ/ 1995ء میں اُن کے سب سے بڑے صاحب زادے مولوی حافظ مفتی رشید احمد (جوذی استعداد، ہونہار اور فرماں بردار ہونے کے ساتھ پہلی اولاد تھے) مظفر نگر کسی کام سے گئے واپسی میں ایک حادثے میں اچانک جاں بحق ہوگئے۔ مفتی صاحب اُس وقت لندن میں تھے، اُنھیں اس جاں کاہ حادثے کی خبر دی گئی، اُنھوں نے ٹھوس لہجے میں فرمایا: رشید احمد اللہ تعالیٰ کی امانت تھے، اللہ نے واپس لے لی۔ اہل خانہ کو ہدایت دی کہ اُن کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرو اور علی الصباح نمازِ جنازہ و تدفین سے فارغ ہوجاؤ، میرے آنے کا انتظار نہ کرو، میری آمد میں تاخیر بھی ہوسکتی ہے۔

دارالعلوم میں اور اُن کے اہل خانہ میں طبعی طور پر اِس واقعے کا بڑا غم تھا، لوگوں کو اندازہ تھا کہ مفتی صاحب کو بے حد صدمہ ہوگا اور وہ اس کا اظہار بھی کریں گے اور لندن سے اپنی بہ عجلت واپسی تک تدفین کو مُعلَّق رکھنے کی بات کہیں گے لیکن انھوں نے صبرِ جمیل کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا جو اُن کے ہی ایسے صبر شعار علمائے کاملین کا شیوہ ہوتا ہے۔

۱۴۳۲ھ/ ۲۰۱۱ء میں اُن کی اہلیہ محترمہ کی رحلت کا حادثہ پیش آیا۔ یہ حادثہ اِس لیے بھی بڑا دل گداز تھا کہ اس سے نہ صرف ان کا گھر اجڑ سا گیا، بل کہ امور خانہ داری کی جو ترتیب قائم تھی، وہ بالکل تِتّر بِتّر ہوجانے کے خطرے سے دوچار ہوگئی۔ اُن کے بڑھتے ہوئے علمی مشاغل کے پیشِ نظر، اُن کی سن رسیدگی میں،

ہونہار ووفا شعار وپیکر انکسار وسمجھ دار اور امور خانہ داری میں ماہر حافظِ قرآن اور حفظ میں اپنے بچوں کی استاذ پڑھی لکھی بیوی؛ اُن کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت تھی لیکن اُنھوں نے اِس صبر شکن موقع سے جس صبر وقرار کا مظاہرہ کیا اور اپنی مُتاہِّلْ وغَیر مُتاہِّلْ اولاد کو جس خوش اندازی وہنر مندی سے سنبھالا اور خانہ بربادی کے منڈلاتے خطرے کو جس طرح خانہ آبادی؛ بل کہ خانہ سازی میں تبدیل کیا، وہ ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے کہ ایک ذی علم اور علمی وتعلیمی وتالیفی مشاغل میں بے حد منہمک عالم بھی اپنی کثیر الاولاد فیملی کو سلیقہ مندانہ انداز میں چلاسکتا ہے؛ ورنہ بالعموم ماہرینِ علم علماء، نہ صرف گھریلو معاملات میں؛ بل کہ سارے انتظامی امور میں کورے اور نابلد ہوتے ہیں، کیوں کی مصروفیات کی جکڑ بندی وارتکاز خواہی وانہماک طلبی، دیگر سمتوں کی طرف جھانکنے کا موقع نہیں دیتی۔

مفتی صاحبؒ کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ درسِ نظامی کے تحت چلنے والے مدارس (جن کا سُرخیل اُمُّ المدارس دارالعلوم دیوبند ہے) میں دینی عالم سازی کا جو مختلف العلوم نصاب رائج ہے، اُن کو اس نصاب کی تقریباً ساری کتابوں اور علوم میں دست گاہ حاصل تھی؛ کیوں کہ اپنے بھائیوں اور اپنی اولاد کو ازابتدا تا متوسطات خود ہی یہ کتابیں اُنھوں نے پڑھائیں اور مدرسہ اشرفیہ راندیر اور دارالعلوم دیوبند میں اُنھوں نے حدیث وفقہ کے علاوہ بھی متوسطات سے اوپر کی کتابوں کا درس دیا، نیز اس نصاب کی اکثر کتابوں کی تحریری تحقیق وتدقیق وشرح نگاری؛ اُن کی تالیفی زندگی کا اہم مشغلہ رہی؛ اسی لیے منقولات ومعقولات اور عالیات وآلیات سے متعلق ہر طرح کے علوم وفنون، اُنھیں بالعموم مستحضر رہے، جس کی وجہ سے تدریسی وتالیفی عمل اُن کے لیے بہت آسان رہا۔

پھر یہ کہ توفیقِ الٰہی سے اُنھوں نے جہاں بھی جو کچھ بھی پڑھا محنت اور لگن سے پڑھا اور رسمی فراغت کے بعد یا حصولِ تعلیم کے دوران، جس کو جو کچھ پڑھایا ہمہ تن مصروف رہ کر پڑھایا۔ اِس کے علاوہ اُن کی استعداد سازی میں ایک اور عامل نے بنیادی کردار ادا کیا، جس کا تذکرہ مفتی صاحب کے برادرِ خُرد مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند نے، اپنی کتاب ''الخیر الکثیر'' کے شروع میں، اُن کے تعارف میں کیا ہے، جس کا

خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والد ماجد محمد یوسف صاحبؒ (متوفی ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ = جون ۱۹۹۱ء) گو تعلیم مکمل نہ کر سکے لیکن اُنھوں نے کچھ دنوں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں اس زمانے میں تعلیم حاصل کی جب وہاں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء، ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) مولانا محمد یوسف بنّوریؒ (۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء، ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) اور مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ (۱۳۱۶ھ/ ۱۸۸۹ء - ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء) پڑھاتے تھے۔ اُن بزرگوں کے علم و عمل اور فضل و کمال سے وہ حد درجہ متاثر تھے، گھریلو حالات کی وجہ سے خود تو عالم نہیں بن سکے لیکن یہ آرزو اُن کے دل میں موج زن رہی کہ اُن کی اولاد، اُن علمائے نام دار کے جیسے عالم بن جائے، اُنھوں نے اس کا اظہار مولانا بدر عالم میرٹھیؒ سے کیا، جن کے وہ خادمِ خاص تھے۔ مولاناؒ نے اُنھیں اُن کی آرزو کے برآنے کی راہ سمجھائی اور یہ نصیحت فرمائی:

"یوسف! اگر تم اپنے لڑکوں کو اچھا عالم بنانا چاہتے ہو تو حرام اور ناجائز مال سے پرہیز کرنا اور بچوں کو بھی ناجائز اور حرام مال سے بچانا؛ کیوں کہ علم ایک نور ہے، ناجائز اور حرام مال سے جو بدن پروان چڑھتا ہے، اس میں نور داخل نہیں ہوتا۔"

مولانا مفتی محمد امین صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ نصیحت حضرت مولانا نے والد ماجد کو اس لیے کی تھی کہ اُس زمانے میں ہماری ساری قوم بنیوں کے سود میں پھنسی ہوئی تھی، اُسی زمانے میں ہمارے دادا نے بنیے سے سودی قرض لے کر ایک زمین کرائے پر لی تھی، والد صاحب اُس زمانے میں ڈابھیل کے طالبِ علم تھے۔ والد صاحب نے اِس معاملے میں دادا سے اختلاف کیا، تو دادا نے والد صاحب کو الگ کر دیا، چناں چہ والد صاحب کو حرام سے بچنے کے لیے مجبوراً تعلیم چھوڑ کر اپنا گھر سنبھالنا پڑا اور تہیّا کیا کہ چاہے بھوکا رہوں گا مگر حرام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا تاکہ میں نہیں پڑھ سکا تو اللہ تعالی میری اولاد کو علم دین عطا فرمائیں۔" (الخیر الکثیر ۹۲)

الغرض اُن کے والد نے حرام غذا سے بچنے کا التزام کیا اور اپنی اولاد کو بھی اس سے بچائے رکھا، یقیناً نماز روزے کی پابندی، جو اُن کے والد کی خصوصیت تھی، کے ساتھ حرام خوری سے مکمل اجتناب کی وجہ سے اُن کی اولاد عموماً اور بڑی اولاد خصوصاً عالم باعمل بنی جو علم و عمل کی بھرپور حصول یابیوں کا گہرا نقشِ دوام ثبت کرکے دنیا سے رخصت ہوئی۔ اُن کے والد مرحوم کا یہ کارنامہ ان شاء اللہ اُن کی بخشش کا پروانہ ثابت ہوگا۔

مفتی صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے؛ لیکن وہ اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی زندہ، تابندہ اور پایندہ رہیں گے؛ کیوں کہ اُن کے علمی و تعلیمی کارنامے سوختگیِ خونِ جگر کا نتیجہ تھے۔ ایسے کارنامے انسان کی موت کے بعد زیادہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ نشور واحدی نے کیا خوب کہا ہے:

خاک اور خون سے اِک شمع جلائی ہے نشور
موت سے ہم نے بھی سیکھی ہے حیات آرائی

خاک میں خاکی جسم تو چھپ جاتا ہے، لیکن انسان کے علمی وفکری کارنامے تہِ خاک ہوجانے کے بعد اور درخشاں ہوجاتے ہیں:

لَعَمْرُكَ مَاوَارَى التُّرَابُ فِعَالَهُ وَلٰكِنَّهُ وَارَى ثِيَابًا وَأَعْظَمَا

ہاں افسوس رہے گا تو اِس کا مفتی صاحب جیسے شمعِ علم پر قربان ہونے والے مثالی پروانے ایک ایک کرکے رخصت ہوتے جاتے ہیں:

فروغِ شمع تو باقی رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

مفتی صاحب باصلاحیت فضلاء وعلماء کے لیے مادی ومعنوی طور پر بڑے ہم درد اور مددگار ہوتے تھے، اِسی لیے مفتی صاحب کی رحلت سے اُن سارے لوگوں کو بہ طورِ خاص بہت صدمہ ہوا ہے، جو جانتے ہیں کہ انسان ضعیف البنیان ہے اور نقائص ومعایب سے پر ہے؛ اس لیے معاشرتی زندگی میں جو ہر قسم کے انسانوں کا مجموعہ

ہوتی ہے، معاشرتی خرابیاں ضرور ہوتی ہیں، اُن میں زیادہ عیاں حقوق رسانی کے حوالے سے ناہمواریاں ہیں، جس کے اندیشے سے بچنے کے لیے وہ مفتی صاحب کا سہارا لیتے تھے اور اُن کی عادلانہ ثالثی کے ذریعے، حق کی حق دار تک رسیدگی کا یقین رکھتے تھے، کیوں کہ محترم المقام ہونے کے وجہ سے، مفتی صاحب کی رائے وزن دار اور ہمیشہ مسموع ہوتی تھی اور ایسا شاید و باید ہی ہوتا تھا کہ وہ کوئی تجویز یا مشورہ پیش کریں اور متعلقہ لوگ اُس کو روبہ عمل لانے میں آنا کانی کریں۔ کسی بھی معاشرے میں ایسی واجب الاحترام ہستی، اس کی غیر معمولی ضرورت ہوتی ہے۔

سوانحی نقوش

نام: مفتی صاحب کے والدین نے اُن کا نام ''احمد'' رکھا تھا؛ لیکن مفتی صاحب نے جب ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء میں مظاہرعلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، تو وہاں اپنا نام ''سعید احمد'' لکھوایا، اُس وقت سے آپ ''سعید احمد'' ہی سے جانے جاتے رہے۔ پورا نام سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا (یعنی یحییٰ) بن نور محمد ہے۔

جائے پیدائش: موضع ''کالیڑہ'' ضلع ''بناس کانٹھا'' ہے، بناس کانٹھا نام سے کوئی شہر نہیں ہے، بل کہ یہ پورے علاقے کا نام ہے ضلع کا صدر مقام شہر ''پالن پور'' ہے۔ ''کالیڑہ'' گاؤں پان پور سے جنوب مشرق میں تقریباً ۴۸ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کالیڑہ میں ''سلم العلوم'' کے نام سے ایک عربی مدرسہ بھی ہے، جہاں بہ وقتِ تحریر دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، مفتی صاحبؒ کی طالب علمی میں یہاں متوسطات ہی تک تعلیم ہوتی تھی۔

تاریخِ پیدائش: اُن کی صحیح تاریخِ پیدائش محفوظ نہیں ہے، اُن کے والد نے جب ''ڈبھاڈ'' میں زمین خریدی، تو بیع نامے کی روشنی میں تخمینے سے، اُن کا سنۂ پیدائش اواخر ۱۹۴۰/۶۰ ۱۳ھ بتایا، زمین کی خریدگی کے

وقت، مفتی صاحب ڈیڑھ پونے دوسال کے تھے۔ مذکورہ خریدی ہوئی زمین پر ’’مجاہد پورہ‘‘ نام سے ایک گاؤں آباد ہوگیا ہے۔ مفتی صاحب کے والد کی اولاد جو ’’ڈھکّا‘‘ خاندان سے تعلق رکھتی ہے، آپ اسی گاؤں کے باسی ہیں، مفتی صاحبؒ کا خاندان پالن پور کے علاقے کی مشہور ’’مومن‘‘ برادری سے تعلق رکھتا ہے۔

مفتی صاحب کے اُن سے چھوٹے ۴ بھائی اور ۴ بہنیں ہیں، مفتی صاحب اُن سب سے بڑے تھے، گویا وہ نو بھائی بہن تھے۔ بہنیں سب حیات ہیں اور متاہل ہیں۔ بھائیوں میں سے دو بھائی فوت ہو چکے ہیں۔ ایک عبدالرحمن جو مفتی صاحب کے معاً بعد کے تھے اور اپنے گاؤں مجاہد پورہ میں کھیتی باڑی کرتے تھے، ۱۸/ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ مطابق یکم مارچ ۲۰۱۳ء کو اُن کا انتقال ہوگیا۔ اِن کے معاً بعد کے مولانا عبدالمجید تھے جو دارالعلوم اشرفیہ راندیر کے فارغ تھے، وہ ۹/ربیع الاول ۱۴۳۶ھ مطابق یکم جنوری ۲۰۱۵ء کو وفات پا چکے۔ ان کے بعد کے مولانا مفتی محمد امین پالن پوری ہیں، جن کی تاریخ ولادت ۱۷ ربیع الاخر ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء ہے، دارالعلوم کے فاضل ہیں، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء سے دارالعلوم دیوبند میں استاذ ہیں، اِس وقت دورۂ حدیث اور درجۂ علیا کی کتابیں ان سے متعلق ہیں۔ ذی استعداد اور صاحب تصنیفات ہیں۔ اللہ صحت و عافیت کے ساتھ عمر دراز سے نوازے۔ دیوبند کے محلّہ قلعہ میں اپنے ذاتی مکان میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ ان کی بود وباش ہے۔ ان سے چھوٹے مولانا حبیب الرمن مولود

۱۳۷۹ھ/ ۱۹۶۰ء ہیں جو مظاہر علوم سہارن پور سے فارغ ہیں اور دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں صحیح بخاری اور جامع الترمندی پڑھاتے ہیں۔

تعلیم: مفتی صاحب نے مکتب کی تعلیم اپنے آبائی گاؤں ’’کالیڑہ‘‘ کے مکتب میں حاصل کی، اُس کے بعد اُن کے ماموں مولانا عبد الرحمن شیر رح اُنھیں دارالعلوم چھاپی لے گئے، جہاں اُنھوں نے ماموں صاحب سے اور دیگر اساتذہ سے چھ ماہ تک فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، چھ ماہ بعد ماموں نے مذکورہ مدرسے سے رشتہ

منقطع کر کے اپنے گاؤں میں سکونت اختیار کر لی تو اُنھوں نے ماموں سے اُن کے گھر پر ہی فارسی کی کتابیں پڑھیں۔

عربی کی ابتدائی اور متوسط تعلیم مولانا محمد نذیر میاں پالن پوری رح کے ''مدرسہ اسلامیہ عربیہ'' پالن پور میں حاصل کی، یہاں آپ کے اساتذہ میں مولانا مفتی اکبر میاں پالن پوری رح اور مولانا ہاشم بخاریؒ تھے، جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد گجرات کے کئی مدرسوں میں مدرس رہے، بعد میں کئی سال دارالعلوم دیوبند کے استاذ رہے۔ پھر مدینہ منورہ ہجرت کر گئے اور اسی کی خاکِ پاک کا پیوند بنے۔

بعدہ ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء میں مظاہر علوم سہارن پور کا قصد کیا اور یہاں مسلسل تین سال تک تعلیم حاصل کی اور شرحِ جامی کے بعد اور جلالین سے پہلے کا مرحلہ طے کیا۔

۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں جلالین اور ہدایہ اولین کی جماعت میں داخل ہوئے۔ اور ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم میں دورۂ حدیث کیا۔ دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحبؒ نے درج ذیل اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی:

مولانا سید اختر حسین دیوبندی (۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء-۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) مولانا بشیر احمد خاں بلند شہری (متوفی ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء) مولانا سید حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء) مولانا عبد الجلیل کیرانوی (متوفی ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) مولانا اسلام الحق اعظمی (۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء- ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء- ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) مولانا عبد الاحد دیوبندی (۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء- ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) مولا نا فخر الحسن مراد آبادی (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء- ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء)

مولانا محمد ظہور دیوبندی (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء- ۱۳۸۳ھ- ۱۹۶۳ء) علامہ محمد ابراہیم بلیاوی (۱۳۰۴ھ/

۱۸۸۶ء-۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری (۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء-۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) شیخ محمد عبدالوہاب محمود مصری مبعوث از جامعہ ازہر برائے دارالعلوم دیوبند، مولانا نصیر احمد خاں بلند شہری (۱۳۰۷ھ/ ۱۹۱۸ء-۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء) شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین ہاپوڑی ثم المرادآبادی (۱۳۰۷/ ۱۸۸۹ء-۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء)۔

دورۂ حدیث میں مفتی صاحب نے اول نمبر سے کام یابی حاصل کی سوائے مسلم شریف کے جس میں انھیں ۴۵ نمبر ملے، حدیث شریف کی ساری کتابوں میں ۵۰-۵۰ نمبر حاصل کیے۔ یاد رہے کہ دارالعلوم میں اس وقت نمبرات کی آخری حد ۵۰ تھی، ابھی چند سال پہلے دنیا کے عام علمی اداروں کی طرح آخری حد ۱۰۰ نمبر ہوگئی ہے۔

۸۳-۱۳۸۲ھ کے تعلیمی سال میں اُنھوں نے دارالعلوم میں افتا کیا مستحکم صلاحیت کی وجہ سے ۸۴-۱۳۸۳ھ کے تعلیمی سال میں دارالافتا میں معاون مفتی کی حیثیت سے ان کا تقرر رہا حسنِ کارکردگی کی وجہ اُس وقت کے دارالعلوم کے مفتی، مفتی محمود حسن نانوتوی نے ۱۳۸۴ھ میں ان کے مستقل تقرر کی سفارش کی، مہتمم دارالعلوم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے سفارش کو قبول فرماتے ہوئے، افتا کمیٹی کے ممبران کو تحریراً پیش رفت کا حکم دیا لیکن متعلقہ کچھ حضرات نے اس تحریر کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا۔ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی نے اُنھیں یہ فرماتے ہوئے اِس صورت حال کی اطلاع دی کی ’’مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اِس سے اچھے آؤ گے‘‘۔ چناں چہ نو سال بعد وہ دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ خدمتِ تدریس کے لیے بلائے گئے اور دم واپسیں تک اس سعادت سے بہرہ ور رہے۔

عملی میدان میں

ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ/ مارچ ۱۹۶۵ء سے شعبان ۱۳۹۳ھ ستمبر ۱۹۷۳ء تک ۹ سال اُنھوں نے دارالعلوم اشرفیہ راندیر، سورت میں تدریسی خدمت انجام دی۔ وہیں سے تحریری و تالیفی کام کا آغاز بھی کیا اور مختلف کتابیں

تصنیف کیں، نیز حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ (۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء-۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ھ) کے علوم ومعارف کی تفہیم وتشریح کا تحریری کام بھی شروع کیا، اِس سلسلے کی ایک کوشش ''افادات نانوتوی'' کے نام سے بالاقساط ''الفرقان'' لکھنؤ میں شائع ہوئی، جس کی اہل علم نے بہت پذیرائی کی۔

رجب ۱۳۹۳ اگست ۱۹۷۳ء میں منعقدشدہ مجلس شوری نے مفتی صاحبؒ کو دارالعلوم کا استاذ منتخب کیا۔ شوال ۱۳۹۳ھ/نومبر ۱۹۷۳ء سے آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کی، پہلے سال انھوں نے مسلم الثبوت، ہدایہ اول، سلم العلوم، ملاحسن، ہدیہ سعیدیہ، جلالین نصف اول مع الفوز الکبیر کے اسباق پڑھائے ۔سال بہ سال ترقی کرتے ہوئے حدیث شریف کی کتابوں کی تدریس تک پہنچے۔

۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاں بلند شہری کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے اور ۱۴۴۱ھ/ ۲۰۲۰ء کے تعلیمی سال کے ختم تک آپ نے مکمل بخاری شریف کا درس دیا؛ لیکن حضرت مولانا نصیر احمد خاں کی حیات میں ہی ان کی وفات سے دوسال پہلے سے یعنی سال تعلیمی ۱۴۲۸ھ-۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸-۲۰۰۷ء سے ہی، آپ کے ذمے بخاری شریف کردی گئی تھی؛ کیوں کہ حضرت مولانا نصیر احمد خان بہت کم روز اور رہین فراش ہوگئے تھے۔ دارالعلوم میں آپ شیخ الحدیث اور صدر مدرس بھی رہے، اس کے ساتھ متعدد ذمے داریاں بھی اُن کے سپرد رہیں، مثلاً: ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء اور ۱۹۸۲ء/ ۱۴۰۲ھ میں انھوں نے دارالافتا کی سرپرستی اور نگرانی کی خدمت انجام دی، نیز ''مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت'' کے ناظم اعلی رہے، انھوں نے اضافی خدمتوں میں سے کسی کا کوئی الاؤنس دارالعلوم کی پیشکش کے باوجود نہیں لیا۔

بیعت وخلافت:

اکابر واسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مفتی صاحب طلبِ علم کے زمانے سے اپنی باطنی اصلاح کے لیے فکرمند رہے۔ چناں تحصیلِ علم کے ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا قدس سرّہ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء

۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) سے بیعت ہوکراُن کی تعلیمات و ارشادات پر عمل پیرا رہے، نیز دیگر معاصر صالحین کی مجلسوں سے استفادہ جاری رکھا، بالخصوص حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری نوراللہ مرقدہ (۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء- ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۹۲ء) کی مجلسوں میں کثرت سے حاضر ہوتے رہے۔ ان بزرگوں کی وفات کے بعد حضرت مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء- ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء) سے رجوع ہوئے اور انھی سے ۱۴۱۸ھ میں اجازتِ بیعت وارشاد سے بہرہ مند ہوے۔

تالیفات:

مفتی صاحب نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں جن میں مستقل تصنیفات اور شروحات اور مراجعات داخل ہیں، اُن کے صفحات مجموعی طور پر تینتیس ہزار چھ سوبیس ہیں (۳۳۶۲۰) ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی، متوسط اور چھوٹی تقطیع کی کتابیں شامل ہیں، ان میں سے متعدد کتابیں کئی کئی ضخیم جلدوں میں ہیں، جب کہ اکثر کتابیں ایک یا دو جلدوں میں ہیں، جن کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱. تحفۃ القاری، یہ صحیح بخاری کی شرح ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، ہر جلد ۲۰ × ۳۰ کی تقطیع پر تقریباً چھ سو صفحے کی ہے۔ ساری جلدوں کے صفحات بہتّر سو دس (۷۲۱۰) ہیں۔

۲. تحفۃ الالمعی، یہ جامع ترمذی کی شرح ہے۔ مذکورہ تقطیع میں ۸ آٹھ جلدوں میں ہے، ہر جلد زائد از چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، ساری جلدوں کے کل صفحات انچاس سو اکیاسی (۴۹۸۱) ہوتے ہیں۔

۳. تفسیر ہدایت القرآن، یہ قرآن پاک کی آسان تفسیر اور ترجمہ ہے۔ مذکورہ تقطیع میں اس کی آٹھ ۸ جلدیں ہیں، ہر جلد زائد از ۶۰۰ صفحات میں ہے کل جلدوں کے مجموعی صفحات پینتالیس سو چھہتر (۴۵۷۶) ہوتے ہیں۔

۴. آسان بیان القرآن، یہ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ (۱۲۸۰ھ/

۱۸۶۳-۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کی تفسیر مکمل بیان القرآن کی سہیل ہے، جو دارالعلوم کے ایک فاضل مولانا عقیدت اللہ قاسمی نے کی ہے، مفتی صاحب نے نظرثانی کے بعد، اس کی طباعت واشاعت اپنے تجارتی مکتبہ: ''مکتبۂ حجاز'' دیوبند سے کیا ہے، مذکورہ تقطیع پر یہ ۵ پانچ جلدوں میں ہے، ہر جلد تقریباً چھ سو (۶۰۰) صفحات کی ہے، پانچوں جلدوں کے کل صفحات (۲۸۶۸) اٹھائیس سو اڑسٹھ ہوتے ہیں۔

۵. رحمۃ اللہ الواسعہ، یہ محدث دہلوی (امام احمد بن عبدالرحیم معروف بہ ''شاہ ولی اللہ دہلوی'' (۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۳ء- ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) کی مشہور تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی اردو شرح ہے، جو مفتی صاحب نے بڑی جاں فشانی سے کی ہے؛ اِسی لیے اِس سلسلے میں کی گئیں سابقہ ساری کوششوں سے فائق اور مفید تر ثابت ہوئی ہے اور اہلِ علم نے اس کی بہت پذیرائی کی ہے۔ یہ کتاب پانچ (۵) جلدوں میں مذکورہ تقطیع میں ہے مکمل جلدوں کے مجموعی صفحات چھتیس سو چودہ (۳۶۱۴) ہیں۔

۶. تحقیق وتعلیق حجۃ اللہ البالغہ، یہ عربی زبان میں حجۃ اللہ البالغہ کی تحقیق وتعلیق ہے، اس کو بڑے سائز پر دارابن کثیر دمشق نے ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں بہت خوب صورت چھاپا تھا، یہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۶۹۳ صفحات کی ہے اور دوسری جلد ۶۴۷ صفحات کی، دونوں جلدوں کے مجموعی صفحات (۱۳۴۰) تیرہ سو چالیس ہوتے ہیں۔ اِسی طباعت کا عکس مفتی صاحب کے ''مکتبۂ حجاز'' سے اسی انداز میں چھپا ہوا، دیو بند میں دستیاب ہے۔

۷. ایضاح المسلم، یہ صحیح مسلم کی شرح کی پہلی جلد ہے، جو کتاب الایمان پر مشتمل ہے، مذکورہ تقطیع میں یہ جلد (۶۰۰) چھ سو صفحات میں ہے۔

۸. فیض المنعم، یہ مقدمۂ صحیح مسلم کی شرح ہے، بڑے سائز کے (۱۷۶) ایک سو چھہتر صفحات میں ہے۔

۹. شرح علل الترمذی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ علل الترمذی کی عربی میں شرح ہے۔ کتاب بڑے

سائز کے اسی (۸۰) صفحات میں ہے، مکتبۂ حجاز سے شائع ہوتی رہتی ہے۔

۱۰. زبدۃ شرح معانی الآثار (کتاب الطہارۃ) یہ امام طحاوی (ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ ازدی طحاوی: ۲۳۸ھ/ ۸۵۲ء-۳۲۱ھ/ ۹۳۳ء) کی مشہور کتاب ''معانی الآثار'' کے کتاب الطہارۃ کی عربی شرح ہے۔ یہ متوسط سائز کے ایک سوانیس (۱۱۹) صفحات میں ہے۔

۱۱. مفتاح التہذیب، یہ منطق کی مشہور کتاب ''تہذیب المنطق'' مؤلفہ سعد الدین تفتازانی (۷۲۲ھ/ ۱۳۲۲ء- ۷۹۲ھ/ ۱۳۹۰ء) کی اردو شرح ہے، متوسط سائز کے (۱۵۲) ایک سو باون صفحات میں ہے۔ اس کتاب کی تدریس کی تقریر کو ان کے پسرِ اکبر مولانا رشید احمد پالن پوری مرحوم ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء- ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) نے جمع کیا تھا اور دار العلوم کے استاذ مولانا خورشید احمد گیاوی نے مرتب کیا تھا۔

۱۲. الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، یہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی فارسی تصنیف کا عربی میں ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ماضی میں ایک سے زائد لوگوں نے کیا تھا، لیکن وہ نقص آلود رہا، اِس لیے مفتی صاحب نے اس کی تہذیب وتصحیح کی اور حذف وتنقیح کے ساتھ اس پر حاشیہ نویسی بھی کی۔ دار العلوم دیوبند اور ملحقہ مدارس میں مفتی صاحب ہی کا عربی ترجمہ داخل نصاب ہے، یہ کتاب متوسط سائز کے ایک سو بیس (۱۲۰) صفحات میں ہے۔

۱۳. العون الکبیر شرح الفوز الکبیر، یہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کی عربی میں شرح ہے، یہ متوسط سائز کے تین سو بارہ (۳۱۲) صفحات میں ہے۔

۱۴. الوافیہ بمقاصد الکافیہ، یہ عربی زبان میں علامہ ابن الحاجب (ابوعمر وعثمان بن عمر بن ابی بکر بن یونس دوینی اَسنائی معروف بہ ''ابن الحاجب'' :۵۷۰ھ/ ۱۱۷۴ء-۶۴۶ھ/ ۱۲۴۹ء) کی نحو میں معرکۃ الآراء کتاب ''الکافیہ'' پر حواشی وتعلیقات ہیں۔ یہ کتاب متوسط سائز کے دوسو پندرہ (۲۱۵) صفحات میں ہے۔

۱۵. ہادیہ شرح کافیہ، یہ اردو زبان میں کافیہ کی شرح ہے، چھوٹے سائز کے تین سو اٹھاون (۳۵۸) صفحات

میں ہے۔

۱۶. مبادئ الفلسفہ، یہ کتاب دارالعلوم کی مجلس شوری کی طلب پر مفتی صاحب نے ترتیب دی ہے، جو دارالعلوم میں داخل نصاب ہے۔ کتاب کا مقصد فلسفہ کی بڑی اور دقیق مشکل کتابوں سے پہلے طلبہ کو اس کے اصول ومبادی سے واقف کرانا ہے؛ تاکہ ان کے لیے ان کتابوں کا پڑھنا اور سمجھنا آسان ہوجائے۔ یہ کتاب متوسط سائز کے چالیس (۴۰) صفحات میں ہے۔

۱۷. معین الفلسفہ، یہ مبادئ الفلسفہ کی اردو شرح ہے، جس سے میبذی کے حل میں بھی مدد ملتی ہے اور فلسفہ کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنا آسان ہوتا ہے۔ یہ کتاب چھوٹے سائز پر (۱۶۴) ایک سو چونسٹھ صفحات میں ہے۔

۱۸. مبادئ الاصول، یہ اصول فقہ کی بنیادی اصطلاحات پر مشتمل ہے، عربی زبان میں اصول الشاشی، نورالانوار اور کشف الاسرار وغیرہ اصول فقہ کی کتابوں سے استفادے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اِس کو پڑھ لینے کے بعد اصول فقہ کی مشکل کتابوں کو ہضم کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ یہ کتاب متوسط سائز کے چالیس (۴۰) صفحات میں ہے۔

۱۹. معین الاصول، یہ اردو زبان میں مبادئ الاصول کی شرح ہے۔ چھوٹے سائز کے ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات میں ہے۔

۲۰. آپ فتوی کیسے دیں؟، یہ کتاب علامہ ابن عابدین شامی (محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز عابدین دمشقی معروف بہ ''علامہ شامی'' (۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء-۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ء) کی مشہور کتاب ''شرح عقود رسم المفتی'' کا سلیس اردو ترجمہ ہے، مترجم نے مباحث کی ضروری وضاحت اور مفید عنوانات کے اضافے کے ساتھ فقہا اور کتب فقہیہ کا مفصل تعارف بھی کتاب میں درج کردیا ہے۔ یہ کتاب متوسط سائز کے ایک سو ساٹھ (۱۶۰) صفحات میں ہے۔

۲۱. آسان صرف، یہ کتاب مفتی صاحب نے مبتدی طلبہ کے لکھی ہے، یہ برصغیر میں اکثر مدرسوں میں داخلِ نصاب ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں ہے۔ چھوٹے سائز پر پہلا حصہ چالیس (۴۰) صفحے میں، دوسرا حصہ چونسٹھ (۶۴) میں اور تیسرا حصہ ایک سو چار (۱۰۴) صفحے میں ہے۔

۲۲. آسان نحو، یہ کتاب نحو کے مبتدی طلبہ کے لیے دو حصوں میں اردو میں لکھی گئی ہے۔ چھوٹے سائز پر پہلا حصہ چالیس (۴۰) صفحے میں اور دوسرا حصہ ایک سو چار (۱۰۴) صفحے میں ہے۔

۲۳-آسان فارسی قواعد، یہ مبتدی طلبہ کو فارسی پڑھانے کے لیے بہت آسان کتاب ہے، دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ چھوٹے سائز بتیس (۳۲) صفحے میں ہے اور دوسرا حصہ (۶۴) چونسٹھ صفحے میں ہے۔

۲۴. آسان منطق، یہ کتاب دراصل مولانا حافظ عبداللہ گنگوہیؒ کی تالیف تیسیر المنطق کی ترتیب وتسہیل ہے، جو مفتی صاحبؒ نے کی ہے۔ یہ چھوٹے سائز پر (۷۷) صفحے میں ہے۔

۲۵. تحفة الدرر شرح نخبة الفكر، یہ علامہ ابن حجر عسقلانی (شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن محمد کنانی عسقلانی مصری شافعی: ۷۷۳ھ/ ۱۳۷۱ء-۸۵۲ھ ۱۴۴۹ء) کی اصول حدیث کی مشہور کتاب ''نخبة الفكر في مصطلح اہل الاثر'' کی اردو میں شرح ہے، چھوٹے سائز کے (۸۴) چوراسی صفحے میں ہے۔

۲۶. مفتاح العوامل شرح مئة عامل، یہ کتاب امام عبدالقاہر جرجانی (ابوبکر عبدالقاہر بن عبدالرحمن بن محمد جرجانی: ۴۰۰ھ ۱۰۰۹ء- ۴۷۱ھ/ ۱۰۷۸ء) کی فن نحو کی مشہور کتاب ''شرح مئة عامل'' کی اردو میں گراں قدر شرح ہے۔ یہ شرح دراصل شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد ہاپوڑی مرادآبادی نوراللہ مرقدہ نے کی تھی، اس کا مسودہ عرصے تک حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ (۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء-۱۴۳۸ھ/ ۲۰۱۷ء) کے پاس محفوظ رہا مفتی صاحب نے وہ مسودہ ان سے لے کر اس پر دیدہ ریزی سے نظر ثانی کیا اور مولانا خورشید انور گیاوی استاذ دارالعلوم نے اسے مرتب ومکمل کیا، النوع الاول کے نصف کے بعد کی ترکیب نحوی رہ گئی تھی، اس

کا اضافہ کیا۔ یہ کتاب چھوٹے سائز پر دو سو بہتر (۲۷۲) صفحے میں ہے۔

۲۷. گنجینۂ صرف، یہ اردو میں صرف کی مشہور کتاب ''پنج گنج'' کی شرح ہے، یہ شرح بھی حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ کے قلم سے ہے۔ مفتی صاحب نے اس کا مسودہ بھی حضرت مولانا ریاست علیر حسے حاصل کر کے اس پر نظر ثانی کی اور اس کو مرتب و مکمل کر کے اپنے مکتبہ، مکتبۂ حجاز سے شائع کیا، یہ کتاب چھوٹے سائز کے دو سو پچپن (۲۵۵) صنے میں ہے۔

۲۸. علمی خطبات، یہ مفتی صاحب کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے، جو اُنھوں نے رمضان المبارک کے مہینے میں بیرون ملک بالخصوص برطانیہ، کناڈا وغیرہ میں کیں، ان کے صاحب زادوں نے انھیں مرتب کیا اور مفتی صاحب نے لفظ لفظ ان کو پڑھا تھا، اس کے بعد یہ تقریریں شائع کی گئیں، گویا یہ بھی ان کی تالیف ہی ہے۔ پہلا حصہ چھوٹے سائز پر (۳۰۴) تین سو چار صفحات میں اور دوسرا حصہ (۲۷۱) دو سو اکہتر صفحات میں ہے۔

۲۹. تذکرۂ مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویانِ کتبِ حدیث، اِس کتاب میں خلفاے راشدین، عشرہ مبشرہ، ازواجِ مطہرات، بناتِ طیبات، فقہاے سبعہ، مجتہدین امت، محدثین کرام، راویان کتب حدیث، شارحین حدیث، فقہاے امت، مفسرین عظام، متکلمین اسلام وغیرہ کا انتہائی اختصار کے ساتھ تذکرہ ہے۔ یہ کتاب چھوٹے سائز کے اَسی (۸۰) صفحے میں ہے۔

۳۰. دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، یہ کتاب مفتی صاحب کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے، جو اُنھوں نے غیر مقلدین کے ردّ میں لندن میں اور جون ۲۰۰۴ء میں ہندو پور اور شہرِ مدراس میں کیں، پھر ان پر نظر ثانی کی اور رحمۃ اللہ الواسعۃ سے دین کی بنیادی باتوں کا اضافہ کیا، اب یہ مذکورہ نام سے چھوٹے سائز کے (۹۶) چھیانوے صفحے میں چھپتی رہتی ہے۔

۳۱. داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اِس کتاب میں داڑھی پر کیے جانے والے

اعتراضات کے جوابات کے علاوہ انبیا کی سنتوں کو بیان کیا گیا ہے، جیسے ناخن تراشنا، بغل کے بال لینا، مسواک کرنا وغیرہ۔ یہ کتاب چھوٹے سائز کے ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) صفحے میں ہے۔

۳۲۔ عصری تعلیم ضرورت، اندیشے، تدبیریں، لڑکیوں کو سرکاری اسکولوں میں عصری تعلیم دلانے کے سلسلے میں مشکلات و نقصانات پر غور کرنے کے لیے، علاقۂ پالن پور میں قائم اصلاحی جماعت نے ۱۰ ربیع الاخر ۱۴۲۷ھ مطابق ۹ مئی ۲۰۰۶ء کو ایک اجتماع منعقد کیا اور مفتی صاحب کو مذکورہ مسئلے پر خطاب کے لیے مدعو کیا۔ اُنھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کو کتاب کی صورت میں، شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم چھاپی، گجرات نے شائع کیا۔ یہ کتاب چھوٹے سائز کے پچپن (۵۵) صفحات میں ہے۔

۳۳۔ اسلام تغیر پذیر دنیا میں، یہ کتاب جو چھوٹے سائز میں ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات میں ہے، ان چار مقالات کا مجموعہ ہے، جو علی گڑھ مسلم یونیورٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سمیناروں اور جلسوں میں پڑھے گئے۔ پہلے مقالے کا عنوان ''اسلام تغیّر پذیر دنیا میں'' ہے جو مفتی صاحبؒ کے قلم سے ہے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا۔ دوسرے مقالے کا عنوان ''فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ'' ہے، یہ بھی مفتی صاحبؒ ہی کا لکھا ہوا ہے، یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سمینار میں پڑھا گیا۔ تیسرا مقالہ بہ عنوان ''فقہ حنفی میں فہم معانی کے اصول'' ہے، یہ حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ کی تحریر کردہ ہے، یہ بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سمینار میں پڑھا گیا۔ چوتھا مقالہ جو ''نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟'' سے مَعنُوَن ہے۔ مفتی صاحب کا نتیجۂ فکر ہے۔ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جامع مسجد میں پیش کیا گیا۔

۳۴۔ حرمتِ مُصَاہَرَت، یہ کتاب چھوٹے سائز کے اسی (۸۰) صفحے میں ہے۔ اس میں سسرالی اور دامادی رشتوں کے مکمل احکام اور ناجائز انتفاع کا حکم ذکر کیا گیا ہے۔

۳۵۔ حیاتِ امام طحاوی، یہ کتاب چھوٹے سائز کے چھیانوے (۹۶) صفحات میں ہے۔ اس میں امام طحاوی

کے تذکرے کے ساتھ، شرحِ معانی الآثار کا تعارف اور اس کی شروح کا جائزہ شامل ہے۔

۳۶. حیاتِ امام ابوداود، یہ کتاب چھوٹے سائز کے اسی (۸۰) صفحات میں ہے، اس کتاب میں امام صاحب کے حالات، سنن ابی داود کا تعارف، اس کی شرحوں اور متعلقات کا جائزہ شامل ہے۔

۳۷. جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم، یہ کتاب چھوٹے سائز پر (۸۹) چھیاسی صفحات میں چھپی ہوئی ہے۔ رجب ۱۴۳۹ھ/اپریل ۲۰۱۸ء میں حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ (۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء-۱۴۳۹ھ/ ۲۰۱۸ء) پر دارالعلوم وقف دیوبند نے سمینار کیا جس میں کبار اساتذہ ومنتظمین دارالعلوم کو بھی مدعو کیا گیا، دیگر لوگوں نے شرکت کی لیکن مفتی صاحب نے دلائل کی روشنی میں مذکورہ سمینار کو جلسۂ تعزیت مانتے ہوے، اس میں شرکت نہیں کی، جس سے علمی مناقشے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مفتی صاحب نے اپنی عدم شرکت پر علمی انداز میں جو کچھ لکھا، نیز دیگر لوگوں نے تحریری طور پر جو کچھ کہا، اس کو اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، جس سے کتاب دستاویزی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

۳۸. تسہیلِ ادلۂ کاملہ، یہ کتاب متوسط سائز کے دوسوبتیس (۲۳۴) صفحات میں ہے، یہ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوتی ہے، یہ کتاب غیر مقلدوں کے دس سوالات اور ان کے حقیقی جوابات پر مشتمل ہے، یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیرح (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء- ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کی تصنیف ہے۔ مفتی صاحب نے اس کی تسہیل کی ہے اور اُن کے برادر خرد مولانا مفتی محمد امین پالن پوری نے اس کی ترتیب وتزیین کی ہے۔

۳۹. تحقیق وتحشیہ ایضاح الادلہ، یہ کتاب متوسط سائز کے (۶۷۱) چھ سو اکہتر صفحات میں شیخ الہند اکیڈمی سے طبع ہوتی ہے، غیر مقلدوں کے دس سوالوں کے جوابات کی شرح ووضاحت خود شیخ الہند نے کی تھی، مفتی صاحب نے تحقیق وتحشیہ کا کام کیا ہے اور مولانا مفتی محمد امین پالن پوری نے ترتیب وتزیین کی ہے۔

۴۰. کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟، یہ کتاب حضرۃ الامام محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی کتاب ''توثیق الکلام والدلیل المحکم'' کی شرح ہے۔ یہ چھوٹے سائز کے ایک سوانسٹھ (۱۵۹) صفحے میں ہے۔

۴۱. اِرشاد الفہوم شرح سلم العلوم، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ قاضی محب اللہ بن عبد الشکور بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کی فن منطق کی مشہور ومتداول غیر معمولی کتاب ''سلم العلوم'' کی اردو شرح ہے۔ یہ چھوٹے سائز کے (۳۸۴) تین سو چوراسی صفحات میں ہے۔

۴۲. کامل برہان الٰہی، یہ کتاب متوسط سائز میں چار (۴) جلدوں میں ہے، پہلی جلد پانچ سو چھیاسٹ (۵۶۶) صفحات کی ہے، دوسری پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) کی، تیسری بھی پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) صفحات کی، جب کہ چوتھی (۶۱۴) چھ سو چودہ صفحات کی ہے کل صفحات تئیس سو (۲۳۰۰) ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں وہ مضامین ہیں جو مفتی صاحب نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے ہر مبحث کے شروع میں اس کے مشمولات کو سمجھانے کے لیے لکھے ہیں، قارئین کی خواہش پر ان کی رائے ہوئی کہ ان مضامین کو علاحدہ کتاب میں شائع کر دیا جائے، تاکہ جو لوگ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں شاہ صاحب کی عربی عبارت کی بہ جائے صرف شاہ صاحب کی مراد کو جاننا چاہیں وہ مفتی صاحب کے ان مضامین ہی کو پڑھ لیا کریں۔

۴۳. محفوظات، یہ کتاب چھوٹے سائز میں تین حصوں میں ہے، تینوں حصوں کے مجموعی صفحات (۱۱۲) ایک سو بارہ ہیں۔ اس میں مفتی صاحب نے طلبہ کو یاد کرانے کے لیے کچھ آیتیں اور احادیث مع ترجمۂ اردو درج کی ہیں۔ پہلے حصے میں چھوٹی چھوٹی آیتیں اور احادیث ہیں، دوسرے میں پہلے سے کچھ بڑی اور تیسرے میں ان سے بھی بڑی؛ تاکہ تدریجاً طلبہ کی استعداد کے مطابق انھیں سمجھنا اور یاد کرنا آسان ہو۔

۴۴. مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے، یہ کتاب چھوٹے سائز کے چونسٹھ (۶۴) صفحات میں ہے، ردّ

قادیانیت اور مسئلہ ختم نبوت پر یہ بہت قیمتی رسالہ ہے۔ دارالعلوم کا ''کل ہند تحفظ ختم نبوت'' شعبہ اس کی اشاعت کرتا رہتا ہے۔

۴۵. تعددِ ازواجِ رسول پر اعتراضات کا علمی جائزہ، یہ کتاب مفتی صاحب کی دورانِ تدریس حدیث مذکورہ موضوع پر تقریر ہے، جو بنگلہ دیش کے ایک فاضل دارالعلوم اور مفتی صاحب کے شاگرد مولانا کمال الدین شہاب قائی نے مرتب کر کے دارالنشر ڈھاکہ بنگلہ دیش سے چھوٹے سائز کے تریسٹھ (۶۳) صفحات میں شائع کی ہے۔

۴۶. تہذیب المغنی، ''المغنی'' علامہ محمد بن طاہر بن علی پٹنی (۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء-۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء) کی اسماء الرجال پر اہم کتاب ہے مفتی صاحب نے اس کی عربی شرح لکھنی شروع کی تھی، صرف باب الراء تک لکھ سکے تھے اس لیے وہ شائع نہ ہوسکی۔

۴۷. زبدۃ الطحاوی، امام طحاوی کی ''معانی الآثار'' کی عربی تلخیص ہے۔ چونکہ مدارس میں یہ کتاب جہاں تک پڑھائی جاتی ہے، وہیں تک کام کر سکے تھے، اس لیے اس کو شائع نہیں کیا۔

۴۸. مفتی صاحب کے بہت سے فتاوی ان کے ذاتی رجسٹروں اور دارالعلوم کے دارالافتا کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔ اُنھیں دیگر علمی کاموں سے فرصت نہیں ملی اس لیے انھیں مُدَوَّن کر کے شائع نہ کر سکے۔

پس ماندگان

۱۹۶۵ء/ ۱۳۸۴ھ میں مفتی صاحب کی شادی اپنے ماموں مولوی حبیب الرحمن شیرؔا کی بڑی صاحب زادی سے ہوئی، مفتی صاحب نے اپنی اہلیہ کی نہ صرف صلاح وتقوی اور صبر شکر پر پرورش کی، بل کہ انھیں جیّد حافظ قرآن بنایا جس کی وجہ سے یہ ہوا کہ انھوں نے امور خانہ داری کو بہ خوبی انجام دیتے ہوئے اپنے بچے اور بچیوں کو بل کہ اپنی بہوؤں کی بھی حفظ قرآن کی سعادت عظمی سے نوازا۔ قابل ذکر ہے کہ وقتِ تحریر مفتی صاحب کی ۱۳۱ اولاد واحفاذ واسباط اور پانچ بہوویں حافظ قرآن ہیں، یاد رہے کہ بہ راہ راست اولاد اور مفتی صاحب کے پوتوں، پوتیوں

اور نواسے نواسیوں کی تعداد ۳۳ ہے۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مفتی صاحب کی اہلیہ کا ۱۴۳۲ھ/۲۰۱۱ء میں انتقال ہو چکا، دو صاحب زادوں کی بھی وفات ہو چکی ہے، ایک پسرِ اکبر مولوی مفتی رشید احمد مولود ۴/ جمادی الاخری ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۰ ستمبر ۱۹۶۶ء کی جن کی ایک حادثے میں ۵/ شوال ۱۴۱۵ھ مطابق ۷ مارچ ۱۹۹۵ء کو شہادت ہوئی۔ ان کے دو لڑکے ہیں: مولوی مفتی مسیح اللہ فاضلِ دار العلوم دیوبند جو ممبئی کے ایک مدرسے میں مدرس ہیں اور اپنی والدہ (جن کی دوسری شادی ہو چکی ہے) کے ساتھ ممبئی ہی میں سکونت پذیر ہیں، دوسرا لڑکا سمیع اللہ حافظِ قرآن ہے، وہ ممبئی کے ایک مکتب میں معلم ہے اور ممبئی ہی میں اپنی والدہ کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔

پسرِ ثانی مولانا حافظ سعید احمد مولود یکم ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق یکم فروری ۱۹۶۸ء ہدایہ تک تعلیم یافتہ تھے اور سورت کے ایک مدرسے میں حفظ کے استاذ تھے، مدرسے کا نام دار العلوم محلّہ رام پورہ ہے۔ پانچ چھ سال سے راندیر سے کسی مدرسے میں مدرس تھے اور وہیں بروز منگل: ۲۸/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۹/ نومبر ۲۰۱۹ء وہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور وہیں مدفون ہوئے۔

ایک صاحب زادی، جو چوتھے نمبر کی اولاد تھی اور جس کی تاریخ پیدائش ۱۳/ جمادی الاول ۱۳۹۱ھ مطابق ۷/ جولائی ۱۹۷۱ء ہے، بہت جلد بہ مقام راندیر، بروز جمعہ: ۱۲/ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ مطابق ۲۰/ اپریل ۱۹۷۳ء، داغِ مفارقت دے گئی۔

باقی اولاد الحمد للہ زندہ بخیر ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- مولانا وحید احمد مولود ۱۷/ جمادی الاولی ۱۳۸۹ھ مطابق ۲/ اگست ۱۹۶۹ء، فاضلِ دار العلوم ہیں، ۱۵ سال سے دمن کے مدرسہ نور الاسلام میں درس و تدریس میں مشغول ہیں۔

۲- مولانا حسن احمد مولود المحرم ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۸/ فروری ۱۹۷۳ء، دار العلوم دیوبند سے فراغت

کے بعد مفتی صاحب نے انھیں اپنی کتابوں کی کمپیوٹر سے ٹائپ کرنے کی ذمے داری سپرد کی، اب وہ اس کام کے ماہر بن گئے ہیں چناں چہ اُنھوں نے روشن کمپیوٹر کے نام سے کمپوزنگ کا باقاعدہ ادارہ قائم کرلیا ہے۔

۳- مولانا مفتی حسین احمد مولود ۲/ جمادی الاخری ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۴/ جون ۱۹۷۴ء۔ دارالعلوم کے فاضل ہیں، ذی استعداد ہیں مختلف مدرسوں میں تدریسی خدمت انجام دے چکے ہیں، جس کے دوران بخاری و مسلم وترمذی شریف پڑھا چکے ہیں۔ مفتی صاحب کی ترمذی کی شرح ''تحفۃ الالمعی'' اور بخاری کی شرح ''تحفۃ القاری'' تھی نے مرتب کی ہے اور اب مسلم کی شرح کو مرتب کررہے ہیں، جس کی ایک جلد مفتی صاحب کی زندگی میں آچکی ہے، اب اس کے بعد کی جلدوں پر کام کررہے ہیں۔ اپنے ذاتی مکان میں ''معہد الفقہ النعمانی'' کے نام سے ایک ادارہ کے بانی و مدیر بھی ہیں، جس میں فضلائے مدارس کے لیے فقہ وافتا میں مہارت یابی کا انتظام ہے۔

۴- مولانا محمد ابراہیم سعیدی مولود شعبان ۱۳۹۶ھ/ اگست ۱۹۷۶ء، دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد سے ہی ضلع ہاپوڑ کے ایک گاؤں'' کورانہ'' میں مدرسہ نافع العلوم میں تقریباً بائیس ۲۲ سال سے مدرس ہیں، وہاں کے صدر مدرس اور ناظم تعلیمات بھی ہیں اور فقہ وحدیث کی کتابوں کا درس بھی دیتے ہیں۔

۵- حافظ محمد قاسم مولود ۵/ ربیع الآخر ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۵/ مارچ ۱۹۷۸ء درجہ سوم عربی تک تعلیم حاصل کی، اب تجارتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں، دیوبند میں قاضی مسجد کے قریب'' مکتبہ حجاز'' کے مینجر ہیں۔

۶- حافظہ عائشہ مولود صفر ۱۳۹۹ھ/ جنوری ۱۹۷۹ء، بڑی صاحب زادی کا نام بھی عائشہ تھا، ان کا دوڈھائی سال میں انتقال ہوگیا تو مفتی صاحب نے اُس کے بعد متولد ہونے والی بچی کا نام بھی عائشہ ہی رکھا، جو اس وقت دو بہنوں میں بڑی بہن ہے۔ حفظ قرآن کے بعد بنیادی دینی تعلیم حاصل کی، اپنی بچیوں کو عائشہ سلمہا نے خود ہی حفظ کرایا اور ان کی مزید تعلیم وتربیت کی ذمے داری ادا کررہی ہیں۔ مفتی اسامہ پالن پوری فاضل دارالعلوم کی اہلیہ ہیں، جو جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں درجات متوسط وعلیا کی کتابیں پڑھاتے ہیں فقہی ضوابط، مسائل

المیز ان،تحفۃ الفقہ ،فقہی اصول اور’’تاسیس النظر‘‘ کی شرح وغیرہ کے مصنف بھی ہیں۔

۷۔مفتی محمد سعید مولود ربیع الاخر۱۴۰۱ھ/فروری۱۹۸۱ء، دارالعلوم سے فراغت کے بعد مفتی صاحب کے علمی خطبات کومرتب کرنے کا کام کیا۔مظفرنگر کے کشن پور کے مدرسہ بحرالعلوم میں پانچ سال تدریسی خدمت کے بعد گیارہ سال سے جامعۃ الامام محمد انور دیوبند میں درجات علیا کی کتابوں کی تدریس ان کے سپرد ہے۔

۸-مولانا احمد سعید مولود ۴/صفر ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۱/نومبر ۱۹۸۲ء، دارالعلوم کے فاضل ہیں، پندرہ سال سے دیوبند کے مدرسہ جامعۃ الشیخ حسین احمد مدنی میں درجات علیا کے مدرس ہیں۔

۹-حافظہ فاطمہ سلمہا مولود ۱۱/جمادی الاولی ۱۴۰۵ھ مطابق ۲/فروری ۱۹۸۵ء، حفظ قرآن کے بعد بنیادی دینی تعلیم سے بہرہ ور ہیں۔’’گھٹامن‘‘ پالن پور کے مدرسہ جامع نورالعلوم کے بانی و مہتمم مرحوم جناب حنیف صاحب کھروڈیہ کے صاحب زادے حافظ بلال کی اہلیہ ہیں، حافظ بلال کی بود وباش ممبئی میں ہے، جہاں وہ تجارت سے وابستہ ہیں۔مفتی صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام اُنھی صاحب زادی کے یہاں گزارے اور ممبئی کی خاک کا ہی پیوند بنے۔

۱۰-قاری حافظ عبداللہ سعید مولود: ۷/رجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹/مارچ ۱۹۸۶ء، حفظِ قرآن کے بعد مدرسہ اسلامیہ ریڑھی تاج پورہ، سہارن پور سے تجوید وقراءت کی سند حاصل کی، اِس وقت دیوبند میں تجارتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

۱۱-حافظ عبید اللہ مولود ۹/صفر ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۲/ستمبر ۱۹۸۸ء، حافظ قرآن ہیں اور بنیادی دینی تعلیم سے بھی بہرہ یاب ہیں، مکتبہ حجاز دیوبند میں تجارتی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔

تحریر کردہ ۱۱ بجے: جمعہ ۲۶/شوال ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/جون ۲۰۲۰ء

حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ

فکرِ ولی اللہی کے مستند شارح

حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب
بانی وڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحبؒ کی وفات کا صدمہ ابھی تازہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سعید احمد پالنپوری بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ حسب معمول نیند سے بیدار ہو کر موبائل فون کھولا تو کراچی کے ڈاکٹر ثناء اللہ محمود کے اکاؤنٹ پر حضرت مفتی صاحبؒ کے فرزند مولانا قاسم احمد پالنپوری کا میسج رنج وغم کا ایک نیا طوفان لیے نگاہوں کے سامنے موجود تھا کہ ''انتہائی رنج وغم کے ساتھ یہ خبر صاعقہ اثر لکھی جارہی ہے کہ ہمارے والد محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند آج بتاریخ ۱۹ مئی مطابق ۲۵ رمضان المبارک بروز منگل بوقت چاشت اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ مفتی صاحبؒ کی علالت کی خبریں کئی روز سے آرہی تھی مگر گزشتہ روز ایک میسج نے تشویش میں اضافہ کر دیا تھا جو آج حقیقت میں بدل گئی اور عالم اسلام کی یہ عظیم علمی شخصیت، محدث، فقیہ، متکلم اور ہزاروں علماء کرام کے شفیق استاذ اپنا سفر زندگی مکمل کر کے دار باقی کی طرف روانہ ہو گئے۔

مولانا پالنپوریؒ کے تعارف کے لیے اس کے بعد مزید کسی بات کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی علمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے اور انہوں نے سالہا سال تک اس مرکز علم

میں ہزاروں تشنگان علوم کو مسلسل فیضیاب کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا یہ منصب ہمیشہ اپنے دور کی ممتاز ترین علمی شخصیات کے ساتھ مخصوص رہا ہے جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ، خاتم المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطین علم وفضل کے نام آتے ہیں، اور ان کے ساتھ کسی فہرست میں نام کا شمار ہونا بجائے خود کسی بڑے سے بڑے علمی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ مگر حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ ہر صاحب علم وفضل کی طرح اپنے کچھ امتیازات اور خصوصیات بھی رکھتے تھے جن کے باعث وہ اپنے معاصرین میں ایک الگ شان کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتے تھے اور ان کی آرا وافکار کو اہل علم کے حلقوں میں رہنمائی اور استفادہ کے لیے مرجع کی حیثیت حاصل تھی۔

مجھے متعدد باران کی زیارت وملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے قیام کے بعد اپنے عہد کی جن ممتاز علمی وفکری شخصیات نے اس کے علمی پروگراموں کو رونق بخشی، ان میں حضرت پالنپوریؒ بھی شامل ہیں۔ لندن کے مرکز ختم نبوت اسٹاک ویل گرین میں ورلڈ اسلامک فورم کی ایک فکری نشست میں وہ تشریف لائے اور عصر حاضر میں علماء کرام کی ذمہ داریوں کے عنوان سے انہوں نے بلیغ خطاب فرمایا۔ دور حاضر کے فکری ونظریاتی فتنوں پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وہ علمائے کرام اور دینی حلقوں کو اپنے مخصوص انداز میں ان سے باخبر کرتے رہتے تھے۔ یہ خطاب بھی ان کے اسی ذوق کا آئینہ دار تھا، پھر ایک بار نیویارک میں ''شریعۃ بورڈ'' کے مولانا مفتی نعمان احمد کے ہاں ان کی زیارت ہوئی اور کچھ دیر ان کی مجلس وگفتگو سے شادکام ہونے کا موقع ملا۔ ان دنوں والد گرامی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا تھا اس لیے زیادہ دیر انہیں کی باتیں ہوتی رہیں بلکہ گوجرانوالہ کے ایک لوکل اخبار نے حضرت والد محترم کے حوالے سے خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا تھا جس کی ایک کاپی حضرت پالنپوریؒ کی خدمت میں پیش کی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے تبصرہ فرمایا۔ اس کے علاوہ بعض ممتاز اہل علم کے کچھ علمی وفقہی تفردات بھی

زیر بحث آئے جن کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ تفردات اور انفرادی آرا کو اگر باقاعدہ موقف بنا کر سامنے نہ لایا جائے تو بہت سی الجھنوں سے بچا جا سکتا ہے۔ خود میرا ذوق بھی ان معاملات میں یہی ہے اس لیے یہ گفتگو کافی دلچسپ رہی۔

میں نے ایک موقع پر کسی مجلس میں عرض کیا کہ ہم درس نظامی کے نصاب میں علم کلام کے موضوع پر بنیادی کتاب شرح العقائد'' پڑھاتے ہیں جو یونانی فلسفہ کے پیدا کردہ اعتقادی و کلامی مباحث کے حوالے سے ہے اور اہل سنت کے عقائد کے بنیادی ڈھانچے سے آگاہی کے لیے وہ از حد ضروری ہے، مگر آج کے دور میں ہمیں جن عقائد و افکار کا سامنا ہے ان کا بیشتر حصہ مغربی فلسفہ و ثقافت کا پیدا کردہ ہے، اس لیے جدید مغربی فکر و فلسفہ نے جو مسائل کھڑے کیے ہیں ان کے بارے میں شرح العقائد کی دوسری جلد لکھنے کی ضرورت ہے جسے اس کے ساتھ ہی درسی طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔ بعض دوستوں نے اسی مجلس میں سوال کیا کہ یہ لکھے گا کون؟ میں نے عرض کیا کہ میری نظر میں اس وقت تین بزرگ ہیں جو اس کام کو صحیح اور بہتر طور پر کر سکتے ہیں (۱) حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم (۲) حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ اور (۳) حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ۔ ان میں سے دو تو ہم سے رخصت ہو گئے ہیں جبکہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کے لیے بلا مبالغہ جسم کا رواں رواں دعا گو رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا سعید احمد پالنپوریؒ کا امت کے اصحاب علم پر ایک عظیم احسان یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کی معرکۃ الآرا تصنیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی اردو و عربی دونوں زبانوں میں شرح لکھ کر علماء اور طلباء کی رسائی اس عظیم علمی ذخیرہ تک آسان کر دی ہے جو یقیناً ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں اور ان کے خاندان، تلامذہ اور مستفیدین کو ان کی حسنات سلسلہ تادیر جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں آمین یارب العالمین۔

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ

ایک مردم ساز شخصیت، لاثانی مدرّس، یکتا مصنّف

حضرت مولانا مفتی عبدالرؤوف غزنوی صاحب
فاضل وسابق استاذ وخطیب دالعلوم دیوبند
استاذِ حدیث جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو
جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

(اقبالؒ)

بروز منگل ۲۵؍ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء صبح ساڑھے چھ بجے (بہ وقتِ ہندوستان)، محدّثِ جلیل، مفسّرِ نبیل، فقیہِ ممتاز، عالمِ ربانی، مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم کا مستند شارح اور مسلکِ دارالعلوم دیوبند کا صحیح ترجمان، حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ شیخ الحدیث وصدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند نے ممبئی شہر کے ایک ہسپتال میں تقریباً اسی سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی وفات کی خبر نے صرف برِصغیر ہی میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں آپ کے پھیلے ہوئے بے شمار شاگردوں، متعلقین، محبین اور آپ سے براہِ راست یا بالواسطہ استفادہ کرنے والوں کو تڑپا دیا، جنہوں نے اپنے غمگین اور ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ تقدیرِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ماہِ مبارک کے آخری بابرکت عشرے میں حضرت مفتی صاحب قدّس سرّہ کے لیے خوب ایصالِ

ثواب کیا اور مغفرت ورفعِ درجات کی دعائیں کیں، اور ساتھ ساتھ انہوں نے حضرت قدّس سرُّہ کے پسماندگان اور دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران کی خدمت میں تعزیتِ مسنونہ پیش کی۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی پیدائش خود اُن کے اندازے کے مطابق ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ کو ہوئی ہے، جس کی صراحت انہوں نے ''ہدایت القرآن'' جلد ششم کی ابتداء میں ''احوالِ واقعی'' کے عنوان کے تحت فرمائی ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے میں اور متوسط درجات کی تعلیم ''مظاہرِ علوم'' سہارنپور میں حاصل کی، اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۳۸۰ھ کو ''دارالعلوم دیوبند'' میں داخلہ لیا، جہاں ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء کو آپ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کرتے ہوئے سالانہ امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ دورانِ تعلیم آپ کو اپنے تمام اساتذۂ کرام اور بالخصوص حضرت علّامہ محمد ابراہیم بلیاوی صاحب قدّس سرُّہ صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند کی خصوصی توجہ وشفقت حاصل رہی۔

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد تکمیلِ افتاء میں داخلہ لیا اور فتویٰ نویسی میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ دارالافتاء کے ذمہ داران نے تحریری طور پر آپ کی تقرّری کی سفارش کی۔ اُدھر آپ کے محترم استاذ ومربی حضرت علّامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند کی بھی یہی خواہش تھی کہ آپ کا تقرُّر دارالعلوم دیوبند ہی میں ہو، لیکن تقدیرِ خداوندی کچھ اور تھی اور آپ کا تقرُّر دارالعلوم میں اس وقت نہ ہوسکا۔ اس موقع پر آپ کے محترم استاذ حضرت علّامہ بلیاویؒ نے آپ کو تسلّی دیتے ہوئے ایک مختصر اور پُراثر جملہ ارشاد فرمایا کہ: ''مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اس سے اچھے آ ؤ گے۔'' اور آپ کو اپنی دعاؤں اور نصیحتوں سے نوازتے ہوئے ''دارالعلوم اشرفیہ راندیر-سورت'' جانے کا مشورہ دیا، جہاں درجہ عُلیا کے مدرّس کی حیثیت سے ۱۳۸۴ھ کو آپ کا تقرُّر عمل میں آیا۔

''دارالعلوم اشرفیہ'' میں آپ نے نو سال تک خدمت کی۔ ان نو سالوں میں اپنی خداداد ذہانت، عزم و ہمّت، مسلسل محنت اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق سے ایک طرف تو نہایت کامیابی کے ساتھ مختلف فنون اور حدیث کی کتابیں پڑھاتے رہے اور دوسری طرف تصنیف و تالیف اور مضمون نویسی کا مشغلہ بھی جاری رکھا اور ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا، علمی حلقوں میں آپ کی شہرت اور طلبہ میں آپ کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔

آپ کی مقبولیت اور مختلف صلاحیتوں کے پیشِ نظر حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سابق رکنِ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی تحریک پر ۱۳۹۳ھ کو آپ کا تقرّر اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں ہوگیا، جہاں آپ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا بھرپور موقع ملا اور آپ کے استاذِ محترم و مربی حضرت مولانا علّامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (متوفّٰی: ۱۳۸۷ھ) کا اگرچہ اس وقت انتقال ہوگیا تھا، تاہم ان کا مذکورہ بالا جملہ ''مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اس سے اچھے آؤ گے۔'' پورے نو سال کے بعد ہو بہو ثابت ہوگیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ اُس وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک جو اَڑتالیس سال کا عرصہ ہے، اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے منسلک رہے، جہاں آپ نے نصاب کے اندر شامل' فقہ، اُصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، عقائد، مناظرہ، ادب، میراث، تفسیر، اُصولِ تفسیر، حدیث اور اُصولِ حدیث کی مختلف کتابیں نہایت کامیابی کے ساتھ پڑھائیں اور طلبہ میں آپ کی مقبولیت اس حد تک بڑھ گئی کہ جس کتاب کا سبق آپ سے متعلق ہوجاتا، اس کتاب کے طلبہ بے حد مطمئن ہوکر اپنے آپ کو سعادت مند تصوّر کرتے۔

آپ نے دارالعلوم دیوبند میں بھی تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا۔ دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے میں بنیادی اور محنت طلب کتابوں کی تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھنا اگرچہ کوئی آسان کام نہیں تھا، لیکن عزم و ہمت کے اس پیکرِ مجسّم نے مختصر عرصے میں تدریس کے ساتھ ساتھ اسلامی کتب خانے کو اپنی ایسی ضخیم اور تحقیقی تصانیف سے معمور کردیا، جن سے علم و تحقیق کے میدان سے وابستہ

حضرات حیرت زدہ ہوکر رہ گئے، چنانچہ مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عدیم المثال تصنیف "حجۃ اللّٰہ البالغۃ" کی ایک محقّق و مفصّل شرح کی ضرورت ہمارے اکابرین کے دور سے محسوس کی جارہی تھی، تاہم اس اہم تحقیقی کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ ہی کو منتخب فرمایا اور آپ نے پانچ ضخیم جلدوں میں "رحمۃ اللّٰہ الواسعۃ" کے نام سے اس کی شرح لکھی، جسے علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔

"رحمۃ اللّٰہ الواسعۃ شرح حجۃ اللّٰہ البالغۃ" کی اہمیت کو دیکھ کر دارالعلوم دیوبند کی مؤقر مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۱۳/ ۱۴/ صفر ۱۴۲۵ھ نے ایک تحریری تجویز پاس کی، جس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے اس علمی کارنامے کو پوری جماعت کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرنے کے مرادف قرار دیتے ہوئے آپ کو مبارکباد پیش کی گئی ہے۔ احقر کے ناقص علم کے مطابق اس سے قبل کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے کسی کتاب سے متعلق تحریری تجویز پاس کی ہو، جس میں مصنف کو ان کی تصنیف پر مبارکباد پیش کی گئی ہو، واللہ اعلم۔ "رحمۃ اللّٰہ الواسعۃ" کے علاوہ آپ نے آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ترمذی شریف کی شرح "تحفۃ الألمعي شرح سنن الترمذي" کے نام سے، بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل بخاری شریف کی شرح "تحفۃ القاري شرح صحیح البخاري" کے نام سے اور آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآن کریم کی تفسیر "ہدایت القرآن" کے نام سے تحریر فرماکر یہ ثابت کردیا کہ آج کے پُرآشوب و پُرفتن دور میں بھی حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علّامہ جلال الدین سیوطیؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے مصنفین کے نقشِ قدم پر چلنے والے اور اپنے آپ کو علمی و تحقیقی کاموں کے لیے وقف کرنے والے افراد موجود ہیں۔

متعدّد ضخیم جلدوں پر مشتمل مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ آپ نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں ایک کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مایۂ ناز تفسیر "بیان القرآن" کے تسہیل

نگارحضرت مولانا عقیدت اللہ قاسمی صاحب زید مجدہم کی خواہش اور حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کے مشورے سے تسہیل کا مسوّدہ آپ ہی کے حوالے کیا گیا، جس پر آپ نے شروع سے آخر تک نظرثانی فرماکر اس میں مفید ترمیمات واضافے کردیئے اور پانچ جلدوں میں ''آسان بیان القرآن'' کے نام سے شائع فرمادیا، جس سے ''بیان القرآن'' کا سمجھنا آسان ہوگیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے مذکورہ بالا تصانیف کے ساتھ ساتھ مختلف علمی موضوعات سے متعلق دیگر تصانیف بھی تحریر فرمائی ہیں، جن کی مجموعی تعداد مذکورہ بالا تصانیف کے ساتھ ملاکر چھیالیس بنتی ہے اور ہر ایک کتاب اپنی جگہ پر اہمیّت رکھتی ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض کتابیں تو دارالعلوم دیوبند اور ہندوستان کے بعض دیگر مدارس اور اسی طرح ''وفاق المدارس العربیہ پاکستان'' کے نصابِ تعلیم میں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ آپ کے ہونہار صاحبزادے جناب مولانا احمد سعید صاحب پالن پوری فاضل دارالعلوم دیوبند زید مجدہم کے ایک مراسلہ کے مطابق حضرت مفتی صاحبؒ کی کل تصانیف کے مجموعی صفحات کی تعداد تینتیس ہزار چھ سو چوراسی (۳۳۶۸۴) تک جاپہنچتی ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی مختلف صلاحیتوں، طلبہ میں بے پناہ مقبولیت، علمی حلقوں میں محبوبیت اور آپ کی تقویٰ وطہارت کے پیشِ نظر دارالعلوم دیوبند کی مؤقر وبااختیار مجلسِ شوریٰ نے ۱۴۲۹ھ کو جب حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خان صاحب قدّس سرُّہ سابق شیخ الحدیث وصدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند نے بوجہ علالت وپیرانہ سالی دارالعلوم کی خدمت سے ازخود سبکدوشی کی درخواست کی، شیخ الحدیث وصدر المدرّسین کے اعلیٰ علمی منصب کے لیے آپ ہی کا انتخاب فرمایا، جس پر آپ اپنی وفات ۱۴۴۱ھ تک فائز رہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت مفتی صاحبؒ کی چند خصوصیات

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قُدِّس سرُّہ سے احقر کا تعلق رواں صدی ہجری کے پہلے سال ۱۴۰۱ھ سے لے کر آپ کے وصال ۱۴۴۱ھ تک پورے چالیس سال پر محیط رہا ہے، شروع کے گیارہ سال کا عرصہ تو وہ ہے جس میں احقر طالب علم اور پھر مدرس اور مسجدِ قدیم دارالعلوم دیوبند کے امام وخطیب کی حیثیت سے دارالعلوم ہی میں مقیم رہا اور حضرت مفتی صاحبؒ سے قدم قدم پر بالمشافہہ استفادہ کرتا رہا۔ اس کے بعد آپ کے وصال تک جو مزید انتیس سال کا عرصہ بنتا ہے، اس میں احقر کی دیوبند سے کراچی منتقلی کی وجہ سے بالمشافہہ استفادے کا موقع تو ہاتھ سے نکل گیا، اِلاّ یہ کہ وقفے وقفے سے چند دفعہ آپ کی خدمت میں حاضری اور براہِ راست استفادے کی سعادت پھر بھی میسر رہی، تاہم! باقی عرصے میں خط وکتابت اور فون کے ذریعے آپ سے استفادے اور موقع بموقع راہنمائی حاصل کرنے کا سلسلہ آپ کے وصال تک اللہ کی توفیق سے قائم رہا اور آپ نے احقر کو کبھی بھی اپنے علمی افادات اور مفید مشوروں سے محروم نہیں فرمایا۔

اس طویل عرصے کے اندر حضرت الاستاذؒ کو قریب سے دیکھنے اور آپ کی خصوصیات سے واقف ہونے کا ایک بھرپور موقع اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا۔ مذکورہ طویل واقفیت وتعلق کی روشنی میں احقر پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کے ہر پہلو میں اہلِ علم وفضل کے لیے مفید سبق اور آپ کے متعلقین کے لیے نشانِ راہ اور قابلِ تقلید بلکہ قابلِ رشک عملی کردار کے نمونے ہیں۔ آپ کی خصوصیات میں سے چند ہی خصوصیات قارئینِ کرام کے فائدے کے لیے قلمبند کی جا رہی ہیں۔

۱:......تدریس وتالیف کے لیے مکمل یکسوئی کا اہتمام

حضرت الاستاذؒ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے مطالعہ وتدریس اور تحقیق وتالیف کے لیے مکمل یکسوئی

اختیار فرماتے ہوئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ غیر ضروری ملاقاتوں، عام اجتماعات میں شرکت اور تعلیمی ایام میں سفر کرنے سے اس لیے اکثر معذرت ہی فرماتے تھے، تاکہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے مشغلے میں خلل واقع نہ ہو۔ فرماتے تھے کہ: ایک سبق کا ناغہ چالیس دن کی برکت کو ختم کر دیتا ہے۔ تاہم سالانہ چھٹیوں میں بیرونِ ملک مقیم ان مسلمانوں کے اصرار پر جو حضرت والاؒ کے اصلاحی وعلمی بیانات کو اپنی اور اپنی نئی نسل کی اصلاح کے لیے نہایت مفید اور ضروری سمجھتے تھے، برابر سفر فرماتے رہے اور اُن کے عقائد واعمال کی اصلاح کے لیے نہایت عام فہم اور مدلّل انداز میں بیانات فرماتے رہے، جن سے ان کو دیارِ غیر میں رہتے ہوئے اپنے لیے لائحۂ عمل طے کر لینے اور اپنے عقائد واعمال کی حفاظت کرنے میں مدد ملتی رہی۔ آپ کے بیانات عام خطیبوں کی طرح جوشیلے نہیں ہوتے تھے، بلکہ تدریس کے انداز میں قرآن وسنت کی تعلیمات پر مبنی اور فقہاء ومحدّثین واکابرِ دیوبند کی تشریحات کے مطابق ہوا کرتے تھے۔

احقر نے اپنی زندگی میں دو ایسی شخصیات دیکھی ہیں جو عالمی شہرت ومقبولیت کی بلندیوں تک پہنچنے کے باوجود اُن کے علمی وتحقیقی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا اور انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو غیر علمی مشاغل سے دور رکھا۔ ایک شخصیّت ممتاز عالمِ دین ومحدّثِ کبیر حضرت الاستاذ الشیخ عبد الفتاح ابوغُدّہ حَلَبی شامی قُدّس سرُّہ کی تھی جن سے ''جامعۃ الملک سعود ریاض سعودی عرب'' میں احقر نے پڑھا اور دوسری شخصیت حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری برَّد اللہ مضجعہٗ کی تھی جن سے احقر نے دار العلوم دیوبند میں پڑھا اور پھر طویل عرصے تک استفادہ بھی کرتا رہا۔

عصرِ حاضر میں ایک عام مشاہدہ یہ رہا ہے کہ جب بعض علمی شخصیات کو شہرت ومقبولیت حاصل ہو جاتی ہے اور اندرونِ ملک وبیرونِ ملک بے شمار لوگ ان کے معتقد بن جاتے ہیں تو پھر ان کے لیے اپنے معتقدین کی تقریبات واجتماعات میں شرکت سے معذرت کرنا، یا ان کی دعوت پر سفر سے اجتناب کرنا، یا اسی طرح دینی وعلمی اداروں

میں انتظامی مناصب کی پیشکش کو ردّ کرنا، ان کے لیے امتحان بن جاتا ہے اور بالآخر ان میں سے اکثر حضرات مذکورہ غیر تعلیمی سرگرمیوں میں ایک حد تک مشغول ہو ہی جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے علمی و تحقیقی کاموں کی رفتار میں ترقی کے بجائے سستی پیدا ہوجاتی ہے! لیکن کچھ حضرات اتنے باہمت و پر عزم اور اپنی علمی و تحقیقی مصروفیات میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ اپنی علمی مصروفیات کے مقابلہ میں کسی بھی ترغیب و مصلحت کا شکار نہیں ہوتے ہیں، ان ہی حضرات میں سے احقر کی نظر میں ایک حضرت الاستاذ الشیخ عبدالفتاح ابوغُدّہؒ اور دوسرے حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ بھی تھے۔

۲......عزم و ہمّت اور مسلسل محنت

حضرت والا قُدّس سرُّہ کی دوسری خصوصیت ان کی مسلسل محنت اور غیر معمولی عزم و ہمّت تھی۔ آپ ایک طرف تو دارالعلوم دیوبند میں ایک کامیاب و مقبول ترین مدرس کی حیثیت سے مختلف کتابیں پڑھاتے رہے، یہاں تک کہ شیخ الحدیث وصدر المدرّسین کے اعلیٰ علمی منصب پر آپ کو فائز کردیا گیا، اُدھر آپ اپنے بچوں کو جن کی تعداد بحمد اللہ! ایک درجن سے زائد تھی، خود ہی حفظِ قرآن اور ابتدائی کتابوں کی تعلیم اور خوشخطی کی مشق کراتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مجموعی طور پر تینتیس ہزار چھ سو چوراسی (۳۳۶۸۴) صفحات پر مشتمل ایسی علمی وتحقیقی چھیالیس کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جن کی تفصیل اوپر عرض کی جاچکی ہے۔ مذکورہ تمام علمی مشاغل کے باوجود عام مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ دل میں لیے ہوئے ایامِ تعطیل میں اندرونِ ملک و بیرونِ ملک آپ کے اصلاحی بیانات بھی ہوتے رہے، جن سے بے شمار خواص وعوام فیض حاصل کرتے رہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ قُدّس سرُّہ کے یہ تمام علمی کارنامے درحقیقت علومِ دینیہ سے ان کی اس سچی محبت کے کرشمے ہیں جو اُن کے دل میں موجزن تھی۔ وہ ایسی محبت تھی جو منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہوکر راستے کی مشقتوں کو صرف یہ نہیں کہ برداشت کرلیتی تھی، بلکہ ان مشقتوں کو بھی اپنی منزلِ مقصود کا حصہ سمجھتی تھی۔ ایسی ہی

محبت کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے:

رہ رواں را خستگی راہ نیست عشق خود
راہ است ہم خود منزل است

ترجمہ ومفہوم: ''منزلِ مقصود کی طرف جانے والا مسافر راستے کی مشقتوں سے پریشان نہیں ہوتا، کیونکہ سچی محبت کی نظر میں منزلِ مقصود کا راستہ بھی منزلِ مقصود ہی کی طرح دلچسپ ہوتا ہے۔''

حضرت مفتی صاحبؒ کی تمام تصانیف اگر شائع شدہ نہ ہوتیں اور ان کی مذکورہ دیگر علمی مصروفیات کے لاتعداد چشم دید گواہ آج (ماہِ شوال ۱۴۴۱ھ) تک موجود نہ ہوتے تو شاید قارئین کرام کو یہ شبہ ہوجاتا کہ مضمون نگار اپنی عقیدت مندی میں حدِّ اعتدال سے آگے نکل چکا ہے، اس لیے کہ سہولت پسندی اور راحت طلبی کے موجودہ عصر میں کسی ایک ہی فرد کا بیک وقت اتنا ہی زیادہ علمی کام کرنا بظاہر ناممکن ہے۔

راقم الحروف جب بھی حضرت الاستاذ قدّس سرّہ کی علمی مصروفیات ومحنتوں پر غور کرتا ہے تو یہ محسوس کرلیتا ہے کہ انہوں نے صحیح معنوں میں مندرجہ ذیل مشہور مقولے کا تقاضا پورا کیا ہے: **''العلمُ لا یُعطیکَ بعضَہٗ حتی تُعطیَہٗ کلَّکَ''** یعنی ''علم اپنی ذات میں سے کچھ بھی اس وقت تک تمہیں نہیں دے گا جب تک تم اپنی پوری ذات اُسے نہیں دوگے۔''

عام طور پر لوگ مذکورہ بالا مقولے کا مخاطَب طالبِ علم ہی کو قرار دیتے ہیں، جب کہ حضرت الاستاذؒ نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا تھا کہ اس کا مخاطَب خود مدرّس بھی ہے۔

طلبِ علم کے لیے آپ کی قربانی کا ایک واقعہ

حضرت مفتی صاحبؒ کے عزم وہمت اور طلبِ علم کے لیے ان کی قربانی کا ایک واقعہ یاد آیا: ایک دفعہ احقر اُن کی اجازت سے ان کے ذاتی کتب خانہ میں مطالعہ کررہا تھا، اس دوران ایک پرانی سی کتاب نکالی، جس کے

سرورق پر حضرت الاستاذؒ کے قلم سے ان کے زمانۂ طالب علمی کا ایک فقرہ لکھا ہوا تھا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ: ''والدہ محترمہ نے گاؤں سے کسی کے ساتھ میرے لیے گھی بھجوایا تھا، اُسے بیچ کر میں نے یہ کتاب خرید لی۔''

اللہ اکبر! غور کیا جائے، آج کل کے بعض طالب علموں کے پاس اگر کتاب خریدنے کے لیے گھر والے پیسے بھیجتے ہیں تو وہ اُسے کھانے پینے پر خرچ کر دیتے ہیں، لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے بہ زمانۂ طالب علمی جو خالص کھانے کی چیز تھی اور وہ بھی والدہ محترمہ کے ہاتھ کی بھیجی ہوئی اُسے بیچ کر کتاب پر خرچ کیا:

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بکجا

۳......افہام وتفہیم کا منفرد سلیقہ

راقم الحروف کو اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا احساس واعتراف ہے، لیکن یہ ایک تقدیری بات ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے طلبِ علم کی غرض سے چار مختلف ملکوں (افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور سعودی عرب) کے بعض ایسے مایۂ ناز اہلِ علم سے استفادہ کیا ہے اور ان کے پاس پڑھا ہے، جن کی نسبت اُس کے لیے موجبِ سعادت وباعثِ افتخار ہے۔ میں اس وسیع واقفیت کی بنا پر (جو میرا ذاتی کمال نہیں) شرح صدر کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت والا کے افہام وتفہیم کا انداز ان سب سے منفرد اور ممتاز تھا۔ مشکل سے مشکل بحث ایسی ترتیب وعمدہ انداز سے بیان فرماتے تھے کہ اعلیٰ تو درکنار، ادنیٰ سے ادنیٰ طالبِ علم کے لیے بھی سمجھنا آسان ہوجاتا، اور مجھے یاد ہے کہ کبھی آپ دوسرے اساتذۂ کرام کے اسفار کی وجہ سے دو تین گھنٹے مسلسل پڑھاتے اور تمام طلبہ ہمہ تن گوش ہوکر سنتے اور ''کأنَّ علی رؤوسھم الطیرَ'' کا مصداق بن کر آپ کی علمی تحقیقات سے مسلسل کئی گھنٹوں تک انہماک کے ساتھ استفادہ کرتے رہتے۔

۴......تربیت ومردم سازی

حضرت الاستاذؒ کی تربیت اور مردم سازی کا انداز بھی نرالا تھا۔ وہ خود بھی ہمیشہ اپنے علمی، تصنیفی اور اصلاحی

کاموں میں مصروف اور غیر ضروری ملاقاتوں اور ملنے جلنے سے دور نظر آتے تھے اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کو بھی اِسی بات کی تلقین کرتے تھے:

گرت ہوا است کہ با خضر ہمنشیں باشی
نہاں ز چشمِ سکندر چو آب حیوان باش

ترجمہ ومفہوم: ''اگر تمہیں خضر علیہ السلام (حق اور اہلِ حق) کے ہم نشیں ہونے کا شوق ہے، تو سکندر (دنیا اور اہلِ دنیا) کی نگاہوں سے آبِ حیات کی طرح پوشیدہ رہو۔''

راقم نے دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ جن اساتذہ یا طلبہ کو حضرت والاؒ سے قرب وتعلق کی سعادت نصیب ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو ترقیوں سے نوازا اور انہیں استغناء، علمی انہماک، اعلیٰ ہمتی اور دنیوی زندگی کی پرخار وادیوں کو عبور کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ حضرت الاستاذؒ کی مردم سازی کے چند واقعات نمونے کے طور پر پیش کیے جارہے ہیں:

آپ کی مردم سازی کا پہلا واقعہ

تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ-۱۴۰۳ھ کے درمیان میں جب احقر کا دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے تقرُّر ہوا، تو اس وقت کے ناظمِ تعلیمات حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ نے دفترِ تعلیمات بلاکر مجھے دیئے جانے والے اسباق سے متعلق میری رائے معلوم کی! میں چونکہ نیا نیا فارغ التحصیل ہوگیا تھا اور تدریس کے میدان میں پیش آنے والی مشکلات کا کوئی اندازہ یا تجربہ نہیں تھا، عمر بھی صرف بیس سال کے لگ بھگ تھی، اُدھر شاید دماغ اس زعم میں بھی مبتلا تھا کہ ایک طرف میں نے دورۂ حدیث میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے اور دوسری طرف درسِ نظامی کے موجودہ نصاب میں شامل مروَّجہ کتابوں کے علاوہ منطق وفلسفہ اور دیگر فنون کی کچھ ایسی کتابیں بھی اپنے علاقے کے جیّدالاستعداد علماء کے پاس پڑھی ہیں جو آج کل کم ہی پڑھائی جاتی ہیں، لہٰذا

درسِ نظامی کی کوئی بھی کتاب ان شاء اللہ! میرے لیے مشکل نہیں ہوگی۔ بہرصورت! ناتجربہ کاری بلکہ نادانی پر مبنی مذکورہ بالا زعم کے تحت میں نے حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ سے جواباً عرض کیا کہ: حضرت! آپ جو بھی اسباق سپرد فرمائیں گے، میں ان شاء اللہ! پڑھاؤں گا۔ نہ تو ابتدائی درجات کے اسباق سے مجھے کوئی دل شکنی ہوگی اور نہ ہی کچھ اوپر کے درجات کے اسباق سے گھبراہٹ ہوگی۔

میرا جواب سن کر حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''ملّا حسن''، ''میبذی'' اور دو کتابیں ان کے علاوہ جن کے نام یاد نہیں رہے' مجھ سے متعلق کر کے اپنے پاس نوٹ کر لیں، تاکہ آگے ان کا اعلان آویزاں کیا جائے۔ میں دل دل میں خوش ہو رہا تھا کہ مجھے تو ابتداء ہی سے ترقی ملنے لگی۔ اتفاق سے اُسی وقت اچانک حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ دفتر تعلیمات تشریف لائے اور مجھے ناظمِ تعلیمات حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کے پاس دیکھ کر اندازہ لگایا کہ انہوں نے مجھے اسباق کے سلسلے میں بلایا ہوگا، تو ناظمِ تعلیمات صاحبؒ سے دریافت فرمانے لگے کہ: اس کو کون سے اسباق دے دیئے؟ حضرت ناظم صاحبؒ فرمانے لگے کہ: اس کی رائے دریافت کرنے کے بعد میں نے مذکورہ بالا اسباق اس کے نام لکھ دیئے ہیں۔ مفتی صاحبؒ نے شدّت کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ: ابھی سے یہ کتابیں اس کو ہرگز نہ دیں، ورنہ آگے چل کر یہ کامیاب مدرّس نہیں بن سکے گا۔ مناسب یہ ہوگا کہ سالِ اول میں ''نحو میر''، سالِ دوم میں ''علم الصیغہ''، سالِ سوم میں ''شرح تہذیب'' اور سالِ چہارم میں ''اصول الشاشی'' یا ''سلم العلوم'' کے اسباق اس کو دے دیئے جائیں۔ پھر مجھے مخاطب بنا کر فرمایا:

''مولوی صاحب! دو باتیں سمجھ لو! ایک بات تو ہے کتاب کو سمجھنا اور دوسری بات ہے کتاب کو سمجھانا۔ کتاب سمجھانے کے لیے صرف اس کا سمجھنا کافی نہیں ہوتا، بلکہ مدرّس کو سخت محنت اور ابتدائی درجات سے پڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے، تب جا کر وہ کامیاب مدرّس بن سکتا ہے، تمہارا یہ خیال کہ جو کتاب میں خود سمجھ رہا ہوں، وہ

طالبِ علم کو بھی بہ آسانی سمجھا سکوں گا‘ غلط ہے۔

’’حضرت ناظمِ تعلیمات صاحبؒ چونکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے، اس لیے ان سے اتفاق کرلیا اور ان ہی کے بتائے ہوئے اسباق میرے نام کردیئے۔ مجھے بھی اپنی ناتجربہ کاری کا اندازہ ہوگیا اور دونوں کے اتفاق سے جو اسباق طے ہوگئے تھے اپنے لیے سعادت سمجھ کر شروع کرادیئے۔ اسباق شروع کرادینے کے بعد بہت جلد اندازہ ہونے لگا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا مشورہ میرے حق میں بے حد مفید رہا اور یقینا خالی الذہن طلبہ کو سمجھانے کے لیے بڑی محنت اور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ اگر میں ابتداء ہی سے اوپر کی کتابیں لے لیتا تو بڑی مشکل میں پھنس جاتا۔

مردم سازی کے جذبات پر مبنی حضرت مفتی صاحبؒ کی مندرجہ بالا نصیحت و مشورے کا فائدہ آج تک محسوس کرتا رہتا ہوں اور فارغ ہونے والے طلبہ کو بھی ہر سال کے آخر میں اسی کی روشنی میں یہ مشورہ دیتا رہتا ہوں کہ کامیاب مدرّس بننے کے لیے ابتدائی کتابوں سے تدریس کا آغاز کیجیے اور پھر بتدریج اوپر جانے کی کوشش کیجیے۔ اگر کوئی شخص شروع ہی سے اوپر کی کتابیں لینے کی کوشش کرتا ہے تو وہ مقبول مدرّس نہیں بن سکتا، مولانا جلال الدین رومیؒ نے خوب کہا ہے:

مرغِ پَر نارُستہ چوں پرّاں شود
طعمۂ ہر گربۂ درّاں شود

ترجمہ ومفہوم: ’’پر نکلنے سے پہلے جو چوزہ اُڑنے کی کوشش کرتا ہے، وہ پھاڑنے والی بلّی کا لقمہ بن جاتا ہے۔‘‘

حضرت مفتی صاحبؒ کی مردم سازی کا دوسرا واقعہ

دارالعلوم دیوبند میں مدرّس کی حیثیت سے احقر کی تقرّری کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ امتحان ہال (دار الحدیث تحتانی) میں تحریری امتحان ہو رہا تھا اور مدرّسین حضرات نگرانی فرما رہے تھے، میں بھی ایک حلقے کی نگرانی

پر مامور تھا، اس دوران مجھے اپنے حلقے کے اندر یہ محسوس ہوا کہ امتحان میں شریک دو طالب علم آپس میں گفتگو کررہے ہیں، میں نے اپنی ناتجربہ کاری اور فطری تیز مزاجی کے تحت کچھ سخت لہجے میں ان کی سرزنش کی، مجھے یہ اندازہ بھی نہیں ہوا کہ حضرت الاستاذؒ نے مجھے ان طلبہ کی سرزنش کرتے ہوئے دیکھا ہے، کیونکہ وہ ایک دوسرے حلقے میں گشت فرمارہے تھے،لیکن آپ نے اپنی دوربین نگاہوں سے مجھے دیکھ لیا تھا، چنانچہ آہستہ آہستہ گشت کرتے ہوئے میرے حلقے کی طرف تشریف لائے اور مجھے ایک طرف کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث جو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نقل کی ہے، سنائی:'

'إن الرفقَ لا یکون في شيئ إلا زانه ولا یُنزَع من شيئ إلا شانَه۔"

"بے شک نرمی ایک ایسی چیز ہے کہ جب وہ کسی معاملے میں شامل ہوجاتی ہے تو اس کو خوبصورت بنادیتی ہے،اور اگر اُسے کسی معاملے سے الگ کردیا گیا ہو تو وہ معاملہ بگڑ جاتا ہے۔

"حدیث سنانے کے بعد حضرت الاستاذؒ نے فرمایا کہ:"دیکھو! یہ بات تو اپنی جگہ پر درست ہے کہ استاذ کا رعب ووقار طلبہ کے ذہنوں میں قائم رہنا چاہیے اور وہ طلبہ کے ساتھ اتنا بے تکلف نہ ہو جس سے اس کا رعب ووقار جاتا رہے،لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ بلا ضرورت سخت لہجہ یا سخت رویہ اختیار کرنا، استاذ وشاگرد کے درمیان قائم شفقت وعقیدت کے اس رشتے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے جس کا برقرار رہنا ضروری ہوتا ہے، جب کہ نرمی ورحم دلی اس رشتے کو مزید مضبوط بنادیتی ہے۔"

راقم الحروف کا مزاج فطری طور پر کچھ تیز واقع ہوا ہے، البتہ حضرت الاستاذؒ کی مذکورہ بالا نصیحت کا یہ اثر اس وقت سے آج تک محسوس کرتا ہوں کہ جب بھی کسی معاملے میں تیز مزاجی کا غلبہ ہونے لگتا ہے تو حضرت والا کی نصیحت یاد آتی ہے اور نرمی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اور اگر بروقت نرمی اختیار نہ کرسکا تو پھر ندامت

وشرمندگی ضرور ہوتی ہے جو آئندہ کے لیے نرمی اختیار کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضرت الاستاذؒ کی مردم سازی کا تیسرا واقعہ

دارالعلوم دیوبند کے اسلاف واکابر کی طرح حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قُدِّس سرُّہٗ کی تربیت ورجال سازی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو تلاش کرتے ہوئے اُبھارنے اور بروئے کارلانے کی کوشش فرماتے تھے، اس سلسلے کا ایک واقعہ سپردِقلم کیا جارہا ہے:

دارالعلوم دیوبند میں مدرّس کی حیثیت سے جب احقر کا تقرُّر عمل میں آیا، تو دارالعلوم کے نظام کے مطابق تدریس کے ساتھ ساتھ دارالاقامہ کے ایک حلقے کی نظامت بھی مجھ سے متعلق کردی گئی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اپنے حلقے کے بعض انتظامی اُمور سے متعلق ایک مفصل تحریر میں نے حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام لکھی۔ میری اردو زباں چونکہ کافی کمزور تھی، اس لیے مجھے اپنی اس ٹوٹی پھوٹی تحریر پر دل میں شرم بھی محسوس ہورہی تھی کہ پتانہیں میری تحریر کا مقصد حضرت مہتمم صاحب کے سامنے واضح بھی ہوسکے گا یانہیں؟ بہرصورت! اسی تردُّد کے ساتھ ہی میں نے اپنی تحریر پیش کار صاحب کے پاس جمع کرادی، تاکہ وہ مناسب وقت میں اُسے حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں پیش کردے۔

اتفاق سے جس وقت میری مذکورہ تحریر پیش کار صاحب کے ذریعے حضرت مہتمم صاحبؒ کے سامنے پیش ہورہی تھی اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ بھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے بھی اُسے ملاحظہ فرمایا تھا، جس کا مجھے کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک مناسب موقع پر مجھ سے فرمایا کہ: تمہارے اندر لکھنے کی صلاحیت موجود ہے، تم اپنی اس صلاحیت سے کام لیتے ہوئے کچھ نہ کچھ لکھنے کا سلسلہ شروع کرو۔ میں حیران ہوگیا کہ میں نے آج تک نہ تو کوئی رسالہ لکھا ہے اور نہ ہی کسی مقالہ نویسی یا مضمون نگاری میں کوئی دلچسپی لی ہے، اور نہ ہی اپنے اندر لکھنے کی ہمت محسوس کرتا ہوں! پتہ نہیں حضرت الاستاذ کس بنیاد پر میرے

اندر لکھنے کی صلاحیت کا تذکرہ فرما رہے ہیں؟ میں اسی سوچ میں تھا کہ حضرت نے اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ: کچھ عرصہ قبل تم نے مہتمم صاحب کے نام دارالاقامہ کے انتظامی امور سے متعلق جو ایک تحریر لکھی تھی وہ مہتمم صاحب نے مجھے بھی دکھائی تھی، جس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ تمہارے اندر لکھنے کی صلاحیت موجود ہے، لہٰذا تم اس صلاحیت کو ضائع مت کرنا۔

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قُدِّس سرُّہ کی مذکورہ بالا قیمتی نصیحت پر اگرچہ اپنی غفلت کی وجہ سے میں مکمل طور پر عمل پیرا نہ ہوسکا، تاہم اس کی برکت سے میں نے اپنے اندر اتنی ہمّت ضرور محسوس کی ہے کہ اس وقت سے آج تک اللہ کی توفیق سے کچھ نہ کچھ کبھی تو عربی زباں میں اور کبھی اردو زباں میں لکھنے کی نوبت پیش آتی رہتی ہے۔

۵......دینی حمیّت وحق گوئی

مصلحت پسندی کے موجودہ دور میں حضرت الاستاذؒ کی ایک خصوصیّت' ان کی دینی حمیّت وحق گوئی تھی۔ وہ خلافِ شریعت کسی عمل پر خاموشی اختیار کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اپنے اکابر کے مسلک سے ہٹ کر عصرِ حاضر کے تقاضوں کے بہانے سے اگر کسی کی کوئی رائے سامنے آتی تو آپ مدلّل اور پُرزور انداز میں اس کی تردید فرماتے۔ دینی یا سیاسی جلسوں میں تصویر کشی کا مسئلہ ہو یا جاندار کی تصویر کے ساتھ سوشل میڈیا اور ٹی وی پر تبلیغِ دین کا موضوع ہو، مزارات پر کتبے لگانے کا سلسلہ ہو یا مدارسِ دینیہ کے اندر مروّجہ حیلۂ تملیک کا مسئلہ ہو، یا ان سے ملتے جلتے کچھ دیگر ایسے مسائل ہوں جن میں قرآن وسنت کی تعلیمات اور اپنے اکابر کے مسلک سے ہٹ کر تساہل سے کام لیا جارہا ہو، آپ مضبوط دلائل کی روشنی میں ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر ان امور کی مخالفت فرماتے۔ آپ کی بعض آراء سے کچھ اہلِ علم حضرات اگر اتفاق نہ بھی کرتے، تب بھی اس بات کا اعتراف وہ ضرور کرتے کہ آپ ایک حق گو اور صاف گو عالمِ دین ہیں، جو کچھ فرماتے ہیں دینی حمیت کے تحت فرماتے ہیں۔ خلاصہ

یہ ہے کہ آپ حق گوئی میں شاعرِ مشرق علّامہ اقبالؒ کے مندرجہ ذیل شعر کے مصداق تھے:

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

احقر کے اوپر حضرت الاستاذؒ کے بے شمار احسانات

رواں پندرھویں صدی ہجری کے پہلے سال ۱۴۰۱ھ کو احقر بے سروسامانی کی حالت میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طالبِ علم کی حیثیت سے داخل ہوا۔ ظاہری بے سروسامانی، غریب الوطنی اور مقامی زبان سے ناواقفیت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اتنے انعامات سے نوازا جن کا تصور بھی مجھ جیسا تہی دامن و بے حیثیت طالبِ علم نہیں کرسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک اہم انعام یہ تھا کہ اس نے میرے اساتذۂ کرام اور بالخصوص حضرت مفتی صاحبؒ کی خصوصی شفقتیں میری طرف متوجہ کرادیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے جہاں دارالحدیث میں اپنے دوسرے شاگردوں کے ساتھ ساتھ احقر کو بھی حدیث کی متعدد کتابیں پڑھائیں، وہاں اپنے خارجی اوقات میں نظام الاوقات کی رعایت کے ساتھ حاضرِ خدمت ہونے اور استفادے کی خصوصی اجازت سے بھی نوازا۔ احقر کو دورانِ مطالعہ جو اشکالات درپیش ہوتے، ان کی خدمت میں جاکر پیش کرتا اور آپ نہایت توجہ کے ساتھ سماعت فرماتے اور اطمینان بخش جوابات سے نوازتے۔

اشارہ بالسبّابہ کے مسئلے میں راہنمائی

احقر نے فقہ کی کتابیں اپنے علاقے کے علمائے کرام سے پڑھی تھیں، وہ علمائے کرام تشہُّد کے وقت اشارہ بالسبّابہ کے قائل نہیں تھے، اور دلیل میں بعض فقہائے احناف کی عبارتیں اور بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مفصّل مکتوب کو پیش کرتے تھے، جس میں اشارہ بالسبّابہ کی حدیث میں تاویل کرتے ہوئے فقہ حنفی کی مختلف کتابوں کے حوالوں کے ساتھ اس اشارے کو منع کیا گیا ہے۔ (مکتوباتِ امام ربانی،

دفتر اول، مکتوب نمبر: ۳۱۲)

دارالعلوم دیوبند جانے سے قبل جہاں احقر نے درجہ موقوف علیہ پڑھتے ہوئے مشکوٰۃ شریف میں اپنے استاذ کے پاس اشارہ بالسبّابہ والی حدیث پڑھی اور استاذ محترم نے اس حدیث کی روشنی میں اشارہ بالسبّابہ کو سنت قرار دیا، تو میں نے طالب علمانہ اشکال پیش کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ مکتوب اور اس میں درج شدہ تحقیق کا حوالہ دیا اور اس کا جواب اپنے استاذ محترم سے چاہا! استاذ محترم نے جواب دینے اور مجھے سمجھانے کی کوشش فرمائی، لیکن میرے ذہن میں اس جواب سے متعلق مزید اشکالات پیدا ہوتے رہے، اور یاد پڑتا ہے کہ سوال وجواب کا سلسلہ چند دن تک جاری رہا، لیکن میری محرومی تھی کہ میں پھر بھی مطمئن نہ ہوسکا۔

اگلے سال جب دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طالبِ علم کی حیثیت سے احقر کو داخلہ ملا اور وہاں کے مایۂ ناز محدّثین حضرات کے پاس حدیث پڑھنے کا موقع میسر ہوا، تو حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ نے حدیث کی متعدد کتابیں پڑھائیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس پہلی بار جب اشارہ بالسبّابہ والی حدیث پڑھنے کا موقع ملا تو احقر نے یہاں بھی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ مکتوب کے حوالے سے اشکال پیش کیا، حضرت الاستاذؒ نے اس مسئلے کو تفصیل طلب قرار دیتے ہوئے سبق کے بعد اپنی رہائش گاہ پر مجھے ملنے کا حکم دے دیا۔

جب مقررہ وقت پر احقر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اطمینان کے ساتھ میرا اشکال سنا اور پھر اپنی خداداد صلاحیت اور بے نظیر اندازِ تفہیم کے ذریعے محققینِ احناف اور اکابرِ دیوبند کا مسلک بیان کرتے ہوئے مذکورہ مکتوب کا ایسا محققانہ جواب پیش فرمایا جس سے میرا ذہن بالکل مطمئن ہوگیا اور صرف یہ نہیں کہ میں نے اگلی ہی نماز میں اشارہ بالسبّابہ کی سنت پر عمل شروع کیا، بلکہ آگے چل کر اللہ کی توفیق سے اپنے علاقے کے دوسرے بے شمار لوگوں کو بھی اس سنت پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کرتا رہا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

امامت وتدریس میں ان کی راہنمائی

احقر کو دورۂ حدیث کے سال دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں امامت وخطابت کی ذمہ داری اور فراغت کے بعد تدریس کی ذمہ داری بھی سپرد کردی گئی۔ ان دونوں میدانوں میں اپنے تمام اساتذۂ کرام اور بالخصوص حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی راہنمائی قدم قدم پر شاملِ حال رہی۔ ان کی خصوصی توجہات وشفقتوں کی برکت سے مجھ جیسا مغفّل وتہی دامن شخص بھی ایک طرف تو نحو میر سے تدریس کا آغاز کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور آج دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھا رہا ہے، اور دوسری طرف ایک بڑی مسجد میں امامت وخطابت کی ذمہ داری بھی انجام دے رہا ہے۔ اگر ان کی خصوصی عنایات وتوجہات اور مبارک دعائیں شاملِ حال نہ ہوتیں تو بظاہر ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔

حفظِ قرآن میں احقر کے اوپر حضرت مفتی صاحبؒ کا عظیم احسان

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں مدرّس کی حیثیت سے احقر کا تقرُّر رہوا۔ تدریس کے دوران میں نے محسوس کیا کہ مدرّس اگر حافظِ قرآن نہ ہو تو تدریس میں اُسے دقّت پیش آتی ہے، اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں حُفّاظِ قرآن کی کثرت کو دیکھ کر بھی حفظِ قرآن کا ایک ولولہ دل میں پیدا ہوچکا تھا، لہٰذا دل نے چاہا کہ تدریس اور مسجدِ دارالعلوم کی امامت اور دارالاقامہ کے ایک حلقہ کی نظامت کے ساتھ ساتھ خارجی وقت میں حفظِ قرآن شروع کروں۔ البتہ مذکورہ بالا مصروفیات کے باوجود حفظِ قرآن میں لگنا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس لیے حسبِ معمول حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قُدِّس سرُّہ کی خدمت میں مشورہ کرنے کے لیے ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا اور حفظِ قرآن کے لیے اپنی رغبت وارادے کا اظہار کیا۔

حضرت الاستاذؒ نے ہمّت افزائی فرماتے ہوئے میرے ارادے کی تائید فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ: تم نے

بہت عمدہ سوچا ہے، لیکن اس عمر میں مذکورہ بالا مصروفیات کے باوجود حفظِ قرآن کے لیے ایک پختہ نظام الاوقات بنانے، مسلسل محنت اور وقت کی پابندی کی سخت ضرورت ہوگی۔ اگر تم مذکورہ تین شرائط کو بجالانے کے لیے تیار ہوتو میں خود ہی روزانہ تمہارا سبق اور آموختہ متعیَّن اوقات میں سن لیا کروں گا اور تجھے اللہ کی توفیق سے حافظِ قرآن بنادوں گا۔

میں چونکہ صرف مشورہ کرنے کے لیے حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، حاشیہ خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ دارالعلوم کے مایۂ ناز استاذِ حدیث اپنی گوناگوں علمی مصروفیات کے باوجود اس حقیر کو اپنی اولاد کا درجہ دے کر اس کے لیے روزانہ کی بنیاد پر وقت نکالیں گے! اس لیے میں نے عرض کیا کہ: حضرت والا! میں تو صرف مشورہ کے لیے حاضر ہوا تھا، لیکن آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا احسان کا معاملہ فرمایا جو میرے تصور میں بھی نہ تھا، لہٰذا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ نے جن تین شرائط کی نشاندہی فرمائی ہے، میں اللہ کی توفیق سے تینوں کی مکمل پابندی کروں گا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ: جاؤ، اور آج ہی سے قرآن کی آخری منزل سورۂ ''ق'' سے حفظ کرنا شروع کرو اور کل فلاں وقت کو ایک منٹ کی تقدیم وتاخیر کے بغیر میرے پاس آنا، میں سن لوں گا۔ حضرت الاستاذؒ کی ہدایت کے مطابق بروز یکشنبہ بتاریخ ۲۸ / صفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۴ / دسمبر ۱۹۸۳ء سورۂ ''ق'' سے احقر حفظِ قرآن میں مصروف ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضرت الاستاذ کی خصوصی توجہ وعنایت سے ایک سال تین مہینے کے اندر مذکورہ بالا مصروفیات کے باوجود بروز دوشنبہ بتاریخ ۱۱ / جمادی الثانیہ ۱۴۰۵ھ مطابق ۴ / مارچ ۱۹۸۵ء حفظِ قرآن مکمل ہوگیا۔ اس پورے عرصے میں روزانہ فجر کے بعد سبق اور شام کو آموختہ حضرت الاستاذؒ کو سناتا رہا اور وہ سنتے رہے، جمعہ کو بھی ناغہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ جب قرآن کریم کی ایک منزل کا حفظ مکمل ہوگیا تو پھر جمعہ والے دن سبق کے علاوہ ایک پوری منزل بھی سنتے تھے۔ اس طویل عرصے کے اندر احقر نے یہ کبھی محسوس نہیں کیا کہ حضرت الاستاذؒ اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی گرانی محسوس فرمارہے ہیں، بلکہ حفظ مکمل ہونے کے بعد بھی روزانہ شروع میں

ڈیڑھ پارہ اور پھر دو پارے مجھ ناچیز سے سنتے رہے اور ماہِ رمضان ۱۴۰۵ھ تک تین دور کراتے ہوئے مجھے اس قابل بنا دیا کہ ماہِ رمضان ۱۴۰۵ھ کو پہلی محراب ان ہی کے مشورے سے دارالعلوم کی مسجد میں سنا دوں۔ رمضان کے بعد بھی شروع میں روزانہ ڈیڑھ پارہ اور بعد میں روزانہ تین پارے احقر سے سنتے رہے، یہاں تک کہ بروز یکشنبہ ۴/صفر ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۰/اکتوبر ۱۹۸۵ء آپ نے فرمایا کہ اب ان شاء اللہ! تمہیں مجھ کو قرآن سنانے کی ضرورت نہیں رہے گی، تم خود پابندی کے ساتھ روزانہ کا ایک معمول بنا کر اپنی پوری زندگی میں قرآن پاک کی تلاوت سے وابستہ رہو اور ہر ماہ رمضان میں محراب سنانے کی پابندی بھی کرو۔

پاکستان واپسی کے بعد بھی قدم قدم پر آپ کی راہنمائی

دارالعلوم دیوبند سے پاکستان واپسی کے بعد بھی تدریس کا معاملہ ہو یا امامت کا، اپنی زندگی کے لیے مناسب طریقۂ کار کی تلاش ہو یا کوئی علمی اشکال درپیش ہو، حالاتِ حاضرہ کے تحت کسی اُلجھن کا سامنا ہو یا زندگی کے نشیب وفراز میں کسی مشکل کا احساس دامن گیر ہو، پڑھنے لکھنے کا طرزِ عمل ہو یا اشاعتِ کتب کا ارادہ، غرض یہ کہ ہر ہر موقع پر حضرت الاستاذؒ سے احقر رابطہ کرتا رہا اور حضرت راہنمائی فرماتے رہے، اور مجھے یاد نہیں کہ حضرت والا کا کوئی بھی مشورہ ایسا رہا ہو جس پر مجھے اطمینان نصیب نہ ہوا ہو یا اس کا نتیجہ مثبت نہ رہا ہو۔

آپ کے وصال کے بعد جہاں احقر سمیت بے شمار بہی خواہانِ دارالعلوم دیوبند فکرمند ہیں کہ اب مادرِ علمی کو ایسا جامع المعقول والمنقول شیخ الحدیث اور ایسا متقی و باہمت صدر المدرّسین کیسے میسر ہوگا؟ وہاں احقر ذاتی طور پر پریشان ہے کہ وہ اپنے علمی اشکالات کس سے حل کرائے گا؟ اور زندگی کے نشیب وفراز میں پیش آنے والے غور طلب امور سے متعلق مشورہ کس سے کرے گا؟ حافظ شیرازیؒ نے شاید ایسے ہی کسی موقع پر کہا ہے:

مرادِ دل ز کہ جویم کہ نیست دلدارے
کہ جلوۂ نظر و شیوۂ کرم دارد

ترجمہ ومفہوم: ’’میں اپنا مقصد کہاں تلاش کروں؟ اس لیے کہ کوئی ایسا تسلی دینے والا تو رہا ہی نہیں، جس کی نگاہ میں جلوہ گری اور اس کی عادت میں ہمدردی ہو۔

’’تاہم! ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں اللہ کی رحمتوں سے نا امید نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند کی بھی حفاظت فرمائیں گے اور حضرت الاستاذ کی اولاد واقارب اور متعلقین ومحبین کو بھی صبرِ جمیل عطا فرمائیں گے، وماذٰلک علی اللہ بعزیز۔

آپ کی ترقی ومقبولیت کا راز

راقم الحروف کی نظر میں حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قُدِّس سرُّہ کی ترقیوں اور غیر معمولی مقبولیت کے دو اہم اسباب ہیں، جنہیں اختصار کے ساتھ قلمبند کیا جا رہا ہے:

ا......رزقِ حلال کی برکت

احقر جس زمانے میں حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کے پاس حفظِ قرآن کر رہا تھا، اس زمانے میں ان کے والدِ ماجد جناب یوسف پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۱۹/ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ) جو اپنے گاؤں میں قیام پذیر تھے، چند دن کے لیے دیوبند تشریف لائے تھے اور اپنے صاحبزادے حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کے ہاں مقیم تھے۔ احقر چونکہ روزانہ ان کے مکان پر قرآن سنانے کے لیے حاضری دیتا تھا، اس لیے ان کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے جب تک وہ حضرت الاستاذ کے پاس مقیم رہے، چند ملاقاتیں میسر ہوئیں اور ان سے واقفیت کا موقع نصیب ہوا۔ وہ باضابطہ عالمِ دین اگرچہ نہیں تھے، لیکن ایک صاف دل، متقی پرہیزگار اور سنتوں کے پابند ضرور تھے۔ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت پر اتنی توجہ دی تھی کہ صرف ایک بیٹے کے علاوہ سب کو حافظ وعالم بنا دیا تھا۔

ایک ملاقات کے دوران میں نے جناب یوسف صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ: آپ کتنے

خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب مدرّسِ دارالعلوم دیوبند جیسے صاحبزادوں کی نعمت سے نوازا ہے، جب کہ آپ خود باضابطہ عالم بھی نہیں ہیں! آپ یہ تو بتا دیجئے کہ آپ کے صاحبزادوں کی کامیابی کا اصل راز کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ: یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم ہے اور اللہ ہی اصل راز کو جانتا ہے، میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ الحمدللہ! میں نے اپنے علم کے مطابق اپنے بچوں کو ایک لقمہ بھی حرام یا مشکوک روزی کا نہیں کھلایا ہے اور پھر اپنا ایک قصہ سنایا جس کا خلاصہ یہ تھا: ''جس زمانے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھیؒ اور حضرت علامہ سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل (گجرات) میں پڑھاتے تھے، اس وقت میں وہاں پڑھتا تھا اور حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کی خدمت کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھ سے حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ نے فرمایا کہ: یوسف! تمہاری برادری کے لوگ بہت اچھے لوگ ہیں، لیکن ان میں ایک خامی ایسی ہے جس کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں کوئی اچھا عالم پیدا نہیں ہوگا، وہ سب کے سب نبیوں کے سود میں پھنسے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی آمدنی حرام ہے، حرام اور ناجائز غذا کھا کر اچھا عالم پیدا نہیں ہوسکتا، لہذا اگر تم چاہتے ہو کہ آگے چل کر تمہارے بیٹے اچھے عالم بنیں تو حرام اور ناجائز مال سے خود بھی پرہیز کرنا اور اولاد کو بھی بچانا۔ میرے والد (حضرت مفتی صاحبؒ کے دادا) نے بھی چونکہ بنیوں سے سودی قرضہ لیا تھا، اس لیے حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کی بات سن کر میں نے ان سے اس سودی قرضے سے جان چھڑانے کا تقاضا کیا، لیکن وہ میری بات نہ مان سکے اور مجھے الگ کر دیا، میں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر یہ تہیّہ کرلیا کہ چاہے بھوکا رہوں، مگر حرام یا مشکوک مال کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، تاکہ میں نہیں پڑھ سکا، میری اولاد تو ان شاء اللہ تعالیٰ پڑھ کر اچھے عالم بن سکیں گے۔ چنانچہ میں نے اپنی ہی محنت سے کمانا شروع کیا، خود بھی حرام مشکوک آمدنی سے بچنے کی کوشش کی اور اولاد کو بھی اس سے بچایا اور ان کی تعلیم پر توجہ دی، جس کے نتیجے میں ایک بیٹے کے

علاوہ اللہ تعالیٰ نے سب کو حافظ و عالم بنا دیا۔‘‘

راقم الحروف کہتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے والدِ ماجد کی تربیت و نیک جذبات کا یہ اثر تھا کہ آپ نے بھی ہمیشہ قناعت و استغناء کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو مشکوک آمدنی سے دور رکھا۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ نے فارغ ہونے کے بعد نو سال تک ’’دارالعلوم اشرفیہ، راندیر‘‘ میں پڑھایا اور ۱۳۹۳ھ کو دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرُّر رہوا، آپ اس دوران ایک معمولی مشاہرے پر اکتفا کرتے ہوئے شب و روز مطالعہ، تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ تدریس کے ابتدائی دور میں فاقوں کی نوبت بھی پیش آئی، لیکن آپ نے ہمیشہ صبر و توکل سے کام لیا۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصانیف کو خوب مقبولیت عطا کی اور اپنے ذاتی کتب خان’’ مکتبۂ حجاز‘‘ سے بقدرِ ضرورت ایک آمدنی کا سلسلہ بن گیا تو آپ نے ۱۴۲۳ھ کو حجِ بیت اللہ سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینے کا سلسلہ موقوف کر دیا اور جو تنخواہ ۱۳۹۳ھ سے ۱۴۲۳ھ تک وصول فرما چکے تھے، وہ بھی واپس لوٹا دی، اور دارالعلوم دیوبند میں تقرُّری سے قبل ’’دارالعلوم اشرفیہ، راندیر‘‘ میں جو نو سال تک تنخواہ وصول فرمائی تھی، وہ بھی دارالعلوم اشرفیہ کو لوٹا دی اور پھر اپنے وصال تک للہ فی اللہ دین کی خدمت میں مصروف رہے۔

ایک دفعہ حضرت الاستاذؒ نے خود مجھ سے فرمایا کہ: میرے والد ماجد کا منشا تو یہ تھا کہ میں ابتدا ہی سے بلا مشاہرہ پڑھاتا، لیکن میں نے یہ سوچا کہ میری طالب علمی کے دور میں تو والد صاحب ہی اپنی محنت کی معمولی آمدنی سے مجھ پر خرچ کرتے رہے، اب تدریس کے دوران بھی وہ ہی مجھ پر اور میری اولاد پر خرچ کرتے رہیں، یہ مناسب نہیں، لہذا میں مشاہرہ لینے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا، لیکن یہ نیت کی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو اپنے والد کے منشا کا خیال رکھتے ہوئے سارا وصول کیا ہوا مشاہرہ واپس لوٹا دوں گا۔

۲...قرآن کریم سے والہانہ تعلق و محبت کا کرشمہ

حضرت الاستاذؒ کی مقبولیتِ عامہ اور کامیابیوں کا ایک اہم سبب احقر کی نظر میں قرآنِ پاک سے ان کی والہانہ محبت و وابستگی تھی ، دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں احقر نے بارہا یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جب کوئی شخص حضرت والا کے سامنے تلاوت شروع کرتا یا وہ خود تلاوت میں مصروف ہوجاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ کا ظاہری وباطنی تعلق سب سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب سے جُڑ گیا ہے، آنسو رواں دواں اور چہرے کا رنگ بدلا ہوا نظر آتا۔ حضرت والاؒ کی مذکورہ کیفیت کو یاد کر کے آج تک میں سوچتا رہتا ہوں کہ اگر زندگی میں صرف ایک دفعہ بھی ہمیں ایسی کیفیت نصیب ہوجائے تو شاید ہمارا بیڑا پار ہوجائے، لیکن بات یہ ہے کہ احقر جب حضرت الاستاذؒ کے قرآنِ پاک سے تعلق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مندرجہ ذیل جیسی حدیثوں کی روشنی میں دیکھتا ہے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت الاستاذؒ کی ترقیوں اور بے مثال محبوبیت ومقبولیت کا ایک اہم راز قرآنِ پاک سے ان کی والہانہ محبت تھی، کیونکہ ان حدیثوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن سے تعلق ومحبت، اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ امام بخاریؒ نے بروایت حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے:

”لم يأذن الله لنبي ما أذن لنبي صلى الله عليه وسلم يتغنّى بالقرآن“

یعنی” اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی نہیں سنی جیسی اس نبی کی سنی جو قرآن پاک ترنم سے پڑھتا ہے۔“(بخاری شریف، ج:۲،ص:۷۵۱)

اور امام ترمذیؒ نے بروایت حضرت ابوامامہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ارشاد نقل کیا ہے:............”وما تقرّب العباد إلى الله بمثل ما خرج منه يعني القرآن“۔یعنی”اور بندوں نے اللہ تعالیٰ کی نزدیکی اس قدر کسی چیز کے ذریعے حاصل نہیں کی جس قدر اس چیز کے ذریعے جو اللہ سے صادر ہوئی ہے، یعنی قرآن پاک“۔(ترمذی شریف، ج:۲،ص:۱۱۹)

آپ کی ایک آخری خاموش تمنا جو پوری ہوگئی

حضرت الاستاذؒ نے اپنی زندگی اتنی کارآمد بنالی کہ موجودہ دور میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی، آپ نے دین کی مسلسل خدمت کرتے ہوئے اپنی صحت کی بھی کوئی پروانہیں کی۔ غالبًا آپ یہ چاہتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جسم کے بارے میں مجھ سے سوال کرے کہ: ''فیم أبلیتہ؟'' ''یعنی'' اپنے جسم کو کن کاموں میں لگا کر آپ نے ناتواں کر دیا؟'' تو میں جواب دے سکوں کہ: ''في خدمة کتابک وسنة نبیک ''یعنی'' تیری کتاب اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی خدمت میں لگا کر ناتواں کر دیا۔''

آپ زیادہ محنت اور پیرانہ سالی کی وجہ سے اپنی عمر کے آخری سالوں میں شوگر اور دل کی مختلف بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے، عمر کے اس حصے میں بظاہر ان بیماریوں سے صحت یاب ہونے کی اُمید کم اور ان کے مزید بڑھ جانے کا اندیشہ زیادہ ہوجاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یقیناً حضرت والاؒ کی یہ خاموش تمنا رہی ہوگی کہ وہ ارذلِ عمر سے پہلے ہی قرآن وسنت کی خدمت کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور میں حاضری دیں، اور اپنے عزیز طلبہ کو بھی تعلیمی سال کے درمیان میں الوداع نہ کہیں جس سے ان کی کتاب بخاری شریف نامکمل رہ جائے، اور نہ ہی دارالعلوم کو سال کے درمیان میں خیر باد کہہ کر اس کی مؤقر مجلسِ شوریٰ کو شیخ الحدیث وصدر المدرّسین کی تعیین کے لیے غور کرنے کا موقع نہ دیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نیک اور مخلص بندے کی مذکورہ خاموش تمنا اس طرح پوری فرمائی کہ آپ نے بخاری شریف کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے اس جملے کے ساتھ اپنے طلبہ سے رخصت لی کہ:

''اب وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا''، اور پھر رمضان المبارک میں سفر کے دوران نہایت کمزوری کی حالت میں آرام کرنے کے بجائے روزانہ تراویح کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ شروع فرما کر علمی اور اصلاحی گراں قدر نکتے بکھیرتے رہے، کمزوری اتنی کہ متعلقین نے (بشمول احقر کے بذریعہ فون) چند دن تک درس موقوف رکھنے اور

آرام کرنے کی درخواست کی، لیکن آپ نے انکار فرماتے ہوئے ۱۵ر رمضان تک درس کا سلسلہ جاری رکھا، آپ کی کیفیت پر حافظ شیرازیؒ کا مندرجہ ذیل شعر منطبق ہورہا تھا:

دست از طلب ندارم تا کام مِن بر آید
یا تن رسد بہ جاناں یا جان زِ تن بر آید

ترجمہ ومفہوم: ''میں اپنے مقصد کے حصول تک جد وجہد جاری رکھوں گا، تا کہ یا تو محبوبِ حقیقی کا وصال نصیب ہو یا پھر میں اپنی جان اس کے سپرد کروں''۔

۱۵ر رمضان المبارک کے بعد زبان میں بولنے کی طاقت باقی نہیں رہی اور سفرِ آخرت شروع ہوگیا اور چند ہی دن کے اندر آخری عشرے میں ۲۵ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ راقم الحروف جب حضرت الاستاذؒ کی پوری زندگی اور خاص کر زندگی کے آخری قابلِ رشک ایام پر غور کرتا ہے، تو بے اختیار زبان پر یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں: **"عاش سعيداً ومات سعيداً وسيُبعث يوم القيامة إن شاء الله سعيداً"**.

(آپ نے سعادت مندی کی زندگی بسر کی اور سعادت مندی کی موت نصیب ہوئی اور قیامت میں بھی ان شاء اللہ تعالیٰ سعادت مندی کی حالت میں اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے) اور اسی سوچ وغور وفکر سے اللہ تعالیٰ مجھے اپنے عظیم مربی واستاذ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدّس سرُّہ العزیز کے فراق پر صبر کی توفیق عطا فرماتا ہے، اور اُمید کرتا ہوں کہ ان بے ربط لیکن دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ٹوٹے پھوٹے کلمات سے قارئین کرام اور حضرت الاستاذؒ کی اولاد واقارب اور مخلصین ومتعلقین کو بھی صبر کی توفیق نصیب ہوگی۔

احقر نے اپنے مضمون کو بار بار سمیٹنے کی کوشش کی، لیکن قلم اپنی زبانِ حال سے مندرجہ ذیل مشہور شعر کو معمولی ترمیم کے ساتھ دہراتا ہوا آگے بڑھتا رہا:

أعد ذكر "سعيد" لنا إن ذكره

هو المسک ما کرّرتَه یتضوع

ترجمہ ومفہوم:''شیخ سعید کا تذکرہ دہراتے رہنا، کیونکہ ان کا تذکرہ جتنا دہراتے رہو گے اتنا ہی مشک کی طرح مہکتا رہے گا۔''

حضرت الاستاذؒ نے اپنے پیچھے نو صاحبزادگان اور دو صاحبزادیوں کو سوگوار چھوڑا، جو سب کے سب حافظِ قرآن اور دینی تعلیم سے آراستہ اور دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ دو صاحبزادوں کا آپ کی حیات میں انتقال ہو گیا تھا، وہ بھی حافظِ قرآن اور دینی تعلیم سے آراستہ تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور آپ کی اولاد، اقارب ورشتہ دار، دارالعلوم دیوبند کے اربابِ انتظام اور اساتذۂ کرام وطلبہ اور حضرتؒ کے تمام تلامذہ ومتعلّقین ومحبّین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین!۔

❁…❁…❁

علم حدیث کا مہر تاباں غروب ہوگیا
جو نصف صدی ایک عالم کو منور کررہا تھا

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کا سانحۂ ارتحال

حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی
جامعہ اسلامیہ، مظفر پور، اعظم گڑھ

آج صبح بتاریخ ۲۶ ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بروز منگل کو اچانک ایک ایسے حادثہ فاجعہ کی اطلاع ملی جس کا اس سے پہلے تصور نہیں کیا جاسکتا تھا، یعنی دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند کا ممبئی میں سانحۂ ارتحال پیش آیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس ناچیز سے مفتی صاحب کا پہلا تعارف ۱۹۶۷ء میں ہوا تھا، جب وہ مدرسہ اشرفیہ راندیر میں پڑھا رہے تھے، خاص طور سے ابوداود شریف کا سبق ان سے متعلق ہوا، اس وقت تک اس ناچیز کی ہندوستان کے مدارس میں شہرت ہوچکی تھی، میری کتاب ''محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے'' منصۂ شہود پر آچکی تھی، اس لیے فلاح دارین کے مہتمم مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی جو مجھے ترکیسر لائے تھے، انھوں نے ایک روز راندیر کے سفر کا پروگرام بنایا، انھوں نے بتایا کہ مدرسہ حسینیہ میں مولانا شمس الدین افغانی بڑے فاضل آدمی ہیں، انھیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے، ان کے شاگردوں نے جن میں مولانا عبدالرحیم متالاؒ اور مولانا غلام محمد پٹیلؒ وغیرہ نے آپ کا ان سے بڑا ذکر خیر کیا ہے، اس کے علاوہ مولانا ہاشم بخاری اور مولانا سعید احمد پالن پوری ہمارے گجرات کے نوجوان اچھے مدرس اور عالم ہیں، انھوں نے اپنے یہاں آپ کو شام کے کھانے پر مدعو کیا ہے، اس لیے ہم موانا کے

ہمراہ راندیر گئے، وہاں مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کے یہاں مہمان رہے، رات کا کھانا اور قیام انھیں کے یہاں رہا، مفتی سعید احمد سے ملاقات سے اندازہ ہوا کہ مولانا بہت ہی صاحب ذوق، کتابوں کے حریص پڑھنے لکھنے کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں، اس طرح مفتی سعید احمد صاحب مرحوم سے تعلقات کی ابتدا ہوئی، پھر کثرت سے ترکیسر ان کی آمد و رفت رہی، مجھے بعض کتابوں کی ضرورت تھی، اس کو مفتی صاحب نے عاریۃً فراہم کیا، راندیر میں انھوں نے میرے بیانات بھی کرائے، زمانہ گزرتا گیا، وہاں سے میری سہارن پور ''بذل المجہود'' کی خدمت کے لیے ایک سالہ چھٹی لے کر حاضری ہوئی، سہارن پور کے قیام میں مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی کی جب بھی آمد ہوئی تو انھوں نے مفتی صاحب کا سلام و پیام پہنچایا، اس کے بعد میرا قاہرہ، حجاز مقدس اور پھر ابوظبی کا سفر ہوگیا۔

حرمت مصاہرت کے بارے میں ابوظبی میں حنفیہ کے مسلک کے بارے میں مجھ سے سوالات کیے گئے، اس سلسلے میں معلوم ہوا کہ مولانا کتاب ''حرمت مصاہرت'' طبع ہو چکی ہے، اس کو میں نے منگوایا اور استفادہ کیا، اس نازک مسئلہ میں جس طرح انھوں نے گفتگو کر کے اپنے مسلک کو واضح اور مدلل کیا ہے، اس کو پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی، اس کے بعد جب وہ دارالعلوم دیوبند منتقل ہو کر آگئے، ان کا دورہ کے بڑے اساتذہ میں شمار ہونے لگا، وہاں ترمذی شریف وغیرہ اونچی کتابیں ان کے ذمہ کی گئیں، اس زمانے میں میرا سہارن پور مظاہر علوم شوریٰ میں جانا ہوا، دیوبند بھی حاضری ہوئی، حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے میزبان تھے، مولانا بھی مہمان خانے میں تشریف لائے اور ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنے بعض رسائل ہدیہ کیے، بعد میں بار بار سہارن پور اور دیوبند کا سفر ہوا، وہ مہمان خانہ تشریف لاتے، کبھی ان کے جائے قیام چائے کے لیے حاضری ہوتی، ان کے کتب خانہ پر نظر ڈالی، بہت ہی خوشی ہوئی، انھوں نے اپنی مؤلفات مجھے ہدیۃً عنایت فرمایا دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اور شکر گزار رہا۔

ان کے اہم کارناموں میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی خدمت اور اس کا حاشیہ ہے، حقیقت میں یہ علماء پر ایک فرض

تھا جو انھوں نے پوری محنت کر کے پوری جماعت کی طرف سے ادا کر دیا، یہاں تک کہ انھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کی تقریر جس کو اردو سے عربی میں منتقل کیا گیا ہے اس کو بھی حاصل کرلیا اور یہ کتاب بیروت دار ابن کثیر سے ۲؍جلدوں میں شائع ہوئی، ہمارے لڑکے اس کتاب کو شارقہ معرض سے خرید کر لائے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، مولانا سے میں نے دریافت کیا کہ اس کے حقوق بھی آپ کو دیئے یا نہیں؟ انھوں نے فرمایا مجھے معلوم نہیں، کتاب چھپ گئی الحمدللہ یہی بڑی بات ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے کچھ حقوق ناشر نے ان کو ادا کیے۔

مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے تالیفات کا ذخیرہ چھوڑا ہے، جو ان کی جامعیت ورسوخ فی العلم پر بہت بڑی دلیل ہے، ایک طرف تو وہ مقاصد شریعت اور اس کے اسرار کی عظیم کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی شرح کرر ہے ہیں، دوسری طرف حدیث شریف کی بخاری شریف اور ترمذی شریف جیسی کتابوں کی تدریسی لحاظ سے بھی اور تالیفی لحاظ سے بھی خدمت کرر ہے ہیں، انھوں نے اپنے پیچھے بڑا علمی سرمایہ چھوڑا ہے، ترمذی شریف کی شرح ''تحفۃ الالمعی'' ۸؍جلدوں میں شائع ہوگئی ہے جو طلبہ اور علماء کے لیے رہنمائی کا کام کرتی رہے گی۔

مجھ سے انھوں نے فون پر بتلایا کہ آپ کی تحقیق سے جو ''بذل المجہود'' شائع ہوئی ہے اس کو میں پابندی سے اپنے مطالعہ میں رکھتا ہوں، میں نے کہا کہ اگر کوئی ملاحظہ ہو تو بتلائیے گا تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردوں، انھوں نے جواب دیا کہ اب تک تو کچھ ملا نہیں، اخیر میں میں نے اپنی کتاب ''الجامع الکبیر (سنن الترمذی) ومعہ الکوکب الدری علی جامع الترمذی'' کو ہدیۃً بھجوایا تو اس پر بھی بہت مسرت کا اظہار کیا کہ الحمدللہ متن کے ساتھ ہمارے اکابر کی باتیں عالم عرب میں بھی آگئیں اور صاحب تحفۃ الاحوذی کا آپ نے جابجا جواب بھی دیا ہے۔

ان کی کتاب ''تحفۃ القاری'' جو بڑی محنت اور مشقت اور ان کی نظر ثانی کے بعد ۱۲؍جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، وہ بھی طلبہ کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے، اس کے بعد میں نے اپنی ''الجامع الصحیح للإمام البخاری مع حاشیہ السہارنفوری'' جو پہلے ۱۵؍جلدوں میں اور بعد میں ۶؍جلدوں میں شائع ہوئی ہے دونوں کتابیں ان کی خدمت میں

بھجوائی، اس پر بھی بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، ہمارے دوست محترم مولانا محمد یونس صاحب جون پوری مرحوم شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم اسی نسخۂ بخاری میں پڑھاتے تھے، اس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔

مفتی صاحب مرحوم کو جب معلوم ہوا کہ میری تحقیق سے ''**المواهب اللطيفة فی شرح مسند الإمام أبی حنيفة**'' جو علامہ عابد سندھیؒ متوفی ۱۲۵۷ھ کی تالیف ہے جو شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے بھی شیخ ہیں، ۷/جلدوں میں بیروت سے طبع ہو چکی ہے، جب مجھے معلوم ہوا کہ اس کتاب کے وہ بہت مشتاق ہیں اور ان کی طرف سے ایک نمائندہ اعظم گڑھ آیا، اس ناچیز نے ہدیۃً یہ کتاب ان کو بھجوائی، انھوں نے اسے دیکھ کر فون پر بہت ہی مسرت وخوشی کا اظہار کیا کہ آپ سے بڑا قیمتی اور اہم کام ہو گیا۔

اسی طرح مولانا کی کتابوں پر نظر ڈالنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ منطق وفلسفہ، علم کلام پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے تھے، مبادئ الاصول جو فقہ کی بنیادی اصطلاحات پر مشتمل ہے معین الاصول اس کی شرح، آپ فتوی کیسے دیں، یہی نہیں بلکہ ان کی آسان صرف، آسان نحو بھی مبتدی طلبہ کے لیے شائع کی حتیٰ کہ آسان منطق، آسان فارسی قواعد اور مفتاح العوامل بھی تالیف کی، یہ وہ سارے رسائل ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی کتابوں کو پڑھاتے وقت انھوں نے طلبہ کو سامنے رکھ کر ان کو سہل بنا کر ان کے سامنے پیش کیا، دوسری طرف دورہ حدیث کے طلبہ وعلماء کے لیے ایسی عظیم الشان کتابیں تالیف کیں جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں، تیسری طرف ان کی فتاویٰ پر بھی گہری نظر تھی، انھوں نے امداد الفتاوی میں بھی بڑا تعاون کیا ہے۔

علامہ طاہر پٹنی کی کتاب ''المغنی'' کی بھی تحقیق وتعلیق کی ہے جو رجال کی اہم کتاب ہے، نیز فرق ضالہ کے رد میں بھی ان کی کئی کتابیں ہیں، ردّ قادیانیت پر بھی ان کا ایک قیمتی رسالہ ہے۔

میرا آخری سفر گذشتہ سال حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعزیت کے لیے سہارن پور کا ہوا، وہاں سے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کے لیے حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب کی ضیافت میں دیوبند حاضر

ہوا، حضرت مفتی سعید احمد صاحب تشریف لائے، انھوں نے تفسیر ''ہدایت القرآن'' کا نسخہ مجھے دیا، دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، میں نے عرض کیا کہ: حضرت! اللہ تعالیٰ نے آپ سے حدیث شریف وقرآن کریم اور فقہ وفتاویٰ میں بھی بڑا کام لیا، میں نے ان کو اپنے مدرسہ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ آنے کی دعوت بھی دی اور ان سے اپنے کتب خانہ کا ذکر کیا، میں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں ایک لاکھ کتابیں ہیں جن میں بہت سے قلمی مخطوطات بھی ہیں، ہمارے حضرت مولانا محمد یونس صاحبؒ جون پوری کئی مرتبہ ہمارے مدرسے میں تشریف لائے تھے اور وہ کتابوں کو دیکھتے ہی رہ گئے، مخطوطات کو بھی اور مطبوعات کو بھی، مفتی صاحب مرحوم نے بہت شوق سے سفر کرنے کا ارادہ کیا مگر مقدر سے اس کا موقع نہیں آیا۔

اس سے پہلے بنگلور میں مولانا مفتی شعیب اللہ خان صاحب کی دعوت پر جوان کے مدرسہ میں بہت بڑا اجلاس ہوا تھا، اس میں انھوں نے بہت سے اکابر علماء کو مدعو کر رکھا تھا، اس ناچیز کو بھی مدعو کیا تھا، ایک دن مغرب بعد پروگرام میں ناچیز کا بیان بخاری شریف کے افتتاح کا موضوع رکھا تھا، میں نے ۴۰ ر منٹ بیان کر کے اپنی بات ختم کر دی، اس کے بعد حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب کا بیان تھا، زندگی کے تجارب، طلبہ وعلماء کو نصائح، ان کا یہ بیان بہت قیمتی تھا طلبہ کے لیے بھی اور علماء کے لیے بھی اور عامۃ الناس کے لیے بھی، اس میں سب سے اہم بات یہ فرمائی کہ اپنے اکابر کے مسلک سے ہٹنا بہت خطرناک ہے، اس پر قائم رہیں، اس سے وابستہ رہنا یہ بڑی سعادت مندی کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی ان کا وقت آ گیا؛ لیکن انھوں نے اپنی تالیفات کے ساتھ ہزاروں شاگردوں کی تعداد چھوڑی، جس سے ان کا سلسلۂ فیض قیامت تک جاری رہے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم نے کثرت اولاد کے باوجود سب کو حفاظ وعلماء بنایا اور خود کفیل بنانے کی کوشش کی اور خود حضرت مفتی صاحب درس وتدریس کی خدمت للہ فی اللہ انجام دیتے رہے، مدرسوں کی تنخواہ سے اپنے آپ کو

مستغنی رکھا، یہ درحقیقت ان کے شیخ اوّل اور ہمارے استاذ و شیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے دامن فیض سے وابستگی کی برکت تھی۔

امسال دہلی شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے لیے اس ناچیز کے پاس خط آیا کہ آپ کسی کا نام اس کے لیے پیش کریں، اس ناچیز نے حضرت مولانا ہی کا نام پیش کیا تھا، اگرچہ وہ جائزہ کے خواہشمند نہیں تھے؛ لیکن جائزہ کے لیے شرف کی بات تھی کہ ان جیسے آدمی کی طرف اس کا انتساب ہو جائے۔

اس قحط الرجال کے دور میں ایسے عالم ربانی محدث وفقیہ واصولی ومتکلم کا اٹھ جانا بہت بڑا خسارہ ہے، خاص طور پر دارالعلوم دیوبند جو ''ام المدارس'' ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کا بدل عطا فرمائے، بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کا قیام اللہ کے غیبی نظام کے تحت ہوا اور ایسی جگہ پر ہوا کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اس سرزمین پر پہنچے جہاں آج دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہے تو ٹھٹک کر فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی خوشبو آرہی ہے، یہی مقولہ بزرگوں سے حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت بھی لکھا گیا ہے، جب کہ انھوں نے جہاد پر جاتے ہوئے دیوبند میں قیام فرمایا تھا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک بیان میں فرمایا کہ یہ دارالعلوم مشرق ومغرب کے مسلمانوں کے لیے ایک عدیم النظیر درس گاہ ہے جو اس دورِ تجدید میں بھی اسلاف کی امانت کو سنبھالے ہوئے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ یہاں سے ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں گے جو اس کی روایات وخصوصیات کو باقی رکھیں گے، آمین!

انشاء اللہ امید ہے کہ حضرت مولانا کے شاگردوں میں ان کے بھائی صاحب اور ان کی اولاد انھیں کے راستے پر چل کر روحانی وعلمی کمال حاصل کریں گے، اللہ الموفق۔

ان کے انتقال سے ۳/دن پیشتر اچانک اس ناچیز نے ان کی ٹیلیفون پر خیریت معلوم کرنی چاہی تو ان کے صاحبزادے نے بتلایا کہ والد صاحب بمبئی ہیں اور بیمار ہیں، تفصیل کا ذکر نہیں کیا تھا؛ لیکن مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ

شدید بیمار ہیں، دودن کے بعد دوبارہ پھر فون کیا اس کے دوسرے روز اس حادثہ کو سن کر بہت رنج ہوا اور اپنے مدرسہ کے طلبہ واساتذہ کو خصوصی ایصال ثواب کی تاکید کی اور خود بھی ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔

حضرت مفتی صاحب کے لیے ایک بڑا سرمایہ ان کی اولاد ہیں، ماشاء اللہ ۹/ بیٹے بقید حیات ہیں، سب حافظ قرآن ہیں، اکثر عالم ہیں، اسی طرح ان کی سب بہویں حافظ قرآن ہیں، یہ سن کر رشک آیا، ہمارے ۶/ اولا دنرینہ ہیں افسوس کہ صرف ایک صاحب عالم ہوسکے اور ایک پوتے، ہمارے کاموں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں نظر آرہا ہے، دیکھ کر رنج وغم ہورہا ہے، یہ بہت بڑی ابتلا ہے، بیشک جامعہ اسلامیہ مظفر پور اور مرکز ابوالحسن ندوی کی تعمیر اور ہماری مؤلفات اللہ کرے کہ یہ ہمارے لیے سرمایۂ آخرت بنے، اللہ تعالیٰ غیب سے انتظام فرمائے، آمین۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کے درجات بلند فرمائے اور ان کے علمی وروحانی فیض کو بقا و دوام عطا فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین!

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❁...❁...❁

اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی
نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی پچیسویں تاریخ کی صبح کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ دارفانی سے دارجاودانی کی طرف رحلت فرماگئے، (إنا للہ وإنا إلیہ راجعون) موت کوئی انہونی چیز نہیں، انسان کا پیدا ہونا ہی مرنے کی دلیل ہے، بس افسوس اس کا ہے کہ دنیا ایک عظیم ترین عالمِ دین سے محروم ہوگئی، علم کا ایک عظیم ترین ذخیرہ ان کے ساتھ رخصت ہوگیا، دنیا سے دینی علوم کے رخصت ہونے کی صورت یہی ہوتی رہی ہے کہ علم اہلِ علم کے ساتھ دفن ہوتا رہا، اس قحط الرجال کے دور میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدرالمدرسین بڑی تسلی کا سامان تھے، ان کے اندر علوم کی گہرائی وگیرائی تو تھی ہی، اسی کے ساتھ جادو بیانی کی دولت سے سرفراز تھے، مشکل سے مشکل مسئلہ کو بڑی آسانی سے سمجھا لیتے تھے، آسان سے آسان الفاظ اور سہل ممتنع تعبیرات ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی رہتیں، بڑے پُروقار لب ولہجہ میں سامعین کے کانوں کے راستے سے ان کے دل ودماغ تک رسائی حاصل کر لیتے تھے۔

مولانا مرحوم نے جہاں مشکل سے مشکل موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، وہیں آسان سے آسان تصنیفات سے نسل نو کی علمی آبیاری بھی فرمائی ہے، ''حجۃ اللہ البالغہ'' جیسی دقیق ترین کتاب کی شرح لکھ کر آپ نے علمائے دیوبند کے ذمہ تین سوسالہ قرض کی ادائیگی فرمائی، مؤقر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے مبارک بادی کی تجویز کے ذریعہ موصوف کی حوصلہ افزائی فرمائی، صحیح بخاری، جامع ترمذی اور طحاوی شریف کی شروحات نے آپ کے علمی

مقام کو خوب متعارف کرایا، اصول تفسیر میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی تصنیف ''الفوز الکبیر'' کی تعریب کی توفیق بھی نصیب ہوئی جو آج دارالعلوم دیوبند کے نصاب کا جزء ہے، اسی طرح علم منطق وفلسفہ کو مبتدی طلبۂ کرام کے ذہن سے قریب کرنے کے لیے ''مبادئ الفلسفہ'' اور ''آسان منطق'' کی ترتیب کی ذمہ داری بھی مجلس شوریٰ نے موصوف کے سپرد فرمائی؛ چنانچہ پندرہ بیس سال سے یہ تینوں کتابیں دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں داخل ہیں، مولانا مرحوم پہلے خوش نصیب مصنف ہیں جن کی تین کتابیں مادر علمی میں پڑھائی جاتی ہیں اور دوسری تصانیف: آسان نحو، آسان صرف، آسان فارسی قواعد، مبادی الاصول (اصول فقہ) وغیرہ دیگر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ تصانیف سے ہر ایک اندازہ کرسکتا ہے کہ موصوف کو جملہ علوم شرعیہ میں مہارتِ تامہ حاصل تھی، ایسی شخصیت کی رحلت سے کتنا بڑا خلا ہوا ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ناچیز کو جب وفات کی اطلاع ملی تو بے ساختہ زباں پر آیا:

مَا کان قیسٌ هُلْکُهٗ هُلْکُ واحدٍ
ولکنّهٗ بنیانُ قومٍ تَـهدّما

(قیس کی وفات ایک شخص کی وفات نہیں؛ بلکہ (اس سے) قوم کی عمارت منہدم ہو کر رہ گئی)، فوراً ہی دولت کدہ پر پہنچا اور صاحب زادوں کو تعزیتِ مسنونہ پیش کی اور کہا: ''یہ محض آپ ہی کے والد نہیں تھے، یہ تو پوری امتِ مسلمہ کے عظیم ترین سرپرست تھے! مسلک دیوبند کی بے باک ترجمانی کی جب بھی ضرورت پیش آئی مولانا مرحوم نہایت ہی اچھے انداز میں اس کی تکمیل فرماتے تھے، موصوف کو میں نے اڑتالیس سال سے دارالعلوم میں دیکھا؛ کیوں کہ ان کا اور میرا تقرر ایک ہی دن ہوا ہے، صبح وشام کا فرق تھا، موصوف نے ہمیشہ دارالعلوم کے مفاد کو مقدم رکھا، ہر مجلس میں ان کے خلوص نے متأثر کیا، انھوں نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، وہ دوستوں سے کبھی منھ نہ پھیرتے تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کو نعم البدل عطا فرمائے، ان کی رحلت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کو پُر فرمائے''،

وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

چلا گیا وہ اجالے سمیٹ کر اپنے

حضرت مولانا کلیم صدیقی صاحب
مبلغِ اسلام، پھلت، مظفر نگر

فی الحقیقت ام المدارس دارالعلوم دیوبند نے اپنی تاسیس سے لے کر آج تک برصغیر کے مسلمانوں کی جو علمی، دعوتی، اصلاحی اور سیاسی خدمت اور قیادت کی ہے، اور خالق کائنات علی کل شئی قدیر نے دارالعلوم کے بانیین اور شروع سے لے کر اس کی انتظامی اور تدریسی خدمات پر مامور موفق من اللہ علماء، مشاہیر اور ربانی مقتدایان کے اخلاص کی وجہ سے، اس ادارہ اور اس سے وابستہ اور فارغین کی خدمات میں جو برکت ومقبولیت رکھی ہے، اس سے واقف دنیا کا ہر مسلمان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند کی حیثیت اللہ کے فضل سے عالم اسلام میں علمی، دعوتی، اصلاحی اور دینی دارالخلافہ کی ہے، اور اس بابرکت، مؤقر اور محترم ادارہ کا دارالحدیث جو اپنے خاص امتیازات کے ساتھ اپنی ایک شان رکھتا ہے، اس کی مسند صدارت پر فائز ملک کی مقتدر ترین شخصیات برصغیر کی علمی تاریخ کی شان سمجھی جاتی رہی ہیں، اس دارالحدیث کی مسند صدارت پر فائز شخصیت کو دارالعلوم کا شیخ الحدیث کہا جاتا ہے۔

اس طرح کسی عالم دین کا دارالعلوم کی کرسی صدارت پر فائز ہوکر شیخ الحدیث بن جانا عالم اسلام کے مسلمانوں کی علمی قیادت کا تاج عطا ہوجانا ہے۔ گویا دارالعلوم کا شیخ الحدیث پورے عالم کے اہل علم کے نزدیک امیر المومنین فی الحدیث کا منصب نشین سمجھا جاتا ہے۔ اس اہم ترین منصب پر دارالعلوم کی تاسیس سے لے کر آج تک، بڑے علمائے ربانین اور آسمان علم خصوصا علم حدیث کے آفتاب وماہتاب علوم کی سربراہی کی خدمت انجام

دیتے رہے ہیں۔

ان مقتدایان امت، جبال العلم شخصیات میں، جنھوں نے نہ صرف دارالعلوم کی مسند صدارت کے منصب کا حق ادا کیا، بلکہ ان کی وجہ سے اس مؤقر اور متبرک ترین منصب کی شان میں اضافہ ہوا، اور اس کو چار چاند لگے، ایک مرکزی نام نامی، ہمارے مخدوم ومحسن، استاذ الاساتذہ، نہ صرف حدیث پاک بلکہ اکثر اسلامی علوم وفنون کے میر کارواں، حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری، جن کو ۲۵ رمضان المبارک سے قبل ہم اپنا سرپرست اور مہربان تسلیم کرتے ہوئے، مدظلہ العالی اور دامت برکاتہم العالیہ لکھتے اور بولتے تھے۔اور اب علیم وحکیم ربّ کائنات کے پہلے سے طے شدہ قضا وقدر کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ، اور نور اللہ مرقدہ لکھنے پر مجبور ہیں۔اور جو ابھی ۲۵ ؍رمضان المبارک کو ممبئی میں مختصر علالت کے بعد ایک شفاخانہ میں مقیم رہ کر اپنی زندگی بھر کی خدمات کا اجر عظیم حاصل کرنے کے لئے اس دنیا کے قید خانہ کو خیر باد کہہ کر لاکھوں لوگوں، بلکہ کروڑوں سوگواروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے کریم رب کی جوار رحمت میں چلے گئے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحبؒ پچاس سال تک دارالعلوم کی مسند تدریس پر متمکن رہ کر مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھاتے رہے، اور جو کتاب بھی ان کو تدریس کے لئے سپرد کی گئی، وہ اس درس کی عظمت کا نشان بنے رہے۔ان کے درس کا امتیاز تھا کہ دل چسپ کہانیوں کی طرح طلباء کی عقل اور ذوق کی سطح پر آ کر بڑی بڑی کتابوں کے مشکل ترین مضامین کو اس طرح طلباء کے شعور میں اتار دیتے، کہ پھر وہ علم طالب علم کو مستحضر ہوجاتا۔

دارالعلوم دیوبند کو شروع ہی سے آسمان علم کے آفتاب وماہتاب علماء، تدریس کے لئے میسر رہے ہیں، اس کی تدریسی تاریخ میں طلباء میں مقبول ترین اساتذہ کی کوئی مختصر سے مختصر فہرست مرتب کی جائے، تو اس فہرست میں حضرت مفتی سعید صاحبؒ کا نام نامی، قیادت کرنے والوں میں ہی لکھنا پڑے گا۔وہ اپنی مسند تدریس کے حقوق کو

نبھانے والے اساتذہ میں تھے، جو تدریس کو آخری درجہ کی عبادت خیال فرماتے تھے، اور پھر اس کو پابندی اور پوری تیاری کے ساتھ، طلباء کا حق سمجھ کر اس ذمہ داری کو نبھانا وہ دینی فریضہ خیال فرماتے تھے۔ تدریس میں اس طرح انہماک اور پابندی کا حق ادا کرنے کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ پوری دنیا میں اپنے اہل تعلق منتسبین، خصوصا دنیا کے کونے کونے سے آنے والے اپنے شاگردوں سے تعلق کا بھی نہ صرف حق نبھاتے تھے، بلکہ نہ جانے کتنے اداروں، جماعتوں اور تحریکوں سے وابستہ علماء اور صلحاء، اس کے علاوہ ام المدارس دار العلوم دیوبند کی عقیدت ومحبت میں دار العلوم کی زیارت کے لئے حاضری دینے والے بھی وہاں کی حاضری حضرت مفتی صاحب کی زیارت اور ملاقات کے بغیر تشنہ سمجھتے تھے، اور حضرت سے ملنے کے مشتاق رہتے تھے، حضرت مفتی صاحب کا مزاج، اوقات کے سلسلہ میں نظام الاوقات کی پابندی کا تھا، اور وہ بہت خوش

اوقات علماء میں تھے، ان کی وقت کی قدردانی اور شاید تقوی کی وجہ سے اللہ تعالی نے حضرت کے وقت میں ایسی برکت عطا فرمائی تھی، کہ ہر طرح کے مسائل میں مشورے، رہنمائی اور سرپرستی کے لئے حاضر ہونے والے ہزاروں ہزار خدام حضرت کے در سے تشنہ نہیں لوٹتے تھے، اور حضرت تمام کاموں میں ان کی رہنمائی فرما کر مفید مشوروں سے نوازتے تھے، یہ بات حضرت مفتی صاحب کی کھلی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے۔ وہ شاگردوں اور اہل تعلق کی نشست وبرخاست، ان کے ظاہر اور باطن ہر چیز کی فکر فرماتے تھے اور ان کی اصلاح فرماتے تھے۔

ایک بار عصر کی نماز کے بعد حاضری ہوئی تو علماء کرام کا ایک وفد جو کئی شہروں سے دورہ پر آیا ہوا تھا، ملاقات کے لئے آیا، شاید ان میں سے اکثر حضرت کے شاگرد تھے، اتفاق سے ان میں سے اکثر ذرا موٹے تھے، اور ان کا پیٹ بڑھا ہوا تھا، حضرت نے اسی تعلق سے اہل علم اور اہل دین کے موٹاپے کے خلاف تقریر فرمادی اور بڑی بے تکلفی سے فرمایا کہ پتہ نہیں مولوی کس چکی کا پسا کھاتے ہیں کہ بس مولوی بنے اور توند نکلنا شروع ہوئی، بھائی دبلا پتلا آدمی بھی مولوی کہلا سکتا ہے۔ اتنی بے تکلفی سے گویا ان کو صحت کا خیال نہ رکھنے پر ڈانٹا ہو، مگر چونکہ اندر کی

خیر خواہی، اور شفقت کے جذبہ کے ساتھ فرمایا تھا، اس لئے جب اس حقیر نے باہر نکل کر ان تمام علماء سے الگ الگ بات کی، تو کسی نے بھی اس طرح ان کے ڈانٹے سے ذرا بھی گرانی محسوس نہیں کی، بلکہ سب نے عزم کیا کہ اب وزن کم کریں گے۔

مسند تدریس کا نہ صرف حق ادا کرنے، بلکہ دار العلوم کی مسند درس کی شان کو دوبالا کرنے، اور پورے عالم میں پھیلے ہوئے اپنے ہزاروں ہزار بلکہ لاکھوں لاکھ شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کے دینی کاموں، بلکہ ذاتی زندگی میں رہنمائی، بلکہ سرپرستی فرمانے کے ساتھ ساتھ، مفتی صاحبؒ نے مختلف علوم وفنون میں تصنیف کا جو عظیم الشان کام کیا، وہ خود آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ ولی اللّٰہی درس گاہوں سے وابستہ اپنی ہر طرح کی علمی نسبت حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ سے کرنے والے لاکھوں لاکھ علماء پر قرض تھا کہ وہ ولی اللّٰہی علوم سے موجودہ دور کے علماء اور صلحاء کو روشناس کرانے کے لئے استفادہ کی شکل پیدا کریں، خصوصاً اسلامی کتب خانوں کی شان سمجھی جانے والی، علوم اسلامیہ کی ممتاز ترین شاہکار تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' جس پر نہ صرف برصغیر کے علماء ناز کرتے ہیں بلکہ عرب وعجم کے علماء اور مشاہیر بھی اس کی عظمت کے معترف ہیں، اس بات کے مشتاق تھے کہ موجودہ زمانہ کی سطح کے مطابق اس کی کوئی شرح منظر عام پر آئے، تاکہ ان علوم عالیہ سے ہمیں بھی استفادہ کا موقع ملے، حضرت مفتی صاحب کو یہ حق تھا کہ وہ اس کتاب کی زمانہ کی سطح کے مطابق شرح فرما کر اس سے استفادہ کے لئے راہ ہموار کریں، پوری امت مسلمہ خصوصاً برصغیر کے علماء پر تقریباً تین سو سال سے یہ قرض چلا آرہا تھا جو حضرت مفتی صاحبؒ نے امت کی طرف سے تن تنہا ادا کیا، اور ایسی عظیم الشان، ایسے منفرد علوم پر مشتمل تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کی معرکۃ الآراء شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے نام سے تحریر فرمائی، جو واقعی زمانہ کے علماء کے لئے اسم بامسمی، اللہ کی بڑی رحمت ہے۔

مولانا کاشف الہاشمی کی تفسیر ''ہدایت القرآن'' کی تکمیل خود مفتی صاحب کا ایک بڑا کارنامہ، اور فہم قرآن کی

شاہ کار مثال ہے جو حضرت مفتی صاحبؒ نے انجام دی۔اس کے علاوہ حدیث وفقہ حتی کہ صرف ونحو اور منطق اور علم کلام پر ان کی کئی بیش قیمت تصنیفات،طالبان علوم کی پیاس بجھانے کے لئے مسلسل اسلامی علوم کی شان بڑھا رہی ہیں۔

قرآن وحدیث کا کوئی مسئلہ ہو یا فقہ فتاویٰ کی کوئی بحث،مفتی صاحبؒ کا امتیاز یہ تھا کہ ان کی رائے بہت پختہ اور مضبوط علمی دلائل پر قائم ہوتی تھی،جس کی وجہ سے ان سے استفتاء کر کے جواب حاصل کرنے والا اندر سے مطمئن ہو کر لوٹتا تھا،وہ آسمان علم کے شہ سوار،ایسی علمی شخصیت تھے کہ بڑے بڑے اہل علم کو ان کی خصوصیات،ان کے علمی مقام،ان کے کردار،ان کی فکری سطح پر لکھنے میں اور ان پر قلم اٹھانے میں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا رہے گا۔ایک دیہاتی اور گنوار حضرت مفتی صاحبؒ کے اوصاف کہاں بیان کر سکتا ہے،پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ان کے باصلاحیت شاگرد اور منتسبین،حضرت کے کردار اور زندگی کے مختلف گوشوں پر تصنیفات اور ان کے سوانح لکھیں گے،جو بعد میں آنے والوں کے لئے مشعل راہ بنیں گے،اس حقیر نے تو بس اپنے غم کو ہلکا کرنے،اور اس صدمہ میں صبر کی ہمت حاصل کرنے اور تسلی کے لئے بہانہ تلاش کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے کہ مفتی صاحب کا سانحہ وصال جہاں پورے عالم اسلام کا واقعی بڑا حادثہ ہے(جو موجودہ زمانہ میں جب مدارس کی اتنی کثرت اور طلباء کی اس قدر بھیڑ بھاڑ کے باوجود رجال کا اس قدر قحط ہے،کچھ زمانہ پہلے حضرت مفتی صاحب کی ہی ایک تقریر وائرل ہوئی تھی کہ ام المدارس جہاں پر بڑے بڑے اہل علم وہاں کی جاروب کشی کو بھی اپنے لئے فخر کی بات گمان کرتے ہیں،وہاں پر کسی ادنیٰ خدمت کے موقع کو اپنے کے لئے صد شرف سمجھتے ہیں،وہاں پر کسی فن کا کوئی مرکزی عالم رخصت ہوتا ہے تو اس کی جگہ اس مسند کا حق ادا کرنے والا نہیں مل پاتا)اللہ کی ذات فعال لما یرید،علی کل شئی قدیر ہے،اپنی قدرت کاملہ سے ازہر ہند کی نسبت سے اس خلا کو پر کرنے کے لئے خرق عادت کے طور پر کوئی نظم فرمادیں۔مگر ملک کی سطح پر تو بظاہر کوئی ایسی شخصیت،ہم جیسے چھوٹے کی عقل وشعور کی رسائی کی حد تک نہیں دکھائی

دیتی جو حضرت مفتی صاحب کے وصال سے جو خلا ہو گیا ہے، اس کو پورا کر سکے، اور اس عظیم منصب کے شایان شان درس کا حق ادا کر سکے۔ اس طرح حضرت مفتی صاحب کا حادثہ وفات پورے عالم اسلام کے لئے بڑا سانحہ ہے، مگر اس حقیر کو تو یہ لگتا ہے کہ ملی اور ملکی حادثہ سے زیادہ مفتی صاحب کا حادثہ وفات، اس کم مایہ حقیر اور ہماری پوری دعوتی تحریک کے لئے بڑا حادثہ اور محرومی ہے، اس لئے کہ میرے حضرت والا کے تعلق کی برکت سے دعوت سے امت کی مجرمانہ غفلت کے دور میں رب کریم نے جو ٹوٹی پھوٹی آواز لگوادی ہے، اور الحمدللہ ملک اور بیرون ملک دنیا میں امت مسلمہ کے افراد اس آواز اور ایک بھنگی کی منادی پر کان دھر کر کھڑے ہو کر دعوت کی ضرورت کو سمجھ رہے ہیں، اور الحمدللہ ابتدائی مرحلہ میں بہت سے لوگ عملاً دعوت کا کام کرنے میں لگ گئے ہیں، ہماری اس تحریک کے لئے سب سے زیادہ انشراح کے ساتھ، انتہائی شفقت، اپنائیت، اور قدردانی فرماتے ہوئے جس طرح حضرت مفتی صاحبؒ ایک بڑے سرپرست کی طرح تائید اور رہنمائی فرماتے تھے، ہم لوگوں کو ان کا کوئی قائم مقام، اس معیار کا، دور دور تک نہیں دکھائی دیتا۔

ہمارے محب وحبیب، رفیق اور داعی، مفتی روشن شاہ صاحب نے لوگوں کے ڈر اور جھجک کے پردے ہٹا کر دستر خوان اسلام پر آنے والے نووارد مہمانوں کی تڑپا دینے والی داستانوں پر مشتمل مجموعہ ''نسیم ہدایت کے جھونکے'' کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا اور اس کی پہلی جلد شائع ہو کر منظر عام پر آئی، تو اس زمانہ میں یہ حقیر ایک روز ایک سفر کے دوران ہریانہ جاتے وقت، حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، ہم لوگوں کا خیال تھا کہ عصر کی نماز حضرت والا کے محلہ کی مسجد میں پڑھ کر مسجد ہی میں حضرت سے ملاقت کر کے آگے کے سفر پر روانہ ہو جائیں گے، نماز کے بعد حضرت سے ملاقات ہوئی، انھوں نے پرتپاک انداز میں معانقہ فرمایا، اور دیر تک ماں کی طرح سینے سے چمٹائے رہے، ہم لوگوں نے چند منٹ کے بعد اجازت چاہی، تو فرمایا کہ چائے پیئے بغیر کیسے جا سکتے ہیں، چلئے ساتھ میں چائے پیئیں گے اور اس حقیر کا ہاتھ ایک بے تکلف دوست کی طرف بغل میں دبا کر ساتھ ساتھ چل

دیئے، حتی کہ زینہ پر بھی اسی طرح بغل میں ہاتھ دبا کر چلتے رہے، یہ حقیر ادباً ذرا سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا، ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس اپنی مسند اور تکیہ پر بٹھا لیا، اور اپنے قریب کرتے رہے اور فرماتے رہے، تم تو دور بیٹھ رہے ہو، مل کر بیٹھو، بالکل اس طرح چمٹا کر بیٹھا لیا جیسے ماں اپنے بچے کو آنچل میں چھپا لیتی ہے، آج تک یہ حقیر اس محبت سے چمٹا کر بٹھانے کا مزا محسوس کرتا ہے، جیسے پرندہ اپنے بچوں کو اپنے پروں میں چھپا لیتا ہے، اور فرمایا مولوی کلیم میں نے آپ کی وہ کتاب ''نسیم ہدایت کے جھونکے'' رات کی ایک نشست میں ہی پڑھ ڈالی، اور درمیان میں اسے چھوڑ نہیں سکا، اور اسے پڑھتے ہوئے میں اپنے دل اور آنکھوں پر چاہتے ہوئے بھی قابو نہ رکھ سکا، روتا رہا اور پڑھتا رہا، اور اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھے ایسا لگا، جیسے کچھ وقت میں نے خیر القرون میں گذارا۔

اس کے بعد ہمیشہ اہل علم اور شاگردوں کے سامنے حتی کہ دارالحدیث میں درس کے دوران بھی ہم لوگوں کی ٹوٹی پھوٹی دعوتی کوششوں کا بہت عنایت اور محبت سے تذکرہ فرماتے، اور ہر موقع پر حوصلہ افزائی فرماتے۔

ایک زمانہ میں اس حقیر کے ایک محب ومحسن اور بڑے، جن سے اس حقیر کا بہت ہی دیرینہ تعلق بھی تھا، نے اس گنوار کی بعض کوتاہیوں اور غلطیوں کی اصلاح کے لئے خیر خواہی، اور دین اور اہل دین کو دین کے لئے مضرکمیوں سے باخبر کرنے کے لئے ایک کتاب تحریر فرمائی، جس کی دیوبند میں بھی بڑی اشاعت ہوئی، اس زمانہ میں یہ حقیر حاضر خدمت ہوا، تو حضرت بے حد شفقت سے ملے اور فرمایا، مولوی کلیم کام کرنے والوں کو آگے کی طرف دیکھنا چاہئے۔ فرمایا کہ میرے شیخ الحدیث بننے کے بعد جو کتابیں میرے خلاف لکھی گئیں، کچھ لوگ میرے خیر خواہ بھی میرے پاس لاتے تھے کہ آپ جواب لکھیں، یا ہمیں اجازت دیں کہ ہم جواب لکھیں، ہم نے کوئی کتاب پڑھی بھی نہیں، نہ جواب دیا اور نہ جواب دینے کی کسی کو اجازت دی۔ لوگ تھک کر خود وہیں بیٹھ گئے۔ بعد میں مفتی صاحب نے اپنی معرکۃ الآراء تفسیر ''ہدایت القرآن'' میں نسیم ہدایت کے جھونکے کا بڑی محبت کے ساتھ تذکرہ فرمایا۔

ہماری بستی پھلت میں علماء کے لئے دعوتی تربیت کا کیمپ لگایا گیا تو اس کے اختتامی پروگرام کے لئے اس حقیر کی حسرت تھی کہ اس بار حضرت مفتی صاحبؒ کو بلانا ہے، اس حقیر نے اپنے جواں سال، قابل رشک، سعید نواسے اور داعی مولوی عمر ناصحی کے ساتھ ایک صاحب کو دعوت دینے کے لئے بھیجا، ہمارے قابل رشک داعی جناب مولانا اسلم کاظمی، جو دیوبند آنے والوں اور اساتذہ وطلباء کے لئے ہمارے نمائندہ اور واسطہ رہتے ہیں، وہ ان لوگوں کو لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک سال تک بہت سے کام اپنے ذمہ لگا لئے ہیں، ایک سال تک تو نہیں جا سکتا۔ پھر کچھ خیال آیا تو فرمایا: ایک نوجوان عالم بیٹھے تھے، مان لو یہ غیر مسلم ہیں آپ ان کو اسلام کی دعوت دیجئے، کیسے ان کو مسلمان کریں گے؟ مولانا اسلم صاحب نے قرآن مجید کی آیات سے توحید، آخرت اور رسالت کی دعوت دی، اور کلمہ پیش کیا، تو فرمانے لگے تم نے ویدوں اور گرنتھوں کے اشلوک سنسکرت میں تو پڑھے ہی نہیں، تاکہ یہ مانوس ہوتے۔ اسلم بھائی نے کہا کہ مولانا کلیم صاحب یہ کہتے ہیں کہ سب انبیاء کے ساتھ ان کا کام ختم ہوا، تو معجزے بھی ان کو وقتی عطا کئے گئے، اور ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گئے، مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تو قیامت تک کے انسانوں کے لئے ہے، تو ابھی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام باقی ہے، تو آپ کو ایسا زندہ وتابندہ معجزہ قرآن کی شکل میں دیا گیا جو قیامت تک اپنے اعجاز کے ساتھ زندہ وتابندہ رہے گا۔ ان کی کتابوں کی دلیل دے کر بات کرنے میں بڑی طوالت ہے، اور وہ کام بہت واقفیت اور مہارت کا ہے، مگر دعوت بالقرآن کا راستہ انتہائی سادہ، آسان اور ہر سطح کے اور ہر مذہب کے لئے ایک عصائے موسیٰ کی طرح سارے ساحروں کے سحر کا توڑ ہے، حضرت بہت منشرح ہوئے اور فرمایا کہ مولوی اسلم گاڑی کا نظم کرو پُھلت چلیں گے، پھر تشریف لائے، پوری کارگذاری سنی، بے حد دعائیں دیں، بعض مشورے بھی عنایت فرمائے، اور پچاس شرکاء تھے، سب کو پچاس پچاس روپئے عنایت فرمائے۔

ابھی ممبئی سفر سے کچھ دن پہلے اس حقیر کے رفیق اور سفر وحضر کے اولاد کی طرح ساتھ رہنے والے جوان

داعی، عزیز مولوی سعید پالن پوری، خدمت عالیہ میں دیوبند حاضر ہوئے، دوپہر کا وقت تھا، تعارف کے ساتھ حاضری کی اجازت چاہی، تو باہر ہی تشریف لے آئے اور فرمایا آج کل ملاقات بالکل بند ہے، اور اس وقت تو میں کبھی بھی نہیں ملتا، (شاید قیلولہ کا وقت یا کسی دوسری مصروفیت کا وقت رہا ہوگا) مگر تم بھائی کلیم کے یہاں سے آئے ہوتو آجاؤ، ان سے بھی فوراً یہ کہا کہ یہ میرا شاگرد ہے، تم یہ خیال کرو کہ یہ ہندو ہے، اس کو دعوت کیسے دوگے، میرے سامنے دعوت دے کر بتاؤ؟ ان کی گفتگو سن کر بہت خوش اور مطمئن ہوئے، پھر فرمانے لگے مولوی کلیم کی یہ بات بہت دل کو لگتی ہے اور بہت مضبوط ہے کہ وہ قرآن سے استدلال کرتے ہیں، یہ بھی فرمایا کہ شاید اسی لئے اللہ نے ان کے کاموں میں برکت عطا فرمائی ہے، پھر مولوی سعید سے فرمایا کہ پالن پور کے علاقہ کے نوجوان علماء کو لے جاؤ مولوی کلیم کے پاس، اور دعوت سکھا کر دعوت سے لگاؤ، اور جتنا زیادہ ہو سکے یہ کام کرو۔

اس حقیر کے ہر وقت کے حاضر باش رفیق اور سفر وحضر میں اس حقیر کی ہر کڑوی کسیلی کو نظر انداز کر کے دن رات اس حقیر کی راحت کا خیال رکھنے والے ساتھی، عزیزی حافظ مبشر ایک بار ممبئی کے سفر کے لئے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر تین نمبر پلیٹ فارم کی مسجد میں اپنی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے، خوش قسمتی سے اسی راجدھانی ٹرین سے حضرت مفتی صاحب بھی ممبئی کے سفر پر تشریف لے جا رہے تھے، دہلی کے کسی اہل تعلق کے یہاں حضرت نے دوپہر کی دعوت قبول فرمائی تھی، مگر دیوبند سے دہلی سفر میں بہت تاخیر ہوگئی، تو حضرت مفتی صاحب نے میزبان سے فرمایا کہ کھانا اسٹیشن پر تین نمبر پلیٹ فارم کی مسجد میں لے کر آجائیں، حضرت مسجد میں پہنچے، نماز کے بعد حافظ مبشر سے ملاقات ہوئی، جب معلوم ہوا کہ پھلت سے آئے ہیں اور اس حقیر کے ساتھی ہیں، تو بہت تپاک سے ملے، میزبان کے کان میں کچھ فرمایا شاید اجازت لی ہوگی، اور پھر فرمایا کہ آپ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے، ساتھ میں کھانا کھلایا اور فرمایا، بھائی کلیم کو اللہ نے بڑے کام کے لئے چنا ہے، ان کا کوئی تعلق والا بھی مل جاتا ہے، تو خوشی ہوتی ہے۔

اتنی بڑی شخصیت کی یہ خوشی اور شفقت ہماری پوری دعوتی تحریک کے لئے بڑا سرمایہ تھی، یقیناً اس کی برکات اور حضرت کی دعاؤں کی تاثیر تو باقی رہے گی۔ مگر وقتاً فوقتاً ادھر سے ادھر، یہ شفقت وعنایت کے جملے، اور یہ حوصلہ افزائی کی کمی تو تاعمر ستاتی رہے گی۔ سال کے درمیان میں دارالحدیث میں آواز ختم ہوجانے کا واقعہ پیش آیا تو شاید وہ ایک الارم تھا، اس کے بعد حضرت ممبئی تشریف لے گئے، ابھی رمضان سے قبل ہمارے محب وحبیب جناب حافظ محمد آصف صاحب ساکن جوگیشوری، جو علماء اور اکابرین کے سچے عاشق زار، اور ہمارے ان خوش قسمت، قابل رشک دوستوں میں ہیں، جنھیں اکثر اکابرین کی میزبانی کا شرف اللہ تعالی نے عطا فرمایا ہے، وہ گویا علماء کے میزبان سے مشہور ہیں ان کے یہاں حضرت مفتی صاحب تشریف لائے، رخصت ہونے سے پہلے اپنے خاندانی حالات، ابتدائی تعلیم، بھائیوں کی تعلیم، راندیر اور دیوبند میں تقرری، شادی اور گھریلو حالات، خود ہی بڑے مزے لے کر سنائے، جو حافظ آصف نے فون میں ریکارڈ کر لئے اور حضرت کے وصال کے بعد وہ آڈیو از راہ محبت ایک قیمتی ہدیہ کے طور پر اس حقیر کو دے دی، جس کو عزیز مولوی سعید پالن پوری نے نقل کر کے ارمغان کے اسی شمارہ میں شائع کیا ہے۔ اس حقیر نے حافظ صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے تو یہ قیمتی تحفہ عیدی میں بھیج دیا۔

جناب حافظ آصف کے فون سے اطلاع ملی کہ حضرت کو دل کا اٹیک ہوا ہے، حضرت کی چند سال قبل بائی پاس سرجری ہوئی تھی، حضرت کو ہوسپٹل لے جارہے ہیں، اس کے بعد بھی، اللہ تعالی انہیں اپنی شایان شان اجر عطا فرمائے وقتاً فوقتاً حال سے باخبر کرتے رہے، بعد میں ایک روز بتایا کہ ہم لوگ ابھی حضرت کی خدمت میں ہو کر آئے ہیں، الحمد للہ طبیعت کافی اچھی ہے، اور آج حضرت نے خود طلب فرما کر کچھ کھانا بھی تناول فرمایا ہے، اور یہ بھی بتایا کہ آپ کا سلام اور پیغام بھائی نے حضرت کو پہنچایا، حضرت بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں، یہ بھی بتایا کہ کرونا ٹیسٹ حضرت کا ہوا ہے جس کی رپورٹ کل تک آئے گی، بعد میں معلوم ہوا کہ رپورٹ پوزیٹو آ گئی مگر طبیعت اچھی ہے، اچانک ۲۴ر کی رات میں ان کا فون آیا کہ حضرت کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی ہے

آپ دعا میں لگ جائیں، نہ جانے کتنے لوگ دعا میں لگ گئے، مگر اجل کا وقت تو دعا سے کہاں ٹلنے والا ہے۔ ۲۵/ رمضان کی صبح سارے عالم اسلام نے یہ خبر سنی اور پڑھی کہ امت کا وہ غم خوار امیر المومنین فی الحدیث کروڑوں سوگواروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر جود وعطا کے اس جشن شاہی میں اپنے محبوب حقیقی کی آغوش رحمت میں ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو کر چلا گیا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ کورونا ہونے کے باوجود کچھ بااثر لوگوں کی کوشش سے پروٹوکول کے خلاف حضرت والا کو غسل بھی دیا گیا، اور چند خدام کو باقاعدہ تدفین کی اجازت بھی دی گئی، ہمارے آصف صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جنہیں مسجد میں اور قبرستان میں دونوں جگہ نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔

حضرت مفتی صاحب دنیا سے تشریف لے گئے، مگر الحمد للہ حضرت کے نو صاحبزادے، جو سب عالم دین ہیں اور لاکھوں لاکھ شاگرد رشید، بڑی تعداد میں تصنیفات اور آپ کی پوری سیرت، و اخلاق و کردار کی عظمت رہتی دنیا تک امت مسلمہ کے لئے مشعل راہ اور مہمیز بنی رہے گی۔

قارئین ارمغان سے درخواست ہے کہ حضرت مفتی صاحب اس کی پوری دعوتی تحریک کے مرکزی سرپرست محسن اور مربی تھے اس لئے شاید دوسروں سے زیادہ ہم پر، اور ہمارا زیادہ حق ہے کہ ہم حضرت والا کے لئے تا عمر ایصال ثواب کرتے رہیں، ادارہ ارمغان حضرت کے تمام پس ماندگان، دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم کے ذمہ داران کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے۔

❁...❁...❁

مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

حضرت مولانا مفتی محمد یوسف تاؤلوی صاحب
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

میرا ان سے بیت دیرینہ تعلق ہے اور بہت بے تکلفی بھی رہی۔ میں انکا بہت قدرداں بھی ہوں۔ اوران کی ۲ خوبی تو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں (۱) انکی محنت جو آخری دم تک رہی (۲) حق پسندی بہت دفعہ ایسا ہوا کہ وہ کسی بات پر مصر ہیں۔ جب میں نے اسکے خلاف معتبر کتب میں دکھایا تو فورا رجوع بھی کیا اور شکریہ بھی ادا کیا۔ یہ باتیں عامۃ لوگوں میں کم پائی جاتی ہیں۔ گو کچھ دنوں سے بعض لوگوں نے دیرینہ تعلقات میں خلل ڈال رکھا تھا مگر جب ملاقات ہوتی تھی ،تواسی دیرینہ انداز پر ہی ہوتی تھی اور وہی مجھے امروہہ سے دارالعلوم لانے والے ہیں۔ واقعہ تفصیلی ہے۔ خیر

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سعید احمد پالنپوری صاحب کا ۱۹ رمئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح انتقال ہوگیا، وہ برصغیر کی مشہور علمی شخصیت تھے، ان کی لکھی ہوئی کتابوں اور شروح کو اللہ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی تھی، انہوں نے چھوٹی بڑی کوئی تیس کے قریب کتابیں لکھی ہیں، جن میں بارہ جلدوں میں بخاری شریف کی شرح ”تحفۃ القاری“ آٹھ جلدوں میں ترمذی شریف کی شرح ”تحفۃ الالمعی“ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی حجۃ البالغۃ کی پانچ جلدوں میں شرح ”رحمۃ اللہ الواسعۃ شامل ہیں ،انہوں نے آٹھ جلدوں میں قرآن کریم کی تفسیر بھی ”ہدایت القرآن“ کے نام سے لکھی ہے اور ”فیض المنعم کے نام سے مسلم شریف کے مقدمہ کی شرح بھی تحریر فرمائی ہے۔ ان کی یہ شروحات انتہائی آسان اور عام فہم ہیں اور کتاب حل کرنے میں کمزور استعداد کے طلبہ کے لئے بھی بہت مفید

ہیں، ان کی کتابیں ہندوستان و پاکستان اور بنگلا دیش تینوں جگہ چھپتی ہیں اور طالبان علوم نبوت میں ان خصوصیات کی وجہ سے یکساں مقبول ہیں۔۔۔وہ ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئے ۱۹۶۲ء میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے دورہ حدیث کیا، ۱۹۷۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے اور تقریباً نصف صدی تک تا دم وفات منصب درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا چراغ جلائے رکھا۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے، لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور دارالعلوم کو تمام شرور وفتن سے محفوظ فرمائے۔۔آمین

❁...❁...❁

شیخ الحدیث وصدر المدرسین

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ

دیوبند تشریف آوری، تصانیف وعلمی خدمات ویادگار مجالس

حضرت مولانا خورشید حسن قاسمی صاحب
استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند

حضرت اقدس حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہٗ کا تعلق راقم الحروف کے خانوادہ سے حضرتؒ کے زمانہ طالب علمی سے تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جس وقت راقم الحروف مادرعلمی دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ فارسی وریاضی کی کتب کا ابتدائی طالب علم تھا اس وقت والد ماجد حضرت مولانا سیّد حسن صاحبؒ سابق استاذ تفسیر وحدیث دارالعلوم دیوبند سے درس مشکوٰۃ شریف متعلق تھا اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ حضرت قبلہ والد ماجد کی خدمت میں جماعت مشکوٰۃ کے دیگر چند طلباء کی طرح حضرت والد صاحبؒ کے ہمراہ اکثر وبیشتر راقم الحروف کے خاندانی مکان جامع مسجد تشریف لاتے اور حضرت والد صاحبؒ سے خارج میں بھی استفادہ فرماتے اور یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ نومبر ۱۹۶۰ء میں طویل عرصہ کے بعد پاکستان سے حضرت والد صاحبؒ کے حقیقی ماموں جد المکرم فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی دیوبند تشریف آوری ہوگئی حضرت والد صاحبؒ نے موقع کو غنیمت خیال فرماتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے تبرکاً مشکوٰۃ شریف کے ایک درس کی تدریس کے لیے گذارش فرمائی جس کو حضرت مفتی شفیع

صاحبؒ نے منظور فرمالیا اور مشکوٰۃ شریف کی فضیلت علم سے متعلق ایک حدیث کا درس دیا مذکورہ درس میں حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ بھی شریک رہے مذکورہ درس حضرت مولانا شاہد حسن صاحب قاسمیؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند نے قلم بند کیا اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی نظر ثانی اور باہمی اصلاح کے بعد کتابی شکل میں ''طلباء دین سے حضرت مفتی محمد شفیعؒ کا ایک یادگار خطاب'' کے نام سے شائع بھی فرمایا۔ بہر حال مذکورہ مناسبت کے بعد حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا راقم الحروف کے خانوادہ اور احقر سے تعلق اور مناسبت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

حضرت مفتی پالن پوری صاحبؒ کو حضرت والد صاحبؒ کے علاوہ جن اکابر اساتذۂ کرام سے شرف تلمذ حاصل ہوا، ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

دورۂ حدیث کے اساتذۂ کرام

استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، شیخ الحدیث حضرت مولانا شیخ فخر الدین صاحبؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، حضرت مولانا سیّد فخر الحسن صاحب، حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحبؒ، حضرت مولانا محمد عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ وغیر وغیرہ۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے مادر علمی کے شعبہ افتاء میں داخلہ لیا اور افتاء میں بھی امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل فرمائی۔ فراغت افتاء کے بعد بھی مشق وتمرین کا سلسلہ جاری فرماتے رہے اور حضرت مفتی صاحبؒ کو حضرت مولانا مفتی سیّد مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوریؒ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے افتاء کی سند خصوصی بھی عنایت فرمائی اور کچھ عرصہ تک مفتی صاحبؒ نے معین مفتی کے طور پر بھی شعبۂ افتاء دارالعلوم میں خدمات انجام دیں۔

بہر حال خدمت افتاء کے علاوہ مفتی صاحبؒ نے بشمول دارالعلوم دیوبند ملک کے دیگر مدارس میں نصف صدی

سے کچھ زائد عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دیں، حضرتؒ کے تلامذہ ہندو پاکستان، بنگلہ دیش کے علاوہ امریکہ، لندن وغیرہ اور عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں خدمت افتاء وخدمت تدریس میں مشغول ہیں، حضرتؒ کے تلامذہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور دارالعلوم دیوبند میں بھی درجہ ابتدائی، درجہ وسطیٰ اور بعض درجہ علیا کے استاذ حضرتؒ کے خاص تلمیذ ہیں ۔حضرت اقدسؒ اُن نامور چند حضرات اساتذۂ کرام میں سے ہیں کہ جن کو ابتداء سے لے کر انتہاء تک اکثر علوم وفنون کی تدریس کا موقع ملا اور آپؒ کا درس طلباء میں ہمیشہ مقبول رہا، درسی تقریر پر مغز اور تفہیم عام فہم رہتی، فقہی اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے دلائل کے علاوہ حضرات احناف کے ترجیحی دلائل کا خاص خیال فرماتے؛ لیکن وجہ اختلاف کو ضرور ذکر کرتے، حضرتؒ کثیر التصانیف اساتذۂ کرام میں سے ہیں اور حضرتؒ کی تصانیف کی تعداد پچاس سے بھی زائد ہے۔ حضرتؒ کی تصانیف، تفسیر وحدیث، فقہ وافتائ، نحو وصرف، منطق، فلسفہ غرض تقریباً جملہ علوم وفنون متداولہ پر مشتمل ہیں بعض تصانیف، سوانح وتاریخ سے متعلق بھی نیز درسی کتب کی شروحات اور فقہی مقالات وتحقیقی فتاویٰ اس کے علاوہ ہیں جو کہ بلاشبہ ملت کے لیے عظیم سرمایہ اور گنج گراں مایہ ہیں اہم تصانیف کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

تفسیر ہدایت القرآن کامل آٹھ جلد یہ تاریخی آسان تفسیر ہے جس کا آغاز حضرتؒ نے دیوبند تشریف لانے کے بعد تقریباً فوراً ہی بعد فرمایا۔ ابتداء میں مذکورہ تفسیر کے آغاز قرآن کریم کے آٹھ پارے کی تفسیر حضرت مولانا کاشف الہاشمی راجو پوریؒ نے فرمائی اور پارہ عم کی تفسیر بھی حضرت راجو پوریؒ ہی نے فرمائی تھی؛ لیکن بعد میں حضرت مفتی صاحبؒ نے آغاز قرآن تا ختم قرآن کریم مذکورہ تفسیر کی تکمیل فرمائی، تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری کامل بارہ جلدیں، شرح ترمذی شریف اردو کامل، رحمت اللہ الواسعہ، شرح حجۃ البالغہ، تعلیقات وتشریحات حجۃ اللہ البالغہ حواشی وحوالہ جات شرح الفوز الکبیر، امداد الفتاویٰ جس کی صرف ایک ہی جلد ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند سے شائع ہوسکی، تسہیل بیان القرآن کامل، فیض المنعم شرح مسلم شریف، ایضاح المسلم جلد اوّل، زبدۃ الطحاوی شریف کتاب الصلوٰۃ، کتاب الطہارت، مفتاح التہذیب شرح، شرح تہذیب اردو، حیات امام طحاوی شریفؒ، حیات امام ابوداؤدؒ، کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ شرح رسم المفتی، آپ فتویٰ کیسے دیں، مسائل حرمت مصاہرت، آسان نحو، آسان صرف وغیرہ وغیرہ۔

حضرتؒ کی مجلس: علوم ومعارف کا خزانہ تھی اور علمی جواہر پاروں کا عظیم مجموعہ تھی جوکہ تفسیری نکات حدیثی تشریحات، فقہی اشکالات کے جوابات اور واقعات اکابر کے علاوہ سائنس جدید سے پیدا ہونے والے نت نئے سوالات کے جوابات اور بیش بہا معلومات پر مشتمل ہوتی تھی جس میں ارباب افتاء حضرات اساتذہ کرام اور طلباء دلچسپی سے شرکت فرماتے مذکورہ مجلس ہمارے اکابر کے طرز کی یادگار مجلس تھی۔ مذکورہ مجلس کے ملفوظات وافادات اگر کتابی شکل میں شائع ہوجائیں تو یقیناً ملت کے لیے رہنما تصنیف ثابت ہوں۔

حضرتؒ کی حیات طیبہ کا خاص طور سے قابل ذکر پہلو یہ ہے تدریسی ودیگر علمی وتصنیفی وانتظامی غیر معمولی مشغولیات کے باوجود اہل محلہ اور مسجد محلہ کے احوال سے خوب واقفیت رکھتے اور مسجد محلہ کی ضروریات کی تکمیل اور اہل محلہ کا بھی تعاون سرپرستی فرماتے یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ کی خصوصی توجہ سے محلہ اندرون کوٹلہ کی مسجد جوکہ طویل عرصہ سے بوسیدہ اور شکستہ حالت میں تھی مذکورہ مسجد کی تزئین وتعمیر جدید عمل میں آئی اور حال میں بھی حضرت موصوف کی توجہ کی برکت سے مذکورہ مسجد کی توسیع کے لیے مسجد کے متصل جانب مشرق ایک وسیع مکان کی خریداری عمل میں آئی اور حضرت کے جذبۂ صلۂ رحمی کا عالم یہ تھا کہ محلہ کے ایک غریب رکشہ چلانے والے کی شکستہ حالت کا علم ہوا تو حضرتؒ نے دارالعلوم مستقل آمدورفت کے لیے اسی کا رکشہ مقرر فرمایا اور اس طرح حسن تدبیر سے مذکورہ شخص کا مزید تعاون فرماتے رہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ انتظام فرمائیں گے تو اس کو بیٹری والا رکشہ خریدوں گا؛ اس لیے کہ اب ہاتھ رکشے پر لوگ سوار نہیں ہوتے ہیں۔

حضرت کی ذاتِ گرامی اہل محلہ اور اہل علاقہ کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی اور ایک انجمن اور ایک ادارہ تھی آج علمی حلقوں کے ساتھ عوامی حلقے بھی حضرتؒ کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے آہ بلب اور اشک بار ہیں۔

خداوند قدوس حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے اور جملہ پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل عطاء فرمائے آمین ثم آمین۔

❁...❁...❁

حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب
استاذ دار العلوم وقف دیو بند

تمام جگہوں پر اختلاف ہوسکتا ہے، راستے جدا ہو سکتے ہیں، مگر ایک راستہ ایسا ہے جس پر سب کو چلنا ہے، اللہ پرست ہوں یا بُت پرست، خدا آگاہ ہوں یا خدا بیزار، فرعون مزاج لوگ ہوں یا ولی صفت انسان، تختِ شاہی کو زینت بخشنے والے ہوں یا فرشِ خاک پر لوٹنے والے، علم کے موتی رَولنے والے ہوں یا خزف ریزوں سے کھیلنے والے، علم کے جویا ہوں یا جہالت کے ہمدوش سب اس راستے کے راہی ہیں، فرق ہے تو صرف اتنا کہ جس کا وقت آئے گا وہ چلے گا، آج نہیں تو کل چلنا ضرور ہے، وہ راستہ موت کا راستہ ہے، اسی راستے پر چل کر حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ بھی بارگاہِ رب میں حاضر ہو گئے۔

دور حاضر میں حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ علم کی ایک مثال، مطالعہ اور وسعت کی ایک نظیر، تدریسی خصوصیات کا امتیاز، زبان و بیان کی جوئے رواں، اسلوب و ادا کا اعتبار اور تحقیقات و نوادرات کی ایک نشانی تھے، انھوں نے بحیثیت شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند کے علمی سلسلوں کو زندہ رکھا انھوں نے علم کی اس روشنی کو پھیلانے اور آگے بڑھانے کی کوشش کی جس کو ہم اس منصب کا تقاضہ اور مطالبہ کہہ سکتے ہیں، انھیں موجودین میں بلاشبہ امتیازی مقام حاصل تھا، انھوں نے گہرائی میں اترنے کا، شناوری کے جوہر دکھانے کا اور رذانتِ علمی کا ثبوت دیا، اپنے قلم سے کئی شاہکار کتابیں بھی دنیا کو دیں اچھی اور کامیاب زندگی گذاری، یکسوئی کے ساتھ کاموں میں مشغول رہے۔

میں ۷۳۔۱۹۷۲ء کے سال شعبۂ فارسی کے درجہ سوم کا طالب علم تھا، عربی درجات کے لیے ایک نئے استاذ کے آنے کا شور ہوا، ہمارے زمانۂ طالب علمی میں کسی استاذ کی آمد کا دارالعلوم کی چہار دیواری میں مہینوں چرچا رہتا تھا، آج ایسا نہیں ہوتا آنے والے استاذ سے طلبہ کی ملاقات درسگاہ ہی میں ہوتی ہے، خاموشی کے ساتھ تقرر ہوجاتے ہیں، ہوسکتا ہے اس ضمن میں میری معلومات ادھوری ہوں بظاہر ایسا ہی ہوتا ہے، بہرحال حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئے، کچھ وقت کے بعد مجھے ان سے بیضاوی شریف پڑھنے کا موقع ملا، یہ مولانا کی ابتدا تھی اور انتہا آپ کے سامنے ہے، اس دور ہی کو ذہن میں رکھ کر یہ چند سطور قلمبند کی ہیں، میں نے دارالعلوم میں جن اساتذہ سے پڑھا ان میں حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ کی جگہ نمایاں رہی اور اس وقت وہ دارالعلوم کی تدریسی زندگی کی جان اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا سا نکھرا ذوق، ان کا سا انہماک فی العلم، ان کا سا تدریسی درک، نکتہ آفرینیوں کا مزاج، رائے میں صلابت اور استحکام، علمی مباحث پر نظر، مسالکِ اربعہ کا احاطہ، اختلافی مسائل میں اعتدال اور میانہ روی، ادب کا خیال یہ سب کچھ مولانا کی علمی زندگی کی بنیادیں ہیں۔

یہ دور جسے ہم علمی افراد سے محرومی کا دور کہتے ہیں یقیناً محرومی کا دور ہے، ایک کے بعد ایک صاحبِ علم کے سفر آخر سے اس راہ کی ویرانی بڑھتی جا رہی ہے، سناٹوں نے وحشتیں بڑھا دی ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ احساس جان نکالے دیتا ہے کہ جانے والے کی جگہ خالی ہی رہے گی، علم کے دروازے بند ہی رہیں گے۔

ربّ کائنات حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کو اپنی خاص رحمتوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمائے، پسماندگان کو ان کی علمی وراثت کا امین بنائے۔ (آمین)

❁...❁...❁

کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ کے عظیم مفسر وشارح، علومِ نانوتوی ومعارفِ شاہ ولی اللہ کے بے نظیر ترجمان، عالم المعقول والمنقول، فنا فی العلم، مسندِ شیخ الحدیث کی زینت، شاہِ تدریس، لسانِ دارالعلوم، اکابر کی حسین یادگار، استاذالاساتذہ

''سلطان العلماء''

حضرت علامہ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری علیہ الرحمہ

شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند

ولادت: ۱۳۶۰ھ-۱۹۴۰ء-وفات: ۲۵ رمضان ۱۴۴۱ھ-۱۹ مئی ۲۰۲۰ء

یادوں پر مشتمل ایک تاثراتی تحریر

مولانا محمد فہیم الدین بجنوری قاسمی صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ہجومِ بلبل ہوا چمن میں، جو گل نے کیا جمال پیدا
کمی نہیں قدرداں کی اکبر! کرے تو کوئی کمال پیدا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً أما بعد:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میر تقی میر

استاذِ گرامی، حضرت علامہ مفتی سعید احمد پالن پوری علیہ الرحمہ کی وفات سے، دارالعلوم دیوبند ایک شیخ الحدیث اور صدر مدرس سے زیادہ، ایک باعظمت ہستی سے محروم ہوگیا، قحط الرجال کے اس دور میں یقیناً ہر دو خلاء غایت درجہ اہمیت کے حامل ہیں؛ لیکن عظمتوں کے مینار جن عناصر سے تشکیل پاتے ہیں، وہ نایاب نہیں، تو ہر عہد میں کم یاب ضرور رہے ہیں، اس وقت تو خیر! آپ مادرِ علمی کے سالارِ قافلہ تھے؛ اس لیے بزمِ قاسمی کا ہنگامہ ٔ گیر ودار، آپ کے نفسِ گرم کا، رہینِ منت تھا؛ مگر ہر دو مناصب سے قبل بھی، گلشنِ علم وعرفان کی بہار وسرسبزی، آپ ہی کی نغمہ سرائی سے منسوب ہوا کرتی تھی۔

اہل نظر کو اس بات کا ادراک ہے کہ چمن کی آہ وفغاں کا پسِ منظر، محض ایک منصب کا خلا یا ایک عمل کا انقطاع نہیں ہے، حضرت کے ساتھ جن علمی، دینی، فکری اور ملی عظمتوں نے ہمیں الوداع کہا ہے؛ رونا اصل ان کے لیے ہے، بلاشبہ آپ کی جدائی سے، جہاں دارالعلوم نے اپنے اکابر ومشائخ کی روایات کا امین اور دورِ اوائل کے امتیاز کا پاسبان کھویا ہے، وہیں دارالعلوم کی مسندِ حدیث سے، خدا جانے کتنی مدتِ مدید کے لیے، اس کی زینت، رونق اور شوکت چھن گئی ہے۔

اس آخری دور میں خالص علمی بنیاد پر، بین الاقوامی شہرت صرف آپ کے حصے میں آئی، برِصغیر تو بتمامہ آپ کی شاگردی پر نازاں ہے، بیرون میں بھی آپ کی شخصیت کو بڑے پیمانے پر پذیرائی حاصل ہوئی، آپ کے فیض

نے کئی برِ اعظموں کا سفر طے کیا، عجم کے علاوہ عربوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، یورپ، افریقہ وا مریکہ وغیرہ کے علمی اسفار نے، آپ کو دارالعلوم دیوبند کے علم وفکر کے سفیر کی حیثیت میں نمایاں کیا اور اسی نظریہ سے دنیا بھر میں آپ کو سنا اور پڑھا گیا۔

اس اجمالی تاثر کے بعد، اب میں مختلف عناوین کے تحت، حضرت کے ان کمالات کا عکس، سینہء قرطاس پر اتارنے کی کوشش کروں گا، جو ہزاروں کفش برداروں کی مانند، میرے لیے بھی شنیدہ کے بجائے، دیدہ ہونے کی وجہ سے، ذاتی مشاہدات وتجربات کے درجے میں ہیں۔

امامِ تدریس

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ
استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا

راسخ عظیم آبادی

تدریس آپ کا اصل میدان تھا، اس جوہر کو آپ کے جملہ کمالات کی روح اور جان سمجھنا چاہیے، تدریس میں جو کمال و جمال آپ کو عطا ہوا تھا، اس کی نظیر ہر چہار سو مفقود تھی، اگر تدریس بہ ذات خود ایک فن ہے اور اس کے مقاصد ومحرکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس کے خدوخال، خوب وزشت، اور ظاہر وباطن کی تحدید ہوسکتی ہے، تو آپ کی تدریس اس کا مصداق اکبر تھی اور حد درجہ تنزل اختیار کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ سررشتہء تعلیم کے ''عالمی مہم جو''، اگر آپ کے درس سے ذاتی نیاز حاصل کرتے، تو تدریس کے نئے معنی وضع ہونے کا نظارہ بہ چشم خود کرتے۔

پورے ماحول کا ہمہ تن گوش ہوجانا، حاضرین کی یکسوئی وانہماک، وسیع حلقہء درس پر گرفت، سامعین کا جوش وخروش، حاضری میں طلبہ کے مابین سبقت کی فضا، دقیق مضامین کا ایسا بیان کہ ذہین کو اکتاہٹ نہ ہو اور غبی محروم نہ

ہو؛ یہ نظارے آپ کی تدریسی کرامتیں ہیں۔

صاحبِ طرز مدرس

تدریس میں آپ کا اسلوب نرالا، اچھوتا، نادر، طرح دار، پیارا، دل کش، سحر انگیز اور سامعین وحاضرین کے لیے نظر بندی کا سامان پیدا کرنے والا تھا، پھر آپ کے اسلوب کی انفرادیت بھی نوع بہ نوع تھی، طرزِ تکلم جدا، لب ولہجہ منفرد، آواز الگ، ترتیب البیلی، غرض! آپ کا صاحبِ اسلوب ہونا بھی متعدد پہلوؤں کا حامل تھا۔

آپ کے معجز نما لہجے میں بہ یک وقت عالمانہ شوکت اور ناصحانہ شیرینی دونوں ہوتی تھیں، جب آپ بولتے تھے، تو گویا بھینی بھینی خوش بو مہکتی تھی اور ہلکی ہلکی بارش کا احساس ہوتا تھی، ایک عجب اسلوبِ بیان تھا، جو خراماں خراماں شروع ہوتا، گاہے تیز ہوکر رواں دواں بھی ہوتا، کبھی موج درموج کا سماں ہوتا اور کبھی سیل درسیل کا، میں اس کا واقف کار نہیں کہ اس دل کش انداز کے آپ واضع تھے، یا اسے انھوں نے اپنے پیش رو اساتذہ سے مستعار لیا تھا، بہ ہر صورت اس انداز کی گونج دیر تک محسوس کی جائے گی۔

حضرت کے درس کا امتیاز اکابر کے جھرمٹ میں بھی قائم تھا

آپ کے درس کا امتیاز عہدِ قدیم کی یادگار رہے، سچ ہے کہ مشک افشانی کو کبھی قدر دانوں کے شکوے کی نوبت نہیں آتی، میں جب جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور میں پڑھاتا تھا، تو ندوۃ العلما کے ایک استاذ آئے تھے، جنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں بھی اکتسابِ فیض کیا تھا اور وہ حضرت قاری طیب صاحب علیہ الرحمہ کے عہد میں یہاں آئے تھے، انھوں نے دیوبند کی یادوں میں بہ طور خاص حضرت والا کے درس کا ذکر کیا اور ہمیں یہ بتا کر حیرت میں ڈالا کہ اس وقت کے اکابر کے انبوہِ کثیر میں بھی، آپ کے درس کی منفرد شناخت تھی اور طلبہ کے مابین غایت درجہ محبوبیت ومقبولیت تھی۔

درس کی مقبولیت

آپ کا درس کیا تھا، ایک شمع محفل کا سماں ہوتا تھا! طلبہ پروانہ وار ہجوم کرتے تھے، ہمارا دور دارالحدیث تحتانی کا ہے، جو اس وقت کی تعداد کے لیے بھی بہ مشکل کافی ہوتی تھی، حضرت کے گھنٹے میں کھچا کھچ بھر جاتی تھی، تاخیر سے آنے والے طلبہ بھی حوصلہ نہیں ہارتے تھے اور دروازوں پر یا دروازوں کے باہر رہ کر درس سنتے تھے، قابلِ ذکر ہے کہ اس دور کی چوکھٹ اور دروازے سے بھی بڑے کاملین نکلے۔

ہمارے دورے کا سال ۱۹۹۸ء-۱۹۹۹ء کا ہے، اسے نشأۃ ثانیہ کے عہد کا عروج سمجھنا چاہیے، اس وقت دورِ ثانی کے جملہ اکابر، نازک عوارضِ صحت سے محفوظ تھے اور تدریس کے لیے درکار قوت وتوانائی شباب پر تھی: بالخصوص حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کا کوکبہء جلال بام عروج پر تھا، تدریس کا طوطی شباب پر تھا اور حضرت دارالحدیث کے دولہا ہوا کرتے تھے، آپ کے درس ترمذی میں "**کأن علی رؤوسهم الطير**" کا منظر قابلِ دید ہوتا تھا۔

اسی قوت وتوانائی کا ثمرہ تھا کہ درس کا اہتمام دیدنی تھا؛ بالخصوص معرکۃ الآراء مباحث میں کلام کی کیفیت بیان سے باہر ہے، مجھے دارالحدیث کا وہ سناٹا یاد ہے، جو آپ کے خراماں خراماں لہجے میں دفعۃً تیزی آنے کی وجہ سے کسی بھی دن پیدا ہو جاتا تھا، اگر حضرت کا رعب، دینی درس گاہوں کی تہذیب اور خاص رنگ کی تربیت کا ماحول عارض نہ ہوتا، تو ان بحثوں کے اختتام پر دارالحدیث کے در و دیوار نعرۂ تکبیر سے لرز اٹھتے اور اندرون کی مسرت سے مغلوب ہو کر طلبہ حضرت کو شانوں پر اٹھا لیتے، بعض مباحث کے اختتام پر میں نے یہ محسوس کیا، جیسے طلبہ آوازۂ تحسین بلند کرنے سے باز رہنے کے لیے، ضبط کی قوتیں بروئے کار لانے میں مصروف ہیں۔

دورہ کا سنسنی خیز سال

خامہ و دماغ کے مابین کا رشتہ بھی عجیب ہے، گفتگو کے بہاؤ میں مجھے اپنے دورے کا سال تازہ ہو گیا ہے،

معلوم نہیں کب ان حسین اور شیریں یادوں کو قلم بند کرنے کا موقع ہوگا! دل کے ہاتھوں مجبور ہوں کہ زندگی کے سب سے خوب صورت تجربے پر ایک دو جملے لکھ کر آگے بڑھوں۔

دورے کے سال کو طلبہ کے عروسی کا سال سمجھنا چاہیے، دارالحدیث کے شرکاء گویا نوشہ ذی جاہ ہوتے ہیں، کون کہتا ہے کہ دورے میں سال بھر بتانے کا موقع ملتا ہے؟ آغاز میں سامنے کی سیٹوں تک رسائی کے ہنگامے اور الوداعی ترانوں کی گونج کے درمیان کا زمانی فاصلہ، ماہ وسال کی سست روی کے بجائے، لمحات وساعات کی تیز گامی سے گذرتا محسوس ہوتا ہے: ع: ''جلوۂ گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد'' کا منظر ہوتا ہے، وہ شب وروز کے دروس، حدیث نبوی کے جاں فزا زمزمے، پر کشش آوازوں کی نغمہ سرائی، حدیث ہی حدیث، مطالعہ ہی مطالعہ، میکدہ اور فقط مے نوشی، جام اور بادے، وہ لطف جو اس سال آیا پھر کبھی میسر نہ ہوا، زندگی کے اس حسین سال کی عکاسی کے تئیں قلم وفا سے قاصر ہے، اپنے ذاتی جذبات یاد ہیں کہ میں سال کے آخر میں بہت سنجیدگی سے اس پر غور کر رہا تھا کہ دورہ مکرر پڑھوں اور قال الرسول کے نغموں سے ایمان کی تازگی اور روح کی بالیدگی کا یہ سلسلہ کم از کم ایک سال اور دراز کروں۔

تصنیف وتالیف

تدریس ایک غیر معمولی ذمے داری ہے اور انسان کو بوجھل کرنے کے لیے تنہا کافی ہے، پھر درسِ نظامی کی تشکیل کچھ اس نوع کی ہے کہ ہر سبق کے لیے سابقہ تیاری امر ناگزیر ہے اور اس میں کوئی استثنا نہیں: یہی وجہ ہے کہ تدریس کی یہ ذمہ داری ہمہ وقت اعصاب پر سوار رہتی ہے، دن تمام پڑھانے کی نذر اور شب مطالعے اور تیاری میں محبوس، ایسی صورت حال میں ایک مدرس سے، دیگر علمی یا عملی امور کی انجام دہی کرامت سے کم نہیں: لیکن ہماری تاریخ ایسی کرامتوں سے پُر ہے، جفا کشی، ریاضت اور مجاہدے کی ایک داستان ہے، جو اہلِ علم نے اپنے خونِ جگر سے رقم کی ہے، وہ جہاں منصبِ تدریس کے مسند نشین تھے، قاضئ وقت تھے، میدانِ جہاد کے شہ سوار

تھے ؛ عین اسی وقت ان کے بافیض قلم ،علم کے دریا بہار ہے تھے اور ان کی تصنیف وتالیف کی سرگرمیوں سے اسلام کی لائبریری تیار ہورہی تھی۔

پھرعلمی آثار کو صدقہ ٔ جاریہ میں خاص مقام حاصل ہے اور کیوں نہ ہو کہ دین کی بقا اور شادابی میں سب سے بڑا کردار قرطاس وقلم نے ادا کیا ہے، آج اگر ہمیں دور افتادہ علاقوں میں، چودہ سو سال بیت جانے کے بعد بھی، دینِ اسلام سے، مستفید ہونے کا موقع میسر ہے، تو اس کا سہرا اس درازتر داستان کے سر ہے، جو سینوں اور سفینوں دونوں نے مل کر رقم کی ہے، آخر کوئی وجہ ہے کہ اہلِ نظر نے ،علما کے قلم کی سیاہی کو، شہید کے خون سے برتر اور راہِ علم کی سعی کو، قتال وجہاد کی سرگرمی سے افضل سمجھا ہے!۔

حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ انگلیوں پر گنے جانے والی، ان نادر وعبقری ہستیوں میں سے ایک ہیں ،جن کے چشمہ ٔعلم وعرفان کی فیاضی میں قلم اور زبان دونوں نے اپنا حصہ ڈالا ، اُس تاریخ ساز تدریس کے کوائف بیان کرنے کے بعد کہ جس کے سحر نے نصف صدی قلوب پر حکمرانی کی ، یہاں ہم نے دادِقلم کی داستان چھیڑتے ہیں:

مبدأ فیاض سے جو قلم آپ کو ہم دست ہوا، اس کی پیشانی توفیق و بامرادی کے تمغے سے درخشاں تھی ، ایسے کتنے اہلِ قلم ،قارئین کی فہرست میں ہیں، جنھوں نے کتاب اللہ کی تفسیر کا خاکہ بنایا اور اس کو پایہ ٔ تکمیل تک پہنچایا؟ صحیح بخاری کی شرح کا بیڑا اٹھایا اور اس کو مکمل کیا؟ سنن ترمذی پر طالع آزمائی کی اور اس کو بھی پورا کیا؟ حجۃ اللہ البالغہ کی تشریح کے دفاتر تیار کیے؟ ایسے کتنے قلم تاریخ نے محفوظ کیے ہیں، جن کی انفرادی کارگزاری میں مذکورہ بالا دواوین درج ہیں؟

اس کے برعکس پیشِ نظر مثالیں ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!'' کا منظر بیان کرتی ہیں، خاکے خوب بنائے گئے ؛ لیکن رنگ بھرنے کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے اور اس صورتِ حال سے بڑے بھی مستثنی نہیں، خود بخاری کی کتنی شروح ہیں، جن کی علمی قیمت اپنی جگہ؛ لیکن اکثر نا تمام ہیں اور بعض تو ایک دو جلدوں تک محدود رہ

گئیں، ان میں بکھرے جواہر پارے قدردانوں کے صبر کا امتحان لے رہے ہیں، کیسے جام ہیں جو چھلکائے گئے؛ لیکن بادہ خوار تشنہ ہیں، محفلیں سجائی گئیں مگر سیری نہیں ہوئی، حضرت الاستاذؒ کے علمی منصوبوں کو دستِ غیب کا یہ تعاون ہمیشہ حاصل ہوا کہ جس کام کی تحریک اٹھائی اس کو انجام تک پہنچایا۔

تدریس کی طرح تصنیف میں بھی آپ کا طرز جداگانہ ہے، جو یقیناً بہ یک وقت سہل اور ممتنع دونوں ہے، ان کا جو یہ طریقہ ہے کہ وہ درپیش بحث پر سیر حاصل گفتگو پہلے کرتے ہیں اور عبارت کے حل کی سمت بعد میں آتے ہیں، یہ جتنا کامیاب، مؤثر اور پرکشش ہے اتنا ہی مشکل اور دشوار بھی ہے، اس کی اولین شرط یہ ہے کہ متکلم کو بحث پر عبور حاصل ہونے کے ساتھ مضمون مرتب بھی ہو اور بیان کے لیے یہ درجہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

تحفۃ الالمعی اور تحفۃ القاری دونوں دواوین ہماری طالبِ علمی کے بعد کے نقوش ہیں، تحفۃ الالمعی سے استفادے کا موقع کم ہوا؛ تاہم تحفۃ القاری کا مستقل خوشہ چیں ہوں، چوں کہ گذشتہ ایک دہائی سے، صحیح بخاری کی معرکۃ الآراء اور تاریخی اردو شرح، ''ایضاح البخاری'' کی تالیف وترتیب سے، بندے کا بھی تعلق ہے؛ اس لیے قدیم مراجع کی طرح، اہم معاصر شروح بھی پیش نظر ہیں، موجودہ پسِ منظر میں شرح پر پڑنے والی نظر، استفادے کے ساتھ ساتھ جانچ پرکھ اور نقد وتحقیق کو بھی شامل ہوتی ہے؛ اس لیے تحفۃ القاری سے متعلق تاثر اندھیرے کا تیر نہیں ہوگا؛ بل کہ ذاتی مشاہدے وتجربے کے حکم میں ہوگا۔

تحفۃ القاری کی خصوصیات

اس عظیم تصنیف کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اردو زبان میں بخاری شریف کی ایک مکمل شرح ہے، فی زمانہ ہمارے سامنے اردو زبان میں صحیح بخاری شریف کی متعدد شروح ہیں؛ لیکن ان میں سے بیشتر ناتمام ہیں؛ جب کہ بعض ایسی بیش قیمت اور نابغۂ روزگار ہیں کہ ان کا ناتمام ہونا حسرتِ آیات سے کم نہیں، جیسے محدثِ بجنور، علامہ احمد رضا بجنوری کی ''انوار الباری شرح صحیح بخاری''، جس کی سطر سطر میں علم کے خزانے پنہاں ہیں؛ لیکن بہ ہر حال

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے!۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت والا نے اختصار کے ساتھ صحیح بخاری کو حل کر دیا ہے، حضرت کی شرح کے بعد نسبتاً کم استعداد والوں کے لیے بھی بخاری کے تراجم ومضامین اور احادیث کو سمجھنا ممکن ہوگیا ہے، حضرت کی شرح کے علاوہ اردو میں غالباً دو شرح اور دستیاب ہیں جو مکمل ہیں؛ لیکن دونوں ہی حلِ عبارت سے قاصر ہیں؛ بل کہ حضرت مفتی تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم کے دروس پر مشتمل جو انعام الباری آئی ہے، اس کو تو شرح سمجھنا ہی زائد بات ہے؛ اس لیے کہ اس میں حضرت کے درس کو من وعن کتاب کی شکل دے دی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں عین درس کی مانند صفحات کے صفحات بغیر کسی کلام کے گذرتے ہیں، حلِ عبارت کے نقطۂ نظر سے دوسری شرح کا حال بھی ناگفتہ بہ ہے؛ تاہم یہ ممکن ہے کہ ثانی الذکر کے شارح کے پیشِ نظر بھی کوئی دیگر مقصود ہو، جس میں وہ شرح کامیاب ہو؛ لیکن حل بخاری کے لیے وہ یقیناً کافی نہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نے کتاب میں جامعیت کے ساتھ اختصار کو پیش نظر رکھا ہے، حضرت نے کتاب کے حل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا؛ لیکن حضرت کو اس بات کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ اگر شارحین کی بحثوں میں توسع کی جانب گئے، تو عمرِ عزیز کافی نہیں ہوگی؛ اس لیے بحثوں کو سمیٹتے ہوئے حل کتاب پر توجہ مبذول کی ہے، اس طریق کی تفسیر کرتے ہوئے، حضرت بے تکلف تعبیر میں یوں فرماتے تھے:

''میں پنچایت نہیں کرتا کہ فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے یہ کہا، میں تو وہ بیان کرتا ہوں جو مجھے سمجھ میں آیا''۔ یوں ممکن ہے کہ تحفۃ القاری کے بعض مباحث ومقامات سے اہلِ علم کو اتفاق نہ ہو؛ لیکن اس تبصرے سے اختلاف، کسی کے لیے بھی آسان نہیں کہ حضرت نے عبارت کو حل کرتے ہوئے، صحیح بخاری کی تفہیم وتوضیح کا حق ادا کر دیا ہے۔

چوتھی خصوصیت کو حضرت کی تمام تصانیف کی خصوصیت سمجھنا چاہیے کہ وہ عبارت کے ذکر سے قبل ہی بحث کو

اس کے مبادی کے ساتھ ذہن نشین کردیتے ہیں، اس طرح مضمون ذہن نشین ہوجاتا ہے اور بات دل میں راسخ ہوجاتی ہے؛ تاہم یہ طرز اختیار کرنا آسان نہیں، جیسا کہ اوپر آیا، ظاہر ہے کہ اس مشکل طریق کو اپنانے میں آپ کی کامیابی بھی کوئی سادہ بات نہیں ہوسکتی؛ یقیناً اس کے پسِ پشت ریاضت اور مجاہدے کی ایک داستان ہوگی۔

خطابت وموعظت

تدریس وتصنیف کی طرح خطابت میں بھی آپ کا اسلوب وانداز بالکل جداگانہ تھا، خاص رنگ، پیارا انداز، دل کو لبھانے والی ادا، بولنے میں ایک نوع کا ٹھہراؤ تھا، جس سے مضمون عام فہم ہوجاتا تھا، زبان کی سلاست وروانی مجمع کو باندھے رکھتی تھی، جو عموماً ازدحامِ عظیم کی شکل میں ہوتا، بیشتر خطاب دراز ہوتے؛ لیکن سامعین کی بشاشت میں تغیر ممکن نہیں تھا، ہمہ تن گوش کا منظر از اول تا آخر یکساں قائم رہتا۔

تدریس وتصنیف کی مانند، خطابت کی راہ سے بھی آپ نے ایک عالم کو فیض یاب کیا، اس نسبت سے دنیا بھر میں آپ کو یاد کیا گیا، مشرق ومغرب میں عوام وخواص نے آپ کو سنا، احاطہء دارالعلوم میں بھی منصبِ خطابت آپ ہی کے لیے محفوظ تھا۔

مادرِ علمی میں تعلیمی سال کے آغاز کی انتہائی خاص مجلس ہو کہ جس میں علمی دنیا کا کریم سامنے ہوتا تھا، یا انبوہِ عظیم پر مشتمل عوامی اجلاس، یا دانش گاہوں کے خالص علمی پروگرام، یا ملک بھر کے چنیدہ اہل فقہ وفتاوی کا اجتماع، ہر رنگ وآہنگ کے خطاب پر یکساں عبور تھا اور ہر ماحول کی نزاکتوں کو بڑی پُرکاری سے نبھالے جاتے تھے۔

آپ کے بیانات، دراصل علمی، فکری اور تربیتی مضامین وابحاث سے تعبیر ہیں، فی زمانہ بیانات کا رجحان عروج پر ہے، آپ کے سلسلے کو اس کا حصہ گردانناکوتاہ بینی ہوگی، علمی وفکری خزانوں کے لحاظ سے آپ کے بیانات کا درجہ، آپ کی معرکۃ الآراء تصانیف اور شہرۂ آفاق دروس سے کم نہیں ہے، بہت اچھا ہوا کہ آپ کے بیانات پر ترتیب وتدوین کا کام ہوا اور ان کو کتابی شکل میں طبع کیا گیا، آج وہ ''علمی خطبات'' کے نام سے اہل ذوق کے لیے

سامانِ شفاء بنے ہوئے ہیں۔

فکر ونظر کا خاص ذوق

آپ نوع بہ نوع موضوعات پر تدبر وتفکر کا خاص ذوق اور متواتر شغل رکھتے تھے، ممکن ہے یہ وصف اپنے استاذِ خاص حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی علیہ الرحمہ سے گہرے تاثر کا نتیجہ ہو، آپ کے اس ذوق کے دو ثمرات مرتب ہوئے: ایک یہ کہ بعض مسائل میں آپ نے ایک نئی رائے قائم کی اور اس نوع کی تخلیقی فعالیت نے، روایات کے گلشن میں، افکارِ تازہ کے، گلہائے رنگا رنگ کھلائے، دوسرا یہ کہ قدیم مباحث کو نئی ترتیب حاصل ہوئی، اول الذکر ثمرہ اہل علم کے یہاں زیر بحث رہا ہے؛ لیکن دوسرا فائدہ نہایت انمول ہے، یعنی بات تو اکابر ہی کی ہے؛ لیکن اس کو ایک خاص انداز میں سمیٹا گیا ہے اور جدید ترتیب سے آراستہ کیا گیا ہے، آپ کے دروس اور آپ کی تصانیف میں یہ نگینے جگہ جگہ جلوہ گر ہیں۔

کئی سال قبل لبنان کے ایک بہت ہی ذی علم شافعی عالم دیوبند آئے ہوئے تھے: انھوں نے بڑی جدوجہد سے باضابطہ تعلیمی ویزا لے کر داخلہ لیا تھا، اس پوری کارروائی میں میرے خاص دوست، حضرت مولانا مفتی محمد انوار خان بستوی قاسمی حفظہ اللہ نے ان کی مدد اور رہنمائی کی تھی، ان کی وساطت سے مذکورہ عرب عالم کے ساتھ میرا بھی قریبی تعلق رہا، ایک روز وہ شدید تاثر میں تھے، دریافت کرنے پر کہنے لگے کہ آج تو عجیب ہو گیا کہ حضرت مفتی سعید صاحب علیہ الرحمہ نے، إنما الاعمال بالنیات کی ایسی تشریح کی جو میرے لیے بالکل نئی تھی اور نہایت علمی اور دل چسپ تھی، ان کو مطلع کیا گیا کہ حضرت کے علمی عجائب کا یہ ایک نمونہ ہے۔

آپ کے دروس، تصانیف، حواشی اور علمی خطبات کو بہت حد تک آپ کا نتیجۂ فکر سمجھنا چاہیے، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے نقوش وآثار نے اسلامی لائبریری کی ثروت میں اضافہ کیا ہے اور علم کی سرسبزی اور اس کے سرگرم سفر کی روانی میں اپنا قیمتی حصہ شامل کیا ہے، بہت سے مباحث میں، آپ کا یہ شہرۂ آفاق موقف رہا کہ

اختلاف نص فہمی کا ہے، اس خصوصیت کو بھی اسی خاص پسِ منظر میں دیکھنا چاہیے؛ بل کہ آپ اپنے خوردوں کو بھی اس کی دعوت وترغیب دیتے تھے، مختلف مجالس میں فرمایا کہ میں تو خوب سوچتا ہوں، تم بھی سوچو اور اس علمی سفر کو آگے بڑھاؤ۔

بے تکلفی و سنجیدگی

حضرت کا مزاح بھی عالم آشکار ہے، جو آپ کے لطیف جمالیاتی ذوق کا عکاس ہے اور آپ نے جس طرح اس کو نبھایا وہ کرامت سے کم نہیں؛ کیوں کہ عصر بعد کی مجلس ہو، عوامی جلسہ ہو، یا درسِ حدیث کی مسند ہو؛ آپ کے رکھ رکھاؤ، خاص وضع اور علمی وقار سے، ماحول پر ایک پُر ہیبت فضا طاری رہتی تھی؛ لیکن اسی مہیب سناٹے میں، خاص مناسبت سے کوئی لطیفہ سناتے اور ماحول زعفران زار ہوجاتا اور حاضرین تازہ دم ہوجاتے، مجمع کو علمی مضامین گھول کر پلانے کے لیے سنجیدہ ماحول بنانا اور اسی لمحہ لوٹ پوٹ کرنے کے لیے محفل کو باغ باغ کرنا؛ یہ دونوں متضاد کرامتیں آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھیں، آپ ہر ماحول میں ہنسانے پر قادر تھے، ہنساتے تھے اور خوب ہنساتے تھے اور بڑوں بڑوں کو لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کردیتے تھے۔

مجھے تکمیل ادب کے سال کا، حضرت والا کا ایک شگفتہ بیان، بیس سال بعد بھی تازہ و مستحضر ہے، ہفتم اولی کی درسگاہ میں محاضرات سے متعلق کوئی اجتماعی پروگرام، استاذِ گرامی حضرت مولانا قاری عثمان صاحب، دامت برکاتہم کی زیر صدارت جاری تھا، منصبِ خطابت پر حضرت پالن پوری علیہ الرحمہ جلوہ گر تھے، اس روز حضرت کی طبیعت خوب کھلی اور پورے رنگ میں نظر آئے، مجھے حضرت صدرِ جلسہ کا، ہنس ہنس کر بے حال ہونا اور گرتے گرتے سنبھلنا کل کی طرح یاد ہے۔

شگفتہ مزاجی میں بہت بے تکلف ہوتے ہوئے بھی دیکھا اور اس رو میں ایسے لطائف بھی سنے کہ اس امانت کو آگے بڑھانا، ہر کس وناکس کا کام ومقام نہیں، رفقائے درس میں حضرت کے ایک صاحب زادے بھی تھے اور وہ

سامنے ہی بیٹھتے تھے؛ لیکن مزاجِ عالی اگر آمادۂ شگفتگی ہو جائے، تو پھر کسی کا خیال نہیں فرماتے تھے اور بے تکلفی اسی عروج پر ہوتی، جو عروج کمالِ وقار کو کچھ وقت قبل حاصل تھا، ابراہیم بھائی جائے پناہ دیکھتے اور ساتھیوں کی شریر و معنی خیز نگاہیں ان کا تعاقب کرتیں۔

حضرت جب سنجیدگی کے موڈ میں ہوتے، تو اس کا اہتمام بھی حد درجہ فرماتے، پھر مجال نہیں کہ کوئی زیر لب بھی مسکرائے، ترمذی شرف کے سبق میں اس حوالے سے ایک تنبیہ میرے حصے میں بھی آئی، حضرت نے خاص لہجے میں فرمایا: ''سنجیدگی سے سن، کیا ہوں ہوں ہنستا ہے''!۔

دارالعلوم کے مردِ بحران

سب جانتے ہیں کہ اختلاف کے ایام میں اضطراب و انتشار اپنے عروج پر تھا، دیگر مصیبتوں کے علاوہ طلبہ کا تعلیمی زیاں موجبِ قلق تھا؛ اس لیے اس وقت ایک عارضی نظامِ تعلیم کی تحریک ہوئی اور کیمپ لگایا گیا، اس نظام کے روح رواں آپ ہی تھے، اس کے قصے بڑوں کی زبانی بہت سنے گئے اور اس وقت شعبۂ تعلیم کی باگ ڈور، جس طرح آپ نے سنبھالی، وہ اپنے آپ میں ایک تاریخ ہے۔

بعد کے دور میں بھی جو فتنے رونما ہوئے، ان کی آگ بجھانے میں ہم نے آپ ہی کو پیش پیش دیکھا، ہماری طالبِ علمی میں بھی ایک بڑا ہنگامہ ہوا، تعلیم کی پرسکون فضاء اچانک ہیجانی ماحول میں تبدیل ہوگئی اور ایک طوفان کھڑا ہوگیا، حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کی طرف سے مسجدِ رشید میں طلبہ کو جمع کیا گیا، اس موقع پر حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ نے بہت مؤثر خطاب کیا، جس میں فتنے کے عواقب سے متنبہ کیا اور اس کو فرو کرنے کا جو نسخہ احادیث میں آیا ہے، یعنی دوڑنے والا اپنی جگہ کھڑا ہو جائے، کھڑا ہوا شخص بیٹھ جائے اور بیٹھا ہوا لیٹ جائے؛ اس کی نہایت دل کش تشریح کی، طلبہ مطمئن ہو گئے اور فتنہ سرد ہو گیا۔

فنافی العلم

ایک خاص چیز جو آپ کو معاصر اساطین واعیان سے ممتاز کرتی ہے، وہ علمی یکسوئی ہے، آپ نے خود کو علم کے لیے وقف کرلیا تھا، غیر علمی سرگرمیوں سے خود کو سمیٹ کر فنا فی العلم ہو کر رہ گئے تھے، خلوت ہو یا جلوت، صرف اور صرف علمی شغل تھا اور کچھ نہیں، یہ رنگ اس درجہ غالب تھا کہ غیر علمی گفتگو بھی ناگواری کا موجب ہوتی تھی، بسا اوقات برملا اس کا اظہار بھی فرمادیتے تھے؛ حتی کے عصر بعد کی مجلس بھی اسی مزاج میں ڈوبی ہوتی تھی، طلبہ مختلف علمی سوال کرتے اور حضرت ان کی تشفی کرتے، اگر سکوت طاری ہوتا، تو خود تحریک کرتے اور فرماتے کہ کچھ پوچھو۔

فی زمانہ مجالس کا یہ رنگ علماء کے یہاں بھی مفقود ہے، ایک تو عصر کے بعد تفریحِ طبع کا ذہن ہوتا ہے، دوسرے بعض کے یہاں بالقصد علمی گفتگو کو غیر مستحسن سمجھا جاتا ہے، ان کے یہاں امورِ سیاست اور کوائف زمانہ کے واقف کار ہی مجلس پر حاوی رہتے ہیں، یہ چیز بھی قبیح نہیں؛ بل کہ امورِ زمانہ سے باخبر رہنا بھی اپنی جگہ اہم تر ہے؛ تاہم علمی مذاکروں کا، اہل علم کی مجالس سے یک لخت اٹھ جانا اور اس سے ہمارا اصاف کترانا بھی لمحۂ فکریہ ہے، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کے یہاں مجلس میں بھی علمی مذاکرے کی میراث زندہ وتابندہ دیکھی گئی۔

عرق ریزی وجانفشانی

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

علامہ اقبال

آپ کی زندگی عمل پیہم کا بھرپور استعارہ ہے، آپ کے مسلک میں جہد مسلسل ''علت العلل'' کا جزو لاینفک تھی، ان کا ایقان یہ تھا کہ انسان کی مساعی ہی، قدرت کی پراسرار قوتوں کو مشکل کشائی اور سرپرستی کی جانب راغب کرتی ہیں۔ چنانچہ پیرانہ سالی میں بھی نوجوانوں سے زیادہ مصروفِ عمل دیکھا گیا، ولولۂ عمل سے بے تاب دل ہمیشہ جوان رہا، آپ کے جملہ آثارِ علمیہ کو انھیں شب وروز کی کاوشوں کا خون بہا سمجھنا چاہیے، کوہ کنی اور سنگ

تراشی میں نازک مزاجی کا کوئی دخل نہیں، ہم نے اپنے اکابر اور آپ کے معاصرین کو بھی کھلے دل سے اس جانفشانی کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھا اور سنا اور حلقہء احباب کو تو اس احساس پر غریق ندامت پایا کہ پیرانہ سالی، ضعف اور عوارضِ صحت کے علی الرغم، حضرت کی مساعی جلیلہ، ہماری کاوشوں سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔

حق گوئی و بیباکی

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

علامہ اقبال

حق گوئی میں بے نظیر تھے، بہ بانگِ دہل اپنی بات رکھنے کے لیے جو جرأتِ ایمانی درکار ہے، وہ حضرت حق سے بہ افراط پائی تھی، اس کی ایک دو نہیں، درجنوں مثالیں ہیں، نیز اس کا مشاہدہ کرنے والے بھی ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ آپ کی بنگلور تشریف آوری ہوئی تھی، میں اس وقت مسیح العلوم میں مدرس تھا، شہر کی مشہور مسجد ''قادریہ مسجد'' میں آپ کا خطاب تھا، مسجد حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، مجمع مرفہ الحال اور تعلیم یافتہ تھا، جس میں مختلف افکار و خیالات کے لوگوں کی نمائندگی تھی، حضرت والا کسی موضوع پر گفتگو فرماتے ہوئے مودودیت پر آگئے اور اس شان سے گفتگو کی جیسے دیوبند کی دارالحدیث میں تشریف فرما ہوں، مجمع پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور مخلصیں اس ڈر میں سانسیں روکے ہوئے تھے کہ مبادا کسی گوشے سے گستاخانہ ردعمل نمودار ہو؛ لیکن آپ کے بیان وخطاب کا رعب بھی دیدنی ہوتا تھا، سب گردنیں بدستور خم رہیں اور ماحول کی خوشگواری میں فرق ڈالنے والا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

اسی قبیل کا ایک اور قصہ یاد آیا اور وہ بھی شہر بنگلور ہی کی مرکزی مسجد سر اسماعیل سیٹھ فریزر ٹاون کا ہے، حضرت

ایک بہت بڑے مجمع کو خطاب کر رہے تھے اور حسنِ اتفاق کے دار العلوم کے اکابر اساتذہ میں سے، ایک دیگر استاذِ گرامی بھی تشریف فرما تھے اور وہ باہر والے حصے میں ایک جانب تھے، میں بھی ان کے قریب بیٹھا تھا، واقفِ حال جانتے ہیں کہ اس مسجد سے مربوط طبقہ بہت حد تک وسیع المشرب اور جدید سوچ وخیال کا حامل ہے، حضرت نے مجمع کی نبض دیکھ کر اسی کا علاج شروع کیا اور بہت صاف صاف سنائی، مجھے اس بیان کا ایک وقفہ مستحضر ہے، جس نے مسجد کے در و بام پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب موبائل کی آمد کی خبریں اخباروں تک محدود تھیں اور مواصلات کا انحصار لینڈ لائن پر تھا، متدین گھرانوں میں اس بات کا اہتمام ہوتا تھا کہ نئی کال گھر کا مرد ہی رسیو کرے، جب کہ جدید گھرانوں میں توسع تھا، مردوں کے ہوتے ہوئے بھی خواتین کی سبقت قبیح نہیں سمجھی جاتی تھی، حضرت نے اس پر تنبیہ کے لیے سخت تعبیر منتخب کی، مزید کام لب و لہجے نے کیا، جملہ کیا تھا ایک بجلی تھی، جو پوری قوت کے ساتھ بلا استثناء سب پر گری، میرے قریب تشریف فرما حضرت الاستاذ نے بھی اس کی شدت کو محسوس کیا۔

نیز ان سب سے بڑھ کر وہ واقعہ ہے، جس کی شہرت دور دور تک ہوئی، بنگلور میں حضرت قبلہ مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم، بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور نے، ''تحفظ شریعت'' کے عنوان سے اپنی نوعیت کی سب سے بڑی اور تاریخی کانفرنس بلائی تھی، اس رات قدوس صاحب عیدگاہ کے میدان میں پورا ہندوستان موجود تھا، دار العلوم کے اکابر، ندوۃ العلماء کے اکابر وغیرہ زینتِ اسٹیج تھے، اجلاس میں بنگلور کے ایک بزرگ عالم دین نے اپنے بیان میں بعض قابلِ اعتراض نکات شامل کر دیے، حاضرین دم بہ خود رہ گئے، مجمع میں ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی، حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا تفصیلی بیان پہلے ہو چکا تھا، حضرت دوبارہ خطاب کی کرسی پر تشریف لائے اور جملہ اکابر کی موجودگی میں، مذکورہ بالا فکر کی گمراہی کا اعلان فرمایا، اس وقت کا ماحول دیدنی تھا؛ کیوں کہ شہر بنگلور کے وہ مالک ہوتے تھے، یوں علانیہ رد، ذاتی خطرات کو دعوت دینے سے کم نہ تھا اور ایسا

ہوا بھی؛ چناں چہ دھمکیاں بھی دی گئیں اور بنگلور میں داخلے کی پابندی کے عہد و پیمان بھی ہوئے۔

یہاں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں: ایک تو یہ کہ برملا اظہارِ حق، آپ کا خاص ذوق تھا، دوسرے یہ کہ وہ حق گوئی میں کسی بھی حد تک جانے کا حوصلہ رکھتے تھے اور اس حوالے سے وہ ہر طرح کی ترغیب و ترہیب سے بے نیاز تھے، یہ ایک دو واقعات محض مثالیں ہیں، حضرت کا یہ مزاج خاص تھا اور سینکڑوں لوگ اس جلوے کے شاہد ہیں؛ گویا مذہب و مشرب ہی حق گوئی تھا، جس بات کو وہ اپنے نزدیک حق سمجھتے تھے، اس کو بلا تامل، بے کم و کاست، بدون ہموار کیے، مصلحت و موقع کا انتظار کیے بغیر، بے ساختہ کہہ ڈالنا، ان کے یہاں معمولی بات تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے دستِ غیب آپ کا مؤید ہے۔

قدامت پر اصرار

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

متاعِ دین ہی اہل اللہ کا سرمایہ ہے، اس خرمنِ حیات کے پیچھے قربانیوں کی ایک داستان ہوتی ہے، جسے وہ اپنے خونِ جگر سے رقم کرتے ہیں، دورِ جدید کی بیشتر پیش رفت اسی متاعِ عزیز پر شب خون مارتی ہیں؛ اس لیے اہلِ نظر ان سے قربت بنانے میں محتاط ہوتے ہیں، اس سے انکار نہیں کہ بسا اوقات اس احتیاط میں بھی تجاوز ہو جاتا ہے؛ لیکن کیا کریں قزاقوں کی نگری میں، شک مزاجی ہی سلامتی کی ضامن ہے؛ بعض جدید سہولیات سے اکابر کے ابتدائی نفور کو اسی پسِ منظر میں دیکھنا چاہیے، اس حوالے سے حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ بھی غایت درجہ ذکی الحس تھے، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ اپنے استاذِ گرامی حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی علیہ الرحمہ کے حوالے سے بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ان کے خدام یا فرزندان نے پرانا فرش اٹھا دیا، تو بڑی حسرت سے فرمایا: سعید! ایک دن یہ فرش ہی تبدیل ہو جائے گا اور یہاں نئی نئی چیزیں در آئیں گی۔

حضرت ایک مرتبہ مسیح العلوم تشریف لائے، راستے میں کسی نے حضرت امام مالک کے مشہور ارشاد: ''لن یصلح آخر هذه الامة إلا بما صلح به أولها'' کی تشریح دریافت کی، حضرت نے سکوت اختیار فرمایا، جامعہ آمد پر دفتر تشریف لے گئے، جہاں کرسیوں کا نظام تھا، حضرت نے کرسی پر بیٹھنے سے گریز کیا اور دوسری جانب نیچے تشریف فرما ہوئے اور سائل سے مخاطب ہوئے کہ اس اثر کا مفہوم یہی ہے؛ گو کہ حضرت نے خود آخر میں بہ عذر کرسی استعمال کی اور ظاہر ہے کہ مسیح العلوم کے دفتر میں بھی کرسیوں کا نظم، عذر وضرورت اور کاموں کی انجام دہی میں سہولت وغیرہ کے پیش نظر ہی کیا گیا تھا۔

یادوں کے صفحات

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ِماسوا کو مٹاتی چلی گئی

مادرِعلمی دارالعلوم دیو بند میں داخلے کا خواب ۱۹۹۷ء کو پورا ہوا؛ گو کہ میرا یہ ششم کا سال تھا؛ لیکن آپ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، اس وقت صحت بھی عمدہ تھی، گوشہ گوشہ آپ کے جمال وکمال کی خوشبو سے معطر تھا، سابقہ سال میرے برادرِ کبیر جناب مولانا فخر الدین قاسمی کی فراغت کا سال ہے، وہ ممتاز طلبہ میں تھے، اگر تدریس اختیار کرتے، تو ان کی بھی ایک شان ہوتی، خط نہایت صاف تھا، ترمذی شریف کا درس اہتمام سے ضبط کیا تھا، حضرت کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے، بالکل نوعمری میں بندے کے قلب پر اولین نقوش یہیں سے ثبت ہوئے۔

ایک خاص دل فریب ادا

احقر کو بعض پروگراموں کے لیے رابطہ کرنے کا بھی اتفاق ہوا اور بعض رابطہ کاروں کی تحریک دیکھنے کا بھی موقع ملا، اس سلسلے میں احقر نے ایک خاص ادا نوٹ کی، پروگرام کا لفظ سنتے ہی غایت درجہ بے رخی اختیار فرماتے اور ایسا جواب دیتے کہ سامنے والا قطعی مایوس ہوجائے، نو وارد کی تحریک یہیں اختتام پذیر ہوجاتی؛ لیکن اگر کوئی

واقف کار ہوتا اور دعوتِ قدم رنجائی میں معقولیت شامل کرتا، تو مان بھی لیتے تھے، میں نے بعض کرتب بازوں کو بھی کامیاب ہوتے دیکھا، ایک صاحب بہت ہی فن کار ہیں، وہ عصر کے بعد حاضر ہوئے، حضرت نے ان کے نمودار ہوتے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر معافی کی خواستگاری کا اشارہ دیا، انھوں نے جیسے ہی پروگرام کی بات چھیڑی، حضرت نے درمیان میں قطع کلامی کرتے ہوئے، ان کو مایوسی آمیز حتمی جواب دیا، وہ پہنچے ہوئے تھے، خاموش ہو گئے، قدرے توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ جنبانی کرتے ہوئے کہنے لگے کہ حضرت سفر کے بارے میں آپ کی مرضی؛ لیکن مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مسجد کے سنگِ بنیاد کا معاملہ ہے اور ایک صاحبِ خیر نے یہ کہا ہے کہ اگر حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم تشریف لاتے ہیں، تو تعمیر کے مکمل اخراجات میں دوں گا، بہ صورت دیگر میری طرف سے کوئی عہد نہیں، یہ تیر کام کر گیا اور حضرت نے فوراً فرمایا: ٹھیک ہے جمعہ کا دن رکھ لو، اس قسطوں والی ترکیب کو میں نے بھی آزمایا اور بخت آور رہا۔ اس سلسلے میں حضرت تعلق کو حد درجہ نبھاتے تھے، حضرت نے بعض ایسے مقامات کے لیے بھی زحمتِ سفر گوارا کی، جہاں نام اور کام خاص نہیں تھا؛ لیکن زمامِ کار کسی قدیم خادم کے ہاتھوں میں تھی۔

فضائی سفر سے متعلق میرا سوال اور آپ کا جواب

فضائی سفر میری خاص کمزوری ہے، ٹکٹ کنفرم ہوتے ہی پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں، ائیر پورٹ کی سمت دوڑتی ہوئی سواری، مقتل کی جانب کشاں کشاں لیجائے جانے کا تصور پیدا کرتی ہے، میں نے دہلی ائیر پورٹ پر، حضرت کے سامنے اس کا شکوہ کیا، حضرت نے بے تکلف انداز میں تین سوال کیے کہ بتاؤ مرنے کا وقت مقرر ہے؟ جگہ مقرر ہے؟ طریقہ مقرر ہے؟ اثبات کے جواب پر فرمایا کہ پھر ڈر کس بات کا ہے؟ حضرت کے خاص انداز نے کم از کم اس وقت راحت پہنچائی اور وہ سفر نسبتاً آسان گذرا، دورانِ سفر فلائٹ میں حضرت کرسی سے اٹھ کر درمیان کے راستے میں کھڑے ہو گئے تھے، مسلسل بیٹھنے میں تکلیف محسوس ہوئی ہوگی، کافی دیر کھڑے رہے، میرے اوپر نظر پڑی تو مسکرائے۔

دل چسپ فون کال

کئی سال قبل کی بات ہے، حضرت ایک مسئلے کی تحقیق فرما رہے تھے، میں نے سرسری طور پر عرض کیا کہ یہ بات ایک عرب عالم نے فلاں کتاب میں لکھی ہے اور اس موضوع پر مبسوط کلام کیا ہے، بات آئی گئی ہوگئی، پھر اس بحث نے زور پکڑا، تو ایک شب مجھے حضرت کا فون آیا، میرے پاس اس وقت حضرت کا نمبر نہیں آیا تھا، دوسری طرف سے آواز آئی کہ میں سعید احمد بول رہا ہوں، مجھے آواز کی شناخت نہیں ہوئی، تو میں نے لا پرواہی میں کہا: بولو کیا کہنا ہے! حضرت نے دوسری بار میں فرمایا کہ میں سعید احمد پالن پوری بول رہا ہوں، تب میں ناگاہ اپنی اوقات میں آیا، حضرت نے فرمایا کہ مجھے عرب عالم کی وہ بحث درکار ہے، سردی شباب پر تھی اور کہرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، حضرت نے کسی کو بھیجنے کی پیش کش کی؛ لیکن وہ کاغذات لے کر حاضرِ آستانہ ہونا میری سعادت تھی، اس لیے صبح سویرے میں لے کر حاضر ہوا اور دعائیں لیں۔

تعلیم میں لا پرواہی پر اولاد کی فہمائش

میری معین مدرسی کے دور میں حضرت کے ایک صاحب زادے کا سبق متعلق تھا، اس کو بسا اوقات سبق میں دل چسپی کم ہوجاتی تھی، ایک مرتبہ کئی دن کا ناغہ ہوگیا، میں اور رفیقِ محترم حضرت مولانا توحید عالم بجنوری قاسمی، استاذ دارالعلوم دیوبند، حضرت کو آگاہ کرنے کے لیے دولت کدے پر حاضر ہوئے، اس وقت رہائش سابقہ مکان میں تھی، پہلی منزل پر کونے کا کمرہ مطالعے اور ملاقات کے لیے تھا اور وہیں سے ایک دروازہ زنانے حصے کی طرف بھی کھلا تھا۔

حضرت کی خاص ادا تھی کے روزمرہ آنے والوں کے علاوہ کسی کو دیکھتے تو فوراً آنے کا سبب دریافت فرماتے، ہم نے معاملہ پیش کیا، کئی دن کی غیر حاضری کو سن کر حضرت بہت خفا ہوئے، فرطِ غضب میں اولاً تو ہماری خبر لی کہ اطلاع دینے میں اتنی تاخیر کیوں کی، پھر صاحب زادے کو طلب کیا، حضرت حسبِ عادت بیٹھے ہوئے تھے: لہٰذا

بیٹھے ہوئے ہی مارنا شروع کیا اور بہت مارا، وہ جان بچانے کے لیے کھڑا ہوا، تو حضرت بھی مارتے مارتے کھڑے ہو گئے، اس وقت حضرت نے بیٹے کو کتنا مارا؟ اس کے لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی باپ کو بہ دست خود اتنا مارتے ہوئے نہیں دیکھا، حضرت کے تنفس میں تغیر آ گیا، حال برا ہو گیا، آخر گھر میں سے دخل ہوا اور آواز آئی، گفتگو کا وہ تبادلہ گجراتی میں تھا، ادھر مبتلا بہ کو یہ سمجھ میں آیا کہ کسی طرح گھر کے زنان خانے کی طرف پیش رفت کرنی چاہیے، وہ اُدھر بڑھا اور حضرت بھی اس کو مارتے مارتے ادھر تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد واپس تشریف لائے، تو ہم اپنی باری کے منتظر تھے؛ لیکن ہمارے لیے تیز کلامی پر اکتفا فرمایا اور ہم بہت ہی ندامت لیے بہ سلامت اپنے حجروں کو پہنچے۔

شاگردوں کی حوصلہ افزائی

دورۂ حدیث میں اول آنے پر انعام کے سلسلے میں کچھ فرمانے کے لیے مجھے گھر طلب کیا، حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کی طرف سے، انعامی کتب کے انتخاب کی ذمے داری آپ کو تفویض کی گئی تھی، میں عصر بعد حاضر ہوا تو مخصوص مہمانوں کا ایک وفد موجود تھا، مخصوص میں نے اس لیے کہا کہ حضرت بعد میں ان کو رخصت کرنے کے لیے باہر سڑک تک تشریف لائے تھے، آپ نے ان کی توجہ میری طرف مبذول کرائی اور بہت حوصلہ افزائی کی۔

ہمارے سال میں ترمذی شریف کے ششماہی نتیجے پر شاکی ہوئے تھے، فرمایا تھا کہ مجھے صرف دو کاپیاں پسند آئیں، اس وقت نمبرات کا منتہی عدد پچاس تھا، جس کو حاصل کرنے والے دو طالب علموں میں سے ایک میں تھا اور دوسرے رفیق محترم مفتی محمد مزمل صاحب بدایونی، استاذ دارالعلوم دیوبند تھے، جن کو حسبِ سابق ششماہی امتحان میں اول آنے کا امتیاز بھی حاصل ہوا تھا، اس امتحان میں عاجز نے اس خوشی پر اکتفا کیا تھا کہ کُل ممتحنہ چار کتابوں میں سے، بخاری اور ترمذی دونوں میں پچاس نمبر آئے تھے اور یہ امتیاز بھی فقط متذکرہ بالا دو طالب علموں تک محدود

تھا۔

دل چسپ مذاکرے

ایک مرتبہ میں نے علاماتِ قیامت اور ظہور مہدی وغیرہ سے متعلق گفتگو کی، حضرت کی رائے یہ تھی کہ ابھی اس کا وقت دور ہے، حضرت نے فرمایا کہ ظہور مہدی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ترکی پر غیروں کا قبضہ ہوگا؛ کیوں کہ احادیث میں آیا ہے کہ ظہور مہدی سے قبل مسلمان قسطنطنیہ فتح کریں گے اور اس کے لیے خون بہانے کی نوبت نہیں آئے گی؛ بل کہ نعرۂ تکبیر سے فتح ہوگا اور ابھی چوں کہ ترکی پر مسلمانوں کی حکومت ہے؛ اس لیے ظہور مہدی کا امکان نہیں ہے۔

بندے نے یہ عرض کیا تھا کہ مذکورہ واقعہ پیش آچکا ہے، جنگ عظیم اول کے بعد خلافت کا خاتمہ ہوا، ترکی بھر میں قرآن، اذان اور نماز سمیت، شعائر اسلام پر سخت ترین پابندی عائد کی گئی، یہ ترکی کا غیروں کے قبضے میں جانا تھا، پھر طیب اردگان وغیرہ کی سرکردگی میں، وہاں دوبارہ اسلامی شعائر اور دینی سرگرمیوں کی واپسی اور اسلام کی بہار سے ترکی کا سرسبز ہونا؛ یہ فتح قسطنطنیہ ہے، جو نعرۂ تکبیر یعنی پر امن راہ سے حاصل ہوئی، قتال کی نوبت نہیں آئی۔

میں نے جب قربِ قیامت پر اصرار کیا تو فرمایا کہ تو ایضاح البخاری لکھنا بند کردے، جب تیرے نزدیک قیامت بس آنے ہی والی ہے، تو اس کو لکھنے کا کیا فائدہ؟

میں نے ایک بار لکھنے پڑھنے کے عوارض بیان کیے؛ بالخصوص گھریلو موانع کا ذکر کیا، تو فرمایا کہ تیرے بس کی بات نہیں ہے، تم لوگ کچھ نہیں کر پاؤ گے، پھر فرمایا کہ میں نے زندگی میں ماچس تک خود نہیں خریدی، اولاً یہ امور امین کے ذمے تھے، بعد میں بچوں نے سنبھال لیے۔

تمام خاکے مکمل

ایک اور چیز جو آپ کو معاصرین ہی نہیں، بہت سے اکابرینِ امت سے بھی ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ اپنے کرنے کا تمام کام کر گئے اور ہر کام بڑی آسانی سے، گویا ہنستے ہنستے کر گئے، بڑے بڑے منصوبے بنائے اور ان کو بہ خوبی مکمل کیا اور علم وفکر کا بڑا ورثہ چھوڑ گئے:

میں آج مر کے بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر مِری محفل، مِرا مزار نہ پوچھ

علالت اور انتقال

شوگر کے قدیم عارضے کے باوجود مجموعی طور پر حضرت کی صحت وتوانائی ہمیشہ بہتر دیکھی گئی؛ اس لیے جب دو مواقع پر تشویش کی صورتِ حال بنی، تو اس کو ناگاہ سمجھا گیا، پہلا موقع دل کے عارضے کا تھا، جو کامیاب آپریشن پر منتہی ہوا، اس وقت بھی یاس کی لہر آئی تھی، دوسرا موقع یہ تھا، جو دارِ فانی سے کوچ پر منتہی ہوا، یہ سلسلہ رجب میں دورانِ درس زبان بندی سے شروع ہوا تھا؛ لیکن چوں کہ زبان رکنے کی تکلیف سابق میں بھی کئی بار پیش آئی تھی اور علاج سے اس کا ازالہ ہوتا رہا تھا؛ اس لیے شاید کسی نے بھی اس میں خطرے کی علامت محسوس نہیں کی اور ان کا یہ ادراک درست تھا؛ چنانچہ حسبِ سابق ممبئی کے علاج سے افاقہ ہوا؛ یہاں تک کہ آپ نے طویل خطاب بھی کیے؛ لیکن پھر طبیعت ناساز ہوئی اور اس بار مختلف عوارض نے ہجوم کیا؛ وقتِ موعود آ گیا تھا؛ اس لیے قضا غالب آئی اور تدابیر کارآمد نہ ہوئیں۔

عالمی وبا کورونا وائرس کی وجہ سے آمد ورفت کی راہیں مسدود تھیں؛ اس لیے سانحۂ جان کاہ نے دوہرا غم دیا، جو جہاں تھا وہیں تڑپ کر رہ گیا، نہ روئے مبارک کی زیارت ملی، نہ نمازِ جنازہ کی سعادت، ایک غم نہیں تھا غموں کے پہاڑ تھے:

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی

تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

کیفی اعظمی

حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ ہمارے درمیان نہیں رہے؛ لیکن ان کے چھوڑے ہوئے نقوش و آثار، اس ناقابلِ تسخیر سلسلۂ کوہ کی مانند، ہمارے سامنے پھیلے ہوئے ہیں کہ جس کی بلند و بالا اور دل کش چوٹیاں، آنے والی نسلوں کو دعوتِ شوق کے نظارے کے ساتھ، ذوقِ جادہ پیمائی بھی دیتی رہیں گی:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

میر تقی میر

بہ حالتِ غنودگی آپ کی زیارت

بندے کو بہ حالتِ غنودگی دو بار آپ کی زیارت ہوئی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر دو دفعہ غنودگی، یعنی بین النوم والیقظہ ہی دیکھا، پہلی دفعہ روئے مبارک دیکھا، جو تازہ ہشاش بشاش اور درخشاں محسوس ہوا، حضرت حسبِ عادت تبسم فرما رہے تھے، بس اسی پر میں اٹھ بیٹھا، یہ ۲۷ رمضان کی بات ہے اور دوسرا واقعہ عید کے بعد کا ہے، اس بار آپ کو گفتگو کرتے ہوئے دیکھا، درمیان میں آپ نے پان تھوکا اور پھر سلسلۂ کلام شروع فرمایا۔

خاتمہ

عاجز کی داستان انجام کو پہنچی، میں زبان و بیان کا آدمی نہیں ہوں، حضرت کے کمالات کا بیان میری باریابی سے بالاتر ہے، اس مضمون میں شاید ہی کوئی بات ایسی ہو، جو قارئین کی معلومات میں اضافے کا سبب بنے، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں گلہائے عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے، ہزاروں تاج دارانِ قلم کی گردنیں آپ کے حقوق سے گراں بار ہیں، جن کو حقِ تلمذ کی ادائے گی کے فریضے کا احساس بھی ہے؛ اس لیے بہترین تخلیقات آئندہ بھی نمودار ہوں گی؛ میں تو بہ صدقِ دل کہتا ہوں کہ ان سطور کی تسوید کے بہانے، کچھ وقت

حضرت الاستاذ کی یادوں میں گزارنا چاہتا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ غرض بالا کی تحصیل میں نامراد نہیں ہوا۔

تجھ بن تیرا شہر ویران بہت ہے
گلی چپ ہے بازار سنسان بہت ہے
تیری صدائیں ہیں چار سو بکھری ہوئی
تیری تلاش میں نگاہ پریشان بہت ہے

اور اخیر میں ان دو اشعار کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں:

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلہء تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امید یارنظر کا مزاج درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے

فیض احمد فیض

الوداع حضرت الاستاذ:

محمد فہیم الدین بجنوری قاسمی

خادم دارالعلوم دیوبند

۱۴ شوال ۱۴۴۱ھ-۷ جون ۲۰۲۰ء

❁...❁...❁

مخدوم العلماء حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوریؒ
یادوں کے چند نقوش

مولانا مفتی اشرف عباس قاسمی صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ ۹/مئی ۲۰۲۰ء منگل کی صبح یہ خبر صاعقہ اثر دارالعلوم دیوبند اور اسلامیان ہند کو سوگوار کر گئی کہ علوم ولی اللہی کے شارح، فکر نانوتوی کے امین، مسلک حق کے ترجمان، ملک العلماء استاذ گرامی مرتبت حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ طویل علالت کے بعد مولائے حقیقی سے جا ملے، یہ خبر چوں کہ وحشت ناک اور غم انگیز تھی اس لیے تھوڑی دیر تک دل کو تسلی دیتے رہے کہ شاید خبر غلط ہو؛ تاہم تحقیق کے بعد جب کوئی راہ نہیں بچی تو چار و ناچار یقین کرنا پڑا۔ باچشم تر ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا اور بوجھل قدموں کے ساتھ محلہ بیرون کوٹلہ میں واقع حضرت والا کی رہائش گاہ پر حاضر ہو کر صاحبزادگان سے اظہار تعزیت کیا، آخری دیدار اور جنازے و تدفین میں شرکت کی وجہ سے دل میں اٹھ رہے جذبات کچھ سرد پڑ جایا کرتے ہیں؛ لیکن لاک ڈاؤن کی وجہ سے یہ حسرت بھی دل میں ہی رہ گئی، طلبہ تڑپتے رہے اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہزاروں تلامذہ کے دل مسوس کر رہ گئے۔

حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحبؒ نے خاص شان استغنائیت کے ساتھ زندگی گزاری، سالہا سال سے دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ کے نام پر ایک پائی بھی قبول نہیں کرتے تھے اور گزشتہ سالوں میں جتنا کچھ لیا تھا وہ بھی دارالعلوم کے خزانے کو لوٹا دیا تھا، رہائش بھی دارالعلوم کی زمین پر دارالعلوم کے مکان میں نہیں تھی؛ بلکہ محلہ ''بیرون

کوٹلہ‘‘ میں ذاتی مکان میں رہتے تھے، دارالعلوم آمد ورفت میں سہولت کے لیے دورۂ حدیث شریف کے طلبہ نے ایک گاڑی کا نظم کرلیا تھا؛ لیکن طلبہ کوشش کے باوجود حضرت کو اس کے لیے رام نہ کر سکے اور اپنی خاص شان بے نیازی کے ساتھ دھوپ ہو یا گرمی، بارش ہو یا سردی دیوبند کے قدیم روایتی رکشے سے ہی آتے جاتے رہے اور اسی شان استغنائیت کے ساتھ آخرت کا بھی سفر کر گئے کہ نہ کسی کا سہارا لیا اور نہ ہم گنہ گاروں میں سے کسی کا کاندھا قبول کیا، خدا کی کروڑوں رحمتیں ہوں آپ کی اس تربت پر جس نے اس گنج گراں مایہ اور آفتاب علم وفضل کو اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔

حضرت الاستاذ مفتی صاحب کی زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت تھی، وہ بے نیازی اور بلاخوف لومۃ لائم اظہار حق میں اپنے اکابر کی روایات عزیمت کا عکس جمیل تھے، مدینۃ العلم دیوبند میں خالص علمی ذوق کے حامل ،مربیٔ اجیال اور صاحب طرز مدرس ومعلم تھے، ان کے انتقال سے دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث سونی ہوگئی ہے، علم وتحقیق کا ایک سنہرا باب بند ہوگیا ہے، قابل فخر روایات کا تسلسل ٹوٹ گیا ہے۔

پہلی مرتبہ زیارت کا شرف ۱۹۹۶ء میں جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ میں حاصل ہوا، جہاں تشریف آوری کے موقع پر آپ نے ’’نورالانوار‘‘ کے متعدد مواقع سے سوالات بھی کیے اور بیش قیمت نصائح سے نوازا؛ البتہ باضابطہ استفادے اور اس جوئے علم سے اپنے ظرف کے بہ قدر لینے کے مواقع اس وقت نصیب ہوئے جب ۱۹۹۹ء میں مقدر نے یاوری کی اور دورۂ حدیث شریف کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ منظور ہوا، اس وقت پورے دارالعلوم میں آپ کے طرز تفہیم اور خاص اسلوب درس کا غلغلہ تھا، ہمیں بھی آپ سے جامع ترمذی اور شرح معانی الآثار پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی، آپ کتاب پر مکمل قابو یافتہ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے، آپ کی آمد کے ساتھ ہی شور وشغب ختم اور ہمہ تن گوش ہو کر طلبہ درس سماعت کرتے تھے، آٹھ سو طلبہ کو اپنے اندسمو لینے والی درسگاہ حدیث میں نہ چوں کی آواز آتی اور نہ چاں کی، ایسا معلوم ہوتا کہ سکینت نازل ہو رہی ہے، علم وفن کے

جواہر لٹائے جارہے ہیں اور طلبہ اس قدر پرسکون اور ہمہ تن مصروف ہیں جیسے ان کے سروں پر پرندے ہوں، طلبہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اسی وقت آتی یا ہنسی کی آواز اسی وقت بلند ہوتی جب حضرت الاستاذ خود چاہتے اور خاص لطیفہ سنا کر مجلس میں شگفتگی اور تازگی بکھیر دیتے، درس کا انداز اس قدر اچھوتا اور البیلا ہوتا کہ ہر کسی کو اس سے خاص فائدہ محسوس ہوتا، بڑے بڑے علمی اختلافات وابحاث کو چند جملوں میں سمیٹنے کا خاص ملکہ فیاض ازل نے عطا کیا تھا، انتہائی مرتب انداز میں حاصل درس کو اس طرح بیان کرتے کہ طلبہ عش عش کر اٹھتے تھے، منتخب عبارت خواں طالب علم کو بھی حسن صوت کے ساتھ بڑے تیقظ اور زیرکی کا ثبوت دینا پڑتا تھا، اپنے وضع کردہ اصول سے سمجھوتہ نہیں کرتے تھے اور طلبہ پر بھی سخت نظر رکھتے تھے، ان خوبیوں نے طلبہ کے درمیان آپ کو خاص قسم کی محبوبیت اور دل آویزی عطا کردی تھی۔ آپ کے حلقۂ درس میں کئی ساتھیوں کے ہم راہ اللہ پاک نے مجھ ناچیز کو بھی سعادت عطا کی کہ ترمذی کی ہر روایت ہم نے بہ راہ راست سنی، کبھی کسی طرح کے انقطاع کی شؤمت سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔

جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ میں دس سالہ تدریسی خدمات کے بعد جب دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی درجات میں اساتذہ کی تقرری کا اعلان آیا تو اس ناچیز نے بھی رب کریم کی عطا کی امید پر درخواست گزار دی، اس موقع پر مفتی منظور احمد کانپوریؒ اور مفتی ابوالقاسم صاحب بنارسی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہم راہ حضرت مفتی صاحبؒ بھی انٹرویو کے اہم رکن تھے، حضرت مفتی صاحبؒ کی بارعب اور بھاری بھرکم شخصیت کے تصور کے ساتھ ایک بار پھر حضرت والا کے سامنے امتحان دینے کا موقع ملا، پورے انٹرویو میں کسی خفگی یا جلال کے مظاہرے کے بغیر حضرت مفتی صاحبؒ نے گلستان اور شرح تہذیب کے متعدد مقامات سے نرمی اور آہستگی کے ساتھ سوالات کیے اور اس طرح مجھ جیسے کم ہمت کو بھی بہ قائمی ہوش وحواس جوابات دینے کے مواقع نصیب ہوگئے، تقرری کی منظوری کے بعد جب حضرت والا کی خدمت میں حاضری دی تو حضرت نے دعا دی اور خاص انداز میں نصیحتیں کیں اور اس طرح مجھ ناچیز کا مقدر جاگ اٹھا اور حضرت والا کی زیر سرپرستی دارالعلوم میں خدمت کی سعادت میسر ہوگئی، احقر کے پورے

آٹھ سالہ دورِ تدریس کے درمیان حضرت والا ہی صدر المدرسین رہے، اس دوران کئی بار ہمارے مختلف مسائل آپ کے سامنے پیش ہوئے، آپ نے ہمدردانہ اور مشفقانہ جذبات کے ساتھ ہمارے مسائل کو سنا اور ان پر غور کیا، آپ ہی کی زیر صدارت مجلس تعلیمی نے ادنی سے وسطی میں ترقی کی سفارش کی جسے بعد میں مجلس شوری نے بھی منظوری دی، تعلیمی سال کے آغاز میں دفتر اہتمام میں جہاں سارے اساتذہ موجود ہوتے، آپ کا پر مغز کلیدی خطاب ہوتا، جس سے ہم نوآموزوں کو بڑا فائدہ ہوتا، سال گزشتہ بھی بہ حیثیت صدر مدرس آپ نے درجات ادنی و وسطی کے سارے اساتذہ کو جمع کر کے بڑی دلسوزی کے ساتھ پابندی وقت اور چھٹیوں کے نظام سے متعلق قیمتی ہدایات دیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ عام وضع سے ہٹ کر انفرادی خصوصیات کے حامل بزرگ تھے، ظاہر و باطن میں یکسانیت تھی، وہ تعریف و توصیف میں کذب بیانی، مبالغہ آمیزی اور تصنع سے پاک انسان تھے، یہ مطلب نہیں کہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی بھی نہ کرتے ہوں؛ بلکہ وہ خورد نواز بھی تھے؛ لیکن نہایت نپے تلے چند الفاظ ہی استعمال کرتے تھے اور اس کے ساتھ اصلاح و تربیت سے نہیں چوکتے تھے، میرے بعض مضامین کی جہاں آپ نے سراہنا فرمائی کہ ''یہ تم نے ٹھیک لکھا ہے'' وہیں کئی بار اصلاح و تنبیہ بھی فرمائی؛ چنانچہ جب ''اباضیہ'' کے سلسلے میں ماہ نامہ دار العلوم میں مضمون شائع ہوا اور اس میں جو موقف اختیار کیا گیا تھا، اس موقف کی تغلیط تو نہیں فرمائی؛ مگر اس پر حضرت کو انشراح نہیں ہو پا رہا تھا تو حضرت نے دو تین بار مجلس میں فرمایا کہ اس کی مزید تحقیق کرو! احقر کی تحقیق و تعلیق سے شائع شدہ ''نزہۃ النظر في توضیح نخبۃ الفکر'' کی موجودہ شکل و صورت آپ ہی کے ملاحظات و رہنما ہدایات کی رہین منت ہے، ابھی چند ماہ قبل احقر کا مرتب کردہ رسالہ ''صحاح ستہ تعارف و خصوصیات'' خدمت میں پیش کیا گیا تو از راہ نوازش پہلے پورا رسالہ پڑھا، بعض مقامات نشان زد فرمائے؛ چنانچہ آپ ہی کی ہدایت کی روشنی میں رسالے میں دو جگہ ترمیم کی گئی، اس کے بعد تشجیع کے لیے چند دعائیہ کلمات بھی تحریر فرمائے جو کتاب کے شروع میں

مطبوع ہیں۔

آپ بڑے وسیع القلب اور اپنے چھوٹوں وتلامذہ کے لیے بڑے مشفق واقع ہوئے تھے، اپنے ہم عصر علماء و مشائخ کے ساتھ علمی بنیادوں پر نقطہائے نظر کا اختلاف ہو جایا کرتا تھا، اس طرح کا اختلاف تعزیتی اجلاس کے سلسلے میں بھی ہم نے دیکھا، ایسے نازک معاملات میں ہم چھوٹوں کو اپنی حیثیت معلوم ہوتی تھی؛ اس لیے دونوں طرف کے بزرگ اساتذہ کے مکمل احترام کے ساتھ ایسے مسائل میں توغل کے بغیر الگ تھلگ رہنے میں ہی عافیت محسوس ہوتی تھی؛ لیکن مذکورہ بالا مسئلے میں یہ تاثر دیا گیا کہ جیسے میری کوئی مخالفانہ رائے ہے، مجھے اس صورت حال کا جب ادراک ہوا تو حضرت مفتی اشتیاق صاحب قاسمی جو حضرت مفتی صاحبؒ کے معتمد اور مزاج شناس ہیں، کے ہمراہ حاضر ہوا، تو حضرت والا نے نہایت بشاشت کا مظاہرہ فرمایا اور یہ کہتے ہوئے کہ تمہارے سلسلے میں میرا دل صاف ہے؛ بڑی دعاؤں سے نوازا، جس سے حضرت والا کی عظمت دل کے نہاں خانوں میں مزید جاگزیں ہوگئی۔

دیوبند مدینۃ العلم ہے اور یہاں علم وعمل کی پوری کہکشاں موجود رہتی ہے؛ تاہم ان اصحاب علم وفضل میں بھی آپ کا یہ امتیاز تھا کہ آپ کی مجلس بلاوجہ کے تبصرے، تعریض اور تنقید سے یکسر خالی ہوتی تھی، آپ کی عصر کے بعد کی مجلس میں خالص علمی باتیں ہوتیں، کوئی زبانی بات کر لیتا یا پرچی لکھ کر تھما دیتا اور حضرت مفتی صاحب شروع ہو جاتے اور علم وتحقیق کے موتی اس طرح لٹاتے گویا عصر کے بعد کی مجلس نہیں؛ بلکہ حضرت والا کے حلقۂ درس میں ہی بیٹھے ہیں۔

اللہ پاک نے مزاج کی یکسوئی اور اپنے کام سے عشق کی حد تک لگاؤ کی وجہ سے وقت میں کافی برکت دی تھی ؛اس لیے ہزاروں صفحات پر مشتمل وقیع علمی تالیفات آپ کے قلم سے منصۂ شہود پر آئیں، ان تمام جھمیلوں اور بکھیروں سے اپنے کو الگ کر رکھا تھا، جس سے یکسوئی اور لکھنے پڑھنے کے کام میں خلل پڑتا ہو، ہر کام کا ایک وقت تھا اور خاص ترتیب تھی، انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ کثیر العیال، مخیر تاجر ہونے، اپنی اولاد واحفاد کے

لیے الگ سے وقت فارغ کرنے اور دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم علمی دانش گاہ کی انتظامی وتدریسی مصروفیتوں کے باوجود بھی بڑے بڑے علمی معرکے سر کیے جاسکتے ہیں۔

مفتی صاحب بڑے باعزیمت، باحوصلہ اور مستقل مزاج انسان تھے، دو جواں سال صاحب اولاد بیٹوں کو اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا، اہلیہ کے غم فرقت کو جھیلا اور نہ جانے کیسے کیسے نامساعد حالات سے نبرد آزما ہوئے؛ لیکن ہم نے نہیں دیکھا کہ کبھی آپ کی زبان پر حرف شکایت آیا ہو یا بے صبری کا مظاہرہ کیا ہو؛ چنانچہ چند ماہ بیشتر رام پورہ سورت میں آپ کے فرزند گرامی کا انتقال ہوا، وہاں سے واپسی کے بعد بحر العلوم حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی حفظہ اللہ احقر کی موجودگی میں اظہار تعزیت کے لیے تشریف لائے تو حضرت مفتی صاحب نے نہایت استقلال کے ساتھ حضرت مولانا کے کلمات تعزیت کے جواب میں فرمایا کہ: ''جس کی امانت تھی اس نے لے لی، اس پر کیا افسوس کرنا''۔

حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحبؒ کی زندگی سے ہمیں عزیمت، انقطاع الی العلم، حق پر تصلب وواستقامت، نامساعد حالات میں بھی صبر واستقلال، زہد واستغناء، تنظیم اوقات اور کامیاب اسلوب تدریس کے جو اسباق ملتے ہیں، ان سے دیر اور دور تک زندگی کی تاریک راہوں کو بھرپور روشنی اور راہ نوردگان کو سچی رہنمائی ملتی رہے گی۔

حضرت الاستاذؒ نام ونمود اور بدعات وخرافات سے حد درجہ گریزاں تھے اور مرنے کے بعد بھی خاص امتیاز والے اعمال پر نقد فرماتے تھے، اسی ضمن میں ہمیشہ گور غریباں اور عامۃ المسلمین کے قبرستان میں تدفین کی وکالت کرتے تھے، خدا کا کرنا ایسا ہی ہوا کہ وہ ممبئی کی جوگیشوری میں واقع عام قبرستان میں ہی دفن کیے گئے۔

جس روز حضرت مفتی صاحبؒ بہ غرض علاج ممبئی کے لیے روانہ ہونے والے تھے، اس سے ایک دن قبل معمول کے مطابق نیازمندانہ حاضری ہوئی، حضرت کی طبیعت کافی متاثر تھی، بہ مشکل تمام چند جملے ہی وقفے وقفے سے بول پارہے تھے، ہم نے مجلس سے اٹھتے ہوئے سلام کیا، مصافحہ کیا اس کے اگلے روز ہی حضرت ممبئی کے لیے

روانہ ہو گئے؛ لیکن آہ! کسے معلوم تھا کہ یہ ملاقات اس عارضی دنیا میں آخری ملاقات ثابت ہوگی، اور یہ سفر ممبئی سفر آخرت کی تمہید ہے، افسوس! اب دیو بند میں حضرت کی زیارت اور ملاقات نہ ہو سکے گی، مزار قاسمی جا کر بھی دل کا غبار نہیں نکل سکے گا؛ بلکہ حال دل سنانے اور سلام عقیدت پیش کرنے کے لیے جوگیشوری ممبئی کے اسی اوشیواڑہ مسلم قبرستان میں حاضری دینی ہوگی، جہاں آٹھ فٹ کی گہری قبر میں صرف ایک شخص کو دفن نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ وہاں علم وعمل اور معرفت وعزیمت کی ایک تاریخ دفن کردی گئی ہے۔

اللہ رب العزت حضرت الاستاذ کی تربت پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائیں، جملہ حسنات وخدمات کو شرف قبول عطا کریں، اولاد واحفاد اور تلامذہ ومتعلقین کو وصبر جمیل نصیب فرمائیں اور دارالعلوم دیو بند اور پوری ملت اسلامیہ کو نعم البدل عطا کریں۔ آمین

❁...❁...❁

مثالی استاذ

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

مولانا مفتی امانت علی قاسمی صاحب
استاذ و مفتی دار العلوم وقف دیوبند

پچیس رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ صبح سات بجے یہ اندوہناک خبر ملی کہ عالم اسلام کی ہر دلعزیز شخصیت، علم و عمل کی پاکیزہ روایت کے امین حضرت الاستاذ، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ اب ہمارے درمیان نہیں رہے (انا للہ وانا الیہ راجعون)، کئی دنوں سے تشویش کی خبریں آرہی تھیں، تاہم اس خبر کے لیے دل و دماغ بالکل آمادہ نہیں تھا؛ لیکن تقدیر کے سامنے کس کی چلتی ہے، موت سے کس کو رستگاری ہے، میرے یا مجھ جیسے ہزاروں کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، قانون قدرت ہر آن اور ہر حال اپنا کام کرتی ہے، اور قدرت جس چیز کی مصلحت سے واقف ہے انسان اس کی تہہ تک نہیں جاسکتا ہے، ہر شخص کے آنے اور جانے کا وقت متعین ہے اس میں کوئی تاخیر نہیں ہوسکتی ہے، کسی کی موت کے وقت کو دنیا کا کوئی ماہر ڈاکٹر نہیں ٹال سکتا ہے، اس لیے نہ چاہنے اور دل کے نہ ماننے کے باوجود بھی اس خبر کا یقین کرنا پڑا۔

زندگی ہے اپنے قبضے میں نہ اپنے بس میں موت
آدمی مجبور ہے اور کس قدر مجبور ہے

جانے والے جاتے ہیں، آئے دن موت کی خبریں آتی ہیں، لیکن جسم و اعصاب پر اور دل و دماغ پر، بسا اوقات کسی کے جانے کی خبر سے جنبش بھی نہیں ہوتی؛ لیکن جانے والوں کی فہرست میں کبھی ایسے نام آجاتے ہیں،

جن کے جانے کا غم اور درد سہا نہیں جاتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جگہ اگر میری موت مقدر ہوتی تو شاید اتنا دکھ نہ ہوتا، مفتی صاحب کی وفات کا رنج وغم صرف اس لیے نہیں ہے کہ آپ میرے استاذ تھے، صرف اس لیے تکلیف نہیں ہوئی کہ مجھے آپ سے محبت تھی؛ بلکہ آپ کے منوں ٹن مٹی کے نیچے چلے جانے کا افسوس اس لیے بھی ہے کہ آپ دارالعلوم دیوبند کی زینت تھے، چمنستان قاسمی میں آپ سے رونق تھی، آپ کے عالم آخرت کے سفر پر چلے جانے کا غم، اندوہناک اس لیے بھی ہے کہ آپ علماء دیوبند کے ترجمان تھے، علوم نانوتویؒ کی توضیح وتشریح کرنے والے تھے، آپ کی وفات کی خبر دل پر بجلی بن کر اس لیے گری کہ آپ دارالعلوم کی مسند تدریس کی شان تھے، فکرولی اللہی کے امین ومحافظ تھے، آپ کی رحلت کا افسوس اس لیے بھی ہے کہ آپ علم حدیث کے نیر تاباں تھے، آپ سے دارالعلوم کی درس گاہ میں تابانی تھی۔ سچ پوچھیے تو یہ بھرتی کے الفاظ نہیں ہیں، مبالغہ آمیزی نہیں ہے، الفاظ کی ہیرا پھیری نہیں ہے، تعبیرات کی کرشمہ سازی نہیں ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مشکل حالات میں آپ امت کے لیے سرمایہ تھے، جس وقت کہ باطل قرآن وحدیث کی بے جا تاویلیں کررہا ہے، حدیث کی من گھڑت تشریح کررہا ہے ان حالات میں آپ امت کے لیے نسخہ شفاء تھے، قوم کے دردِ دل کی دوا تھے، آپ کو کھو کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے بحر بیکراں کو کھو دیا ہو، آپ سے بچھڑ کر لگتا ہے کہ کشتی اپنے ناخدا سے بچھڑ گئی ہے۔ سچ پوچھیے تو آپ کے جانے سے پوری قاسمی برادری سوگوار ہوگئی، ملت کے ہر طبقہ نے شدید کرب محسوس کیا، دارالعلوم کے بام ودر وہاں کے چمن وانجمن، گنبد ومینار، سڑک اور راستے، دارالحدیث کی مسند، مسجد رشید کا اسٹیج ہر ایک نے خاموشی سے تنہائی اور خلوت میں درد وکرب کا اظہار کیا ہے، یہ بھی سچ ہے کہ آپ اس وقت دارالعلوم کے گنجہائے گراں مایہ اور چمنستان قاسمی کے گل سرسبد تھے۔ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت، علمی شخصیت تھی، آپ تقریر، تحریر اور تدریس تینوں فنون میں ممتاز تھے، سب میں نمایاں تھے، آپ کی تقریریں علمی ہوا کرتی تھیں لیکن انداز اور طریقہ اس قدر سہل ہوتا کہ عوام وخواص ہر ایک یکساں مستفید ہوتے تھے، ہندوستان میں عام جلسوں میں آپ نہیں جایا کرتے تھے، اسی طرح ایام تعلیم میں اسفار سے مکمل گریز کیا کرتے تھے، لیکن جس پروگرام یا سیمینار میں آپ تشریف فرما ہوتے وہ اس کانفرنس کی قسمت اور اس کے معیار کی ضمانت ہوا کرتی تھی، جس پروگرام میں آپ ہوتے اس کے میر محفل ہوا کرتے تھے، اور سب سے اہم اور فیصلہ کن خطاب آپ کا ہوا کرتا تھا، دارالعلوم کے ہر اجلاس میں آپ کا خطاب ہوتا تھا، انعامی جلسہ میں آپ کے خطاب کی حلاوت اور ایک ہی مضمون کو ہر سال ایک نئے پیرہن میں بیان کرنے کی دل آویز ادا کبھی نہیں بھول سکتا ہوں، آپ کا انداز تقلیدی نہیں اجتہادی تھا، آپ کا لب ولہجہ منفرد تھا، آپ علمی باتوں کو جس سہل پیرائے میں بیان کیا کرتے تھے وہ آپ کا حصہ تھا بقول ڈاکٹر کلیم عاجزؒ ؎

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

مفتی صاحبؒ کو تقریر کے علاوہ تحریر میں بھی بے پناہ ملکہ حاصل تھا، آپ کی کتابیں نئے اسلوب کے ساتھ تسہیل وترتیب کا حیرت انگیز شاہ کار ہیں، ماضی قریب میں حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندویؒ کو اللہ تعالی نے تسہیل کے فن سے نوازا تھا آپ نے مشکل کتابوں کو تسہیل کے پیرہن میں ڈال کر امت پر بڑا احسان کیا ہے، حضرت قاری صاحبؒ کے بعد اس میدان کی دوسری شخصیت میری نظر میں مفتی صاحبؒ کی ہے، آپ نے مختلف فنون کی مشکل کتابوں کی شرح اور تسہیل وترتیب کا کام کیا ہے، اور مشکل کتابیں آپ کی تشریح وتوضیح سے آسان ہوگئی ہیں، درس نظامی کی کتابوں میں کافیہ مشکل ترین کتاب مانی جاتی ہے آپ نے ہادیہ لکھ کر اس کے ثقل کو ختم کردیا، فن منطق میں تہذیب دقیق ترین کتاب سمجھی جاتی ہے آپ نے مفتاح التہذیب لکھ کر اس کے بوجھ کو کم

کردیا۔اسی طرح شرح مأۃ عامل کی شرح مفتاح العوامل، فلسفہ میں معین الفلسفہ، طحاوی کتاب الطہارت کا خلاصہ زبدۃ الطحاوی لکھ کر موجودہ وقت میں طالبین علوم نبوت کے لیے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ جو اسرار شریعت پر مایہ ناز تالیف ہے، آپ نے رحمۃ اللہ الواسعۃ لکھ کر شاہ صاحب کے علوم وافکار سے استفادہ کو آسان بنادیا۔آپ نے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے علوم وافکار جس کا سمجھنا اور پڑھنا اس دور میں مشکل کام ہوگیا ہے اس کی تشریح وتوضیح کا بڑا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

تقریری وتحریری خوبیوں کے علاوہ مفتی صاحبؒ کا اصل امتیاز آپ کی تدریس ہے، آپ رجال ساز تھے ،آپ باکمال اور بے مثال مدرس تھے، تدریس کے باب میں آپ نے کسی کی تقلید نہیں کی تھی؛ بلکہ ایک نئے انداز کی آپ نے طرح ڈالی تھی ، اس لیے کہنا چاہیے کہ آپ امام تدریس تھے، مجدد تدریس تھے، آپ کا سبق بہت مقبول ہوا کرتا تھا، اور آپ نے درس کو ہر چیز پر ترجیح دی تھی ، درس وتدریس آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا، غیر حاضری کا آپ کے یہاں تصور نہیں تھا، اور نہ ہی دیر حاضری کا، آپ کے آنے سے پہلے تمام طلبہ کا درس میں حاضر ہونا ضروری تھا، آپ کے آنے کے بعد کسی کو درسگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں تھی اگر کسی نے ایسی غلطی کی تو اس کا خمیازہ تمام طلبہ کو جھیلنا ہوتا تھا، مفتی صاحب اس اصول کی خلاف ورزی پر سبق موقوف کر کے ناراض ہوکر گھر چلے جاتے تھے، تمام طلبہ کو مفتی صاحب کا یہ مزاج معلوم تھا۔

مجھے مفتی صاحب سے ترمذی شریف اور طحاوی شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ دس سالہ زمانہ تعلیم میں کون سی کتاب ہے جس میں ایک دن کی غیر حاضری نہیں ہے تو میرا جواب ہوگا کہ ترمذی شریف میں ایک بھی غیر حاضری نہیں ہوئی ، اسی زمانہ میں دارالعلوم وقف دیوبند میں محدث عصر حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے درس بخاری کا بڑا چرچا رہتا تھا، ان کا درس عالمانہ اور فاضلانہ ہوا کرتا تھا، ہفتم کے سال ختم بخاری کی ایک مجلس میں شریک ہوچکا تھا شاہ صاحبؒ کا خطیبانہ انداز اور محققانہ درس واقعی مسحور کن ہوا

کرتا تھا آپ ابن حجرؒ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے؛ بلکہ درس بخاری میں شاید سب سے زیادہ نقد ابن حجر پر ہی کیا کرتے تھے، دورہ حدیث کے سال تمنا ہوتی تھی کہ شاہ صاحب کے درس بخاری میں شریک ہوسکوں لیکن مفتی صاحب کے درس کی عظمت اس قدر دل میں پیوست تھی کہ ان کا سبق چھوڑ کر کہیں اور جانے کا سوال ہی نہیں تھا ،ہاں جمعہ میں مغرب کے بعد اگر مفتی صاحب تشریف نہیں لاتے تو کبھی کبھی شاہ صاحبؒ کے درس تک رسائی ہوجاتی تھی۔

مفتی صاحب کے درس ترمذی کا انداز بڑا نرالا تھا، حدیث کی تشریح پس منظر کے ساتھ اس طرح بیان کرتے تھے کہ تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بہت سی باتیں خود بخود حل ہوجاتی تھیں، آپ مذاہب ائمہ کے اختلاف میں اس پر ضرور روشنی ڈالتے تھے کہ یہ اختلاف نص فہمی کی بنا پر ہوا ہے یا دلائل میں اختلاف کی بنا پر اس سے بڑا اطمینان ہوتا تھا، مفتی صاحب کے سمجھانے اور بیان کرنے کا انداز نرالا تھا اور انداز میں اس قدر ٹھہراو تھا کہ ہمارے ساتھیوں میں نوے فیصد آپ کی تقریر کو بآسانی لکھ لیا کرتے تھے؛ بلکہ بعض صاحب ذوق تو مفتی صاحب کی تقریر کو عربی میں قلم بند کر لیتے تھے، اور مفتی صاحب کے یہاں دلائل کی بہت زیادہ فراوانی نہیں ہوتی تھی، لیکن حدیث کی ایسی فقہی تشریح کرتے تھے کہ احناف کا مسلک بہت مضبوط انداز میں نمایاں ہوجاتا تھا، بعض مرتبہ صرف احناف کے دلائل بیان کرتے تھے اور فرماتے شوافع کے دلائل انہی سے معلوم کرلو میں کیوں بیان کروں۔ مفتی صاحب کی زندگی میں علم وعمل کا بڑا توازن تھا، درس سے آپ کو غایت درجہ محبت تھی، سبق کا تسلسل اور وقت کی بڑی قدر و قیمت تھی اور ان سب پر مستزاد آپ کا خلوص، آپ کی پاکیزہ زندگی تھی جس نے آپ کے درس کو حد درجہ مقبول بنادیا تھا۔

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

آپ کی بعض باتیں آج بھی دل کی انگھوٹی میں نگینے کی طرح سجی ہوئی ہیں اور حسین یادوں کی طرح بسی ہوئی ہیں، آپ مطالعہ کے بہت عادی تھے، آپ نے مطالعہ کو اپنی زندگی کی غذا بنایا تھا لیکن صرف مطالعہ کی بنا پر سبق پڑھانے کے قائل نہیں تھے؛ بلکہ آپ کی رائے تھی کہ مطالعہ کے بعد حاصل مطالعہ کو ذہن کے خانوں میں ترتیب دینا ضروری ہے اس سے تفہیم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، آپ کا نظریہ تھا کہ کسی کتاب کو پڑھانے کے لیے شروحات کا مطالعہ کافی نہیں ہے؛ بلکہ کسی کتاب کا پڑھانے کے لیے اس فن کو پڑھنا ضروری ہے، جب آدمی فن کو پڑھ لیتا ہے تو اس کے لیے اس فن کی کسی کتاب کو پڑھانا آسان ہوجاتا ہے، آپ کا نظریہ یہ تھا کہ متون کو حفظ کرنے کا اہتمام کیا جائے اس سے فن میں درک پیدا ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسین کا ایک شعبہ تھا لیکن مفتی صاحب اس کے خلاف تھے ان کا نظریہ تھا کہ فن کی ابتدائی کتابیں وہ پڑھائے جس نے فن پڑھ رکھا ہو، فراغت کے بعد جو معین مدرس ہوجاتے ہیں وہ بچوں پر تجربہ کرتے ہیں ان کا مطالعہ فن کا نہیں ہوتا ہے وہ شروحات دیکھ کر پڑھاتے ہیں اس لیے طلبہ کو اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ نے گو بہت سی اردو شروحات لکھی ہیں؛ اس لیے کہ طلبہ میں عربی شروحات کو سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوتی جارہی ہے لیکن آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ سو سال بھی اردو شروحات پڑھتا رہے اس کو علم نہیں آئے گا۔ آپ کہتے تھے کہ طلبہ کے تین درجات ہیں اعلی صلاحیت، ادنی اور متوسط، اعلی صلاحیت کے طلبہ کو فراغت کے بعد فوراً تدریس میں لگ جانا چاہیے، تکمیلات میں رہ کر اپنی صلاحیت ضائع نہیں کرنی چاہیے، اور متوسط طلبہ کو تکمیلات میں رہ کر اپنی کمزوری کی اصلاح کرنی چاہیے اور کمزور طلبہ کو خدمت خلق کے میدان میں لگ جانا چاہیے اور اپنے دین کے تحفظ کے لیے ایک سال کے لیے جماعت میں چلے جانا چاہیے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ طلبہ دو طرح کے ہیں ایک جو اپنے لیے پڑھتے ہیں اور ایک ماں باپ کے لیے پڑھتے ہیں، ماں باپ کے لیے جو پڑھنے کے لیے مدارس میں آتے ہیں وہ پڑتے ہیں پڑھتے نہیں ہیں، یعنی صرف پڑے رہتے ہیں اس لیے طلبہ کو ماں باپ کے لیے نہیں اپنے لیے پڑھنا چاہیے۔

فراغت کے بعد بھی مفتی صاحب سے گاہے بہ گاہے ملاقات ہوتی تھی، آپ کی مجلس عام طور پر علمی مجلس ہوا کرتی تھی، آپ کبھی کبھی دارالعلوم حیدرآباد میں ختم بخاری کے لیے تشریف لاتے تھے، اسی طرح جمعیۃ علماء کے مباحث فقہیہ

میں بھی آپ تشریف لاتے تھے وہاں آپ کو دیکھ کر اور آپ کی باتیں سن کر بڑی خوشی ہوتی تھی، کبھی کبھی شوال میں بھی دیوبند میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا، مفتی صاحب اپنے قریبی شاگردوں کو ہدیہ وغیرہ بھی دیا کرتے تھے، بعض مرتبہ کوئی کتاب ہدیہ میں پیش کی جاتی تو اس پر انعام سے بھی نوازتے تھے، ایک مرتبہ میں اپنی کتاب ''امام ابوحنیفہ سوانح وافکار'' لے کر مفتی صاحب کی خدمت میں گیا، مفتی صاحب بہت دیر تک اس کے مختلف اوراق کو پڑھتے رہے اور اخیر میں فرمایا ''تمہاری اردو اچھی ہے'' یہ جملہ صرف حوصلہ افزائی کے لیے تھا، میں نے محسوس کیا ہے یہ میرے لیے بہت بڑا انعام ہے، شاید ہزار روپیے سے مجھے وہ خوشی نہ ملتی جتنی مفتی صاحبؒ کے اس ایک جملے سے ہوئی تھی، مفتی صاحب سے آخری ملاقات تین ماہ قبل ہوئی تھی، مفتی اشتیاق احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند سے ملاقات ہوگئی کہنے لگے کہ مفتی صاحب کے پاس جارہا ہوں تم بھی چلو تعزیت ہوجائے گی، اس وقت مفتی صاحب اپنے سمدھی کے انتقال کے بعد ممبئی سے تشریف لائے تھے اور اسی دن واپسی ہوئی تھی، اس دن کافی دیر تک آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا، بارش ہورہی تھی اس لیے مغرب کی نماز بھی آپ کے گھر میں پڑھی، دارالعلوم کے بعض اساتذہ بھی تشریف فرما تھے اس موقع پر مفتی صاحب نے فرمایا میں نے اپنا بھائی کھودیا۔ یہ آخری ملاقات تھی کسے معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ثابت ہوگی۔

آخری بات لکھ کر مضمون ختم کرتا ہوں، مفتی صاحب کی زندگی کی اہم بات یہ ہے کہ آپ نے فراغت کے بعد حفظ کیا تھا اس لیے کہ مفتی صاحب سمجھتے تھے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے قرآن کا حفظ ہونا ضروری ہے، اسی طرح آپ کی اہلیہ محترمہ نے شادی کے بعد حفظ کیا تھا، پھر امی جان نے اپنے تمام بیٹوں بیٹیوں کو اسی طرح تمام بہوؤں کو اور تمام پوتوں کو حافظ بنانے کا اہتمام کیا تھا، گویا کہ حفظ قرآن کے تعلق سے ''این خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق ہے۔ ؎

مقبول جو ہوں شاذ ہیں قابل تو بہت ہیں
آئینہ کے مانند ہیں کم دل تو بہت ہیں

جاوداں وہ سایۂ دامانِ رحمت میں رہیں

حضرت مولانا مصلح الدین قاسمی صاحب
استاذِ تفسیر و ادب دارالعلوم دیوبند

نصف صدی سے زائد عرصے تک ''دارالعلوم اشرفیہ راندیر، سورت صوبہ گجرات'' اور ''ازہر ہند دارالعلوم دیوبند'' کی مسندِ تدریس پر جلوہ افروز ہوکر تشنگانِ علومِ نبوت کو اپنے علمی بحرِ زخّار سے سیراب کرتے ہوئے بالآخر ۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بہ وقتِ چاشت ملت اسلامیہ کے سالارِ کاررواں، قافلۂ علماء کے حُدی خواں، محدثِ جلیل، استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری صدرالمدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اپنے ہزارہا ہزار شاگردوں، متعلقین، محبّین اور منتسبین کو روتا بلکتا چھوڑ کر ممبئ کے ایک ہاسپٹل میں مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ إنّا للہ وإنا إلیہ راجعون، **اللّٰھم اغفرلہ وراحمہ وأسکنہ فی فسیح جناتک۔**

تیرے اعمال ابد تک نہ مریں گے ہرگز
رہنما ہے ترا نقشِ کفِ پا تیرے بعد

باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، دنیائے فانی کے ہر فرد؛ بلکہ ہر شخصیت کو خواہ کتنی ہی دلکش اور کردار وعمل کی بنیاد پر کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو بالآخر اُسے ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہے؛ کیوں کہ ہر ایک جانے ہی کے لیے آیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی جاتا ہے تو صرف چند لوگ آنسو بہاتے ہیں اور کوئی اس انداز سے جاتا ہے کہ پوری دنیا میں اس کے چاہنے والے اور اس سے انتساب پر فخر کرنے والے آنسو بہاتے اور غم میں

ڈوب جاتے ہیں، ایسے لوگ بہ ظاہر روپوش تو ضرور ہو جاتے ہیں؛ مگر ان کی روشنی باقی رہتی ہے، پوری کائنات اس روشنی سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اس کے اُجالے میں اپنی متاعِ گم شدہ کو ڈھونڈھتی ہے۔

بلاشبہ استاذِ گرامی مرتبت، محدّثِ جلیل، فقیہ بے نظیر حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالن پوری نوّر اللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی ایسی ہی تھی، آپ کی رحلت نے علمی حلقے میں جو خلا پیدا کیا ہے، اس کا پُر ہونا بہ ظاہر مشکل نظر آتا ہے، آپ بیک وقت ایک عظیم محدّث، ممتاز فقیہ، باکمال مصنف، بے مثال مربّی، بافیض استاذ، علومِ اسلامیہ کے شارح اور علماء کے مرجع تھے، فقہی سیمیناروں، علمی حلقوں، قابلِ ذکر علمی مجالس کے بادشاہ تھے، ملک و بیرونِ ملک کے صفِ اوّل کے علماء میں نہ صرف یہ کہ آپ کا شمار تھا؛ بلکہ اکابر علماء کی نگاہیں کسی بھی لاینحل مسئلے کے حل کے لیے آپ کو ڈھونڈھتی تھیں اور آپ بہت ہی آسان الفاظ اور سہل انداز سے چٹکیوں میں وہ مسائل حل کر دیا کرتے تھے، قدرت نے آپ کو علمی بصیرت، فراستِ ایمانی اور ایسی علمی جلالتِ شان سے نوازا تھا کہ آپ سے ملنے؛ بلکہ آپ کو دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا اور آپ کے حلقہ ہائے درس میں شرکت کرنے والوں اور خوشہ چینوں کا تو کیا کہنا؟ وہ تو آپ کے گرویدہ اور آپ پر نچھاور ہونے کے لیے تیار رہتے تھے، کہنے کو تو طلبۂ دورۂ حدیث کے لیے آپ کا سبق ''حدیث شریف'' کا ہوتا تھا؛ مگر آپ کے حلقۂ درس سے اٹھنے کے بعد طلبہ یہ محسوس کرتے کہ وہ ایک سبق نہیں؛ بلکہ بہت سے فنون اور اسباق پڑھ کر اٹھ رہے ہیں، ہر سبق میں احادیثِ مبارکہ کی تشریح، موقع بہ موقع اسماء الرجال کی بحث، ائمۂ کرام کے اقوال، فقہی مسائل اور ترجیح الراجح کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نحو وصرف نیز موقعے کی مناسبت سے ایک طرح کے مضمون میں وارد احادیثِ مبارکہ میں پائے جانے والے مختلف الفاظ کے مابین فرق اور نکات پر بھی سیر حاصل بحث کرتے اور دیکھتے دیکھتے پورا گھنٹہ ختم ہو جاتا؛ بلکہ بسا اوقات حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں دو دو گھنٹے پڑھاتے رہتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی سبق شروع ہوا ہو۔ آہ

دید کی پیاسی نگاہیں تجھ کو پائیں گی کہاں

زیارت وملاقات

دارالعلوم الاسلامیہ بستی سے سالِ ششم (جلالین) کی تعلیم مکمل کر کے ۱۴۱۴ھ میں احقر ام المدارس دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا، حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کے علمی جلالتِ شان کی گونج تو سابق مدرسے ہی میں احقر کے کان میں پڑ چکی تھی، داخلے کی کارروائی کی تکمیل کے بعد پہلی بار زیارت کا شرف اس وقت ہوا جب آپ ترمذی شریف کا درس دینے کے لیے دارالحدیث تحتانی میں تشریف لائے، دوسرے سال ۱۴۱۴ھ و ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۹۹۴-۱۹۹۵ء میں باضابطہ شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ آپ معتدل رفتار سے پیادہ پا تیسرے گھنٹے اور بعد نماز مغرب تشریف لاتے، آپ کے آنے سے پہلے ہی پوری دارالحدیث کھچا کھچ بھر جاتی، آپ کے آتے ہی سنّاٹا چھا جاتا، آتے ہی سلام اور لا الٰہ الا اللہ کے ورد کے بعد سبق شروع فرما دیتے اور پھر تسلسل کے ساتھ خاص انداز اور لب و لہجے میں پورے گھنٹے اور عشاء کی اذان کی سبق جاری رہتا، اکثر طلبہ آپ کا سبق نوٹ کرتے، احقر بھی پورے سال نوٹ کرتا رہا اور ایک ضخیم مجلد کاپی اس کی برکت سے تیار ہوگئی۔ دورۂ حدیث کے سال گاہ بہ گاہ رفقاء کے ہمراہ عصر کے بعد کی عمومی مجلس میں حاضر ہوتا؛ مگر قریب ہوکر چاہت کے باوجود اپنا تعارف کرانے کی ہمت نہ ہوئی، دورۂ حدیث شریف کے بعد تکمیلِ ادب اور تخصص فی الادب کے سالوں میں کچھ تعارف ہوا اور قریب جانے کی ہمت ہوئی؛ مگر کئی ملاقاتوں میں نام اور سکونت دریافت فرماتے رہے۔

شفقت جو ہمیشہ یاد رہے گی

ماہ شوال ۱۴۱۷ھ میں احقر نے دارالعلوم دیوبند معاونتِ تدریس کی درخواست پیش کی، دعا کے لیے حاضرِ خدمت ہوا، اپنا ارادہ ظاہر کیا اور دعا کی درخواست کی، دوسرے دن حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ نے برادر گرامی مرتبت جناب ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد صاحب زید مجدہٗ استاذ دارالعلوم دیوبند- جن کا زمانۂ طالب علمی سے آخر تک حضرت والا سے والہانہ تعلق رہا- کی زبانی پیغام بھیجا کہ وہ لڑکا جو تخصص فی الادب پڑھ رہا تھا اور کل شام آیا تھا

اُسے کہو کہ ''کل صبح مجھ سے ملے''۔

صبح کو حاضرِ خدمت ہوا، عزیز محترم ''مولوی احمد سعید سلّمہ'' (استاذ حدیث جامعۃ الشیخ حسین احمد المدنی دیوبند) ناشتہ لے کر آئے، ساتھ میں ناشتہ کیا، پھر فرمایا: ''میں سفر پر جا رہا ہوں ایک ہفتے بعد واپسی ہوگی، یہ میرا بچہ ہے (بھائی احمد کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) میں اِسے قصص النّبیین اور کچھ کتابیں خود پڑھاتا ہوں، آپ انھیں میرے سفر سے واپسی تک پڑھائیں''، حکمِ عالی کے مطابق میں سفر کی واپسی تک سعادت سمجھ کر پڑھاتا رہا، اِس طرح حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ سے تعلق بہت پختہ ہوگیا، اس واقعے کے بعد سے جب بھی خدمت میں حاضری ہوتی تو خیریت اور مصروفیت ضرور دریافت فرماتے۔

دارالعلوم دیوبند میں معاونتِ تدریس کی مدّت کی تکمیل کے بعد احقر کی تقرری ''جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد'' میں ہوگئی جہاں دس سال تک خدمتِ تدریس انجام دیتا رہا، اس دوران ایک مرتبہ حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ جامعہ قاسمیہ شاہی تشریف لائے، خدمت کے لیے احقر مہمان خانے میں حاضر ہوا، سر پر تیل کی مالش کر رہا تھا، فرمایا: ''ہاں بھائی! اور کیا حال ہے؟'' پھر زیرِ درس کتابوں کے متعلق دریافت کیا، بعد ازاں فرمایا: ''ندائے شاہی میں تمہارا مضمون پڑھتا رہتا ہوں، ٹھیک لکھتے ہو!''

دارالعلوم میں تقرر کے بعد شروع کے سالوں میں عموماً جمعہ کو صبح دس بجے ملاقات کے لیے حاضر ہوتا، ہوا یہ کہ ایک جمعہ کو صبح فون کیا، بات نہ ہو سکی، پھر دس بجے فون کیا اور کہا کہ حضرت! صبح بھی فون کیا تھا، حاضرِ خدمت ہونا چاہ رہا تھا، فرمایا: ''جمعہ کو فجر کی نماز کے بعد سوتا ہوں، سنو! جمعہ کو مولوی کی صبح نو بجے ہوتی ہے، آنا ہو تو نو بجے کے بعد فون کر کے آیا کرو''۔ ایک مرتبہ دورانِ ملاقات معلوم کیا کہ مکان کہاں ملا ہے؟ میں نے بتلایا کہ حضرت! اُس دارالمدرسین میں جو شیخ الاسلام منزل کے پاس ہے جہاں حضرت مولانا عبد الخالق صاحب سنبھلی زید مجدہم رہتے ہیں، تو فرمایا: ''وہ جگہ اچھی ہے، مگر یاد رکھو وہ مکان اپنا نہیں پرایا ہے، اپنے مکان کی فکر کرو'' کس قدر اپنائیت اور

شفقت کے ساتھ آپ پیش آتے تھے۔ آہ! اب ایسی عنایتیں اور شفقتیں کہاں ملیں گی؟

ڈوب سا جاتا ہے دل رہ رہ کے ان کی یاد میں
کوئی کیا سمجھے کہ وجہِ بے خودی ہوتی ہے کیا

پیکرِ علم و عمل

طالب علمی اور مدرسی کے زمانے میں بہت سے اکابر علمائے دیوبند کو پڑھنے اور اپنے اساتذۂ عظام کی زبانی سننے کا موقع ملا جو یقینا مجموعۂ کمالاتِ ظاہریہ و باطنیہ تھے، جنھوں نے اپنے اپنے دور میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، اللہ رب العزّت ان کی خدماتِ جلیلہ قبول فرمائے۔ مگر احقر کی آنکھوں نے جن اساتذۂ کرام اور مشائخ عظام کو دیکھا ان میں حضرت الاستاذ حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کو بھی علم و عمل کے اعتبار سے اکابر دارالعلوم کا پرتو اور عکس جمیل پایا، آپ علم و عمل، تصنیف و تالیف اور تحقیق و تشریح کے رسیا تھے، آپ کا بیشتر وقت، تدریس و تصنیف اور مطالعہ و تحقیق ہی میں گذرتا تھا، یہی آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، جب بھی آپ کسی موقعے پر خطاب فرماتے، ہمیشہ طلبہ کو جدوجہد، محنت اور تضییعِ اوقات سے بچنے کی تاکید فرماتے، عصر بعد کی عمومی مجلس میں بارہا یہ دیکھنے کو ملا کہ حضرت والا کسی کتاب کی تصحیح اور پروف ریڈنگ میں مصروف ہیں، درمیان میں کسی نے کوئی سوال کیا، آپ نے قلم روک کر جواب دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئے، اکثر ملاقاتوں میں ہم جیسے شاگردوں کو محنت کرتے رہنے کی یہ کہتے ہوئے تاکید فرماتے ''ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دارالعلوم پہنچ گئے تو محنت کا سلسلہ ختم کردیا'' سچ ہے:

سمجھا کے پستیاں مرے اوجِ کمال کی
اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

عزم واستقلال

علمی وعملی میدان میں آپ کا عزم واستقلال بھی مثالی رہا ہے، کوئی بھی اہم ترین اور ضخیم کتاب ہو اور آپ نے اس کی تحقیق وتشریح کا ارادہ کرلیا تو صفحات کی ضخامت اور کتاب کی طوالت آپ کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوئی، یہی وجہ ہے کہ ربّ کریم کے فضل وکرم سے آپ نے تن تنہا وہ علمی خدمات اور کارہائے نمایاں انجام دیے جن کے لیے اکیڈمیاں درکار ہیں؛ چناں چہ ''رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ، تحفۃ الالمعی شرحِ سنن ترمذی، تحفۃ القاری شرحِ بخاری، فیض المنعم شرحِ مقدمہ مسلم، تحفۃ الدرر شرحِ نخبۃ الفکر، مبادئ الفلسفہ'' جیسی چالیس سے زیادہ معرکۃ الآرا، اپنے نوکِ قلم سے لکھی ہوئی تصنیفات آپ کے عزم واستقلال اور وقت کی قدر وقیمت پر شاہدِ عل ہیں، جن سے امت رہتی دنیا تک فیضیاب ہوتی رہے گی اور آپ کے درجات بلند ہوتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ!

صبر اور تسلیم ورضا

یوں تو کئی سالوں سے حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ مختلف اعذار وامراض سے دوچار تھے؛ مگر کبھی بھی بیماری کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا، ہمیشہ آپ کا انداز بس یہی نظر آیا۔ ع

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

حتیٰ کہ بعض بیماریوں میں آپ کا آپریشن بھی ہو؛ اگر بحالی صحت سے پہلے ہی آپ اپنے تدریسی وتصنیفی عمل میں منہمک ہوجاتے، ایسا عزم وحوصلہ، صبر ورضا اور اشتغال وانہماک کم از کم احقر نے حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کے علاوہ کسی اور میں نہیں دیکھا۔

زبان بندش کی یہی بیماری جس کے علاج کے لیے آپ ''لاک ڈاؤن'' سے پہلے ممبئی تشریف لے گئے تھے ایک سال پہلے بھی آپ کو لاحق ہوئی تھی، عصر کی نماز کے بعد عیادت کے لیے حاضرِ خدمت ہوا، طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ متعدد اساتذۂ دارالعلوم بھی عیادت کے لیے گئے ہوئے تھے، آپ بولنے کی کوشش کرتے؛ مگر زبان بند ہوجاتی اور آپ مسکرانے لگتے، پھر کچھ آواز کھلتی اور بولنا شروع کردیتے، متعدد مرتبہ ایسا ہی ہوا، جب بھی

زبان بند ہوتی آپ مسکراتے اور ذرا راحت ملتی تو ''لاالٰہ الا اللہ'' کے ورد کے ساتھ گفتگو شروع فرمادیتے، یہ صورتِ حال دیکھ کر احقر حیرت زدہ رہ گیا کہ ایسا عارضہ اگر کسی اور کو لاحق ہوتا تو وہ بے چارہ گھبرا جاتا؛ مگر آپ پورے صبر وضبط کے ساتھ بیٹھے رہے۔''مصائب میں الجھ کر مسکرانا اُن کی فطرت تھی''۔

ایسے ہی ایک مرتبہ آپ کی آنکھ کا آپریشن ہوا، خبر ملی کی حضرت تشریف لا چکے ہیں، عیادت کے لیے حاضرِ خدمت ہوا خیال تھا کہ ابھی آپ آرام کررہے ہوں گے؛ مگر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کسی کتاب کی تصحیح میں مصروف ہیں، عرض کیا کہ: حضرت! آپ نے ابھی سے کام شروع کردیا، فرمایا: ابھی سے، میں نے تو آنے کے بعد ہی کام شروع کردیا ہے، پھر فرمایا:''بیماری تو اصل میں وہ ہے جو عمل میں حارج اور رکاوٹ ہو!''

عزم واستقلال اور صبر وضبط کے بہت سے واقعات آپ کی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں جن کو ذکر کرنے اور دہرانے کا یہ موقع نہیں ہے؛ مگر آنکھوں دیکھے یہ چند واقعات ومشاہدات ہم جیسے شاگردوں اور وفا کیشوں کو یہ سبق ضرور دیتے ہیں کہ کامیابی محنت اور جدوجہد ہی میں ہے۔

ہزاروں رحمتیں ہوں اے امیر کارواں تجھ پر
فنا کے بعد بھی باقی ہے شانِ رہبری تیری

رب کریم بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کی خدمات کو قبول فرما کر بہترین صلہ عطا فرمائے، آمین!۔ ؎

خدا کی رحمتیں تیری لحد پہ سایہ فرمائیں
ہمیشہ تیری تُربت پر فرشتے پھول برسائیں

❀…❀…❀

وہ اک سفینہ جو ترجماں تھا بہت سی غرقاب کشتیوں کا

حضرت مولانا محمد اجمل قاسمی
استاذ تفسیر وادب جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، مراد آباد

استاذ کوئی بھی ہو، تعلیم کے کسی بھی مرحلے میں اس نے پڑھایا ہو، وہ آدمی کا محسن اور کرم فرما ہے؛ مگر محسنین کی اس فہرست میں کچھ ایسی ہستیاں بھی ہوتی ہیں جن کی طرف انتساب آدمی کے لیے وجہِ افتخار اور باعث امتیاز بنتا ہے، میرے اور مجھ جیسے ہزاروں فیض یافتگان دارالعلوم دیوبند کے لیے جو ہستیاں وجہ افتخار ہیں، ان میں ایک نمایاں اور جلی نام حضرت الاستاذ حضرت مولانا ومفتی سعید احمد صاحب صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کا ہے (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ) اردو شاعر فراقؔ گورکھپوری نے کبھی اپنے معاصرین سے کہا تھا:

نے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو!
جب یہ دھیان آئے گا ان کو، تم نے فراقؔ کو دیکھا ہے

پتہ نہیں یہ فراقؔ کی بڑھی ہوئی خوش فہمی تھی یا اس میں حقیقت کا عنصر بھی کسی قدر شامل تھا؟ مگر حضرت مفتی صاحب کے نیاز مندوں کے بارے میں یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آنے والی نسلیں ان پر ضرور رشک کریں گی کہ انھوں نے مفتی سعید احمد صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔

ہزار ہا ہزار شاگردوں، عقیدت مندوں، وفا کیشوں اور نیاز مندوں کے دلوں میں حضرت مفتی صاحب کے لیے عقیدت ومحبت اور عظمت واحترام کے غیر معمولی جذبات تھے، آپ کی اچانک اور غیر متوقع رحلت نے ان جذبات میں ایک زبردست تلاطم برپا کردیا ہے، آپ کی عقیدت ومحبت میں نوک قلم سے ٹپکنے والے الفاظ اور

تحریریں سوشل میڈیا پر امڈتے سیلاب کا سماں پیش کررہی ہیں، منظوم ومنثور خراجہائے عقیدت کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہاہے۔

وادی ایمنِ ہند مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کو اللہ سدا شادو آباد رکھے عنادل خوش نوا اس کی شاخِ نشیمن کو اپنی نغمہ سرائیوں سے معمور کرتے رہے ہیں اور ان شاء اللہ العزیز صبح قیامت تک معمور کرتے رہیں گے؛ مگر جن بلبلان خوش الحان نے ہمارے کانوں میں رس گھولے ہیں یکے بعد دیگرے ان کے کوچ کرتے رہنے سے یہ فضا ہمیں سونی سونی سی نظر آنے لگی ہے، پندرہ سال کے عرصہ میں کتنے اکابر رخصت ہوگئے جو اپنی طویل خدمات کی وجہ سے اس ادارے میں اپنا ایک مقام اور وقار رکھتے تھے، لیجیے اب اس گلشن سے وہ گلِ سرسبد بھی رخصت ہوا جس کی بہارِ حسن اپنے رنگ کی رعنائی اور معطر شمیم سے دل وجان کو تازہ اور قلب ونظر کو مست کیے رکھتی تھی۔

جن خوش نصیبوں نے آپ کی مجلس درس کا رنگ دیکھا انہیں دکھانا کیا، جنھوں نے نہیں دیکھا واقعہ یہ ہے کہ انہیں دکھانا مشکل ہے، قلم کو یارائے بیان کہاں جو منظر کی صحیح تصویر اتار سکے، انگلیاں کیبورڈ پر حرکت میں ہیں اور حضرت الاستاذ کا دل آویز سراپا اور آپ کی مجلس درس کا دلکش منظر دماغ کی اسکرین پر متحرک ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں احاطہ مولسری میں نگاہوں کو فرش راہ کیے کھڑا ہوں، اور حضرت الاستاذ بعد نماز مغرب صدر گیٹ سے داخل ہورہے ہیں، وجیہ شخصیت، دراز قد وقامت، باوقار سراپا، متین چال، صاف ستھرا لباس، احاطہ مولسری میں پہنچ کر کنویں والے ہینڈ پائپ پر پان تھوک کر منہ صاف کررہے ہیں، پھر دارالحدیث کی طرف محو خرام ہورہے ہیں، وہی تاریخی سرخ رنگ والی دارالحدیث جو دارالعلوم دیوبند کا حسن اور اس کی پہچان ہے، جہاں پہنچ کر مجھ جیسے ہزاروں دل ادب واحترام میں جھکے اور فرط عقیدت سے کھنچے جاتے ہیں۔

دارالحدیث کی شمالی سمت سے جوں ہی آپ اندر داخل ہوتے، طلبہ کے کچھا کچھ بھرے مجمع پر سناٹا چھا جاتا، ہر کوئی سنبھل کر باادب بیٹھ جاتا، درس کو قلم بند کرنے والے سیکڑوں طلبہ اپنے کاغذ قلم ٹھیک کرنے لگتے، پہلی تپائی پر

بیٹھنے والے اپنے بال اورٹوپی بھی اہتمام سے درست کرنے لگ جاتے؛ اس لیے کہ کسی طالب علم کا الول جلول ہیئت میں قریب بیٹھنا حضرت کے لیے باعث تکدر تھا، مسند کے پاس پہنچ کر حضرت سروقد کھڑے ہوجاتے، مجمع پر نظر ڈالتے ہوئے خاص ادا سے سلام کرتے، سال میں دو چار دفعہ ایسا ہوتا کہ مجمع کو ناموافق پاکر غصہ میں تنبیہاً یہیں سے الٹے قدم یہ کہتے ہوئے واپس چلے جاتے کہ تمہیں اگر پڑھنے کا شوق نہیں رہا تو ہمارا بھی پڑھانے کا شوق پورا ہوچکا ہے جس کا آئندہ طلبہ کے اہتمام درس پر اچھا اثر مرتب ہوتا، ورنہ عام معمول تھا کہ سلام کے بعد خاص لب و لہجے میں ''لا الہ الا اللہ'' کہتے ہوئے مسند حدیث پر فروکش ہوجاتے، آپ کی زبان اس مبارک ورد کی عادی تھی، دوران درس جب بھی پہلو بدلتے، یا کسی مضمون کو مکمل کرتے، یا کوئی نئی بات شروع کرنے کا ارادہ کرتے تو بے اختیار یہ کلمہ آپ کی زبان پر جاری ہوجاتا۔

''وہ آئے کب کے، گئے بھی کب کے، نظر میں اب بھی سما رہے ہیں''

آپ کی چال ڈھال، نشست و برخاست اور رفتار و گفتار میں عالمانہ وقار اور خاص قرینہ نظر آتا تھا، آپ مسند پر جب فروکش ہوتے تو سامنے کتاب کی طرف کسی قدر جھک کر بیٹھتے، مائک والے کو ہدایت ہوتی کہ آواز بس اتنی رکھے جو دارالحدیث میں صاف سنائی دے، اس بارے میں اسے رہ رہ کر تنبیہ ہوتی رہتی، اس گھنٹے کی چوکسی اسے پورے دن کی ڈیوٹی پر بھاری تھی، دوران گفتگو سامنے مخاطب ہوتے، کسی قدر دائیں بائیں بھی متوجہ ہوتے، مگر پوری طرح چہرہ نہ اِدھر پھیرتے نہ اُدھر، بات کہتے ہوئے ہاتھوں کے اشارے سے بھی مدد لیتے؛ مگر نہ اٹھا پٹخ کرتے نہ زیروزبر ہوتے، بس سینے تک ہی ہاتھ اٹھایا کرتے تھے، تدریس و تقریر دونوں کا انداز یکساں تھا۔

دوران درس طلبہ یا تو گوش برآواز ہوکر بدیدہ و دل آپ کی طرف متوجہ ہوتے، یا نظر نیچی کیے آپ کی تقریر قلمبند کرنے میں جٹے ہوتے، ہر طرف سکوت و سکون کی ایسی حکمرانی ہوتی کہ صریر خامہ صاف سنائی دیتی، اوراق الٹنے کی آواز محسوس کی جاتی، دارالعلوم کی مسند حدیث کو یقینا بہت سے ایسے اکابر نے زینت بخشی ہے جو علم و تحقیق

اور صلاح وتقوی کے میدان میں حضرت مفتی صاحب سے بہت فائق ہوئے ہیں؛ مگر جس اہتمام اور شوق سے طلبہ کی جتنی بڑی تعداد نے حضرت کے درسی افادات قلم بند کیے کسی اور کے نہ کیے گئے۔

آپ کے یہاں ہر چیز کا ایک معیار تھا جس پر مضبوطی سے قائم رہتے، ہر کسی کو آپ کے یہاں عبارت خوانی کا شوق پورا کرنا ممکن نہ تھا، اس کے لیے سال کے شروع میں ایک جائزہ ہوتا، شوقین طلبہ درخواست دیتے، حضرت خود ان کا امتحان لیتے جس کو پاس کرتے اسی کو بس عبارت خوانی کی اجازت ہوتی، جب تک یہ مرحلہ طے نہ ہوجاتا عبارت بھی خود پڑھتے، شروع ہی میں یہ تاکید ہوتی کہ میرے دارالحدیث میں داخل ہونے کے بعد کوئی داخل نہ ہو، اس کا نتیجہ تھا کہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے سبھی طلبہ موجود ہوتے، اتفاقیہ کوئی پچھڑ جاتا تو مفتی صاحب کی نظروں سے بچ بچاکر کسی گوشہ میں بیٹھتا یا پھر اوپر کی گیلری میں چلا جاتا، شخصیت کی مقناطیسیت تھی، حسن تدریس کا جادو تھا یا کوئی کرامت تھی کہ طلبہ پروانہ وار آپ پر نثار تھے، اور آپ کے آداب درس کو سعادت سمجھ کر بجالاتے، صدائے احتجاج بلند کرنا تو کجا، شکوہ سنج بھی کم ہی دیکھے گئے ہوں گے۔

آپ درس دے رہے ہوں، تقریر کر رہے ہوں یا عام مجالس میں گفتگو کر رہے ہوں انداز یکساں ہوتا، موقع عجلت کا ہو یا اطمینان کا گفتگو میں ہمیشہ اطمینان اور ٹھہراؤ ہوتا، بولنے کا ان کا اپنا لب ولہجہ تھا آواز بھی کسی قدر پست تھی؛ مگر اسی لب ولہجے میں جب بولتے تھے تو علم کے موتی رولتے تھے، محبوبیت ایسی تھی سب کچھ بھاتا اور بھلا لگتا تھا۔

تدریس میں ان کا اپنا خاص نہج اور منفرد انداز تھا جو علامہ ابن رشد مالکی کی معرکۃ الآراء تصنیف "**بدایۃ المجتهد و نهایۃ المقتصد**" اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مسوی شرح موطا کے نہج سے ملتا جلتا اور اس کے قریب تر تھا، عام طور پر ہمارے مدارس میں ائمہ کے مذاہب پر طویل بحث ہوتی ہے، دلائل کے درمیان موازنہ ومحاکمہ کیا جاتا ہے، اور مذہب حنفی کی وجہ ترجیح بیان کی جاتی ہے، اس طریقے کی بنیاد حضرت گنگوہیؒ ونانوتویؒ سے

ہوئی، شیخ الہند تک بات اختصار اور اشاروں تک محدود تھی، علامہ انور شاہ کشمیریؒ آئے تو انھوں نے اپنے وسیع مطالعہ، بے پناہ علم، اور بے مثال قوت حافظہ سے اس نہج کو زبردست ترقی دی، اور ان کے شاگردوں نے اس کو عام کیا اور پھیلایا، یہ نہج وقت کی ضرورت کے تحت سمجھ بوجھ کر اختیار کیا گیا تھا، ہندوستان میں غیر مقلدین نے یہ پروپیگنڈہ زور وشور سے کرنا شروع کر دیا تھا کہ فقہ حنفی احادیث صحیحہ کے بجائے قیاس اور ضعیف احادیث پر قائم ہے، اس بے حقیقت پروپیگنڈے کا صحیح جواب یہی تھا کہ تدریس وتحریر کے ذریعہ یہ بات اہل علم پر واشگاف کی جائے کہ فقہ حنفی بھی دیگر مذاہب متبوعہ کی طرح کتاب اللہ اور سنت صحیحہ پر قائم ہے؛ چنانچہ اس نہج پر درس وتدریس کے فوائد بھی سامنے آئے (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نفحۃ العنبر اور نقش دوام)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا موقف تھا کہ جب چاروں مذاہب برحق ہیں تو دلائل میں موازنہ ومحاکمہ اور ترجیح کے قصوں کے دراز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ ائمہ کے مذاہب اور ان کے مستدلات کو پیش کرتے، ساتھ ہی یہ بھی واضح کرتے کہ یہ اختلاف نص فہمی کا ہے یا تعارض نصوص سے پیدا ہوا ہے، یہ بھی واضح کرتے کہ مسئلے کی اصل کتاب اللہ ہے یا سنت رسول اللہ، مثلاً ترمذی شریف میں جب ''مس المرأۃ'' کا مشہور مسئلہ زیر بحث آیا تو آپ نے فرمایا: یہ مسئلہ دراصل حدیث کا نہیں بلکہ قرآن کا ہے، پھر آپ نے ''او لامستم النساء الخ'' آیت کریمہ تلاوت فرمائی، اور یہ بھی بتایا کہ اس مسئلے میں اختلاف نص فہمی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، جن لوگوں نے ''لامس'' کو اس کے حقیقی معنی میں رکھا انھوں نے ''مس'' کو ناقض وضو قرار دیا، اور جن لوگوں نے ''ملامسة'' کو جماع سے کنایہ سمجھا انھوں اس کو جنابت سے متعلق قرار دیا اور ''مس'' کو ناقض وضو نہیں سمجھا۔

نصوص سے فقہاء کے طرز استدلال کو حدیث کے درس میں زیرِ بحث لانے کا فائدہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کرتے کہ جو مسائل فقہاء نے طے کر دئے ان میں تو اب اجتہاد کی ضرورت نہیں، لیکن جو نئے مسائل پیش آتے رہتے ہیں ان میں اجتہاد کی ضرورت قیامت تک باقی رہے گی، جب آپ گذرے ہوئے مسائل میں فقہاء

کے طرز استدلال سے واقف ہوں گے تو آئندہ اس میں پختگی پیدا کر کے آپ بھی اپنے دور کے مسائل اسی نہج پر حل کر سکیں گے، اور اگر واقفیت ہی نہیں ہوگی تو آپ فقہی بصیرت سے محروم رہیں گے اور نت نئے مسائل کا حل پیش کرنے سے عاجز ہوں گے۔

درس حدیث میں اسناد اور روایت کے مقابل میں درایت کے پہلو پر زیادہ توجہ فرماتے تھے، مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے بھی رکھتے تھے، اور اس کو بہت اہمیت اور قوت کے ساتھ پیش کرتے تھے، بہت سے علمی مسائل میں آپ کی اپنی آراء اور تفرادات ہیں جو آپ کے درسی تقریر کے مجموعوں میں دیکھے جا سکتے ہیں، آپ کی بعض آراء اور تفردات آپ کی حیات ہی میں بحث کا موضوع بنے، سوال وجواب اور بحث ومباحثے کا ایک طویل سلسلہ رہا۔ ناچیز کے دل میں آپ کی عظمت ومحبت کے جو نقوش دور طالب علمی میں قائم ہوئے الحمد للہ وہ اب تک مدھم نہیں پڑے، آپ کے دروس سے خاص شغف رہا ہے، سبق میں حاضری کا اہتمام اللہ کے فضل سے ہمیشہ رہا، دورے میں یہ اہتمام مزید بڑھ گیا، شاذ ونادر ہی کسی سبق میں ناغہ ہوا؛ مگر کچھ گھنٹے ایسے تھے جس میں الحمد للہ کوئی ناغہ نہیں ہوا، ان میں ایک گھنٹہ حضرت مفتی صاحب کا بھی تھا۔

آپ کا نمایاں امتیاز آپ کی عمدہ تفہیم اور مباحث کی تسہیل وتبسیط ہے، آپ گھول کر پلا دینے کے گُر سے واقف تھے، آپ کے سبق میں پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھتیں، اور سنگلاخ علمی مباحث پانی ہوجاتے، آپ کے اس انداز کو آپ کے سیکڑوں تلامذہ نے حسب ظرف واستعداد جذب کیا، اور کامیاب وباتوفیق مدرس بن گئے:

یہ بھی اعجاز ہے آپ کے نطق کا
بے زبانوں کو طرز کلام آگیا

آپ کی اسی خوبی وکمال کا نتیجہ تھا کہ ذہین وزیرک بھی آپ کی باتوں کو سمجھتے، اور غبی وکند ذہن بھی، سبھی کے لیے آپ کے درس میں دلچسپی کا سامان موجود تھا، طلبہ تو خیر طلبہ ہیں، مدرسہ اور مدرسے کی کتابوں سے نا آشنا کوئی

عام پڑھا لکھا آدمی بھی اگر آپ کے سبق میں شامل ہوجاتا تو وہ بھی مستفید ہوتا اور بے مزہ نہ رہتا، ایک مرتبہ گاؤں اور علاقے کے کچھ لوگ دارالعلوم کی زیارت کے لیے تشریف لائے، ان میں ایک دو کے علاوہ یا تو اسکول کے ماسٹر تھے یا تاجر، ان کی خواہش حدیث کے سبق میں شرکت ہوئی، میں ان کو مغرب کے بعد حضرت مفتی صاحب کے درس میں لے گیا، اتفاق سے اس دن ترمذی کے سبق میں اعتکاف کے مسائل زیرِ بحث تھے، ہمارے یہ زائرین دیندار لوگ تھے، ان میں سے بعض اعتکاف وغیرہ کا بھی اہتمام کرتے تھے، حضرت مفتی صاحب نے دیر تک اعتکاف و معتکف کے مختلف مسائل بیان کیے، معتکف کے لیے غسلِ نظافت وتبرید کا مسئلہ آج کل کے ماحول میں اہمیت اختیار کر چکا ہے، مفتی صاحب نے اس پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی، زائرین بہت محظوظ اور مستفید ہوئے، ایک صاحب تو کہنے لگے مولانا بہت اچھا پڑھاتے ہیں، اگر یہ کتاب اتنی آسان ہے تو ہم لوگ بھی پڑھ سکتے ہیں، غرض آپ کے سبق میں کس و ناکس کوئی بھی محروم نہیں رہتا تھا:

وللأرض من كأس الكرام نصيب

بعض احادیث فکری ونظری کے بجائے عملی ہوتی ہیں، ایسی احادیث کی تشریح میں اگر علمی وفنی موشگافیوں کے بجائے عمل اور تجربہ پیش کیا جائے تو مضمون زیادہ دلنشین ہوتا ہے اور ساتھ ہی عمل کا داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے، حضرت مفتی صاحب ایسی حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے بہت سی دفعہ یہی دوسرا طریقہ اختیار کرتے، دوران درس کسی مناسبت سے رقیہ (جھاڑ پھونک) کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو حضرت نے فرمایا: ’’کلمات میں اللہ نے اثر رکھا ہے، اللہ پر بھروسہ کرکے اگر ان کو پڑھ کر مریض کو دم کیا جائے تو فائدہ ہوتا ہے، تجربہ کرکے دیکھو! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے‘‘ پھر فرمایا: ’’بارہا ایسا ہوا کہ میرے والد کو دانت یا سر میں درد ہوا، میں نے احادیث میں وارد کلمات پڑھ کر دم کیا اور الحمدللہ تھوڑی ہی دیر میں افاقہ ہوگیا، ایک مرتبہ فون کیا، پتہ چلا والد صاحب کو سر میں تکلیف ہے، میں نے ان سے کہا ریسور سر پر رکھیے، میں نے ادھر سے ریسور میں دم کیا اور الحمدللہ افاقہ ہوگیا۔ اس طرح کے بعض اور واقعات

بھی ذہن میں ہیں مگر طوالت کا خوف دامن گیر ہے،اس طرح کی احادیث میں تجربہ پیش کرنے سے حدیث پر اعتماد بڑھتا تھا،اور عمل کا داعیہ بھی پیدا ہوتا تھا۔

آپ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ اگر آپ مسلسل دو گھنٹے پڑھاتے،تو آواز انداز رفتار شروع آخر اور درمیان میں یکساں ہوتی،عام طور سے دورہ حدیث میں سال کے شروع میں طویل تقریریں ہوتی ہیں،پھر وقت کی کمی کے باعث سرداً وروایۃً کتاب پوری کرادی جاتی ہے؛مگر حضرت اس معاملے میں بھی طاق تھے جو انداز اور رفتار شروع میں ہوتی وہی آخری سبق تک بحال رہتی،ہر ہر حدیث پر حسب ضرورت کلام فرماتے۔

آپ کو اردو بالخصوص مغربی یوپی میں بولے جانے والے محاورات اور کہاوتوں پر دسترس تھی،احادیث کے ترجمہ میں کبھی اردو کا کوئی مناسب محاورہ نقل کرتے تو طبیعت محظوظ ہوتی،مانعین زکاۃ کے خلاف خلیفہ الرسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے جہاد کی تھی،جب کہ دیگر بہت سے صحابہ کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جہاد میں تامل تھا،جس کا اظہار انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا،اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو مومنانہ اور جوشیلے جملے ارشاد فرمائے ان میں ایک جملہ یہ بھی ہے ’’یا عمر! أجبار فی الجاہلیۃ وخوار فی الإسلام‘‘ استاذ محترم نے اس کا ترجمہ فرمایا:’’عمر! جاہلیت میں تو بڑے سورما تھے اسلام میں بھیگی بلی بن گئے؟؟‘‘ حضرت کے اس ترجمہ نے بہت محظوظ کیا،آپ کے درسی افادات میں اس کی مثالیں امید ہے جا بجا دیکھنے کو ملیں گی۔

حضرت عزم کے سچے اور دھن کے پکے تھے،جو ٹھان لیتے اس میں جٹ جاتے،اور کر گذرتے،آپ کی زندگی اور کارنامے اس کے شاہد اور گواہ ہیں،افتاء کرتے ہوئے حفظ قرآن کا شوق پیدا ہوگیا،تو افتاء کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ چند ماہ میں حفظ بھی کر ڈالا،معاشی حالات کچھ بہتر ہوئے تو بلا معاوضہ خدمت تدریس انجام دینے اور اب تک اس خدمت پر معاوضے میں جو کچھ لیا تھا اس کو واپس کرنے کا داعیہ پیدا ہوا،چنانچہ اللہ کے بھروسہ پر ٹھان لیا اور کر گذرے،حالاں کہ یہ عمل آسان ہرگز نہ تھا،اولوالعزمی کی یہ مثال اس دور میں مشکل سے ہی ملے گی،

ہم طلبہ کو بھی نصیحت کی تھی کہ تنخواہ لے کر کام کرو، اور یہ نیت رکھو کہ اللہ دوسرے ذرائع پیدا کردے گا تو تنخواہ نہیں لیں گے، اور اگر ممکن ہوسکا تو لی ہوئی تنخواہ بھی واپس کردیں گے؛ مگر یہ فرہادی حوصلہ اور یہ آہنی ارادہ ہرکس و ناکس میں کہاں، یقیناً یہ چیزیں مفتی صاحب کو بہت عظیم بناتی تھیں:

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

آپ مضبوط جی گردے اور طاقتور شخصیت کے مالک تھے، جھینپنا اور مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں تھے، اندرون دارالعلوم طلبہ واساتذہ کے مجمع کو خطاب کررہے ہوں یا باہر کسی سیمینار یا اہل علم کے مجمع سے مخاطب ہوں، لہجے میں وہی ٹھہراؤ اور اطمینان ہوتا اور گفتگو کا وہی رنگ وآہنگ ہوتا جس سے وہ جانے اور پہچانے جاتے تھے، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ مجمع سے متاثر ہوجائیں، اور انداز گفتگو میں فرق آجائے، جو موقف رکھتے مضبوطی سے پیش کرتے اور اس پر قائم رہتے۔

آپ مقبولیت اور محبوبیت کی جس بلندی پر تھے وہاں پہنچ کر خواہی نہ خواہی آدمی کے اسفار نیز پروگراموں اور جلسوں میں شرکت کا سلسلہ دراز ہوجاتا ہے، یہ آدمی کی مجبوری بھی ہوتی ہے اور لوگوں کی ضرورت بھی، بلکہ دیکھا جائے تو یہ ایک دینی ضرورت بھی ہے؛ مگر اس مرحلے میں پہنچ کر اعتدال پر قائم رہنا مشکل ہوجاتا ہے، عموماً ہوتا یہ ہے کہ بیرونی پروگراموں کی کثرت کی وجہ سے اسباق کا حرج اور طلبہ کا نقصان ہوتا ہے؛ مگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ اس سلسلے میں بالکل مختلف تھا، آپ کے نزدیک درس کو ہمیشہ اولیت اور اہمیت حاصل رہی، دوران تعلیم سفر سے مکمل پرہیز کرتے اور یکسو ہوکر پڑھنے لکھنے اور پڑھانے میں لگے رہتے، سفر کرنا ہوتا تو چھٹیوں کے ایام میں کرتے، عوامی جلسوں اور پروگراموں سے خود بھی پرہیز کرتے اور پڑھنے لکھنے کا ذوق رکھنے والے طلبہ کو بھی اسی کی تاکید کرتے، فرماتے کہ عوامی جلسوں کی نذر ہوکر آدمی علم کے مطلب کا نہیں رہتا، مفتی صاحب کا یہ معمول جہاں ان کے علم دوست ہونے کا ثبوت ہے وہیں طلبہ کے تئیں ان کی خیرخواہی اور امانت داری کی بھی دلیل ہے۔ اور

بلاشبہ ہم شاگردوں کے لیے ایک بہترین مشعل راہ بھی۔

آپ کی بڑی خوبی وقت کی حفاظت اور اس کی قدردانی تھی، آپ اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ وصول کرتے، ہر وقت علمی مشاغل میں لگے رہتے؛ آپ کے یہاں مجلس آرائی، لایعنی مشاغل، حد یہ ہے کہ جائز تفریحات کا بھی کوئی خانہ نہ تھا، عیادت وتعزیت کے علاوہ عام طور پر کسی کے یہاں آتے جاتے نہیں تھے، دو تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ناچیز چھتہ مسجد کے قریب واقع افریقی منزل (جس میں اساتذہ کی رہائش گاہیں ہیں) سے گذر رہا تھا، کہ حضرت پر نظر پڑی، دیکھا حضرت دارالعلوم کی طرف تیز گامی سے جارہے ہیں یا واپس ہورہے ہیں اور ہاتھ میں کوئی کتابچہ ہے جس کا مطالعہ بھی جاری ہے، میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ اس مصروف راستے میں تیز گامی سے چلنا اور پھر مطالعہ بھی کرتے رہنا کیوں کر ممکن ہوا، اور اگر ساتھ میں دیوبند کے رکشہ چلانے والوں کی ہٹو بچو اور طوفانی چال کو بھی ذہن میں رکھ لیا جائے تو استعجاب اور سوا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عصر بعد آپ کی مجلس میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو خیال تھا کہ حضرت طلبہ کو کچھ نصیحت فرماتے ہوں گے، مگر جب وہاں پہنچا تو قصہ بالکل مختلف تھا، ایک طالب سر میں تیل کی مالش کررہا تھا، اور حضرت کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف، حاضرین میں کسی نے کچھ پوچھا تو مطالعہ جاری رکھتے ہوئے جواب دے دیا اور پھر وہی خاموشی، وقت کی اس طرح قدردانی ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ ترقی کے اس بام عروج پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

آپ حصول علم کی راہ میں مشقت اٹھانے کے عادی اور سخت کوش واقع ہوئے تھے، اور اپنے شاگردوں کو بھی اسی طرح دیکھنا چاہتے تھے، فرماتے تھے کہ دینی پیشوائی اللہ کے وعدوں پر یقین اور دین کی راہ میں قربانی اور مشقتوں پر صبر کیے بغیر نہیں ملتی، اور اپنی بات کی تائید میں یہ آیت کریمہ پیش کرتے: ”وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ“ (السجدۃ: ۲۴) اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے کچھ لوگوں کو، جب انھوں نے صبر کیا، ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، اور وہ ہماری

آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

علمی مشاغل میں اس درجہ اشتغال کا ایک ناخوشگوار نتیجہ بسا وقت یہ سامنے آتا ہے کہ آدمی کی معاشرت کمزور پڑ جاتی ہے، لوگوں کے حقوق کا لحاظ نہیں ہو پاتا؛ مگر مفتی صاحب کا یہ پہلو بھی تشنہ نہیں تھا، اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر جس طرح انھوں نے توجہ دی اس کی تفصیل آپ کے برادر خورد استاذ محترم حضرت مفتی امین صاحب دامت برکاتہم کے قلم سے ممدوح محترم کی زندگی میں منظر عام پر آچکی ہے، ایک دو واقعہ اور پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو دوران درس حضرت سے سنے۔ فرمایا: ''میں اپنے گھر کی تعمیر کرا رہا تھا، کہ ایک پڑوسی نے مجھ سے کہا حضرت! میری طرف دیوار میں ایک طاق اگر نکلوادیں تو مہربانی ہوگی، وہ میرے چراغ رکھنے کے کام آئے گا، میں نے کہا کہ بہتر ہے، اور مستری کو کہہ کر پڑھانے چلا آیا، واپس آیا تو دیوار اونچی ہوگئی تھی، اور طاق نہیں نکلا تھا، میں نے مستری سے وجہ پوچھی، تو اس نے کہا مولانا صاحب آپ سمجھتے نہیں ہیں، اگر آپ اس طرف طاق نکلوادیں گے تو کل کو اُسے آدھی دیوار پر دعوے کا حق ہو جائے گا؛ لہٰذا طاق نکالنے میں آپ کا نقصان ہے، میں نے کہا بھائی تمہاری خیر خواہی کا شکریہ، مگر تم نکال دو، اور میں نے اپنے بچوں سے کہہ دیا کہ اگر یہ پڑوسی کبھی دیوار پر دعوی کردے تو آدھی دیوار اسے دے دینا۔

اسی طرح ایک مرتبہ دوران سبق وہ معروف حدیث کسی مناسبت سے زیرِ بحث آئی جس میں ہے ''إذا طبختَ مرقةً فأكْثِر مَائها، و تَعاهَد جِيرانک'' (کہ جب (گوشت کا) شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا لو، اور اپنے پڑوسیوں کا بھی خیال رکھو) '' آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ اچار بنانے کے لیے گھر میں بڑے برتن کی ضرورت ہوئی، پڑوسی کے گھر سے منگایا گیا، جب برتن واپس کرنے کی باری آئی تو میں نے کہا اس برتن میں اچار رکھ کر واپس کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اچار بنانے کا موسم آتا ہے تو وہ پڑوسی صاحب پوچھنے لگتے ہیں کہ برتن کب بھیجوں؟

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

آپ قناعت پسندی، سادگی، خودداری، وضع داری، عزت نفس، عالمانہ وقار، علم کے ساتھ عمل کی دولت سے نہ صرف مالا مال تھے؛ بلکہ ہم ایسوں کے لیے مثال بھی تھے، حرص وطمع اور تعلقات سازی کے فن سے نا آشنا تھے، ان باتوں پر بھی دو چار سطر لکھنے کا ارادہ تھا مگر خوف طوالت مانع ہے۔

حضرت سے سنہ ۲۴-۱۴۲۳ ہجری مطابق ۲۰۰۳ء میں دورہ حدیث کے سال جامع ترمذی اور امام طحاوی کی شرح معانی الآثار پڑھنے کی سعادت ملی، دورہ کے بعد مزید پانچ سال اور کل سات سال دارالعلوم میں رہنا ہوا، اس دوران حضرت کے بہت سے خطابات سننے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا جس پر ناچیز اللہ تعالی کا بے حد شکر گزار ہے، میرے تدریب فی الافتاء کے سال حضرت کو بخاری شریف کی جلد اول کی تدریس سونپی گئی؛ چنانچہ ناچیز جناب مفتی فخر الاسلام صاحب نائب مفتی دارالعلوم زید مجدہم کے ہمراہ آپ کے پہلے درس بخاری میں شریک ہوا، حضرت نے سبق شروع میں فرمایا: ''جس نے بخاری میں تین باتیں پڑھیں اس نے بخاری پڑھی ورنہ اس نے بخاری نہیں حدیث بخاری پڑھی''، (۱) فرمایا: امام بخاری خود مجتہد ہیں وہ اپنا موقف اور علمی آراء ابواب کے تراجم کی شکل میں پیش کرتے ہیں؛ چنانچہ کہا گیا ہے کہ ''**فقه البخاری فی تراجمه**'' لہٰذا بخاری پڑھنے میں پہلا کام تراجم میں پیش کردہ بخاری کی آراء اور مجتہدات کو سمجھنا ہے، (۲) امام بخاری ادنیٰ ادنیٰ مناسب سے تراجم کے تحت احادیث نقل کرتے ہیں، بخاری پڑھنے اور پڑھانے میں دوسرا اہم کام تراجم اور اس کے تحت نقل کی گئی احادیث میں مناسبت اور جوڑ کو سمجھنا ہے، یہ موضوع بخاری کے حوالے سے اہم اور ارباب فن کی جولان گاہ رہا ہے۔ (۳) تیسری بات جو حضرت نے فرمائی وہ ذہن میں نہیں رہی، شاید مفتی فخر الاسلام صاحب کو یاد ہو، یا آپ کے درسی افادات میں موجود ہو۔ فرمایا: اگر آپ نے ان تینوں باتوں کی رعایت کے ساتھ بخاری پڑھی تو بخاری پڑھی، ورنہ اس کی احادیث پڑھیں۔

اس مقالے میں حضرت کی شخصیت اوران کارناموں کا پیش کرنا مقصود نہیں ہے، ان باتوں کے لیے تو مبسوط مقالہ درکار ہے، سنا ہے کہ آپ کی حیات ہی میں اس پر کام شروع ہو چکا ہے، ان سطور میں تو بس اپنی تسکین خاطر کے لیے مفتی صاحب سے وابستہ اپنے مشاہدات وتاثرات کو پیش کرنا ہے، اب اگر اس حکایت میں دوسروں کو بھی اپنے مشاہدات وتاثرات کی جھلک مل جائے تو یہ میرے لیے خوشی اور سعادت کی بات ہوگی، کچھ اور باتیں بھی پیش کرنے کا ارادہ تھا؛ مگر مضمون کی طوالت دیکھتے ہوئے ترک کرنا پڑا، امید ہے کہ جو باتیں رہ گئیں ہیں وہ بھی دوسروں کے مضامین یا آپ کے سوانحی خاکے یا افادات میں آگئی ہوں گی یا آجائیں گی۔

ورق تمام ہوا اورمدح ابھی باقی ہے

اللہ تعالی حضرت الاستاذ کی حسنات وخدمات کو شرف قبولیت بخشے، زلات کو معاف فرمائیں، مقام قرب میں جگہ عطا فرمائے، اوردارالعلوم کو آپ کا نعم البدل عطا فرما کر آپ کے خلا کو پر فرمائے، **اللّٰھم لاتحرمنا اجرہ، ولا تفتنا بعدہ، واغفر لنا ولہ، واجمعنا معہ فی جنات النعیم یارب العالمین، آمین!**

❁…❁…❁

امیر المومنین فی الحدیث کی وفات

مولانا مفتی اسعد قاسم سنبھلی صاحب
جامعہ شاہ ولی اللہ، مرادآباد

رمضان کے آخری عشرے میں برصغیر کے جلیل القدر عالم، اہل سنت والجماعت کے امام اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ داغ مفارقت دے گئے ،سنت الٰہی کے مطابق ہر صدی میں کچھ عبقری شخصیات پیدا ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر سلف کی یاد آتی ہے اور معاصرین ان کے علم وفضل سے متاثر ہوکر خود بھی لکھنے پڑھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، حضرت مفتی صاحب اس عہد کی ایسی ہی عظیم شخصیت تھے جو متقدمین کی طرح بیک وقت تفسیر وحدیث ،فقہ وتاریخ اور بلاغت وکلام جیسے تمام موضوعات پر یکساں عبور رکھتے تھے ہمارے نزدیک شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ کے بعد گجرات میں اتنا بڑا محدث پیدا نہیں ہوا اور پورے عالم اسلام میں شاید دو چار علماء ہی ایسے موجود ہوں جنھوں نے بخاری ومسلم اور جامع ترمذی کی وقیع ومفصل شروح کے ساتھ قرآن کریم کی بھی مبسوط ومکمل تفسیر لکھی ہو، پھر ان کا ایک اور عظیم کارنامہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم ومعارف کی نقاب کشائی ہے، حضرت مفتی صاحب نے حجۃ اللہ البالغۃ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعۃ لکھ کر نہ صرف ایک جہاں کو حیرت میں ڈال دیا بلکہ اس علمی قرض کو بھی ادا کیا جسے چکانے کی حسرت لئے امام العصر حضرت کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب ،شمس العلماء حضرت مولانا منظور نعمانیؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دنیا سے چلے گئے۔

شخصیات عموماً کسی عظیم المرتبت کی پروردہ ہوتی ہیں اور تاریخ میں ایسے قدآور علماء کم پائے جاتے ہیں جنھوں

نے اپنی شخصیت کی تعمیر میں دوسروں سے زیادہ خود حصہ لیا ہو اور اپنی سعادت ونجابت، استقامت والوالعزمی اور توفیق الٰہی کی بدولت وہ بام عروج پر پہنچے ہوں حضرت مفتی صاحب عہد حاضر میں اس سلسلے کی ایک زندہ مثال تھے انھوں نے اسلاف واکابر کی زندگیاں پڑھ کر اپنے لئے ایسا لائحہ عمل بنایا جس پر کاربند ہوکر وہ ترقی کے مراحل طے کرتے گئے اور اس دور زوال میں بالآخر وہ عظیم مفسر جلیل القدر محدث، فقیہ دوراں معلم بے بدل، مرشد کامل، مربیٔ لاثانی اور دلوں میں گھر کرنے والا واعظ ومقرر پیدا ہوا جس نے اپنے عظیم کارناموں سے امت کو دور اقبال کی یاد دلادی مفتی صاحب کی شخصیت بڑی بھاری بھرکم تھی اگر وہ کہیں کا دورہ کرتے تو پورے خطے میں ہلچل مچ جاتی، اگر کسی ادارے میں بخاری ختم کراتے تو وہاں عید کا سماں ہوتا پھر کیا علماء کیا طلبہ سب ان کی مجلس پر پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے اور کاسی مسئلے میں اگر وہ کوئی رائے قائم کرتے تو انشراح کے بعد حضرت کی استقامت چٹان کی طرح ہوتی، پھر کسی سے مرعوب ہوتے نہ لومت لائم کی پرواہ کرتے اور ہم جیسے عقیدت مند ہی نہیں ان کے معاصرین بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔

ہم دور آخر کی پیداوار ہیں اور ہم نے پچھلی صدیوں کے علماء نہیں دیکھے لیکن اہل علم اگر مجھے اجازت دیں تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ میں نے علامہ عینیؒ، امام سفارینیؒ، ملاعلی قاریؒ، ابن الہمامؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ، محدث گنگوہیؒ اور مجدد تھانویؒ کو دیکھا ہے، ہاں ہاں بس زمانے کا فرق ہے حضرت مفتی صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات میں واقعتاً ان تمام شخصیات کا مشترک عکس جمیل نظر آتا ہے کل جب مورخ ان کے اوصاف وکمالات سے تاریخ کی کہکشاں سجائے گا اور اہل قلم ان کی عظمت وعبقریت پر مقالے لکھیں گے تو ہمیں بھی اس پر فخر ہوگا کہ ہم نے حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھا ہے، ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے ہیں اور بارہا ملاقات کر کے حضرت کی خوب خوب دعائیں لی ہیں، یہ وہ سعادت ہے جس کی لوگ آئندہ تمنا کریں گے اور اس وقت ہم اپنی قسمت پر پھولے نہ سمائیں گے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کی خبر سن کر آنکھ بار بار روئی لیکن آج کچھ لکھنے کیلئے بیٹھا تو قلم بھی زار و قطار رونے لگا۔ بھلا خود جس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا ہو وہ دوسروں کو صبر کی تلقین کیسے کرے ہم بہرحال دکھے دل اور نمناک آنکھوں سے مرحوم کے اہل خانہ عزیز واقارب اور تمام مخلصین وعقیدت مندوں کو تعزیت پیش کرتے ہوئے یہ صراحت ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب کی وفات کوئی خاندانی سانحہ نہیں بلکہ ایک دلدوز ملی حادثہ ہے جس نے تمام علماء کو تڑپا دیا اور مشرق و مغرب میں پھیلے حضرت کے عقیدت مند تلامذہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے نوحہ گری کی شریعت میں بالکل اجازت نہیں اس لئے ہم تو بس دست بستہ یہی عرض کرتے ہیں کہ اے تفسیر و تاویل کے امام، اے حدیث وفقہ کے شہسوار، اے ختم نبوت کے بے باک مجاہد، اے اسلامی تاریخ کے زریں باب، اے دین وشریعت کے ترجمان، اے مشائخ وعلماء کے امام و پیشوا! ہم تیری فرقت پر آبدیدہ ہیں، تیری جدائی ہم پر بجلی بن کر گری ہے، تیری وفات کی خبر سن کر آنکھیں چھلک پڑیں، دل رنج وغم سے بھر گیا اور ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا، اگر زمانے کی گردش معمول پر ہوتی تو ایک خلقت تیرے دیدار کے لئے امنڈ پڑتی اور دنیا پھر وہی منظر دیکھتی جو وارثین نبوت، پاسبان شریعت اور شارحین دین متین کے جنازوں کا ہوتا ہے کہ اس میں مخلصین ومقبولین کے ساتھ شرکت کے لئے آسمان سے فرشتے بھی اترتے ہیں ہمیں اس سعادت سے محرومی کا پوری زندگی قلق رہے گا، اور مدتوں ہم اس غم کو نہ بھلا سکیں گے اب تو آخر میں بس یہی دعا بے ساختہ ہماری زبان پر آتی ہے کہ باری تعالی تجھے بلند سے بلند مقام سے نوازے اور ہم بھی رحمت ومغفرت سے سرشار ہونے کے بعد جنت میں تیرے جوار میں بسیں تاکہ دنیا میں استفادہ کی جو کسر رہ گئی وہ آخرت میں پوری ہو۔ مولی تو بڑا رحیم وکریم ہے ہمارے ان ارمانوں کو حقیقت میں بدل دے اور ہمیں اپنے فضل وکرم سے محروم نہ فرما۔ اللهم آمین - إن العين تدمع، وإن القلب يحزن، ولكن لا نقول إلا ما يرضي ربنا الله، أنتم لنا سلف، ونحن بكم لاحقون، وإنا بفراقك يا شيخنا لمحزونون۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

ایک عہد آفریں شخصیت

مولانا محمد ساجد قاسمی ہردوئی
استاذ تفسیر وادب دارالعلوم دیوبند

مورخہ ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ (۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء) کو حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) کی رحلت آپ کے اہل خانہ، ہم کنبۂ دارالعلوم اور تمام وابستگان حلقۂ دیوبند؛ بلکہ عالم اسلام کے علمی حلقوں کے لیے بہت بڑا حادثہ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نہ صرف دارالعلوم دیوبند اور حلقۂ دیوبند بلکہ عالم اسلام کی چنیدہ شخصیات میں سے تھے، آپ اپنی تصنیفات وتالیفات اور علمی جلالت شان کی وجہ سے بیرون ممالک کے علمی حلقوں میں بھی معروف تھے اور وہ حلقے آپ کی علمی عظمت کے معترف تھے، اسی لیے آپ کے انتقال پر پوری دنیا سے تعزیتی پیغامات کا سلسلہ بندھ گیا۔

ایک عہد آفریں شخصیت

واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے، آپ اپنے درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور تربیت ورہنمائی کے لحاظ سے ایک فرد نہیں؛ بلکہ ایک انجمن تھے۔ آپ کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا اور ایک انجمن سونی پڑگئی۔ آپ کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی اور نئی نسلوں کے لیے آپ کی زندگی میں

بہت کچھ سیکھنے کی چیزیں ہیں۔

زمانۂ طالب علمی سے لے کر وفات سے چند روز قبل تک جہد مسلسل اور پیہم علمی اشتغال کے نتیجے میں اللہ تعالی نے آپ کو علمی جامعیت سے نوازا تھا، آپ کو متداول اسلامی علوم پر بڑی دستگاہ تھی، ان میں سے ہر ایک میں آپ کا حصہ تھا، کسی بھی علمی موضوع پر آپ بڑی بصیرت کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے، جس سے سامعین بھی مطمئن ہوجاتے اور اس موضوع پر ان کو بصیرت بھی حاصل ہوتی تھی۔ یہ آپ کی علمی جامعیت کی دلیل تھی۔ دار العلوم دیوبند میں وقتاً فوقتاً ہونے والے علمی وتربیتی اور اصلاحی پروگراموں میں آپ کا خطاب ہوتا تھا، آپ کا خطاب بہت وقیع، پرمغز اور بصیرت افروز ہوتا۔ جو آپ کی علمی شخصیت کا عکاس ہوتا تھا۔

یکسوئی وعلمی اشتغال

آپ وقت کے انتہائی پابند تھے، اسباق اور میٹنگوں میں ٹھیک وقت پر پہنچتے تھے، اور وقت کی پابندی کی ہم مدرسین اور طلبہ کو نصیحت بھی کیا کرتے تھے۔ آپ اپنے معمولات کے بڑے پابند تھے، حتیٰ کہ کبھی کبھی بعد نماز عصر اپنے لکھنے پڑھنے کا معمول جاری رکھتے تھے؛ البتہ اگر طلبہ یا اساتذہ آپ کے پاس عصر کے بعد جاتے تو ان سے پوری توجہ سے گفتگو کرتے تھے۔ آپ نے اپنے آپ کو تدریسی اور علمی مصروفیات کے لیے یکسو کر لیا تھا، آپ نہ کوئی انتظامی ذمے داری سنبھالتے تھے اور نہ سیاسی یا نیم سیاسی مسائل میں پڑتے تھے اور نہ ہی اس قسم کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے؛ البتہ جمعیۃ علماء ہند کے زیر انتظام ادارۃ المباحث الفقہیۃ کے فقہی سیمیناروں میں تقریبا پابندی سے شریک ہوتے تھے، جب کہ جمعیۃ کے عمومی اجلاسات میں آپ شرکت نہیں کرتے تھے۔ جو علمی ودینی خدمات آپ نے انجام دیں وہ یکسوئی اور زندگی کے ہنگاموں سے اپنے آپ کو دور رکھے بغیر ممکن نہیں تھیں۔

دو شخصیتوں کی کتابوں سے غیر معمولی دلچسپی

آپ نے تدریس وتعلیم کے ساتھ مدرسی کی شروعات ہی سے تصنیف وتالیف کا آغاز کر دیا تھا۔ آپ نے جن

شخصیات کو زیادہ پڑھا ان میں سے ایک امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور دوسرے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی ہیں۔آپ ان دونوں کے فکر وفلسفے سے زیادہ متاثر تھے؛ چنانچہ آپ نے اول الذکر کی کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کیا؛ بلکہ آپ نے ان پر کام بھی کیا،آپ نے شاہ صاحب کی کتاب الفوز الکبیر کے فارسی نسخے سے عربی میں ترجمہ کیا اور العون الکبیر کے نام سے اس کی عربی شرح بھی لکھی۔شاہ صاحب کی دوسری کتاب حجۃ اللہ البالغہ جو آپ کا علمی شاہ کار ہے،آپ نے دارالعلوم میں عرصۂ دراز تک اس کی تدریس کی خدمت انجام دی۔اور اس پر عربی میں حواشی بھی لکھے، نیز اس کی اردو زبان میں رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے مبسوط شرح بھی لکھی جو آپ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔

ثانی الذکر حضرت نانوتوی کی کتابوں کا بھی آپ نے گہرائی وگیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اپنے حاصل مطالعہ کو ''افادات قاسمی'' کے نام سے مرتب کیا، جو ماہنامہ الفرقان لکھنؤ سے قسط وار شائع ہوئے۔نیز اسی طرح آپ نے حضرت نانوتوی کی کتاب توثیق الکلام کی نہایت آسان شرح کے انداز میں (کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟) نامی کتاب بھی مرتب کی۔

اس کے علاوہ آپ نے متعدد درسی کتابوں بالخصوص قرآن کریم کی تفسیر اور حدیث کی کتابوں پر کام کیا۔جن میں قرآن کی تفسیر ہدایت القرآن اور بخاری کی شرح تحفۃ القاری اور ترمذی کی شرح تحفۃ الالمعی قابل ذکر ہیں۔

تقریر وتحریر میں اچھوتا انداز

اللہ تعالی نے آپ کو تقریر وتحریر کا بہت سہل وآسان اور اچھوتا انداز عطا فرمایا تھا،آپ اسباق کے مضامین کو بہت سہل وآسان اور دلنشیں انداز میں پیش کرتے تھے، چنانچہ مشکل سے مشکل مسائل کو عام فہم انداز میں پیش کرتے ،جنھیں سننے والے بآسانی سمجھ لیتے تھے اور مشکل ہونے کے باوجود ان کو سمجھنے میں کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔

یہی حال آپ کی تحریر کا بھی تھا، آپ کا اسلوب سادہ، عام فہم اور بلا کی سلاست لیے ہوئے تھا، مشکل اور پیچیدہ مسائل کو آسان انداز میں پیش کرنے کا آپ کو بڑا ملکہ تھا، آپ کے اسلوب کو سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے، یعنی اسلوب اتنا آسان کہ اس سے آسان ممکن نہ ہو۔ حضرت شیخ الہند کی کتاب ادلۂ کاملہ کی آپ نے تسہیل کی اور اپنے خاص اسلوب میں اس کے مسائل کی توضیح کی۔ میرے وطن کے ایک بڑے عالم نے آپ کی اس کتاب کی زبان اور اس کے اسلوب تحریر کی بڑی تعریف کی جن کا ذوق ادب نکھرا ہوا ہے۔

قابل رشک زندگی

حضرت مولانا عمید الزماں صاحب (برادر خورد حضرت مولانا وحید الزماں صاحب) آپ کے رفیق درس تھے، فراغت کے بعد دار العلوم میں عربی زبان میں ترجمہ اور تحریری کاموں کے لیے ملازم رکھے گئے۔ کچھ مدت یہاں کام کیا، اس کے بعد دہلی چلے گئے اور سعودی سفارت خانے میں ملازم ہو گئے، اس وقت سفارت خانے میں مولانا کی تنخواہ چالیس ہزار تھی یہ اب سے تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔ جب کہ مدارس میں اس وقت تنخواہ تین چار ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ مفتی صاحب نے ایک بار ان سے کہا کہ بھائی عمید الزماں صاحب آپ اتنی تنخواہ کا کیا کرتے ہیں: اوڑھتے ہیں یا بچاتے ہیں۔ منشاء یہ تھا کہ اتنی بڑی تنخواہ کا مصرف کیا ہے؟

جب کہ مفتی صاحب کی مدرسے سے قلیل تنخواہ تھی اور کتابوں کی معمولی سی تجارت تھی، آپ اسی پر گذر بسر کرتے تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے آپ کے یہاں مالی وسعت عطا فرمائی اور آپ نے بلا تنخواہ پڑھایا بلکہ ماضی میں جو تنخواہ لی تھی اسے واپس بھی کر دیا۔

مولانا عمید الزمان صاحب آپ کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان کے پاس دین بھی ہے اور دنیا بھی۔ اور وہ خود دار العلوم کی ملازمت چھوڑ کر سفارت خانے کی ملازمت اختیار کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے تھے۔

عادات واخلاق

آپ انتہائی خلیق اور ملنسار تھے، اور اپنے خوردوں کے ساتھ خوش طبعی اور بے تکلفی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ کچھ لوگ اپنے اردگرد وقار کا ایک ہالہ بنا کے رکھتے ہیں، خوردوں کا ان کے پاس بے تکلفی سے کوئی بات کرنا یا ہنسنا گستاخی تصور کیا جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے یہاں اس طرح کی کوئی بات نہیں تھی؛ چنانچہ ہم لوگوں سے خوش طبعی کی باتیں کرتے، اور ہم لوگوں سے بھی کچھ سنانے کے لیے کہتے۔ آپ کی ایک خوبی سب کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا معاملہ تھا، ہم لوگ جب بھی اپنی انتظامی یا ادارہ جاتی کوئی ضرورت لے کر گئے تو اسے بغور سنا اور اس سلسلے میں ممکنہ تعاون بھی کیا۔

اصابت رائے

اللہ تعالی نے آپ کو اصابت رائے سے بھی نوازا تھا، علمی مسائل و معاملات میں آپ کی رائے بہت صائب ہوتی تھی، اور بڑی جرأت کے ساتھ آپ اپنی رائے رکھتے تھے۔

خوردوں کی علمی رہنمائی وحوصلہ افزائی

آپ علمی کاموں میں رہنمائی اور بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور مفید آراء سے بھی نوازتے تھے؛ چنانچہ بہت سے لوگوں نے آپ کی رہنمائی اور سرپرستی میں کتابیں تصنیف کیں اور مصنف بن گئے۔ ناچیز نے دارالعلوم میں آنے کے بعد حضرت نانوتوی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ شروع کیا، اور جب وہ تراجم شیخ الہند اکیڈمی کی جانب سے طبع ہو کر آئے تو میں نے آپ کی خدمت میں انھیں پیش کیا۔ آپ نے بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، اور اس وقت آپ نے حجۃ اللہ البالغہ کا ایک نسخہ دیا عربی زبان میں جس کی تحقیق وتعلیق کا کام آپ نے کیا تھا وہ ابھی طبع ہو کر آئی تھی اور کہا کہ اس کتاب کو اس قسم کا کام کرنے والے سمجھیں گے۔

ناچیز نے دارالعلوم میں آنے کے بعد جو کچھ تھوڑا بہت کام کیا وہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے اسے ملاحظہ فرمایا اور اس کے سلسلے میں کوئی مفید رائے اور مشورہ ضرور دیا۔ تحصیل علم کے موضوع پر میں نے اپنا مختصر رسالہ (تحصیل میں اسلاف کی قربانیاں) آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اسے پورا پڑھا اور اگلی ملاقات پر فرمایا کتاب اچھی ہے؛ البتہ اس میں فلاں فلاں واقعہ مناسب نہیں ہے، اسے اگلے ایڈیشن میں نکال دینا۔

نیز جب میں نے ''تیسیر الانشاء'' کے سلسلے کا پہلا جزء مرتب کیا اور طبع ہونے کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اسے پسند فرمایا؛ البتہ بعض آراء بھی دیں اور فرمایا جب اگلے اجزاء مرتب کرنا تو طبع کرانے سے پہلے مجھے دکھانا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرا جزء جب مرتب کیا تو اسے آپ کو دکھایا اور آپ کے مشوروں کے مطابق اس میں ترمیم کی، نیز تیسرے جزء کی ترتیب کے وقت بھی ایسا ہی کیا۔ طبع ہونے کے بعد جب میں نے تیسرا جزء پیش کیا تو آپ نے مجھے ایک ہزار روپیہ دیا اور فرمایا کہ پانچ سو اس جزء کا ہدیہ ہے اور پانچ سو پچھلے جزء کا۔

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ آپ کو حضرت نانوتوی کے فکر و فلسفے سے بہت گہرا لگاؤ تھا اور اس موضوع پر آپ نے کام بھی کیا تھا؛ چنانچہ اس موضوع پر آپ کی رائے بہت اہمیت کی حامل تھی، اسی طرح اس موضوع پر کام کو پسند بھی کرتے تھے۔ ابھی چند سال پہلے دارالعلوم وقف نے حضرت نانوتوی پر ایک سیمینار کرنے کا فیصلہ کیا تھا، حضرت نانوتوی کی شخصیت سے متعلق موضوعات کی فہرست آئی اور مجھے بھی ایک موضوع پر لکھنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے اپنے لیے (فلسفۂ قاسمی: منہج اور اصول) کے موضوع کا انتخاب کیا۔

حضرت نانوتوی کی کتابوں کے ترجمہ کے دوران آپ کی کتابوں اور تحریروں کو غور سے پڑھنے کا موقع ملا، میں نے دیکھا کہ حضرت کے یہاں کچھ اصول ہیں کہ جن کی روشنی میں آپ گفتگو کرتے ہیں، آپ پہلے اصول ذکر کرتے ہیں اس کے بعد جزئیات ان پر متفرع کرتے ہیں۔ میں نے اپنے اس مضمون میں حضرت کے انہی اصولوں کو اور ان کی تفریعات کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ مضمون مکمل کر کے سیمینار کے منتظمین کے حوالے کر دیا؛

لیکن سیمینار کسی وجہ سے ملتوی ہوگیا۔تو میں نے مضمون اشاعت کے لیے ماہنامہ دارالعلوم میں دے دیا، چنانچہ وہ شائع بھی ہوگیا۔

ایک دن میں عصر کے بعد آپ کی مجلس میں گیا تو آپ نے ماہنامہ دارالعلوم میں شائع ہوئے میرے اس مضمون کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ میں نے ماہنامہ میں آپ کا مضمون پڑھا، وہ بہت اچھا ہے میں یہ سمجھتا تھا تمھارا عربی اردو میں ترجمہ کا ذوق ہے، مجھے نہیں اندازہ تھا کہ حضرت نانوتوی کی فکر سے متعلق تم ایسا مضمون لکھ سکو گے۔ تمہارا مضمون بہت اچھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ترجمہ کے دوران حضرت نانوتوی کی کتابوں کو غور سے پڑھنے کا اتفاق ہوا، حضرت کے فلسفے سے متعلق یہ چیزیں میرے ذہن میں آئیں جنھیں میں نے مرتب کر دیا۔اس کے بعد آپ نے حضرت نانوتوی کی کتابوں پر کام کرنے کا طریقہ بتایا، غالباً آپ نے فرمایا کہ حضرت کی وہ کتابیں اور تحریریں جو قابل فہم ہیں ان کو موضوع وار مرتب کر کے عام قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے، اس موقع پر آپ نے حضرت نانوتوی کی جن کتابوں پر کام کیا اس کا بھی تذکرہ کیا اور آپ کے جو مضامین افادات قاسمی کے عنوان سے قسطوار ماہنامہ الفرقان میں شائع ہوئے ان کا بھی ذکر کیا۔

اساتذہ کے لیے قیمتی نصائح

آپ کو اپنے اساتذہ میں سے علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے خصوصی تعلق تھا، آپ ان کی یہ وصیت ہم اساتذہ کی مجلس میں ہمیشہ نقل کیا کرتے تھے۔آپ نے فرمایا کہ میں نے دارالعلوم سے رخصتی کے وقت حضرت علامہ سے کہا کہ حضرت مجھے کوئی نصیحت کر دیجیے۔ چنانچہ علامہ نے تین باتوں کی نصیحت فرمائی، آپ نے فرمایا:

مولوی صاحب!

۱- فن دیکھ کر پڑھانا علم آئے گا۔

۲- طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا طلبہ تم سے محبت کریں گے۔

۳-   سنت پر عمل کرنا مقبولیت حاصل ہوگی۔

نیز آپ اساتذہ کی مجلس میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کسی بھی کتاب کی تدریس کے وقت اس فن کی چھوٹی بڑی تمام کتابوں کا مطالعہ کرو، مثال کے طور پر فقہ میں اگر کسی کتاب کی تدریس متعلق ہوئی ہے تو نیچے نور الایضاح اور اوپر ہدایہ اور درمختار تک کا مطالعہ کرو۔ یہ مطالعہ اپنے لیے ہوگا طلبہ کو صرف ضروری باتیں ہی بتانی ہیں۔آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ بالکل صحیح تھا کسی فن پر استیعابی نظر اسی طرح کے مطالعہ سے ہوسکتی ہے۔

آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اپنے لیے کسی ایک فن کو منتخب کرکے اس میں مہارت حاصل کی جائے، اور اسے اپنا اختصاصی فن بنایا جائے، اس سلسلے میں بعض اساتذہ کی مثال بھی دیتے تھے جو کسی فن میں اختصاص کے لیے مشہور رہیں۔

مطالعے کے سلسلے میں آپ کی یہ رہنمائی بھی بڑی قیمتی ہے جو آپ مجلس میں اساتذہ کے سامنے ذکر کیا کرتے تھے کہ کسی کتاب/فن کا مطالعہ کیا جائے اس کے بعد استنتاج (نتیجہ اخذ کرنا) کیا جائے۔ یہ بات صحیح ہے کہ نتیجہ اخذ کرنا ہی حاصل مطالعہ ہے۔محض معلومات اکھٹا کرنے اور اس کا ثمرہ حاصل نہ کرنے سے مطالعے کا عمل نامکمل رہتا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ احمد امین نے کسی سے اس کے مطالعہ کے نظام الاوقات کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ صبح سے رات گئے تک میں مطالعہ کرتا ہوں تو احمد امین نے اس سے کہا کہ جب سارا وقت تم مطالعے میں لگاتے ہو تو جو مطالعہ کیا ہے اس میں غور وفکر کرکے نتیجہ کب حاصل کرتے ہو؟

ہم آپ کو رخصت نہ کرسکے

الغرض آپ ہمارے درمیان سے چلے گئے، اور ایک ناقابل تلافی خلا اپنے پیچھے چھوڑ گئے، ہمارے درمیان آپ کی یادیں اور کتابوں کی شکل میں انمٹ نقوش باقی ہیں۔شعبان میں آپ کی طبیعت ناساز ہوئی اور

بغرض علاج ممبئی تشریف لے گئے، آپ کو افاقہ بھی ہو گیا، رمضان میں آپ نے تراویح کے بعد بیان کا سلسلہ بھی شروع کیا جو نشر ہوا اور لاکھوں لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہوگئی ہے؛ لیکن پھر طبیعت بگڑی اور علاج کے باوجود سنبھل نہ سکی، اور ہم سب کو ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے کر چلے گئے۔ کیا معلوم تھا کہ دیوبند سے آپ کا یہ سفر آخری ہے اور اب دوبارہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اس سے بھی زیادہ ہم سب کے لیے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ کورونا جیسی وبائے عام اور بلائے ہمہ گیر کی وجہ سے ہم لوگ بلکہ آپ کے اہل خانہ (سوائے دو بیٹوں کے) بھی آپ کا آخری دیدار نہ کر سکے اور نہ جنازے میں شریک ہو سکے۔

ہم لوگوں کا حال حضرت مفتی صاحب کے سلسلے میں تقریباً وہی ہے جو کسی شاعر کا بغداد اور اس کے مکین کے تئیں تھا:

لعَمْري ما فارقتُ بغداد عن قلى لو أني وجدتُ من فراقٍ لها بُدَّا

كفى حُزْنًا أن رُحتُ لم أستطِعْ لها وَدَاعا ولم أُحدِث بسَاكِنها عهدًا

(بخدا میں نے بغداد کو کسی خفگی و ناراضگی کی وجہ سے نہیں چھوڑا، اگر میں اس کو چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ پاتا (تو میں اسے ہرگز نہ چھوڑتا)۔

میرے غم کے لیے یہ بات کافی ہے کہ میں اسے رخصت نہیں کر سکا اور اس کے مکین کے ساتھ کوئی عہد و پیمان نہ باندھ سکا۔

❁...❁...❁

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ نقوش وتاثرات

مولانا منیر الدین احمد عثمانی نقشبندی

استاذ دارالعلوم دیوبند

۲۴؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء کی صبح ۷؍بجے کرونا وائرس کی دہشت تھی، سناٹا تھا، دیوبند کی گلیاں اور شاہراہیں خاموشی کی چادریں اوڑھے ہوئے گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ ایک صاعقہ اثر خبر پردۂ سماعت سے ٹکرائی کہ مسند حدیث کا مہتاب غروب ہوگیا، جس کی ضیاء پاشیوں سے ہزاروں ستارے روشن ہوتے تھے، اس کے غروب ہونے سے ان گنت تاروں کی روشنی ماند پڑگئی، کتنے گلشن حدیث اس کی ضیاء باریوں سے سرسبز وشاداب دکھائی دے رہے تھے، اس کے غروب ہوجانے سے خزاں رسیدہ نظر آرہے ہیں، گلشن حدیث کے ہزاروں گلوں کو اس کی چمک سے خوشبوئیں فراہم ہوتی تھیں، اس کے ڈوبنے سے خوشبوئیں معدوم نظر آرہی ہیں، کتنی کلیوں کو اس کے وجود سے کھلنا نصیب ہوتا تھا، اس کے غروب ہونے سے بن کھلے مرجھا گئیں، اس کے وجود سے بے شمار احادیث نبویہ کے شجر ثمر بار ہوتے تھے، اس کے غروب ہونے سے وہ اشجار بے ثمر ہوکر رہ گئے، اس کے وجود سے ہزاروں تشنگان احادیث کو سیرابی ملتی تھی، اس کے عدم سے سیرابی کے لیے تڑپ رہے ہیں، وہ ماہتاب استاذ گرامی مرتبت، شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کی ذات گرامی ہے، جس کے پردۂ عدم میں چلے جانے سے اس عاجز کی آنکھیں اشک بار ہیں، جگر پارہ پارہ ہے، طبیعت غم واندوہ کی مسموم ہواؤں سے جھلسی ہوئی ہے، آلام ومصائب کی تیز وتند آندھی سے

دل مضطرب ہے، نہ محفل میں اطمینان ہے نہ تنہائیوں میں سکون، اضطراب ہی اضطراب ہے، پورا ماحول سوگوار ہے، آلام ومصائب اتنے شدید ہیں کہ اگر وہ روشن دنوں پر ڈال دئے جائیں تو تاریک شب میں تبدیل ہوجائیں

ے

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّهَا
صُبَّتْ عَلَى الْاَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

اس عاجز کی طرح ہزاروں تلامذہ اپنے مشفق استاذ گرامی مرتبت کی جدائیگی کے غم سے نڈھال، اولاد واحفاد اپنے بے مثیل والد کے اس سفر پر چلے جانے سے جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا، بے پناہ حزین و پُرملال، جو اپنی اولاد کے لیے نہ صرف باپ؛ بلکہ ایک شیخ وقت، پیر طریقت، جو اپنے سالک کی ہر چہار سمت نظر رکھتا ہے، شفیق ایسے کہ ہر سو شفقت برستی تھی، اپنی اولاد میں سے ہر ایک کو دنیاوی اعتبار سے خود کفیل بنانے کے خواہشمند اور دینی لحاظ سے سب کو دیندار دیکھنے کے آرزومند رہتے تھے، اس عاجز پر تو حد سے زیادہ مہرباں وکرم فرماتے تھے، یہ عاجز تقریباً تین سال محلہ کوٹلہ دیوبند میں حضرت کے پڑوس میں رہا، حضرت نے جس طرح حق پڑوس ادا کیا وہ ایک مومن کامل کی مثال ہے، اس دوران حضرت والا کی شفقتوں سے خوب متمتع ہوا۔

مارچ ۲۰۰۱ء میں بچوں کی دل لگی کے لیے ایک گراں قیمت مرغا خریدا، مگر کچھ ہی دنوں بعد کسی خیر خواہ کی نظر میں وہ مرغا بھا گیا، اور اس نے اس کو غائب کردیا، اس کے لیے حضرت اقدس گھر پر تشریف لائے، تعزیت فرمائی اور دیر تک تسلی کے کلمات ارشاد فرماتے رہے، جس سے دل کو بڑی تسکین نصیب ہوئی۔

جنوری ۲۰۱۹ء میں جب عاجز زادی کا عقد نکاح میں نکاح خوانی کا مسئلہ آیا تو یہ عاجز ڈرتے ڈرتے مفتی اشتیاق احمد صاحب، مدرس دارالعلوم کی معیت میں حاضر خدمت ہوا، اور عقد نکاح میں شرکت کی درخواست پیش کی، حضرت والاؒ نے بطیبِ خاطر منظور فرمائی؛ حالانکہ حضرت کی طبیعت علیل تھی، کسی قسم کی مجلس میں شرکت نہیں

فرماتے تھے، فرمایا کہ میں ضرور شرکت کروں گا، ساتھ ہی فرمایا کہ تمہاری امی (اہلیہ مرحومہ) سے تمہاری اہلیہ اور اس بچی کا بڑا گہرا ربط تھا؛ چنانچہ بعد نماز عصر جامع رشید میں مجلس نکاح منعقد ہوئی، حضرت نے شرکت فرمائی اور بڑی جامع اور مستجاب دعا فرمائی۔

حضرت استاذ گرامی، ان مؤفق اور بافیض علماء میں سے ہیں جن سے اللہ رب العزت نے تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کا خوب کام لیا، شمالی گجرات کا مردم خیز اور متدین علاقہ پالن پور، ضلع بناس کانٹھا، مقام کالیڑہ میں ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں حضرت کی ولادت باسعادت ہوئی، والد محترم نے بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی، پہلے گاؤں کے مکتب سے اکتساب فیض کیا، پھر گجرات کی معروف دینی درس گاہ دارالعلوم چھاپی، تحصیل علم دین کے لیے اپنے ماموں جان مولانا عبدالرحمن کے ہمراہ تشریف لے گئے، مگر اللہ رب العزت نے حضرتؒ کے لیے کچھ اور ہی سعادتیں مقدر فرما رکھی تھیں، اس لیے صرف چھ ماہ کی مختصر مدت کے بعد مصلح الامت حضرت مولانا نذیر احمد صاحب پالن پوری کے ادارہ میں منتقل ہوگئے اور مولانا نذیر احمد صاحب کے مدرسہ کے فن کار ماہر اساتذہ کرام حضرت مفتی محمد اکبر صاحب پالن پوریؒ اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاریؒ سے ابتدائی سے شرح جامی تک کتابیں پڑھیں، ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں شمالی ہند کی بافیض درس گاہ جامعہ مظاہر علم سہارنپور میں داخل ہوئے، اور فن نحو میں دسترس رکھنے والے امام النحو علامہ صدیق احمد صاحب جمویؒ سے تین سال تک کسب فیض کیا، فن نحو کے علاوہ، فن منطق اور فلسفہ میں بھی استفادہ کیا۔

مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں اس وقت علم حدیث وفقہ کے آفتاب و ماہتاب موجود تھے، حدیث وفقہ کی روشنی سے علمی دنیا کو روشن کر رہے تھے، اور پوری دنیا ان کی ضیاء پاشیوں سے چمک رہی تھی، حضرت اقدسؒ نے بھی ان سب کے علمی نور کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لیے ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء داخلہ لیا، اور یکتائے روزگار ہستیوں سے علمی استفادہ میں مشغول ہوگئے، حدیث کے شناور، مسند حدیث کے شہ نشیں فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین

صاحبؒ سے بخاری شریف کی تکمیل کی۔ فن منطق وفلسفہ میں پیش رو میں نظیر نہ رکھنے والے بے مثیل اور افہام وتفہیم میں منفرد شخصیت حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ سے مسلم شریف اور ترمذی شریف میں کسب فیض کیا۔

دورۂ حدیث کے بعد فقہ وفتاویٰ کے روشن ستارہ حضرت مفتی مہدی حسن صاحبؒ سے فتویٰ نویسی کی تربیت حاصل کی، اس طرح اپنے زمانے کے یکتائے روزگار ہستیوں سے استفادہ کیا جس کی وجہ سے اللہ رب العزت کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں میں خوب جلا پیدا ہوا، اور آپ علیہ الرحمہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہو گئے۔

مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے درس نظامی کی تکمیل کے بعد ۱۳۸۴ھ میں جامعہ اشرفیہ راندیر، سورت گجرات میں بحیثیت مدرس علیا آپ کا تقرر ہوا، اور مختلف علوم وفنون کی تدریس کے ساتھ کتب احادیث آپ سے متعلق رہیں، جب تدریس کے لیے مادر علمی سے روانگی عمل میں آنے لگی تو حضرت نور اللہ مرقدہٗ شیخ المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور خصوصی نصیحت کی درخواست کی، اس پر حضرت علامہ نے فرمایا: صبح تشریف لایئے، چناں چہ صبح کے وقت حاضری پر تین گراں قدر نصیحت فرمائی۔ فرمایا:

(۱) فن دیکھ کر پڑھایئے، علم آئے گا۔

(۲) طلبہ کو اپنی اولاد سمجھئے، طلبہ محبت کریں گے۔

(۳) سنت نبوی ...... کی پیروی کیجئے، لوگوں کی الفت نصیب ہوگی۔

چنانچہ حضرت اقدسؒ نے تینوں نصیحتوں کو دل کے گوش سے سنا اور ان پر عمل کی گرہ باندھ لی، جامعہ اشرفیہ راندیر، سورت میں تدریس کے دوران ہی مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی عقابی نگاہ آپ پر پڑی، اور آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں خدمت تدریس کی دعوت پیش کی، اوّلاً دعوت تدریس منظور فرمائی، پھر غور وفکر کے بعد جامعہ اشرفیہ کی خدمت تدریس کو ترجیح دی اور حضرت علی میاں ندویؒ کو (ممبئی حاضری پر) ممبئی میں جا کر معذرت پیش فرمادی۔

جامعہ اشرفیہ راندیر، سورت میں دس سال خدمت تدریس کے بعد ۱۳۹۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی خدمت تدریس کے لیے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، انتخاب کے بعد مختلف علوم وفنون کی کتابیں متعلق ہوتی رہیں، اور آپ کامیاب تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ استاذ گرامی قدر حضرت مولانا نصیر احمد صاحب کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء میں بخاری شریف اوّل آپ سے متعلق کی گئی اور آپ کو شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے عظیم منصب پر فائز کیا گیا، اور تاحین حیات اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔

منصب تدریس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے، اس منصب کا میسر آنا توفیق باری تعالیٰ ہے، اور اس منصب کے حصول کے بعد اس کو غنیمت سمجھنا اتباع سنت ہے، حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اس منصب تدریس کو جان سے زیادہ عزیز سمجھا، جب درس کا وقت ہوجاتا تو کوئی سخت سے سخت چیز بھی رکاوٹ نہیں بن پاتی، موسم سرما کی برفیلی ہوائیں ہوں، موسم گرما کی لُو زدہ آندھی، زمانۂ مرض کی تکلیف بھی آپ کی تدریس میں حائل نہیں ہو پاتی؛ بلکہ ڈاکٹروں کی تدریس کو منع کرنے کے باوجود تدریسی خدمت میں عافیت محسوس کرتے، اور گھنٹوں تدریس کے بعد تکلیف کے بجائے آرام وراحت محسوس کرتے، تدریس ایسی کہ جب حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے درس کا وقت ہوتا تمام متعلقہ طلبہ بھاگ دوڑ کر اپنی اپنی جگہ حاصل کرتے، سکون سے بیٹھ جاتے، ماحول میں سناٹا چھا جاتا، اور ''کَاَنَّمَا عَلٰی رُؤُسِہِمُ الطَّیرُ'' کا منظر پیش کرتا، اور تفہیم ایسی کہ ذکی، متوسط اور غبی، تینوں طبقات کے طلبہ یکساں مستفید ہوتے، ایک نشست میں تین تین گھنٹے کا درس بالکل بھی گراں محسوس نہیں ہوتا؛ بلکہ مزید استفادہ کے خواہشمند ہوتے، خاردار، شعلہ بار اور کٹھن راہوں سے گذر کر نرم وگرم جھیلتے ہوئے، موج وحوادث میں ہنستے اور کھیلتے ہوئے شبانہ روز کی جد وجہد اور محنت ومشقت کے ذریعہ صبح تمنا کی کرن تک پہونچنے کے عادی تھے، جامعہ اشرفیہ راندیر میں تنخواہ کی مقدار قلیل تھی، خرچ پورا ماہ کفایت نہیں کرتا تھا، پہلے عشرہ میں چائے وپان ساری چیزیں تکمیل تک پہونچتی تھی، دوسرے عشرہ میں چائے رہتی، پان بند ہوجاتا، اور تیسرے عشرہ میں چائے وپان دونوں

چیزیں بند ہوجاتی تھیں، مگر کبھی تدریس موقوف نہ ہونے پائی، اور نہ ہی کبھی جگہ کی تبدیلی کا خیال ذہن میں آیا، اور اپنے ماتحتوں کی ترقی کے لیے تڑپنا، پھڑکنا، گھلنا اور اپنی تمام تر توانائیوں کو صرف کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور اپنی ۱۳؍ اولاد کو خود کفیل بنانے کے لیے اسباب مہیا فرماتے اور اسباب میں مصروف کرنے کی فکر فرماتے: تاکہ ان لوگوں کو دشوار گزار گھاٹیوں سے گذرنا نہ پڑے، اور مشکل ایام دیکھنا نہ پڑے۔ آج --الحمد اللہ-- حضرتؒ کی ۱۳؍ صلبی اولاد میں سے جو حیات مستعار سے لیث ہیں وہ بقدر کفایت اسبابِ معیشت سے بھی لبریز ہیں۔

تصنیف وتالیف اللہ رب العزت کی بیش بہا نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے، جو استاذ گرامی مرتبت کے حصہ میں وافر مقدار میں آئی، بعض تصنیف تو ایسی ہے کہ سوچ کر دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ ''رحمۃ اللہ الواسعہ، شرح حجۃ اللہ البالغہ'' حضرت کی ایسی کاوش ہے جس نے علماء امت سے ایسا قرض اتارا ہے جو عرصہ سے چلا آرہا تھا۔ ''عمدۃ القاری شرح بخاری شریف'' بارہ جلدوں میں۔ ''تحفۃ الالمعی شرح ترمذی شریف'' ۸؍ جلدوں میں۔ الغرض ہرفن میں آپؒ کی بیش قیمت تصانیف درجنوں کی تعداد میں کتب خانہ علمیہ کے ذخیرے ہیں، جن سے دنیا ہمیشہ استفادہ کرتی رہے گی۔ ''مبادی الفلسفہ'' فن فلسفہ میں وہ گران قدر تصنیف ہے جو فن فلسفہ کے شیدائیوں کے لیے بنیاد اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے بغیر فن فلسفہ کی تحصیل دشوار گذار اور مشکل ہے اور تقریباً مدارسِ اسلامیہ میں داخل نصاب ہے۔

استاذ گرامی مرتبت ایسے خاندان کے فرد فرید تھے جو بزرگوں سے مربوط اور مضبوط رشتہ رکھتے تھے، آپ کے والد گرامی قدر الحاج حضرت یوسف صاحب متدین، بزرگوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے خاص اور مقرب بندوں کے ارادت مند اور عقیدت مند تھے، اسی وجہ سے انھوں نے اپنی پانچوں نرینہ اولاد کو حصول علم دین میں لگایا، ان میں سے تین حضرت مفتی سعید احمد صاحب، حضرت مفتی محمد امین صاحب، اور حضرت مفتی حبیب احمد صاحب خدمت تدوین علم دین کے لیے وقف ہوگئے، ان کا خلوص تھا کہ اللہ رب العزت نے ان تینوں کو دین

مبین کی سعادت بھری خدمات سے بہرہ ورفرمایا، بلکہ ان میں سے اول الذکر دونوں مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں حدیث کے ممتاز اساتذۂ کرام میں شامل ہیں۔ استاذ گرامی مرتبت کی پُروقار شخصیت ہمارے لیے تمام امور میں رجع کی حیثیت رکھتی تھی، ان کا وجود مسعود ایک مبارک گھنیرے اور پھلدار درخت کے مانند تھا، اور ہر محفل کے لیے شمع تھے، لیکن کسی چیز کی قدر و قیمت اسی وقت سمجھ میں آتی ہے جب وہ باقی نہ رہے۔

آہ! اس شخصیت کے زندہ رہنے سے کتنے اقدار وروایات، حوصلوں اور امنگوں کو فروغ ملتا تھا، آج اس کے اٹھ جانے سے کتنی شمعیں بےنور اور کتنی محفلیں سونی ہوگئیں ع

کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی
چلا جاتا ہوں ہنستا، کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

انسان کتنا ہی توانا وتندرست ہومگر وہ ایک کمزور مخلوق ہے، خود خالق کائنات نے فرمایا: ''وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا'' انسان کمزور پیدا کیا گیا، اس مضمون کو مزید وضاحت کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورہ روم میں بیان فرمایا ہے:

''اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَۃً یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَھُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ''۔ (سورہ روم آیت ۵۴)

اِس آیت میں اللہ رب العزت نے انسان کے تین مراحل ذکر فرمائے ہیں، ابتدائی کمزوری، درمیانی توانائی، اور انتہائی کمزوری، گویا انسان کمزور زیادہ ہیں، توانا وطاقت ور کم۔

استاذ گرامی مرتبت! صبر واستقامت کے پیکرِ جمیل تھے، کتنے بھی حوادث آئے سب کو بسہولت انگیز کر لیتے تھے، عمر کی ۸۲؍بہاروں سے گذرنے کے باوجود حساس وبشاش رہتے تھے، دورۂ حدیث شریف کی جماعت میں

تدریس کے طاقت ور اور مضبوط ستون تھے، کسے معلوم تھا کہ یہ مضبوط ستون اتنی جلدی گر جائے گا، وہ نکتہ آفریں درس جس کے سننے کے بعد ذہن ودماغ کو غذا ملتی تھی، وہ درس جس کے سننے کے لیے ہر طالب علم سانس روکے گوش بر آواز رہتا تھا کہ مبادا کوئی لفظ دل وکان میں پڑنے سے قبل ہوا کے دوش پر اُڑ نہ جائے، ہر لفظ ہیرے جواہرات سے گراں، آتش فروزاں سے زیادہ پُرسوز، درد وکرب سے لبریز، درِ یتیم سے زیادہ صاف وستھرا، تخت وطاؤس سے زیادہ قیمتی، اخلاص ووفا سے دُھلا ہوا، احتساب وللّٰہیت سے تاباں، خونِ جگر سے رنگین، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل کی بے چینی وکرب وسوز الفاظ وعبارات کے جامہ میں تبدیل ہو رہا ہے، کسے پتہ تھا کہ یہ آواز یک لخت خاموش ہو جائے گی۔

۱۶؍رجب المرجب ۱۴۴۱ھ کی وہ گھڑی آگئی جس میں کمزوری تندرستی پر غالب آگئی، توانائی مغلوب ہوگئی، مجلس درس سونی ہے، صرف قاری روایات طالب علم کی آواز کانوں میں آ رہی ہے، مگر جس آواز کے لیے سماعت بے چین ہے، اس میں بالکل سکوت ہے، یہی صورت حال پانچ دنوں تک برقرار رہتی ہے، اور ۲۲؍رجب المرجب ۱۴۴۱ھ بعد نماز عشاء درس کا آغاز ہوتا ہے، قاری روایات کی آواز گونجنے لگتی ہے، طلبۂ دورۂ حدیث سناٹے میں ہیں، بخاری شریف کی تکمیل ہوتی ہے، اور شیخ وقت کی زبان مبارک سے صرف ایک جملہ نکلتا ہے ''اللہ جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے'' اس جملہ کا سننا تھا کہ طلبہ کی چیخیں نکل گئی، پورا مجمع زار وقطار رونے لگا اور روتے روتے محفل برخواست ہوگئی۔

۲۲؍رجب المرجب ۱۴۴۱ھ شام میں اس عاجز کی حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی، مگر کوئی بات نہ ہوسکی، پھر جب ۲۳؍رجب ۱۴۴۱ھ کی صبح میں حاضری ہوئی تو حضرت کی زبان مبارک سے الفاظ صاف نکل رہے تھے، باتیں کیں اور فرمایا کہ تم کل آئے تھے، لیکن میری زبان بند تھی، اور اب زبان جاری ہے، پھر بغرض علاج ممبئی جانے کا تذکرہ آیا، اور فرمایا کہ دو پہر کی فلائٹ سے ممبئی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، چناں چہ ۲۳؍رجب

المرجب ۱۴۴۱ھ میں ممبئی تشریف لے گئے، ایک ہفتہ کے علاج کے بعد الحمدللہ صحت بحال ہوگئی اور مجلس وعظ ونصیحت کا آغاز فرما دیا، وہ دیوبند لوٹنا چاہتے تھے، لیکن ملک میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے ساری سواریاں مسدود ہوگئیں تھیں، جس کی وجہ سے ممبئی میں قیام کرنا پڑا، پھر ۲۳؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ میں طبیعت بگڑ گئی، ایک نجی ہسپتال میں داخل کیا گیا، مگر وقت موعود آپہنچا تھا، جس کی وجہ سے ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی صبح کی اولین ساعتوں میں کلمہ پڑھتے ہوے اپنے محبوب حقیقی اللہ رب العزت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس دارِ فانی کو خیر باد کہہ دیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ)۔

ب ہم تقدیری فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں، جس طرح رسول اکبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات پر اپنے غم کا اظہار فرمایا تھا، اللہ رب العزت کی مرضی پر رضا ظاہر فرمائی تھی

”ان العین تدمع، والقلب یحزن، ولا نقول الا ما یرضی، ربنا وانا بفراقک یا إبراهیم لمحزونون“

ہماری آنکھیں اشک بار ہیں، دل غمگین ہیں، ہم اپنی زبان پر وہی لاتے ہیں جو ہمارے رب کی خوشنودی کا سبب ہو اور اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی سے بے حد غمگین ہیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

❁...❁...❁

ایک عبقری شخصیت کا ذکر ''سعید''

حضرت مولانا مفتی تبریز عالم حلیمی قاسمی صاحب
خادمِ تدریس دارالعلوم حیدرآباد
سابق معین مدرس دارالعلوم دیوبند

حضرت الاستاذ، استاذ الاساتذہ مفتی سعید احمد پالن پوری نور اللہ مرقدہ (م: ۱۴۴۱ھ = ۲۰۲۰ء) کا سانحۂ ارتحال دنیائے علم وفضل کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔ حضرت الاستاذ کی علمی خدمات کا دائرہ نہ صرف بہت وسیع اور مختلف النوع حیثیت کا حامل ہے، بلکہ اتنا روشن ہے جو سب کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ یقیناً ان کی ذات سے محرومی مسلمانانِ ہند، بالخصوص طالبانِ علوم نبوت کے لیے بہت بڑی محرومی ہے۔

تدریس، تصنیف وتالیف اور بیان وخطابت: بیک وقت تینوں کا کسی ایک شخص میں جمع ہوجانا خوش نصیبی اور کمال کی بات ہے، مفتی صاحب کی زندگی میں یہ تینوں باتیں علی وجہ الکمال جمع تھیں، جس کی وجہ سے آپ کی شخصیت ایک نمایاں مقام کی حامل شخصیت تھی؛ چناں چہ آپ نے پوری زندگی علم دین کی اشاعت اور قوم وملت کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی، بے شمار لائق شاگرد اور مردانِ کار تیار کیے، مفید اور نافع کتابیں تصنیف کیں، اور اپنی علمی واصلاحی خدمات کی روشنی سے نہ معلوم کتنے چراغ روشن کیے۔ آپ کی تدریس اِس قدر عمدہ، شاندار، عام فہم اور دل پذیر تھی کہ اس پر خامہ فرسائی سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، آپ کو دارالعلوم دیوبند کی مسندِ تدریس کی آبرو اور اس کی پیشانی کا جھومر کہا جائے یا جماعتِ دیوبند کا علمی سالار اور یادگارِ سلف کا عنوان دیا جائے؛ یہ سب یقیناً عقیدت مندانہ خراجِ عقیدت کی علمی تعبیرات ہیں، ورنہ آپ کی تدریس اِن الفاظ کی حقیقت

سے بالاتر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تدریس نے نہ صرف یہ کہ طلبہ کے ذہن ودماغ کو روشن اور متاثر کیا، بلکہ آپ کی مثالی تدریس نے ان کے قلعۂ قلب پر فتح وحکمرانی کے جھنڈے لہرائے، سب جانتے ہیں کہ دل کی تسخیر کے بعد ہی کسی انسان کو مقبولیت کا اعلی معیار نصیب ہوتا ہے، جو مفتی صاحب کو خوب حاصل ہوا۔

میرے بخاری کے مؤقر استاذ شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خان صاحب نور اللہ مرقدہ (م: ۱۴۳۱ھ = ۲۰۱۰ء) کی علالت اور وفات کے بعد عارضی پھر دائمی طور پر بخاری کی تدریس کے لیے دارالعلوم دیوبند کے موقر اور علیا درجہ کے اساتذہ کرام پر نظر ڈالی گئی تو اس وقت کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہ (م: ۱۴۳۲ھ = ۲۰۱۰ء) کی نظرِ انتخاب ترمذی اور طحاوی کے استاذ مفتی سعید احمد پالن پوری پر رکی، چوں کہ مفتی صاحب کا علمی دبدبہ، کارہائے نمایاں، تدریسی لیاقت اور علم حدیث کے مطالعہ کی وسعت عالم آشکارا تھی، اس لیے یہ انتخاب 'حسنِ انتخاب' ثابت ہوا اور اسی علمی رتبے کی وجہ سے مفتی صاحب صدارتِ تدریس کے پروقار عہدے پر بھی فائز کیے گئے۔ آپ کی تدریس اور اندازِ تدریس کی دھاک اور بازگشت برسوں محسوس کی جائے گی، بالخصوص ترمذی، طحاوی اور بخاری کی تدریس کی گونج ایک لمبے زمانہ تک سنی جائے گی؛ کیوں کہ پچھلے چالیس پینتالیس سالوں میں طالبانِ علوم نبوت کو مفتی صاحب کی ذات سے جو علمی نفع ہوا ہے وہ غیر معمولی ہے۔

آپ کی تصنیف وتالیف پر کیا گفتگو کی جائے، اس کے موضوعات وعنوانات میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری ہے کہ اس پر خامہ فرسائی مستقل ایک کام اور لکھنے والوں کے لیے ایک علمی موقع اور بڑا میدان ہے۔ اندازِ تصنیف پر کیا کلام کیا جائے، اس پھول کی خوشبو بھی اپنی الگ اور منفرد شناخت رکھتی ہے، اس خوشبو سے اہل علم کی لائبریریاں معطر تو ہیں ہی، طلبہ واساتذہ کی تشنگی کا کافی اور شافی سامان بھی اس میں موجود ہے، اردو کی چاشنی، محاوروں کا برموقع استعمال اور کہیں کہیں انگریزی الفاظ کی آمیزش سے آپ کی تصنیفات پر 'سونے پہ سہاگہ' کا محاورہ صادق آتا ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ تدریس اور تصنیف وتالیف کے لیے ایک طرف تعلقات، تفریحی مشاغل وشواغل اور دنیاوی مفادات کی قربانی ناگزیر ہے تو دوسری طرف وقت کی قدردانی اور اسے ناپ تول کر خرچ کرنے کا خود کو پابند بنانا بھی ضروری ہے، تاکہ یکسوئی کے ساتھ مطالعہ اور کتب بینی کو غذائے روح بنایا جاسکے۔ حضرت الاستاذ اِس حوالہ سے ان اسلاف کی یادگار اور ان مصنفین ومدرسین کا عکس جمیل تھے کہ علم ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور جنھوں نے اپنی مسلسل محنت اور علمی اشتغال کے پیشِ نظر ہر طرح کی قربانیاں پیش کی ہیں۔ چناں چہ 'بڑی قربانیوں کے بعد پیدا نام ہوتا ہے' کے پیشِ نظر حضرت الاستاذ کے گلستانِ علم وفن میں نہ صرف عمدہ پھول کھلے، بلکہ اس علمی باغ میں 'یافت' کے ساتھ 'دریافت' کی ایسی کلیاں بھی وجود میں آئیں جن کی مہک اور افادیت پسِ مرگ بھی محسوس کی جائے گی۔

یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ مفتی صاحب تدریس وتصنیف کے باب میں یکتائے روزگار تھے، آپ کے درسی افادات، درسی تصنیفات اور غیر درسی کتب گلستانِ علم وفن کے وہ شگفتہ پھول ہیں جن کی خوشبو اور عطر بیزی اہل علم اور وابستگانِ دیوبند کے قلب وذہن کو معطر کرتی رہے گی اور اس آفتاب کی کرنیں چھن چھن کر علمی درس گاہوں کے بام ودر کو روشن کرتی رہیں گی۔

حضرت الاستاذ کے بیان وخطابت، زورِ خطابت اور اندازِ خطابت کے سامعین کی تعداد بے شمار ہے، سب گواہی دیں گے کہ اللہ تعالی نے آپ کو بیان وخطابت کا البیلا اور دل کو چھو لینے والا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ لہجہ کی ملاحت، گفتگو کی فصاحت وبلاغت، اشاروں کا منفرد انداز، محاوروں اور اکابر کے واقعات کی آمیزش، آسان اور عام فہم اندازِ تفہیم اور خالص علمی اور درسی انداز اور اسی جیسی وہ تمام خوبیاں آپ کے بیان وخطاب کا حصہ تھیں جن کی وجہ سے افادہ واستفادہ عام اور تام ہوتا ہے اور اس کا فیضان دیرپا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تقریر اور آپ کا بیان مجلس کا خلاصہ اور متعلقہ عنوان کا لب لباب ہوتا تھا۔ اصلاحی مجلس ہو یا عوامی جلسہ، افتتاح واختتامِ بخاری کا

اجلاس ہو یا فقہی اجتماعات: میں اپنے تیرہ چودہ سالہ مشاہدے کی بنیاد پر یہ دعوی کرسکتا ہوں کہ ہر جگہ اور ہر موقع پر پورا مجمع، گوش برآواز' کی مثال ہوتا تھا۔ مفتی صاحب کی بہت ساری وہ تقریریں جو آن رکارڈ ہیں اور بہت سے وہ خطبات جو طبع ہو چکے ہیں یقیناوہ سب پچھلوں کے لیے نشانِ منزل کا کام دیں گے۔

حضرت الاستاذ کی زندگی کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر محیط تحریر کے لیے تو 'سوانح حیات' کا انتظار کرنا مناسب ہے، یہاں گنتی کے چند صفحات میں بلا کسی خاص ترتیب کے راقم الحروف اپنے تیرہ سالہ تعلقات ومشاہدات کی یادوں کو قلم وقرطاس کے ذریعہ سمیٹنا چاہتا ہے، بالخصوص ایسے واقعات وملفوظات قلم بند کرنے کو جی چاہتا ہے جو راقم الحروف کی زندگی پر بہت اثر انداز ہوئے ہیں۔

حضرت الاستاذ کی مقبولیت کا راز:

اکابرِ دیو بند بقول مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہ: خیر القرون کی یادگار تھے، سلف صالحین کا نمونہ تھے، اسلامی مزاج ومذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ (ماہنامہ دار العلوم، شمارہ ۹، ۱۰ جلد ۹۴، رمضان، ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ مطابق ستمبر اکتوبر ۲۰۱۰ء) حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی، فقیہ النفس حضرت گنگوہی، حکیم الامت حضرت تھانوی اور حضرت سہارن پوری رحمہم اللہ وغیرہ اسی تصویر کے تابندہ نقوش اور آسمانِ علم نبوت کے آفتاب وماہتاب تھے، ان کا ذوق ومزاج، تدین، سلامتیٔ فکر، دینی تصلب اور رسوخ فی العلم وہ معیارات وخصوصیات ہیں جن پر قائم رہنا اعتدال اور دیو بندیت کہلاتا ہے۔ اور انھی خصوصیات سے اتصاف کی بنیاد پر اکابر دیو بند کو وہ مقام ومرتبہ حاصل ہوا کہ آج جس کی طرف ادنی انتساب پر بھی ہم لوگ فخر کرتے ہیں۔ اسی لیے علم وفضل کے ساتھ تواضع وبے نفسی اکابرِ دیو بند کی شان ہے۔ مفتی تقی عثمانی زید مجدہ لکھتے ہیں:

اگر صرف وسعتِ مطالعہ، قوتِ استعداد اور کثرتِ معلومات کا نام علم ہو تو یہ صفت آج بھی ایسی کم یاب نہیں، لیکن اکابرِ دیو بند کی خصوصیت یہ ہے کہ علم وفضل کے سمندر سینے میں جذب کر لینے کے باوجود ان کی تواضع، فنائیت

اور للہیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ محاورہ زبان زدِ عام ہے کہ 'پھلوں سے لدی ہوئی شاخ ہمیشہ جھکتی ہے' لیکن ہمارے زمانے میں اس محاورے کا عملی مظاہرہ جتنا اکابرِ دیوبند کی زندگی میں نظر آتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ (ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ ۹، ۱۰ جلد ۹۴، رمضان، ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ مطابق ستمبر اکتوبر ۲۰۱۰ء)

اوپر جس علم وفضل اور تواضع وفنائیت کی بات لکھی گئی ہے، یہی درحقیقت ہر انسان کی مقبولیت کا سبب اور دنیا وآخرت میں سرمایۂ افتخار ہے۔ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری نور اللہ مرقدہ کی شہرت ومقبولیت کا بنیادی اور سب سے بڑا اسبب صرف ان کی تدریس وتصنیف نہیں ہے، بلکہ اکابرِ دیوبند کے علم وفضل اور تواضع وفنائیت سے خود کو متصف کرنا سب سے بڑا سبب ہے۔ حضرت مفتی صاحب کو اکابرِ دیوبند اور ان کے علوم ومعارف سے حد درجہ لگاؤ تھا، آپ اکابرِ دیوبند کے علوم کے ناقل وشارح اور ان کی تواضع وللہیت کا عکس جمیل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیت ودیوبندیت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ باطل فرقوں اور ان کے گمراہ افکار ونظریات پر رد مفتی صاحب کا خصوصی مشغلہ تھا، آپ توسع کے نام پر فقہِ حنفی سے خروج یا فقہی جزئیات میں لچک، فکرِ دیوبند میں التباس اور عملِ متوارث کی خلاف ورزیوں سے حد درجہ دور اور نفور تھے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہنا بے محل نہیں ہوگا کہ آج بھی فضلائے دارالعلوم کی شہرت ومقبولیت کا راز انھی اوصاف وخصوصیات سے اتصاف میں مضمر ہے، کم از کم مفتی صاحب کی زندگی سے یہ سبق حاصل کر لینا چاہیے۔ فتاوی دارالعلوم دیوبند، باقیات فتاوی رشیدیہ، الفتاوی جلد اول پر حواشی ونظر ثانی، علاوہ ازیں حضرت نانوتوی کی متعدد کتابوں کی تسہیل وترتیب، مفتی صاحب کی اکابر دیوبند کے علوم ومعارف سے گہری وابستگی کی واضح مثالیں ہیں۔

احسان وشفقت کے چند نقوش:

استاذ وشاگرد کے مقدس رشتہ میں استاذ ہمیشہ محسن اور شفیق ہوتا ہے، اس لیے کسی استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ وادب تہ کرنا درحقیقت استاذ کو اپنا محسن تسلیم کر لینا ہوتا ہے۔ چوں کہ حضرت الاستاذ سے راقم الحروف کو ترمذی جلد

اول، علل ترمذی، طحاوی کتاب الطہارہ اور بخاری جلد اول کا ایک سبق پڑھنے کی سعادت ملی ہے، اس لیے حضرت الاستاذ میرے محسن بھی ہیں۔ محسن استاذ کے احسان وشفقت کے چند نقوش اور یادوں کو قیدِ تحریر میں لانا احسان شناسی کا تقاضا معلوم ہوتا ہے۔

(الف) جب دار العلوم میں میری معین مدرسی (۲۰۱۰ء) کی مدت پوری ہونے والی تھی تو کسی مدرسہ میں بغرضِ تدریس ملازمت کی فکر دامن گیر ہوئی، بعض اساتذہ نے حضرت مفتی صاحب سے ملاقات کا مشورہ دیا، چوں کہ طالب علمی اور معین مدرسی کے دوران مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری برائے نام تھی؛ اس لیے ملاقات اور اظہارِ مدعا میں خوف آمیز تردد محسوس ہوا، لیکن ہمت کر کے حاضرِ خدمت ہوا۔ میں نے سببِ ورود اور شانِ نزول کے طور پر ایک مدرسہ کی نشان دہی کی، چوں کہ مفتی صاحب اس مدرسہ کے سرپرست تھے، اس لیے کہا: میں بات کر کے تمھیں بتاؤں گا۔ دوسرے دن حاضرِ خدمت ہوا تو فرمایا: اگر تم نے دار الافتاء کیا ہے تو مدرسہ میں جا کر بات کرلو، میں نے تمھارا تذکرہ کر دیا ہے۔ اور آنے جانے کا کرایہ مدرسہ کے ذمہ ہوگا۔ مفتی صاحب کے مشفقانہ برتاؤ نے میرے اندر جرأت پیدا کی، چناں چہ میں نے کہا: حضرت ایک بار میرے سامنے فون پر گفتگو ہو جائے تو مناسب ہوتا۔ چوں کہ مفتی صاحب کے مزاج میں صراحت اور حق گوئی کے ساتھ شفقت ومحبت تھی، غالباً اس لیے فرمایا: بھائی! میں تمھارے اخلاق سے بہت زیادہ واقف نہیں ہوں، بایں وجہ اس معاملہ میں زیادہ گفتگو نہیں کر سکتا۔ میری زبان سے غیر اختیاری طور پر یہ جملہ نکل گیا کہ حضرت! آپ کی تصدیق اور انٹرویو کے بعد ہی میں دار العلوم میں تدریب المعلمین کے لیے منتخب ہوا ہوں۔ مجھے لگا مفتی صاحب اِس گستاخی پر ناراض ہو جائیں گے، لیکن شفقت اور خندہ پیشانی کے ساتھ کہا: ٹھیک ہے، میری مدرسہ کے صدر مدرس سے بات کراؤ۔ مفتی صاحب نے میرے سامنے ذمہ دارِ مدرسہ سے کہا: مولانا تبریز صاحب آئے ہوئے ہیں، آپ ان کا تقرر کر سکتے ہیں، یہ بھی اچھا کام کریں گے۔ اس کے بعد مجھ سے کہا: جاؤ اور میری نصیحت یاد رکھو: جو بھی کتاب دیں کہنا پڑھا دوں گا،

تواضع مت کرنا۔

اس واقعہ کے بعد حضرت الاستاذ کے تئیں عقیدت ومحبت میں نہ صرف یہ کہ اضافہ ہوا، بلکہ تعلقات کی راہیں ہموار ہوئیں، ایسا اس لیے نہیں کہ میرا کام بن گیا، بلکہ اس لیے کہ اس پورے واقعہ کے آئینہ میں مفتی صاحب کی صاف ستھری باطنی تصویر، بے داغ سراپا اور کسی عام طالب علم کے تئیں آپ کی محبت وشفقت کا عکس جمیل دکھائی دے رہا تھا۔

(ب) ۱۵/شوال ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۹/جون ۲۰۱۹ء یعنی حضرت الاستاذ کی وفات سے دس ماہ پہلے کی بات ہے، راقم مجلس میں حاضر ہوا، اور پیچھے جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد جب مجھ پر مفتی صاحب کی نظر پڑی تو حسبِ عادت اپنے قریب بیٹھایا اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ قبیل مغرب میں نے اجازت چاہی تو فرمایا: بعد مغرب تھوڑی دیر کے لیے آنا۔ بعد نمازِ مغرب حاضر ہوا تو پانچ ہزار روپے بہ طور ہدیہ عنایت فرمائے۔ دل باغ باغ ہوگیا، اس لیے نہیں کہ روپے ملے ہیں، بلکہ خوشی کا اصل سبب یہ تھا کہ مفتی صاحب نے اپنے پاس سے اور اپنے ہاتھوں سے دیے ہیں۔ میری زبان سے بے ساختہ کچھ دعائیہ جملے نکلے، جس پر مفتی صاحب نے بس اتنا کہا: جاؤ محنت سے پڑھاؤ۔ یہ مفتی صاحب سے میری آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ ہر چند کہ ممبئی میں بغرضِ علاج قیام کے دوران مفتی صاحب سے بذریعہ فون بات ہوئی، لیکن ملاقات کا موقع نہ مل سکا اور آہ! آئندہ ممکن بھی نہیں ہے۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

حضرت الاستاذ کے علمی اور مادی احسانات اور شفقت کا معاملہ صرف میرے ساتھ ہی نہیں تھا، بلکہ ایسے بہتیرے طلبہ، اساتذہ اور دیگر افراد ہیں جن پر مفتی صاحب کے احسان وشفقت کا سایہ رہا۔

رسوخ فی العلم کا مشاہدہ:

۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء میں دار العلوم کے شعبۂ تدریب المعلمین (معین مدرسی) کے لیے جب میری درخواست منظور ہوئی تو مجھے دفترِ اہتمام میں بغرضِ انٹرویو بلایا گیا، جہاں مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی زید مجدہ، مولانا ایوب صاحب زید مجدہ کے ساتھ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب نور اللہ مرقدہ تشریف فرما تھے۔ چوں کہ میرے لیے یہ پہلا موقع تھا جب میں مفتی صاحب کے بالکل سامنے اور بہت قریب تھا، مذکورہ اساتذہ کے ساتھ مفتی صاحب کی موجودگی اور علمی رعب میں اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا، جس کے اثرات چہرے پر بھی رہے ہوں گے۔ میری درخواست اور تعلیمی رکارڈ مفتی صاحب کے ہاتھ میں تھا، مفتی صاحب نے دونوں بزرگوں سے کہا: ان کی تکمیلِ افتاء میں اول پوزیشن ہے، مفتی صاحب کے اس جملہ میں مجھے کچھ ایسی حوصلہ افزائی محسوس ہوئی کہ دل سے خوف کا احساس جاتا رہا اور مفتی صاحب کے سوالات کی جواب دہی آسان ہوئی۔

اس واقعہ کے گیارہ سال بعد یعنی ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۰۱۹ء میں راقم الحروف نے دار العلوم میں جب ثانویہ کی تدریس کے لیے درخواست دی تو منظوری کے بعد بغرضِ انٹرویو دار العلوم کے مہمان خانہ میں حاضر ہوا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کشمیری اور مفتی اسماعیل صاحب مالیگاؤں (اراکین شوری) کے ساتھ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب نور اللہ مرقدہ بھی تشریف فرما تھے۔ میرے اندر آتے ہی مفتی صاحب نے کہا: دیکھو بھائی! گھٹنوں میں تکلیف کی وجہ سے ہم لوگ صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں، سامنے بھی صوفہ ہے، اگر تم چاہو تو ہماری طرح صوفہ پر بیٹھ جاؤ، لیکن میری قوتِ سماعت چوں کہ کمزور ہوگئی ہے؛ اس لیے میرے پاس نیچے بیٹھنا چاہو تو نیچے بیٹھ جاؤ۔ یہ مفتی صاحب کی تواضع تھی، ورنہ نیچے بیٹھنے کا حکم دینا مفتی صاحب کا حق تھا اور میری ذمہ داری تھی کہ میں نیچے بیٹھ جاؤں۔

میں نے مذکورِ بالا دونوں انٹرویو اِس لیے ذکر کیے تا کہ مفتی صاحب کے علمی رسوخ اور اعلیٰ صلاحیت کا ایک

نقشہ پیش کیا جاسکے۔ اول الذکر انٹرویو کے وقت مفتی صاحب ترمذی، طحاوی اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھایا کرتے تھے اور ثانی الذکر انٹرویو کے موقع پر صحیح بخاری زیرِ درس تھی۔ علم بیزاری کے عمومی ماحول میں دیکھا اور سوچا جائے تو ترمذی و بخاری کے استاذ کو عربی اول تا چہارم یعنی ثانویہ کی کتابوں کا استحضار عموماً نہیں ہوتا؛ کیوں کہ وہ زیرِ مطالعہ نہیں ہوتیں اور نہ ہی فرصت وضرورت ہوتی ہے کہ شیخ الحدیث ثانویہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے۔ لیکن مفتی صاحب اِس حوالہ سے بالکل منفرد اور یکتائے زمانہ واقع ہوئے تھے، میں اپنے اِن انٹرویوز کی وجہ سے یہ دعوی کر سکتا ہوں کہ آپ رسمی علم نہیں، بلکہ حقیقتِ علم کے مالک تھے۔ ہر فن کی کتابیں آخری عمر میں بھی ازبر تھیں، ابتدائی کتب کی استعداد ہی نہیں، بلکہ ان کتابوں کا استحضار ایسا تھا جیسے ان کتابوں کے اصل مصنف اور شارح خود آپ ہیں، چناں چہ دورانِ انٹرویو غلطی پر مفتی صاحب نہ صرف یہ کہ روکتے اور ٹوکتے، بلکہ ثانی الذکر انٹرویو کے موقع پر متعلقہ عبارت کی مکمل تشریح بیان کر دیتے تھے، تاکہ امیدوار کو اپنی غلطی معلوم ہو جائے، اور اس لیے بھی تاکہ دوسرے ممتحن حضرات کے سامنے صورتِ مسئلہ خوب واضح ہو جائے۔ میرا احساس ہے کہ مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے لیے اعلی معیار کا مدرس چاہتے تھے، تاکہ دارالعلوم کا علمی مقام برقرار رہے۔ غالباً اسی لیے فارسی اور منطق کی استعداد، استحضار اور عبارت فہمی مفتی صاحب کے نزدیک انتخاب کی بنیاد تھی؛ چناں چہ دورانِ انٹرویو کہنے لگے: آج کل کے فضلاء کتابیں لکھ لیتے ہیں، علیا درجہ کی کتابیں پڑھا لیتے ہیں، لیکن ابتدائی کتب کی استعداد ناقص اور کمزور رہتی ہے۔ مفتی صاحب کے اس طرزِ عمل سے بعض فضلاء کو اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن چوں کہ یہ سب دارالعلوم دیوبند کے مفاد کے پیشِ نظر تھا، اس لیے مفتی صاحب اِس حوالہ سے نہ صرف یہ کہ معذور ہیں، بلکہ عنداللہ ماجور بھی ہوں گے۔

مفتی صاحب سے کبھی سنا تھا کہ میرے استاذ علامہ ابراہیم بلیاویؒ (م: ۱۹۶۷ء) دارالعلوم دیوبند میں 'استاذ کرسی' کی حیثیت رکھتے تھے، اب وہ کرسی خالی ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ 'استاذ کرسی' کی تعبیر مفتی صاحب پر بھی فٹ

بیٹھتی ہے۔ استاذ کرسی کا مطلب مفتی صاحب یہ بیان کرتے تھے: ایسا استاذ جس کی طرف مشکل مسائل میں رجوع ہوا جائے اور وہ ہر علمی گتھی سلجھا سکتا ہو۔

مصنف ساز شخصیت کی کچھ یادیں:

مصنف ومؤلف ہونا بلاشبہ مفتی صاحب کی کتابِ زندگی کا ایک اہم باب ہے، لیکن آپ کا مصنف ساز ہونا اس باب کا اہم عنوان ہے۔ اسی لیے فضلائے دارالعلوم کو ہمیشہ تصنیف وتالیف کی جانب متوجہ فرماتے تھے، کتاب خواہ کیسی بھی ہو، صاحبِ کتاب کی حوصلہ افزائی سے دریغ نہیں کرتے تھے، بلکہ مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔ جس مجلس میں کتاب پیش کی جاتی تھی سرسری طور پر پوری کتاب دیکھ لیتے تھے، بعض دفعہ موضوع کی تعیین کے ساتھ متعلقہ موضوع پر لکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ طلبہ اور فضلاء کے تئیں آپ کا یہ طرزِ عمل دوررس نتائج اور مفید اثرات کا حامل ثابت ہوا؛ چناں چہ بلاواسطہ یا بالواسطہ متعدد فضلاء اور طلبہ نے آپ کی تحریک یا رہبری کی وجہ سے قلم پکڑنا سیکھا اور قلم وقرطاس کے میدان میں اپنی ایک شناخت قائم کی۔ بلاشبہ یہ مفتی صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

راقم الحروف کو تدریسی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد کچھ لکھنے کی خواہش ہوتی تھی، لیکن نااہلی اور تن آسانی کی وجہ سے امروز فردا کی کیفیت رہتی تھی۔ ۱۸ر شوال ۱۴۳۴ھ کی بات ہے، میں مفتی صاحب کی مجلس میں حاضر تھا، مفتی صاحب نے مجھ سے یا کسی اور سے کہا: مدرسہ کو صرف معیشت کا ذریعہ نہ بناؤ، بلکہ علم میں ترقی کا ذریعہ بنانا چاہیے، اگر مدرسہ میں رہ کر علم میں کمال پیدا نہیں ہوا تو خسر الدنیا والآخرۃ، پیسے تو مدارس کے باہر بھی کما سکتے ہو، بلکہ یہاں سے زیادہ کما سکتے ہو، مدارس میں رہنے کا مقصد علمی ترقیات ہے۔ اللہ کی شان دیکھیے، مفتی صاحب کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی، چوں کہ تصنیف وتالیف بھی علمی ترقی کا ایک زینہ ہے؛ اس لیے میں نے کچھ لکھنے اور مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کا عزم کرلیا۔ میری کتاب 'اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ' (صفحات: ۵۰۲) کی

تکمیل درحقیقت مفتی صاحب کی تحریک کا ہی نتیجہ ہے۔

عجیب اتفاق اور خوش گوار لمحہ اس وقت سامنے آیا جب میں نے اپنی کتاب مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کی تو اسی مجلس میں پوری کتاب پر سرسری نگاہ ڈالی، اظہارِ خوشی کے ساتھ دعاؤں سے نوازا اور حوصلہ افزائی کے طور پر ایک ہزار روپے یہ کہتے ہوئے مجھے دیے: یہ تمھارا انعام ہے۔ مفتی صاحب کے متعلقین جانتے ہیں کہ مفتی صاحب کا کسی کے بارے میں زبانی طور پر حوصلہ افزا کلمات کہہ دینا بہت بڑی بات تھی، کسی نو آموز مؤلف کی تالیف پر مفتی صاحب کا نقد انعام دینا نہ صرف یہ کہ مؤلف کے لیے سرمایہ افتخار ہے، بلکہ مفتی صاحب کی اعلی ظرفی، بلند حوصلگی اور دریا دلی کا غماز بھی ہے۔ میری مذکورہ کتاب کے اخیر میں 'مؤلف کے کوائف' کے زیرِ عنوان میرا مختصر تعارف بھی شامل ہے، جب مفتی صاحب کی اس پر نظر پڑی تو فرمایا: یہ نئے زمانے کے لوگوں کا انداز ہے، ہمارے اکابر اسے پسند نہیں کرتے ہیں، دیکھو خاک ہونے سے پہلے خود کو خاک بنانے کی کوشش کرنی چاہیے (خاک شو پیش از آنکہ خاک شوی)۔ مطلب یہ تھا کہ شہرت اور ناموری کے لیے بقلم خود اس طرح کی حرکت کرنا غیر مناسب ہے۔ پھر فرمایا: کتابیں اپنی ذمہ داری پر لکھا کرو، تقریظ کے چکر میں نہیں رہنا چاہیے۔

جب میری دوسری اور تیسری کتاب منظرِ عام پر آئی تو مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی، حسبِ عادت پوری کتاب دیکھی اور پہلی کتاب 'موجودہ دور کے اندھیرے اور دعائے نبوی کی روشنی' کے بارے میں فرمایا: کتاب کا نام چھوٹا رکھنا چاہیے تھا؛ 'دعائیں اور حکمتیں' موزوں تھا۔ حوصلہ افزائی کے طور پر کہا: تمھارا قلم رواں ہے، لکھا کرو۔ دوسری کتاب 'نمازِ تراویح کی اہمیت اور چند قابلِ اصلاح پہلو' دیکھ کر ارشاد فرمایا: جلسۂ تعزیت کے موضوع پر لکھو۔ مفتی صاحب تو دارِ بقاء کو کوچ کر گئے، لیکن قلم و قرطاس جب بھی ہم آغوش ہوں گے ان کی یاد آتی رہے گی؛ کیوں کہ قلم ہوگا، قرطاس ہوگا، کتاب ہوگی، مجلس بھی ہوگی، لیکن میرِ مجلس نہ ہوگا، میرِ مجلس نہ ہوگا تو سب کچھ ہو کر بھی کیا ہوگا؟

اِس موقع پر مفتی صاحب کی متعدد مجلسوں کی کچھ امانتوں کا حوالۂ قرطاس کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ایک موقع پر مجھ سے دورانِ گفتگو کہا: قلم مت رکھو، لکھتے رہو، ایک محقق نے کہا تھا: سو کتابیں آتی ہیں تو ایک پڑھنے کے قابل ہوتی ہے، باقی کتابیں بے کار ہوتی ہیں۔لیکن کمیت میں گیہوں کے دانوں کے ساتھ گھاس پھوس بھی ہوتی ہے، وہ دانے اس کے بغیر پیدا نہیں ہوتے، اس لیے لکھتے رہنا چاہیے، تاکہ کوئی ایک کتاب بھی اچھی آسکے۔اگر کتاب کی اشاعت کے اسباب نہ ہوں تب بھی لکھتے رہو۔راندیر گجرات میں میں نے کئی کتابیں لکھیں، لکھ کر بکس میں بند کردیتا تھا، جب دیوبند آیا تو وہ سب شائع ہوئیں۔

• ۱۴۳۰ھ کے انعامی جلسہ میں جہاں ایک طرف طلبہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ انھیں مطالعہ اور تکرار کی پابندی کرنی چاہیے، وہیں اساتذہ کرام سے کہا: اساتذہ فن دیکھ کر پڑھائیں، اس کے ساتھ تجمیع اور استنتاج کرتے رہیں، یعنی فن سے متعلق باتیں جمع کریں اور ان سے نئی باتیں اخذ کریں اور تصنیف کی لائن میں قدم رکھیں۔

تصنیف وتالیف کے لیے اپنی ذاتی لائبریری میں کتابوں کا ذخیرہ ہونا بہت ضروری ہے، مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس وہ تمام کتابیں موجود ہیں جو تصنیف وتالیف کے لیے امہات کتب اور مآخذ ومصادر کی حیثیت رکھتی ہیں۔غلبۂ مادیت کے ساتھ علم بیزاری کے اِس دور میں مفتی صاحب کا یہ واقعہ درسِ عبرت اور باعثِ تقلید ہے۔فرمایا: دورانِ طالب علمی گھر سے جو گھی لاتا تھا، اسے خود استعمال کرنے کے بجائے ایک کلو، چودہ روپے میں بیچ کر کتابیں خریدتا تھا۔

تصنیف وتالیف کے لیے جہاں کتب بینی اور مطالعہ بے حد ضروری ہے وہیں حاصلِ مطالعہ کو محفوظ رکھنا بھی ناگزیر ہوتا ہے، مفتی صاحب اِس حوالے سے بھی مثالی تھے، بلکہ آپ درسِ نظامی کے متون حفظ کرنے کے قائل تھے، اسی لیے آپ نے کئی متون کی شرح لکھی اور اپنے متعلقین کو متون حفظ کرائے بھی۔ایک مجلس میں استاذِ محترم مولانا محمد نسیم صاحب بارہ بنکوی استاذ ادب دار العلوم دیوبند سے فرمایا: جب میں نے مدرسی شروع کی تھی تو درسی

مطالعہ کے علاوہ روزانہ پانچ سو صفحات کا خارجی مطالعہ کیا کرتا تھا۔ ایک موقع پر فرمایا: کتابیں دو طرح سے پڑھی جاتی ہیں: بالاجمال، یعنی فہرست دیکھی جائے اور جو ضروری معلوم ہو اسے پڑھ لیا جائے، دوسرا طریقہ ہے بالتفصیل پوری کتاب پڑھی جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شعبہ اور فریضہ نہایت اہمیت وافادیت کا حامل ہے؛ اسی لیے ہر فرد کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی بساط بھر مسلم معاشرہ میں رائج برائیوں کی نشان دہی کرے، اس پر روک ٹوک کرے، مردہ سنتوں کو زندہ کرنے اور کرانے کی کوشش کرے اور اسلام کی جملہ تعلیمات کو اس کی صحیح صورت کے ساتھ عام کرنے کی دعوت دے۔ مفتی صاحب کی زندگی اِس حوالہ سے بھی بہت نمایاں تھی۔ سفر ہو یا حضر جہاں بھی موقع ملتا تھا اِس فریضہ کی ادائیگی کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔

بہ وقتِ ملاقات مصافحہ کرتے ہوئے اگر کسی نے مغفرت کی دعا **یغفر اللّٰہ لنا و لکم** نہیں پڑھی تو فوراً تنبیہ فرمایا کرتے تھے، بلکہ ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے: لوگوں کے مصافحے بے دعا ہو کر رہ گئے ہیں، لوگوں میں مصافحہ کی دعا کے سلسلے میں بہت غفلت پائی جاتی ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ یہ سنت زندہ کریں۔ ایک مجلس میں مزاحاً فرمایا: اب لوگ مصافحہ کی دعا پڑھنے کے بجائے کہتے ہیں: دعا کی درخواست ہے۔ پھر ترقی ہوئی اور خصوصی دعا کا چلن ہوا اور اب 'اخص الخواص دعا میں یاد رکھیں' کا رواج ہے۔ ایک مجلس میں راقم الحروف نے سلام و مصافحہ سے پہلے ہی دعا کی درخواست کی تو مفتی صاحب نے کہا: دعا ادھار مت رکھو، نقد دعا لو، **یغفر اللّٰہ لنا و لکم** کہو، میں بھی دعا دوں گا۔ اگر چہ **یغفر اللّٰہ لنا و لکم** کے الفاظ کے ساتھ کوئی حدیث وارد نہیں ہے؛ لیکن بہ وقتِ مصافحہ مطلقاً مغفرت کی دعا کرنا ثابت ہے؛ اس لیے مفتی صاحب اِس حوالہ سے بہت فکر مندی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ تحفۃ الالمعی اور رحمۃ اللہ الواسعۃ میں بھی اِس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ میں خود بہ وقتِ مصافحہ

بآوازِ بلند یغفر اللہ لنا ولکم پڑھنے کا عادی نہیں تھا؛ لیکن مفتی صاحب کی متعدد مجلسوں میں ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ عادی بن گیا، بلکہ اپنی کتاب 'اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ' میں اس پر بالتفصیل گفتگو کی ہے۔ **الدال علی الخیر کفاعله** کے بموجب ان شاء اللہ مفتی صاحب ماجور ہوتے رہیں گے۔

ایک صاحب کے بچے دار العلوم کے شعبۂ حفظ میں زیرِ تعلیم تھے، وہ صاحب مفتی صاحب سے ملنے آئے تھے، ان کے چہرے سے داڑھی صاف تھی، مفتی صاحب نے نکیر فرماتے ہوئے کہا: لڑکے کو علمِ دین سکھا رہے ہو اور خود بے دین ہو۔ یاد رکھو، لڑکا ڈنڈے کھا کر حافظ بنے اور والد بے دینی کے ساتھ تاج کا خواہاں ہو، یہ ممکن نہیں۔ اگر والدین دیندار نہیں ہوں گے تو اولاد پر اسلامی رنگ کیسے چڑھے گا۔ میرا یہ احساس ہے کہ مفتی صاحب اِس کے روادار نہیں تھے کہ اکرامِ ضیف کی آڑ میں ملاقاتیوں کی بے دینی پر نکیر نہ کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جو طلبہ یا نو واردِ مفتی صاحب کی مجلس میں بے لوثی کے ساتھ حاضر ہوتے تھے ان کی اصلاح ہوتی رہتی تھی؛ کیوں کہ اصلاح کے لیے صلاح اور اخلاص ضروری ہے اور مفتی صاحب میں یہ دونوں جوہر موجود تھے، اور جو بے مقصد یا مفاد پرستی کے جذبہ سے شریکِ مجلس ہوتے تھے وہ خالی دامن لوٹتے تھے یا مجلس کو الوداع کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ناخوش گوار ماحول میں نصیحت کا اثر:

غالباً جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ کی بات ہے، یہ وہ سال ہے جس میں جمعیت کا اختلاف برائے صدارت عروج پر تھا، دار العلوم کے احاطہ میں بھی اس کے اثرات اور اس کی بازگشت دکھائی اور سنائی دیتی تھی۔ ایک شب دار العلوم میں کچھ شر پسند عناصر نے ایسا انتشار پھیلایا کہ اس نے بہت سارے طلبہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس بھیڑ نے دفترِ اہتمام میں توڑ پھوڑ کی اور کچھ کاغذات بھی جلا دیے۔ تقریباً ڈھائی بجے رات مفتی سعید احمد صاحب، مولانا ریاست علی صاحبؒ (م: ۲۰۱۷ء) وغیرہ تشریف لائے، دار الحدیث میں طلبہ کو جمع کیا گیا۔ طلبہ کے درمیان مفتی صاحب کی مقبولیت کچھ ایسی تھی کہ مفتی صاحب کی مختصر تقریر سے حالات قابو میں آ گئے۔ مفتی صاحب نے کہا:

جمیعت کی لڑائی کو دارالعلوم سے مت جوڑو، تم پڑھنے آئے ہو پڑھو۔ دارالعلوم کی املاک، قوم وملت کی املاک ہیں، آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ انھیں نقصان پہنچائیں، آپ کو اگر اشخاص سے شکایت ہے تو اشیاء کو نقصان کیوں پہنچاتے ہو؟ چناں چہ سارے طلبہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، اور ایک بہت بڑا فتنہ ختم ہو گیا۔

پان کھانے میں اپنے استاذ کی تقلید:

مفتی صاحب کو پان کھانے کی عادت تھی، پاندان، ناگردان اور اگلدان آپ کی نشست گاہ کے قریب ہی رکھے رہتے تھے، اکثر خود ہی پان کے بیڑے اور گلوریاں تیار کرتے تھے، دورانِ سفر بھی اس کا اہتمام تھا، دورانِ سفر پان سے افطار کا واقعہ بھی سنایا کرتے تھے۔ سبق پڑھانے آتے تھے تو پان ضرور کھاتے تھے، لیکن احاطہ مولسری میں پہنچ کر کنویں والے ہینڈ پائپ پر پان تھوک کر کے دارالحدیث میں تشریف لاتے تھے۔ ایک مجلس میں مفتی صاحب کو پان کھاتا ہوا دیکھ کر میں نے پوچھا: پان کھانے میں طلبہ کو اپنے استاذ کی تقلید کرنی چاہیے یا نہیں؟ فرمایا: تقلیدِ لغوی جائز ہے، شرعی ناجائز ہے؛ کیوں کہ شرعی تقلید صرف شرعیات میں ہوتی ہے۔ آہ اب ایسی علمی مجلسیں کیوں کر نصیب ہوں گی؟

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا؟

حضرت الاستاذ کی قیمتی باتیں:

۱۔ ایک مجلس میں میں نے کہا: حضرت میں نے آپ سے طحاوی کا سبق پڑھا ہے، اب میں طحاوی پڑھا رہا ہوں، آپ اس کی اجازت دیں گے؟ کہنے لگے: یہ سب برکت کے لیے ہے۔ سندیں سب لکھی ہوئی ہیں، تاہم تین شرطوں کے

ساتھ میری طرف سے اجازت رہتی ہے: روایت کرنے والا اہل السنۃ ہو، حدیث سمجھتا ہو اور تثبت کے

ساتھ بیان کرتا ہو۔

۲۔ ایک بار فرمایا: جب میں مدرس ہو کر راندیر گجرات جا رہا تھا تو میرے استاذ علامہ ابراہیم بلیاوی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے تین نصیحتیں کی تھیں: (الف) فن دیکھ کر پڑھائیو، علم آئے گا۔ (ب) سنت کی پیروی کیجیو، عندالناس مقبولیت نصیب ہوگی۔ (ج) شاگردوں کو اولاد سمجھیو۔

۳۔ سفرنمونۂ سقر تو ہے؛ تاہم سفر وسیلۂ ظفر بھی ہے۔

۴۔ مجھ سے پوچھا: 'تبریز' کا معنی کیا ہے؟ میں کہا: ایک نہر کا نام ہے یا پھر بابِ تفعیل کا بگڑا ہوا مصدر ہے۔ مفتی صاحب نے کہا: نہیں، یہ فارسی لفظ ہے، اور سونا (ذھب) کے معنی میں ہے۔

۵۔ میبذی میں الہیات پڑھانے کی چیز ہے، شروع کا حصہ تو فلسفہ کی تردید میں لکھا گیا ہے۔

۶۔ ایک مجلس میں بہ وقتِ رخصت میں نے نصیحت کی درخواست کی تو کہا: میری کتابیں پڑھو۔

۷۔ استاذ شاگرد کے درمیان علمی پردہ حائل رہنا چاہیے۔ استاذ شاگردوں سے بے تکلف رہے، لیکن علم کا رعب باقی رہنا چاہیے۔

۸۔ اگر استاذ فن جانتا ہوگا اور فن دیکھ کر پڑھاتا ہوگا تو طلبہ کو فیض پہنچے گا ورنہ نہیں۔

۹۔ مصباح اللغات اور المعجم الوسیط میں زندہ الفاظ ہیں، اور مردہ الفاظ یعنی جن کا استعمال بند ہوگیا ہے ان کا قبرستان 'تاج العروس' اور 'لسان العرب' ہے۔

۱۰۔ ترمذی کے سبق میں ایک روز فرمایا: دعوت کی تین قسمیں ہیں: کامل دعوت (پیسہ دے دینا)، ہاف دعوت (کھانا گھر بھیج دینا)، دعوت لاشئ (گھر بلا کر کھلایا جائے اور سارے لوگ دیکھیں)۔

ایک عوامی خطاب:

۲۶ رصفر ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۰۰۷ء کو دار العلوم دیوبند کی مسجد رشید میں غلہ اسکیم کا جلسہ منعقد ہوا۔ مفتی

صاحب کا خطاب سننے کے لیے میں بھی حاضر تھا، مفتی صاحب نے سورۃ العصر کی تلاوت فرمائی اور اس کی روشنی میں عوام الناس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: جن میں چار باتیں ہوں وہ تو کام یاب ہیں، بقیہ لوگ بلا شبہ خسارے اور گھاٹے میں ہیں۔ زمانہ کی قسم یہ اس کی دلیل ہے، یعنی انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صرف وہ قومیں پنپ سکی ہیں جن میں ایمان، نیک عمل، حق کی وصیت وتاکید اور مصائب پر صبر اور آلام پر ایک دوسرے کو ہمت دلانا، موجود ہوں۔ انسانی تاریخ حضرت آدم سے شروع ہوتی ہے، ہابیل وقابیل کا واقعہ دیکھیے، ہابیل کو قابیل نے قتل کیا تو وہ گھاٹے میں رہا، حضرت نوح اور ان کی قوم کی تاریخ دیکھیے، ان کی پوری قوم طوفان میں بہہ گئی؛ کیوں کہ ایمان قبول نہیں کیا تھا۔ آگے بڑھو، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے قصہ میں نمرود گھاٹے میں رہا، حضرت موسی علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ دیکھیے، حضرت موسی علیہ السلام کام یاب اور فرعون نامراد ہوا، حضرت عیسی علیہ السلام اور یہودیوں کے قصہ میں یہودیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کو اپنے خیال میں پھانسی دی، لیکن وہی ناکام رہے، بعد میں حضرت عیسی علیہ السلام کا دین عام اور شائع ہوگیا، اور آخر میں حضور علیہ السلام اور قریش کا حال دیکھو، قریش گھاٹے میں رہے۔ الغرض کام یابی انھی چار باتوں میں مضمر ہے۔

ہندوستان اسلامی اعتبار سے دیگر ممالک سے بہتر اسی لیے ہے کہ یہاں مدارس کا نظام ہے، جس سے تواصی بالحق والصبر کا کام ہوتا ہے، اور جب یہ دونوں باتیں ہوں گی تو ایمان وعمل خود وجود میں آئیں گے؛ اس لیے آپ حضرات اپنے محلے میں مکتب قائم کریں، کسی بچے کو بے تعلیم نہ رہنے دیں، دینی ماحول میں دنیا پڑھانے میں کوئی حرج نہیں اور جو جوان وبوڑھے مکتب نہیں جاسکتے وہ جماعت میں نکل کر دین سیکھیں۔

اللہ کی طرف سے بندوں کی آزمائش ہوتی ہے اور 'وإذ ابتلی إبراھیم ربہ' میں 'ربہ' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزمائش تربیت اور ربوبیت کے لیے ہوتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالی نے ابتلاء کے ساتھ 'رب' کا لفظ استعمال کیا ہے، دوسری آیت 'ولنبلونکم بشيء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات' سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ باتوں سے آزمائش ہوتی ہے؛ اس

لیے جب ایسے حالات آئیں تو اس پر صبر کرنا چاہیے، اس کا اجر ملے گا۔

راقم الحروف عرض گزار ہے کہ مفتی صاحب کی عوامی تقریر بھی دل پذیر ہوتی تھی، درسِ حدیث میں تو محدثانہ شان ظاہر ہوتی ہی تھی، تاہم عوامی تقریروں میں مفسرانہ گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کو قرآن فہمی کا عمدہ ذوق عطا کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے تکمیلِ افتاء کے سال قرآن مجید حفظ کیا، شعبہ چمن بندی کا موجودہ دفتر آپ کا کمرہ تھا، دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ عشاء کے بعد اس کمرے کے چبوترے پر بیٹھ کر آپ نے قرآن یاد کیا، آپ کا ماننا تھا کہ قرآن سمجھنے کے لیے حفظِ قرآن ضروری امر ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ بہت ساری آیتوں کی تفسیر دوسری آیتوں سے ہو جاتی ہے، اگر وہ ساری آیتیں پیشِ نظر نہ ہوں تو مفسر عمدہ اور صحیح تفسیر کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔

جن لوگوں نے مفتی صاحب کی تفسیر نہیں سنی ہے انھیں مفتی صاحب کے ذوقِ تفسیر کے لیے 'ہدایت القرآن' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تفسیر ہدایت القرآن مفتی صاحب کے قلم کا آخری شاہ کار ہے، پارہ تیس اور ایک تا نو کی تفسیر مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی صاحب کے قلم سے ہے، بقیہ پاروں کی تفسیر مفتی صاحب نے کی ہے۔ مکمل تفسیر شائع ہو چکی ہے۔ مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے: میں نے پہلے فقہ پڑھا، پھر حدیث پڑھی، اس وجہ سے میرے لیے قرآن سمجھنا آسان ہو گیا۔ گمراہی سے بچنے کے لیے یہی ترتیب مناسب ہے؛ کیوں کہ صرف فقہ پڑھو گے تو جمود کا شکار ہو جاؤ گے اور صرف حدیث پڑھو گے تو غیر مقلد بن جاؤ گے، قرآن کا عالمانہ فہم: فقہ، حدیث اور کلام پڑھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ایک بار اپنا رمضان کا معمول بتایا کہ رمضان میں صرف قرآن مجید پڑھتا اور سمجھتا ہوں، تصنیف و تالیف اور دیگر علمی مصروفیات بند کر دیتا ہوں۔

ہمارا سبق اور ہماری ذمہ داریاں:

اِس فانی دنیا میں جب موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو زندگی دوڑتی ہوئی موت سے لپٹ جاتی ہے؛ اسی لیے

یہاں زندگی سے زیادہ کوئی جی نہیں سکتا اور موت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا۔ مفتی صاحب بھی اِس فانی دنیا میں عارضی طور پر مقیم تھے، اس لیے اپنے وقتِ موعود پر فانی دنیا سے دارِ بقاء کی جانب کوچ کر گئے، لیکن اشاعتِ اسلام، حفاظتِ اسلام اور دفاعِ اسلام کے حوالے سے آپ کی خدمات، آپ کی محنتیں اور آپ کی کوششیں زندہ جاوید ہیں؛ کیوں کہ مفتی صاحب جیسے عبقری اور مثالی شخصیات کی خدمات اور ان کی یادیں اِس دار فانی میں لباسِ بقاء زیبِ تن کر لیتی ہیں، یہ نظامِ قدرت کا حصہ ہے کہ مفتی صاحب جیسے اکابر امت کے کارہائے نمایاں کے فانی جسم میں روحِ بقاء حلول کر جاتی ہے، اسی لیے ایسے لوگ پسِ مرگ زندہ کا مصداق ہوتے ہیں۔ اس لیے جب تک اہلِ علم کی انجمنیں قائم رہیں گی، ان انجمنوں میں مفتی صاحب کا ذکرِ سعید ہوتا رہے گا، ان شاء اللہ۔ مفتی صاحب کی زندگی اپنے شاگردوں اور متعلقین سے یوں مخاطب ہے:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے

آخر میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ (م: ۱۹۸۲ء) کے ایک خط کا حصہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ خط شیخ الحدیث کی طرف سے ۹/شعبان ۱۳۹۸ھ کو مدینہ منورہ سے مفتی تقی عثمانی صاحب کو لکھا گیا ہے۔ یہ خط البلاغ خصوصی اشاعت کراچی میں شائع ہوا ہے۔ حضرت شیخ لکھتے ہیں:

''ایک وہ زمانہ تھا کہ دونوں مدرسوں میں دربان سے لے کر صدر مدرس اور مہتمم تک ہر شخص صاحبِ نسبت ہوتا تھا، آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ امتیازی شئون مٹ رہی ہیں جو اپنے اکابر کا طرۂ امتیاز تھیں۔ اکابر ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں، اور اصاغر ان کی جگہ تو لے رہے ہیں، لیکن علوم واعمال اور اذکار میں ان کے قائم مقام نہیں بن رہے ہیں۔ صرف رسمیہ الفاظ اور شاعرانہ قسم کے مضامین کی بہتات رہ گئی ہے، جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ کماً وکیفاً ختم ہو رہی ہے۔ کسی کی وفات پر ماہناموں کے نمبر نکلنا یہ بھی ایک فیشن سا ہو گیا ہے،

نمبر نکال دینے سے مرنے والے کا حق ادا نہیں ہو جاتا، جانے والے نے جو شریعت اور طریقت کی خدمت انجام دی اس کو آگے بڑھانا اور اس مزاج کے آدمی پیدا کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔“

جنھیں مفتی صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تدریسی، تصنیفی اور علمی وعملی زندگی میں مفتی صاحب کے چھوڑے ہوئے انمٹ نقوش کو سرمۂ چشم بنائیں اور ان کے مشن کو آگے بڑھائیں، یہی مفتی صاحب کی روح کی تسکین کا صحیح سامان ہوگا۔ مفتی صاحب کی زندگی کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج ومذاق، افادات وخطبات، ارشادات وملفوظات اور علمی وعملی خدمات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے، چناں چہ کتابی شکل میں ساری چیزیں موجود ہیں؛ اس لیے ان سے استفادہ اور ان سے حصولِ روشنی اپنے لیے بھی آسان ہے اور اگلی نسلوں کے لیے بھی سہل ہے۔

نہیں ہے پیرِ مے خانہ، مگر فیضان باقی ہے
ابھی تک مے کدہ سے بوئے عرفانی نہیں جاتی

❁...❁...❁

آسمان علم کا نیر تاباں غروب ہوگیا

مولانا مفتی محمد عفان منصور پوری صاحب
مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ

مشفق استاذ محترم، مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز شیخ الحدیث وصدر المدرسین، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ دنیائے فانی کو الوداع کہکر اپنے مزاج کے مطابق شان بے نیازی کے ساتھ جوار رحمت الٰہی میں پہنچ چکے ہیں، تاریخ تھی ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بوقت چاشت بروز منگل، یہ اتفاق نہیں بلکہ نظام قدرت ہے کہ سعید روح کے پرواز ہونے کے لئے مالک دوجہاں نے اس ماہ مبارک "رمضان" کے آخری عشرے کے لمحات کا انتخاب کیا ہوا تھا، جس میں آخری سانس لینا اہل ایمان کے لئے اعلی درجہ کی سعادت وخوش بختی اور علامت قبولیت ہے، طبیعت تو پہلے بھی متعدد مرتبہ تشویشناک حد تک آپ کی خراب ہوئی لیکن اللہ پاک کے خصوصی فضل وکرم اور بے شمار چاہنے والوں کی دعاؤں کی برکت سے پھر ایسے صحتیاب ہوئے کہ معمول کے مطابق درس وتدریس وعظ ونصیحت اور فیض رسانی کا سلسلہ جاری فرمادیا، اس مرتبہ بھی حضرت الاستاذ کی طبیعت کی ناسازی کا علم ہوا تو مجھ جیسے نہ جانے کتنے شاگردوں نے دعاؤں کا سلسلہ شروع کیا اور یہ امید کرتے رہے کہ انشاء اللہ چند روز میں حضرت روبصحت ہوجائیں گے اور پھر علوم ومعارف کے موتی بکھیرنے شروع کریں گے لیکن تقدیر تدبیر پر غالب آئی اور اس مرتبہ ایسا نہ ہوا چند روز کی شدید علالت کے بعد آپ غریب الوطنی کی حالت میں (جو بجائے خود مقام سعادت وشہادت ہے) عروس البلاد ممبئی کے ایک شفاخانے میں واصل بحق ہوگئے اور پھر وصیت کے مطابق مقامی قبرستان ہی میں آسودہ خواب ہوئے انا للہ وانا الیہ

راجعون۔

حضرت الاستاذ کے انتقال پر ملال کو دو دن گزر چکے ہیں لیکن طبیعت ایسی مغموم اور بجھی ہوئی ہے کہ نہ کچھ کہا جارہا ہے نہ لکھا جارہا ہے، یادوں کا ایک سلسلہ ہے جو تھمنے کا نام نہیں لیتا، آپ کا مخصوص لب ولہجہ، خوبصورت ومنفرد اور دلنشیں انداز بیان، جاذب نظر خط اور تحریر، ہر چیز کو بہت اہتمام اور اہمیت کے ساتھ ذکر کرنا، قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی عام فہم تشریح، اردو وعربی قواعد ومحاورات کی بہترین وضاحت اور اس طرح کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو ذہن ودماغ میں ایسی نقش ہوچکی ہیں کہ مٹائے نہیں مٹ سکتیں۔

بلاشبہ آپ ایک قابل فخر، صاحب طرز، کہنہ مشق، طلبہ کی نفسیات کو سمجھنے والے ایک کامل استاذ تھے، خوش نصیب ہیں وہ تمام حضرات جن کو حضرت کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا موقع میسر ہوا۔

آپ صرف استاذ نہیں بلکہ استاذ گر تھے، آپ سے پڑھنے والا پڑھانا سیکھ جاتا تھا نہ جانے کتنے شاگردوں نے آپ کے اسلوب کو اخذ کر کے اپنی تدریس کے انداز میں نکھار پیدا کیا ہوگا، بھرپور توجہ کے ساتھ تمام طلبہ پر نگاہ رکھتے ہوئے ایسی سبک رفتاری سے کلام فرماتے کہ لکھنے والا بآسانی آپ کی تقریر کو قلمبند کر لیتا اور ہر طالب علم گوش برآواز ہوتا، امثلہ ونظائر کے ذریعہ مسئلہ کو سمجھاتے اور درمیان میں ایسے لطائف بھی سناتے یا ایسے جملے بولتے جس سے مجلس درس زعفران زار ہوجاتی اور نئی تازگی محسوس ہوتی، سبق میں شروع سے اخیر تک دلچسپی ایسی برقرار رہتی کہ مجال ہے کہ کوئی طالب علم غافل ہوجائے یا بے توجہی کا مظاہرہ کرنے لگے۔

ہم نے بھی سنن ترمذی کے تقریباً تمام دروس بالاستیعاب ضبط کئے پھر تکرار کے موقع پر اور بعد میں تدریس کے وقت کاپی پر ایک نگاہ ڈالنے سے غیر معمولی فائدہ محسوس ہوا۔

تفہیم کے تو آپ بادشاہ تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ مباحث کو دلنشیں پیرایہ میں اس طرح پیش کرنا کہ غبی سے غبی طالب علم بھی مطمئن ہوجائے خدا کی طرف سے عطاء کردہ آپ کا وہ امتیاز تھا جس کا ہر شخص قائل اور معترف ہے۔

ہمیں حضرت الاستاذ سے سنن ترمذی اور شرح معانی الآثار پڑھنے کا موقع ملا، صبح کے تیسرے گھنٹے میں اور مغرب کے بعد آپ کا درس ہوتا تھا، محلہ بیرون کوٹلہ میں جو دارالعلوم سے خاصے فاصلے پر واقع ہے آپ کا مکان تھا وہاں سے پیدل بڑی پابندی کے ساتھ بروقت درس میں تشریف لایا کرتے تھے اور شروع ہی میں طلبہ کو یہ ھدایت فرمادی تھی کہ میرے آنے کے بعد کسی طالب علم کا درسگاہ میں آنا جرم ہوگا، چنانچہ طلبہ اس کا بھرپور خیال بھی کرتے اور آپ کے آنے سے پہلے درسگاہ کھچا کھچ بھر جاتی، اگر کبھی اتفاق سے آپ تشریف لائے اور طلبہ کی تعداد کم محسوس ہوئی تو ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے واپس تشریف لے جاتے اور خاص طور سے ترجمان سے جواب طلب فرماتے ، یہ مرحلہ طلبہ کے لئے بڑی تشویش اور فکر کا باعث بن جاتا تھا، عصر کی نماز کے بعد طلبہ ڈرتے ڈرتے آپ کے گھر مجلس میں حاضر ہوتے غلطی پر نادم ہوتے، معافی طلب کرتے، آئندہ پابندی کے ساتھ حاضری کا عہد کرتے تو دو چار تنبیہی جملے کہکر معاف فرمادیتے اور اگلے وقت تشریف لے آتے، آپ کے اس عمل کا یہ اثر ہوتا کہ پھر طلبہ وقت سے پہلے درسگاہ میں موجود دکھائی دیتے۔

ہمارے سال بھی ایک مرتبہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہم لوگ عصر کے بعد حاضر خدمت ہوئے، معافی مانگی فرمانے لگے کہ تم لوگ کیوں آئے، تمہاری وجہ سے میں واپس تھوڑا ہی آیا تھا، جاؤ ان ہی طلبہ کو بھیجو جو درس گاہ میں موجود نہیں تھے، احساس تو ان کو ہونا چاہئے، چنانچہ پھر طلبہ کی ایک بڑی جماعت حاضر ہوئی حضرت اولاً ناراض ہوئے فرمایا میں اتنی دور سے تیاری کر کے محنت کر کے سبق پڑھانے جاتا ہوں اور تم لوگ غائب رہتے ہو پھر اسباق میں پابندی سے حاضری کی تاکید فرمائی، اس کے فوائد و برکات بتائے اور پھر شفقت فرماتے ہوئے معاف فرمایا اور اگلے دن سلسلہ درس کا آغاز فرمادیا۔

ابتدائے سال میں مبادیات حدیث، علوم حدیث، مقام سنن ترمذی اور امام ترمذی کی مخصوص اصطلاحات پر سیر حاصل گفتگو فرماتے جو کئی روز تک مسلسل جاری رہتی۔

آپ کے سبق میں عبارت خوانی کا مرحلہ بھی بڑا اہم ہوتا تھا، ہر طالب علم اس کی ہمت نہیں کر پاتا تھا، آپ با قاعدہ گھر بلا کر عبارت خوانی کے خواہشمند طلبہ کا امتحان لیتے اور پھر چند طلبہ کو سال بھر عبارت خوانی کے لئے متعین فرما دیتے، اطمینان کے ساتھ صاف صاف، متوسط آواز میں، صحیح عبارت پڑھنے کی تاکید فرماتے، آواز تھوڑی بھی تیز ہوتی تو حضرت کو ناگوار گزرتی، ٹوکتے اور فرماتے مائک دور کر کے پڑھو، اعراب کی غلطیاں اگر آنے لگتیں تو عبارت خواں تبدیل فرما دیتے یا خود پڑھنا شروع فرما دیتے اس لئے عبارت خواں طلبہ بھر پور تیاری کر کے ہی سامنے آتے تھے۔

ہمیں بھی الحمدللہ کتاب کے معتد بہ حصہ کی عبارت پڑھنے کا موقع ملا ایک دفعہ پڑھتے ہوئے بار بار گلا صاف کرنے کے لئے کھنکھارنے کی نوبت آئی تو مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے: سنو! سب طلبہ متوجہ ہو گئے تو ارشاد فرمایا کل سے چمچہ لیکر آیا کرو اور جہاں آواز پھنسے گلے میں چلا لیا کرو، سب ہنسنے لگے حضرت بھی متبسم ہوئے اور فرمایا چلو آگے پڑھو۔

مغرب کے بعد تشریف لاتے تو باضابطہ سبق کا آغاز کرنے سے پہلے حفظ احادیث کی غرض سے ایک مختصر حدیث لکھواتے اور تین مرتبہ اس کو اجتماعی طور پر کہلواتے۔

شروع سال سے اخیر تک آپ کا انداز تدریس بالکل یکساں رہتا اواخر سال میں بھی اسی بسط وتفصیل کے ساتھ اطمینان سے پڑھاتے رہتے جس انداز سے شروع میں پڑھاتے، سب کے اسباق بند ہو جاتے اور آپ کے اسباق کا سلسلہ امتحان کے قریب تک جاری رہتا، کتاب کی تکمیل کے موقع پر آپ کی الوداعی نصیحت بھی بہت اہم ہوتی تھی جس کا طلبہ کو اشتیاق رہتا تھا اور جب آپ دعاء کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے تو طلبہ کی روتے روتے یہ سوچ ہچکیاں بندھ جاتی تھیں کہ اب حضرت کی مجلس درس میں حاضری کا سلسلہ منقطع ہو جائی گا۔

طلبہ کے درمیان مقبول ترین اساتذہ میں آپ کا شمار تھا، آپ کے شخصی رعب، علمی مقام اور وجاہت کی وجہ

سے طلبہ اگر چہ آپ سے بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر پاتے تھے لیکن دل سے محبت اور قدر بہت کرتے تھے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ حضرت الاستاذ نے یہ علمی تفوق، رفعت مقام، اور لوگوں کے دلوں پر دھاک کسی بے ساکھی کے ذریعہ حاصل نہیں کی بلکہ اس کے پیچھے صرف اور صرف اللہ کا فضل و کرم اور حضرت کی مقصد کے تئیں جفاکشی، وقت کا صحیح استعمال اور بے پناہ محنت وجد وجہد ہے، جاننے والے جانتے ھیں کہ دور طالب علمی سے لیکر زمانہ تدریس تک کیسے کٹھن اور صبر آزما حالات کا آپ نے خندہ پیشانی اور جذبہ شکر کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن اپنی علمی سرگرمیوں پر آنچ نہ آنے دی یہ رتبہ بلند اور علمی دنیا میں آپ کا سکہ اسی جہد مسلسل اور قربانی کا نتیجہ ہے۔

حضرت الاستاذ سے پڑھنے کا موقع تو ہمیں دورہ حدیث میں ملا لیکن شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد ہی سے ہم نے حضرت الاستاذ کا نام سنا کیونکہ محلہ بیرون کوٹلہ میں جہاں آپ کی رہائش تھی اسی کے پڑوس میں حضرت والد محترم دامت برکاتہم کے ساتھ ہم لوگوں کی بھی سکونت تھی، کچھ بڑے ہوئے تو بعد عصر آپ کی مجلس میں حاضری کا بھی موقع ملنے لگا، پھر تو قرب و تعلق اور عقیدت بڑھتی ہی چلی گئی۔

کتابیں اور علمی اشتغال آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، مزاج میں یکسوئی اور زندگی میں انتہائی سادگی تھی، شہر میں زیادہ لوگوں سے آپ کے راہ و رسم نہیں تھے اور علمی اشتغال کی وجہ سے آپ کے پاس اس کا موقع بھی نہیں تھا، جب بھی خدمت میں حاضری ہوتی کچھ پڑھتے ہوئے، پڑھاتے ہوئے، لکھتے ہوئے، سنتے ہوئے یا نصیحت کرتے ہوئے ملتے، عصر کے بعد عمومی مجلس ہوتی اس میں طلبہ آپ کے سر پر تیل رکھتے، کچھ پوچھتے تو آپ تسلی سے جواب مرحمت فرماتے، دیر تک خاموشی رہتی تو خود فرماتے کچھ سوال کرو خاموش کیوں بیٹھے ہو، یہاں آیا کرو تو سوال سوچ کے آیا کرو۔

فرق باطلہ کا تعاقب، مسلک حق کی ترجمانی، منکرات پر برملا نکیر اپنے موقف پر خلوص نیت کے ساتھ جماؤ یہ چیزیں آپ کے مزاج کا حصہ تھیں۔

دیوبند جانا ہوتا تو حضرت الاستاذ سے ملاقات کے لئے حاضری ہوتی، بڑی محبت وشفقت کا معاملہ فرماتے، اسباق کی تفصیلات معلوم کرتے دعائیں دیتے، مدرسہ کے احوال دریافت فرماتے، کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی تو عنایت فرماتے مزید دو نسخے دیتے اور فرماتے کہ یہ مفتی سلمان کو دینا وہ اس پر ندائے شاہی میں تبصرہ لکھدیں گے، ندائے شاہی کا بھی پابندی سے مطالعہ فرماتے رسالہ اکثر آپ کی تپائی پر دکھائی دیتا، بارہا فرمایا کہ تمہارا مضمون پڑھا اچھا تھا لکھتے رہو ایک مرتبہ فرمایا کہ تمہارا اور مفتی سلمان کا مضمون ضرور پڑھتا ہوں۔

مدرسہ عربیہ اعزاز العلوم ویٹ کے جلسہ سالانہ میں اکثر و بیشتر حضرت کی شرکت ہوتی تھی، چند سال قبل ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت اسٹیج پر تشریف فرما تھے اور آخری خطاب آپ کا ہونا تھا، حضرت مولانا قاری شوکت علی صاحب زید مجدہ کا حکم تھا کہ تجھے بھی کچھ کہنا ہے اس کے بعد حضرت بیان فرمائیں گے، میری ہمت بالکل نہیں ہو رہی تھی، میں نے عرض کیا حضرت آپ بیان فرمادیں، آپ کی موجودگی میں ہم کچھ نہیں بول سکتے، حکماً فرمایا کہ بیان کرو میں بیٹھا ہوں جب تک ایسے نہیں بولو گے تو بیان کرنا کیسے آئیگا۔

مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے آپ کا تعلق بہت گہرا اور پرانا تھا، آپ مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر بھی تھے اور پچھلے چند سالوں تک مسلسل ختم بخاری کے لئے تشریف بھی لاتے، مدرسہ کے سابق مہتمم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ سے آپ کی دیرینہ رفاقت تھی جس کو آپ نے اخیر تک بخوبی نبھایا۔

چند ماہ بیشتر آپ کے صاحبزادہ گرامی کا انتقال ہوا تو مدرسہ کے ذمے داران کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضری ہوئی، جاتے ہوئے پوچھا کیوں آئے ہو ہم نے مرحوم صاحبزادے کا تذکرہ شروع ہی کیا تھا تو فرمانے لگے "جو گیا وہ سپنا اور جو رہا وہ اپنا" اللہ کو جو منظور تھا وہ ہوگیا، بس جانے والوں کے لئے دعاء کرتے رہو، پھر تعزیت کے مروجہ طریقہ کے عدم ثبوت پر گفتگو فرماتے رہے، کچھ دیر کے بعد ہم نے عرض کیا کہ حضرت کئی سال سے آپ کی تشریف آوری مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں نہیں ہوسکی ہے اس سال تشریف لے آئیں، مسکراتے ہوئے فرمانے

لگے ''اب اس نے موضوع بدل لیا حالانکہ آیا تھا یہ تعزیت ہی کے لئے'' پھر فرمایا کہ جلسہ کی تاریخ کے لئے رجب کے شروع میں ملنا، پھر ملاقات ہوئی تو کمزوری اور طبیعت کی ناسازگی کی وجہ سے معذرت فرمالی۔

حضرت الاستاذ کی شخصیت پر لکھنے کے بہت سے پہلو ہیں جن پر لکھنے والے انشاء اللہ خوب اور بہت خوب لکھیں گے یہ تو بروقت بے ترتیب کچھ تاثراتی سطور ایک ادنی شاگرد کی طرف سے حضرت الاستاذ کے لئے خراج عقیدت کے طور پر قلمبند کردی گئی ہیں۔

اس موقعہ پر ہم استاذ مکرم کے اہل خانہ بالخصوص آپ کے برادر گرامی استاذ نا حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری مدظلہ اور آپ کے جملہ صاحبزادگان واولاد واحفاد کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہیں اور دعاء گو ہیں کہ اللہ پاک ہمارے حضرت کی مغفرت تامہ فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائیں، آپ کی زریں وسنہری دینی خدمات کا اپنی شایان بدلہ مرحمت فرمائیں اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو آپ کا نعم البدل عطاء فرمائیں۔

❁...❁...❁

اتر گئے منزلوں کے چہرے امیر کیا؟ کارواں گیا ہے

رئیس المحدثین حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ یادوں کے نقوش

مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف سمستی پور

ایک سوگوار صبح ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ (۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء) کی صبح کیسی سوگوار تھی کہ اس کے آسمان کا سورج ابھی نکلا ہی تھا کہ آسمان علم وفن کا روشن آفتاب غروب ہوگیا، ابھی صبح کلیوں نے کھلنا اور کوئل نے چہکنا شروع کیا تھا کہ گلشن اسلام کا ایک پھول مرجھا گیا، اور باغ علوم نبوت کا ایک بلبل خاموش ہوگیا، یعنی علم وفن کا امام رئیس المحدثین حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کئی دنوں سے آپ کی شدید علالت کی تشویشناک خبریں موصول ہو رہی تھیں، ۲۴؍رمضان المبارک کو شام سے ہی حالت زیادہ خراب ہونے کی خبر ملی، ۲۵؍رمضان کی شب کشمکش میں گذری، رات بھر جاگنے کے بعد صبح کے تھکے ہوئے لمحات میں ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع ملی، آخر زندگی بھر کا تھکا ہارا مسافر ابدی نیند سو گیا۔

کڑے سفر کا تھکا مسافر تھکا ہے ایسا کہ سو گیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کرلیں ہر آنکھ لیکن بھگو گیا ہے

حضرت مفتی صاحبؒ اس دور میں ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے، جن کو ہر علم وفن سے آشنائی تھی، مدارس کے نصاب میں رائج نیچے سے اوپر تک ہر کتاب کی تدریس کی ان کو سعادت حاصل ہوئی تھی، وہ تدریس کا بے پناہ ملکہ رکھتے تھے، کسی فن کی کتاب ہو، پانی کردیتے تھے، علم کو گھول کر پلانے کا وہ ہنر جانتے تھے، ان کا طریقہ فن میں اتر کر کلام کرنے کا تھا، وہ ہر فن کے مزاج شناس تھے، گفتگو کسی موضوع پر بھی ہو بصیرت و گہرائی میں ڈوبی ہوتی تھی، خاص طور پر حدیث اور فقہ ان کے ذوق کا حصہ تھے، ان دونوں فنون کے مراجع و مآخذ پر گہری نظر تھی ، حدیث وفقہ کے فطری مذاق کا نتیجہ تھا کہ ان کے درس حدیث میں بڑا اعتدال ہوتا تھا، وہ نہ اہل ظاہر کی طرح گفتگو فرماتے تھے، اور نہ فقہی تشقیقات میں غلو کے قائل تھے، آپ کے یہاں روایت ودرایت دونوں کا امتزاج تھا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے دار العلوم دیوبند میں جس طرز تدریس کی بنا ڈالی تھی، مفتی صاحب اس دور میں اس کے بہترین نمائندہ تھے، وہ متصلب حنفی تھے، لیکن درس ایسا بصیرت افروز اور مدلل ہوتا تھا کہ مسلک حنفی دل ودماغ کی گہرائیوں میں اترجاتا تھا، ان کا درس بڑا مقبول اور طرز افہام وتفہیم بہت مؤثر تھا، اسی لئے بلاشدید مجبوری کے کوئی طالب علم ان کے درس سے غیر حاضر نہیں ہوتا تھا۔ فقہ وحدیث کے علاوہ علوم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور معارف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر بھی آپ کا خصوصی مطالعہ تھا، ان بزرگوں کی کئی کتابوں کی تشریح وتسہیل آپ نے فرمائی۔

لب ولہجہ اور زبان وبیان

درس ہو یا عوامی خطاب ان کا لب ولہجہ ہمیشہ مجلسی ہوتا تھا، تکلفات اور آورد سے بالکل پاک، سیدھا سادہ انداز بیان اور سادہ عام فہم الفاظ، وہ بہ تکلف پرشکوہ الفاظ اور حسین تعبیرات کے درپے نہیں ہوتے تھے، اسی لیے ان کی گفتگو سامعین کے سروں کے اوپر سے نہیں بلکہ دل ودماغ کے اندر کو چھوتی ہوئی گذرتی تھی، خشک سے خشک موضوع کو تر وتازہ اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا جو سلیقہ انہیں حاصل تھا کہ اس دور میں شاید باید۔۔۔

گوکہ ان کی مادری زبان اردو نہیں تھی مگر وہ اہل زبان کی طرح اس پر قدرت رکھتے تھے، اردو اور عربی دونوں زبانوں پر ان کو یکساں عبور حاصل تھا، مختلف علوم و فنون پر ان کی تصنیفات اس کے لیے شاہد عدل ہیں، نادر موضوعات پر چالیس (۴۰) سے زیادہ تصنیفات آپ نے یادگار چھوڑیں، جو ایک مستقل علمی لائبریری ہے، آئندہ محققین کے لئے وہ مأخذ کا کام کرے گی، ان شاء اللہ۔

شرف تلمذ اور رابطہ

مجھے (۱۴۰۶ھ، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء میں) آپ سے ہدایہ رابع اور ترمذی وطحاوی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، آپ کی ترمذی وطحاوی کے درسی افادات بھی میں نے قلمبند کئے تھے، جو میرے ذخیرۂ کاغذات میں محفوظ ہیں، دارالعلوم دیوبند کے دوران قیام مجھے یاد نہیں کہ کسی استاذ کے سبق سے میں غیر حاضر ہوا ہوں، لیکن حضرت مفتی صاحب کے درس سے میں بہت متأثر تھا، وہ اس وقت دارالعلوم دیوبند کی درسگاہ کی آبرو تھے، بہت سے علمی مسائل میں لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے، ہمارے دور میں طلبہ کے درمیان وہ سب سے زیادہ مقبول ترین استاذ تھے، بہت بارعب اور باوقار تھے، لیکن اس کے باوجود بڑی محبوبیت کے حامل تھے، طلبہ عصر کے بعد ان کے گھر پر حاضر ہوتے تھے، اس زمانہ میں مفتی صاحب گھر سے دارالعلوم پاپیادہ تشریف لاتے تھے، میرا قیام افریقی منزل قدیم میں تھا، اسی کے پاس سے گذر کر وہ معراج گیٹ سے دارالعلوم تشریف لے جاتے تھے، اس طرح اکثر آمنا سامنا اور ملاقات ہوتی تھی، مگر ہمت کی کمی کے سبب بہت دنوں تک آپکے در دولت پر حاضری سے محروم رہا۔

سہ روزہ عالمی ختم نبوت کانفرنس میں مقالہ پیش کرنے کا قصہ

پہلی بار مجھے آپ کے گھر پر حاضری کا شرف دارالعلوم دیوبند میں پہلی سہ روزہ عالمی ختم نبوت کانفرنس (۱۹۸۷ء) کے موقعہ پر حاصل ہوا، وہ قصہ بھی بڑا عجیب تھا، میں دارالعلوم دیوبند کا ایک گمنام طالب علم، ایک

چھوٹے سے مدرسہ (مدرسہ دینیہ غازی پوریوپی) سے آیا تھا، حلقۂ احباب میں وہی دو چار طلبہ تھے، جو غازی پور سے ساتھ آئے تھے، دارالعلوم کے عظیم اساتذہ کے درباروں تک ہم جیسے معمولی طلبہ کی رسائی نہیں تھی، میری طبیعت کی کم آمیزی اس پر مستزاد، طلبہ سے بھی بہت کم شناشائی تھی، درسگاہ اور کتب خانہ کے علاوہ کہیں آنا جانا نہیں تھا، دارالعلوم سے باہر کبھی کسی تفریح گاہ، جلسہ، مشاعرہ یا پروگرام میں شریک نہیں ہوا، اپنے ضلعی اور صوبائی انجمنوں میں بھی بہت کم شرکت ہوتی تھی، اسی زمانہ میں دارالعلوم میں ختم نبوت کانفرنس کی مہم شروع ہوئی، جس میں ملک و بیرون ملک سے بڑی علمی، ملی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی، امام حرم عبداللہ بن سبیل بھی تشریف لائے، اس موقعہ پر دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے طے کیا کہ کانفرنس کے پروگراموں میں ایک نشست طلبۂ دارالعلوم کی بھی رکھی جائے، تاکہ دارالعلوم کی نمائندگی اس میں شامل ہو، نشست میں پانچ (۵) طلبہ کے مقالات اور پانچ (۵) طلبہ کی تقاریر پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اور خواہشمند طلبہ کو اس میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی، تاکہ مسابقہ کے بعد بہتر سے بہتر انتخاب عمل میں آسکے، اس کا اعلان آویزاں ہوتے ہی خوہشمند طلبہ کا اژدحام دیکھنے کو ملا، دارالعلوم دیوبند تو علم کا بحر بےکراں ہے، یہاں ایک پر ایک باصلاحیت طلبہ ہر زمانے میں موجود رہے ہیں، دفتر تعلیمات کے پاس میں نے بھی یہ اعلان دیکھا، میری تمناؤں نے بھی انگڑائی لی، مگر یہ سوچ کر کہ دارالعلوم کے باصلاحیت اور ممتاز طلبہ کے درمیان میرے جیسے ایک معمولی اور گمنام طالب علم کی کیا حیثیت ؟ ہمت نہیں ہوتی تھی، لیکن شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے بھی ختم نبوت کے موضوع پر مقالہ نویسی میں حصہ لینے کا عزم کرلیا، پھر وقت مقررہ کے اندر مقالہ تیار کر کے خاموشی کے ساتھ خریداران یوسف کی آخری صف کے امیدوار کی طرح دفتر میں جمع کرادیا جس کی اطلاع میرے قریب ترین ساتھیوں کو بھی نہ ہوسکی، حقیقت یہ ہے کہ مجھے ایک فی صد بھی امید نہیں تھی کہ میرا مقالہ کسی لائق ہوگا اور اس عظیم الشان کانفرنس کے لئے اس کا انتخاب عمل میں آئے گا، اس مسابقہ میں کتنے طلبہ نے حصہ لیا یہ تو معلوم نہ ہوسکا لیکن میری خوش بختی کہ پانچ منتخب

مقالات میں ایک میرا مقالہ بھی شامل تھا۔

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں بہ غلط بر ہدف زند تیرے

دفتر کا چپراسی ڈھونڈتا ہوا میرے کمرے پر آیا اور تحریری حکم سنایا کہ اپنا مقالہ لے کر حضرت مفتی سعید احمد پالنپوری کے گھر پر حاضر ہو، اس طرح پہلی مرتبہ مجھے حضرت مفتی صاحب کے در دولت پر حاضری کی سعادت میسر ہوئی، مفتی صاحب نے کچھ ضروری ہدایات دیں، اور رخصت کر دیا، یہ پہلا موقعہ تھا جب میرا رابطہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ اتنے قریب سے ہوا۔۔ بہر حال عظیم الشان سہ روزہ کانفرنس ہوئی اور اس کی ایک نشست میں جس میں ملک و بیرون ملک کے اعیان وعلماء تشریف فرما تھے، اس حقیر کو بھی اپنا مقالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

فقہ میں اختصاص اشتغال بالفقہ سے پیدا ہوتا ہے، رسمی کورس سے نہیں، اس کے بعد مفتی صاحب سے میری مناسبت بڑھتی گئی ،اور وہ بھی شفقت فرمانے لگے، دورۂ حدیث میں مجھے امتیازی نمبرات حاصل ہوئے، تو نظر عنایت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا، مگر افتاء کے سال میں اپنے اسباق اور کاموں میں ایسا مصروف رہا کہ مفتی صاحب کے یہاں بہت کم آمد و رفت رہی، مفتی صاحب کے پاس ہمارا کوئی گھنٹہ نہیں تھا، افتاء سے فارغ ہونے کے بعد فقہ میں مزید اختصاص کے لئے میں تدریب افتاء میں جانا چاہتا تھا، جس کو وہاں معین المفتی کہتے تھے، ایک دن دفتر اہتمام میں مجھے طلب کیا گیا، میں حاضر ہوا تو وہاں اس وقت حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ ، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین صاحبؒ کے علاوہ پوری مجلس تعلیمی موجود تھی، اس میں حضرت مفتی سعید احمد صاحب بھی تھے، ان بزرگوں نے میرا نام دارالعلوم میں معین المدرس کے لئے تجویز فرمایا تھا، میں نے تدریب افتا کی خواہش ظاہر کی ،تو مفتی سعید صاحبؒ نے فرمایا کہ: تدریب افتا کا مقصد اختصاص فی الفقہ ہے اور یہ رسمی کورس سے نہیں بلکہ مسلسل

اشتغال بالفقہ سے حاصل ہوگا"

مفتی صاحبؒ کے اس ارشاد کے بعد میں نے اپنی خواہش واپس لے لی ، اور بزرگوں کے فیصلہ کو قبول کرلیا، مفتی صاحب کا یہ جملہ فقہ کے ابواب میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، یہ ان کی زندگی بھر کے تجربات ومشاہدات کا حاصل تھا، اس واقعہ (۱۹۸۸ء) کو قریب بتیس سال ہونے جارہے ہیں، مفتی صاحب کے اس جملہ کی صداقت ہردن مشاہدہ میں ہے، اختصاص تو شاید مجھے حاصل نہ ہوسکا لیکن میرے اشتغال بالفقہ کا سفر آج تک موقوف نہیں ہوا، مفتی صاحب کے اس ایک جملہ نے میری زندگی کی ترتیب بدل ڈالی۔

میری پہلی تالیف ''منصب صحابہ" - مفتی صاحب کا انکار اور اطمینان

حضرت مفتی صاحب سے وابستہ ایک اور یادگار واقعہ جو میری تصنیفی وتحقیقی زندگی میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے، ۱۹۸۹ء کا ہے، جب میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر وہاں معین المدرس تھا، میں نے افتا پڑھنے کے زمانے میں اپنی پہلی تالیف ''منصب صحابہ" مرتب کی، میرٹھ میں فرق باطلہ کے بعض افراد سے میری علمی مڈبھیڑ نے اس کتاب کا مواد تیار کیا، جس کی بنیادی فکر حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ایک مضمون سے لی گئی ہے جو (غالباً ۱۹۵۸ء میں) رسالہ دارالعلوم میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا، اور اس مضمون کی طرف رہنمائی استاذ مکرم بحر العلوم حضرت مولانا وعلامہ محمد نعمت اللہ اعظمی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند سے ملی تھی ، معین المدرسی کے زمانے میں اس کتاب کی اشاعت کے بعض اسباب پیدا ہوئے ،تو اس پر تقریظ کے لئے میں نے اپنے اساتذہ سے رجوع کیا، اسی ضمن میں میں نے حضرت مفتی صاحبؒ کے آستانہ پر حاضری دی اور تقریظ کی خواہش کا اظہار کیا، اتفاق سے وہ سال کا آخری حصہ تھا، اور ان دنوں اسباق کے علاوہ بہت سے اسفار اور پروگراموں کا بھی ان پر بوجھ تھا، لیکن حضرت مفتی صاحب نے ازراہ

شفقت میری خواہش کو قبول فرمایا، آپ اس وقت بھی کسی پروگرام کے لئے ہی پا بہ رکاب تھے، فرمایا کہ کتاب کا مسودہ دے دو، میں سفر میں اس پر ایک نظر ڈالوں گا، دو دن کے بعد آ کر ملاقات کرو، دو دن کے بعد حسب الحکم جب حاضر ہوا تو مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ میں نے تمہارے مسودہ کا ابتدائی حصہ دیکھا ہے، مگر مجھے اس کی بنیاد سے ہی اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ اگر تمہاری بات مان لی جائے تو علماء دیوبند کی پچاس سالہ خدمات پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے کتاب میں صحابہ کے معیار حق ہونے کی تشریح لکھی تھی، اور اس کو مذاہب اربعہ کی روشنی میں مدلل کیا تھا، پوری کتاب میں کہیں بھی اکابر دیوبند میں سے کسی بزرگ کا نام یا ان کی کسی عبارت کا اقتباس نقل نہیں کیا گیا تھا، اور نہ فریق مخالف میں سے کسی کا نام یا ان کی کسی عبارت کا اقتباس شامل کیا گیا تھا، مسئلہ کو خالص مثبت علمی اور غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی، تا کہ لوگ اس مسئلہ کو مناظرہ اور مقابلہ کی عینک نکال کر خالص علم وتحقیق کی روشنی میں دیکھیں۔۔۔اس موضوع پر اس انداز میں غالباً اس سے پہلے کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی تھی، مفتی صاحب کو شاید یہ نیا انداز مطالعہ پسند نہیں آیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں ایک بلند حیثیت عرفی کے مالک تھے، میرے استاذ تھے، میں ان پر اعتماد کرتا تھا، اس لئے ان کے اس ارشاد سے تھوڑی دیر کے لئے مجھے لگا کہ جیسے میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی ہو، گو کہ میری تحقیق کی بنیاد علماء متقدمین کی عبارتوں پر تھی، جس کی پشت پر خود ترجمان مسلک دیوبند حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی تفکیر وتشریح موجود تھی، لیکن مفتی صاحب کا مطمئن ہونا بھی میرے حق میں ضروری تھا۔۔۔میں نے نہایت ادب واحترام سے عرض کیا کہ علماء دیوبند کی کس کتاب میں معیار حق کی تشریح کی گئی ہے؟ جو میری یہ تشریح اس سے متناقض ہے، کتابوں میں معیار حق کی صرف اصطلاح استعمال کی گئی ہے، اور اس کا مفہوم ذہنی اب تک ہماری کسی کتاب میں صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں ہوا، جب کہ معیار حق کے اثبات سے قبل اس اصطلاح کی توضیح وتشریح ضروری ہے، اگر حضرت والا کے علم میں کوئی کتاب ہو تو رہنمائی فرمائیں

۔۔۔۔میری معروضات کو حضرت مفتی صاحبؒ نے بہت توجہ کے ساتھ سنا، اور تھوڑے تأمل کے بعد کل آنے کے لئے ارشاد فرمایا، ابھی وہ کسی سفر سے آئے تھے، اور آرام کرنا چاہتے تھے، میں بہت مایوسی کے ساتھ اپنی قیامگاہ پر واپس آیا، اور تھوڑی دیر کے بعد دارالعلوم کے کتب خانہ کا رخ کیا، تاکہ اس مسئلہ پر مزید مطالعہ وتحقیق کرسکوں، پورے چوبیس گھنٹے میرے نہایت بے قراری میں گذرے، مفتی صاحب نے مجھے دوسرے دن عشاء کے بعد کا وقت دیا تھا جب وہ کھانا تناول فرماتے تھے، میں نے اس تعلق سے جوممکنہ اعتراضات تھے، ان کو سامنے رکھ کر مختلف عبارتیں ایک الگ کاغذ پر جمع کی تھیں، اگلے دن میں حاضر خدمت ہوا تو حضرت دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے، اور بہت خوشگوار موڈ میں تھے میں نے گذشتہ روز کی گفتگو کے تناظر میں کچھ وضاحتی گفتگو پیش کرنی چاہی، حضرت مفتی صاحبؒ نے مجھے روکتے ہوئے فرمایا کہ اپنی اصل کتاب سنانا شروع کرو، میں نے کتاب شروع کردی، مفتی صاحب نے کوئی اعتراض نہیں کیا بس خاموشی کے ساتھ متوجہ رہے، مفتی صاحب کا کھانا ختم ہوا، تو فرمایا کہ بس، اب اگلا حصہ کل اسی وقت، اس طرح میں نے پوری کتاب کی خواندگی حضرت مفتی صاحب کے کھانے کے وقت قریب دس دنوں میں مکمل کی، اور اس اثناء مفتی صاحب نے ایک آدھ جگہ جزوی مشورہ کے علاوہ کوئی کلام نہیں فرمایا، خواندگی مکمل ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں اس پر تقریظ نہیں مقدمہ لکھوں گا، چنانچہ آپ نے اس پر قریب بارہ (۱۲) صفحات کا وقیع مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں کتاب پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا، اور حقیر مؤلف کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

منصب صحابہ" پر مفتی صاحب کا مبسوط مقدمہ

بطور نمونہ مقدمہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں: ''الغرض یہ ایک مناقشاتی موضوع بن گیا ہے، ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر ردو قدح سے علیٰحدہ ہوکر مثبت انداز میں کوئی مختصر کتاب لکھی جائے، تاکہ کھلے ذہن کے لوگ اس کا مطالعہ کریں، اور ٹھنڈے دل ودماغ سے اس مسئلہ پر غور کریں۔

مجھے خوشی ہے کہ ہمارے دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل جناب مولانا اختر امام عادل سمستی پوری جوفی الحال دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی مشق کررہے ہیں، اورمعین المدرسین کی حیثیت سے پڑھارہے ہیں، انھوں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس کی عرصہ سے خواہش تھی، میں آج کل ایک عارضی بیماری میں مبتلا ہوں جس کی وجہ سے میں اسے بنظر غائر تو نہ دیکھ سکا ہوں، مگر میں نے پوری کتاب سنی ہے، اور میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب میں جس طرح اس مسئلہ کی تحلیل کی گئی ہے، اور جس دلچسپ انداز میں دلائل قاری کے ذہن نشیں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان شاء اللہ یہ کتاب غیر مطمئن ذہنوں کے لئے بھی باعث تشفی ہوگی، اور عام مسلمانوں کے لئے بھی زیادتی ایمان اور صحابہ کرام کی قدرشناسی کا ذریعہ ثابت ہوگی" پھر حضرت مفتی صاحب ہی نے مجھے مشورہ دیا کہ ہمارے یہاں زبان وادب کے نقطۂ نظر سے حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ کی شخصیت بہت اہم ہے، یہ مسودہ ایک نظر ان کو بھی دکھلا دو، دوسرے دن عصر کے بعد حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا یہ مسودہ برائے تقریظ ان کی خدمت میں بھی پیش کیا، حضرت الاستاذ مولانا بجنوریؒ نے بھی نہایت محبت کے ساتھ تقریظ لکھی۔

حضرت بجنوریؒ کی تقریظ کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

الحمد اللہ کہ اکابر دیوبند اور علماء دیوبند کے بروقت تنبہ اور تعاقب سے امت اس بڑے فتنہ سے آگاہ ہوئی اور اس کا زور بھی کم ہوا، اب دارالعلوم دیوبند کے معین المدرسین عزیزم مولانا اختر امام عادل سلمہ اللہ نے ایک مفصل تحریر مرتب کی ہے۔۔عزیزم کا یہ مفصل مضمون ایک ضرورت کی تکمیل اور مسلک دیوبند کے ایک مخصوص مسئلہ کی قابل اعتماد تشریح ہے"

اس کتاب پر حضرت الاستاذ علامہ محمد حسین بہاریؒ اور حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ کی تقریظات بھی ہیں، تفصیل کے لئے اہل ذوق کتاب کی طرف مراجعت فرمائیں، کتاب انٹرنیٹ

پر موجود ہے۔اس تفصیل سے حضرت مفتی صاحب کی وسعت نظری اور خورد نوازی کا اندازہ ہوتا ہے،اور کس طرح وہ کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ مسائل کا مطالعہ کرتے تھے،اور اگر کوئی بات سمجھ میں آجاتی تو قبول کر لینے میں بھی کوئی دریغ نہیں ہوتا تھا،اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔

مفتی صاحب "منصب صحابہ" کو شیخ الہند اکیڈمی سے شائع کرانا چاہتے تھے،اس کتاب کی اشاعت کا ایک زریں پہلو یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب نے کتاب اور موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہ خیال ظاہر فرمایا کہ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہو تو اس کی استنادیت میں اضافہ ہوگا اور دارالعلوم کی علمی وفکری نمائندگی بھی ہوگی'اور غالباً حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کے پاس مجھے بھیجنے کا مقصد یہی تھا،حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ ان دنوں دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات بھی تھے ،اور شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر بھی ،حضرت مفتی صاحب کی یہ تجویز ان کی عالی ظرفی ،وسیع القلبی اور چھوٹوں کو آگے بڑھانے کی شاندار مثال ہے،حضرت مولانا بجنوریؒ نے بھی اس تجویز کو قبول کر لیا تھا،اور ظاہر ہے کہ میرے لئے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی تھی ،میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ میری ایک معمولی تحریر کو اتنی اہمیت دیں گے،لیکن سوء اتفاق جس ناشر نے طباعت کی تیاری کی تھی ،اور کتابت وغیرہ کے سارے مراحل مکمل کئے تھے،میں نے جب اس کے سامنے یہ تجویز رکھی تو وہ اس کتاب سے دستبردار ہونے پر راضی نہ ہوا، بلکہ یک گونہ فتنہ کی شکل پیدا کر دی ،اور اتنی عجلت کا مظاہرہ کیا کہ اس نے خریداری کی بکنگ کے لئے ایک پوسٹر شائع کر دیا،اور کتاب کے منظر عام پر آنے سے قبل ہی کتاب کی بڑی تعداد بک ہوگئی۔۔۔۔حضرت مفتی صاحبؒ مجھ پر اعتماد کرتے تھے ،اور میرا بھلا چاہتے تھے اس لئے پر امید تھے کہ میں ان کی تجویز کو ہر صورت میں قبول کروں گا،انہوں نے دارالعلوم کی دیواروں پر یہ پوسٹر دیکھے تو ان کو صدمہ پہونچا، پھر میں حاضر بارگاہ ہوا تو بے حد رنج کا اظہار فرمایا اور کہا کہ تم نے ایک سنہرا موقع کھو دیا۔

شیخ الہند اکیڈمی کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی ملازمت کا مشورہ

اس کتاب کی بنا پر حضرت کو مجھ سے حسن تعلق اور حسن ظن اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جب میری معین المدرسی کی مدت اختتام پذیر ہونے لگی (شعبان سے قریب ایک ماہ پیشتر) تو مجھ سے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند اکیڈمی کو ایک اسسٹنٹ ڈایریکٹر کی ضرورت ہے جو اس کے علمی اور قلمی کاموں میں معاونت کرے، ابھی اسی ہفتہ شوریٰ کی میٹنگ ہونے والی ہے، تم اس کے لئے ایک درخواست دے دو، میں نے عرض کیا کہ کیا قلمی خدمات کے ساتھ مجھے تدریسی خدمات کا بھی موقعہ مل سکے گا؟ مفتی صاحب نے فرمایا کہ نہیں، یہ قلمی کام کا عہدہ ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ نے ہی ہمیں نصیحت کی ہے کہ فراغت کے بعد کم ازکم دس سال تک تدریسی خدمت کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر علم میں پختگی نہیں آتی، مفتی صاحب نے فرمایا، درست ہے، ایسا کرو کہ جزوی تدریس کی شرط کے ساتھ درخواست دے دو، شاید قبول کرلیں ۔۔۔ بہرحال میں نے حضرت مفتی صاحبؒ کے حکم پر درخواست دی، مگر شاید وہ قبول نہ ہوسکی، کہ ایک شخص دو شعبوں میں کام نہیں کرسکتا تھا ۔۔۔ دیوبند سے رخصت ہوتے وقت مفتی صاحب سے الوداعی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو مفتی صاحب نے تسلی دی اور فرمایا کہ ”امید ہے کہ اللہ پاک اس سے بہتر صورت میں تمہیں دیوبند واپس لائیں گے“ وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ دیوبند سے نکل جانے کے بعد بھی مفتی صاحب سے میں مسلسل مربوط رہا اس لئے کہ میرا ایقان تھا کہ ”وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ“ میں نے ہمیشہ اپنے بزرگوں کی جوتیوں میں رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھا۔

دارالعلوم حیدرآباد میں میری ملازمت کی بات چیت

دیوبند سے میں سیدھے مدرسہ سراج العلوم سیوان (بہار) آ گیا تھا، یہاں عربی ششم تک تعلیم تھی، افتا کی ذمہ داری اور جمعہ کی خطابت بھی مجھے دی گئی تھی، لیکن یہاں کے ماحول میں بڑی گھٹن تھی، میں نے مفتی صاحب کو خط لکھا تو انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرے لئے دارالعلوم حیدرآباد والوں سے بات کرلی، ایک زمانہ میں

دارالعلوم حیدرآباد کے ذمہ داران ہر کام میں مفتی صاحب سے مشورہ کرتے تھے، اور مفتی صاحب کی رائے فیصلہ کن قرار پاتی تھی، اختتام سال پر میں دیوبند حاضر ہوا تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ دارالعلوم حیدرآباد کے لوگ آئے تھے، ان کو ایک صاحب قلم مفتی کی ضرورت تھی، میں نے تمہارے لئے بات کرلی ہے، رمضان کے بعد سیدھے دیوبند آجاؤ، ان کا ایک وفد آئے گا ان کے ساتھ چلے جانا۔

علمی رہنمائی

حیدرآباد سے بھی مسلسل میرا رابطہ آپ سے قائم رہا، بعض علمی مشورے بھی آپ سے لیتا تھا، ایک بار مجھے فقہی مصطلحات کے لئے انگریزی لغت کی ضرورت تھی، تو آپ نے ہی معجم لغۃ الفقہاء (مرتبہ: ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی وڈاکٹر حامد صادق قنیبی، مطبوعہ دارالنفائس بیروت، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء) کی طرف میری رہنمائی فرمائی، اس کتاب سے میں نے اسلامی قانون کے تقابلی مطالعہ کے موقعہ پر کافی استفادہ کیا، حضرت مفتی صاحبؒ کو انگریزی زبان کا بھی بہتر مذاق تھا۔ اللہ پاک ان کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے آمین۔

جامعہ ربانی کا قیام مشکلات، مشورے اور ہدایات

حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں بعض محرکات کے تحت جب میں نے اپنے وطن سمستی پور میں ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو اس موقعہ پر بھی میں نے مفتی صاحب کو پل پل سے باخبر کھا، اور آپ سے ضروری مشورے اور ہدایات کا طالب رہا، چنانچہ ابتدا میں جب میں نے (۱۹۹۶ء میں) مدرسہ کا پلان بنایا، تو وہ بڑا پلان تھا، مفتی صاحب نے اس پر نکیر کی، اور بالآخر وہ پلان بعض سازشوں کے تحت سولہ (۱۶) ماہ کے بعد فیل ہوگیا (جس کی ایک تلخ تاریخ ہے جو ان شاء اللہ کبھی زیر تحریر آئے گی) اس کی اطلاع میں نے حضرت مفتی صاحب کو دی تو آپ نے مجھے تسلی دی، حوصلہ بڑھایا اور تحریر فرمایا: ’’

برادر مکرم ومحترم جناب مولانا اختر امام عادل صاحب زید فضلہ وعلمہ

سلام مسنون

آپ کا خط ملا، جملہ احوال کا علم ہوا،غور کرنے کے بعد آپ کے لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی متبادل ادارہ قائم کریں،اوراپنے علمی مشاغل بھی جاری رکھیں،مگرادارہ قائم کرنے کی صورت میں زمام کار بدست خودرکھیں،ورنہ پھروہی حشر ہوگا جوہوچکا۔

بحمدہ تعالیٰ آپ پر مصارف کا کوئی خاص بوجھ نہیں ہے،اس لئے آزادرہ کرکام انجام دے سکتے ہیں،میں دعا کرتاہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت عطافرمائیں۔ابھی آپ ناتجربہ کارہیں،حوادث سے نہ گھبرائیں،کسی بھی اہم مقصد کوحاصل کرنے کے لئے کٹھنائیوں سے گذرنا پڑتاہے،تب جا کرمنزل ملتی ہے،اورملازمت توملازمت ہے،اس میں جوروبنناہی پڑتاہے،اورزمانہ کی ناموافقت کاشکوہ ہمیشہ بڑے لوگ کرتے رہے ہیں،کشتی موجوں سے ٹکراکرہی ساحل مراد پر پہونچتی ہے۔یہاں کے احوال بحمدہ تعالیٰ اچھے ہیں ،دعوات صالحہ میں یادرکھیں،بندہ بھی دعاگوہے۔

والسلام

سعیداحمد پالنپوری

۲۰/۴/۱۹ھ

مفتی صاحب نے یہ خط مجھے ۲۰/ربیع الثانی ۱۴۱۹ء مطابق ۱۳/اگست ۱۹۹۸ء کوتحریرفرمایا،اوربھی کئی اکابرکومیں نے خط لکھاتھا،اورسب نے ہی تقریباً یہی بات لکھی ،بالآخر اس خط کی تاریخ تحریر سے دوماہ کے اندر ۸/جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۹۸ء کوشہر سے دورمنورواشریف میں نہایت سادگی کے ساتھ جامعہ ربانی کاافتتاح عمل میں آیا،اوراس کی اطلاع بھی حضرت مفتی صاحب کودی گئی ،توآپ نے اظہار مسرت فرمایا،اوریہ خط تحریرکیا:

”برادرمکرم ومحترم زیدلطفہ سلام مسنون

آپ کا دو(۲) رجب کا مکتوب ہم دست ہوا، جامعہ ربانی کے افتتاح سے بہت مسرت ہوئی، ان الرقیٰ فی البدایۃ المتواضعۃ معمولی آغاز ہی میں کامیابی کاراز مضمر ہے، پہلے جو آپ نے ماسٹر پلان بنایا تھا وہ ایک سنہرا خواب تھا اور اس کا انجام آپ دیکھ چکے، وہ طریقہ صحیح نہیں تھا، جیسا کہ میں نے اس وقت آپ کو لکھا تھا، اور غالباً وہ میرا لکھنا آپ کو ناگوار بھی ہوا تھا، مگر حقائق بہرحال حقائق ہوتے ہیں، اور امانی کبھی بھی حصول مقصد کا ذریعہ نہیں بنتے۔

اب آپ اس نونہال کی آبیاری کریں، ان شاء اللہ بہت جلد یہ مبارک درخت ثمر بار ہوگا۔۔۔۔رہے علاقہ کے احوال جو آپ نے لکھے ہیں، وہ کوئی قابل تعجب اور لائق حیرت نہیں ہیں، اگر لوگوں کے یہ احوال نہ ہوں، تو ماضی میں انبیاء کرام کیوں مبعوث کئے جاتے، اور حال میں اور مستقبل میں وارثین انبیاء کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔

آپ کے علمی کاموں میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائیں، ہم ناکاروں کے لئے دعا فرمائیں کہ کچھ کرسکوں، والد ماجد سے سلام مسنون کہیں، اور مدرسہ کی طرف پوری توجہ رکھیں، پچھلے ادارہ جیسا حال نہ کردیں، رہا کبھی کسی مناسب وقت میں علاقہ کا دورہ ہوا تو ان شاءاللہ اس سے دریغ نہ ہوگا۔

والسلام

سعید احمد پالنپوری

۱۵/رجب ۱۴۱۹ھ

میری تالیف ”قوانین عالم میں اسلامی۔۔“ کو جامع انسائیکلوپیڈیا قرار دیا جامعہ ربانی کے قیام کے بعد میری کئی کتابیں منظر عام پر آئیں، لیکن جب میری دستاویزی کتاب ”قوانین عالم میں اسلامی قانون

کا امتیاز" تیار ہوئی، تو میں نے یہ کتاب حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں پیش کی، مفتی صاحب اس کتاب کو پڑھ کر بے حد مسرور ہوئے، اور اس پر درج ذیل تحریر بطور تقریظ و تعارف کے رقم فرمائی:

(بعد حمد و صلوٰۃ) جناب مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی زید مجدہم کی مایہ ناز کتاب "قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز" پیش نظر ہے، دور حاضر میں اسلامی قانون اور اسلامی تمدن کو جس چیلنج کا سامنا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے، اس سے لوہا لینے کے لئے ہمیں بڑی تیاری کرنی ہے، مدارس اسلامیہ کے عام طلبہ اور شعبۂ افتاء کے مخصوص طلبہ کو اسلامی قانون کا تقابلی مطالعہ کرانا ضروری ہے، اس سلسلہ میں مراجع کی کمی تھی، عربی میں تو خیر کافی مواد موجود تھا، مگر اردو میں نہ کے برابر ہے، اب بفضلہٖ تعالیٰ یہ مفصل کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہی ہے ۔ یہ قیمتی کتاب پانچ (۵) بابوں پر مشتمل ہے۔

☆ پہلے باب میں اسلامی قانون کا تعارف، خصوصیات و امتیازات، تدریجی ارتقاء، مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات کا بیان ہے، اور آج تک ہونے والی متعدد فقہی مساعی پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز اسلام کے بین الاقوامی قوانین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

☆ دوسرے باب میں مصنف نے اسلامی فقہ کے خلاف پیدا کی گئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے، اور دنیا کے دیگر قوانین نے جو اسلامی قانون سے خوشہ چینی کی ہے، اس پر روشنی ڈالی ہے، اور مثالوں سے یہ بات واضح کی ہے۔

☆ تیسرے باب میں دنیا کے مشہور غیر مسلم ملکوں کے قوانین کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی خصوصیات سے بحث

کی گئی ہے، اور اسلامی قانون کی بہ نسبت وہ کتنے ناقص ہیں اس پر نظر ڈالی گئی ہے۔

☆ چوتھے باب میں قانون اسلامی پر لکھی گئی بنیادی کتابوں کا تذکرہ ہے، اس باب میں تقریباً پچیس سو

(٢٥٠٠) فقہی مآخذ کا ذکر آگیا ہے۔

☆ پانچویں باب میں فقہی اصطلاحات کی فرہنگ ہے جس کی ضرورت عالمی قوانین کے مطالعہ کے وقت پیش آتی ہے، اس باب میں تقریباً ایک ہزار (١٠٠٠) فقہی اصطلاحات کا عظیم ذخیرہ جمع کردیا ہے۔ اس طرح یہ ایک جامع انسائیکلوپیڈیا بن گیا ہے، اور یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتاب اس موضوع پر حرف آخر ہے، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اس موضوع پر لکھی جانی والی کتابوں میں یہ کتاب سب سے زیادہ مبسوط اور جامع ہے۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائیں اور اس کا فیض عام وتام فرمائیں، اور امت کی صلاح وفلاح اور بلند پرواز مصنف کے رفع درجات کا ذریعہ بنائیں (آمین)

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالنپوری

خادم دارالعلوم دیوبند

٢١ ر صفر ١٤٢٦ھ

دیارِ غیر میں درس اور سوال وجواب کی عملی تربیت

اس طرح حضرت مفتی صاحب سے میرے استفادہ کا سلسلہ زمانہما بعد تک جاری رہا، میں چھوٹی سی چھوٹی سے چیز میں بھی اپنے اساتذہ کی رہنمائی کا طلبگار رہتا تھا۔۔۔اس ضمن میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ ١٤٢٦ھ / ٢٠٠٥ء میں رمضان المبارک کے موقعہ پر میرا برطانیہ کا سفر ہوا، اور "مسجد الرحمن بولٹن" میں رمضان کے آخری عشرہ میں میرے درس قرآن کا پروگرام طے ہوا، اس سے پہلے عشرے میں حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری سابق استاذ دارالعلوم دیوبند اسی مسجد میں درس پر فائز تھے، یہ بیرون ملک کسی باقاعدہ درس کا میرا پہلا تجربہ تھا، مجھے معلوم ہوا کہ لندن میں اسٹام فورڈ کی مسجد قبا میں حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ تشریف لائے ہوئے ہیں، اور عید تک یہیں قیام فرمائیں گے، میں نے اس ارادے سے کہ

حضرت کے طریق کار سے رہنمائی حاصل کروں

سیدھے لندن پہونچا، حضرت مسجد ہی کے ایک حجرہ میں آرام فرمارہے تھے ،ان کو معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئے ،اپنے میزبان سے میرے کھانے پینے کے انتظام کا حکم فرمایا،لیکن میرا قیام اسی محلہ میں محترم جناب یوسف بھائی پٹیل کے یہاں تھا،وہ بھی میرے ساتھ تھے ، میں نے معذرت کی ، دوتین دنوں تک میں آپ کے درس اورسوال وجواب کی مجالس میں شریک رہا، پہلے دن ازراہ ادب میں نے پیچھے بیٹھنے کی کوشش کی ،توحضرت نے حکم دے کر مجھے آگے بلایااوراپنے بازو میں بٹھایا،اور لوگوں سے دوچار تعارفی کلمات بھی ارشادفرمائے،بعض سوالات کے جوابات بھی دینے کوکہا۔۔۔۔اس طرح ایک اجنبی ملک میں درس اورسوال وجواب کی عملی تربیت میں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے حاصل کی ۔ یہ واقعہ اگرچیکہ بہت چھوٹا ہےلیکن میرے لئے بہت اہم ہے، میں برطانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کی نفسیات اوران کے مسائل اورتقاضوں سے واقف نہیں تھا،ان کوکیسے مطمئن کیاجائے ،کون سی بات ان کے سامنے رکھنی چاہئے اورکون سی نہیں ،اس کے لئے بھی بصیرت کی ضرورت ہے، مفتی صاحبؒ وہاں ایک عرصہ سے تشریف لے جارہے تھے،اوران کی نفسیات اورضرورتوں کواچھی طرح سمجھتے تھے ،اس لئے میرے لئے ان کا طرزعمل دلیل راہ بنااورمیں نے بولٹن (برطانیہ) کے دروس میں اس سے کافی استفادہ کیا۔

جوہرنایاب

یہ تمام واقعات حضرت مفتی صاحب کی وسعت قلبی ،خردنوازی ،حسن تربیت ،اور افرادسازی کی بےنظیرصلاحیت کے مظہرہیں ،آج جب لوگوں کے پاس ان چیزوں کے لئے وقت نہیں ہے،اور بڑے لوگوں کے اندرچھوٹوں کوآگے بڑھانے کاجذبہ کم سے کمترہوتاجارہا ہے،مفتی صاحب جیسے انتہائی اصولی اور عدیم الفرصت شخص کے پاس یہ چیزیں فراوانی کے ساتھ موجودتھیں ،اورانہی بزرگوں کے طفیل دین اورعلم کی امانت

نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، امت کی مائیں بانجھ نہیں ہیں، ضرورت ایسے مربیوں اور معلموں کی ہے جو ذرہ کو آفتاب اور خاک کو کیمیا بنانے کا ہنر رکھتے ہوں، حضرت مفتی صاحب اس دور زوال میں ایسے ہی

جوہر نایاب تھے جواب ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتا
ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
جو یاد نہ آئے بھول کے پھر اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

(شادؔ عظیم آبادی)

فقہی سیمیناروں اور اجتماعات میں شرکت

حضرت مفتی صاحب گوکہ قدیم میخانوں کے بادہ خوار تھے لیکن ان میں شدت اور خشکی نہیں تھی، وہ ہر اچھی چیز کا خیر مقدم کرتے تھے، مجھے خوب یاد ہے، غالباً ۱۹۸۸ء کی بات ہے، جب میں دارالعلوم دیوبند میں معین المدرس تھا، دستاویزی فقہی رسالہ بحث ونظر (پٹنہ) (زیر ادارت فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ) کے پوسٹر دارالعلوم کی دیواروں پر جگہ بہ جگہ چسپاں نظر آئے، میں نے خیال کیا کہ اردو کے عام فہم اور دلچسپ رسالوں کا تو خریدار نہیں ہے، تمام اردو رسائل خسارہ میں چل رہے ہیں، اس فقہی دستاویزی رسالہ کا خریدار کون ہوگا؟ لیکن جب یہ رسالہ منظر عام پر آیا تو خریداروں کے ہجوم میں وقت کے ممتاز علماء وفقہاء بھی نظر آئے، یہی رسالہ فقہ اکیڈمی اور آئندہ فقہی سیمیناروں کا سنگ بنیاد بنا، اور اس نے پورے ملک میں فقہی انقلاب کی لہر پیدا کردی، دوسرے فقہی سیمینار (منعقدہ ۱۹۸۹ء بمقام جامعہ ہمدرد دہلی) میں حضرت الاستاذ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند) کے خادم کی حیثیت سے میں پہلی بار شریک ہوا، تو استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ بھی تشریف فرما تھے، معلوم ہوا کہ مفتی صاحبؒ بحث ونظر کے تین سال کے خریدار بنے۔

مفتی صاحب اس رسالہ اورحضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے مداحوں میں تھے،قاضی صاحبؒ کے کئی سیمیناروں میں وہ شریک رہے،بعد میں بعض وجوہات اور مصالح کے تحت انہوں نے سیمینار میں شرکت ترک کردی تھی۔

فقہی مسائل میں اتفاق واختلاف ملامت کی پرواہ کئے بغیراپنی رائے کا اظہار

حضرت مفتی صاحب کا فقہی ذوق کافی بلند تھا،اور نئے مسائل میں بھی ان کا ذہن بہت تیزی کے ساتھ چلتا تھا،انہوں نے نکتہ رس ذہن پایا تھا،وہ اصول اورقواعد کی سخت رعایت کے ساتھ نئے مسائل میں اپنی رائے دیتے تھے،ان کے یہاں اسلاف کی احتیاط بھی تھی ،اور عہد حاضر کی ضرورتوں کا ادراک بھی ،ادارۃ المباحث الفقہیۃ (جمعیۃ علماء ہند) کے اجتماعات میں وہ پابندی سے شریک ہوتے تھے،بلکہ روح رواں رہتے تھے ،ان اجتماعات میں ہمیشہ آپ کے خیالات سے استفادہ کا موقعہ ملتا تھا،اور مسئلہ کی مختلف شقوں تک رہنمائی ہوتی تھی،کئی مسائل میں مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں تھا،اورکئی مسائل میں بہتوں کوان سے اختلاف رہا،لیکن مفتی صاحب اپنی رائے میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے تھے ،وہ پوری طاقت سے اپنی بات پیش کرتے تھے،میڈیکل انشورنس،منیٰ میں قصرواتمام،اورتعزیتی جلسے وغیرہ کئی مسائل میں ان کی ایک الگ رائے تھی،اورکئی علماء ان کے حامی بھی تھے،اور بہتوں کواختلاف بھی تھا،لیکن ان کی رائے کسی دباؤ کی پابند نہیں تھی ،وہ جواخلاص کے ساتھ سمجھتے تھے وہی بولتے تھے،خطأ وصواب میں کلام ہوسکتا ہے،ان کے اخلاص میں نہیں،مگراس کے ساتھ وہ وسیع النظر تھے ،اختلاف کرنے والوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ مخلصانہ اورمشفقانہ ہوتا تھا،اس دور میں ایسی مثالیں کمیاب ہیں،آج لوگوں کواپنی رائے پراتنااصرار ہوتا ہے کہ اس سے اختلاف کرنے والے کواپنا مخالفتصور کرنے لگتے ہیں،وہ اختلاف اورمخالفت کے فرق سے واقف نہیں ہیں،حضرت مفتی صاحب اس نقطۂ امتیاز کو سمجھتے تھے۔

حضرت سے آخری ملاقات کا منظر

حضرت سے میری آخری ملاقات ادارۃ المباحث الفقہیۃ کے پندرہویں فقہی اجتماع (١٩ تا ٢١ رجب ١٤٤٠ھ مطابق ٢٧ تا ٢٩ مارچ ٢٠١٩ء، دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی) میں ہوئی تھی، حضرت پروگرام میں تشریف فرما تھے، اور اجلاس جاری تھا، میں آگے بڑھ کر ملاقات کے لئے حاضر ہوا، تو بے ساختہ اپنی کرسی سے کھڑے ہوگئے، وہ بیمار اور کمزور تھے، میں نے ہرچند اصرار کیا کہ حضرت نہ اٹھیں تشریف رکھیں، لیکن وہ نہ مانے اور کھڑے ہوکر مجھ سے معانقہ فرمایا، میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔۔۔ یہ تھی ہمارے بزرگوں کی تواضع اور اپنے معمولی سے معمولی شاگرد کی قدر افزائی، وہ قدرت کی طرف سے بہت اونچا دل، وسیع ظرف اور بلند اخلاق لے کر آئے تھے، وہ نفسانیت سے پاک اللہ سے ڈرنے والے بزرگ تھے۔

بلاتنخواہ تدریس اور سابقہ تنخواہوں کی واپسی - مدارس کی تاریخ میں ایک زریں مثال

آپ کے بلند تقویٰ، احتیاط اور خشیت وانابت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ جب اللہ پاک نے آپ پر مالی فتوحات کے دروازے کھول دیئے، اور تجارت وغیرہ کی سہولت پیدا ہوئی، تو آپ نے ١٤٢٣ھ میں حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد ہی دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینے کا سلسلہ موقوف کردیا، اور ١٤٢٣ھ سے آخر تک بغیر تنخواہ کے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں، بلکہ شوال ١٣٩٣ھ سے ذی الحجہ ١٤٢٣ھ تک دارالعلوم دیوبند سے جو تیس سال تین ماہ تک تنخواہ لی تھی، وہ تنخواہ بھی دارالعلوم دیوبند کو واپس کردی، اسی طرح ذیقعدہ ١٣٨٤ھ سے شعبان ١٣٩٣ھ تک دارالعلوم اشرفیہ سے جو نو (٩) سال تنخواہ لی تھی، وہ تنخواہ بھی دارالعلوم اشرفیہ کو واپس کردی، ایسی مثالیں ماضی میں بھی خال خال ملتی ہیں، آج کا تو سوال ہی کیا ہے، اس کی تفصیل جناب عادل سعیدی پالن پوری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کی ہے:

دارالعلوم اشرفیہ عربیہ راندیر سورت گجرات کو واپس کی ہوئی تنخواہ کی تفصیل:

واپسی کی تاریخ: ۲۸/اپریل ۲۰۰۳ء

☆ مارچ ۱۹۶۵ء سے جنوری ۱۹۶۸ء تک: مبلغ پانچ ہزار سات سو چالیس روپے فقط (۵۷۴۰)۔

☆ فروری ۱۹۶۸ء سے فروری ۱۹۷۰ء تک: مبلغ پانچ ہزار ایک سو پانچ روپے فقط (۵۱۰۵)۔

☆ مارچ ۱۹۷۰ء سے فروری ۱۹۷۲ء تک: مبلغ چھ ہزار چھ سو روپے فقط (۶۶۰۰)

☆ مارچ ۱۹۷۲ء سے اکتوبر ۱۹۷۳ء تک: مبلغ پانچ ہزار آٹھ سو پانچ روپے فقط (۵۸۰۵)۔

ٹوٹل: مارچ ۱۹۶۵ء سے اکتوبر ۱۹۷۳ء تک: مبلغ تیئیس ہزار دو سو پچاس روپے فقط (۲۳۲۵۰)۔

دارالعلوم دیوبند کو واپس کی ہوئی تنخواہ کی تفصیل

واپسی کی تاریخ: ۹/صفر ۱۴۲۴ھ

☆ شوال ۱۳۹۳ھ سے ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ تک: مبلغ تینتیس ہزار دو سو ستر روپے فقط (۳۳۲۷۰)۔

واپسی کی تاریخ: ۱۷/ربیع الاول ۱۴۲۴ھ

☆ از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ: مبلغ دس ہزار آٹھ سو اکیاسی روپے بارہ پیسے فقط (۱۰۸۸۱/۱۲)۔

☆ از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ: مبلغ دس ہزار پانچ سو تین روپے اٹھائیس پیسے فقط (۱۰۵۰۳/۲۸)۔

☆ از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ: مبلغ گیارہ ہزار چھ سو انہتر روپے چھہتر پیسے فقط (۱۱۶۶۹/۷۶)۔

☆ از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ: مبلغ گیارہ ہزار نو سو انچاس روپے ساٹھ پیسے فقط (۱۱۹۴۹/۶۰)۔

☆ از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ: مبلغ چودہ ہزار ایک سو اکتیس روپے چوالیس پیسے فقط (۱۴۱۳۱/۴۴)۔

☆ از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ: مبلغ بارہ ہزار دو سو سولہ روپے تینتیس پیسے فقط (۱۲۲۱۶/۳۳)۔

☆ از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ: مبلغ پندرہ ہزار ایک سو ستانوے روپے باون پیسے فقط (۱۵۱۹۷/۵۲)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۰۸ھ: مبلغ سترہ ہزار باسٹھ روپے پچاس پیسے فقط (۵۰/۱۷۰۶۲)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۰۹ھ: مبلغ بائیس ہزار دوسوساٹھ روپے اڑتالیس پیسے فقط (۴۸/۲۲۲۶۰)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۰ھ: مبلغ چوبیس ہزار پانچ سوستر روپے چوبیس پیسے فقط (۲۴/۲۴۵۷۰)۔

واپسی کی تاریخ: ۱۹/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۱ھ: مبلغ چھبیس ہزار نوسوچھپن روپے اسی پیسے فقط (۸۰/۲۶۹۵۶)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۲ھ: مبلغ انتیس ہزار چارسوبیس روپے سولہ پیسے فقط (۱۶/۲۹۴۲۰)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۳ھ: مبلغ تیس ہزار گیارہ روپے باون پیسے فقط (۵۲/۳۰۰۱۱)

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۴ھ: مبلغ چوالیس ہزار آٹھ سواڑتیس روپے فقط (۴۴۸۳۸)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۵ھ: مبلغ پینتالیس ہزار سات سوآٹھ روپے فقط (۴۵۷۰۸)۔

واپسی کی تاریخ: ۱۶/رجب ۱۴۲۴ھ

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۶ھ: مبلغ چھیالیس ہزار پانچ سواٹھتر روپے فقط (۴۶۵۷۸)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۷ھ: اڑتالیس ہزار چارسوچوالیس روپے فقط (۴۸۴۴۴)

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۸ھ: مبلغ پچپن ہزار آٹھ سوچھیانوے روپے فقط (۵۵۸۹۶)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۹ھ: مبلغ اکیاسی ہزار دوسوبیاسی روپے فقط (۸۱۲۸۲)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۲۰ھ: مبلغ اکیاسی ہزار دوسوبیاسی روپے فقط (۸۱۲۸۲)

واپسی کی تاریخ: ۲۲/ذیقعدہ ۱۴۲۴ھ

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۲۱ھ: مبلغ اٹھاسی ہزار تین سوچھپن روپے فقط (۸۸۳۵۶)

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۲۲ھ: مبلغ اکیانوے ہزار آٹھ سوچھیانوے روپے فقط (۹۱۸۹۶)۔

☆ ازمحرم تا ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ: مبلغ پچانوے ہزار چارسو چوبیس روپے فقط (۹۵۴۲۴)۔ٹوٹل: شوال ۱۳۹۳ھ سے ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ تک: مبلغ نو لاکھ انچاس ہزار آٹھ سو چار روپے پچھتر پیسے فقط (۹۴۹۸۰۴/۷۵)۔ دارالعلوم اشرفیہ اور دارالعلوم دیوبند کو واپس کی ہوئی تنخواہ کا ٹوٹل: مبلغ نو لاکھ تہتر ہزار چون روپے پچھتر پیسے فقط (۹۷۳۰۵۴/۷۵) دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم اشرفیہ سے لی ہوئی تنخواہ اسی سال واپس کی، جس سال دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینی بند کی، اور محرم ۱۴۲۴ھ سے تا وفات دارالعلوم دیوبند میں بغیر تنخواہ کے پڑھا رہے تھے" (عادل سعیدی صاحب کی تحریر مکمل ہوئی، جو حضرت کے وصال کے بعد حال ہی میں کسی واٹس ایپ سے مجھے حاصل ہوئی)

ولادت سے وفات تک- بہ یک نظر

حضرت مفتی صاحب کی ولادت ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) میں ہوئی ، کالیڑہ پالنپور سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، گاؤں میں مکتب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے ماموں مولانا عبدالرحمن صاحب کے ساتھ دارالعلوم چھاپی میں داخل ہوئے، وہاں اپنے ماموں اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، چھ (۶) ماہ کے بعد حضرت مولانا نذیر میاں پالنپوریؒ کے مدرسہ پالنپور چلے گئے، اور وہاں چار سال تک مولانا مفتی محمد اکبر میاں پالن پوریؒ اور مولانا ہاشم بخاریؒ سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں (شرح جامی تک) پڑھیں، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے تین سال تعلیم حاصل کی، ۱۳۸۰ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اور ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے اور اول پوزیشن حاصل کی، یہ دارالعلوم دیوبند کا سوواں (۱۰۰) سال تھا، فراغت کے بعد دو سال تک افتاء کا کورس کیا اور حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوریؒ سے فتویٰ نویسی کی مشق کی۔فراغت کے بعد ذیقعدہ

۱۳۸۴ھ سے دارالعلوم اشرفیہ عربیہ راندیر، سورت، گجرات میں تدریسی خدمات کا سلسلہ شروع کیا، اور شعبان ۱۳۹۳ھ تک مسلسل نو (۹) سال دارالعلوم اشرفیہ میں پڑھایا، شوال ۱۳۹۳ھ/نومبر ۱۹۷۳ء میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے ہوا، اور اس وقت سے تاوفات تقریباً سینتالیس (۴۷) دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں، جن میں آخری دس سال آپ دارالعلوم دیوبند کے سب سے باوقار منصب شیخ الحدیث وصدرالمدرسین کے منصب پر فائز رہے۔ وفات ۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت چاشت قریب سات بجے ممبئی کے ایک اسپتال میں ہوئی، اور اسی دن شام میں جوگیشوری کے قبرستان میں مدفون ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی وفات صرف دارالعلوم دیوبند کا نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کا سانحہ ہے، آپ کے جانے سے ایسا خلا پیدا ہوا ہے، جس کا پر ہونا آسان نہیں ہے، اللہ پاک آپ کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے اور ہمیں آپ کے نقش جمیل پر چلنے کی سعادت عطا فرمائے آمین

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❀...❀...❀

تری لحد پر خدا کی رحمت، تری لحد کو سلام پہونچے

مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
نائب ناظم امارت شرعیہ بہار واڑیسہ جھارکھنڈ

مفکر اسلام، مفسر قرآن، محدث کبیر، محقق دوراں، فکر نانوتوی اور رموز ولی اللہی کے شارح وامین، فقیہ زمن، امام المنطق والفلسفہ، نمونہ سلف، درجنوں کتابوں کے مصنف، ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر مدرس، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری نے ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء مطابق ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بروز منگل بوقت چاشت سنجیونی ہوسپیٹل ملاٹ ممبئی میں داعی اجل کو لبیک کہا، ان کی طبیعت ادھر کئی مہینوں سے خراب چل رہی تھی، اتار چڑھاؤ آتا رہتا تھا، رمضان المبارک میں ان کی تفسیروں کا سلسلہ ممبئی میں جاری تھا، سوشل میڈیا پر افادات آ بھی رہے تھے، پھیپھڑے میں پانی بھر جانے کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری تھی اور یہی مرض الموت ثابت ہوا، تدفین پانچ بجے شام اوشیوارہ مسلم قبرستان جوگیشوری (ویسٹ) ممبئی میں عمل میں آئی، پہلی نماز جنازہ ان کے صاحبزادہ مولانا عبدالوحید صاحب نے سنجیونی نرسنگ ہوم سے متصل مسجد کے قریب پڑھائی اور دوسری نماز جنازہ کی امامت حضرت کے ایک اور صاحبزادہ مولانا عبداللہ نے قبرستان سے متصل کی ، لاک ڈاؤن کی وجہ سے محدود تعداد میں ہی لوگوں کو جنازہ میں شرکت کی اجازت ملی، حضرت مفتی صاحب کے انتقال سے علمی دنیا کا جو خسارہ ہوا ہے اس کی تلافی کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، اہل علم وفن بہت ہیں، خود دارالعلوم دیوبند میں علمی دنیا کے شمس وقمر، ماہ ونجوم کی کثرت ہے، اس کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ ''ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے'' پس ماندگان میں ۹ لڑکے، دو لڑکیاں بقید حیات ہیں پوتے پوتیاں نواسے نواسیوں سے بھرا پرا گھر

چھوڑا۔اہلیہ ۲۰۱۱ء میں انتقال فرما گئیں تھیں،اور حضرت کی زندگی میں ہی دونو جوان لڑکوں نے داغ مفارقت دے دیا تھا۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا (یحییٰ) بن نور محمد کی ولادت ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ کے آخری ماہ میں ہوئی، یہ تاریخ بھی تخمینی ہے، واک پیڈیا میں تاریخ ولادت ۱۹۴۲ء درج ہے، حضرت کی جائے پیدائش کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) ہے جو پالن پور سے تیس میل جنوب مشرق میں واقع ہے، ابتدائی تعلیم کا آغاز ان کے والد محترم نے کروایا، پھر کالیڑہ کے مکتب میں بیٹھا دئے گئے، یہاں آپ نے مولانا داؤد صاحب چودھری، مولانا حبیب اللہ صاحب چودھری اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب جونکیہ سے کسبِ فیض کیا، فارسی کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم چھاپی میں اپنے ماموں مولانا عبدالرحمن صاحب شیرا سے حاصل کی، چھ ماہ کے بعد اپنے ماموں کے ساتھ ان کے وطن ”جونی سیندھی“ آگئے اور فارسی کی تعلیم جاری رکھی، عربی کی ابتدائی اور متوسطات تک کی تعلیم حضرت مولانا نذیر میاں صاحب پالن پوری کے مدرسہ سے حاصل کیا، اس زمانہ میں مولانا محمد ہاشم بخاری (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند) یہاں استاذ تھے، چنانچہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، ۱۳۷۷ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور تشریف لائے اور یہاں تین سال تک وہاں کے نامور اساتذہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جموئی مولانا مفتی یحییٰ صاحب سہارنپوری، مولانا عبدالعزیز رائے پوری رحمہم اللہ سے منطق وفلسفہ اور دوسرے علوم متداولہ کی درسی کتابیں پڑھیں، ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں سند فراغت پائی، شوال میں دارالافتاء میں داخل ہوئے، اور ڈیرھ سال بعد معین مفتی بنائے گئے، فراغت کے بعد آپ نے حفظ قرآن شیخ محمود عبدالوہاب مصری سے کیا جو ان دنوں جامعہ ازہر قاہرہ کی طرف سے دارالعلوم میں مبعوث تھے۔

تدریسی زندگی کا آغاز دارالعلوم اشرفیہ راندیر سے ہوا، ۱۳۸۴ھ سے ۱۳۹۳ھ تقریباً نو سال درس نظامیہ کی

اعلیٰ نصابی کتابیں پڑھائیں، یہاں آپ نے تفسیر، عقائد، اصول تفسیر، فقہ اور اصول فقہ کی منتہی کتابوں کا درس دیا، تصنیف وتالیف کا آغاز بھی وہیں سے ہوا، چنانچہ داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت، العون الکبیر وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں، ۷؍رجب ۱۳۹۳ھ کی مجلسِ شوریٰ کے ایک فیصلہ کے مطابق بحیثیت استاذ دارالعلوم دیوبند میں آپ کی تقرری عمل میں آئی، اللہ کے فضل اور اپنی محنت کی بدولت آپ مسلسل ترقی کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے زمانہ ۲۰۰۸ء مطابق ۱۴۲۹ھ میں بخاری شریف جلد اول کا درس بھی آپ سے متعلق ہوا اور آپ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے، آپ کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد چھیالیس ہے، جس میں تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی کی آٹھ جلدیں اور تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری کی بارہ جلدیں شامل ہیں، صدر جمہوریہ ہند پرتیبھا دیوی سنگھ پاٹل نے آپ کو عربی میں علمی شغف اور مسلمہ قابلیت کے لئے ۱۹؍جون ۲۰۱۲ء کو ایوارڈ سے نوازا تھا۔ تصوف کے رموز آپ نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب اور مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہم اللہ سے سیکھے اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت بیعت پائی، تین بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی، پہلا حج ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں اور آخری حج ۱۹۹۰ء میں وزارت حج واوقاف سعودی عرب کی دعوت پر کیا، ۱۴۱۴ھ میں ایک سفر عمرہ کا بھی آپ نے کیا، آپ کا فیض علمی ہندوستان ہی نہیں دنیا کے بیشتر ملکوں میں شاگردوں کے ذریعہ پہونچا، خود آپ بھی رمضان میں محاضرات کے لئے کناڈا اور برطانیہ خصوصیت کے ساتھ بلائے جاتے تھے، گزشتہ رمضان بھی آپ نے لندن میں گذارا تھا اور آپ کی تقریروں سے مسلمانوں کی بڑی تعداد مستفیض ہوتی تھی، لندن کی مختلف مجلسوں میں میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔

میری پہلی باقاعدہ ملاقات حضرت مفتی صاحب سے صدسالہ کے سال ان کے گھر پر ہوئی، یہ میرا جلالین کا سال تھا یعنی عربی ششم کا، اور میں اپنی پہلی تصنیف فضلائے دارالعلوم اور ان کی قرآنی خدمات کے لئے مواد جمع

کرر ہا تھا، حضرت کی تفسیر ہدایت القرآن کے نام سے اس زمانہ میں قسط وار چھپ رہی تھی، میں حضرت کے پاس بعد نماز عصر پہونچ گیا اور ان کی زندگی اور تفسیر سے متعلق تفصیلی انٹرویو لیا، جس کا ایک حصہ میری کتاب فضلائے دارالعلوم اوران کی قرآنی خدمات میں شامل ہے، مجھے یاد ہے کہ جب میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ بہت ساری تفسیر کی موجودگی میں آپ کو اس کام کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، فرمایا کہ ''پاگل پن ہے'' میں خاموش ہو گیا کہنے لگے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ قرآن کریم کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے، میں سوچتا ہوں کہ کوئی خاص بات اللہ تعالیٰ اس کام کی وجہ سے میرے دل میں بھی ڈال دے گا، پھر فرمایا کہ اس تفسیر کا آغاز مولانا کاشف الہاشمی نے کیا تھا، مکتبہ حجاز لیتے وقت اس تفسیر کی تکمیل کا وعدہ میں نے کیا تھا اسی کو نبھار ہا ہوں۔

حضرت مفتی صاحب سے میرے تعلقات دورۂ حدیث کے نتیجہ امتحان آنے کے بعد شروع ہوئے، دورۂ میں میری جب پوزیشن آ گئی تو حضرت کی توجہ میری طرف مبذول ہوئی، دورۂ حدیث کی بیشتر کتابیں میں نے حضرت سے ہی مدنی مسجد میں پڑھی تھیں، اور تقریریں بھی نقل کی تھیں، دارالعلوم بند تھا اور کیمپ میں دورہ کی اکثر کتابیں حضرت ہی کے زیر درس تھیں، بعد میں بخاری شریف حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب پڑھانے لگے تھے۔ دورہ سے فراغت کے بعد جب میں نے افتاء میں داخلہ لیا تو حضرت ہی اس شعبہ کے ذمہ دار تھے، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سفر حج پر چلے گئے تھے، چنانچہ داخلہ کی کارروائی حضرت نے ہی مکمل کرائی، داخلہ سے پہلے ہی حکم دیا کہ شامی کی پہلی جلد، طحطاوی علی المراقی اور فتاویٰ رشیدیہ اپنے اپنے پیسوں سے خرید لاؤ، حکم کی تعمیل کی گئی، پھر فرمایا کہ کتاب کے صفحات الٹنا سیکھو، تم لوگ مدرسہ کی کتابوں کی جلد الٹ الٹ کر توڑ دیتے ہو، پھر کھول کر دکھایا کہ اس طرح کتاب کھولنے سے جلد نہیں ٹوٹتی ہے، پہلے سبق میں تین نصیحتیں بھی کیں، ایک یہ کہ اگر فتویٰ تم کو لکھنا ہو تو سوال اپنے قلم سے کبھی نہیں لکھنا، جواب ہمیشہ مستفتی کے سوال والے کاغذ سے ہی شروع کرنا، چاہے ایک سطر ہی اس کاغذ پر آئے، تاکہ کوئی بدل نہ سکے، دوسطروں یا الفاظ کے بیچ میں اتنا

فاصلہ نہ چھوڑنا کہ کوئی اضافہ کرسکے، یہ تینوں نصیحتیں آج تک کام آرہی ہیں، پھر فرمایا دستخط صاف صاف کرنا، اس لئے کہ فتویٰ کی اہمیت مفتی کی شناخت سے ہوتی ہے، پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ دستخط کا ٹیڑھا پن مزاج کے ٹیڑھے پن کو بتاتا ہے۔

افتاء کے سال ہی میں نے حضرت کی تقریر ترمذی سترہ سو صفحات میں نقل کیا، مفتی رشید احمد لینیسیا جنوبی افریقہ ان تقریروں کو ٹیپ کرتے اور میں رات کو کیسیٹ کی مدد سے نقل کرتا، بعد میں مفتی رشید احمد نے وہ ٹیپ ریکارڈر مجھے ہدیہ کردیا جو آج بھی میرے پاس موجود ہے، میں نے وہ تمام نقل شدہ صفحات نظر ثانی کے لئے حضرت کی خدمت میں پیش کردیا تھا، حضرت کی رائے تھی کہ میں ایک بار پھر ترمذی شریف ان سے پڑھوں ،تقریریں قلم بند کروں اور دونوں کو ملاکر کے ایک مسودہ تیار کروں ، حضرت کی نظر ثانی کے بعد اسے شائع کیا جائے ، حضرت کی تجویز یہ بھی تھی کہ میں مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور ویشالی سے دیوبند آجاؤں بال بچوں کے ساتھ نان و نفقہ حضرت نے اپنے ذمہ لینے کی بات بھی کہی ،لیکن اسی زمانہ میں حضرت کے بڑے صاحبزادہ کا ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا، حضرت پر اس کا زبردست اثر رہا اور بات آئی گئی ، ہوگئی ، بعد میں حضرت کی تقریری افادات پر مشتمل تحفہ الالمعی سامنے آئی۔

حضرت نے میری کئی کتابوں کی حرفاً حرفاً تصحیح کی ''دین کی دعوت کا آسان طریقہ'' جب میں نے لکھا تو حضرت نے ایک ایک سطر پڑھا، ذیلی عناوین لگائے ، پیش لفظ لکھا اور ضروری حذف و اضافہ کیا، حضرت کے قلم کی یہ تصحیح آج بھی بطور تبرک نور اردو لائبریری حسن پور گنگھٹی بکساما مہوا ویشالی میں موجود ہے۔

میں نے جب آثار السنن پر تفہیم السنن کے نام سے کام شروع کیا تو شروع کے چند صفحات ان کے پاس لے گیا، فرمایا کتاب لکھنے کے لئے یہ طے کرنا چاہیے کہ یہ کتاب کس کے لئے لکھی جارہی ہے، میں نے کہا کہ سوچتا ہوں ،طلبہ اساتذہ سب کے لئے مفید ہو، فرمایا: تب ٹھیک ہے، کتاب تیار ہوئی ، پہلی جلد چھپ گئی، حضرت کی

خدمت میں پیش کیا،تو اپنی تپائی پر رکھ لیا، چھ ماہ بعد میرا دیو بند جانا ہوا تو کتاب وہیں پر رکھی ہوئی تھی، کہنے لگے قیلولہ کے وقت اسے پڑھتا ہوں، پھر فرمایا کہ تحویل قبلہ کی بحث اس میں بہت اچھی آئی ہے،رطب و یابس سے پرہیز کیا ہے،اچھا کیا، پھر ایک دوسری جگہ نکالی اور فرمایا کہ یہ تعبیر صحیح نہیں ہے، پھول چڑھانا ہر حال میں تعبدی کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہاں پر پھول ڈالنا لکھنا چاہیے،حضرت اپنی ساری مشغولیت کے باوجود اتنی باریک نگاہی سے ہم جیسے شاگردوں کی تحریروں کو پڑھ کر اصلاح فرمایا کرتے تھے۔

میں جن دنوں مدرسہ احمدیہ ابابکر پور ویشالی میں تھا، مدرسہ نے پچھتر سال پورے کر لئے تو ڈائمنڈ جوبلی کے طور پر ایک تقریب کے انعقاد کا فیصلہ ہوا،اس تقریب میں شرکت کے لئے دعوت کی غرض سے حضرت کی خدمت میں میری حاضری ہوئی،حضرت ان دنوں حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعۃ لکھنے میں مشغول تھے، میری دعوت پر فرمایا کہ نہیں جاؤں گا،ایک گھنٹہ تقریر ہوگی، تین دن سفر میں جائے گا اور شرح کا کام رک جائے گا،اس جواب نے مجھے مایوس کیا، میرے دیو بند کے ہر سفر میں حضرت کا معمول تھا کہ ایک وقت دعوت کرتے تھے،ایک سفر سے دوسرے سفر تک جتنی کتابیں حضرت کی چھپی ہوتیں وہ سب ہدیہ کرتے، پھر ایک لفافہ بھی دیتے جس میں سفر خرچ کے طور پر کچھ رقم ہوتی، چلنے لگا تو فرمایا کہ کل دن کے کھانے پر آجانا، میں نے بجھے دل سے کہا کہ ٹھیک ہے، اگلے دن کھانے پر حاضری ہوئی تو کہنے لگے ایک شرط پر میں تمہارے یہاں جاؤں گا، میں نے فوراً کہا کہ حضرت! استاذ شاگرد میں شرط نہیں چلے گی، آپ جو کہیں گے وہ میں کروں گا، آپ جائیں یا نہ جائیں،فرمایا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے جتنے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں اس کی فوٹو کاپی میں نے حاصل کر لی ہے،صرف خدابخش والا نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا ہے، میں نے وہاں کے کئی ذمہ داروں کو لکھا،لیکن کامیابی نہیں ملی،تم یہ نسخہ اوپر کرو، میں آؤں گا، میں نے کہا کہ کوشش کروں گا، چنانچہ بڑی کوشش کے بعد میں نے اس نسخہ کی مائیکروفلم حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی،حضرت کی خدمت میں بھیجا، بڑی دعائیں ملیں،حضرت پروگرام میں تشریف

لائے، ڈیڑھ گھنٹہ تقریر فرمائی، واپسی میں میرے کہنے پر میرے قائم کردہ مدرسہ معہد العلوم الاسلامیہ چک چمیلی سرائے ویشالی بھی تشریف لے گئے، وہ زمانہ بالکل ابتدائی تھا، مدرسہ میں بیت الخلاء اور پیشاب خانہ بھی نہیں بنا ہوا تھا، حضرت نے خفگی کا اظہار کیا، میں نے حضرت کے جانے کے بعد پہلی فرصت میں اس کام کو کرایا۔

رحمۃ اللہ الواسعہ مکمل ہوئی، اس کی پہلی جلد چھپ کر آئی تو اس میں حضرت نے میری اس خدمت کا ذکر کیا، جو میرے لئے باعثِ سعادت اور سند ہے، آج جبکہ علمی استحصال کا عام مزاج بن گیا ہے، لوگ پوری پوری تصنیفات دوسروں کی اپنے نام سے چھپوادے رہے ہیں، حضرت کا یہ عمل لائق تقلید بھی ہے اور قابل تحسین بھی۔

افتاء کے سال میں میرا حضرت کے گھر اندرون کوٹلہ دیوبند بہت جانا ہوتا تھا، حضرت مطالعہ میں مشغول ہوتے اور ہم لوگ بھی ان کی لائبریری سے استفادہ کرتے، حضرت کثیر العیال تھے، لیکن کبھی بھی بچوں کے رونے کی آواز گھر سے نہیں آتی تھی، میں نے کہا کہ حضرت ہم لوگوں کے یہاں تو بچے رو رو کر جان عاجز کردیتے ہیں، یہاں کوئی آواز ہی نہیں آتی، کہنے لگے نظام الاوقات ایسا بنا ہوا ہے کہ چھوٹا بچہ ہمیشہ گود میں ہی رہتا ہے، پھر کیوں روئے گا، فرمایا: اسی لئے میں مہمانوں تک کو کہہ دیتا ہوں کہ میرے یہاں دن کے کھانے کا وقت اتنے بجے اور رات کے کھانے کا وقت اتنے بجے ہے، اس کی پابندی ضروری ہے، فرمایا کہ وقتی طور پر یہ بات ذرا گراں گزرتی ہے، لیکن اگر اس کے خلاف ہو تو میرا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔

گھریلو زندگی میں بھی بیوی بچوں کی بڑی رعایت کرتے تھے، ان کی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند کے اچھے طلبہ کو اتالیق رکھتے تھے اور اپنی نگرانی میں ان سے پڑھوایا کرتے تھے، مولانا خورشید احمد گیاوی اور مولانا اشتیاق احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند بھی حضرت کے بچوں کے اتالیق رہے اور پڑھانے کی تربیت حضرت کی زیر نگرانی حاصل کی، آج یہ دونوں دارالعلوم دیوبند کے کامیاب ترین استاذ ہیں۔

عید میں تو میں گھر چلا آتا تھا، لیکن پورے دور طالب علمی میں عید الاضحیٰ دیوبند میں ہی گزارتا، ایک سال ہم

لوگ قربانی کے دن حضرت کے گھر پہونچے، حضرت نے روٹی کلیجی سے ضیافت فرمائی، ہم کئی لوگ تھے، ظاہر ہے کلیجی کی مقدار ہی کیا ہوتی ہے، حضرت نے صاحب زادہ سے کہا کہ اماں سے پوچھو، ہم لوگوں کے حصہ میں اور ہے ؟ گھر سے جواب آیا نہیں، اب آپ لوگوں کے حصہ کا نہیں ہے، فرمایا: خصی بچے پالتے ہیں اور کلیجی سب بڑے اڑا ڈالتے ہیں، اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ بچے محروم نہ رہیں، کیوں کہ ان کا بھی حق اور حصہ ہے۔

پھر فرمایا کہ گھر کی عورتوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے، ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ خالی برتن بار بار اندر بھیجتے رہتے ہیں، عورتیں اپنے حصے کا بھی جو تھوڑا بہت رہتا ہے، بھیج دیتی ہیں، اور ان کی قسمت میں دیگچی پوچھنا ہی آتا ہے، یہ زیادتی ہے، سالن جتنا لائے ہو تمہارے علم میں ہے، پھر بار بار خالی برتن کیوں بھیجتے ہو، ختم ہو گیا تو ہو گیا، عورتوں کو محروم نہ کرو یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔

ایک بقرعید کے موقع سے دیکھا کہ کباب خود ہی لگا رہے ہیں، ہم لوگ بھی جا پہونچے تو کچھ سیخ ہم لوگوں کو دیتے اور کچھ اپنے بچوں سے کہتے کہ اماں کو دے آؤ، اہلیہ نے ان کا بڑا ساتھ دیا ان کے انتقال سے حضرت ٹوٹ کر رہ گئے تھے، دو جوان بچوں کا جنازہ بھی انہیں اٹھانا پڑا جو ان کی صحت کو کھوکھلا کر گیا، لیکن راضی برضاء الٰہی کے قائل بھی تھے اور عامل بھی، اس لئے آگ اندر اندر سلگتی تھی، لیکن اس کی تپش دوسرے یا تو محسوس نہیں کرتے تھے یا کم کرتے تھے۔

حضرت کی محبت وشفقت کا دائرہ مجھ ہی تک نہیں میرے متعلقین تک پھیلا ہوا تھا، میرے عزیز شاگرد ہیں اظہار الحق قاسمی جب دار العلوم میں زیر تعلیم تھے، ایک بار میں نے تعارف کرا دیا تو وہ پوری توجہ اور شفقت کے مستحق ہو گئے، میرے دولڑکے محمد نظر الہدیٰ قاسمی اور ظفر الہدیٰ قاسمی کا بھی وہ خیال رکھتے تھے، پہلی بار جب ان دونوں کو ملانے لے گیا تو ظفر الہدیٰ رومال سے داڑھی ڈھانپے ہوئے تھے فرمایا کہ اس طرح داڑھی وہ لپیٹتا ہے جو داڑھی کاٹتا ہے، ظفر الہدیٰ نے جلدی سے رومال ہٹایا تب انہیں یقین ہوا کہ معاملہ گڑبڑ نہیں ہے، حضرت مفتی

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی خصوصیات میں ان کا تحقیقی ذوق ،نظام الاوقات کی پابندی، علمی کاموں میں انہماک ،صاف صاف اپنی باتیں کہہ گذرنا اور بلاخوف لومۃ لائم کہنا قابل ذکر ہیں ،صدسالہ کے سال الہ آباد کے ایک بزرگ دیوبند تشریف لائے ،حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دس روپے اجلاس صدسالہ کے لئے دیا ہے،اور صبح جب میں اٹھا تو بعینہ یہ دس کا نوٹ تکیہ کے نیچے موجود تھا،حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالحدیث میں ان کے استقبال میں جلسہ کیا اور فرمایا کہ موصوف صاحب نسبت بھی ہیں ،اور اہل دل بھی ، پھر فرمایا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت زیادہ بھی دے سکتی تھیں ،لیکن دس روپے دینے کا مطلب ہے کہ امت کا غریب سے غریب شخص بھی اس اجلاس کے مالی تعاون میں حصہ لے سکے، پھر جو دس روپے کی بارش شروع ہوئی تو کئی ہزار روپے جمع ہوگئے ،اور مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا، میں خود اس مجلس میں شریک تھا،حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک تھے،وہ اجلاس کے بعد اٹھ کر کتب خانہ چلے گئے ،رات بھر تعبیر خواب کی کتابوں کو کھنگالتے رہے،اور بالآخر صبح دم اس نتیجے پر پہونچے کہ خواب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روپے دے سکتی ہیں ،لیکن وہ روپے بیدار ہونے کے بعد سرہانے موجود رہے یہ صحیح نہیں ہے،انہوں نے تمام حوالہ جات کے ساتھ یہ بات حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے رکھدی ،حضرت نے سکوت اختیار کیا۔

مباحث فقہیہ اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں بھی ان کا فقہی نقطۂ نظر سامنے آتا تھا جو ان کے گہرے مطالعہ اور فقہی جزئیات پر ان کی باریک نگاہی کا مظہر ہوتا، الفتاوی پر ان کا قیمتی حاشیہ بھی ان کی فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے،بعض موقعوں سے تو یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ تجویز تیار ہوگئی ،خواندگی ہورہی ہے کہ حضرت پہونچ گئے ،اب جو حضرت نے گفتگو شروع کی ،حوالہ جات منگوائے گئے تو وہ بنیاد ہی ڈھہ گئ جس پر تجویز کی عمارت کھڑی کی گئی تھی ،ایک موقع سے جب دہلی میں جمعیتِ علماء نے تحفظ ختم نبوت کا اجلاس منعقد کیا تو ایک

صاحب نے قادیانیوں کے کفر سے متعلق تجویز کی خواندگی کی ،اناؤنسر نے تجویز کی تائید کے لئے حضرت مفتی صاحب کا نام پکارا،حضرت نے فرمایا کہ یہ تو اللہ کا فرمان ہے،اس کی تائید بندہ کیا کرے گا، یہ عجیب وغریب بات ہے۔اس کے بعد جو حضرت نے قرآن وحدیث کے حوالے سے اس پر گفتگو شروع کی تو مجمع عش عش کر رہا تھا۔

اس موقع پر حضرت کے بعض ملفوظات کا ذکر کرنا افادہ سے خالی نہیں ،فرمایا:تمہارے دشمن بازار میں تمہارا مذاق اڑائیں اس سے بہتر ہے کہ دوستوں کے ذریعہ تمہاری اصلاح ہوجائے ،فرمایا کرتے کہ بہت سے لڑکے مدرسے میں پڑھنے کے لئے آجاتے ہیں علم پڑھنے سے آتا ہے پڑنے سے نہیں ،دس سال مسلسل پڑھو گے تو دس سال کے بعد کتاب سے علم نکلتا ہوا دکھائی دے گا ،اس قسم کے بہت سارے ملفوظات ہیں ،جن کو جمع کر دیا جائے تو ایک کتاب تیار ہوجائے ،اس مختصر سے مضمون میں ان سب کے ذکر کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ہی موقع۔

بات لمبی ہوگئی اور حضرت کی تدریسی خصوصیات پر گفتگو نہیں آسکی ، جو حضرت کا اصل میدان تھا واقعہ یہ ہے کہ تدریسی کتابوں کے متن کی ایسی تشریح جو طلبہ کے ذہن ودماغ کو روشن کردے ،ان کی تدریس کی اہم خصوصیت تھی ،اسی وجہ سے ان کا درس دارالعلوم میں مقبول ترین تھا اور بہت کاہل طالب علم بھی ان کے درس میں بیٹھنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا تھا۔

حدیث میں آتا ہے کہ قرب قیامت علم اٹھ جائے گا ،مطلب یہ بیان کیا گیا کہ اہل علم اٹھتے جائیں گے ،جس تیزی سے اہل علم اٹھتے جارہے ہیں اس سے تو ایسا ہی لگتا ہے کہ قیامت قریب ہے ،اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند فرمائے ،سئیات سے درگذر کریں ،اور پس ماندگان کو صبر جمیل بخشے ،شاعر کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ۔

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں شب و روز
غضب تو یہ ہے کہ اب آفتاب ٹوٹا ہے

آئی جوان کی یاد۔۔۔۔

پروفیسر محمد فیضان بیگ صاحب
شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دارالعلوم سے قدیمی پشتینی تعلق کی وجہ سے وہاں کے اکابرین مشائخ اور اساتذہ سے یک گونہ عقیدت ہم سب گھر والوں کو رہی ہے، اگرچہ مجھے براہ راست کبھی کسی دینی ادارہ میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود منجملہ اور حضرات کے حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ کے نام سے کان ناآشنا نہیں تھے، لڑکپن میں جب میں جامعہ ملیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں پڑھتا تھا اور زمانے اور ماحول کے برعکس تبلیغ والوں کی برکت سے دین میں کچھ کچھ دلچسپی شروع ہوئی تھی تو ہدایت القرآن کے نام سے ایک پارے کا ترجمہ، تشریح وتفسیر حضرت اقدس مفتی صاحب کا کاپی سائز میں چھپا تھا، وہ نظر سے گزرا، پڑھ کر بہت مفید لگا، مفتی صاحب سے غائبانہ تعلق میں ایک درجہ کی مزید زیادتی ہوئی اور اگلے پاروں کی تلاش شروع ہوئی، لیکن دیوبند سے براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے مزید پارے جو نہ معلوم چھپے تھے کہ نہیں، دستیاب نہ ہو سکے، پھر لڑکپن کے کھیل کود میں بات ذہن سے محو ہوگئی۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی زیارت غالباً ۱۹۸۰ء میں ہوئی، جامعہ ملیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے اوپر ایک قومی سیمینار منعقد ہوا تھا، جس کی جگہ ہمارے جامعہ کے ہائر سکنڈری اسکول کا کومن روم تھا، ملک کے بڑے بڑے دانشوروں اور علماء کا اجتماع تھا، دینی شوق میں ہم بھی چلے گئے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ایک کونہ میں کھڑے ہونے کی جگہ ملی، سنجیدہ علمی مذاکرات تو ہمارے پلے کیا پڑتے،

البتہ ایک دلچسپ لطیفہ ذہن کی سطحوں سے چسپاں رہ گیا، قدیم وجدید کا تنازعہ تھا، ملک کے مشہور دانشور پروفیسر سید طاہر محمود صاحب جو بعد میں مانیرٹی کمیشن کے صدر بھی رہے، مناقشہ میں حصہ لیتے ہوئے شکایتی انداز میں بولے کہ آپ علمائے کرام تو جب ہم کچھ کہتے ہیں تو ہماری بات پر کان دھرتے ہی نہیں، ہم کو تو آپ لوگ شیطان سمجھتے ہیں، بس پھر کیا تھا، اس کے اوپر اگلا جملہ مفتی صاحب نے چپکایا کہ ''نہیں جناب ایسا نہیں ہے، اگر ہم آپ کو شیطان سمجھتے تو فوراً لاحول پڑھتے اور آپ یہاں سے بھاگتے نظر آتے''، مفتی صاحب کی اس حاضر جوابی پر پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا، ہم لڑکوں کو بہت اچھا لگا کہ علماء بھی اتنے بذلہ سنج ہوتے ہیں، اس کے بعد پھر سالہا سال تک دیوبند کی طرف کوئی رخ نہیں رہا، مفتی صاحب کو بھی تقریباً بھول گئے، عمر ذرا کچھ اور بڑھی، تو جماعتوں میں آنا جانا شروع ہوا، اس درمیان مفتی صاحب کا شمار دارالعلوم کے حدیث کے بڑے اساتذہ میں ہونے لگا تھا، میں اس درمیان تعلیمی تجربی مراحل سے گذر کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاذ ہوگیا تھا، اپنے تبلیغی حلقوں میں کبھی کبھی یہ بات کانوں میں پڑتی تھی کہ دارالعلوم میں جو مفتی سعید صاحب ہیں، وہ اپنے درس میں، مجلس میں برملا تبلیغ کی بعض باتوں پر تنقید کرتے ہیں، سن کر اچھا نہیں لگتا تھا، سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ کیوں کرتے ہیں، پھر سلسلہ علی گڑھ سے دیوبند جماعتوں میں جانے کا شروع ہوا، بھائی جان حضرت پروفیسر محمد سلمان بیگ صاحب رحمۃ اللہ علیہ- خلیفہ ومجاز بیعت حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ- جو خود بھی تبلیغ کے کام میں بہت سرگرم تھے بلکہ گویا تبلیغ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا ان کو بھی دیوبند سے بہت عقیدت تھی، دیوبند میں وہاں کے بہت سے حضرات ان کو جانتے مانتے بھی تھے، مفتی محمود الحسن گنگوہی صاحب، مولانا مرغوب الرحمن صاحب اور مولانا ارشد مدنی صاحب وغیرہ سے ان کا خاص تعلق تھا، دیوبند کی حاضری کے دوران جماعت کے اصول کے مطابق علماء کی خدمت میں بھی حاضری ہوتی تھی، اسی سلسلے میں کسی وقت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بہت ڈرتے ڈرتے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے اور معاف کرے بادل ناخواستہ حاضری دی، جا کر کردم بخود باادب بیٹھ گئے لیکن

ذرا ہی دیر گزری تھی کہ مفتی صاحب کی شفقت اور دلچسپ باتوں، علمی نکتوں اور مزاحی چٹکلوں سے طبیعت کا تکدر بالکل دور ہوگیا اور اپنی نالائقی اور بدگمانی پہ دل خود کو ملامت کرنے لگا، پھر جب کبھی علی گڑھ سے دیو بند حاضری ہوتی تھی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں بھی ضرور حاضر ہوتے تھے، ہم نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہمارے تایازاد بھائی مولانا محمد رضوان قاسمی صاحب مقیم مکہ مکرمہ جو مفتی صاحب کے درسی ساتھی یا ہمعصر ہیں ان کا حوالہ دے کر اپنا تعارف کرایا مفتی صاحب بہت خوش ہوئے، ہاتھ کے ہاتھ کئی قصے ان کے سنا ڈالے اور مانوسیت اور بڑھ گئی۔

تعلقات کی یہی حدود رہیں، جب کبھی دیو بند حاضری ہوتی تو حضرت والا سے بھی شرف ملاقات حاصل کر لیتے، پھر اللہ کی توفیق سے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ میرے بچوں محمد حیان اور محمد حبان کا داخلہ بہت نوعمری میں دارالعلوم میں ہوگیا، اب دارالعلوم میں بار بار حاضر ہونا ایک ضرورت بن گیا، ظاہر ہے کہ وہاں کے حضرات سے عقیدت و تعلق میں بھی اضافہ ہوا اور جب جہاں موقع ہوا ان حضرات کی مجالس سے خوشہ چینیوں کے مواقع بھی زیادہ فراہم ہونے لگے۔ خاص طور سے میاں محمد حبان سلمہ کو مفتی صاحب سے اور مفتی صاحب کو ان سے تعلق بڑھنے لگا، فراغت کے بعد تحقیق شامی اور ترتیب فتاوی کے سلسلے میں ان کا قیام مستقل دیو بند ہی میں ہوگیا تو انہوں نے حضرت مفتی صاحب کی عصر بعد کی مجلس کو گویا آپ اپنے او پر لازم کرلیا، کسی بزرگ سے اپنا اصلاحی تعلق قائم کر لینے کی ترغیب پر مفتی صاحب کے علاوہ کسی اور کے لئے تیار نہیں ہوئے، ان کے میلان کی پختگی کو دیکھتے ہوئے میں نے مفتی صاحب سے تنہائی میں یہ بات عرض کردی اور یہ التجا بھی پیش کی کہ اب میں ان کو آپ ہی کے سپرد کرتا ہوں، جس پر مفتی صاحب نے حامی بھری، میں سمجھ رہا تھا کہ اس قسم کی درخواستیں مفتی صاحب کے یہاں شب و روز کا قصہ ہیں، حضرت کو کب اس کا موقع ہوگا، لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ حضرت مفتی صاحب- اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے- یا تو کسی بات کے لئے ہاں نہیں کرتے تھے اور اگر کر لیتے تھے تو واقعی اس کا حق ادا کر

دیتے تھے، یہ گویا ان کی خردنوازی، عالی ظرفی اور پختگی کردار کا جزو لاینفک تھا۔ مفتی صاحب مجھ کو تھوڑا بہت تو پہچانتے ہی تھے اب اور بھی محبت فرمانے لگے، میں جب کبھی حاضر ہوتا حضرت بہت والہانہ انداز میں نہایت بشاشت کے ساتھ ''آؤ بھئی بیگ صاحب، آگے آجاؤ'' کہہ کر آگے بلا لیتے ،لیکن یہ ساری محبت اور سارا تعلق صرف عصر کے بعد کی مجلس ہی تک محدود تھا، اگر اپنی حماقت سے کسی اور وقت حاضری کی اجازت مانگی تو ایک آدھ بار کے علاوہ سوکھا صاف جواب انکار ہی میں ملا۔ ایک بار حاضر ہوا تو فرمایا کہ میں آجکل اعتکاف میں ہوں، تفسیر ہدایت القرآن مکمل فرمارہے تھے، فرمایا کہ بغیر اعتکاف کے کوئی کام مکمل نہیں ہوتا، اس لئے جب بھی مجھے کوئی اہم کام کرنا ہوتا ہے تو میں معتکف ہوجاتا ہوں، اس سے مراد حضرت کی تعلقات کے سلسلے کو یکسر منقطع کر کے اپنے تصنیفی کام کو مکمل کرنے کے لیے یکسو ہوجانا تھا، میں نے بھی سوچا کہ واقعی بات تو یہی ہے۔

چند ماہ کے بعد پھر حاضری ہوئی تو تفسیر ہدایت القرآن کا کام تقریباً نمٹ چکا تھا، عصر کے بعد کی مجلس میں حاضری کے بعد ایک جلد ہدایت القرآن کی ازراہ عنایت مجھے بھی عطا فرمائی، مجلس سے اٹھ کے آنے لگا تو فرمایا کہ بیگ صاحب اس کے اوپر کچھ لکھ دیجیو، میں سناٹے میں آگیا، کہ نہ میرا میدان اور نہ مجھ میں اتنی اہلیت، تاہم علی گڑھ واپس آنے کے بعد محض امتثال امر میں تفسیر کو دیکھنا شروع کیا، تو واقعی بہت اچھوتی، دلچسپ اور نہایت مفید معلوم ہوئی، کچھ تاثرات فی البدیہ قلمبند کرواکے ڈرتے ڈرتے حبان میاں کے ذریعہ حضرت کی خدمت میں بھجوادیے، بیس پچیس صفحے کا ایک چھوٹا سا مقالہ سا ہوگیا، حضرت کو پیش کیا گیا تو اول سے آخر سب پڑھا اور بہت خوش ہوئے اور حبان میاں سے بہت تعریف کی، ظاہر ہے کہ میری تحریر اس قابل کہاں تھی، اس کو حضرت کی خردنوازی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے، جب میں حاضر ہوا تو مجلس میں دوبارہ اپنی مسرت کا اظہار کیا، فرمانے لگے کہ لیکن تم نے اس میں تعریف ہی تعریف لکھی ہے، کچھ خامیوں کی نشاندہی بھی کرنی چاہیے، میں نے تو دیا ہی اس لیے تھا کہ کچھ تنقید لکھ کر لاؤ تاکہ میری خامیاں مجھے معلوم ہوں، حالانکہ کچھ تھوڑی تجاویز میرے ذہن میں آئیں تھیں، لیکن احتراماً میں نے ان کو حذف کردیا تھا، خیر مجلس کے

اختتام پر تفسیر کا پورا سیٹ مجھ کو عنایت فرمایا اور فرمایا کہ ان پر بھی لکھنا، خاص طور پر آخری جلد کے بارے میں فرمانے لگے کہ اصل مسالہ تو اس میں ہے، اس کو بھی دیکھیو، چنانچہ میں نے آکر اس بے ربط تحریر میں نئی جلدوں کی روشنی میں اور کچھ اضافے بھی کر دیے۔

ظاہر ہے کہ حضرت سے بہت قریب کا اور بہت براہ راست شب وروز والا تعلق تو مجھ پردیسی کا تھا نہیں، کبھی کبھی ٹیلی فون پر گفتگو ہو جاتی تھی، وہاں بھی حضرت کی بے تکلفی اور ذرہ نوازی کا یہی حال رہتا تھا، اس سال حضرت کی ختم بخاری کی کیفیت معلوم کر کے بہت تشویش پیدا ہو گئی تھی، ممبئی علاج کے بعد جیسے ہی پتہ چلا کہ حضرت کی طبیعت اب بہتر ہے میں نے فوراً ٹیلیفون پر خیریت معلوم کی تو تعجب کی انتہا نہ رہی کہ حضرت بالکل ہشاش بشاش تھے، فرمانے لگے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، کورونا لاک ڈاؤن شروع ہو گیا تھا، میرے سب بچوں کو فرداً فرداً پوچھنے لگے، یہاں تک کہ ایک بچی جو لکھنؤ میں تھی اس کو بھی پوچھا کہ لکھنؤ والی آگئی کہ نہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت جب کسی سے تعلق قائم کرتے تھے تو اس میں کتنی سچائی خلوص اور اپنائیت ہوتی تھی۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت اب ہمارے درمیان نہیں رہے: جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور میری کیفیت کچھ اس عرب شاعر کی طرح سے ہے جس نے اپنی قریبی دوست کی وفات پر اپنے مرثیے میں کہا تھا:

عجبا أتوحشني وأنت إزائي

وضياء وجهك مالء سودائي

(میں بڑے تعجب میں ہوں، کہ تو مجھے شدید احساس تنہائی اور وحشت میں مبتلا کر رہا ہے، حالانکہ تو میرے سامنے موجود ہے اور تیرے چہرے کی تابانی میری سواد قلب کو پر کیے ڈال رہی ہے۔)

حضرت پر تو قریبی تعلقات والے تفصیل سے لکھیں گے، میں نے تو یہ چند سطور دوسروں کے لئے نہیں بلکہ اپنے اندرونی جذبے کی تسکین کے لئے تحریر کی ہیں۔

ایک عظیم محدث، مدرس اور محقق

حضرت مولانا انوار احمد اعظمی خیرآبادی
خادم جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ

شوال ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء میں، میں جب دورۂ حدیث کی تکمیل کے لئے دار العلوم دیو بند پہنچا تو دیکھا کہ علم وفن کے آفتاب و ماہتاب وہاں موجود تھے اور روشن ستاروں کی کہکشاں بھی، مسند اہتمام پر حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب (نور اللہ مرقدہ) جلوہ افروز تھے، شیخ الحدیث حضرت مولانا شریف حسن صاحب (نور اللہ مرجعہ) کا علم بخاری شریف جلدِ اول اور ترمذی شریف جلدِ اول کے درس میں بحرِ بے کراں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا اُبل رہا تھا (جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء میں حضرت مولانا شریف حسن صاحب کا انتقال ہو گیا) فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی (نور اللہ مرقدہ) اپنے علم وفن، ذہانت وفطانت، ذکاوت وظرافت اور ورع وتقویٰ سے دار العلوم کے در و بام کو منور ہوئے تھے، نمازِ عشاء کے بعد بخاری شریف جلدِ ثانی کے درس میں حرمِ کعبہ کی سی نورانیت کا سماں رہا کرتا تھا، اور حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب کے یہاں وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کا منظر۔

حضرت مولانا معراج الحق صاحب، حضرت مولانا عبد الاحد دیو بندی، حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاری اور عربی ادب کے امام حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی (رحمہم اللہ) جیسے علم وفن کے ماہرین اپنے علم وفن کا موتی لٹا رہے تھے۔ یہ تھے دار العلوم کے آفتاب و ماہتاب، اور علم کے روشن ستاروں کی جو کہکشاں تھی اس میں پالن پور کے افق سے نمودار ہو کر ایک روشن ستارہ ابھی قریبی زمانہ میں ہی شامل ہوا تھا مگر اس کی تیز رفتار روشنی

اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ یہ ستارہ مستقبل قریب میں ہی یہ کامل بن کر دار العلوم کے در و بام کو منور کرنے لگے گا، وہ ستارہ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ تھے، جو اِس وقت بارہ سال سے دار العلوم کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے اور علم وفن کا دریا بہا رہے تھے، ادھر چند سالوں سے حضرت مفتی صاحب مختلف قسم کے عوارض اور بیماریوں میں مبتلا تھے مگر نہایت عزیمت کے ساتھ ان پر صابر وشاکر تھے، سال گذشتہ بخاری شریف کے آخری درس میں مرض کا شدید حملہ ہوا، ان کی اور طلباء کی آہ وبُکا کے درمیان کسی طرح آخری حدیث مکمل ہوئی، دعاء سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحب بعجلت تمام اپنے صاحبزادے لے کر ممبئی اپنی صاحبزادی کے مکان پر پہنچے اور پھر فوراً ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے، مرض کی شدت کم ہوئی تو صاحب زادی کے مکان پر چلے آئے اتنے میں رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا تو سابقہ معمول کے مطابق حضرت مفتی صاحب نے وعظ ونصیحت اور دعاء کا سلسلہ شروع کر دیا جس کی وجہ سے امید ہو چلی تھی کہ جلد ہی صحت یاب ہو کر دیو بند واپس آ جائیں گے، مگر قضا وقدر کا فیصلہ نافذ ہو چکا تھا کہ زندگی بھر تھکا ماندا مسافر اب مستقل آرام کی نیند سو جائے، چنانچہ بیماری نے دوبارہ شدت اختیار کر لی تو مفتی صاحب کو ہسپتال لے جایا گیا وہاں ڈاکٹروں نے انھیں انتہائی نگہداشت والے شعبہ آئی، سی، او میں رکھا مگر اس دنیا کی زندگی کا وقت ختم ہو چکا تھا تو بروز سہ شنبہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء کو چاشت کے وقت یہ کہتے ہوئے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنجِ مزار میں
داغ فراق فرقت ِشب جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی اب خموش ہے
فقیر انہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعاء کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
وہی آج وعدہ وفا کر چلے

علم کا جو تابندہ ستارہ پالن پور کے افق سے نمودار ہوا تھا، دارالعلوم دیوبند آ کر یہ کامل بنا اور نہایت خاموشی کے ساتھ ممبئی کے افق پر غروب ہو گیا۔ رہے نام اللہ کا۔ یہ دنیا فانی ہے یہاں جو آیا ہے جانے کے لئے ہی آیا ہے مگر بہت سے جانے والے ایسے ہوتے، جن پر دنیا آنسو بہاتی ہے، دلوں میں ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے اور جو اپنے عظیم کارناموں کی وجہ سے زندۂ جاوید بن جاتے ہیں، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب (نوراللہ مرقدہ) بھی انھیں لوگوں میں سے تھے، ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی اور اپنے روشن کارناموں کی بنا پر انشاءاللہ العزیز وہ زندۂ جاوید رہیں گے۔

میں دارالعلوم میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اور حضرت مفتی صاحب کے یہاں ابھی دورے کی کوئی کتاب نہیں تھی اس لئے ان سے کسی کتاب کے پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا، بلکہ پورا سال سوائے ایک مرتبہ کی ملاقات بھی نہیں ہوئی، احاطۂ دارالعلوم میں ملاقات کا واقعہ پیش آیا کہ میں شیخ الادب حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی کے ساتھ جا رہا تھا، احاطہ مولسری میں قدرے لانبے قد کے ایک صاحب عربی کرتا پہنے ہوئے اور عربی انداز میں ہی سر پر سفید رومال لگائے ہوئے البیلے انداز میں مستانہ چال کے ساتھ چلے آ رہے تھے، دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کو سلام کرنے میں سبقت کرنے کی کوشش کی چنانچہ دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا السلام علیکم اور پھر دونوں نے وعلیکم السلام بھی ایک ساتھ ہی کہا، ان مولانا صاحب سے میں نے بھی سلام کیا اور مصافحہ کی سعادت حاصل کی، یہی بزرگ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری تھے۔ میں دار جدید کے کمرہ ۱۱ میں رہتا تھا، اس میں آٹھ لڑکے ضلع بستی کے تھے ان میں سے کوئی ایک حضرت مفتی صاحب کے یہاں مشکوٰۃ شریف پڑھتے تھے، وہ لڑکے جب کمرہ میں آتے تو ان پر وجد کی کیفیت ہوتی، کوئی تشریح کی خوبی بیان کرنے میں رطب اللسان ہوتا، کوئی

نحوی صرفی ترکیب پر فریفتہ ہوتا کوئی لغات پر تو کوئی اندازِ تقریر کی خوبی کو بیان کرتا، اور یہ سلسلہ پورے سال تک چلتا رہا، میں متاثر تو ضرور ہوتا مگر کسی دن بذاتِ خود جا کر درس کو سن لیتا اس کا اتفاق نہیں ہوا، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گھر واپس آ گیا تو پھر صد سالہ کے موقع پر ۱۹۸۰ء میں دیوبند جانے کا اتفاق ہوا، اس وقت کثرتِ ازدحام کی وجہ سے کسی سے ملاقات کا کوئی سوال نہ تھا۔

حضرت مفتی صاحب کے تبحرِ علم کا کچھ اندازہ ۱۹۸۶ء کی تحفظِ ختم نبوت کے ایک جلسہ میں ہوا جو دارالعلوم دیوبند کے احاطہ دارِ جدید میں منعقد ہوا تھا، مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے اپنی تقریر میں قادنیت کا مقابلہ کرنے والے صفِ اول کے لوگوں میں ایک صاحب کی نام لیا، اپنی باری آنے پر مفتی صاحب جب مائک پر آئے تو انھوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی بات کی نہایت مدلل انداز میں تردید کی اور بتایا کہ وہ صاحب تو بہت بعد میں تردید قادیانیت کے قافلہ میں شریک ہوئے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ المباحث الفقہیہ کے ایک سمینار میں فدائے ملت حضرت مولانا اسعد مدنی صاحب نے کسی بات کی وضاحت کی تو مفتی صاحبؒ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ حضرت سے سہو ہو گیا اصل بات اس طرح اور یہ ہے۔

یہ تو دور دور سے ملاقات کا واقعہ ہے، پہلی مرتبہ قریب سے ملاقات کی تقریب یہ ہوئی کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دیوبند تشریف لے جا رہے تھے میں بھی ان کے ساتھ تھا، حضرت اقدس کی وساطت سے میں نے اپنی کتاب ''عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور شہدائے اسلام'' حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کی تو تھوڑی دیر کتاب کو مختلف جگہوں سے دیکھا اور دعائیں دیں۔ جب پھر ''امہات المؤمنین'' چھپ کر آئی تو حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب کی وساطت سے ہی وہ کتاب بھی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کی تو اسے بھی تھوڑی دیر ملاحظہ فرمایا اور ایک غلطی کی اپنے خاص انداز

میں نشاندھی کی، میں نے عرض کیا کہ شیخ الہندؒ نے یہ بات اسی طرح تحریر فرمائی ہے تو خاموش ہو گئے مگر فرمایا کہ میں اس کی تحقیق کروں گا، حضرت مفتی صاحب کے یہاں علم کے معاملہ میں مرعوبیت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، اسی موقع پر ''عورتوں کا طریقۂ نماز'' نامی کتاب جو حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب کا تحریر کردہ ایک رسالہ ہے، میں نے مفتی صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا تو بغور اس کا مطالعہ کیا اس میں ان کو کوئی بات کھٹکی تو دونوں حضرات کے ما بین ایک اچھا خاصا علمی مباحثہ ہوا، اس وقت مجھے براہِ راست حضرت مفتی صاحبؒ کی وسعتِ نظر اور علم میں کی ان کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ ہوا، وہ اپنی بات کی تائید میں اس طرح دلائل پیش کر رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ فرما رہے ہیں وہی درست ہے، حضرت اقدس مفتی صاحب اپنی عادت کے مطابق خاموش ہو گئے، مگر بعد نماز عصر مفتی سعید احمد صاحبؒ مہمان خانہ آئے اور حضرت اقدس مفتی صاحب سے فرمایا کہ مولانا ابوالقاسم صاحب میں نے مسئلہ کی تحقیق کر لی ہے، آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے یہاں مداہنت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، دلیل کی روشنی میں اگر ان کی بات غلط ثابت ہو گئی تو اس کا اعتراف کر لینے اور اس سے رجوع فرما لینے میں انھیں بالکل عار نہیں تھا، البتہ مدلل طور پر ان کی غلطی کو ثابت کئے بغیر کوئی چاہے کہ تحریر کے زور اور نا قابلِ قبول بہت سے حوالوں کے ذریعہ زبردستی ان کو قائل کرے تو یہ ناممکن تھا۔

بزمانۂ طالبعلمی احاطہ دارالعلوم میں حضرت مفتی صاحبؒ کی یکسوئی اور کثرتِ مطالعہ کا ہر شخص قائل تھا، افتاء کے سال میں حاضری درس اور معمول کے مطابق مطالعہ کی مشغولی کے ساتھ اپنے آرام کے وقت میں سے وقت نکال کر انھوں نے قرآنِ کریم کا حفظ بھی کیا اور پھر حفظِ قرآن کو اپنے لئے ایسا ذخیرۂ آخرت بنایا کہ ملائکہ بھی ہمیشہ رشک کرتے رہیں گے، شادی کے بعد بیوی کو قرآنِ کریم اس طرح حفظ کرایا کہ دوپہر کو مدرسہ سے گھر پہنچے اور بیوی کو اپنا سبق یاد کرنے میں مشغول تو کھانا خود ہی پکاتے مگر بیوی کے سبق کا ناغہ نہ ہونے دیتے، پھر بیوی نے اپنے

اور مفتی صاحب کے درجن پھر بچے اور بچیوں کو حفظ کرایا اور بعد میں پوتے پوتیوں کو بھی۔

این سعادت بزورِ بازو نیست

پھر بہت قریب سے مفتی صاحب (نور اللہ مرقدہ) کو اس وقت دیکھا جب بنارس سیرت کانفرس میں ان کی آمد شروع ہوئی، حسنِ اتفاق یہ کہ بنارس میں میرے مستقل میزبان الحاج بھائی رشید احمد (ساجکو) کے مکان پر ہی حضرت مفتی صاحبؒ کا قیام تجویز ہوا، اور حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نے مجھ کو ان کی خدمت پر مامور فرمایا، اس طرح تین مرتبہ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی تو براہِ راست بات چیت کرنے اور مسائل وغیرہ دریافت کرنے کا موقع نصیب ہوا، اس وقت اندازہ ہوا کہ یہ علم وفن کا قلندر ایک ایسا بحرِ بیکراں ہیں جو خالص موتیوں سے بھرا ہوا ہو، اس قلندر نے ''جگر خون کر کے چشمِ دل میں نظر پیدا کر رکھی ہے''۔ درس وتدریس کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ اعلیٰ درجہ کے محقق اور بہترین مصنف بھی تھے، ان کی تصنیف کردہ کتابیں ''رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ''، ''تحفۃ الالمعی شرح جامع الترمذی''، ''تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری''، ''فیض المنعم شرح مقدمۂ مسلم، ہدایت القرآن، قرآن کریم کی تفسیر، داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، سوانح امام ابی داود مع تشریح قال ابوداود'' اور مختلف عنوانات پر بہت سے مقالات اور تقاریر کے مجموعے اس کے شاہدِ عدل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب پختہ علم، صاحب الرائے، اپنی تحقیقات پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے والے، پُرعزم وحوصلہ اور خود اعتمادی کی صفت سے آراستہ صاحبِ علم تھے، ان کی کئی ایک باتوں سے علمی انداز میں اختلاف کیا جا سکتا ہے، متعدد مقامات پر لغزشِ قلم اور سہو سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تاہم تحقیق کے پردے میں تحقیر وتنقیص کا رویہ اختیار کرنا علمی دیانت کے خلاف ہے جسے ہرگز درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حضرت مفتی صاحبؒ پختہ علم علماء کے بڑے قدرداں تھے، ایک مرتبہ بنارس کے قیام میں مجھ سے فرمایا کہ

وقت خالی ہے کوئی پُر فضا مقام ہو تو وہاں چلو، بنارس سے باہر گنگا کے اس پار چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر الحاج بھائی رشید احمد (ساجکو) کا ایک بہت بڑا باغ ہے جس میں تالاب اور جھولے وغیرہ بھی ہیں، حضرت مفتی صاحب کو میں وہاں لے گیا تو بہت خوش ہوئے، چائے نوشی کے درمیان فرمایا کہ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی جو پختہ علم اور تحریر کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں وہ یہاں سے کتنے فاصلہ پر رہتے ہیں۔ حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی اس وقت ممبئ میں زیر علاج تھے میں نے بتایا تو فرمایا کہ ان سے بات کی کوئی صورت ہو سکتی ہے، میں فوراً مولانا کا نمبر ڈائل کیا تو اتفاق یہ کہ موبائل انہوں نے ہی اٹھایا، میں نے عرض کیا کہ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں اور موبائل حضرت مفتی صاحب کو دے دیا انھوں نے تقریباً دس منٹ تک مولانا سے بات کی اور ان کی صحت کے لئے رو کر دعاء کی پھر فرمایا کہ بڑے صاحب نظر اور تحریر کا ستھرا ذوق رکھنے والے عالم ہیں۔

حضرت مفتی صاحب جیسے صاحبِ علم نایاب تو نہیں مگر کامیاب ضرور ہیں؛ انشاء اللہ العزیز ان کے کارنامے انھیں زندہ و تابندہ رکھیں گے اور مدتوں ان کی یاد ہمیں لاتی رہے گی۔

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ انھیں

❁...❁...❁

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ
ان سے وابستہ کچھ یادیں کچھ باتیں

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی صاحب
ایڈیٹر مجلہ رشد وہدایت، مبارکپور، اعظم گڈھ

میرے ایک کرم فرما دوست کا حکم ہے کہ استاذ گرامی، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدرالمدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری علیہ الرحمہ کے بارے میں کچھ لکھوں۔ آج جب لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو بے ساختہ استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ کے وہ الفاظ یاد آگئے جو انھوں نے عالم اسلام کے نامور محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ کے متعلق لکھے تھے:

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: **إن اللہ لا یقبض العلم إنتزاعاً ینتزعہٗ من العباد ولٰکن یقبض العلم بقبض العلماء الخ** (بخاری شریف، **باب کیف یقبض العلم من کتاب العلم**)

اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھاتے کہ بندوں کے سینوں اور دل ودماغ سے اسے محو کردیں، بلکہ اس طرح اٹھاتے ہیں کہ علماء کو وفات دیدیتے ہیں۔

حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے فتح الباری میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر بیان کی تھی۔ چنانچہ مسند احمد اور طبرانی میں حضرت ابوامامہؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے دوران ارشاد فرمایا کہ علم حاصل کرلو، قبل اس کے کہ اسے اٹھالیا جائے۔ ایک اعرابی نے سوال کیا کہ علم کیسے اٹھے گا؟ تو آپ نے فرمایا: علم کا ختم ہونا یہ ہے کہ حاملین علم یعنی علماء ختم ہوجائیں۔ (فتح الباری ج:١ص:٢٦٠)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جوں جوں علماء اس دنیا سے رُخصت ہوتے جائیں گے، علم بھی رُخصت ہوتا جائے گا۔ اِلا یہ کہ بعد والوں نے اس علم کو کماحقہٗ حاصل کرلیا ہو، اس صورت میں ایک عالم کے جانے کے بعد اس کے تلامذہ کے ذریعہ وہ علم زندہ رہے گا گویا علم کی اصل زندگی اور اس کی حقیقی بقا یہ نہیں ہے کہ اس کے نقوش وآثار کاغذ اور اوراق پر باقی رہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ علماء کے سینوں میں محفوظ ہو، اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی عالم اپنے سینے کا تمام علم کاغذ کے حوالے نہیں کرسکتا۔ علم کا بڑا حصہ تو اس کے سینے کی امانت ہوتا ہے۔ کاغذ میں تو اپنی کچھ معلومات درج کرسکتا ہے، مگر اپنی علمی بصیرت، دقیقہ رسی، فہم ونظر کا صحیح رویہ، ذوقِ سلیم اور روشن وجدان خشک صفحات میں کیسے ودیعت کرسکتا ہے، اس کیلئے تو انسانی دل ودماغ کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ کتابوں اور صحائف کی کثرت اور دفاتر واوراق کے طول وعرض کے باوجود خبر یہی دی جارہی ہے کہ عالم اٹھا تو علم بھی اٹھ گیا ،۔۔۔۔۔۔۔۔۔ظاہر ہے کہ علماء کے ختم ہونے کے بعد کتابیں تو ختم نہ ہوں گی۔ البتہ ان کا مطالعہ بغیر عالم اور استاذ کے کیا جائے گا یہ لوگ ان پڑھ نہ ہوں گے، پڑھے لکھے ہوں گے، لیکن بے استادے ہوں گے، علماء کی صحبت سے محروم ہوں گے، تو کتابیں پڑھ کر بھی علم کی صفت سے مہجور وبے نصیب ہی رہیں گے۔ جاہل کا اطلاق ایسے پڑھے لکھوں پر بھی بحکم حدیث ہوتا ہے۔ (کھوئے ہوؤں کی جستجو۔۔۔۔۔۔ص:۳۳۸)

گزشتہ چند سالوں میں یکے بعد دیگرے جس طرح ہمارے متعدد اکابر اساتذہ، علماء ربانیین اور فقہاء ومحدثین نے دنیائے فانی کو خیرباد کہا اور آخرت کی راہ لی اس سے علمی دنیا بالکل سونی سونی ہوکر رہ گئی ہے، خصوصاً برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں کو اپنی کئی نامور، شہرہ آفاق دینی وعلمی شخصیات، متعدد بزرگان ملت اور میدان علم ومعرفت کے شہ سوار اساتذہ، حدیث وفقہ کے فن میں یکتائے روزگار شمار ہونے والے محدثین وفقہاء کی رحلت وفرقت کا غم سہنا پڑا، ان حوادث میں حضرت مفتی صاحب کا سانحہ ارتحال درس وتدریس کی تاریخ کا ایک ایسا حادثہ فاجعہ ہے۔۔۔۔۔۔بالخصوص ارباب دارالعلوم اور مفتی صاحب کے ہزاروں تلامذہ ومنتسبین کے لئے۔۔۔۔

۔جس کی تلافی بظاہر ممکن نظر نہیں آرہی ہے۔

مصائب اور تھے پر ان کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

مفتی صاحب علیہ الرحمہ میدان درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے وہ گوہر نایاب تھے جس کی چمک دمک سے برصغیر کی علمی وفکری دنیا جگمگا رہی تھی، وہ اپنی سعی مسلسل، غیر معمولی لگن اور محنت وکاوش، نادر الوجود ذہانت وفطانت اور تحقیقی ذوق ومزاج کی وجہ سے قرون وسطیٰ کے علماء محققین کی یاد تازہ کررہے تھے۔ اپنی نصف صدی سے زائد تدریسی وتصنیفی زندگی میں مفتی صاحب نے شب وروز تحقیق وجستجو اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنے قیمتی اوقات صرف کئے، ان کے عزم وحوصلہ کی بلندی کا حال یہ تھا کہ دورۂ حدیث کے سال کتاب التفسیر پڑھنے کے دوران کو یہ احساس ہوا کہ قرآن کریم حفظ کرنا چاہئے، پھر کیا تھا، اگلے سال جب وہ شعبہ افتاء میں تھے، تو اس کا عزم کرلیا، پھر ان کے آہنی عزم اور جہد مسلسل کے سامنے یہ دشوار گزار منزل بھی آسان تھی، انھوں نے اس کا طریقہ یہ نکالا کہ رات کے بارہ ایک بجے جب وہ فرائض مفوضہ سے فارغ ہوتے تو قرآن کریم یاد کرنے بیٹھ جاتے ،اس طرح انھوں نے قرآن کریم حفظ کرلیا، اور مبارک سلسلہ کو انھوں نے اس قدر آگے بڑھایا کہ پھر اہلیہ کو قرآن حفظ کرایا، پھر تمام اولادوں، بہوؤں اور پوتوں وغیرہ کو بھی۔ اسی جانکاہی اور بے پناہ لگن کا نتیجہ اور ثمرہ تھا کہ مفتی سعید احمد صاحب نے اپنی ایک منفرد شناخت اور پہچان بنائی، اور فی الوقت دارالعلوم دیوبند میں ان کے ذوق ومزاج میں کوئی ان کا ہم پایہ نہ تھا، وہ میدانِ تدریس میں بھی اپنا ایک الگ اور منفرد رنگ رکھتے تھے، ان کی تسہیل وتفہیم ضرب المثل تھی، مشکل سے مشکل مسائل کو سہل تر بنا کر طلبہ عزیز کے سامنے پیش کرنا اور ہزاروں شاگردوں کو نہ صرف اپنے درس سے مطمئن کرنا بلکہ ان کو اپنا گرویدہ بنالینا ان کا وہ وہبی ملکہ تھا جس میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ وہ تقریریں تو کرتے تھے، لیکن روایتی قسم کے مقرر نہیں تھے، ان کی تقریروں پر بھی علمی رنگ غالب ہوتا تھا۔ ان

کی امتیازی شان یہ تھی کہ وہ نقل محض کے قائل نہ تھے بلکہ مجتہدانہ اصول پر عمل پیرا محدث وفقیہ تھے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہی مسائل میں ان کی اپنی رائے بھی ہوتی تھی، جو سب سے الگ ہوتی تھی، جس کا اظہار وہ پوری بے باکی سے کرتے تھے اور اس میں وہ کسی ملامت ومخالفت کی پروا نہیں تھے، بہت سے مسائل میں ان کے تفردات ان کے تلامذہ اور دوسرے علماء کے لئے ذہنی خلجان کا باعث بھی ہوتے تھے، ان سے بھرپور اختلاف بھی کیا جاتا تھا لیکن وہ نظریہ پر قائم رہتے اور دوران درس طلبہ سے کہتے بھی تھے کہ میری یہ ذاتی رائے ہے، یہ میرے لئے ہے تمہارے لئے نہیں، تم کو تو اسی پر عمل کرنا ہوگا جو دارالافتاء کا فتویٰ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہم نے اپنے تعزیتی پیغام میں مفتی صاحب کی زندگی پر کس قدر جامع تبصرہ کیا ہے:

"بلاشبہ مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس کی آبرو اور جماعت دیوبند کے علمی سالار تھے، انھوں نے تقریباً نصف صدی تدریسی خدمات انجام دیں اور مقبولیت کا اعلیٰ معیار حاصل کیا۔ ان کا شوقِ تدریس اور سبق میں انہماک حضرات اکابر کی یاد تازہ کرتا تھا، اسی کے ساتھ اللہ رب العزت کی توفیق سے انھوں نے بلند پایہ تصنیفی وتالیفی خدمات بھی انجام دیں۔ رحمۃ اللہ الواسعہ، تحفۃ القاری، تحفۃ الالمعی اور ہدایت القرآن وغیرہ جیسی گراں قدر تالیفات ان کے نام کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فنا فی العلم تھے اور ان کی شخصیت سے علم کی خوشبو مہکتی، علم ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔"

کچھ یادیں:

میں نے شوال ۱۴۱۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مشکوٰۃ شریف میں داخلہ لیا، اور شعبان ۱۴۱۹ھ میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی۔ دیوبند میں قیام کی مدت تقریباً دو سال رہی۔ مشکوٰۃ شریف کے سال درج ذیل اساتذہ کرام کے یہاں گھنٹیاں تھیں:

مولانا ریاست علی صاحب بجنوری (مشکوٰۃ شریف حصہ اول) مولانا عبد الخالق صاحب مدراسی (مشکوٰۃ شریف حصہ دوم) [اس حصہ کی کتاب البیوع مکمل مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی نے پڑھائی، بیضاوی شریف بھی مولانا موصوف کے یہاں تھی، جس کا کچھ حصہ مولانا نے پڑھایا، اور بقرعید سے پہلے یہ نصاب بدر ہوگئی]

مولانا حکیم محمد احمد صاحب (مشکوٰۃ شریف حصہ سوم)

مولانا مجیب اللہ صاحب گونڈوی (ہدایہ جلد ثالث)

مولانا عبد الخالق صاحب سنبھلی (ہدایہ جلد رابع)

مولانا مفتی محمد امین صاحب (شرح عقائد وسراجی)

دورۂ حدیث کے سال گھنٹیاں اس طرح تھیں:

بخاری شریف جلد اول:	مولانا نصیر احمد خاں صاحب
بخاری شریف جلد ثانی:	مولانا عبد الحق صاحب اعظمی
مسلم شریف جلد اول:	مولانا قمر الدین صاحب
مسلم شریف جلد ثانی:	مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی
ترمذی شریف جلد اول:	مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری
ترمذی شریف جلد ثانی:	مولانا سید ارشد مدنی صاحب
ابوداؤد شریف اول:	مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی
ابوداؤد شریف ثانی:	مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی
ابن ماجہ شریف:	مولانا ریاست علی صاحب بجنوری
نسائی شریف:	مولانا قمر الدین صاحب
مؤطا امام مالک:	مولانا قاری محمد عثمان صاحب
مؤطا امام محمد:	مولانا مفتی محمد امین صاحب

ان اساتذہ کرام کے اسماء گرامی کو دیکھ لیں، سب کے سب آسمان علم وفضل کے آفتاب وماہتاب اور میدان درس وتدریس کے شہ سوار ہیں، سب کے افہام وتفہیم کا اپنا الگ الگ انداز اور طرز ہے، عظمت ومحبت تو سب کی دل میں بیٹھی ہوئی ہے لیکن دل جن کے غیر معمولی طریقۂ تدریس اور شگفتہ وسہل انداز تفہیم سے متاثر ہوا ان میں سر فہرست مولانا مفتی سعید احمد صاحب علیہ الرحمہ کی ذات گرامی ہے۔ لیکن پہلے سال ان کے یہاں کوئی کتاب نہیں

تھی، اس وقت حضرت مفتی صاحب کے یہاں دورہ میں ترمذی شریف اور تکمیلات میں حجۃ اللہ البالغہ تھی، جس کی بعد میں انھوں نے اس کی نہایت مفصل شرح رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے لکھی، مشکوٰۃ کے سال کبھی کبھار مغرب بعد والے درس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

دورہ کے سال باقاعدہ مفتی صاحب سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، ترمذی شریف جلد اول مکمل اور طحاوی کا کچھ حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مفتی صاحب کے طریقہ تدریس، انداز تفہیم وتسہیل، وقت کی پابندی، نظم وضبط، کچھ خاص اصول وضوابط، کچھ مخصوص ادائیں، ان پر تلامذہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنے اپنے انداز اور اسلوب میں تفصیل سے لکھا ہے، اس لئے میں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ سال بھر پوری پابندی سے سبق میں حاضر ہوتا رہا اور بقدر استعداد اس سے فیضیاب ہوتا رہا، ایک عجیب بات مفتی صاحب کے درس میں یہ تھی کہ کبھی کسی کمزور سے کمزور طالب علم کو بھی یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ مجھے سبق سمجھ میں نہیں آیا۔ اذکیاء بھی مطمئن تھے اور اغبیاء کو بھی کسی طرح کی کوئی شکایت نہ تھی، مفتی صاحب کا انداز بیان کچھ اس طرح کا تھا اکثر طلبہ ان کی تقریر مکمل ان کے الفاظ میں لکھ لیتے تھے۔ مفتی صاحب کا جو رعب ودبدبہ تھا کبھی ان کے قریب ہونے کی ہمت نہ ہوئی، کبھی کوئی اشکال ہوا تو دستور کے مطابق ایک پرچی لکھ کر ترجمان کے حوالہ کردی اور مفتی صاحب نے جواب دیدیا، پورے سال کبھی ذاتی تعارف کی نوبت نہ آئی۔

دیوبند پہنچنے سے پہلے الفوز الکبیر کی عربی شرح العون الکبیر دیکھی تھی، اس کے علاوہ یاد نہیں کہ کوئی اور کتاب دیکھی تھی یا نہیں؟ ہمارے دورہ کے سال الفوز الکبیر کا عربی ترجمہ مفتی صاحب نے کیا جسے دار العلوم دیوبند نے بڑے اہتمام سے شائع کیا جو آگے چل کر دیوبند سے مربوط تمام مدارس میں داخل نصاب ہوا۔ اس کتاب پر استاذی مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ نے مجلہ المآثر مئو میں شاندار تبصرہ کیا جو فروری تا اپریل ۱۹۹۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا، جس میں مفتی صاحب کی اس خدمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا، یہیں سے مفتی صاحب

سے ذاتی طور پر تعارف ہوا، ورنہ اس سے پہلے دورہ کے آٹھ نوسو طلبہ کی بھیڑ کا ایک فرد میں بھی تھا۔ اس کے بعد جب رحمۃ اللہ الواسعہ کی دوجلدیں شائع ہوگئیں تو مفتی صاحب نے اس کو بھیجا کہ مولانا اعجاز احمد صاحب اس پر تبصرہ کریں اور اپنی رائے دیں۔ مولانا نے میری زیر ادارت شائع ہونے والے رسالہ ماہنامہ ضیاء الاسلام مئی ۲۰۰۲ء کے شمارے میں تقریباً دس صفحات پر مشتمل نہایت مفصل تبصرہ کیا، جو واقعی اس کتاب کا ایک بہترین تعارف ہے، اور پورا تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے، اس کے کچھ حصوں کو مفتی صاحب نے بعد کی کسی جلد میں نقل بھی کیا ہے، اس کے بعد جب تیسری جلد شائع ہوئی تو اس پر بھی مولانا نے تبصرہ کیا، اس کے چوتھی اور پانچویں جلد مفتی صاحب نے ایک ساتھ بھیجی اس پر نومبر دسمبر ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں تبصرہ شائع ہوا، اسی وقت میری دیوبند حاضری ہوئی، میں وہ شمارہ لے کر گیا تھا، مفتی صاحب نے کہا کہ صبح سات بجے گھر آؤ اور ناشتہ میرے ساتھ کرو، مجھے کبھی مفتی صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ایک طالب علم جو گھر سے واقف تھا ساتھ لیا اور وقت مقررہ پر گھر پہنچ گیا، ناشتہ کے بعد مفتی صاحب نے دوران گفتگو فرمایا کہ ایک بات کہتا ہوں برا مت ماننا، میں نے کہا کہ حضرت ضرور کہیں، فرمایا کہ میں نے تو صرف تمہاری دعوت کی تھی ایک اور شخص کو کیوں لائے؟ وجہ میں نے بتائی، کہنے لگے کہ الحمدللہ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن اصولی اعتبار سے یہ درست نہیں، یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں آئندہ کبھی ایسا موقع ہو تو احتیاط کرنا، یا داعی کو مطلع کر دینا، پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگوں کے یہاں تو ابھی بہت سادگی ہے، لیکن ادھر مغربی یوپی میں تو مہتمم اور ذمہ دار حضرات جب تک آگے پیچھے دو چار حضرات کو نہ لے لیں تب ان لوگوں کا وزن ہی نہیں بنتا۔

دوسرے روز صبح کو دہلی واپسی تھی، صبح والی فاسٹ پسنجر سے جانا تھا، اسٹیشن پر مفتی صاحب بھی موجود تھے، وہ بھی اسی ٹرین سے دہلی جارہے تھے، یہ میری خوش بختی تھی کہ مفتی صاحب کی معیت نصیب ہوگئی، راستہ میں مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی، اس میں سے ایک دو باتیں لکھتا ہوں۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ دہلی کا یہ سفر ایک کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں ہو رہا ہے، اسی میں بات حقوق طباعت کی نکل گئی، تو فرمایا کہ میں اپنی کتابوں پر ''حقوق طبع محفوظ ہیں'' نہیں لکھواتا۔ ایک بار مجھ سے ربانی بکڈپو دہلی کے مالک حکیم مصباح الحق صاحب نے کہا کہ آپ اپنی کتابوں پر ''حقوق طبع محفوظ'' نہیں لکھواتے، اس سے آپ کا نقصان ہوگا دوسرے لوگ آپ کی کتابیں شائع کرلیں گے، (مفتی صاحب نے حکیم صاحب کو جو جواب دیا اس سے ان کے توکل واعتماد علی اللہ اور شان استغنا کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے) مفتی صاحب نے فرمایا کہ میں نے ان سے کہا کہ اگر کوئی اس کو شائع کر کے کمائے گا تو وہ میرا رزق کم نہیں کردے گا جو میری قسمت میں روزی لکھی ہے وہ ہر حال میں اللہ تعالی مجھے دیں گے اور جو وہ کمائے گا اپنی قسمت کا کمائے گا، اس لئے اگر کوئی میری کتاب چھاپتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ میں اس کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری کتاب کی اشاعت میں میری مدد کی ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے کہا کہ جب آپ کا عزم اتنا بلند ہے تو پھر کوئی بات نہیں، اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ ابھی ایک صاحب نے میری کتاب آسان نحو یا آسان صرف کا ایک ایڈیشن چھاپ کر ساؤتھ افریقہ بھیجا ہے، میں اس کا شکر گزار ہوں اس لئے کہ یہ میرے بس میں نہیں تھا کہ کتاب وہاں پہنچاتا اب اس سے استفادہ وہاں تک عام ہوگیا، سلسلہ گفتگو کے دوران یہ بھی فرمایا کہ میری کتاب رحمۃ اللہ الواسعۃ پر زمزم پبلشرز کراچی نے فی جلد ۵۰۰۰ ۷ ہزار روپئے رائلٹی کے دئے تھے، میں نے پورے پونے چار لاکھ واپس کردئے۔ چونکہ میں بھی ایک طرح سے تجارت کتب اور اس کی نشر و اشاعت سے وابستہ ہوں اس لئے مفتی صاحب کی یہ بات اب بھی لوح حافظہ پر اس طرح محفوظ ہے جیسے کل کی بات ہو، واقعی مفتی صاحب کی شان ہی نرالی تھی، ان کی اس اولوالعزمی کا اب تک دل پر ایک خاص اثر ہے۔

اس وقت مفتی صاحب تفسیر ہدایت القرآن میں سورہ کہف کی تفسیر لکھ رہے تھے، اس سلسلہ میں مَیں نے پوچھا کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تذکیر بسورۃ الکھف کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمانے لگے کہ میرا

ذہن بہت مرتب ہے، میں ایسی کتابیں نہیں پڑھ پاتا جس میں بہت زیادہ بے ترتیبی ہو، اور مولانا مناظر احسن صاحب کی تصانیف کا حال یہ ہے کہ ان کے ذہن میں معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ رہتا ہے، وہ زور استدلال اور کثرت معلومات کی بنا پر کب اصل موضوع سے کتنی دور نکل جائیں گے، کچھ کہا نہیں جاسکتا، اس لئے میں ان کی کتابوں سے استفادہ کم کر پاتا ہوں، میں نے کہا کہ اس وقت میں ان کی کتاب ''امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' پڑھ رہا ہوں، کہنے لگے تم ہی بتاؤ کہ امام صاحب کی شخصیت کوئی سیاسی شخصیت تھی؟ ان کا لگاؤ سیاست سے کتنا تھا؟ لیکن مولانا نے اس پر پانچ سو صفحات کی کتاب لکھ دی۔

مجھ سے پوچھنے لگے کہ تمہارے مدرسہ کی مالیات کا نظم کیسے ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ مقامی طور پر اور مقامی حضرات جو بمبئی وغیرہ میں ہیں، ان کے ذریعہ۔ کہنے لگے بیرون ملک سے؟ میں نے کہا کہ ہمارے استاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی چندہ کے لئے بیرون ملک بھیجنے کے بالکل قائل نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ چونکہ باہر چندے کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا اس لئے اس میں بدظنی و بدگمانی کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے، فرمایا کہ مولانا کی یہ رائے بالکل درست اور مبنی برصواب ہے، میرا خیال بھی باہری چندے کے بارے میں یہی ہے۔

غرض دیوبند سے دہلی کے اس سفر میں خوب کھل کر بات کی، ٹرین میں ہی فجر کی نماز باجماعت ادا کی گئی، مدرسہ کے کئی اور لوگ بھی اسی ڈبے میں تھے۔ مفتی صاحب سے اتنی تفصیلی گفتگو اس کے بعد پھر کبھی نہیں ہوئی۔

بعد میں داخلہ امتحان میں کاپیاں جانچنے کے جب دیوبند جانے کا اتفاق ہوا تو عصر بعد کی مجلس میں کبھی کبھار حاضری ہوتی، ایک حاضری میں مَیں نے کہا کہ آپ کی زندگی میں بعد کے لوگوں کے لئے بہت سبق ہے، آپ اپنی یادداشتوں کو مرتب کرادیں یہ بہت نفع بخش ہوگی، کہنے لگے کہ اس وقت تحفۃ القاری کی ترتیب کا کام چل رہا ہے، جو بہت اہم ہے، بعد میں اس پر غور کروں گا، میں نے کہا کہ یہ تو ہلکا پھلکا کام ہے سفر وغیرہ میں تھوڑا تھوڑا کرتے رہیں، کہنے لگے کہ سفر میں میرے لئے تصنیفی کام مشکل ہے، میں نے کہا کہ مولانا تقی عثمانی صاحب نے تو اپنا پورا

ترجمہ قرآن ہی فضائی سفر میں لکھا ہے، اس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے انھوں نے اس دوران کہاں کہاں کا سفر کیا؟ کہنے لگے کہ بھائی سب کا الگ الگ مزاج اور انداز ہوتا ہے۔

میں نے مفتی صاحب کے ان چھوٹے چھوٹے رسالوں سے بہت فائدہ اٹھایا جو درسیات سے متعلق ہیں جیسے آسان نحو، آسان صرف، آسان منطق، ہادیہ اور اس طرح کے دیگر رسالے، ان کے ذریعہ بات کو سمجھانے کی قدرت اور نحو وصرف کے مسائل کی مشق کرانے میں بہت مدد ملی۔

مفتی صاحب گوکہ اسی سال کے ہوچکے تھے لیکن جیسی ان کی صحت تھی، بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر جلد ہم سے جدا ہوجائیں گے، جب ممبئی میں ان کے انتقال کی خبر ملی تو غربت ومسافرت کی اس موت پر دل عجیب طرح کے صدمہ سے دوچار تھا، کبھی سوچا بھی نہ سوچا وما تدری نفس بای ارض تموت کی تفسیر مفتی صاحب کے حق میں اس شکل میں حاضر ہوگی کہ نہ جانے ہم جیسے دور افتادگان ان کی آرام گاہ کو کبھی دیکھ بھی پائیں گے یا نہیں؟ دیوبند تو کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتے ہیں لیکن ممبئی ؟؟؟ کہنے والے نے سچ کہا ہے

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب ودانہ دگر خاکِ گور

(دو چیزیں انسان کو پوری قوت سے کھینچتی ہیں، ایک اس کا رزق، دوسرے قبر کی مٹی)

حق تعالیٰ شانہ حضرت مفتی صاحب کی بال بال مغفرت فرمائیں، ان کے درجات کو یوماً فیوماً بلند فرمائیں، کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، اور ان کی جسمانی وروحانی اولاد وجملہ متعلقین کو صبر جمیل واجر جزیل عطا فرمائیں۔

آمین یارب العالمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

❁ … ❁ … ❁

اب چھپے ہیں وہ، نہ نوا سنجیاں ہیں وہ

حدیث نبوی کے منفرد شارح حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

حضرت مولانا امداد الحق بختیار قاسمی

استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد

ہند میں دار العلوم دیو بند وہ شجرۂ طیبہ ہے، جس کے جڑیں حجازِ مقدس سے سیرابی حاصل کرتی ہیں، اس عظیم علمی مرکز سے ہر زمانے میں نابغۂ روزگار، عبقری اور المعی شخصیات وجود پذیر ہوتی رہی ہیں، جنہوں نے اپنی خداداد اور حیرت انگیز صلاحیتوں سے اسلام کی متنوع خدمات انجام دی ہیں، حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ اسی کاروان علم وعرفان کے مایہ ناز فرد تھے، مفتی صاحبؒ نے پورے اخلاص کے ساتھ اپنی ساری زندگی علم حدیث کی خدمت، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کی نذر کردی، انہوں نے اپنی زندگی کی ایک شاہراہ متعین کرلی تھی، جس سے زندگی کے کسی بھی حصہ میں وہ الگ نہیں ہوئے، پوری عمر اسی شاہراہ پر پوری تندہی سے گامزن رہے، طالب علمی کا دور ہو یا تدریس کا، جوانی کا ہو یا بڑھاپے کا، مدرسی کا عہد یا صدر المدرسین کا، زندگی کے ہر پڑاؤ میں مفتی صاحبؒ اپنے مشن اور اپنی متعین کردہ راہ سے سرمو انحراف کرتے نظر نہیں آتے۔

مفتی صاحبؒ تقریریں بھی کرتے تھے، آپ کے دعوتی اسفار بھی ہوتے تھے، ختم بخاری کے اجلاس میں متعدد مدارس اور جامعات کی دعوت پر بھی تشریف لے جاتے تھے، لیکن ان سب کے باوجود آپ کی سب سے زیادہ توجہ کا مرکز تدریس ہوتی تھی، آپ کی زندگی کا سب سے بڑا معمول اسباق کی پابندی تھی، ۲۰۰۹ء کے بعد پورا علم نہیں، لیکن اس سے قبل تک بہت کم ایسا سننے میں آتا کہ آج حضرت مفتی صاحب کا سبق نہیں ہوگا، اللہ تعالی

نے آپ کو اچھی صحت عنایت فرمائی تھی، بہت کم طبیعت ناساز ہوتی تھی، تکان کا احساس کم ہوتا تھا، یہ ۲۰۰۷ء کی بات ہے، جب میں دورہ حدیث شریف میں تھا، میری سنن ترمذی کی لکھی ہوئی کاپیوں میں صرف ایک جگہ لکھا ہے کہ ۲۱/ ۴/ ۲۸ھ کو حضرت بیمار تھے، جس کی وجہ سے سبق نہیں ہوا۔

مفتی صاحب ۱۴۰۲ھ سے دارالعلوم دیوبند میں ترمذی جلد اول کا درس دے رہے تھے، اور ۱۴۲۹ھ تک ترمذی جلد اول کے اسباق آپ سے متعلق رہے، یعنی ۲۷ سال کے طویل عرصہ تک حدیث کی یہ اہم کتاب آپ سے متعلق رہی، اس کے سبق کا منظر بھی دارالعلوم میں منفرد شان کا ہوتا تھا، پوری دارالحدیث طلبہ سے بھری ہوتی تھی؛ یہاں تک کہ باہر اور اوپر گیلری میں بھی طلبہ اور زائرین کا مجمع ہوتا تھا، کیا عجب نظارہ رہتا تھا، حضرت مفتی صاحب کی تشریح تسلسل کے ساتھ ایک ہی لہجہ اور آہنگ میں جاری رہتی، آپ اپنے اسباق میں ایسی تحقیقات کا پٹارا ہرگز نہیں کھولتے تھے، جو طلبہ کے ذہنی معیار سے بلند ہو، ہر طالب علم آپ کی تشریح سے یکساں مستفید اور محظوظ ہوتا تھا، آپ کے سبق کی دو بڑی خوبیاں میں نے محسوس کی: (۱) آپ کا اسلوب بیان بہت آسان ہوتا، بھاری سے بھاری مضمون آسان زبان (جسے ہم کہتے ہیں چٹکیوں میں) سمجھا دیتے تھے۔ (۲) جو بات بھی آپ کی زبان سے نکلتی وہ پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ نکلتی تھی، کبھی کسی بات میں ہچکچاہٹ یا گومگو یا شک وشبہ کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا تھا اور یہ ہی دو عناصر تھے، جس کی وجہ سے تمام طلبہ مکمل حاضر باشی اور حاضر دماغی کے ساتھ آپ کے اسباق میں حاضر رہتے تھے؛ حتی کہ دیگر مدارس کے طلبہ بھی آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔

اپنے خداداد ذہن سے حضرت مفتی صاحب زیادہ تر حدیث کی تشریح کرتے وقت پہلے ایسی تمہید قائم فرماتے، جس سے حدیث میں موجود مضمون پوری طرح ذہن نشین ہوجاتا اور وہ تمہید حدیث کے مضمون سے ایسی مربوط ہوتی کہ محسوس ہوتا کہ وہ بھی حدیث میں مذکور ہے؛ حالاں کہ وہ مفتی صاحب اپنی طرف سے بیان فرماتے تھے اور ایک آدھ بار سبق میں بیان بھی کردیتے تھے کہ یہ تمہید میری طرف سے ہوتی ہے اسے حدیث کا جزو نہ

سمجھیں۔

حدیث کی تشریح میں اپنے استاذ علامہ بلیاویؒ کی تحقیقات اور تشریحات خوب بیان فرماتے تھے، علامہ کو مفتی صاحبؒ ''حضرت الاستاذ'' کے لفظ سے یاد فرماتے تھے۔ نیز حجۃ اللہ البالغہ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اقوال بھی بکثرت ذکر فرماتے تھے؛ کیوں کہ اس زمانے میں دارالعلوم میں حجۃ اللہ البالغہ پر سب سے زیادہ کام حضرت مفتی صاحبؒ نے ہی کیا ہے؛لہذا آپ کو اس کتاب سے خصوصی دل چسپی تھی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے یہاں عبارت خوانی کے بھی قواعد وضوابط تھے، ہر طالب علم کو عبارت پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی ; بلکہ سال کے آغاز میں اس کا بھی امتحان اور انتخاب ہوتا تھا، ترجمان کی رہبری میں چند منتخب طلبہ بعد عصر حضرت مفتی صاحبؒ کے دولت کدہ پر حاضر ہوتے، عبارت پڑھوا کر سب کا امتحان ہوتا، مفتی صاحبؒ بذات خود سب کی عبارت سنتے اور انتخاب فرماتے، بعد ازاں منتخب طلبہ کی فہرست ترجمان کو دے دی جاتی ، پھر منتخب طلبہ ہی پورے سال عبارت پڑھتے، حضرت مفتی صاحبؒ عبارت خوانی میں آواز کی خوبصورتی اور لہجہ میں ترنم کو پسند فرماتے تھے،آپ کے درس کی فضا عجیب پر کیف ہوتی تھی۔

طلبہ کو یہ بھی ہدایت دی جاتی کہ دوران درس جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نامی آئے،تو تمام طلبہ ہلکی جہری آواز میں درود شریف پڑھیں،طلبہ اس کا اہتمام کرتے تھے،جس سے دارالحدیث میں سریلی سی اجتماعی آواز پیدا ہوتی تھی،اس سے بھی درس گاہ کے ماحول کی نورانیت میں اضافہ ہوتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب سال کے آغاز میں طلبہ کو اسماء حسنی اور چالیس حدیثیں یاد کراتے تھے، روزانہ سبق شروع ہونے سے پہلے چند اسماء حسنی کی تلقین فرماتے، طلبہ آپ کے ساتھ انہیں دہراتے، کچھ روز کے بعد جب اسماء حسنی پورے ہو جاتے تو پھر احادیث کی تلقین شروع فرماتے تھے،کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ صرف اسماء حسنی ہی یاد کرائے جاتے، احادیث یاد نہیں کرائی جاتی تھیں۔

مفتی صاحب کی طرف سے ایک سخت ہدایت یہ تھی کہ مفتی صاحب کی آمد سے قبل تمام طلبہ اپنی نشست گاہوں پر بیٹھ جائیں اور آپ کے تشریف لانے کے بعد کوئی طالب علم درس گاہ میں نہ آئے، کبھی ایسا ہوتا کہ مفتی صاحب تشریف لے آتے؛ لیکن طلبہ کی ایک خاصی تعداد درس گاہ میں نہ ہوتی یا وہ ابھی اپنی جگہوں پر پورے طور پر بیٹھے نہیں ہوتے، چند طلبہ کھڑے ہوتے؛ کیوں کہ اس سے پہلے گھنٹے کے استاذ نے تھوڑی تاخیر کے ساتھ سبق ختم کیا ہوتا تھا، مفتی صاحب یہ نظارہ دیکھ کر، ناراض ہوتے اور دارالحدیث کے دروازے سے ہی واپس تشریف لے جاتے تھے اور عام طور پر کتب خانہ تشریف لے جاتے تھے، پیچھے سے کچھ طلبہ اور ترجمان معافی مانگنے پہنچتے، حضرت فوراً معاف بھی فرمادیتے اور کبھی اسی روز اور کبھی دوسرے روز سبق پڑھانے کے لیے تشریف لے آتے، لیکن ایسا حادثہ بہت کم پیش آتا تھا۔

اگر کسی طالب علم کو دوران درس کوئی اشکال ہوتا یا کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو وہ ایک پرچی لکھ کر اپنے آگے بیٹھے ساتھی کو دیتا، وہ اسے اور آگے کرتا، اس طرح آگے جاتے جاتے، سوال کی وہ پرچی ترجمان تک پہنچ جاتی اور وہ پھر سبق کے آخر میں مفتی صاحبؒ کو پیش کرتا اور مفتی صاحب اسے لے کر گھر تشریف لے جاتے اور دوسرے دن اس کا جواب مرحمت فرماتے، بعض طلبہ عصر کے بعد حضرت کی مجلس میں حاضر ہوکر جو حضرت کے گھر پر بعد عصر لگتی تھی، اپنے اشکالات پیش کرتے تھے، حضرت سب کا تفصیل کے ساتھ مکمل اور شافی جواب عنایت فرماتے تھے۔

چنانچہ جب یہ مسئلہ سبق میں آیا کہ منی پاک یا نہیں، تو حضرت نے دوران تشریح فرمایا کہ پورے ذخیرہ حدیث میں کوئی بھی ایسی حدیث نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کپڑے میں منی کے ساتھ نماز ادا کی ہو۔ مجھے علامہ نیمویؒ کی آثار السنن کی ابتدائی چند حدیثیں محفوظ تھیں اور ان میں سیدہ عائشہؓ کی یہ حدیث بھی موجود ہے: عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّهَا كَانَتْ تَحُتُّ الْمَنِيَّ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللّٰهِ - صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - وَهُوَ يُصَلِّي. رواه البيهقي وابن خزيمة وإسناده منقطع۔ (آثار السنن، باب مايعارضه، رقم الحديث: ٣٣)

مجھے اس حدیث میں (وَھُوَ یُصَلِّي) سے اشکال ہو رہا تھا کہ اس میں (واو) حالیہ ہے، جس کا مطلب ہے کہ حالت نماز میں سیدہ عائشہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے سے منی کھرچتی تھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز شروع کی تھی۔

بعد عصر کی مجلس میں یہ حدیث میں نے حضرت کے سامنے پیش کی، مفتی صاحب نے جواب بھی مرحمت فرمایا، لیکن اب یاد نہیں کہ مفتی صاحبؒ نے کیا فرمایا تھا، اتنا یاد ہے کہ وہ جواب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا اور حضرت کے رعب کی وجہ سے میں آگے کچھ عرض نہیں کر سکا تھا۔

اسی طرح ایک بار ڈاکٹر اوصاف کی کتاب ''معاشیات'' کا مطالعہ کر رہا تھا، اس میں بار بار یہ دو لفظ آرہے تھے: (۱) حاجت (۲) ضرورت۔ اور دونوں کے فرق سے احکام اور نتیجہ میں فرق ہو رہا تھا، میں عام بول چال کی طرح دونوں لفظ کو یکساں سمجھتا تھا؛ اس لیے مجھے دشواری پیش آرہی تھی، عصر کے بعد حضرت مفتی صاحب کے سامنے دونوں لفظ پیش کیے، حضرت نے فرمایا تمھیں کیسے سمجھاؤں: کیا انگلش جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا: تھوڑی بہت، تو فرمایا کہ انگلش میں حاجت کو (Want) اور ضرورت کو (Need) کہتے ہیں نیز فرمایا کہ حاجت سے ایک ڈگری اوپر ضرورت ہوتی ہے۔

عصر کے بعد مجلس میں طلبہ، قدیم فضلا اور دار العلوم کے بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے تھے، مجلس خالص علمی ہوتی تھی، بہت ہی مفید باتیں حاصل ہوتی تھیں، ایک بار مفتی صاحب کے ایک شاگرد کسی مدرسہ سے سبک دوش ہو گئے تھے اور ابھی وہ خالی تھے، حضرت مفتی صاحب کی مجلس میں حاضر تھے، میں بھی وہیں تھا، حضرت مفتی صاحب نے ان سے فرمایا: تمھارے سامنے دو راستے ہیں: (۱) جنت کا راستہ (۲) جہنم کا راستہ۔ جہنم کا راستہ یہ ہے کہ کوئی مدرسہ کھول لو اور جنت کا راستہ یہ ہے کہ کسی مدرسہ میں مدرسی کرو۔

ششماہی امتحان میں ترمذی شریف کے پرچہ میں ۴۵ یا اس سے زائد نمبرات لانے والے طلبہ کو مفتی

صاحبؒ اپنے گھر طلب فرما کر خصوصی انعام سے نوازتے تھے، انعام میں عام طور پر کتابیں عنایت ہوتی تھیں، میں بھی اپنے سال میں اس فہرست میں شامل تھا، بعد عصر حضرت مفتی صاحبؒ کے کاشانہ پر حاضری ہوئی، حضرتؒ نے ''الطیب الذکی'' نامی کتاب عنایت فرمائی۔

حضرت مفتی صاحب پہلے امام ترمذی کی کتاب العلل پڑھاتے تھے، اس میں علم حدیث کی قدیم وجدید بیشتر اصطلاحیں طلبہ کے سامنے آجاتی تھیں، مفتی صاحب تفصیل کے ساتھ متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحوں اور ان کے مابین اختلاف کو سمجھاتے تھے، امام ترمذی کی متعدد نئی اصطلاحوں کی بھرپور تشریح فرماتے۔

کبھی کبھار امام ترمذی کے حکم پر بھی مفتی صاحب خوبصورت انداز میں کلام فرماتے تھے، چنانچہ امام ترمذیؒ کبھی کسی حدیث کے بارے میں فرماتے: (هذا حديث صحيح) یا کسی حدیث کے بارے میں امام ترمذی فرماتے: (أصح مافي الباب) اور فی نفسہ وہ حدیث اس پایہ کی نہیں ہوتی تو مفتی صاحبؒ کبھی اس جملہ کے فوراً بعد فرماتے: کیوں کہ قلم آپ کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی فرماتے: جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ کبھی کوئی حدیث فی نفسہ صحیح ہوتی؛ لیکن اس پر اعتراض ہوتا تو اس سے متاثر ہو کر امام ترمذیؒ اس حدیث کو صرف (حسن) فرمادیتے، مفتی صاحب اسے بھی واضح فرماتے، حتی کہ ایسے موقع پر کبھی حضرت مفتی صاحب امام ترمذیؒ کے بارے میں فرماتے: حضرت ڈر گئے۔

امام ترمذی بسا اوقات طویل روایت کے کسی ایک ٹکڑے کو ہی بیان کرتے ہیں، جس سے قاری کو پوری تشفی نہیں ہوتی، تو اس حوالے سے حضرت مفتی صاحبؒ علامہ بلیاویؒ کا یہ قول نقل فرماتے: حضرت الاستاذ فرمایا کرتے تھے: مولوی صاحب ہمارا امام خشک محدث ہے، شاندار روایت کا ذرا سا ٹکڑا لاتا ہے۔

مفتی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ امام ترمذی اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں، جس میں کوئی نہ کوئی کمی ہوتی ہے: جیسے امام ترمذیؒ بسا اوقات نازل اور عالی سند میں نازل کی اور مرسل اور متصل میں مرسل کی ترجیح فرماتے

ہیں۔

مفتی صاحبؒ کا اختلاف ائمہ کو بیان کرنے میں بھی انوکھا انداز تھا، آپ ائمہ کی تقسیم زیادہ تر مرتبہ کے اعتبار سے کرتے اور فرماتے: چھوٹے دوامام کی رائے یہ ہے اور بڑے دوامام کا مذہب یہ ہے، چھوٹے دوامام سے مراد حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ ہوتے اور بڑے دوامام سے مراد: حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام مالکؒ ہوتے، یہ درجہ بندی زمانے کے اعتبار سے تھی، بڑے دونوں امام زمانے کے اعتبار سے مقدم تھے، نیز چھوٹے دونوں اماموں کے وہ استاذ بھی تھے (چاہے بلاواسطہ یا بالواسطہ) اور کبھی تعداد کے اعتبار سے کسی مسئلہ میں فرماتے: دوامام کی رائے یہ اور دو کی یہ، ایک امام ایک طرف ہیں اور تین امام ایک طرف، کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ ساڑھے تین امام ایک طرف اور آدھے امام دوسری طرف، یہ اس وقت ہوتا، جب کسی مسئلہ میں تین امام کی رائے ایک ہو اور چوتھے امام سے اس مسئلہ میں کچھ منقول نہ ہو یا ان کی رائے بھی دیگر تین ائمہ کی طرح ہو؛ لیکن چوتھے امام کے مقلدین کی رائے اور ان کے یہاں فتوی تینوں امام سے الگ ہو، تو حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے تھے: ساڑھے تین ایک طرف اور آدھے دوسری طرف ہیں۔

اختلاف ائمہ کے بیان میں حضرت مفتی صاحبؒ کی امتیازی شان یہ تھی آپ اس انداز سے بیان فرماتے تھے، جس کے نتیجہ میں طلبہ کے ذہن میں دو باتیں جاگزیں ہوجاتی تھیں: (۱) ائمہ کا احترام اور ان کا بلند علمی اور اجتہادی مقام۔ (۲) احادیث میں تطبیق۔ یعنی آپ بوقت اختلاف ائمہ کا ادب واحترام حد درجہ ملحوظ رکھتے، ان کے لیے بلند کلمات استعمال فرماتے، درپیش مسئلہ میں ان کے استدلال کی قوت اور ان کی اجتہادی بصیرت کو واضح فرماتے، احادیث کی اس انداز سے تشریح فرماتے، جس سے یہ بات معلوم ہوجاتی کہ ان میں کوئی تعارض نہیں، سب کا محمل اور مصداق الگ الگ ہے۔

اختلاف حدیث اور اختلاف ائمہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کا عمومی مزاج ترجیح کا نہیں تھا، بلکہ حتی الوسع آپ

تطبیق کی راہ اختیار فرماتے تھے اور شاید یہی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا بھی منہج تھا، جیسا کہ ''الفوز الکبیر'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ (بَابٌ فِي النَّهْيِ عَنِ اسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ) کے تحت کلام کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: پرانے زمانے میں مناظرہ کا اسلوب رائج تھا کہ یہ اس فریق کی دلیل ہے، یہ اس فریق کی، اس کا یہ جواب ہے، یہ راجح اور یہ مرجوح ہے؛ لیکن یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ چاروں ائمہ حق پر ہیں؛ لہذا ترجیح کا کوئی فائدہ نہیں؛ کیوں کہ ترجیح حق اور باطل کے درمیان ہوتی ہے، اس کی نظیر: حضرت شیخ اسماعیل شہیدؒ نے دہلی میں نمازوں میں رفع یدین اور آمین بالجہر شروع کردی، اس وقت وہ طالب علم اور کم عمر تھے، لوگوں کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، وہ سمجھتے تھے کہ یہ غیر مقلدین کا عمل ہے؛ لہذا لوگوں نے شاہ صاحب کے تعلق سے کہنا شروع کردیا کہ وہ غیر مقلد ہوگئے، شور برپا ہوگیا، تو حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے اپنے چھوٹے بھائی شاہ عبد القادرؒ سے فرمایا کہ آپ انہیں سمجھائیں؛ چنانچہ شاہ عبد القادرؒ نے انہیں طلب فرمایا اور سمجھایا، تو شاہ اسماعیل شہیدؒ نے عرض کیا کہ حضرت یہ سنت ہے اور مٹ چکی ہے، میں اسے زندہ کررہا ہوں اور ایسی سنت پر عمل کرنے کا ثواب سو شہیدوں کے برابر ہے؟ تو شاہ عبد القادرؒ نے فرمایا کہ یہ اس سنت کا ثواب ہے، جو ختم ہوچکی ہو اور کسی بدعت نے اس کی جگہ لے لی ہو اور جہاں ایک ہی عمل میں دو سنت ہوں تو وہاں یہ اجر وثواب نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ ترجیح حق وباطل کے درمیان ہوتی ہے نہ کہ حق اور حق کے درمیان، ہاں البتہ ایک طالب علم کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ روایات کے ہوتے ہوئے ائمہ کے درمیان اختلاف کی وجہ کیا رہی؟

مفتی صاحبؒ کے سبق میں یہ اصطلاح بھی اکثر سننے میں آتی تھی کہ آپ ائمہ کے اختلاف میں زیادہ تر یہ فرماتے تھے کہ یہ دلائل کا نہیں؛ بلکہ نص فہمی کا اختلاف ہے؛ یعنی ائمہ کے درمیان کسی مسئلہ میں جو اختلاف ہوا ہے، وہ اس وجہ سے نہیں کہ سب کے پاس الگ الگ آیت یا حدیثیں ہیں؛ بلکہ کسی ایک آیت یا حدیث کے سمجھنے میں

ان کے درمیان اختلاف ہوا ہے، جس کی وجہ سے مسئلہ میں بھی اختلاف ہوا۔

مفتی صاحبؒ حدیث کی تشریح میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کرتے تھے، یہاں اس کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ ہماری دینی درس گاہوں میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

احادیث کی تشریح اور تطبیق میں مفتی صاحب کو کمال کا ملکہ حاصل تھا، ایسے ایسے انداز سے مفتی صاحبؒ تشریح فرماتے کہ دل باغ باغ ہو جاتا، کہیں اور اس انداز کی تشریح سننے میں نہیں آتی، جیسے باکرہ بالغہ لڑکی بغیر ولی کے اپنا نکاح خود کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں احادیث بھی مختلف ہیں اور ائمہ کے مابین بھی اختلاف ہے؛ لیکن ان دونوں اختلاف کو مفتی صاحب نے کس خوبصورتی سے رفع کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ شریعت کا مزاج یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ دو فریق سے متعلق ہوتا ہے تو شریعت ہر فریق سے اس انداز سے بات کرتی ہے، گویا ساری ذمہ داری اسی کی ہے اور دوسرا فریق بالکل آزاد ہے؛ چنانچہ یہاں جب شریعت نے لڑکی کو مخاطب کیا تو فرمایا: (أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ... سنن الترمذي، بَابُ مَا جَاءَ لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ، حديث نمبر: ۱۱۰۲) اور جب اولیاء کو مخاطب بنایا تو فرمایا: (الأَيِّمُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا... سنن الترمذي، بَابُ مَا جَاءَ فِي اسْتِئْمَارِ البِكْرِ وَالثَّيِّبِ، حديث نمبر: ۱۱۰۸) متعدد مقامات پر مختلف احادیث میں مفتی صاحبؒ نے اس طرح تطبیق دی ہے۔

بہت سی حدیثوں میں حضرت مفتی صاحب ایک تطبیق یہ پیش فرماتے تھے کہ جو حدیثیں منسوخ ہو گئی تھیں، ان کو بھی صحابہؓ یاد رکھتے تھے؛ چنانچہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد، جب صغار صحابہؓ کبار صحابہؓ بن گئے اور انہیں یہ خدشہ ہوا کہ مرور زمانہ کی وجہ سے منسوخ حدیثیں کہیں بالکل حافظہ سے محو نہ ہو جائیں اور اس وقت یاد کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ حدیث پر عمل کیا جائے؛ چنانچہ ان صحابہؓ نے حفاظت حدیث کے مقصد سے بہت سی ایسی حدیثوں پر عمل شروع کر دیا، جو منسوخ ہو چکی تھیں، پھر ان کی اتباع میں دیگر لوگوں نے بھی عمل شروع کر دیا پھر جب فقہاء کا

زمانہ آیا تو ان میں اختلاف ہو گیا کہ

ان حدیثوں پر عمل صرف حفاظت حدیث کی غرض سے ہوا ہے یا یہ سنت ہے، بعض نے انہیں سنت مانا اور بعض نے دیگر حدیثوں اور دلائل کی وجہ سے انہیں سنت نہیں سمجھا۔

مفتی صاحبؒ کے یہاں مختلف احادیث میں تطبیق کے لیے ایک اصطلاح یہ بھی خوب استعمال ہوتی تھی: ''یہ تشریع کے وقت کی ترخیص ہے'' جیسے ایک صحابیؓ نے رمضان المبارک میں دن میں بیوی سے صحبت کر لی تھی، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کفارہ کی مختلف شکلیں بتائیں؛ مگر انہوں نے سب سے معذوری ظاہر کی، آخر میں کہیں سے کچھ کھجوریں آئیں جو کفارہ کے لیے ناکافی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ کھجوریں انہیں دے دیں اور فرمایا کہ غریبوں میں تقسیم کر دیں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مدینہ میں مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: جائیں خود استعمال کر لیں۔ اس حدیث کے بارے میں بھی مفتی صاحبؒ فرماتے تھے کہ اس میں تشریع کے وقت کی ترخیص ہے۔

(بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ العِشَاءِ وَالفَجْرِ فِي الجَمَاعَةِ) اس باب کے تحت کی حدیث میں یہ مضمون ہے کہ اگر کوئی عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھے تو اسے رات بھر تہجد پڑھنے کا ثواب ملے گا۔ اس پر بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ایک بندہ یہ دونوں نمازیں جماعت کے ساتھ پڑھتا ہے اور رات کو تہجد بھی پڑھتا ہے اور دوسرا بندہ صرف یہ دونوں نمازیں جماعت کے ساتھ پڑھتا ہے، تہجد نہیں پڑھتا، تو بظاہر دونوں کو ثواب برابر ملے گا؛ کیوں کہ دوسرے کو بھی تہجد کا ثواب ملے گا؟

مفتی صاحب نے اس میں بہترین تطبیق پیش فرمائی ہے، مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں: ثواب کی دو قسمیں ہیں: (۱) اصلی (۲) انعامی۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ بخاری شریف کا ختم پڑھا گیا، ہر طالب علم کو پانچ لڈو ملے اور تین طالب علم نے مٹھائی تقسیم کرنے کا کام انجام دیا، آخر میں استاذ نے ان تینوں طالب علموں کو پندرہ پندرہ لڈو

دیے تو ان پندرہ لڈو میں پانچ اصلی ہیں اور دس انعامی۔ اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ عمل کا ایک ثواب اصلی ہے اور ایک انعامی، جب ایک عمل کے ثواب کا دوسرے عمل کے ثواب سے مقابلہ ہوگا تو ایک عمل کا اصلی اور دوسرے کا انعامی ثواب لیا جائے گا۔ یہاں عشاء اور فجر با جماعت پڑھنے کے ثواب کا تہجد کے ثواب سے جو مقابلہ ہوا تو اس میں عشاء اور فجر کا انعامی ثواب مراد ہے اور تہجد کا اصلی، یعنی عشاء اور فجر کا انعامی ثواب تہجد کے اصلی ثواب کے برابر ہے؛ لیکن جس نے تہجد کی بھی نماز پڑھی ہے، اسے تہجد کے اصلی اور انعامی دونوں ثواب ملے ہیں؛ لہذا یہ عشاء اور فجر با جماعت پڑھنے والے کے تہجد کے (صرف اصلی) ثواب سے کہیں زیادہ ہوں گے۔

اس کی نظیر: سورہ اخلاص پڑھنے کا ثواب ثلث قرآن کے برابر ہے، یہاں بھی سورہ اخلاص کا انعامی اور ثلث قرآن پڑھنے کا اصلی ثواب مراد ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اس انداز اور رفتار سے درس کی تشریح فرماتے تھے، کہ ان کی ہر بات لکھی جاسکتی تھی اور طلبہ کی ایک بڑی مقدار آپ کی درسی تشریح کو کاپی میں لکھنے کا اہتمام بھی کرتے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ بھی اس کی تاکید اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے، چند طلبہ تو آپ کی اردو تشریح کو عربی میں قلم بند کرتے تھے: میں نے بھی اپنے دورے کے سال سنن ترمذی جلد اول کے سبق کی تقریباً بارہ (۱۲) کاپیاں لکھی تھیں، یہ تمام کاپیاں میرے پاس محفوظ بھی ہیں اور یہ سارا مضمون انہی کاپیوں کی مدد سے لکھا ہے۔ اور ہمارے سال ہی ''تحفۃ الالمعی'' کی ترتیب کے لیے مفتی صاحبؒ کے اسباق کی ریکارڈنگ ہورہی تھی، حضرت مفتی صاحب کے اقبال مند صاحبزادے اور آپ کے علمی جانشین حضرت مفتی حسین احمد صاحب دامت برکاتہم العالیہ تحفۃ الالمعی کی ترتیب کا کام انجام دے رہے تھے، حضرت مفتی حسین احمد صاحب بھی میرے استاذ ہیں، جامع مسجد امروہہ میں ان سے شرف تلمذ حاصل ہوا، حضرت نے تحفۃ الالمعی کی پہلی جلد احقر کو بطور ہدیہ عنایت بھی فرمائی تھی۔

دوران درس بہت سے ایسے مسائل آتے تھے، جن میں ائمہ کے یہاں افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہوتا

ہے، ایسے موقع پر حضرت تاکید فرماتے تھے، ہمیں افضل پر عمل کرنا چاہیے، لیکن حدیث یاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیں کبھی کبھار غیر افضل پر بھی عمل کرنا چاہیے، جیسے سجدہ سہو کے مسئلہ میں، حضرت امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ کے یہاں اس کے طریقہ میں اختلاف ہے، حضرت امام شافعیؒ کے بتائے ہوئے طریقہ میں نماز جلدی مکمل ہوجاتی ہے، یعنی ان کے یہاں قعدہ اخیرہ میں سب کچھ پڑھنے کے بعد پہلے سہو کے دو سجدے کیے جاتے ہیں، پھر دونوں طرف سلام پھیر کر نماز مکمل کی جاتی ہے۔

مفتی صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں عام حالات میں حنفیہ کے مطابق سجدہ سہو کرتا ہوں؛ لیکن سفر میں اگر ضرورت پیش آجاتی ہے، تو پھر شوافع کے مطابق عمل کرتا ہوں۔

حضرت مفتی صاحبؒ بارہا دوران درس ائمہ کے درمیان ہوئے اختلاف کے ردعمل اور اس کے غلط نتیجہ کی طرف توجہ مبذول کرایا کرتے تھے، جیسے آپ فرماتے تھے کہ وتر کی تیسری رکعت میں تکبیر کے بعد کونسی دعا پڑھنی ہے، اس میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، احناف کے یہاں افضل دعائے قنوت ہے اور دوسری دعائیں پڑھنا بھی درست ہے، لیکن اختلاف کا ردعمل یہ ہوا کہ احناف کو شوافع کی اور شوافع کو احناف کی دعا یاد نہیں، سب کو بس ایک ہی دعا یاد ہے؛ حالانکہ ساری دعائیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں۔ اور اس کی بہت ساری مثالیں ہیں۔

اس کی مثال میں یہ بات بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ خواتین مسجد کی جماعت میں شریک ہوسکتی ہیں یا نہیں، تقریباً تمام ائمہ کے یہاں فتنہ کی وجہ سے خواتین کے لیے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے؛ لیکن مفتی صاحبؒ فرماتے تھے کہ ہم نے اس میں اتنی شدت اختیار کی کہ گویا ہم عورت کے مسجد میں داخلہ اور ان کے مسجد میں نفس نماز پڑھنے کو بھی ممنوع سمجھنے لگے، چنانچہ ہماری عورتیں بازاروں میں، سفر میں، پبلک مقامات پر مناسب جگہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے نمازیں قضا کر دیتی ہیں، لیکن وہاں کی مسجد میں جا کر نماز ادا نہیں کرتیں، مفتی صاحبؒ اس کی سخت مذمت فرماتے تھے۔

فرض اور نفل نماز میں بہت سے احکام میں اختلاف ہے، فرائض میں جتنی شدت اور سختی ہے اتنی نوافل میں نہیں ہے، حضرت مفتی صاحب فرض اور نفل نماز کے اس فرق کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ فرائض اللہ تعالی کے دربار کی حاضری ہے اور نوافل اللہ تعالی سے پرائیویٹ ملاقات ہے اور دربار کی حاضری کے آداب الگ ہوتے ہیں؛ جب کہ پرائیویٹ ملاقات کے لیے کوئی خاص قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہوتا اور حضرت مفتی صاحبؒ جج کی مثال پیش فرماتے تھے کہ عدالت میں اس کے سامنے کھڑے ہونے کے آداب بہت سخت ہیں، جب کہ جج کے گھر پرائیویٹ ملاقات کے لیے جائیں تو کوئی پروٹوکول نہیں ہوتا اور حضرت مفتی صاحب اپنے مصری استاذ شیخ محمود عبد الوہاب محمود کا عمل بھی ذکر فرماتے تھے کہ وہ جب قدیم مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز کے لیے تشریف لاتے تو بہت اہتمام کے ساتھ تشریف لاتے اور فرض نماز کے بعد نوافل پڑھنے اپنے کمرے تشریف لے جاتے، وہاں جا کر اہتمام والے سارے کپڑے اتار دیتے اور معمولی کپڑوں میں نوافل ادا فرماتے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے استاذ سے ایک بار اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے اسی طرح کی کوئی بات فرمائی تھی۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رات میں طویل اور دن میں مختصر نوافل منقول ہیں، مفتی صاحبؒ اس کی حکمت بیان کرتے ہیں کہ رات کی طبیعت (Nature) میں انبساط اور دن کی طبیعت میں انقباض ہوتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ سارے تفریحی کام: فنکشن، ڈرامے اور مشاعرے رات میں ہوتے ہیں، رات میں خوب جی لگتا ہے اور دن میں انبساط اس لیے نہیں رکھا گیا کہ وہ معاش کے لیے ہے، اگر دن کی فطرت میں انبساط ہوتا تو لوگ تفریح میں لگے رہتے اور کام نہ کرتے۔

حضرت مفتی صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر باب کی حدیث پر ضرور کلام فرماتے تھے، آگے یا پیچھے کا حوالہ دے کر یا وقت کی قلت اور نصاب کی زیادتی کی وجہ سے کبھی انہوں نے عبارت خوانی نہیں کروائی، کوئی ایک باب بھی بغیر کلام کے نہیں گزارا جاتا اور پورے اطمینان کے ساتھ نصاب بھی وقت پر پورا ہوتا تھا۔

دین کا کام کرنے والے بعض طبقوں کے ذہن میں یہ بیٹھ گیا ہے کہ ہم ہی دین کا کام کررہے ہیں، ہمارے علاوہ کوئی دین کا کام نہیں کرتے، حضرت مفتی صاحب نے ایسے لوگوں کے بارے میں باب الجہاد میں ایک خوبصورت مثال پیش فرمائی، آپ فرماتے تھے کہ دین کی مثال کوہ نور کی ہے، گرکرٹوٹنے کی وجہ سے جس کے کئی ٹکڑے ہوگئے ہوں، اب اس کا ہر ٹکڑا کوہ نور ہے، کسی کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہی کوہ نور ہے، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی کوہ نور ہے۔ اسی طرح دین کے بہت سے شعبے ہیں اور دین کی خدمت کسی ایک شعبہ میں منحصر نہیں ہے۔

مدارس کے بارے میں حضرت مفتی صاحب فرماتے تھے: مدارس میں دو بڑی خرابیاں آگئی ہیں: (۱) مصارف میں غلطی، پہلے حیلہ کا ڈھونگ تھا، لیکن اب وہ بھی نہیں رہا، امداد الفتاوی میں لکھا ہے: حیلہ دیانات میں اللہ کے یہاں حلت پیدا نہیں کرتا۔ (۲) مدارس میں تعلیم نہیں رہی، برائے نام تعلیم ہے اور اس سے دار العلوم بھی مستثنی نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے فرمایا: اگر کوئی مہتمم کہے کہ بنا زکاۃ کے مدرسہ نہیں چلتا؛ کیوں کہ دوسری رقم نہیں ملتی، تو اگر ہم ان میں خرد برد نہ کریں تو مدرسہ کیسے چلے گا؟

جواب: کیا اللہ نے تیرے ذمہ مدرسہ چلانا فرض کیا ہے؟ تجھ سے نہیں چلتا، بند کر کے امت کو چابی دے۔ پھر حضرت گنگوہی کا واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ دیوبند کے ایک رئیس صاحب کے بارے میں اہل دیوبند نے سفارش کی کہ ان کو مجلس شوری کا رکن بنایا جائے، حضرت گنگوہی سرپرست تھے، آپ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا اور اس کی نزاکت بھی پیش کی گئی، حضرت نے ان کی رکنیت کے حوالے سے انکار فرمادیا اور فرمایا کہ یہ مدرسہ اللہ کی رضا کے لیے ہے، اگر اس مقصد پر عمل ممکن نہ رہا تو مدرسہ بند کردیں گے۔

(عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا أَرَدْتِ اللُّحُوقَ بِي فَلْيَكْفِكِ مِنَ الدُّنْيَا كَزَادِ الرَّاكِبِ، وَإِيَّاكِ وَمُجَالَسَةَ الأَغْنِيَاءِ، وَلَا تَسْتَخْلِقِي ثَوْبًا حَتَّى تُرَقِّعِيهِ) (سنن الترمذي،

بَابُ مَا جَاءَ فِي تَرْقِيعِ الثَّوْبِ، حدیث نمبر: ۱۷۸۰) اس حدیث پاک میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ کو چند نصیحتیں فرمائی ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ اسی مناسبت سے طلبہ کو بھی نصیحت کرتے اور فرماتے تھے:

اولاد کی تین قسمیں ہیں: (۱) سپوت (۲) کپوت (۳) پوت

(۱) سپوت وہ ہے جو باپ کا نام روشن کرے۔

(۲) کپوت وہ ہے جو باپ کا نام ڈوبائے۔

(۳) پوت وہ ہے جو نہ نام روشن کرے اور نہ ڈوبائے۔

اب سمجھو کہ تمھیں کس نے پڑھایا؟ نہ والدین نے، نہ مدرسہ نے اور نہ اساتذہ نے؛ بلکہ ملت اسلامیہ نے تمھیں پڑھایا ہے۔ لہذا اب دیکھا جائے گا کہ تم ملت کے حق میں کیا بنتے ہو: سپوت، کپوت یا پوت؟

ملت کے حق میں کپوت وہ (فاضل) ہے جس کا عمل خراب ہوجائے، وہ نام بدنام کرتا ہے، مدرسہ کا بھی، اساتذہ کا بھی۔ پوت یہ ہے کہ تمہارا عمل صحیح رہا؛ مگر تم نے ملت کی خدمت نہیں کی۔

سپوت یہ ہے کہ تم نے زندگی بھر کسی بھی لائن سے دین کی خدمت کی اور سپوت بننے والے مرحلے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی سادہ ہو، ٹھاٹھ والی زندگی کے ساتھ یہ مرحلہ طے نہ ہوگا، ہم پر امت کا کام یعنی ملی کام کرنا فرض ہے، ہم اس کے ٹھیکیدار ہیں، امت اگرچہ ایک کوڑی نہ دے۔

پیسہ تین کام کرتا ہے: (۱) اچھا کھانا (۲) اچھا پہننا (۳) لوگوں میں عزت۔

مولوی کو یہ سب حاصل ہیں: سب سے اچھا کھاتا ہے، اچھا پہنتا ہے اور لوگوں میں عزت بھی ہوتی ہے، تو اب پیسہ کیوں چاہیے؟ اور ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھنا چاہیے، شکر کا جذبہ پیدا ہوگا، اوپر والوں کو دیکھو گے تو ناشکری کا جذبہ پیدا ہوگا۔

(بَابُ كَيْفَ كَانَ كِمَامُ الصَّحَابَةِ؟) اس باب کے تحت حضرت مفتی صاحبؒ نے دیوبندیت کے دو

بنیادی عناصر بیان فرمائے، آپؒ فرماتے ہیں کہ دیوبندیت نام ہے: (۱) قرآن وحدیث کو قرون اولی کے طرز پر سمجھنا اور قرون متوسطہ کی تفسیروں کا اعتبار نہیں۔ (۲) احیاء سنت اور اماتت بدعت۔ ورنہ دیوبندیت کچھ نہیں۔

(عَنْ عَمَّتِهِ أُمِّ فَرْوَةَ - وَكَانَتْ مِمَّنْ بَايَعَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قَالَتْ: سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الصَّلَاةُ لِأَوَّلِ وَقْتِهَا) (سنن الترمذي، بَابُ مَا جَاءَ فِي الوَقْتِ الاَوَّلِ مِنَ الفَضْلِ، حدیث نمبر: ۱۷۰) اس حدیث کے تحت حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: حضرت ام فروہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت سلوک کی تھی، اس بیعت سے درجات بڑھتے ہیں اور یہ نوافل اعمال کے لیے ہوتی ہے۔ مغفرت بیعت سلوک پر موقوف نہیں، جیسا کہ بریلویوں کا خیال ہے، ورنہ سارے صحابہؓ اور صحابیاتؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت سلوک کرتے، یہ بیعت کیوں ہوتی ہے؟ جنت کے سو درجے ہیں اور جنت میں جانا ہی صرف مطلوب نہیں؛ بلکہ بلند درجات حاصل کرنا بھی مطلوب ہے اور اسی کے لیے بیعت سلوک کی جاتی ہے۔ تو جہاں بھی حدیثوں میں یہ آئے کہ کسی صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت سلوک کی تھی اور ان کا درجہ بلند ہے۔

(بَابُ مَا جَاءَ فِي تَعْجِيلِ الصَّلَاةِ إِذَا أَخَّرَهَا الإِمَامُ) اس باب کے تحت حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: ایک بات کہتا ہوں سمجھانے کے لیے، اس میں ایک غلط لفظ ہے، جو مجھے استعمال نہ کرنا چاہیے؛ مگر سمجھانے کے لیے استعمال کرتا ہوں: امام دو قسم کے ہوتے ہیں: (۱) پیش امام (۲) پیٹ امام (یہی وہ لفظ ہے، جسے مفتی صاحبؒ استعمال نہیں کرنا چاہ رہے تھے)۔

نماز کا وقت ہو گیا، ابھی امام صاحب نہیں آئے، تکبیر شروع کردی اور جب تکبیر ختم ہو گئی اور امام صاحب نہیں آئے تو کوئی آگے بڑھا اور اس نے نماز پڑھادی۔ پھر نماز کے بعد نمازی امام صاحب کو ڈانٹ رہے ہیں اور امام بھیگی بلی کی طرح سن رہا ہے، یہ ہے پیٹ امام۔

نماز کا وقت ہو گیا، مگر جب تک امام صاحب نہ آئیں، تکبیر شروع نہیں ہو سکتی، کوئی امام کی اجازت کے بغیر مصلی پر چڑھ نہیں سکتا۔ یہ ہے پیش امام۔

(بَابُ تَرْكِ الوُضُوءِ مِنَ القُبْلَةِ) اس باب کے تحت کی عبارت میں لفظ (اصحاب) آیا ہے، جو صاحب کی جمع ہے، اس کی تحقیق کے حوالے سے حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: آج ہی رات میں نے خواب میں مدینہ کے محدث حضرت عوامہ کو دیکھا کہ وہ دیوبند آئے ہیں، تو میں نے ان سے پوچھا کہ ہم جو بزرگوں کے نام کے آخر میں لفظ صاحب لگاتے ہیں، جیسے مولانا قاسم صاحب، تو اس کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ عربی کا لفظ ہے، جو مشترک ہے چھوٹے اور بڑے کے معنی میں، استاذ کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور شاگرد کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ تو صاحب کے معنی ہوئے ہمارے بڑے۔

میری کاپی میں آخری سبق کی تاریخ ہے: ٢٣/٧/٢٨ھ مطابق ٨/٧/٢٠٠٧ء اور چوتھے گھنٹے میں یہ کتاب مکمل ہوئی تھی، اس آخری سبق میں دو نصیحتیں لکھی ہوئی ہیں: (١) فارغ و فاضل مت ہو جاؤ، ساری زندگی پڑھو، چاہے کوئی لائن اختیار کرو۔ اور پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ ایک آیت کی تفسیر یاد کرو، روزانہ ایک حدیث تشریح کے ساتھ اور روزانہ فقہ کا ایک مسئلہ یاد کرو، زیادہ مت پڑھو، اگر ایسا کرتے رہے تو مے خانے کا محروم بھی محروم نہیں اور اگر پڑھنا بند کر دیا تو بہترین طالب علم بھی کوڑی کا ہو کے رہ جائے گا۔ (یہ نصیحت ان طلبہ کے لیے تھی، جو تدریس کے علاوہ کوئی اور مشغلہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے)

(٢) ریت، رواج، بدعات اور خرافات سے آپ کا Compromise نہیں ہونا چاہیے، اس سے ایسی چڑھ ہونی چاہیے، جیسے پاخانے سے ہوتی ہے۔ اللہ تمہارا سرپرست رہے، والی رہے۔

ہم نے طحاوی شریف بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے پڑھی ہے، کتاب کے آغاز میں مفتی صاحبؒ نے ایک بات یہ بیان فرمائی کہ یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ دیوبند میں حدیث نہیں؛ بلکہ اقوال رجال اور ترجیح احناف

پڑھائی جاتی ہے، حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ سو فی صد غلط ہے، ہم مجتہدین کے اقوال حدیث فہمی کے لیے ذکر کرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ دار العلوم دیو بند میں شوافع، مالکی اور حنبلی طلبہ بھی پڑھتے ہیں؛ لیکن آج تک کوئی شافعی طالب علم حنفی نہیں بنا۔ مزید فرمایا: لیکن جب استاذ حنفی ہے تو اونٹ تو اسی کروٹ بیٹھے گا اور جب نفس الامر میں حنفیت راجح ہے تو وہ مرجوح کیسے ہوگی؟۔

الغرض حضرت مفتی صاحبؒ علم حدیث کے منفرد شارح تھے، حدیث نبوی کی تشریح میں آپ کا انداز البیلا اور نرالا تھا، آپؒ ایک عظیم محدث تھے، ساتھ ہی علوم ولی اللہی اور علوم نانوتوی کے ترجمان اور شارح تھے، اللہ تعالی حضرت مفتی صاحبؒ کو خلدِ بریں میں اعلی مقام عطا فرمائے، آپؒ کی نصیحتوں اور مشن پر ہمیں گامزن ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے اور ہمیں آپؒ کا نعم البدل عنایت فرمائے۔

اب چہچہے ہیں وہ، نہ نوا سنجیاں ہیں وہ
شاید گزر گیا قلقؔ خوش نوائے باغ

❁...❁...❁

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی رحلت

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب
امیر عالمی تحفظِ ختم نبوت، کراچی

عالمِ اسلام کی عظیم علمی شخصیت، محدث، فقیہِ وقت، متکلمِ زمانہ، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین، کئی نسلوں کے معلم ومربی، ہزاروں علمائے کرام کے شفیق استاذ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ اس دنیائے رنگ وبو کی تقریباً اسی بہاریں دیکھنے کے بعد ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح چاشت کے وقت اپنا سفرِ زندگی مکمل کرکے عالمِ عقبیٰ کے سفر پر روانہ ہوگئے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، إن للہ ما أخذ ولہ ما أعطی وکل شیء عندہٗ بأجل مسمّٰی۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکابر واسلاف کے عقائد ونظریات کے صحیح اور حقیقی جانشین اور متصلب بزرگ تھے۔ اپنی پوری زندگی درس وافتاء، تصنیف وتالیف اور وعظ ونصیحت میں گزاردی۔ علمِ دین کی اشاعت اور اس کی ترویج آپ کی زندگی کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔

گزشتہ دوسالوں میں ہندوپاک کے کئی اکابر علمائے کرام ومشائخ عظام کی رحلتیں ہوئیں، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا علومِ وحی کے حاملین سے خالی کی جارہی ہے اور قیامت کی قربت کا سامان کیا جارہا ہے، جیسا کہ صادق المصدوق نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفی احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے کہ: ’’إن اللہ لایقبض العلم انتزاعًا ینتزعہٗ من قلوب العباد ولکن یقبضہٗ بقبض العلماء، حتی إذا لم یبق عالمًا اتخذ الناس رؤسًا جھالًا فسئلوا فأفتوا بغیر علم فضلوا وأضلوا‘‘ (مشکوٰۃ، ص: ۳۳) ترجمہ: ’’بے شک اللہ

تعالیٰ اس علم کو اس طرح قبض نہیں کرے گا کہ بندوں کے سینوں سے چھین لے، بلکہ قبضِ علم کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ علماء کو اُٹھاتا رہے گا، یہاں تک کہ جب ایک عالم بھی باقی نہیں چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے، ان سے سوالات ہوں گے، وہ بغیر جانے فتویٰ دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' ایک اور حدیث میں ہے: ''عن مرداس الأسلمي رضي الله عنه قال: قال النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم: یذهب الصالحون الأول فالأول ویبقی حفالة کحفالة الشعیر أو التمر لایبالیهم الله بالةً۔'' (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، ج:۲،ص:۹۵۲) ترجمہ: ''حضرت مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیک لوگ یکے بعد دیگرے اُٹھتے جائیں گے اور (انسانیت کی) تلچھٹ پیچھے رہ جائے گی، جیسا کہ ردّی جو اور کھجور رہ جاتے ہیں، حق تعالیٰ ان کی کوئی پروا نہیں کرے گا۔'' حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ ان اخیارِ امت اور طبقۂ صالحین میں سے تھے جن کی حیات اہلِ زمین خصوصاً علمی حلقوں کے لیے آبِ حیات اور بہت سے فتنوں کے سامنے سدِ سکندری سے کم نہ تھی۔ آپ کی وفات علم وعرفان کی موت ہے، آپؒ کا سانحۂ ارتحال ''موت العالِم موت العالَم'' کے مصداق انسانیت کا نقصان ہے، آپؒ کی وفات سے جہاں اہلِ علم کے حلقے ایک مفسر، محدث، فقیہ، محقق، مصنف اور قادر الکلام خطیب سے محروم ہوگئے، وہاں اہلِ قلوب عظیم روحانی پیشوا سے بھی محروم ہوگئے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی پیدائش کالیڑہ، شمالی گجرات کے شہر پالن پور، ہندوستان میں جناب یوسف صاحبؒ کے ہاں ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء کے آخر میں ہوئی، آپ اپنے والدین کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ والدین نے آپ کا نام ''احمد'' رکھا، جب آپ مظاہر العلوم سہارن پور میں تعلیم پارہے تھے تو آپ نے خود اپنا نام ''سعید احمد'' رکھا۔ آپ کی تعلیم کا آغاز والد صاحب سے ہوا، ابتدائی فارسی اپنے ماموں سے پڑھی، پھر پالن پور شہر میں حضرت مولانا نذیر میاںؒ کے مدرسہ میں شرح جامی تک کتابیں پڑھیں۔

۱۳۷۷ھ میں مظاہر العلوم سہارن پور میں داخلہ لیا اور تین سال تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۸۰ھ میں

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں دورہ حدیث کی تکمیل کر کے فاتحہ فراغ پڑھا۔آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے،اس لیے اساتذہ کرام کی توجہ اور تعلیم وتربیت نے خاص اثر کیا اور آپ نے دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم دینی درس گاہ کے سالانہ امتحان میں اول نمبر سے کامیابی حاصل کی۔ دورہ حدیث سے فراغت کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہؒ کی زیرِ نگرانی افتاء کا کورس مکمل کیا اور افتاء کے ساتھ ساتھ جہاں آپ اپنے بھائی کو حفظ کراتے تھے، وہاں خود بھی آپ نے ان کے ساتھ حفظ مکمل کیا۔

تدریس کے لیے آپ کا پہلا تقرر حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کی معرفت دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں ہوا، ۹ سال تک وہاں آپ نے تدریس فرمائی اور تصنیف کا آغاز بھی آپ نے اسی زمانہ میں شروع کر دیا تھا۔اسی عرصہ میں موصوف نے داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمتِ مصاہرت، ''العون الکبیر'' اور مولانا محمد طاہر پٹنی قدس سرہٗ کی ''المغنی'' کی عربی شرح وغیرہ تصانیف ارقام فرمائیں۔اپنے استاذ حضرت مولانا محمد ہاشمؒ (جو دارالعلوم دیوبند میں پڑھاتے تھے) کی تحریک پر آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے درخواست بھیجی اور اس کے ساتھ ایک خط حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام بھیجا، جس کے جواب میں حضرت مہتمم صاحبؒ نے آپ کو لکھا:

''محترمی ومکرمی زید مجدکم! سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ باعث مسرت ہوا، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتب پر کام کرنے کی اطلاع سے غیر معمولی خوشی ہوئی، جو صورت آپ نے اختیار فرمائی ہے، وہ مناسب ہے، خود میرے ذہن میں ان کتب کی خدمت کی مختلف صورتوں میں سے ایک یہ صورت بھی تھی۔ الفرقان میں پڑھنے کی نوبت نہیں آئی، ان شاء اللہ رسائل منگوا کر مستفید ہوں گا، اور جو رائے قائم ہوگی وہ عرض کروں گا۔درخواست منسلکہ مجلسِ تعلیمی میں بھیج رہا ہوں، اس پر وہاں سے کوئی کارروائی ضرور کی جائے گی، اس کی اطلاع

دی جائے گی۔ دعا کی درخواست۔ قاسم العلوم کے میرے پاس دو نسخے تھے، ایک نسخہ اسی ضرورت سے وہاں بھیجا گیا، مگر واپس نہیں ہوا، اب ایک رہ گیا ہے، جو صاحب نقل کرنا چاہیں، وہ ایک وقت مقرر کر کے میرے کتب خانہ میں ہی بیٹھ کر نقل فرمالیا کریں، اور یہاں بحمد اللہ خیریت ہے۔

والسلام:

محمد طیب از دیوبند

۷/۷/۱۳۹۳ھ۔"

جب خط شوریٰ میں پیش ہوا تو حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ جو شوریٰ کے ممبر تھے، انہوں نے آپ کا نام پیش کیا اور اسی مجلس میں آپ کا تقرر ہو گیا، ۱۳۹۳ھ سے تا دمِ واپسیں تقریباً ۴۸ سال آپ نے دارالعلوم کی خدمت کی۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے مفتی، شیخ الحدیث، صدر المدرسین کے منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ آپ کے فیض قلم سے درج ذیل کتابیں منصۂ شہود پر آئیں:۱:-تفسیر ہدایت القرآن، ۲:-"الفوز الکبیر" کی تعریب جدید، ۳:-"العون الکبیر"، یہ"الفوز الکبیر" کی عربی شرح ہے۔ ۴:-فیض المنعم: (مقدمۂ مسلم شریف کی اردو شرح)، ۵:-"تحفۃ الدُّرر": ("نخبۃ الفکر" کی اردو شرح)، ٦:-مبادی الفلسفہ، ۷:-معین الفلسفہ (مبادی الفلسفہ کی اردو شرح)، ۸:-"مفتاح التہذیب": "تہذیب المنطق" کی شرح ہے، ۹:-آسان منطق، ۱۰:-آسان نحو (دو حصے)، ۱۱:-آسان صرف (تین حصے)، ۱۲:-محفوظات (تین حصے): یہ آیات واحادیث کا مجموعہ ہے، جو طلبہ کے حفظ کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ ۱۳:-آپ فتویٰ کیسے دیں؟ ("شرح عقود رسم المفتي" کا نہایت عمدہ ترجمہ مع ضروری فوائد)، ۱۴:-کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ (یہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی کتاب "توثیق الکلام" کی نہایت آسان عام فہم شرح ہے)، ۱۵:-حیات امام ابوداؤدؒ (امام ابوداؤد سجستانیؒ کی مکمل سوانح)، ۱٦:-مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویان کتب حدیث، ۱۷:-حیاتِ امام

طحاویؒ، ١٨:- اسلام تغیر پذیر دنیا میں (چار قیمتی مقالوں کا مجموعہ)، ١٩:- نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟، ٢٠:- داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، ٢١:- حرمتِ مصاہرت، ٢٢:- تسہیل ادلۂ کاملہ: حضرت شیخ الہندؒ کی مایۂ ناز کتاب ادلۂ کاملہ کی نہایت عمدہ شرح ہے، اس میں غیر مقلدین کے چھیڑے ہوئے دس مشہور مسائل کی مکمل تفصیل ہے، یہ شیخ الہندؒ اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ ٢٣:- حواشي وعناوين ايضاح الادلة: ایضاح الادلۃ حضرت شیخ الہندؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس پر موصوف نے نہایت مفید حواشی ارقام فرمائے ہیں، اور ذیلی عناوین بڑھائے ہیں، یہ کتاب بھی شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ ٢٤:- حواشی امداد الفتاوی، ٢٥:- افاداتِ نانوتویؒ، ٢٦:- افاداتِ رشیدیہ، ٢٧:- ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'': یہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی مبسوط اردو شرح ہے، ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی تشریح ایک بھاری قرضہ تھا، جو ڈھائی سو سال سے اُمت کے ذمہ باقی چلا آرہا تھا۔ ٢٨:- تہذیب المغنی: ''المغنی'' علامہ محمد طاہر پٹنی قدس سرہٗ کی اسماء رجال پر بہترین کتاب ہے، موصوف نے اس کی عربی میں شرح لکھی ہے۔ ٢٩:- ''زبدۃ الطحاوي'': یہ امام طحاویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''شرح معاني الآثار'' کی عربی تلخیص ہے۔ ٣٠:- کامل برہانِ الٰہی، ٣١:- ''حجۃ اللہ البالغۃ'' عربی: (دو حصے)، ٣٢:- ہادیہ شرح کافیہ، ٣٣:- ''الوافية'' شرح کافیہ: (کافیہ کی عربی شرح)، ٣٤:- ''تحفة الألمعي'' شرح سنن الترمذی، ٣٥:- ''تحفة القاري'' شرح صحیح البخاری، ٣٦:- علمی خطبات (دو حصوں پر مشتمل ہے)، ٣٧:- مفتاح العوامل شرح شرح مأۃ عامل، ٣٨:- گنجینۂ صرف شرح پنج گنج، ٣٩:- ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم، ٤٠:- دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، ٤١:- فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے، ٤٢:- آسان فارسی قواعد، ٤٣:- ''مبادی الأصول'' (عربی اصولِ فقہ میں ہے)، ٤٤:- معین الاصول، ٤٥:- شرح علل الترمذی (ترمذی شریف کی ''کتاب العلل'' کی عربی شرح)، ٤٦:- مسلم پرسنل لاء اور نفقۂ مطلقہ۔

مذکورہ بالا تعلیمی، تدریسی اور تصنیفی خدمات کے علاوہ تبلیغ اور وعظ وارشاد کی غرض سے کئی بیرون ممالک مثلاً:

برطانیہ، کینیڈا، افریقہ اور سعودی عرب کا سفر آپ نے کیا۔ آپ کی پہلی بیعت قطب الاقطاب، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہٗ سے تھی اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری نے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت دی۔ حضرت مفتی صاحب کے والد محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ جوڈابھیل میں کچھ عرصہ پڑھتے رہے اور ان کی تربیت سے حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ اس مقام تک پہنچے، حضرت مولانا مفتی محمد امین (استاذِ حدیث وفقہ مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) نے ان کے والد صاحب کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ:

''جس زمانہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، اور محدثِ کبیر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ ڈابھیل میں پڑھاتے تھے، اس وقت والد صاحب ڈابھیل میں پڑھتے تھے، اور حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہٗ کے خادمِ خاص تھے، مگر گھریلو احوال کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے، اس لیے اپنے صاحب زادوں کو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، اور محدث کبیر مولانا محمد یوسف بنوریؒ جیسا عالم بنانے کا عظیم جذبہ رکھتے تھے، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہٗ نے والد صاحب کو یہ وصیت کی تھی کہ:

یوسف! اگر تم اپنے لڑکوں کو اچھا عالم بنانا چاہتے ہو، تو حرام اور ناجائز مال سے پرہیز کرنا، اور بچوں کو بھی ناجائز اور حرام مال سے بچانا، کیونکہ علم ایک نور ہے، ناجائز اور حرام مال سے جو بدن پروان چڑھتا ہے، اس میں یہ نور داخل نہیں ہوتا۔ یہ نصیحت حضرت مولانا نے والد ماجد کو اس لیے کی تھی کہ اس زمانہ میں ہماری ساری قوم بنیوں کے سود میں پھنسی ہوئی تھی، اسی زمانہ میں ہمارے دادا نے بنیے سے سودی قرض لے کر ایک زمین کرایہ پر لی تھی، والد صاحب اس زمانہ میں ڈابھیل کے طالب علم تھے، والد صاحب نے اس معاملہ میں دادا سے اختلاف کیا تو والد صاحب کو حرام سے بچنے کے لیے مجبوراً تعلیم چھوڑ کر اپنا گھر سنبھالنا پڑا، اور تہیہ کیا کہ چاہے بھوکا رہوں گا، مگر حرام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، تاکہ میں نہیں پڑھ سکا تو اللہ تعالیٰ میری اولاد کو علمِ دین عطا فرمائیں۔ چنانچہ والد صاحب، ناجائز اور حرام مال، بلکہ مشتبہ مال سے بھی پرہیز کرتے تھے، اور اپنی اولاد کو بھی بچاتے تھے، اور ان کی تعلیم و

تربیت کی طرف پوری توجہ فرماتے تھے۔‘‘

حضرت مفتی صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال پر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم، نائب رئیس حضرت مولانا سید سلیمان یوسف بنوری زید مجدہم اور جملہ اساتذہ کرام کی طرف سے مشائخ وارباب دارالعلوم دیوبند اور حضرت مفتی صاحبؒ کے جملہ پسماندگان سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کی کامل مغفرت فرمائے، آپ کی جملہ حسنات کو قبول فرمائے، پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور آپؒ کے جملہ متوسلین و تلامذہ کو حضرت کے مشن کو جاری وساری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ ’’بینات‘‘ کے باتوفیق قارئین سے حضرتؒ کے لیے ایصالِ ثواب کی درخواست ہے۔ وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین۔

❁...❁...❁

توصیف کیا بیاں کریں ان کے کمال کی

مولانا عبدالباری فاروقی
استاذ دارالمبلغین لکھنؤ

عالمی دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کو ہماری اس دنیا سے رخصت ہوگئے، انا للہ و انا الیہ راجعون، اس عظیم سانحے کی خبر سے پورے عالم اسلام کے اندر غم وافسوس کا جواثر دیکھا گیا وہ ناقابل بیان ہے، پوری دنیا میں پھیلے ہوئے حضرت علیہ الرحمہ کے فیض یافتہ وہ علماء جن کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا، وہ اس حادثہ سے سب سے زیادہ متاثر ہیں اور غمگین ہیں۔

دارالعلوم دیوبند تجدید دین کی عالم گیر تحریک، حفاظت اسلام کے لئے ہمیشہ کوشاں رہنے والا اور تعلیم وتربیت کے لحاظ سے برصغیر میں مرکزی حیثیت کا حامل ایک عظیم ادارہ ہے، جن مقاصد کے لئے اس ادارہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، بڑے خلوص وللّٰہیت اور ثابت قدمی کے ساتھ ان کی تعمیل میں سرگرم عمل رہا، اس ادارہ نے بے شمار علماء ربانیین پیدا کئے مبلغین ودعاۃ کو جنم دیا مفسرین ومحدثین کی جماعتیں تیار کیں، اس ادارہ کے تربیت یافتہ مصنفین ومقررین اور مناظرین کی ایک بڑی تعداد نے دنیا کے مختلف حصوں میں احیاء دین کا عظیم اور تجدیدی کارنامہ انجام دیا، اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، جب جب سرزمین ہند پر فتنوں نے سر ابھارا، ہر موقع پر فرزندان دارالعلوم کھل کر سامنے آئے اور ان فتنوں کا بھرپور تعاقب کیا، اس سلسلۃ الذہب کی ایک نمایاں کڑی استاذ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کی ذات گرامی تھی، آپ نے دارالعلوم کے مقصد اور اسلاف کی روایات کو نہ صرف

تعلیمی اور تدریسی امور میں قائم رکھا بلکہ ہفتوں کے تعاقب اور سرکوبی میں بھی آپ کا طریق کار اسلاف سے جدا نہ ہوا، ردقادیانیت کے سلسلہ میں آپ نے جو خدمات انجام دیں وہ دہائیوں پر محیط ہیں، آپ نے بلاخوف لومۃ لائم اہل اسلام کو بدعات اور خلاف شرع باتوں سے روکا، اور اس باب میں آپ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہنے والوں میں سے تھے۔

راقم کو حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ سے ملاقات اور آپ کے دیدار کا شرف، سب سے پہلے امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب کے قائم کردہ "۱۵ روزہ جلسے شہدائے اسلام میں حاصل ہوا، جہاں آپ والد محترم حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب کی دعوت پر تشریف لائے تھے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی میں مسلسل ملاقات اور استفادے کے مواقع میسر آتے رہے، اور حضرت کی شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جب بھی ملاقات ہوتی بڑی محبت واپنائیت کا معاملہ فرماتے، اپنے تمام شاگردوں کے ساتھ نہایت شفقت ومحبت سے پیش آتے اور ان کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے، آپ سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نہایت رحم دل واقع ہوئے، جو شخص بھی تحریکی وتدریسی سرگرمیوں میں آپ کا شریک کار رہا، اور جس نے بھی آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، وہ آپ کے علمی مقام کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا، آپ عبادت وریاضت اور تقوی و پرہیزگاری میں نرالی شان رکھتے تھے، اللہ تبارک وتعالی نے استاذ محترم کو عباد الرحمن کی صفات سے معمور فرمایا تھا، اور آپ کو ہر وہ خوبی عطاء فرمائی تھی جو کسی مسلمان کے کامل مومن ہونے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ آپ کی شخصیت جامع کمالات علمیہ وعملیہ تھی، اور آپ کا قلب علوم نبویہ سے منور تھا۔ **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء.**

استاذ محترم نہایت خوش مزاج اور باوجاہت شخصیت کے مالک تھے، طبیعت میں سادگی تھی، شان استغناء، احتیاط اور توکل علی اللہ جیسی صفات سے آپ کا قلب مجلی ومنور تھا، یہاں حضرت کی زندگی کے تمام گوشوں کو قلم بند کرنا

مقصود نہیں ہے مگر اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت نے اپنی زندگی میں سخت سے سخت اور مشکل ترین حالات کا بڑے صبر و ہمت سے سامنا کیا، اور ہمیشہ اللہ کے حکم پر صابر وشاکر رہے، اور اپنی پوری زندگی للہ فی اللہ وقف کر دی، آپ اپنے علمی سفر کو اپنی بے مثال جد وجہد سے اتنا آگے لے گئے کہ دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم جگہ پر اپنا علمی رعب قائم فرمالیا، اور اجلہ اساتذہ میں بھی آپ کو ممتاز ومنفرد مقام حاصل ہوگیا، یہ سچ بات ہے کہ اتنا بلند رتبہ اللہ تعالی اپنے خاص بندوں ہی کو عطا فرماتا ہے، اور لوگوں کی نظر میں ایسی محبت ومقبولیت محض اس کے فضل سے ہی نصیب ہوتی ہے اللہ تعالی قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: **ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن ودا** (مریم، ۹۹) کہ جولوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے رحمن ان کے لئے محبت پیدا فرما دیتا ہے۔

مولانا عدیم المثال صلاحیتوں اور خصوصیات کے مالک تھے مختلف علوم وفنون پر یکساں دسترس کے ساتھ ساتھ زبان قلم پر پوری طرح قادر تھے، آپ کا تدریسی اسلوب ایسا منظر دلنشیں ہوتا تھا کہ جو بات بیان فرماتے وہ ذہن ودماغ میں اینسی نقش ہوجاتی کہ مٹائے نہ مٹتی، میں استاد محترم کا ادنی شاگرد ہونے کی حیثیت سے اس بات کا شاہد اور گواہ ہوں، اور صرف میرا ہی نہیں بلکہ سبق پڑھنے اور سنے والے ہر طالب علم کا میں تبصرہ ہے کہ مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے درس میں غیر معمولی جاذبیت اور کشش ہوتی تھی، بات سمجھانے کا انداز بالکل اچھوتا اور نرالا تھا، دوسرے اسباق میں غفلت برتنے اور پابندی نہ کرنے والے طلبہ بھی آپ کے دروس میں انتہائی شوق وتڑپ کے ساتھ اور اس کو اللہ کی بڑی نعمت سمجھتے ہوئے حاضر ہوتے، تمام طلبہ کی توجہ ویکسوئی کی کیفیت شروع سے آخر تک یکساں رہتی تھی، اور دل کے دریچوں سے یہ آواز آتی تھی کہ یہ محقق وتبحر عالم، علوم قاسمیہ کا حقیقی وارث اور دارالعلوم کی مسند تدریں کا صحیح حقدار اور ولی اللہی فکر کا عظیم ترجمان ہے، انداز تدریس اس درجہ عام فہم ہوتا تھا کہ غبی طلبہ بھی بات کو پوری طرح سمجھ کر مطمئن ہوجاتے تھے، بندۂ ناچیز کو بھی حضرت کے دروس میں حاضر ہونے اور آپ سے سنن ترمذی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، جس کو میں اپنے لئے انعام الہی تصور کرتا ہوں، استاد محترم کتاب

کے آغاز میں کئی دن تک متعلقہ فن کے تعارف، اصول ومبادیات اور تاریخ پر مفصل گفتگو فرماتے اور بڑے عمدہ انداز سے اس کے اصولی مباحث کو طلبہ کے سامنے بیان فرماتے، دوران درس مختلف فیہ مسائل پر سیر حاصل بحث کرتے، آراء واقوال کو شرح وبسط کے ساتھ بیان فرماتے علمی ادراکات، تحقیقات اور تفردات کے علاوہ تسلسل بیان اور حسن ترتیب کے عجیب وغریب ملکہ کی وجہ سے مفتی صاحب کے درس کو امتیازی شان حاصل تھی، مولانا طلبہ کی استعداد کو بالغ نظری سے جانچتے اور پرکھتے اور خامیوں پر خفگی کا اظہار فرماتے کبھی کبھی تو اتنا خفا ہوجاتے تھے کہ بغیر سبق پڑھائے واپس ہوجاتے، حضرت کے درس میں عبارت خوانی ایک بڑا مسئلہ تھا، جس پر بڑی توجہ فرماتے اور سخت ہدایات صادر کرتے، اس کے باوجود بھی جب طلبہ کی عبارت خوانی سے مطمئن نہ ہوتے تو خود ہی عبارت پڑھنے لگتے۔

تدریسی خدمت کے علاوہ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی آپ کسی شہسوار سے کم نہ تھے، اسی معرکۃ الآراء کتابیں آپ کے زور قلم سے وجود میں آئیں جو اپنے فن میں کامل اور اہل علم کے لئے قیمتی ثرمایہ ہیں، آپ کی تالیفات میں جن کتابوں کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ان میں یہ کتابیں سرفہرست ہیں (۱) رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ (۲) تفسیر ہدایت القرآن (۳) تہذیب مغنی (۳) تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری (۵) تحفۃ الالمعی شرح سنن ترندی (۷) تحفۃ الدرر (۸) فقہ حنفی اقرب الی النصوص (۸) اسلام تغیر پزیر دنیا میں۔

آپ نے اپنی پوری زندگی رضائے الہی کی چاہت اور اسلام کی نشرواشاعت میں گزاری، اور آپ کی وفات بھی ایسے مبارک مہینہ میں ہوئی، جو ہر اعتبار سے بابرکت ہے خصوصا اس ماہ مبارک کے آخری عشرہ اور طاق راتوں کی فضیلت اظہر من الشّمس ہے، حق تعالی ان کے فیوض وبرکات عام فرمائے، اور دینی مساعی کو قبول سے فرمائے، جنت الفردوس میں آپ کو اعلی مقام عطاء کرے، اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

رحلت پہ تری غلغلۂ آہ وفغاں ہے

مولانا مفتی محمد اسجد قاسمی ہریدواری
سابق معین مدرس دار العلوم دیوبند

۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کو ادھر افق مشرق سے صبح کے اجالے ابھر رہے تھے ادھر عروس البلاد میں ایک مہر تاباں اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ غروب ہو رہا تھا۔ دنیا بھر میں حضرت کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں محبین ومعتقدین اور علماء وطلبہ پر غموں کا کوہ گراں ٹوٹ رہا تھا۔عرب وعجم کی آنکھوں سے اشکہائے فراق مترشح ہو رہے تھے جو ابھی تک جاری ہیں ۔ ہندوستان کے ساحلی شہر ممبئی سے ایسی غمناک، کربناک، دردناک، المناک اور افسوسناک خبر پھیلی جس نے دنیا کے آخری سرے تک پھیلے ہوئے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے اہل تعلق واہل محبت کی آنکھوں کو نمناک کر دیا۔ چمنستان علم وفن دار العلوم دیوبند کی مسند درس پر اڑتالیس سال تک نغمہ سرائی کر کے یہ بلبل خوش نوا کچھ اس ادا سے خاموش ہوئی کہ اس کو دیکھنے ، سننے اور جاننے والا ہر شخص آبدیدہ ہے۔اہل علم کے طبقے میں ادنی طالب علم سے لیکر دنیا کے چوٹی کے علماء وصلحاء تک حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر مغموم ومحزون ہیں، جن کے نثراونظما تعزیتی پیغامات کثیر تعداد میں سامنے آرہے ہیں۔

موت تو خیر ایک اٹل اور نا قابل انکار حقیقت ہے، لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس عجیب انداز سے ہمیں چھوڑ کر چلے جانا حد سے زیادہ حزن وملال کا باعث بن گیا۔ یہ صرف ایک شخص کا موت کی آغوش میں چلے جانا نہیں تھا، بلکہ اپنی علمی کرنوں سے دنیا بھر میں روشنی بکھیرنے والے ایک نیر تاباں کا روپوش ہونا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے رخصت ہو جانے سے عالم اسلام ایک قیمتی سرمایہ اور گوہر گراں مایہ سے محروم ہو

گیا۔اناللہ و انا الیہ راجعون،ان للہ ماا خذ و ان لہ ما اعطی و کل شیء عندہ باجل مسمی ،اللہ پاک ہمارے مشفق ومکرم اور پیارے استاذ محترم کی مغفرت فرما کر اپنا خاص قرب عطا فرمائے ،آمین۔

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اظہار درد وغم اور آپ کی یادوں کے نقوش کو محفوظ کرنے کے لئے آپ کے خوان علمی سے ریزہ چینی کرنے والے دیگر بہت سے تلامذہ کی طرح احقر نے بھی کیف ما اتفق کچھ باتیں اور یادیں سپر د قرطاس کردی تھیں ،جن کا بنیادی مقصد ماضی کی حسین یادوں کو حیطۂ تحریر میں لاکر محفوظ کرنا تھا۔

لیکن ابھی چندروز قبل جناب مولانا انس احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم کا پیغام موصول ہوا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوخراج عقیدت پیش کرنے کے لئے تذکرۂ سعید (خصوصی شمارہ) کو کتابی شکل دینے کا ارادہ ہے، مجھے بھی اس میں کچھ لکھنے کا حکم ملا، میں نے سوچا کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر بالتفصیل تو بہت سے شہسواران قلم روشنی ڈال ہی دینگے ،میری بساط تو روشنی ڈالنے کی ہرگز نہیں ، البتہ یہ چند سطور رقم کرکے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے چھوڑے ہوئے انمٹ ولازوال نقوش اور قابل تقلید کردار سے روشنی حاصل کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔

وہ پہلی نظر پہلی ملاقات کا عالم

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی اسم گرامی سے تو میں بچپن ہی میں آشنا ہو گیا تھا، والد صاحب زید مجدہم حضرت مولانا حسین احمد صاحب ہریدواری چوں کہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ ہیں،اس لیے وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی بہانے سے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر ہوتا ہی رہتا تھا۔

خوبئ تقدیر سے اللہ تعالیٰ نے اس ناچیز کو ۱۹۹۹ء میں پہلی مرتبہ دارالعلوم دیوبند حاضری کا شرف بخشا،اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی اور میں سیقول کا پارہ پڑھتا تھا،اس وقت رشید مسجد، رواق خالد اور آسامی منزل زیر تعمیر اور اعظمی منزل کی تیسری بلڈنگ تکمیل کے مرحلے میں تھی۔ جدید لائبریری اور دارالقران کی جگہ خالی میدان

تھے، جہاں عصر کے بعد طلبہ کھیلا کرتے تھے۔اسی کمسنی میں ایک دن والد صاحب زید مجدہم فرمانے لگے کہ آج بعد عصر حضرت مفتی سعید صاحب سے ملاقات کے لیے چلیں گے، چنانچہ عصر کے بعد حضرت والد صاحب، حضرت مولانا محمد علی صاحب اور احقر حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے در دولت کی طرف چل دیئے۔ یہ دونوں حضرات آگے آگے بات کرتے ہوئے جاتے اور میں انکے پیچھے پیچھے بچوں کی طرح دوڑتا ہوا چلتا، یہ وہ زمانہ تھا جب مفتی صاحب پرانے مکان کی بالائی منزل میں فروکش تھے۔حضرت کے گھر سے چند قدم پہلے والد صاحب نے میرا حلیہ درست کیا، بال اور ٹوپی ٹھیک کی، گریبان اور بٹن وغیرہ درست کر کے کچھ سلیقہ مندسا بنا دیا۔اوپر کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت اپنی مطالعہ گاہ پر نصف دراز ہیں، ایک طالب علم سر کی مالش کر رہا ہے ہے، دوسرا پیر دبا رہا ہے اور حضرت ہاتھ میں کتاب لیے دقت نظر کے ساتھ کتاب بینی میں مشغول ہیں۔

والد صاحب زید مجدہم سے علیک سلیک کے بعد معلوم کیا کہ یہ بچہ کون ہے؟

والد صاحب:

میرا بڑا بیٹا ہے۔

مفتی صاحب:

اتنی کم عمری میں اس کو ماں سے جدا کر دیا؟

والد صاحب:

بہت زیادہ کم عمر بھی نہیں ہے۔

مفتی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ کھڑے ہو کے دکھاؤ،

میں نے کھڑے ہو کر دکھایا،

حضرت مفتی صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا:

ہاں بہت زیادہ چھوٹا تو نہیں ہے۔

آٹھ سال کا ناظرہ پڑھنے والا بچہ اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت، کتابوں کے درمیان محبوس اور مطالعہ میں مصروف شخصیت کو مافوق الفطرت نہ سمجھتا تو اور کیا سمجھتا؟

خوش منظر و دلآویز شخصیت

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر و باطن بالکل سنت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ انوارات سے منور حسین وجمیل چہرہ، سر پر خوبصورت سفید عمامہ، اس پر مزید عربی انداز میں سفید و چمکدار رومال، چال ڈھال، رفتار و گفتار اور نشست و برخاست میں غایت درجہ سنجیدگی ومتانت کا پاس رہتا تھا۔ آپ کا سراپا ایسا دلکش اور سجیلا تھا کہ ایک مرتبہ نظر پڑ جائے تو دیر تک سیری نہیں ہوتی تھی، آپ اپنے انداز و ادا اور عادات و اخلاق سے اسلاف کی نہ صرف حقیقی یادگار تھے بلکہ انکے علوم کے امین و پاسبان بھی تھے۔ آپ کی شخصیت جوش و ہوش کا حسین آمیزہ تھی۔ آپ کی ذات والا صفات میں حق جل مجدہ نے بہت سے ایسے ہیرے جواہرات ودیعت کیے تھے جو طلبہ وعلماء کے لئے انتہائی کشش کا باعث اور محبت کا سامان تھے۔ جن کی وجہ سے آپ کو عالم گیر شہرت اور مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی۔

لاثانی درس بخاری

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا درس بخاری بلکہ اس سے پہلے درس ترمذی بھی بڑی آب وتاب اور شان و شوکت کے ساتھ ہوتا تھا۔ ابتدائی ایام میں یومیہ تین اسمائے حسنیٰ یاد کرانے کا اہتمام فرماتے، آپ ہی کی برکت سے ہم گناہ گاروں کو بھی یہ مبارک اسمائے خداوندی یاد کرنے کی سعادت نصیب ہوگئی۔

آپ کا درس بخاری سطحیت سے پاک اور جلد بازی و رواروی سے منزہ ہوتا تھا۔ انتہائی سکون کے ساتھ گفتگو کا آغاز ہوتا اور اسی سکون واطمینان کے ساتھ بات مکمل ہوتی تھی۔ دوران درس اگر کوئی خاص موضوع زیر بحث

آجاتا تو اس پر ما لہ و ما علیہ کے ساتھ کلام کر کے ہی دم لیتے تھے۔

آپ کے درس میں وعظ و نصیحت، تزکیہ اور اصلاح وارشاد کے پہلو ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ سبق کا اتنا آسان حل پیش فرماتے کہ کوئی بھی عقدہ حل ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ آپ مشکل سے مشکل مسائل اور پیچیدہ ترین مباحث کو اپنی عمدہ تفہیم وتوضیح سے نہایت آسان بنانے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ درس کی تقریر نپی تلی دریا بکوزہ کا صحیح مصداق ہوتی تھی۔ نہ اتنی مفصل کہ پورے گھنٹے میں چند ہی لائن سبق ہو پائے، نہ اتنی مختصر کہ صفحات کے صفحات گزرتے چلے جائیں اور کوئی کلام ہی نہ ہو۔ آپ کا لب ولہجہ البیلا تو تھا ہی ساتھ ساتھ نرالا اور منفرد بھی تھا۔ ہم نے ایسا پرسکون اور ٹھہراؤ والا انداز اور طرز کلام آج تک نہ دیکھا نہ سنا۔ آپ خود فرماتے تھے کہ مجھے جلدی جلدی اور تیز بولنے کی عادت تھی، مہینوں محنت وکوشش اور مشق وتمرین کے بعد میں نے اس طرح آہستہ آہستہ بولنا سیکھا ہے۔

تنگ آجائے گی اپنے چلن سے دنیا
تجھ سے سیکھے گا زمانہ ترے انداز کبھی

الحمدللہ میں تو پورے سال حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں حاضر رہا۔ لیکن طلبہ کی خاصی تعداد ایسی ہوتی تھی جو صرف حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں حاضر ہوتے تھے اور دیگر گھنٹوں میں یا تو آرام کرتے یا افتاء میں داخلے کے لئے امتحان کی تیاری میں مصروف رہتے اور وہ طلبہ یہ خیال ظاہر کرتے تھے کہ اس ایک گھنٹے کے سبق سے دیگر تمام کتب کے امہات مطالب حل ہوجاتے ہیں۔ مستزاد یہ کہ طلبہ کی عدم موجودگی پر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے سخت تنبیہ ہوتی تھی۔ طلبہ کی قلت کو محسوس کر کے ہر سال متعدد مرتبہ آپ درسگاہ سے غصہ ہوکر واپس تشریف لے جاتے۔ اس تنبیہ کا دو تین ماہ تک طلبہ پر اثر رہتا تھا۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ اس کبرسنی کے زمانے میں بھی سال کے اخیر میں جب تیسرا گھنٹہ خالی ہوجاتا تو مسلسل چار گھنٹے سبق پڑھاتے تھے۔

ہمارے دورے کے سال دل کا آپریشن ہونے کی وجہ سے ششماہی امتحان تک بخاری کے صرف انچاس

صفحے ہو پائے تھے۔ کسی مجلس میں حضرت نے بطور ظرافت یہ جملہ بول دیا تھا کہ اگر سالانہ امتحان تک بخاری مکمل نہ ہوئی تو رمضان میں مکمل کراؤنگا۔ یہ جملہ اتنا مشہور ہوا کہ ہرکس و ناکس کی زبان زد ہوگیا۔ حتی کے احقر نے دارالعلوم کے درجہ ناظرہ کے دونہایت کم عمر بچوں کو بھی یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس سال بخاری رمضان میں مکمل ہوگی ۔ لیکن حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا درس وتدریس کا نصف صدی پر محیط تجربہ اور غیر ضروری مشاغل سے یکسوئی کا انداز ایک نعمت ثابت ہوا۔ جمعہ ہو یا جمعرات یا کوئی اور چھٹی کا موقع، حضرت نے کسی بھی موقع کو خالی نہیں جانے دیا اور الحمدللہ رجب کے اخیر میں بخاری شریف اپنے وقت پر ہی مکمل ہوئی۔

دل کا کامیاب آپریشن

ہمارے دورے کے سال ۱۴۳۵ھ میں عید الاضحیٰ کی تعطیل میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کسی مرض کے علاج کے لیے ممبئی تشریف لے گئے، وہاں جاکر اچانک دل کا سخت دورہ پڑا اور انہیں ایام میں ڈاکٹروں کے مشورے سے بائی

پاس سرجری کرانی پڑی، اس لیے آپ بقرہ عید کے بعد قدرے تاخیر سے دیو بند تشریف لا سکے۔

جس دن آپ دیو بند جلوہ فرما ہوئے اس سے اگلے روز فجر سے قبل احقر، مولوی جمیل امریکی اور ترجمان مولوی شاہ جہاں، حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات اور درسگاہ میں تشریف لانے کے متعلق پوچھنے کے لئے گیے، نماز فجر حضرت ہی کی مسجد میں ادا کی اور بعد فجر ملاقات کا شرف حاصل ہوا، آپ نے سبق پڑھانے کی آمادگی ظاہر کی۔

طلبہ میں اعلان کر دیا گیا؛ بلکہ جب آپ چوتھے گھنٹے میں مولوی جمیل امریکی کے ساتھ بذریعۂ کار تشریف لائے تو طلبہ نے مدنی گیٹ سے مسجد رشید تحتانی تک دورویہ قطار بنا کر آپ کا استقبال بھی کیا۔ (اسی کار سے دورے کے اساتذہ کو کار میں لانے کی طرح پڑ گئی۔)

اگرچہ ابھی آپ مکمل صحتیاب نہیں ہوئے تھے،لیکن تدریس کے شوق سے مغلوب ہوکر آپ نے آہستہ آہستہ سبق پڑھانا شروع کردیا۔ابھی چندہی دن گزرنے پائے تھے کہ طبیعت دوبارہ بگڑنی شروع ہوگئی۔اوربہی خواہوں نے آپ کو ممبئی جانے کامشورہ دیدیا۔

دارالعلوم اوردرس وتدریس سے غیبوبت یقینا آپ کے لیے نہایت رنج وغم کا باعث تھی،اس لیے جب ہم طلبہ آپ کی ،عیادت وزیارت کے لئے آپ کے گھر پہنچے تو آپ آنکھوں سے اشکوں کے ترشح کے ساتھ باہر تشریف لائے۔وہ انتہائی غم کا سماں تھا۔

آپ دہلی ایئرپورٹ جانے کے لئے کار میں بیٹھ گئے۔کچھ دیر کار آہستہ آہستہ چلتی رہی،طلبہ بھی کار کے دائیں بائیں اور پیچھے پیچھے چلتے رہے،لیکن جونہی آپ کی گاڑی مسجد کے پاس سے مڑی تو طلبہ پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی،سسکیاں نکلنے لگیں۔دیگر ساتھیوں نے بتایا کہ ہمارے پیچھے آرہے دارالعلوم دیوبند کے استاذ محترم اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص جناب مولانا اشتیاق احمد صاحب بھی بلک بلک کررودیئے؛لیکن اس دن جہاز کی ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے مفتی صاحب واپس تشریف لے آئے اور بعد عصر ہم طلبہ نے دولت کدے پر حاضر ہوکر جی بھر کے زیارت کی۔اگلے روز آپ ممبئی تشریف لے گئے اور ایک ماہ سے زائد وہیں مقیم رہے۔اس عرصے میں حضرت اقدس جناب مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہ،مہتمم دارالعلوم دیوبند نے تدریس بخاری کے فرائض انجام دیئے۔

جہدمسلسل کاپیکرمحسوس

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا یہ ایسا نمایاں وصف تھا جو ہم طالبان علوم نبوت کے لئے سبق آموز اور قابل تقلید ہے،آپ کسی موجودہ پونجی پر قناعت کے عادی نہیں تھے۔آپ کی ایک ایک ادا سے تعلیم وتعلم اور افادہ واستفادہ کی پیاس نمایاں ہوتی تھی،کبھی کسی منزل یا کسی ایک کتاب کی اشاعت پر ہی بس نہ کرتے،کبھی کسی

بڑے یا چھوٹے نے انہیں وقت ضائع کرتا ہوا نہیں پایا۔آپ کے دل میں ہر آن کوئی نہ کوئی تصنیفی کام کرنے کی آگ لگی رہتی تھی، مطالعہ وکتب بینی تو اکابر کی طرح آپ کی زندگی کا جز ولاینفک بن چکا تھا۔

آپ نے زمانۂ طالب علمی میں بعض پیش آمدہ واقعات کے بعد جس آب وتاب کے ساتھ محنت وجد وجہد کا آغاز فرمایا تھا، دم اخیر تک اس میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ زندگی کے دشوار گزار مراحل کو عزم وہمت سے طے کیا اور تحصیل علم میں آنے والی ہر پریشانی کا سد سکندری بن کر مقابلہ کیا۔آپ نے سدا علمی ذوق وشوق سے سرشار ہوکر علمی عظمتوں کو سر کیا۔اس سلسلے میں آپ کا عظیم کردار حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ ولولہ انگیز بھی ہے۔

بالآخر آپ نے تدریسی وتصنیفی میدانوں میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے اور علمی دنیا پر اپنے گہرے نشانات ثبت کئے۔اسی جہد مسلسل اور سعی پیہم کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر علمی حقائق ودقائق کے نئے نئے افق کھولے اور آپ کے قلم گہر بار سے حجۃ اللہ البالغہ جیسی دشوار اور کٹھن کتاب کی مبسوط شرح رحمۃ اللہ الواسعہ وجود میں آئی۔

صحیح بخاری وجامع ترمذی جیسی عظیم کتابوں کی شہرۂ آفاق شروحات تحفۃ القاری اور تحفۃ الالمعی منصۂ شہود پر آئی۔اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی اس شرح کے بارے میں آپ خود فرماتے تھے کہ علمائے دیو بند میں بخاری کی مکمل شرح صرف میں نے لکھی ہے۔ان مذکورہ بالا تین کتابوں کے علاوہ آپ کے کے قلم فیض رقم سے علم حدیث اور دیگر علوم آلیہ وعالیہ میں پچاسوں گراں قدر تصنیفی شاہکار دنیا کے اہل علم حضرات سے سند قبولیت حاصل کر چکے ہیں اور وسیع پیمانے پر مقبول ومتداول ہیں۔علمی شغف ہی کی وجہ سے اوقات مختلف تدریسی وتصنیفی کاموں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ درمیان سال میں اسفار کی گنجائش نہیں ہوتی تھی، البتہ سالانہ تعطیلات میں امت مسلمہ کو دعوتی، اصلاحی اور فقہی رہنمائی فراہم کرنے کے لئے دنیا کے مختلف دور دراز ممالک کا سفر کرتے اور تشنہ کاموں کو سیرابی عطا فرماتے تھے۔آپ کی مجلس بھی علمی نوعیت کے سوال وجواب سے مہکی ہوتی تھی، کبھی آپ از خود کوئی قیمتی

علمی نکتہ بیان کردیا کرتے تھے۔

ایک روز معین مدرسی کے زمانے میں احقر بعد عصر حاضر خدمت ہوا، آپ نے اپنی بائیں جانب بلایا اور کہا کہ قلم کھولو، میں حیران ہوا کہ آج کس امتحان کی تیاری ہے؟ بہرکیف میں نے قلم کھولا اور حضرت نے اپنی میز پر رکھے ہوئے کاغذات میرے ہاتھ میں تھما کر فرمایا۔۔۔لکھو:۔۔یا ایھا المزمل۔۔۔اے چادر میں لپٹنے والے الخ۔ یہ تفسیر ہدایت القرآن کے تصنیفی سلسلے کی کڑی تھی۔

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ غیر معمولی رفتار سے سورۂ مزمل کی آیات، ترجمہ اور تشریحی کلمات کا املاء کراتے جاتے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا علمی استحضار دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سامنے نہ قرآن نہ کوئی کتاب، آپ کی نظر دیوار پر جمی ہوئی تھی اور اس تیزی کے ساتھ املا کرا رہے تھے کہ اس جوانی کے عالم میں بھی احقر کا قلم حضرت کی زبان کی بمشکل ہمنوائی کر پارہا تھا۔ وہاں موجود طلبہ بھی خاموش محو حیرت بیٹھے رہے اور میں متحیر بھی تھا اور خائف بھی، کہ کہیں کسی لفظ کا دوبارہ معلوم کرنا حضرت کے لئے باعث تکدر نہ ہو جائے۔ اس پوری سورت میں صرف ایک دو جگہ ایسی آئی جہاں حضرت نے کسی جملے کے کاٹنے کا حکم دیا ہو۔ ورنہ مکمل سورت اسی طرح بے تکلف املا کرادی۔

ولایت پادشاہی علم اشیاء کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہے فقط ایک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

(وجل ثناءک) پر حسین توافق

معین مدرسی کے زمانے میں چند مہینوں تک احقر فرائض ونوافل کے ثناء میں بھی جل ثناءک کا اضافہ کرتا رہا۔ پھر ہدایہ میں دیکھا کہ مصنف نے نماز جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں اس جملے کے اضافے سے منع کیا ہے۔ میں نے اسی دن سے اس جملے کا اضافہ بند کر دیا، کچھ روز بعد حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ بعد عصر مجلس میں فرمانے لگے کہ میں عام نمازوں میں جل ثناءک کا اضافہ کرتا تھا، کیوں کہ یہ جملہ لفظ اور معنیٰ دونوں اعتبار سے اچھا لگتا

ہے۔لیکن آج ایک کتاب میں دیکھا کہ مصنف منع کرتے ہیں،تو انہوں نے آخر یہ کس دلیل سے منع کیا؟ آیا کوئی حدیث یا اثر ان کے سامنے ہے؟

ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے موبائل پر بھی اور خارج میں اعلاء السنن اور ابوداؤد وغیرہ میں تلاش کیا،تو نماز جنازہ میں جل ثناءک کا اضافہ تو ملا لیکن اس مجلس میں دیگر نمازوں میں ممانعت کی دلیل نہ مل سکی۔حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ تو چوں کہ علم وعرفان کے عظیم آفتاب تھے،اس لیے فرمایا کہ اس طرح کی باتوں کو میں بغیر دلیل کے تسلیم نہیں کرتا ہوں۔

دارالعلوم کی تین سنہری روایتیں

پہلی روایت

دارالعلوم دیوبند میں انعامی جلسے کا جو معیار ہے وہ شاید و باید ہی کسی دوسرے مدرسے میں ہو۔دارالعلوم سالانہ امتحانات میں کامیاب ہونے والے تمام طلبہ کو حسب مراتب خصوصی اور تشجیعی انعامات سے نوازتا ہے۔اس روح پرور موقع پر تمام طلبہ اور اساتذہ کی موجودگی میں حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا خصوصی پرمغز اور علمی نکات پر مشتمل بیان ہوتا تھا،جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ طلب علم کے زمانے کا مضبوط ترین لائحۂ عمل پیش فرماتے۔نہ صرف طلبہ کے لیے بلکہ اساتذہ کی تدریسی و تصنیفی ترقی کے طور طریقے بھی واضح کرتے تھے۔

دوسری روایت

تعلیمی سال کے آغاز پر تمام طلبہ کو رشید مسجد میں جمع کر کے ان کے مقام و مرتبہ سے روشناس کرایا جاتا ہے ۔اس مبارک موقع پر بھی گزشتہ دہائی میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا خطاب ہوتا رہا اور آپ طلبہ کو درس کی پابندی،پیشگی مطالعہ،تکرار و مذاکرہ، ہفتہ واری آموختہ اور ذاتی محنت و لگن پر خوب ابھارتے اور تعلیمی مزاج

ومذاق کی آبیاری کی کوشش کرتے۔

تیسری روایت

تیسری روایت نہایت اہم اور قابل صد رشک ہے ۔آغاز سال ہی کے موقع پر دفتر اہتمام میں ایک خوبصورت ودلکش تقریب منعقد ہوتی ہے،جس میں بشمول دیگر اساتذہ کے مادر علمی کی مسند حدیث کو رونق بخشنے والی،میدان علم ودانش کی قدآور شخصیات اپنے وجود مسعود سے اس مجلس کے حسن کو دوبالا کردیا کرتی تھیں۔اس موقع پر بھی خطاب کا سہرا آپ ہی کے سر سجایا جاتا تھا،جس میں آپ اپنے طویل ترین علمی تجربات سے کشید کردہ حکمت ودانائی کی زریں باتیں اور نفع بخش اصول ونقوش تمام اساتذہ کے سامنے رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے معین مدرسی کے دوسرے سال کے آغاز پر اس ناچیز کو بھی اس علمی ونورانی محفل میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔جس وقت میں اہتمام پہنچا تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرسی کے سامنے پہلی لائن میں جگہ خالی تھی، میں وہیں بیٹھ گیا اور خوب توجہ سے حضرت کے افادات سے مستفید ہوا۔اس بیان کے ایک اہم اقتباس سے میں آپ کو روشناس کرانا مناسب سمجھتا ہوں،فرمایا :

میں علامہ بلیاوی قدس سرہ کے سر میں تیل لگا رہا تھا،حضرت فرمانے لگے کہ طلبہ تین قسم کے ہوتے ہیں، پلنے والے، پڑنے والے اور پڑھنے والے۔

میں نے حضرت قدس سرہ کی اس تقسیم کے بعد کہا کہ اساتذہ بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔حضرت پوچھنے لگے کہ وہ تین قسمیں کیا کیا ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ بڑے میرے سے زیادہ جانتے ہیں۔

پھر حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دفتر اہتمام ہی میں وہ تین قسمیں بیان فرمائی۔

(۱) ایسے اساتذہ جو بغیر مطالعہ کیے درسگاہ میں چلے جاتے ہیں اور جتنی دیر طلبہ عبارت پڑھتے ہیں اتنی دیر یہ حاشیہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سبق کی زوردار تقریر کرکے چلے آتے ہیں۔

(۲) وہ اساتذہ جورات بھر جتنا مطالعہ کرتے ہیں صبح کو سارا طلبہ کے سامنے قے کر دیتے ہیں۔ کہ فلاں نے یہ کہا، فلاں نے یہ لکھا، فلاں کی رائے یہ ہے۔

(۳) وہ اساتذہ جورات کو مطالعہ کرتے ہیں، پھر اس میں سے حل درس کے متعلق جو باتیں طلبہ کے لیے ضروری ہیں، انہیں ایک کاغذ پر لکھ کر جیب میں رکھ لیتے ہیں اور سبق میں جانے سے پہلے، راستے میں آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے، بار بار اس لکھے ہوئے کو دہراتے رہتے ہیں، پھر درسگاہ میں جا کر ایک ہی انداز و اسلوب میں پیرایۂ بیان بدلے بغیر متعدد مرتبہ طلبہ کو سمجھاتے ہیں۔ اور پورے ہفتے جو اسباق انہوں نے لکھے انہیں ہفتے میں ایک مرتبہ بطور آموختہ پڑھتے ہیں،۔ آپ نے فرمایا: یہ اساتذہ سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔

حضرت الاستاذ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کی پرنور دعا پر مجلس برخاست ہوگئی۔ دفتر اہتمام ہی میں اساتذہ کے ناشتہ کا انتظام تھا، کچھ اساتذہ دسترخوان پر بیٹھ گئے اور کچھ وہیں کھڑے ہو کر آپس میں باتیں کرنے لگے، اسی اثنا میں ایک استاذ میرے پاس آئے کہ آپ کو مفتی سعید صاحب بلا رہے ہیں، میں گھبرایا ہوا حضرت کے پاس گیا کہ خدا جانے آج کیا چیز خلاف ادب سرزد ہوگئی جس پر آج برسر مجلس اکابر اساتذہ کے سامنے ڈانٹ پڑے گی؟

میں نے جا کر سلام کیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کیا اور ہنستے ہوئے فرمایا: تم کون ہو بھائی بہت غور سے تم نے بیان سنا؟ میں نے جواب دیا: محمد اسجد ہریدواری۔ حضرت نے پھر دوبارہ غور سے میرا چہرہ دیکھا اور فرمایا: اچھا وہ ہریدوار والے معین مدرس؟ میں نے کہا: جی حضرت، دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔

یادگار حوصلہ افزا کلمات

جس روز معین مدرسی کا انٹرویو ہوا اور شام کو دفتر تعلیمات سے ہم دو طلبہ کی کامیابی کا اعلان آویزاں کیا گیا، اسی روز احقر بعد عصر متصلاً حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر ہوا، اس وقت کمرے میں حضرت مفتی صاحب، احقر اور آپ کے خادم خاص ہمارے تکمیل افتاء کے ساتھی مولوی محمد فائز سلمہ بھی موجود تھے۔ سلام

کے بعد حضرت نے فرمایا:

تیرا نام اسجد ہے؟

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

فرمایا:

تیرا انتخاب ہو گیا۔

اور ہم نے تمہارے ساتھی کے نام پر نتیجہ لکھا تھا ”اچھا“

اور تیرے نام پر لکھا تھا ”بہت اچھا“

اب محنت کرو اور پڑھاؤ۔

پھر لوگ آتے گئے اور کمرۂ ملاقات بھرتا گیا۔

مغرب سے کچھ پہلے دوسرے ساتھی بھی آ گئے۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے مخاطب ہو کر کچھ اضافہ کر کے یہی کلمات دوبارہ ارشاد فرمایئے۔

آخری دیدار

ماہ رجب کے آغاز میں دار العلوم حاضری ہوئی۔اچانک یاد آیا کہ جمعرات کو بعد مغرب حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب بخاری کا سبق پڑھاتے ہیں،تو کیوں نہ اس البیلے انداز درس سے مستفید ہوا جائے جس کو سنے اور دیکھے ہوئے چھ سال کا عرصہ بیت چکا ہے، میں نے مغرب کی نماز مسجد رشید میں ادا کی اور وہاں سے سیدھا عظیم الشان جدید لائبریری میں واقع دار الحدیث پہنچا۔حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ اسی پہلے کی سی آن بان اور شان کے ساتھ بخاری پڑھا رہے تھے اور دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے بادہ کشوں کے ساغر میں جام ومینا بھر رہے تھے۔اذان عشا سے کچھ دیر پہلے میں دار الحدیث سے واپس ہوا۔وہم وگمان میں بھی دور دور تک یہ بات نہ آئی کہ

فن تدریس کا یہ چمکتا دمکتا آفتاب اور علم حدیث کا درخشندہ ستارہ اب بہت جلد اپنے لاکھوں شیدائیوں کو سوگوار کر کے اس جہان رنگ و بو سے رخت سفر باندھنے والا ہے۔

آخری گفتگو اور وہ خواب جو نتیجۃً سچ ثابت ہوا

ماہ شعبان کے آخر میں احقر نے خواب دیکھا کہ دورۂ حدیث کی تعلیم مسجد رشید کے تہ خانے میں ہو رہی ہے۔ میں اکیلا رشید مسجد سے باہر آرہا ہوں اور حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب تن تنہا، نہایت ضعف کے ساتھ ہاتھ میں عصا لیے مدنی گیٹ کی طرف سے مسجد میں داخل ہو رہے ہیں، درمیان میں میری حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، سلام مصافحہ ہوا (میرا شعبان و رمضان میں عمرے کا ارادہ تھا، جو لاک ڈاؤن اور کرونا وائرس کی وجہ سے منسوخ ہو گیا تھا) حضرت نے فرمایا: تم عمرے کے لیے جا رہے ہو؟ میں نے کہا جی، آپ نے فرمایا: جاؤ اور میں بھی آؤنگا، پھر میں وہیں سے پوری دنیا میں گھوموں گا اور واپس نہیں آؤں گا، میں بیدار ہوا تو بڑی تشویش اور بے چینی محسوس ہوئی، علاج و معالجہ سے اگر چہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت نارمل ہو گئی تھی، لیکن اس خواب کے نہایت واضح ہونے کی وجہ سے مجھے رہ رہ کر تشویش ہوتی رہی۔ تحصیل اطمینان کی خاطر احقر نے رمضان المبارک ہی میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے بذریعۂ فون گفتگو کی۔ بڑی خوش مزاجی کے ساتھ بات ہوئی، اخیر میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میرا آن لائن بیان سنا کرو اور ان الفاظ میں دعا کیا کرو: **اللھم انی اعوذ بک من کورونا ومن کید الکائدین ، الا لعنة اللہ علی الظالمین** گفتگو ختم ہوگئی اور آپ کی خوش گفتاری سے محظوظ ہو کر مجھے سکون مل گیا، چند ہی ایام کے بعد آپ کے صاحبزادۂ محترم کا واٹساپ پر گردش کرتا ہوا میسیج موصول ہوا، جس میں بیماری کی اطلاع اور دعائے صحت کی درخواست کی گئی تھی، اس پیغام کو پڑھتے ہی تشویش عود کر آئی، میں رمضان کے اخیر عشرہ کے اعتکاف میں تھا، بیماری کی اطلاع ملنے پر دعائیں کی گئیں۔

لیکن سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

بالآخر ۲۵؍رمضان المبارک کی صبح یہ خبرالم اثر ملنی شروع ہوگئی کہ حضرت الاستاذ شیخ الحدیث وصدرالمدرسین مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری اس دار فانی سے دار باقی کی طرف کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ قضاوقدر کے فیصلے کب کسی کی تمناؤں سے ٹلے ہیں؟

❁...❁...❁

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مولانا وصی سلیمان صاحب ندوی

مدیر ماہنامہ ارمغان ولی اللہ

گذشتہ کچھ عرصہ میں ملت اسلامیہ کو کئی اہم شخصیات سے محرومی کا داغ سہنا پڑا، اور ان کی جدائی پر آنسو بہائے گئے، ان میں ہر علم وفن، اور دینی خدمت سے وابستہ ہر میدان کے لوگ شامل تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے تسبیح کی کوئی لڑی ٹوٹ گئی ہو، اور اس کے دانے ادھر ادھر بکھرتے چلے جا رہے ہوں، ان میں سے کچھ شخصیات اتنی بڑی تھیں کہ ان پر پوری دنیا میں صف ماتم بچھائی گئی، تعزیتی جلسے ہوئے، تاثرات کا اظہار کیا گیا، مضامین نو کے انبار لگائے گئے، اور پوری ملت نے ان کا خلا محسوس کیا۔ صرف لاک ڈاؤن کے دوران جو لوگ اس دنیا سے رخصت ہوئے ان میں آسمان علم کے جیسے کچھ آفتاب و ماہتاب شامل تھے، اس کا اندازہ اس مختصر فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا حفظ الرحمن کاکوسی ممبئی، شیخ الحدیث حضرت مولانا وسیم احمد سنسار پوری گنگوہی، حضرت مولانا عبد الرحیم فلاحی، حضرت شیخ سرفراز صفدر صاحب، مولانا احمد حسین پٹنی احمد آبادی، مبلغ اسلام مولانا ابوالکلام قاسمی، حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود وغیرہ، ان سب کی دینی خدمات اور علمی کارنامے ایسے ہیں جو مدتوں تک یاد رکھے جائیں گے۔

لیکن ۲۵/ رمضان المبارک کی صبح کو حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی شکل میں جس شخصیت نے سفر آخرت اختیار کیا، وہ اپنی جامعیت، بوقلمونی، گوناگوں صفات اور خصوصیات کے باعث فخر دارالعلوم، فخر ہندوستان، فخر علمائے اسلام، فخر مدارس، اور فخر علوم اسلامیہ تھی، وہ بیک وقت

مدرس، مقرر، خطیب، مصنف، شارح، ترجمان، داعی، مبلغ اور مجسم انسانیت تھے۔ درجنوں تصنیفات، سیکڑوں مضامین، ہزاروں تلامذہ اور لاکھوں محبین کی وجہ سے ان کا حادثہ وفات اور زیادہ سوحان روح، اور دردانگیز ہے، وہ اللہ کے دربار سے جو عمر دراز مانگ کے لائے تھے، وہ اسّی برس کے ماہ وسال پر محیط ہے، لیکن اتنی لمبی عمر میں بھی سب کی خواہش یہی تھی یہ عمر کچھ اور دارز ہوتی، اور دنیا ان کے کمالات سے مزید فیض یاب ہوتی۔

ان کی شخصیت اس قدر عظیم اور بافیض تھی کہ اگر کورونا کی عالمی وبا کے سبب قید و بند کی سی حالت نہ ہوتی، تو شاید اس عاشق حدیث کے جنازہ میں اتنی دھوم ہوتی کہ کاندھا دینے کے لئے علاقے کے علاقے ٹوٹ پڑتے، اور عاشقوں کا اتنا ہجوم ہوتا کہ سنبھالنا مشکل ہوجاتا، ان کی تدفین میں دس پندرہ آدمیوں کی مختصر موجودگی کے باوجود، یقین کامل ہے کہ رمضان المبارک کے جود وعطا کے موسم میں اُس دنیا میں بھی ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا ہوگا، جس طرح اِس دنیا میں ہر فرد مغموم اور ہر آنکھ اشک بار ہے۔

مفتی صاحب کی عظمت کا بڑا راز یہ ہے کہ وہ علمائے متقدمین کی طرح، علم وافادہ کے ہر میدان کے شہ سوار تھے، اور ہر علم وفن پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے، فن حدیث میں ان کا عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہمارے سب سے بڑے تعلیمی ادارہ کے شیخ الحدیث تھے، فقہ اسلامی میں ان کی بزرگی کی دلیل یہ ہے کہ وہاں کے دارالافتاء میں وہ مشکل اور اہم ترین فتاویٰ کے جواب لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ منطق، فلسفہ، نحو وصرف اور اصول حدیث واصول تفسیر کے موضوع پر ان کی بہت سی شاہ کار تصنیفات موجود ہیں، جس کی وجہ سے ان کے فیض کا دریا ان کے بعد بھی مدتوں تک جاری رہے گا۔ علوم اسلامیہ کی تدریس کے میدان میں ان کی استادی مسلم تھی، اور ہر دور کے فضلائے دیوبند ان کو یگانہ روزگار، اور ماہر فن استاد تسلیم کرتے ہیں۔ تقریر وخطابت کے میدان میں بھی ان کی عظمت مسلم تھی، اگرچہ علمی مشغولیات کے باعث وہ ہر چھوٹے بڑے جلسہ میں شریک نہیں ہوتے تھے، لیکن ملت کے کسی بھی حساس مسئلہ پر ہونے والی مجلسوں میں وہ اپنی تقریر کا جادو جگاتے تھے، اور تفہیم کی بے پناہ صلاحیت سے اس کا

حق ادا کر دیتے تھے۔ اسی طرح تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی ان کی شرکت محض برائے نام نہ تھی، بلکہ ان کی علمی و کلامی تصنیفات و مقالات کے باعث انھیں فکر نانوتوی کا شارح اور علوم ولی اللہی کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔

وہ مختلف الجہات صلاحیتوں اور مختلف علوم وفنون کی مہارتوں کے حامل تھے، ان کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت کتنی عبقری تھی، تفسیر میں ہدایت القرآن (۸ر جلدیں) اصول تفسیر میں الفوز الکبیر کی تعریب اور اس کی عربی شرح العون الکبیر، اصول حدیث میں نخبہ کی اردو شرح تحفۃ الدرر، مقدمہ مسلم کی اردو شرح فیض المنعم، شروح حدیث میں بخاری کی اردو شرح تحفۃ القاری، ترمذی کی اردو شرح تحفۃ الالمعی، شرح معانی الآثار کی عربی تلخیص زبدۃ الطحاوی، اصول افتا میں شرح عقود رسم المفتی کی شرح '' آپ فتوی کیسے دیں؟'' اسرار شریعت میں حجۃ اللہ البالغۃ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعۃ، منطق میں آسان منطق، تہذیب المنطق کی شرح مفتاح التہذیب، فلسفہ میں مبادی الفلسفہ اور اس کی اردو شرح معین الفلسفہ، اسماء رجال میں المغنی کی عربی شرح تہذیب المغنی، نحو میں آسان نحو اور صرف میں آسان صرف وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔

قریۃ الصالحین پھلت سے، اور ہماری دینی دعوتی تحریک سے، مفتی صاحب کا تعلق بہت مضبوط تھا، اور اس تعلق کو جس طرح ساری زندگی، ہر سرد و گرم موقع پر وہ نباہتے رہے، وہ ایک مثال ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شہرہ آفاق تصنیفی کارنامہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اپنے اعلی اسلوب، بلند علمی مضامین، اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بے مثال کتاب سمجھی جاتی رہی ہے، اور مدارس کی دنیا میں اس کی تدریس ایک بڑا اشرف سمجھا جاتا ہے، موجودہ دور میں اس سے پوری طرح استفادہ کرنے کے لئے مفتی صاحب نے اس کی بہت تفصیلی شرح لکھی، اور اس کتاب کے ماہر فن اساتذہ کی مدتوں سے سینہ بسینہ چلی آ رہی کتنی ہی بحثوں کو محفوظ کر دیا، جو پانچ ضخیم جلدوں میں رحمۃ اللہ الواسعۃ کے نام سے شائع ہوئی، پھر کامل برہان الہی کے نام سے اس کی علمی ابحاث کو الگ سے شائع کر کے اس کا دائرہ مزید پھیلا دیا، اور اس کتاب پر تیسرا قابل قدر کام یہ فرمایا کہ بہت دقیق نظر سے اس کا اصل عربی متن مرتب

کیا، پیراگراف بنائے، حسب ضرورت عربی میں حواشی تحریر کئے، اوراس طرح اس عالمی کتاب کوایک نئی زندگی دینے کا سامان کردیا۔علوم ولی اللہی سے بے پناہ شغف کے باوجود گذشتہ ڈھائی سوسالوں میں یہ کام قرض چلا آرہا تھامفتی صاحب نے اسے ادا کیا، اس کتاب پران کا یہ کام اگرحرف آخرنہیں توکم ازکم اب تک کا سب بہترکام ضرور ہے۔

اس کے علاوہ وہ ہمارے دعوتی مشن کے سب سے بڑے حامی، اور مؤید تھے، اور ہر معرکہ سخت میں ہمارے ساتھ کھڑے رہنے کے لئے تیار رہتے تھے، انھوں نے تحریروں کے ذریعہ بھی اس مشن کی تائید فرمائی، اور دوران درس پورے شرح صدر کے ساتھ برادران وطن میں دعوت کے کام کو، اور ہمارے دعوتی مشن کوتقویت پہنچاتے رہے، اس دورقحط الرجال میں ہماری تحریک کے لئے ان کی شخصیت ایک سایہ دارشجر کی تھی، جس کے گرجانے سے ہم سب نے اپنے سینوں اوردلوں پر بڑی محرومی کا احساس کیا ہے۔

ماہنامہ ارمغان کا حق تھا کہ وہ اپنے اس عظیم محسن کوخراج عقیدت پیش کرے، اوران کی تابناک زندگی کو شائع کرکے اپنے لئے سرخ روئی کا سامان کرے۔ ارمغان کا یہ تازہ شمارہ مفتی صاحب کے ساتھ ہمارے اس جذبہ احسان مندی کا ایک ادنیٰ مظاہرہ ہے۔

❁...❁...❁

حضرت تو چلے گئے

الوادع! حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

مولانا ممشاد علی صاحب قاسمی
بانی جامعہ فلاحِ دارین الاسلامیہ، مظفرنگر

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہ کی وفات پر میرا دل انتہائی رنجیدہ تھا، اسی دوران ایک دن میں نے استاذ محترم حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ پالن پوری کو فون کیا تا کہ حضرت سے بات کر کے دل کو کچھ سکون محسوس ہو چوں کہ کسی بھی پریشانی کے وقت ان سے بات کر کے مجھے خوشی اور اطمینان محسوس ہوتا تھا، حضرت مفتی صاحبؒ حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ سے میرے قلبی تعلق کے بارے میں خوب جانتے تھے چنانچہ سلام کرتے ہی بولے ''حضرت تو چلے گئے''۔ یہ جملہ مفتی صاحب نے اس انداز میں فرمایا گویا اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو رمضان المبارک کے مقدس ایام میں خاص اہتمام کے ساتھ عمر بھر کی نیکیوں کا انعام دینے کے لئے بطور خاص مدعو فرمایا ہے، پھر اس کے بعد جس طرح مفتی صاحب نے تسلی دی اور بہت دیر تک دل جوئی کی باتیں کرتے رہے آج بیس سال کے بعد یاد آیا کہ رمضان کی یہی تاریخیں تھیں جب مفتی صاحب سے بات ہو رہی تھی۔

آج (۲۵/رمضان کی صبح) جب برخوردار مولوی احمد ندوی سلمہ نے حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ کے وصال کی اطلاع دی تو مفتی صاحبؒ کا وہی جملہ ایک دم کانوں میں گونج اٹھا اور زبان سے نکلا ''حضرت تو چلے گئے''۔ الوداع استاذ محترم الوداع۔۔۔۔۔ آپ کو ماہ مبارک میں یہ جنت کا سفر مبارک ہزاروں لاکھوں محبین اور

شاگردوں کے سلام اور بے شمار دعاؤں کے ساتھ الوداع، وہ دعائیں جن کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کا سلام جو ایک ایک کر کے نہ جانے کب تک آپ کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے رہیں گے، رب کریم کے حضور آپ کے رفع درجات کی دعا کرتے رہیں گے۔ دارالعلوم کی مسند تدریس کا سلام، نصف صدی تک جس کے وقار کی آپ نے حفاظت کی اور اس میں یادگار اضافہ کیا۔ یہ مسند برابر آپ کی واپسی کی منتظر تھی اور اب آپ کے چلے جانے سے بہت اداس ہوگی۔

دستار علم وفضل کے امین الوداع !

اکابر کے جانشین الوداع !

استاذ محترم الوداع !

افسوس اس وقت قلم رک رک کر چل رہا ہے، آنسو تیزی سے بہہ رہے ہیں اس لئے وہ سب تو شاید فی الحال نہ لکھ سکوں جو لکھنا چاہتا ہوں البتہ قلم برداشتہ کچھ باتیں اپنے محسن کی یاد میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے اور حضرت کے منتسبین کی خدمت میں تعزیت کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان ادارہ کی تدریسی تاریخ میں مقبولیت کی بلندی کو چھونے والے کامیاب ترین اساتذہ کی ایک مختصر سی فہرست بھی تیار کی جائے تو اس میں شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ پالن پوری کا اسم گرامی شامل کئے بغیر وہ فہرست ادھوری رہے گی۔ انہوں نے تقریباً نصف صدی تک پڑھایا اور بہت عمدہ پڑھایا۔ ان کا بات سمجھانے کا فطری انداز سادہ زبان اور عام فہم اسلوب مشکل علمی گتھی کو بچوں کی دلچسپ کہانی کی طرح دل ودماغ میں اتار دیتا تھا۔

میں نے ان سے مؤطا امام مالک اور تکمیل میں عربی ادب کی ایک کتاب پڑھی، لیکن حضرت سے علمی استفادہ کا سلسلہ تاحیات قائم رہا، ان کی شفقتیں بھی اس ناکارہ پر ہمیشہ رہیں۔ ۲۰۱۲ء میں میری اہلیہ کا انتقال ہوا

تو بخاری شریف کے درس کے بعد خصوصی دعا کا اہتمام فرمایا، ۲۰۱۷ء میں میرے بیٹے مولوی احمد ندوی کی شادی ہوئی تو نکاح پڑھا کر میری اور میرے بچوں کی عزت بڑھائی، ہمیشہ اچھے مشوروں اور دعاؤں سے نوازتے رہے۔

دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث میں درس حدیث کے آخری دن مفتی صاحب کے ساتھ پیش آنے والا زباں بندی کا عارضہ بھی اب ایسا لگتا ہے گویا وہ حضرت مفتی صاحبؒ کیلئے ایک غیبی اشارہ تھا کہ آپ نے بہت پڑھایا اور حقیقت میں تدریس کا حق ادا کر دیا اب یکسو ہو کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جایئے اور تسبیح واستغفار کے ذریعہ اللہ کے حضور اپنے درجات کو بڑھایئے۔

حالاں کہ اس وقفہ کے دوران بھی وہ برابر علمی ودینی رہنمائی اور احادیث کی موزوں تشریح کے ذریعہ امت کی رہبری فرماتے رہے، آخری ایام میں طلوع ثریا والی حدیث کے بارے میں ان کی باقاعدہ وضاحت بہت اہم تھی جس میں بعض اصحاب علم وفہم بھی مغالطہ میں پڑ گئے تھے، لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کی ایسی عام فہم اور صحیح تشریح فرمائی کہ جس سے اہل علم کی بھی تشفی ہوگئی اور نوآموز طالع آزماؤں کی زبان وقلم کو بھی بریک لگ گیا جو اس حدیث کو بیان کر کے دعوے کر رہے تھے کہ ۱۰ مئی ۲۰۲۰ء کو ثریا ستارہ طلوع ہوگا اور کورونا وائرس دنیا سے ختم ہو جائے گا، یہ مفتی سعید احمد صاحب کی علمی شخصیت اور ان کے مدلل طرز بیان کا ہی اثر تھا کہ سب کو مطمئن کر دیا اور امت ایک فتنہ سے محفوظ ہوگئی۔

حضرت مفتی سعید احمد صاحب نور اللہ مرقدہ شمع علم کے ایسے پروانے تھے جو دن رات اسی کی دھن میں رہتے تھے، ان کی راتیں اسی کی طلب میں اور دن اسی کے شغف میں گزرتے تھے، شام وسحر علم کے ہی چرچے اور اسی کے مذاکرے رہتے تھے اور ان کا یہ ذوق جنوں بچپن سے شروع ہو کر زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہا۔

ان کا حافظہ اور علمی استحضار بہت مضبوط اور قابل رشک تھا جو ایک محدث کی امتیازی شان ہوتی ہے۔ یادداشت ایسی کہ جس سے تعارف ہو جاتا اس کی بتائی ہوئی (ذاتی زندگی) کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی یاد رکھتے اور

بعد کی ملاقاتوں میں ازخوداس کا تذکرہ کرتے جس سے مخاطب کوسکون اور تسلی ہوتی تھی۔

سفر میں وہ کتابوں کا تھیلا ساتھ رکھتے تھے،ہم نے دارالعلوم میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ایک بار دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب مظفرنگر سے دیوبند کیلئے بس میں سفر کررہے تھے ہم بھی اسی بس میں سوار تھے، وہ پورے راستہ مطالعہ میں مشغول رہے پھر دیوبند بس سے اترتے وقت وہ کتاب تھیلے میں ڈالی جس میں اور بھی کوئی کتاب کاپی وغیرہ تھیں، وہ تھیلا کاندھے پر لٹکایا اور چل دئے، اس زمانہ میں کپڑے کا تھیلا ہی ان کے ساتھ رہتا تھا جس میں کتابیں اور پڑھنے لکھنے کا سامان ہوتا تھا،بعض حضرات دوسروں پر اپنے علمی رعب اور کثرت مطالعہ کی دھاک بیٹھانے کیلئے مجلس میں کتاب لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں ایک منٹ بھی مطالعہ سے فراغ نہیں، حضرت مفتی صاحب کو ایسے مصنوعی مطالعہ میں کبھی مشغول نہیں دیکھا، وہ سنجیدہ مطالعہ ہمیشہ تنہائی میں ہی کرتے تھے اور جہاں اہل علم یا ان کے شاگرد جمع ہوں وہاں سوال وجواب اور ان کی دلچسپ علمی گفتگو ہی حاضرین کیلئے حاصل مطالعہ بن جاتی تھی، وہ بہت سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرنے کے عادی تھے،کسی کو مشورہ دیتے تو وہ بھی صاف دلی کے ساتھ،لفاظی سے پاک، ہمدردی سے بھرپور، مفید اور قابل عمل ہوتا تھا۔

شاگردوں کو بھی وہ اسی کی ترغیب دیتے تھے کہ علمی سوال جو بھی ذہن میں آئے پوری صفائی اور بے تکلفی سے معلوم کریں، علمی سوالات کرنے والے سے بہت خوش ہوتے تھے اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے، سبق میں سوال کی پرچی دینے کا جو رواج ہے مفتی صاحبؒ اس کے خلاف تھے، مؤطا امام مالکؒ کے درس کے دوران ہمارے ایک ساتھی نے اسی طرح ایک پرچی بھیجی تو فرمایا کہ یہ طریقہ صحیح نہیں، آپ کو جو بھی پوچھنا ہے سب کے سامنے بے جھجک پوچھئے پرچی میں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر میں جواب دینا چاہوں گا دے دوں گا نہ دینا چاہوں گا تو پرچی دبا کے رکھ لوں گا، آپ سب کے سامنے زبانی پوچھیں اس سے سوال کرنے کی جرأت بھی پیدا ہوگی، مفتی صاحب طلباء میں طلب علم کا شوق پیدا کرنے کے لیے اپنی طالب علمی کے واقعات بھی سناتے رہتے تھے۔

ایک بار سبق کے دوران بتایا کہ مظاہر علوم سہارنپور میں امتحان کے دوران میں نے دن رات جاگ کر امتحان کی تیاری کی تقریباً ایک ہفتہ سونے کا وقت نہیں ملا، بس معمولی آرام کر لیتے تھے، پھر امتحان ختم ہونے کے بعد میں کمرے میں سو گیا کیونکہ نیند رکی ہوئی تھی اس لیے تین دن تک سوتا رہا اتفاق سے اس دوران کسی نے اٹھایا بھی نہیں۔

صاحب ترمذی نے قیلولہ کرنے والے کے لئے قائلۃ کا لفظ استعمال فرمایا ہے ایک طالب علم عصر کے بعد گھر آئے اور پوچھنے لگے کہ قائل ہونا چاہئے قائلۃ کیوں کہا؟ مفتی صاحب نے بتایا کہ قائل کے معنی تو بات کہنے والے کے آتے ہیں قیلولہ کرنے والے کیلئے قائلۃ ہی موزوں ہے، پھر فرمایا کہ تمہیں صاحب ترمذی پر اعتراض کرنے کے بجائے ان سے سیکھنا چاہیے کہ انہوں نے زبان کا استعمال کس طرح کیا ہے اور کون سا لفظ کہاں کس طرح برتا ہے ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان کے الفاظ پر اعتراض نہیں بلکہ اس کو مثال بنانا چاہیے کہ صاحب ترمذی نے ایسے کہا ہے، حضرت مفتی صاحب سبق میں بتاتے تھے کہ سبق پڑھانے کے لئے مطالعہ کا میرا طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی کتاب مجھے پڑھانے کے لئے ملتی ہے تو اس کا پوری توجہ سے مطالعہ کر کے اس میں سے سبق میں جو باتیں بتانی ہوتی ہیں وہ سب اہم اور خاص باتیں اور حوالہ جات ایک کاپی میں نوٹ کرتا رہتا ہوں، ہر کتاب کی الگ کاپی بناتا ہوں، پھر اگلے سال جب وہی کتاب پڑھانی ہوتی ہے تو اس کاپی کو دیکھ لیتا ہوں اور مطالعہ میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، اس سے وقت کی بھی بچت ہوتی ہے اور سہولت بھی ہوتی ہے مگر اس سلسلے میں طلباء کا جو تجربہ تھا وہ بہت خوشگوار تھا عربی ادب میں ہمارا ایک ساتھی جو گزشتہ سال سماعت کر رہا تھا اور اب ہمارے ساتھ باقاعدہ داخلہ کے ساتھ پڑھ رہا تھا وہ بتاتا تھا کہ گزشتہ سال یہی باتیں مفتی صاحب نے دوسرے انداز میں سمجھائی تھیں اور اس سال بہت سی نئی باتیں بتا رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ رٹا رٹایا سبق نہیں پڑھاتے تھے بلکہ ہر سال بہتر سے بہتر، نئے اسلوب اور آسان علمی تشریح کے لئے کوشاں رہتے تھے اور کاپی صرف اس لیے بناتے تھے تاکہ سابقہ

مطالعہ ومعلومات ونتائج محفوظ رہیں۔

مفتی صاحب سلام میں ہمیشہ پہل کرتے تھے ہمارے زمانہ طالب علمی میں جب وہ گھر سے دارالعلوم میں تشریف لاتے تو ہم نے ایک دوبار جان بوجھ کرکوشش کی کہ ان سے پہلے سلام کرلیں لیکن کامیاب نہ ہوسکے ان کی یہ خصوصیت سب کومعلوم تھی۔

وہ اپنے طلباء کوایسی باتیں بھی بتاتے تھے جو بظاہر بہت معمولی لگتی تھیں لیکن ان کا عملی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہوتا تھاایک بار بتایا کہ میرا معمول ہے کہ گھرمیں سبزی سالن جوبھی بنتا ہے کھالیتا ہوں کبھی خود بازار سے نہیں لاتا لیکن اگر مجھے اپنی ذاتی ضرورت کی کوئی چیز مثلاہاتھ کا پنکھالینا ہوتا ہےتوخود بازار جا کرلاتا ہوں کسی اور سے نہیں منگاتا۔

اپنے سفر کاایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ میں ٹرین میں سفرکررہاتھا،نماز کاوقت ہواتومصلی بچھا کرنماز پڑھنے لگا ،اس مصلی پرخانہ کعبہ کی تصویر بنی ہوئی تھی، چند ہندوحضرات وہاں بیٹھے تھےان میں سےایک نے کہا کہ مسلمان کس کی پوجا کرتے ہیں،ایک ہندونے خانہ کعبہ کی تصویر کی طرف انگلی اٹھا کرکہا:اس کی..... مجھے یہ بات بہت ناگوارگزری کہ کتنی بڑی غلط فہمی پیدا ہورہی ہے،اس کے بعد میں سفرمیں خانہ کعبہ کی تصویروالامصلی استعمال کرتا ہوں تواس پرکوئی کپڑاڈال لیتا ہوں۔

۱۹۹۸ میں میری کتاب ’’حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: اکابرومشاہیرامت کی نظرمیں‘‘ آئی تو مفتی صاحب نے کتاب پڑھ کرایک آدمی کے ذریعہ پیغام بھیج کر مجھے بلایا میں حاضرہواتوفرمایا میں نے تمہیں مبارکباد دینے کے لیے بلایا ہےآپ نے اتنی اعلی اورعمدہ زبان لکھی ہے، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ دارالعلوم کے کسی فاضل نے اتنی پیاری اورایسی شاندارزبان لکھی، پھرتقریباایک منٹ کی خاموشی کے بعد پوچھا: آپ ندوہ میں پڑھے ہو؟ میں نے کہانہیں میں یہیں دیوبند میں دارالعلوم میں ہی پڑھا ہوں۔ بولے پھرتم نے ندوی زبان کہاں سے

سیکھی؟اس بات پر مجھے ہنسی آ گئی، میں نے کہا کہ حضرت کیا اچھی اردو صرف ندوۃ العلماء کے فضلاء ہی لکھ سکتے ہیں،فرمایا کہ ہاں ندوہ مسلمانوں کی زبان ہوشمند تو ہے ہی، وہاں کی اردو کی ایک الگ پہچان ہے۔اس پر میں نے عرض کیا کہ حضرت اس پر مجھے حضرت مولانا علی میاں صاحب کی ایک بات یاد آ رہی ہے حضرت مولانا فرماتے ہیں:

کہ میں نے عربی زبان جتنی بھی پڑھی ہے وہ سب ندوۃ العلماء میں ہی پڑھی ہے،کسی بھی عرب یونیورسٹی میں ایک لفظ بھی نہیں پڑھا اور مجھے عرب کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں اور شاہی اجتماعات سے خطاب کرنے کا بارہا موقع ملا،لیکن الحمدللہ مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اگر میں عرب ملک کی کسی یونیورسٹی میں پڑھتا تو اس سے بہتر عربی بول سکتا تھا۔

توحضرت میں نے بھی جو کچھ سیکھا وہ دارالعلوم سے ہی سیکھا۔ندوہ میں الحمدللہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی وجہ سے برابر آنا جانا ہے لیکن کبھی دل میں خیال نہیں آیا کہ اگر ندوہ میں پڑھتا تو اس سے بہتر لکھ سکتا تھا۔میں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے یہ کتاب جب مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء کو پیش کی (جو ندوۃ العلماء کے وقار واعتماد کے اہم ستون تھے اور بلاغت وانشاء میں بھی ان کا ایک بڑا مقام تھا) توانہوں نے کتاب کو دیکھنے کے بعد سر پر رکھتے ہوئے فرمایا تھا:

کہ میں یہاں مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اگر پوری ندوی برادری مل کر بھی ایسی کتاب لکھنا چاہتی تو کم از کم اس سے بہتر نہیں لکھ سکتی تھی۔

یہ باتیں سن کر حضرت مفتی صاحب اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ کھل اٹھا، پھر فرمایا کہ ہاں پہلی بار دارالعلوم کے کسی فاضل نے اتنی عمدہ اردو لکھی ہے آپ واقعی دارالعلوم کے تمام فضلاء کی طرف سے مبارکباد کے قابل ہیں،آپ نے دیوبند میں پڑھ کر اتنی شاندار اردو سیکھی، ہمارے اکابر نے تو سادہ زبان ہی

لکھی ہے، یہ مولانا نور عالم امینی صاحب جو عربی لکھتے ہیں یہ بھی دیو بند والی عربی نہیں یہ ندوی عربی ہے، ندوہ میں زبان کا معیار واقعی بلند ہے ہمارے اکابر نے ایسی عربی اور اردو نہیں لکھی آپ حضرات کے لئے یہ اللہ تعالی کا انعام ہے میں نے آپ کو اسی لئے خاص طور پر بلایا تھا کہ آپ کو مبارکباد پیش کروں میں نے کہا حضرت میں اس کو صحیح نہیں مانتا کہ دیو بند میں رہ کر آدمی ندوہ جیسی اردو نہیں سیکھ سکتا طلب ہو تو ضرور سیکھ سکتا ہے۔

اس ملاقات کے تقریبا دو ہفتے بعد میں لکھنؤ گیا تو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کو حضرت مفتی صاحبؒ سے ملاقات اور پوری گفتگو سنائی حضرت بہت خوش ہوئے اور ''ندوہ والی اردو'' کی بات جب میں نے بتائی تو حضرت کو بے ساختہ ہنسی آگئی اور بہت دیر تک اس گفتگو سے محظوظ ہوتے رہے۔

حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ کا دل تو بڑا تھا ہی، یہ بھی ان کا بڑا پن اور وسیع نظری تھی کہ مجھ جیسے شاگرد کی کتابیں اور مضامین بھی پڑھتے تھے اور کئی بار از خود فون کر کے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے حوصلہ افزائی اور مناسب رہنمائی فرماتے تھے، وہ کسی کے اعتراف کمال میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے، اسی طرح بڑے سے بڑے یا قریب سے قریب کسی آدمی کی خامی اور غلطی کے اظہار میں بھی ذرہ برابر رعایت نہیں کرتے تھا، ان کی یہ صاف گوئی ان کے علمی رسوخ کی علامت تھی۔

کوئی کسی مسجد کے لئے امام اور خطیب یا کسی مدرسے کے لئے مدرس بھیجنے کی درخواست کرتا تو پہلے دار العلوم میں اس کے لئے اعلان کراتے تا کہ جو خواہش مند ہوں سب کو معلوم ہو جائے پھر جو چاہتا اس کو بلا کر اس کا امتحان خود لیتے تھے، خطابت کے امیدوار سے تقریر بھی کراتے اور خود سنتے تھے، جب تسلی ہو جاتی تب بھیجتے تھے وضع قطع پر خاص نظر رہتی، ایک دفعہ گجرات کے ایک بڑے مدرسہ میں ختم بخاری شریف کے بعد دستار بندی کی تقریب تھی، میں بھی حاضر تھا، حضرت مفتی صاحبؒ دستار بندی فرما رہے تھے تو ایک طالب علم نے داڑھی تراشی ہوئی تھی، اس کا نمبر آیا تو مفتی صاحب نے اس کی دستار بندی خود نہیں کی، ساتھ والے ایک اور صاحب سے کرادی، پھر بیان میں

بھی اس کا اظہار فرمایا طالب علم کا اگرچہ نام نہیں لیا، لیکن ذمہ دار حضرات کو متوجہ کرنے کے لیے اجمالی تذکرہ ہی کافی تھا۔

ہم سب کی تمنائیں اور دعائیں تھیں کہ حضرت کا سایہ تا دیر قائم رہے اور وہ جلد شفایاب ہو کر علمی و دینی حلقوں کی اسی طرح رہنمائی و سرپرستی فرماتے رہیں لیکن اللہ تعالی جو چاہتا ہے، کرتا ہے وہ قادر مطلق اور بے نیاز ہے۔ ہمیں اس کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اللہ پاک حضرت الاستاذ المحترم کے درجات بلند فرمائے اور اپنی شایان شان اجر سے نواز کر اعلی علیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

❁...❁...❁

عصرِ حاضر کے محدثِ جلیل

حضرت مولانا مفتی صلاح الدین صاحب قاسمی
بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دار العلوم، آمبور

۲۵ ؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بروزِ منگل ایک طرف آفتابِ دنیا طلوع ہوا تو دُوسری طرف علم وعمل اور زُہد وتقویٰ کا آفتاب غروب ہوگیا، یعنی حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ مختصر سی علالت کے بعد اپنے خالق ومالک سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کی شخصیت دورِ حاضر میں اکابر واسلاف کی یادگار، علم وعمل کی سچی تصویر، زہد وتقویٰ سے معمور اور بے مثال وبے نظیر تھی، آپ اکابرِ دیوبند کے سچے جانشین تھے، خالقِ کائنات نے آپ کو بے شمار خوبیوں اور اوصافِ حسنہ سے متصف کیا تھا، آپ اپنے اقران پر فائق تھے، خلافِ سنّت وشریعت اُمور پر آپ کی طبیعت مکدر ہوجاتی، کسی مختلف فیہ مسئلہ میں جب تک مفتیانِ کرام کا جواز کا متفقہ فتویٰ نہ آجاتا آپ اُس کی اباحت وجواز کے قائل نہ ہوتے، اس کی واضح مثال تصویر کشی اور فوٹو گرافی کی ہے کہ دورِ حاضر کے بہت سے علماء اور مفتیانِ کرام فوٹو گرافی اور تصویر کشی کے جواز کے قائل ہوجانے کے باوجود آپ عدمِ جواز پر اخیر تک جمے رہے، تصویر کشی پر سخت ناراض ہوتے اور کُھل کر نکیر فرماتے، ایک مرتبہ غالباً ساؤتھ افریقہ سے ایک بڑے پروفیسر آپ کی خدمت میں ”فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید“ کے موضوع پر آپ کے خیالات معلوم کرنے اور تفصیلی گفتگو کرنے کی غرض سے آئے ہوئے تھے، عصر کے بعد اُس وقت احقر اور کچھ طلبہ موجود تھے، موصوف نے موضوع پر آپ کے خیالات معلوم کرنے سے پہلے کیمرہ آن کرکے آپ کی طرف اس کا رخ کیا، اس پر آپ کا

غصہ قابلِ دید تھا، فرمانے لگے تصویر کشی ناجائز ہے، یہ کیا واہیات ہے، اس طرح اسلامی احکام کی کھلی خلاف ورزی ہوتی ہے، بہت افسوس ہے کہ آج دلوں سے منکرات کی قباحت و شناعت بھی ختم ہو چکی ہے، اس پر اُنہوں نے معذرت کی، پھر آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور ہماری طرف متوجہ ہو کر بات کرنے لگے۔

منکرات پر نکیر آپ کی رگ رگ میں پیوست تھی، تبلیغی جماعت، خانقاہی نظام اور مدارسِ اسلامیہ میں پائی جانے والی منکرات پر کبھی برملا کبھی ذمہ داروں کے سامنے نکیر فرماتے، اسی طرح آداب کی پوری رعایت کرتے ہوئے حضراتِ اکابر کے یہاں قابلِ اعتراض اُمور کی نشاندہی فرماتے، اور خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف بھی کرتے، ایک مرتبہ چند مقامی احباب کی موجودگی میں فرمانے لگے کہ مولانا صلاح الدین صاحب سے ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے کہ نماز میں حالتِ قیام میں دونوں پیروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہئے؟ احقر نے عرض کیا چار یا پانچ انگلیوں کے بقدر، آپ نے برجستہ فرمایا کہ مسئلہ جانتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں، اس لطیف نکیر پر تنبہ ہوا اور احقر نے اپنی اس غلطی کی اصلاح کرلی، آپ ہر امر اور ہر کام میں اصلاح و دُرستگی اور اس کے سنت کے مطابق ہونے کے خواہشمند ہی نہیں بلکہ حریص ہوتے تھے۔

آپ شرعی مسائل میں رُخصت کے بجائے عموماً عزیمت پر عمل کرتے تھے، عزیمت پر عمل کرتے ہوئے ہر تکلیف ومشقت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرلیتے، اخیر زمانے میں آپ کو اُٹھنے بیٹھنے اور زمین پر سجدہ کرنے میں بڑی تکلیف ہوا کرتی تھی، اِس کے باوجود آپ فرض نماز کھڑے ہو کر اور سنت ونفل زمین پر بیٹھ کر ادا فرماتے، لیکن سنت ونفل نماز کے لئے بھی کرسی کا استعمال آپ گوارا نہیں فرماتے، احقر نے وفات سے چند مہینے پہلے دیکھا کہ آپ فرض اور سنت اطمینان کے ساتھ ادا کر کے فوری طور پر کرسی پر تشریف فرما ہوئے، مگر کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا پسند نہیں فرمایا، معمولی عذر و بہانے سے کرسی استعمال کرنے والوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔

آپ صبرو استقامت اور عزم واستقلال کے پہاڑ تھے، احقر نے آپ سے براہِ راست سنا کہ جب میرے بڑے بیٹے کا انتقال ہوا اُس وقت میں لندن میں تھا، مجھے فون سے اطلاع دی گئی، اناللہ کے بعد پہلا جملہ میری زبان سے الحمدللہ نکلا، پھر جب میرا بائی پاس ہارٹ سرجری ہوا اور دو تین دن کے بعد مجھے ہوش آیا تو ڈاکٹر نے مزاج پوچھا تو میری زبان سے اس وقت بھی پہلا جملہ الحمدللہ ہی نکلا۔ اللہ اکبر! تسلیم ورضا کی کتنی پیاری مثال آپ نے پیش کی۔

آپ کی خُصوصیات اظہر من الشّمس ہیں اور حضراتِ علماءِ کرام اور آپ کے تلامذہ واحباب ان کو پوری شرح وبسط کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور انشاء اللہ لکھتے رہیں گے، اس لئے یہاں اُن کو سپر دِ قرطاس کئے بغیر اُن ہی باتوں کو لکھا جارہا ہے جو ہماری معلومات میں آئی ہیں۔

آپ کی علمی بصیرت خداداد تھی، مسلسل محنت ومجاہدہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تفقہ فی الدین کی دولت سے نوازا تھا، مشکل ترین مباحث کی نہایت دلنشین اور جامع تشریح اور سوالات کے تشفی بخش جوابات دینے میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا، اسی طرح آپ اپنی خداداد ذہانت وفطانت سے اس قدر مرتب اور ہمہ گیر کلام فرماتے کہ خواص کے ساتھ عوام بھی مستفید ہوتے۔

پندرہ سال پہلے ۲۰۰۵ء میں ہمارے شہر آمبور میں جناب ہیچ، بی، حسن احمد صاحب کی سعئ مشکور سے دوروزہ ائمہ اربعہ کانفرنس منعقد ہوئی، حضرت الاستاذ پالنپوریؒ اور حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی زید مجدہم بطورِ خاص مدعور ہے، عالی جناب ناٹامکار فاروق احمد صاحبؒ کے گھر پر قیام رہا اور فاروق احمد صاحبؒ نے اس پروگرام میں اپنے مال اور عمل سے بہت تعاون فرمایا اور حضرت پالنپوریؒ کے خطابات سے متأثر ہوکر آپ ہی کے ہوکر رہ گئے، اس کے بعد سے آپ فاروق صاحبؒ کی دعوت پر ہر سال آمبور تشریف لاتے رہے، اسی مناسبت سے آپ کی احقر پر نظرِ عنایت ہونے لگی اور یہاں ہونے والی خدمات سے بھی آپ بہت خوش

تھے۔

مذکورہ کانفرنس میں مرکزی شخصیت آپ ہی کی تھی، آپ کی تین چار نشستوں میں طویل اور جامع تقریریں ہوئیں، موضوعات میں سے ایک موضوع تھا "فقہِ حنفی کے امتیازات" آپ نے اِس موضوع پر اتنا جامع اور شاندار خطاب فرمایا جو آپ ہی کا حصّہ تھا، اور خالص علمی مسئلے کو اتنے عام فہم انداز میں سمجھایا کہ عوام بھی عش عش کرنے لگے، فرمایا کہ فقہِ حنفی کے چار امتیازات ہیں (۱) گہرائی (۲) گیرائی (۳) احتیاط (۴) انصاف۔ پھر ہر امتیاز کی واضح مثالوں سے تشریح فرمائی (الحمدللہ آپ کی یہ تقریر چھپی ہوئی ہے)۔

اسی کانفرنس میں ایک نشست سوالات وجوابات کی رکھی گئی، سوالات تو بہت سے آئے، مگر دو ہی سوالات کے جوابات میں پوری نشست ختم ہوگئی، ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ ایک صاحب (جو دینی کتب کا مطالعہ کرکے ازخود مجتہد بن گئے ہیں اور لوگوں کے سوالات کا بزعمِ خود قرآن وحدیث کے حوالے سے جواب بھی دیتے ہیں، اس طرح وہ تقلید سے آزاد کرکے غیر مقلدیت کی طرف لوگوں کا رُخ موڑتے ہیں تو اُن) کا یہ دعویٰ ہے کہ میں سو فیصد حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی ہوں، تو کیا اُن صاحب کا یہ دعویٰ صحیح ہے؟ حضرت نے سوال پڑھا کہ ایک صاحب کا دعویٰ ہے کہ میں سو فیصد حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی ہوں، حضرت نے برجستہ فرمایا کہ ہاں بھائی! اِن سب کے ساتھ وہ بھینس کا انڈا بھی ہیں، پوری محفل ہنس پڑی۔

غور کرنے سے اب بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح بھینس کا انڈا ہونا بالکل محال اور ناممکن ہے، اسی طرح سو فیصد حنفی شافعی وغیرہ ہونا بھی محال اور ناممکن ہے، آگے حضرتؒ نے فرمایا کہ اس طرح کہنا اور عقیدہ رکھنا زندیقیت (بے دین ہونے کا ذریعہ) ہے۔

دوسرا سوال مسئلہ حرمتِ مصاہرت (عمرانہ اور اس کے شوہر کے درمیان ازدواجی رشتہ کے حرام ہونے) سے متعلق تھا، داماد اور ساس اسی طرح بہو اور خسر کے مابین ادنیٰ تعلق سے میاں بیوی ایک دوسرے پر کیوں حرام

ہوجاتے ہیں، اس مسئلہ پر اتنی مدلل اور عام فہم تقریر فرمائی کہ معمولی سمجھ رکھنے والا شخص بھی الحمدللہ مطمئن ہوگیا۔

ماہنامہ "الخیر" کی اشاعت کا جب آپ کو علم ہوا تو بہت خوش ہوئے، اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوئی ماہنامہ الخیر کے تعلق سے دریافت فرمایا، ایک سال پہلے ماہنامہ الخیر کا خصوصی شمارہ "منتخب خطبات" احقر نے جب آپ کی خدمت میں پیش کیا تو ایک طائرانہ نظر ڈالی اور خوش ہوئے، اور غائبانہ حُسنِ انتخاب کی ستائش فرمائی۔ تقبل اللہ منا

منتخب خطبات کے سرِ ورق پر ایک نعتِ پاک چھپی ہوئی تھی، پہلے شعر کے دوسرے مصرع پر آپ کی نظر پڑی، مصرع تھا "مزہ جینے کا جب ہے اپنا مسکن ہو مدینے میں" آپ فرمانے لگے دیکھو یہ کہہ رہے ہیں کہ مدینے میں مسکن اور گھر ملے گا تو مدینہ المنورہ میں رہیں گے اور وہاں رہنے اور جینے کا مزہ اور لطف آئے گا ورنہ نہیں۔

ادھر حضرت نانوتویؒ کیا فرماتے ہیں کہ

اُمیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی اُمید
یہ ہے کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا شمار

یعنی مسکن اور گھر ملے نہ ملے سگانِ مدینہ میں شمار ہو کر جینے کا مزہ اور لطف حاصل کریں گے، احقر نے عرض کیا حضرت اپنے اپنے ظرف کی بات ہے، آپ نے فرمایا ہاں! حضرت اقدس نانوتویؒ کا ظرف کتنا پاکیزہ، منور اور عشقِ نبوی سے سرشار تھا۔

اِس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذ پالنپوریؒ کے دل میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کس قدر محبت، عقیدت اور عظمت تھی، نیز حضرتِ نانوتویؒ کے علوم وافکار حتی کہ آپ کے اشعار اور اُن کی معنویت و گہرائی بھی ہمیشہ آپ کے دل ودماغ میں مستحضر رہتی۔

آپ کا آخری سفر ۲۸/ اکتوبر ۲۰۱۹ء کو شہر آمبور کا ہوا، جناب فاروق احمد صاحبؒ کے وصال سے آپ

بہت متاثر تھے، پہلے مدرسۂ مفتاح العلوم میل وشارم میں حضراتِ علماءِ کرام سے آپ کا نہایت عالمانہ خطاب ہوا، وہاں سے فارغ ہوکر آپ آمبور تشریف لائے، عصر کے بعد فاروق احمد صاحبؒ کی قبر کی زیارت کے لئے تشریف لائے، قبرستان دیکھ کر بہت خوش ہوئے، یہاں کے عمومی خطاب میں اور دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث میں درسِ بخاری میں بھی فرمایا کہ شہر آمبور کے قبرستان میں کوئی کتبہ نہیں ہے اور یہی دیوبندیت ہے۔

اسی سفر میں آپ نے احقر سے دریافت فرمایا کہ تمہارے ساتھ جو اساتذہ باہر آگئے وہ کہاں گئے، احقر نے عرض کیا: الحمدللہ اکثر اساتذہ نئے مدرسہ میں احقر کے پاس آچکے ہیں، آپ بہت خوش ہوئے، فرمایا: مجھے مدرسہ دکھاؤ، چنانچہ بعدِ فجر مدرسہ کی زیرِ تعمیر نئی عمارت میں تشریف لائے، کچھ دیر معائنہ کے بعد مدرسہ اور احقر کے حق میں دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، نیز مدرسہ قائم ہوکر ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا آپ نے اپنے ایک ہونہار شاگرد کو از خود دارالعلوم آمبور بھیجا اور فرمایا یہ مدرسہ بہت مناسب ہے، اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کے اعتماد کو حقیقت بنادے اور حضرت الاستاذ کو غریقِ رحمت فرما کر اپنا قربِ خاص نصیب فرمائے۔ آمین

❀…❀…❀

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں، کہ اے لئیم!

حضرت مفتی سعید احمد پالنپوریؒ ایک جہانِ علم، نابغۂ روزگار اور شہ دیں کے ترجمان

مولانا کبیر الدین فاران مظاہری
ناظم مدرسہ قادریہ مسروالا، ہماچل پردیش

دنیائے رنگ و بو اور چمنستان گل و لالہ میں نہ جانے کتنی کلیاں کھلیں اور مرجھا گئیں، کتنے آئے اور چلے گئے ایک دن وہ بھی آئے گا کہ ہم اور آپ بھی عشرت کدۂ عالم کو چھوڑ چلیں گے اسی طرح یہ رہتی دنیا تک سلسلہ جاری رہے گا۔

یہ ایک قابلِ تسلیم حقیقت ہے کہ اس چہار دانگ عالم میں ایسے لوگ بھی آئے جن کے چلے جانے کا نہ صرف یہ کہ انکا کنبہ سوگوار ہوا بلکہ بستیوں، محلوں، شہروں اور دیاروں میں صفِ ماتم بچھ گئی، مے کدۂ علم و تحقیق میں ویرانی چھا گئی، علمی دنیا میں سناٹا برپا ہو گیا اور جام و ساقی کی محفلیں سونی پڑ گئیں۔

انہیں نابغۂ روزگار ہستیوں میں عزم و عمل کے کوہ گراں جرأت و عزیمت کے پہاڑ، عالم جلیل محقق دوراں، فکر نانوتویؒ کے امین، رموز ولی اللٰہی کے شارح، اسلاف کے علمی و روحانی کارناموں کے رمز شناس، فقیہ النفس، جامع علوم و فنون، سادگی و متانت کے عکس جمیل، شفقت و محبت کی تصویر دار العلوم دیوبند کے انمول ہیرا اور درِ نایاب حضرت علامہ مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کی ذات ستودہ صفات تھیں جو گنجینۂ علم و عرفاں، احقاق حق دین کے ترجمان، دین حق کے علمبردار، دار العلوم دیوبند کے مسند حدیث کی زینت اور متعدد علمی و تحقیقی شعبوں کے روح رواں تھے وہ مختصر علالت کے بعد بمبئی عظمی کے ہاسپٹل سنجیونی ملاڈ میں ۱۹ر مئی ۲۰۲۰ء مطابق ۲۵ر رمضان

المبارک ۱۴۱۹ھ بروز منگل بوقت چاشت داغ فراق دے گئے اور ممبئی کے علاقے جوگیشوری میں اوسیواڑا مسلم قبرستان نے اس مہ پارہ کو اپنے سینے میں سمولیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیرے جانے سے اس طرح چھائی ہے خزاں
ہر کلی ہے نوحہ گر ، ہر پھول کے آنسو رواں

حضرت مفتی صاحبؒ بچپن سے ہی ذہین وفطین، کتب بینی اور محنت کے شیدائی، مختلف علوم وفنون بطور خاص فقہ اور حدیث میں امتیازی مقام کے حامل تھے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو صغر سنی میں ہی تمام جلوہ سامانیوں سے مزین فرمایا تھا جس والدہ کی گود نے انہیں پالا پوسا وہ ایک صالحہ خاتون خانہ اور دینی وضع کی ایک پارساماں تھیں، اسی علمی وتربیتی گود میں آپ نے آنکھیں کھولی تھیں اسی کا اثر تھا کہ بچپن سے ہی آپ مفتی صاحبؒ کو دینی ذوق، علمی شغف اور اخلاق حمیدہ کا تحفہ اسی آغوش کی تربیت کا نتیجہ تھا۔

آپؒ نے ایک جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ ''میری ذہنی تربیت اور نشونما میں گھریلو ماحول کے علاوہ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتویؒ قدس سرہ کی ذات ستودہ صفات کو خاص دخل ہے، جس شخصیت کی چھاپ میرے ذہن ودماغ پر ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہیں۔ جن کی فہم وفراست سے میں بیحد متأثر ہوں وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ ہیں۔ حضرت عمرؓ کی ہمہ گیر شخصیت کو اپنے لئے بہترین اسوہ پاتا ہوں اور نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تو ہم امتی ہی ہیں۔

اسی طرح رسل ورسائل پڑھنا میرے نظام الاوقات میں اسکے لئے کوئی گنجائش نہیں، شعر وشاعری کا ذوق نہیں البتہ یہ اشعار میرے لئے پڑھنا اور گنگنانا نیک بختی اور سعادت ہے۔

یا صاحب الجمال و یا سید البشر
من و جھک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقه

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

انہیں برگ و بارگی کی خوشہ چینیوں نے حضرت مفتی صاحب کی شخصیت کو کندن اور قابلِ تقلید ذات بنا دیا تھا۔

کہنے کو تو گل ہوا ہے فقط ایک ہی چراغ
سچ پوچھئے تو بزم کی رونق چلی گئی

آپ کی تعلیم کی شروعات اپنے گھر، گجرات کے مدارس اور اعلیٰ تعلیم کیلئے جامعہ مظاہر علوم سہارنپور اور ازہر ہند دار العلوم دیوبند کا انتخاب علمی تعمق کیلئے کیا۔

طالب علمی کے آخری پڑاؤ کو پہلے کی طرح نہایت محنت ولگن اور جانفشانی سے پار کر ہم عصروں میں تفوق اور امتیاز نے آپ کو دار العلوم دیوبند جیسی وقیع اور نامور درسگاہ کے فائق استاذ کی مسند پر متمکن فرمایا، اپنی مادر علمی کے صف اول کے استاذ و شیخ الحدیث اور نظام تدریس کے صدر باوقار اور علمی شعبوں کے ناظم اور فقہی مجالس کے نگران اعلی بنائے گئے۔

آپ کی درسگاہ کی قبولیت ومحبوبیت اور افہام وتفہیم کی جلوہ افشانیوں سے مشرق ومغرب کے تشنگان علوم سیرابی حاصل کرنے کیلئے کھیپ درکھیپ استفادہ کیلئے امنڈتے، آپ نہ سرسری مطالعہ اور بکھری غیر مستند روایتوں کو ڈھوتے بلکہ کتابوں کے مواد کو تحقیق کی چھلنی میں چھان پھٹک کر سہل اور شیریں گھونٹ تشنگان علم وفن کو پلاتے ،مضامین کو سلیقہ مندی اور سلجھی ہوئی زبان میں اس طرح بیان فرماتے کہ طالب علم سبق آسانی سے سمجھ لیتا، اچھوتے طرز تکلم اور علمی جواہر پاروں کے موتی بکھیرتے اسی میں ان کی درسگاہ کی مقبولیت کا راز پوشیدہ تھا جسے طالبان علوم نبوت نے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

اللہ نے انہیں تحقیق وجستجو، تعلیمی ذوق ومزاج اور دینی فکر وآگہی کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ انگلینڈ کی

ایک مجلس میں فرمایا کہ ’’دینی تعلیم کو عام کرنے کیلئے بچوں کو ٹوپی اور کرتہ پہناؤ کہ اس سے دینی تعلیم کا شوق پیدا ہوگا بچوں میں بھی اور ماں باپ میں بھی اور اگر دینی تعلیم عام کرنا ہو تو اسلامی لباس بھی عام کرو‘‘

حضرت مفتی صاحبؒ کا اظہار حق کا اپنا انداز تھا، مرعوبیت ان سے کوسوں دور تھی وہ غلط اور باطل نظریات کو دیکھ کر خاموش رہنا جرم عظیم سمجھتے تھے۔ کیونکہ بزدلی کی کوکھ سے جنم لینے والی مصلحت کی چادر دنیا کے سامنے تو تن ڈھانپ دیتی ہے لیکن ضمیر کی عدالت میں وہ بندہ برہنہ ہی رہتا ہے اور جب روح کو چپ اور سکوت ڈس جائے تو اندر سے بیشمار قبریں وجود میں آجاتی ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ نے جہاں دیگر بیشمار صلاحیتوں سے نوازا تھا وہیں انہیں، تاریخی مقامات کی سیر اور مسلم حکومت اور مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستانوں سے عبرت وموعظت حاصل کرنے اور دنیا کو اس سے عبرت دلانے کا وافر جذبہ عطا فرمایا تھا۔ اس لئے بھی انہوں نے ایک بڑی دنیا کی سیاحت فرمائی تھی۔ انہوں نے ترکی، استنبول، قسطنطنیہ کا بھی سفر کیا آپ نے اظہار کیا کہ ’’ہم نے وہاں کی سب سے قیمتی اور عبرتناک چیز وہ ایک محل ہے جس کا نام ’’ڈولما باقی پیلیس‘‘ ہے جس کی تعمیر میں سات حکومتیں پوری ہوئیں جس پر بے پناہ دولت کو خرچ کیا گیا۔ اس محل میں ۳۵ مطبخ، ۶۵ غسل خانے اور اس کی چھتوں کے اندر ۳۰۰ ٹن سونا لگایا گیا اور اس کے رنگ وروغن میں بھی تین سوٹن سونے کا استعمال ہوا۔ کمروں اور برآمدہ پر جو جھالر لگے ہوئے ہیں وہ بیش قیمت اور اربوں کھربوں کی دولت سے تیار ہوئے ہیں۔ یہ اس قدر وسیع وعریض رقبے میں پھیلا ہوا ہے، گائڈ نے بتایا کہ پورا محل دیکھنے میں تین ماہ کا وقت درکار ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم اس کمرہ میں گئے جہاں ان کا آخری تاجدار اور فرماں روا جس نے ترکی گورنمنٹ کو تباہ کیا اور اسلامی حکومت اس پر ختم ہوئی۔ ان کی والدہ کے کمرہ میں بھی گیا جس میں قدآدم ایک ننگی تصویر لٹکی تھی اور وہ بادشاہ جن کی چار بیویاں تھیں ان کے کمروں میں جو تصاویر تھیں اس کا تو پوچھنا ہی کیا؟ اخیر میں

مجھ سے ساتھیوں نے پوچھا! آپ کو کیسا لگا؟ میں نے کہا بتاؤں! جس مقصد کیلئے ترکی آیا تھا وہ اس محل کو دیکھ کر حاصل ہوگیا۔ انہوں نے کہا وہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ دیکھنے آیا تھا کہ اسلامی خلافت بنو عباسیہ کے ختم ہونے کے بعد ترکی خلافت آئی تھی وہ خلافت عثمانیہ پانچ سو سالوں تک رہی یہ پانچ سو سال خلافت عثمانیہ ہمارے پاس تھی اللہ نے ہم سے کیوں چھین لیا اس کے اسباب دیکھنے آیا تھا۔ یہ محل دیکھ کر مجھے اطمینان ہوگیا کہ ہمارا استحقاق خلافت کا رہا ہی نہیں تھا تو اللہ نے ہم سے لے لیا۔

اسی طرح ہندوستان کا آخری تاجدار اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر جس کی حکومت صرف لال قلعہ کے اندر محصور ہوکر رہ گئی تھی باہر کچھ بھی نہیں تھا۔ جب اس نے ''زینت محل'' سے نکاح کیا تو اپنی بیوی کا مہر پانچ لاکھ مقرر کیا تھا جس کی ادائیگی نصف نقد اور نصف ادھار کی شکل میں تھی انکا نکاح نامہ تانبے کی پلیٹ پر کندہ کیا گیا جو فارسی زبان میں تھا۔ میں نے اس کو لندن کے برٹیش میوزیم میں دیکھا۔

یہ وہ دور تھا جب ایک گائے صرف چھ روپۓ میں مل جاتی تھی اس وقت اس نے ایک عورت کو پانچ لاکھ روپۓ مہر دیا تو ملک برباد نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اللہ نے ہندوستان کی حکومت نو سو سال مسلمانوں کے پاس رکھی پھر اللہ نے ہم سے لے لی تو اللہ نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ بلکہ خود ہم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے''

اللہ پاک کا ارشاد ہے **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر ما بانفسھم** یعنی اللہ پاک جب کسی قوم کو نعمتیں دیتے ہیں اور وہ قوم اس کی قدر نہیں کرتی تو اللہ اس صورت میں اس امت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ یعنی اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی روش کو نہیں بدلتی۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مغل سمراٹ کے آخری فرماں روا ابوظفر سراج الدین محمد عرف بہادر شاہ ظفر ۲۴ / اکتوبر ۱۷۷۵ء کو دہلی میں

پیدا ہوئے ان کے والد اکبر شاہ اور والدہ لال بائی تھیں ۱۸۵۷ء میں بھارتی فوجوں کیساتھ سامراجی فوجوں کو ہندوستان سے کھدیڑنے اور اس سے لوہا لینے کیلئے یہ ایک مرد مجاہد تھے، انہیں سامراجی حکومت نے گرفتار کر رنگون کی جیل میں بے یار و مددگار مقید کر دیا تھا جہاں وہ تمام تر اذیتوں کو صبر و استقلال سے برداشت کرتے رہے جب بھوک نے انہیں تڑپایا تو بطور استہزا ایک تھال میں ان کے لڑکے کو شہید کر کے سر کو تھال میں سجا کر سامنے رکھ دیا بہادر شاہ ظفر نے تھال پوش کو اٹھا کر دیکھا کہ شہید بیٹے کا سر خون سے لت پت سامنے ہے تو آپ نے فرنگی فوجیوں کو مخاطب ہو کر کہا کہ ''شہزادے ایسے ہی سرخ رو ہو کر والد کے سامنے آتے ہیں خدا کا شکر ہے کہ بیٹے کا چہرہ سرخ ہے سیاہ نہیں'' رنگون (برما) کی جیل میں ہی ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو جان جان آفریں کے حوالہ کر دیا۔ ان کا مشہور شعر ان پر ہی صادق آ گیا۔

بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصل بہار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کیلئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

آج بھی ہندو پاک اور بنگلہ دیش میں ان کے نام سے کئی سڑکیں منسوب ہیں جو اعتراف خدمات کا ایک عمدہ نمونہ، قابل تقلید اور لائق تحسین ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ جہاں کہیں تشریف لے جاتے مدارس کے قیام، مضبوط تعلیم و تربیت اور ان کی خدمت و نصرت کی طرف لوگوں کو متوجہ فرماتے۔

دیکھا گیا ہے کہ مدارس کی کوکھ سے جنم لینے والے حضرات کو جب اللہ عروج بخشتا ہے تو وہ اکثر مدارس والوں سے بے رخی اور منھ پھیرتے نظر آتے ہیں۔

افریقہ کے ایک سفر میں تبلیغی احباب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تبلیغ کی محنت سے جو اصلاح ہوگی وہ عارضی

ہوگی۔ آج مروجہ دعوت کے طریقوں سے کئی قسم کی گمراہیاں وجود میں آرہی ہیں اور قرآن وحدیث کی غلط تشریحات ہورہی ہیں۔ دراصل پائیدار ہدایت کا ذریعہ مدارس کی تعلیم ہے مدرسوں کے ذریعہ ہدایت کی بنیاد زبانی نہیں قرآن وحدیث کا مستحکم اور مضبوط حوالہ ہے۔

حضرت العلامؒ سنتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور طریقۂ صحابہ کرامؓ کے بڑے گرویدہ تھے اور خلاف سنت پر آپ سخت گیر ہوتے مثلاً نماز میں صفوں کی درستگی کا مسئلہ ہے جس سے عموماً مدارس اور عوام کی مسجدیں بھی بے توجہی کا شکار ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ''ہم حنفیوں میں بلکہ دیوبندیوں میں یہ مسئلہ عام ہے کہ لوگ پہلے مسجد آجاتے ہیں پہلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور امام بھی مصلیٰ پر کھڑا ہوجائے تو اقامت یعنی تکبیر شروع ہوتی ہے اور بریلوی بھائیوں کے یہاں سب سے پہلے مؤذن کھڑا ہوتا ہے پھر اقامت شروع ہوتی ہے حی علی الصلوٰۃ پر مقتدی کھڑے ہوتے ہیں اور قد قامت الصلوٰۃ پر امام کھڑے ہوتے ہیں، اس سے پہلے کوئی کھڑا نہیں ہوتا سب بیٹھے رہتے ہیں تو ان کا یہ بھی طریقہ غلط ہے اور ہمارا طریقہ بھی غلط ہے، کیونکہ لفظ کے بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں تکبیر اردو میں کہتے ہیں اور عربی میں اس کو اقامت کہتے ہیں، کیونکہ اقامت کے معنیٰ کھڑا کرنا تو جب تک اقامت نہیں کہا تو کھڑا کرنا صحیح نہیں ہوا تو لوگ کیوں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ دیوبندیوں کا طریقہ غلط ہے، جب اقامت کہی جائے تو کھڑا ہونا درست ہے اقامت کے بعد صف بندی کی جائے اور صفیں درست کی جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفاء راشدین جب اقامت پوری ہوجانے کے بعد صفیں درست کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو انہوں نے صفوں کی درستگی کے لئے چند آدمیوں کو مقرر کردیا تھا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بھی اسی طرح اقامت کے بعد صفیں درست کرتے تھے، دارالعلوم کے صدر مفتی حضرت سید مہدی حسن صاحبؒ چھتہ مسجد میں معذوروں کو جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے خود ممبر پر کھڑے ہوکر صفیں درست کرواتے تھے''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے اللہ کے بندو! اپنی صفوں کو بالکل سیدھا اور برابر رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہاری ذاتو (دلوں) میں خلاف ڈالدیگا۔ (بخاری شریف ج ا ص ۱۰۰)

حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہ پر اس کا بھی غلبہ رہتا تھا کہ مدارس وجامعات کے اندرونی حالات اور اس کا تعلیمی وتربیتی نظام کیسے درست ہو جو اس وقت کا عام المیہ ہے اس کیلئے وہ مسلسل متفکر اور اس کے گرتے معیار پر خون کے آنسو بہاتے درد سے فرماتے کہ ''تعلیم کی پختگی نہ رہی کام انتہائی بگڑ گیا ہے سات آٹھ سال پڑھنے کے بعد بھی کوئی مولوی نہیں بنتا اگر کسی مدرسے کا شیخ الحدیث انتقال ہو جائے تو کوئی شیخ الحدیث نہیں ملتا مدرسے چل رہے ہیں ان میں اتنی کمزوری آگئی ہے پہلے کا جو نہج تھا وہ نہ رہا۔ مدرسوں کا نظام چوپٹ ہو گیا ہے انڈیا میں مدارس بھرے پڑے ہیں اور کئی مقامات پر شیخ الحدیث انگلینڈ سے پڑھانے آرہے ہیں''

یہ واقعہ حد درجہ افسوس ناک ہے کہ آج عصری درسگاہوں اور زندگی کے تمام ترشعبوں میں لوگوں کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو لوگ اعلیٰ وارفع کرنے کی تگ ودو میں لگے ہیں اگر لوگوں کی پسند ہے تو وہ بہت معیاری۔

وہیں مدارس دینیہ اور اس سے متعلقات کا صرف چل چلاؤ کو ہی کافی سمجھتے ہیں یعنی ہر غیر معیاری کو قبول کرنا ان کا مزاج بنتا جارہا ہے۔ نہ انہیں نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، نہ نظام تعلیم کی اصلاح کی فکر، نہ ہی اوقات کی قدر وقیمت

اور نہ ہی ایام رخصت کے صحیح استعمال کا لائحہ عمل طے کرنے کا جذبہ۔ حد تو یہ ہے کہ اکثر مدارس کا نہ تو کوئی ابنائے قدیم سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی کسی فیض یافتہ سے رشتہ جسے وہ امروز وفردا کا سبق پڑھا سکے۔

وائے افسوس! کہ کرونا وائرس Covid-۱۹ کے دور ابتلا کو اہل مدارس ایام رخصت کے طور پر منا رہے ہیں، ہر طرف انتقال مکانی کا کہرام ہے اس دوران نہ کتابوں سے ربط نہ ہی فرصت کے لمحات سے وصولیابی کا جذبہ، نہ

کوئی رہبر رہا نہ کوئی راہ رو اور نہ ہی کسی مصلح فیض یاب سے تعلق کہ ایسے نازک حالات میں رہنمائی حاصل کی جا سکے دوسری طرف عصری اداروں کے طالب علم اپنے اساتذہ سے آن لائن یعنی نیٹ، وہاٹس ایپ اور جدید ذرائع کو انعامات خداوندی سمجھ کر استفادہ کی نت نئی شکلیں اپنا رہے ہیں۔

دل دوز کہانی ہے کہ آج تعمیرات کی کثرت اور مغل آرٹ اپنانے کی ہوڑ لگی ہے۔لیکن تعمیری ذہنیت اور افراد سازی ناپید ہے، مکان کی تعمیر کی تو دوڑ ہے لیکن مکین کی صلاح وفلاح کی کوئی فکر نہیں اس لئے مدارس کو آبادی کا دو فیصد حصہ بھی بمشکل دستیاب ہے۔اس کا بھی کوئی اوسط نہیں۔ہمیں یاد رکھنا ہوگا! کہ علم بیش قیمت ہے اس کی قیمت چکا کر ہی اسے حاصل کرنا ہوگا۔

تم جسم کے خوش رنگ لباسوں پہ ہو نازاں
میں روح کو بے گور وکفن دیکھ رہا ہوں

اسی طرح مدارس کی زکوٰۃ کی وصول یابی کے غلط روش پر ان کا فتوی تھا ’’جس مدرسے میں زکوٰۃ کا مصرف نہیں وہاں زکوٰۃ کا لگانا درست نہیں ایک مدرسہ ہے جس میں غریب طلبہ ہیں خواہ وہ بالغ ہیں یا نابالغ یہاں زکوٰۃ دینا جائز ہے لیکن جس مدرسہ میں نابالغ طلبہ ہیں اور انکے والد مالدار ہیں تو وہ نابالغ طلبہ بھی مالدار ہیں ایسے مدرسے والے اگر حیلہ اور تملیک کر لیں تب بھی ایسے مدرسوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں‘‘

حضرت مفتی صاحبؒ نہ صرف یہ کہ ایک کامیاب استاذ تھے بلکہ حق و باطل کا فرق، صواب وخطا کا امتیاز، اور اظہار واقعہ پر ملمع سازی پسند نہ فرماتے اور اپنی استدلالی رائے پر جماؤ ان کا مزاج تھا وہ ایسا بھی ہوسکتا ہے ویسا بھی کے بالکل قائل نہ تھے۔

ان کا مزاج اگر چہ مناظرانہ اور مجادلانہ نہ تھا لیکن مجلس مشاورت میں دلائل کی بوچھار سے اپنا لوہا منوا لیتے ۔اس لئے بہتوں کو ان سے پرخاش رہتی تھی عام طور پر دنیا ایسوں کو علمی شہسوار تسلیم تو کر لیتی ہے لیکن تسبیح ومصلیٰ کا

آدمی نہیں گردانتی۔لیکن حضرت مفتی صاحبؒ جو ہر روح وتصوف سے بھی خالی نہ تھے اسی روحانی جوہر کو بھانپتے ہوئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے میکدے کے ساقی (حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ رامپوری ناظم جامعہ مظاہرعلوم سہارنپور خلیفہ حضرت تھانوی صاحبؒ) علمی اور روحانی دنیا کی عظیم شخصیت حضرت مفتی مظفرحسین صاحب قدس سرہٗ ناظم مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور نے انہیں تڑپتی روحوں کی تسکین اور جلائے قلب اور دواء دل بانٹنے کیلئے انہیں ساقی بنادیا تھا اور وہ ان کے مجاز بیعت وارشاد تھے۔ چنانچہ وہ اپنی علمی اور روحانی مجالس میں روح شریعت وتصوف کا جام بھی تقسیم کرتے تھے۔

یہ میرے لئے خوش بختی رہی کہ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کا اگرچہ میرے حصے میں شرف تلمذ کا کوئی رسمی سلسلہ نہ رہا لیکن جن اکابر علماء دارالعلوم دیوبند سے میری راہ ورسم کا شرف رہا ان میں حضرت علامہ مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کے ساتھ خاص انس ولگاؤ اور عقیدت ومودت کا مستحکم رشتہ رہا جو میرے لئے سدا سرمایا افتخار رہے گا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی کہ بندہ کی دعوت پر وہ ۲۳؍شوال ۱۴۰۴ھ میں مدرسہ قادریہ مسروالا تشریف لائے اور تین روزہ قیام کے دوران علاقہ کے کئی گاؤں میں تشریف لے گئے اور ہر طبقۂ فکر کے لوگوں میں ان کا موثر بیان ہوا،طلبہ اور اساتذہ کو بھی اپنے ذوق ومزاج کے مطابق شریعت کے جام شیریں سے سیراب فرمایا۔اپنے دل پذیر خطاب میں بچوں کے ذوق ومزاج کی رعایت کیساتھ پڑھانے کا سلیقہ اور کامیاب استاذ کا گر بھی بتایا اس میں اشارہ تھا کہ بچہ ہر وقت کھیلتا ہے اس لئے کامیاب استاذ وہ ہے جو بچوں کو کھیلنے کے طرز پر پڑھائے آپ نے مدرسہ قادریہ مسروالا کے شب وروز کو رجسٹر معائنہ پر یوں رقم فرمایا ۔''صوبہ ہماچل پردیش پہاڑی علاقہ ہے لوگ پہاڑوں کی بلندی پر متفرق طور پر بسے ہوئے ہیں لوگ عام طور پر دین کی بنیادی باتوں سے بھی ناواقف ہیں اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے قرعہ فال بنام استاذی محترم حضرت مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری نکلا اور حضرت مفتی صاحب نے مسروالا میں جو ہماچل پردیش میں مسلمانوں کا جو سب سے بڑا گاؤں ہے مدرسہ قادریہ مسروالا

کی بنیاد رکھی جس کا ناظم مولانا کبیر الدین فاران صاحب کو بنایا گیا۔ جب میں پہلی بار مدرسہ میں حاضر ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مدرسہ نے تعمیری، تربیتی اور تعلیمی لحاظ سے جتنی ترقی کی ہے عام طور پر مدارس پچیس سال میں کرتے ہیں۔ امید ہے کہ جلد وہ دن آئے گا کہ جس طرح یہ صوبہ قدرتی درختوں سے سرسبز وشاداب ہے دین کی بہاروں سے بھی ہمکنار ہوجائے گا''

حضرت مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کو مدرسہ قادریہ کے نظم وانصرام پر بڑا اعتماد تھا اور وہ آنے جانے والوں سے یہاں کے کوائف واحوال دریافت فرماتے اور جب بندہ کو ان کی دولت کدہ پر حاضری میسر آتی تو وہ پالنپوری مہمان نوازی اور سادگی کا دستر خوان بچھا دیتے اور فرماتے کہ فاران صاحب کبھی کبھی آپ کے اخباری بیانات میری نظروں سے گذرتے رہتے ہیں اور میں اس سے بڑا متفق ہوں، میری ان سے مدارس اسلامیہ کی تعلیمی اور تربیتی گراوٹ پر دیر تلک گفتگو ہوتی گویا ہم ایک رائے ہوتے مدارس کی درسگاہوں کی کمزوری کا ایک سبب ان کے نزدیک مہتمم حضرات کی کوتاہی اور تنگ نظری تھی۔

اس فکر کا اظہار انہوں نے میری تالیف ''استاذ فرش سے عرش تک لیجانے والی ذات'' کی دوسری اشاعت کی تقریظ میں کیا تھا۔ ''ہمارے حضرت مولانا کبیر الدین فاران صاحب زید مجدہ نے بقامت کہتر بقیمت بہتر ''استاذ'' نامی رسالہ لکھا ہے میں نے اسے پڑھا بڑی قیمتی باتیں جمع کی ہیں مگر میں پڑھتے ہوئے سوچتا رہا کہ استاذ کہاں؟ مٹی کے چراغ لیکر ڈھونڈو گے تو بھی نہیں ملیں گے۔ پہلے طالب علم استاذ کا انتخاب کرتے تھے اب مہتمم صاحبان انتخاب کرتے ہیں۔ پہلے طالب علم اور استاذ میں رشتہ ہوتا تھا اب طلبہ کا استاذ کے ساتھ تعلق درسگاہ، تپائیوں اور مہتمم کے واسطے سے ہوتا ہے ظاہر ہے بلا واسطہ اور بالواسطہ کا فرق پڑتا ہے پھر ابتدائی تعلیم جس کا مرحلہ عربی چہارم تک ہے ان درجات کو پڑھانے کیلئے مہتمم صاحبان ایسے اساتذہ کو رکھتے ہیں جن کو ابھی پڑھانا ہی نہیں آیا مہتمم صاحبان کے پیش نظر استاذ کی نہ وجاہت ہوتی ہے نہ استعداد نہ پڑھانے کا طریقہ پیش نظر ہوتا ہے۔ بس ایک ہی بات پیش نظر ہوتی ہے کہ اینٹ

گارے کے مزدور سے بھی کم دہاڑی لیتا ہے ایسی صورت میں یہ قیمتی رسالہ صحراء میں صدا ثابت ہوگا۔ رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی۔ ''میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو قبول فرمائے، نافع بنائے، پرانی ریت واپس لوٹ آئے اور مہتمم صاحبان کو فہم عطا فرمائے۔ کہ وہ ابتدائی تعلیم کے لئے اچھی تنخواہیں دیکر مَنجھے ہوئے اساتذہ رکھیں تا کہ نئی نسل برباد نہ ہو'' سعید احمد عفا اللہ عنہ پالنپوری خادم دارالعلوم دیوبند ۲۴/ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ۔

مدارس کے تعلیمی انحطاط اور انتظامی کمزوریوں اور مدارس کی صحت کی خرابی کے وہ بڑے شاکی رہتے حزن و ملال سے فرماتے ''کوئی ان کے حالات درست کرنے والا دور تک نظر نہیں آتا''

کچھ دنوں قبل حاضری پر بھری مجلس میں فرمایا ''مولانا فاران صاحب مجھے'' آپ سے محبت ہے''۔ یہ وہ توصیفی سند ہے جو میرے لئے باعث صد افتخار ہے۔

میری ذاتی زندگی میں کئی اہم موڑ بھی آئے جن فراخ دل اور بالغ نظر غیر متعصب شخصیات سے مجھے مراجعت کی سعادت ملی ان میں حضرت مفتی صاحبؒ سرفہرست ہیں وہ حالات سنتے، مشورے دیتے، حوصلہ اور ہمت باندھتے جس سے میری کڑھن تعب اور دل شکنی دور ہوتی اور پھر حوصلہ کیساتھ سرپٹ رخت سفر باندھ لینے میں مدد ملتی۔

آج جبکہ وہ ہمیشہ کیلئے ہم سے روپوش ہو گئے ہیں لیکن ان کی باتیں، ان کی ادائیں، ان کا بانکپن، دلجوئی اور دل بستگی، داد و دہش کی وہ کریمانہ روش اور ان کا اسوہ ہمارے لئے سرمایہ ہے کیونکہ بے غرض اور مخلص حضرات کی رتی بھر یاد بھی عمر بھر کیلئے زادراہ بن جاتی ہے۔

ان کی شان استغناء، دریا دلی اور خدمت بے لوث کی حاذق طبیب اور شاعر اسلام حضرت مولانا ڈاکٹر سید افضل حسین قاسمی نے یوں ترجمانی فرمائی ہے۔

آپ تو لیتے نہ تھے تدریس کا کوئی عوض
ہر مہینہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے خود ہی عطا

اللہ نے انہیں منفرد انعامات سے مالا مال فرمایا تھا وہ خود حافظِ قرآن، انکی اہلیہ محترمہ حافظہ، انکے صاحبزادے حافظ انکی صاحبزادیاں حافظہ، اوران کی بہوئیں بھی حافظہ تھیں گویا گھر کا ماحول قرآنی اورانوار وبرکات سے عطر بیز رہتا تھا۔

زمیں کی رونق چلی گئی ہے، افق پہ مہر مبیں نہیں ہے
تری جدائی سے مرنے والے، وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے

بلاشبہ! مسند حدیث کی آبرو، جماعت دیوبند کے علمی سالار، فکر نانوتویؒ کے ماہر شناور، چمنستان قاسمی کے بے مثال باغباں سے حقیقی تعلق اور مخلصانہ محبت کا حق ہے کہ ہم مرثیہ خوانی کی بجائے ان کی انمول زندگی کے کارآمد نقوش، علم وفن کا ایک اعلیٰ مقتدا، لشکر نانوتوی کا جرنیل، سادہ اور سپاہیانہ زندگی کا نمونہ، اخلاص ومعرفت کا مرقع، سلف وخلف کا نشان ، عبقری اور عقابی نظر، ہمالیائی ارادوں سے متصف رجال کار اور مردم ساز، بلند و بالا معیار زندگی، شفقت ومؤدت کا سائبان، شہ دین کا ترجمان، عظمت بھری داستانِ حیات اور پیام حق کا تعمیری شمارہ کو زادراہ بنائیں یہی ان کے حق میں تعزیت کا صحیح حق ہے رب کریم امت مسلمہ، بالخصوص دارالعلوم کو اس کا نعم البدل اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

کئی دماغوں کا ایک انساں، میں سوچتاہوں کہاں گیاہے
قلم کی عظمت اجڑ گئی ہے، زباں کا زور بیاں گیاہے

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان کے طرز زندگی کواپنانے، ان کے افکاروکڑھن کواوڑھنے، ان کے نشان قدم اوران کی ڈگر پر چلنے کی سعادت بخشے اوران کی خدمات کو ہمارے لئے مشعل راہ بنائے۔

یارب ذوالجلال! رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جاں نثار کے مرقد کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے ۔آمین۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں؟ کہ اے لئیم
تونے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے؟

❁...❁...❁

علم وفن کا بدر منیر رخصت ہوا

مفتی محمد اصغر صاحب قاسمی پور بالیانی
شیخ الحدیث جامعہ مظہر السعادہ ہانسوٹ، گجرات

محدث کبیر محقق عصر استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نور اللہ مرقدہ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند ۲۵ ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کے روز اس دار فانی سے دار بقا کی طرف رحلت فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون، اب ہمیشہ کے لئے وہ شمع بجھ گئی جس سے علمی دنیا منور تھی اور وہ چشمہ بند ہو گیا جس سے تشنگان علوم نبوت اپنی علمی پیاس بجھا رہے تھے۔

اس جہان رنگ وبو میں انسانوں کا مرنا جینا کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ہر شخص اپنا وقت پورا کر کے اس دار فانی کو خیرا باد کہہ دیتا ہے یہی اللہ تعالیٰ کا نظام ہے باقی رہنے والی ذات صرف خدا کی ہے۔ کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام کیسے کیسے آفتاب علم وفضل آئے جو ڈوب گئے کیسے کیسے تقوی وطہارت کے شہاب ثاقب تھے جو زمین کی خوراک بن گئے ان میں کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی رحلت پر ایک علاقہ یا محدود لوگ غم کے آنسو بہاتے ہیں اور بعض ایسی عبقری اور مثالی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں جن کی وفات پر لاکھوں افراد بلکہ پورا عالم سوگوار ہو جاتا ہے، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کی شخصیت بھی ان پاک نفوس میں سے ایک ہے جن کی وفات حسرت آیات پر آج پورا عالم اسلام خاص طور سے علمی دنیا سوگوار ہے۔

موت اسکی ہے کرے جسکا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لئے

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ ایک عبقری اور مثالی شخصیت کے مالک تھے آپ کو اللہ رب العزت نے علوم ظاہرہ و باطنہ سے آراستہ اور اخلاق فاضلہ واحوال صادقہ سے سرفراز فرمایا تھا تقوی،طہارت،خشیت،انابت الی اللہ،صدق وصفا،شیریں زبانی،ہمدردی جیسی بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا،خوشگوار اور پاکیزہ زندگی عطا فرمائی تھی ،اصول پسندی اور مرتب زندگی آپ کی حیات کا نمایاں وصف تھا،احتیاط اختیار کرنے میں حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے اصولوں پر گامزن نظر آتے تھے،مزاح بہت لطیف انداز میں فرماتے تھے،آپ کے مزاج میں حلم و بردباری اور نہایت درجہ تواضع وانکساری تھی۔

فقیہ الاسلام حضرت مفتی مظفر حسین صاحب قدس سرہ کے دامنِ فیض سے وابستہ رہ کر احسان وتزکیہ اور راہ سلوک کی منزلیں طے فرمائیں ،خلافت واجازت سے مشرف ہوئے،تمام ظاہری علوم وفنون کے ساتھ آپ کو معرفت خداوندی اور تعلق مع اللہ کی دولت میسر تھی،آپ آہ سحر گاہی اور فغان نیم شبی کے لذت شناس تھے بفضلہٖ تعالیٰ علمی خدمات کے ساتھ آپکا روحانی فیض بھی پورے عالم میں جاری وساری ہے، یہ شعر آپ کی ذات پر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔

در کف جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نہ داند جام و سندان باختن

آپ نے تقریباً نصف صدی تک ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے مسند درس خصوصاً مسند حدیث کو زینت بخشی ،شیخ نصیر احمد خان صاحب کے بعد عہدہ صدارت پر فائز ہوئے اور شیخ الحدیث منتخب کئے گئے،اور تاحیات نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے،آپ کو اللہ تعالیٰ نے افہام وتفہیم کا حیرت انگیز ملکہ عطا فرمایا تھا بڑی سے بڑی مباحث کو فقیہانہ ومحدثانہ انداز میں آسان اور مختصر الفاظ میں دریا بکوزہ کر کے بیان فرمادیا کرتے تھے،آپ کا درس انتہائی مقبول تھا،طلبہ پروانہ وار درس میں شریک ہوتے تھے مکررات اور زوائد

سے پاک مرتب گفتگو فرماتے پیچیدہ عبارتوں کو مخصوص انداز میں اس طرح حل کرتے کہ ہر طالب علم مطمئن نظر آتا ،ائمہ کرام کے تعلق سے مکمل احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اختلافی مسائل کو بیان فرماتے ،راجح مرجوح کی وضاحت کرتے نیز اپنا موقف مضبوط دلائل کے ساتھ پیش فرماتے تھے،الغرض آپکے درس کا انداز معارضانہ،مناقضہ نہیں تھا بلکہ ادیبانہ،فصیحانہ، بلیغانہ،محققانہ،محدثانہ،فقیہانہ ہوتا تھا۔

آپ اپنے وہبی اور فطری ذوق کے موافق ہمیشہ اپنے شاگردوں کی دینی وفکری تربیت فرماتے انکے روشن مستقبل کے لئے بھرپور کوشش کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہر فن کثیر تعداد میں موجود ہیں، آپکی اصلاحی فکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپنے اپنے گھرانے کو علمی گھرانہ بنانے کے لئے قابل قدر توجہ فرمائی،اس سلسلہ میں آپ نہایت بیدار مغز تھے،اپنی رفیقہ حیات کو حفظ قرآن کریم وغیرہ کی بے بہا دولت سے بہرہ ور فرمایا جس میں ہم سب کے لئے درس عبرت ہے،ناچیز نے بھی اس طریقہ پر عمل کیا جس کا بہترین نتیجہ ظاہر ہوا۔

آپ وقت کے بڑے قدردان ,تھے،وقت کا ضیاع آپکو ہرگز گوارا نہ تھا،ہر کام کیلئے ایک وقت متعین تھا اور وقت کیلئے ایک کام،گویا آپکا ہر لمحہ امت مرحومہ کی ترقی اور دین اسلام کی اشاعت کے لئے وقف تھا،یہی وجہ ہے کہ درس وتدریس کی وقت طلب مصروفیت کے باوجود آپ کی گرانقدر تصانیف کی لمبی فہرست ہے،جن میں تحفۃ القاری،تحفۃ الالمعی ،ہدایت القرآن ،اور رحمۃ اللہ الواسعۃ جیسی عظیم وضخیم کتابیں قابل ذکر ہیں جو علوم کا خزانہ ہیں،اور یقیناً رحمۃ اللہ الواسعۃ کی تصنیف تو علمی دنیا پر آپکا احسان عظیم ہے،صحیح بات یہ ہے کہ آپ سلف کا نمونہ،علوم ولی اللہی کے پاسبان،فکر نانوتوی کے امین،اور مسلک دیوبند کے سچے ترجمان تھے۔

آپ نے اپنی زندگی میں اس بات کی پوری کوشش فرمائی کہ دین کے مٹے ہوئے نقوش کو ابھارا جائے اور جن پہلوؤں پر بے اعتنائی کی گرد پڑ رہی ہے اسے صاف اور واضح کیا جائے۔

ہمہ وقت کام میں لگے رہنا اور کام میں لگے ہوئے افراد سے خوش ہونا، انہیں مفید مشورے دینا، انکی دینی خدمت کو سراہنا آپکا خاص مزاج تھا، ناچیز نے آداب ملاقات، داڑھی کی اسلامی حیثیت، عمدۃ المغیث وغیرہ کتابیں مرتب کر کے اصلاح کے لئے خدمت میں پیش کیں تو آپ نے پسند فرمایا، اور حوصلہ افزائی کے لئے کچھ رقم بھی عنایت فرمائی۔

آپ کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے (ناچیز بھی اس میں شامل ہے) جو ملک و بیرون ملک دنیا کے ہر خطہ میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے فیض کو عام کرنے میں مصروف ہیں، حضرت نے اپنی زندگی میں جو شجر طوبی لگایا ہے اسکی جڑیں گہری اور شاخیں بارآور ہیں، آپکی روحانی اولاد اور تلامذہ کا جم غفیر انشاء اللہ اس کو مرجھانے نہیں دیگا، یہ جم غفیر اپنے مشفق استاذ محترم کے لئے، **أو علم ینتفع به** کا مصداق بنکر صدقہ جاریہ بنا ہوا ہے اور انشاء اللہ بنا رہے گا۔

آج حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کی ذات گرامی قدر ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن آپ کی زندگی کے تابندہ و پائندہ نقوش ضرور موجود ہیں جن پر چل کر انسانیت عرصہ دراز تک روشنی حاصل کرتی رہے گی، اس لئے ہماری طرف سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں سب سے بہترین خراج عقیدت یہ ہے کہ ہم آپکی زندگی کے رہنما اصولوں کو مشعل راہ بنائیں، اور آپ کی بلند پایہ صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

وہ مرا شعلہ جبیں موج حوادث کی طرح
دیئے بجھا بھی گیا اور دیئے جلا بھی گیا
پیر مغاں نہیں مگر میکدہ تو ہے
جام و سبو یہاں سے ہٹایا نہ جائیگا
چاہا اگر خدا نے تو تیری محفل کا ہر چراغ
یوں ہی جلا کریگا بجھایا نہ جائیگا

استاد محترم! مفتی سعید احمد رحمہ اللہ- کچھ یادیں۔ کچھ باتیں

مولانا محمد شہاب الدین قاسمی
جنرل سیکریٹری جمعیۃ علماء جھارکھنڈ

اللہ تعالیٰ کے مقرب اور محبوب بندوں کا اس دنیا سے جانا صرف چند افراد، قبیلے اور خاندان کے لئے ہی المناک نہیں، بلکہ دنیا ان کی جدائی اور فرقت سے مضطرب ہوجاتی ہے۔حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد اکابر واسلاف کے انہیں زریں روایات کی ایک معتبر اور نمایاں کڑی تھے،جن کی جدائی نے سب کو یکساں غمزدہ کردیا ہے۔

حضرت سے ترمذی شریف پڑھے اگرچہ تیس سال کا لمبا عرصہ ہورہا ہے،لیکن ان کی اچانک جدائی نے گذرے ہرلمحات کی یادیں تازہ کردیں،زمانۂ طالب علمی اور درسگاہ کی جو باتیں قصۂ پارینہ بن چکی تھیں،یکے بعد دیگرے ذہن ودماغ میں مرتسم ہوکر کرب میں اضافہ کرتی رہیں۔عربی چہارم میں جب میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا، اسی وقت سے دورۂ حدیث شریف بالخصوص ترمذی شریف کی عبارت خوانی کے امتیازات وخصوصیات کے سلسلے میں سنتا رہتا تھا کہ جب چاہے اور جس طرح چاہے ہر طالب علم کو حضرت مفتی صاحب کے درس میں عبارت پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔سال کے شروع میں اس سلسلہ میں ہفتوں طلباء کو امتحان سے گذرنا پڑتا۔اور جب تک حضرت کو اطمینان نہ ہوجاتا،کسی کو عبارت پڑھنے کی جرأت نہ ہوتی۔شائقین طلبہ جدوجہد کرتے رہتے،بالآخر ایک یا دو طالب علم کو ہی عبارت خوانی کی اجازت ملتی۔۱۹۹۰-۹۱ء کے دورۂ حدیث شریف میں احقر کو پورے سال ترمذی شریف کی عبارت خوانی کا موقع ملا۔حضرت الاستاذ کی درسگاہ کا اصول منفرد تھا۔گھر سے

رکشہ سے تشریف لاتے۔فوارہ سے اور بسا اوقات معراج گیٹ سے جوں ہی خبر ملتی کہ مفتی صاحبؒ تشریف لا رہے ہیں، دارالحدیث مرتب، خاموش اور محوانتظار ہوجاتا۔طلبہ اپنی نشستوں پر مؤدب بیٹھ جاتے۔ مجال تھا کہ کوئی سامنے یا بغل والے ساتھی سے ہلکی آواز میں بھی بات کرلے۔سب کی نگاہیں ان کے پرُ وقار چہرے کی طرف مرکوز ہوجاتیں۔حضرت مسند درس پر تشریف فرما ہوتے ہی بلند آواز سے طلبہ کو سلام کرتے اور صرف ”جی“ فرماتے۔اور فوراً بعد قاری عبارت خوانی شروع کرتا۔عبارت کی آواز اس قدر مسحور کن اور پر کشش ہوتی کہ دارالحدیث میں روحانیت بھرا سکوت چھا جاتا اور طلبہ ذہنی وفکری طور پر علم حدیث کے سمندر میں غوطہ لگانے کے لئے تیار ہوجاتے۔عبارت کی آواز جو فوّارہ اور دارالحدیث کی گیلریوں تک جاتی رہتی، بسا اوقات وہاں سے گذرنے والے طلبہ کے قدم عبارت سنے بغیر آگے نہ بڑھتے۔

ترمذی شریف کے درس میں متن حدیث واضح اور بہترین لہجہ میں پڑھا جاتا تھا۔الفاظ وحرکات کی ادائیگی میں تکلف کو مفتی صاحبؒ بالکل برداشت نہ فرماتے۔اوراس میں شدت سے بھی منع فرماتے۔آسان ادائیگی اور خوش سماعت سے لبریز انداز قرأت کو پسند فرماتے تھے۔ حروف کو چبانے یا دبانے پر ان کو بارِ خاطر ہوجاتا اور فوراً ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوجاتے۔ بسا اوقات ناراض ہوکر درس سے اٹھ کر چلے جاتے۔اس لئے قاری کو انتہائی مستعد اور حضرت کے اشاروں کا منتظر رہنا پڑتا۔وہ ایسے قاری کو پسند فرماتے تھے جو ان کی بحث اور تقریر کو سمجھ سکے، کہ حضرت کی تقریر کب اور کہاں ختم ہورہی ہے۔اس کا ادراک بھی قاری کو خود کرنا پڑتا تھا۔کبھی کبھی صرف ایک یا دو جملہ پر رک جانا ہوتا۔جو قاری اس حساسیت سے عاری ہوتا مفتی صاحبؒ ان سے عبارت نہیں پڑھواتے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ترمذی شریف کی عبارت خوانی میں میری کسی کمی،کوتاہی یا سستی کی وجہ سے حضرت نے ناگواری کا اظہار کیا ہو۔

حضرت الاستاذ باب کے شروع ہی میں باب سے متعلقہ روایت پر مکمل بحث فرمادیتے۔ بسااوقات دو دودن گذرجاتے اور باب سے آگے روایت کی عبارت پڑھنے کی نوبت نہ آتی۔ آپ حدیث کو مقارن بالفقہ کے اسلوب میں پڑھاتے تھے۔ متعلقہ روایت سے جس قدر فقہی اصول وجزئیات متفرع ہوسکتے تھے، آپ کھل کر بحث فرماتے۔ اکثر اس قدر بسیط اور جامع تشریح فرماتے کہ ہمیں متداول شروحات میں بھی وہ جزئیات نہ مل پاتیں۔ ائمہ اربعہ کے مابین اختلاف کو ذکر کرتے ہوئے اختلاف کی منشاء اور اساس پر خوبصورت، عالمانہ اور محققانہ گفتگوفرماتے، کہ کسی بھی انداز سے ائمہ اربعہ کے مابین کسی کی تفضیل وتنقیص کی بوتک نہ آتی۔ روایت مؤیدہ کے استشہاد اور دلائل میں مزید روایات پیش فرماتے۔ آپ کا انداز بیاں اس قدر مرتب اور آسان ہوتا کہ طلبہ کو دقیق علمی مباحث کوبھی سمجھنے میں دیر نہ لگتی۔ اس دوران طلبہ کی طرف سے اعتراضات واشکالات کی مختلف پرچیاں بھی آپ تک پہونچتیں، آپ ان تمام کو محفوظ کرلیتے اور درس کے اختتام میں ایک ایک کو پڑھتے۔ بعض پرچیوں کو چارٹکڑے کرکے ہوامیں پھونک سے بکھیرتے ہوئے فرماتے یہ اس کا جواب ہے یعنی ان طلبہ کے لئے پرمزاح سرزنش ھوتی جودرس میں دماغی طور پرغیر حاضر رہ کر بحث کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور لایعنی سوالات سے درس کے قیمتی وقت کوضائع کرتے تھے۔ بعض پرچیوں کے جوابات دیتے اور طلبہ کو مطمئن بھی فرماتے اور ان میں بعض ایسی پرچیاں ہوتی تھیں جن کی تائید کرتے ہوے پرچی دینے پر حوصلہ افزائی فرماتے اور بسااوقات گذشتہ تشریح سے آپ رجوع بھی فرمالیتے تھے۔

آپ کے درس حدیث میں علمی نکات وجزئیات کی بارش کا یہ سماں ہوتا کہ ان کا ہر ایک قطرہ گوہر آبدار ہوتا، آپ کے انداز تدریس میں علماء متقدمین کی جھلک نظر آتی، آپ کی تقریر اور تشریح حدیث سن کر طلبہ کے اندر خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوجاتیں، آپ جس جوش اور ولولہ سے درس حدیث دیا کرتے تھے، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ احناف کے اقوال کی تائید میں نقلی وعقلی مسکت دلائل پیش فرماتے اور علماء دیوبند کے منہج واصول سے انحراف

نہ ہوتا۔

حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ کے درس حدیث میں طلبہ کو اس قدر طاقت ملتی کہ صحاح ستہ کے دیگر کتب میں بھی وہ تقریر معاون ثابت ہوتی۔

اسی طرح رجال محدثین اور درجات روایت پر شرح وبسط کے ساتھ بحث کرتے اور ایک ایک سند کی تنقیح میں کبھی تین تین روز بحث فرماتے، جس کے نتیجہ میں اکثر طلبہ کے ذہن ودماغ میں یہ بات سرایت کرجاتی کہ کسی روایت کو نقل کرنے یا بیان کرنے سے پہلے راوی حدیث، اس کی صحت وثقاہت اور اس کی سندوں پر نظر ڈال لی جائے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہم لوگ رجال کے بحث کو تطویل لاطائل کہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے تو حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے تھے کہ ان اصول وضوابط کو یاد رکھو، اس میں ذوق وصلاحیت اور مہارت پیدا کرو، آگے چل کر تم کسی ادارہ کے محدث بنوگے، اس وقت یہ چیزیں کام آئیں گی، اسلئے کہ علم حدیث کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے یہ سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت کے درس میں ترمذی کی تقریر کو میں قلمبند کرتا تھا اور ایک ایک جزئیہ کو نوٹ کرتا تھا، اسکی ایک ضخیم کاپی تیار ہوگئی تھی، درس سے فارغ ہوکر معارف السنن، التعلیق الصبیح، تقریر شیخ الہند اور درس ترمذی سے مراجعت کرتا تھا، حضرت الاستاذ کی تقریر اور ان کتب کے درمیان اگر کوئی بنیادی اختلاف ملتا تو میں حضرت کی خدمت میں جاکر عرض کرتا، حضرت اس کی تائید وتوثیق فرماتے اور حوصلہ افزائی بھی فرماتے اور اگر مجھے سمجھنے میں کچھ غلطی ہوتی تو سمجھا دیتے۔ شفقت، خورد نوازی اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے مجھے ان کی خدمت میں کسی بھی اشکال کو لے کر جانے میں قطعاً جھجک نہیں ہوئی۔

دوران درس لکھی گئی وہ کاپی ہزاروں صفحات پر محیط تھی اور مستزاد کہ حضرت الاستاذ اور دیگر شروحات سے مراجعت شدہ تھی، یقیناوہ میرے لئے بڑا علمی سرمایہ تھی، حضرت نے اس دیکھ کر فرمایا تھا کہ مستند اور کافی علمی ذخیرہ

جمع ھوگیا ہے۔آج بھی ان سطور کو لکھتے ہوئے دل بوجھل ہورہا ہیکہ میرے ایک رفیق درس نے جو مجھ سے عربی اور اردو رسم الخط سیکھتے تھے، سالانہ چھٹی کے موقع پر، ایک روز وہ کاپی مجھ سے فوٹو اسٹیٹ کے لئے کہ کر لے گئے اور آج تک وہ نظر نہ آئے۔اس تیس سال کے عرصہ میں میرے لئے وہ واقعہ سوہان روح بنا ہوا ہے، حضرت الاستاذ کی رحلت اور جدائی نے مدتوں سینے میں درد نہاں کو سوا کردیا، میری نظریں آج بھی ان کی متلاشی ہیں۔

اس موقع پر اپنا ایک واقعہ خوب یاد آرہا ہے کہ ترمذی شریف کا آخری سبق تھا، میری والدہ، بھائی اور ان کی اہلیہ میرے تکمیل حدیث شریف کے موقع پر دیوبند گئے ہوئے تھے، ان کیلئے ضروری انتظامات کی وجہ سے اس دن (پہلا اور آخری دن) میں حضرت مفتی صاحبؒ کے درس میں پانچ منٹ تاخیر سے پہونچا، جس کے نتیجہ میں مجھے سب سے آخری قطار میں جگہ ملی، کچھ دیر بعد حضرت الاستاذ تشریف لائے، بیٹھتے ہی کسی طالب علم نے ترمذی شریف کی آخری حدیث کی عبارت پڑھی، حضرت نے اپنی نگاہ کو اٹھایا اور فرمایا ''شہاب الدین ہزاریباغوی کہاں ہے؟'' میں مارے خجالت، شرم اور خوف اپنی جگہ بیٹھا ہی رہا، میں نے کوئی آواز نہیں دی، پھر دوبارہ فرمایا: اگر وہ کہیں موجود ہو تو آگے آجائے۔ یہ سن کر میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور طلبہ نے میرے لئے راستہ بنایا، اس عمل میں تقریباً چار سے پانچ منٹ صرف ہوئے، لیکن حضرت اطمینان وسکون کے ساتھ بیٹھے رہے۔اور جب میں پہلی صف میں مائک کے پاس پہونچ گیا تو حضرت نے فرمایا ''جی'' اس کے بعد میں نے عبارت خوانی شروع کی اور حضرت استاد محترم نے ترمذی شریف کی آخری حدیث پر تقریر فرمائی۔

میری سماعت میں وہ الفاظ آج بھی محفوظ ہیں جو سال کے اختتام میں طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا تھا: اے جماعت طلباء! آپ کے درمیان متعدد وہ طلباء ہیں جو امتحانات میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرکے پوزیشن لاتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ فراغت کے بعد ہر حال میں بڑے اور مرکزی اداروں میں ہی صرف بڑی بڑی کتابیں پڑھانے کو ملیں گی اور ان کو تدریس وافتاء کے لئے نمایاں مقام ہر حال میں دیا جائے گا،

اور وہ طلبہ جن کی علمی استعداد کم یا متوسط ہے انہیں خدانخواستہ تدریس، تقریر یا تصنیف وتالیف اور خدمت دین کے کسی شعبہ میں شرف حاصل نہ ہوسکے گا، یا محض کم استعداد کی بنیاد پر ان کے ساتھ دوہرا معیار برتا جائے گا۔ ایسا نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے۔ میرے عزیز طلباء! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے قابلیت وصلاحیت نہیں بلکہ صالحیت اور اخلاص وتقوی کی بنیاد پر ہی کام لیتا ہے، اسلئے اپنی نیتوں کو خالص اللہ کے لئے رکھیں، اگر اس میں کچھ اضمحلال یا کمزوری ہے تو آج ہی، اسی مجلس میں نیتوں کی تصحیح کرلیں، اور اللہ کے رسول کے مہمان اور ان کے نائب ووارث ہونے کی حیثیت سے عہد کریں کہ ہم نے جو کچھ یہاں پڑھا سیکھا وہ اعلاء کلمۃ اللہ، اشاعت دین، احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے ہی استعمال ہوگا۔ کسی بھی علمی، فکری تخریب اور فتنہ کا دنداں شکن جواب دیں گے، اسلئے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ لہٰذا ممتاز طلبہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ شیطان اور نفس آپ کو کہیں راہ حق سے بھٹکا نہ دے، اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہیں اور دوسرے تیسرے درجہ کے طلباء کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مایوسی کے شکار نہ ہوں اللہ کے یہاں مایوسی کفر ہے، میں نے دیکھا ہے کہ وہ طلبہ جو پڑھنے میں یا دارالعلوم کی زندگی میں نمایاں نہیں تھے، لیکن میدان کار میں آفتاب وماہتاب ہیں۔

آخری درس میں حضرت الاستاذ اپنی اس بات کو درد بھرے لہجہ اس طرح فرماتے تھے کہ طلبہ نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوتے تھے، نیز شعبان اور رمضان میں ہی دارالعلوم کے احاطہ میں رہتے ہوئے کسی بھی ادارہ کو اپنی تدریسی خدمات کے لئے منتخب کرلیتے، بلاشبہ حضرت الاستاذ کے قیمتی اور رہنمایانہ ارشادات آج بھی ان کے خلف اور شاگردوں کیلئے مشعلِ راہ ہیں۔

تازہ خواہی داشتن داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

❀...❀...❀

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد پالن پوری الی رحمۃ اللہ

مولانا سجود العزیز قاسمی

۱۹ ؍مئی مطابق ۲۵ ؍رمضان المبارک کی صبح جس اندوہناک خبر نے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا، وہ سرمایہ ملت دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ کی دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت فرما جانے کی خبر تھی، خبر کیا تھی ایک بجلی تھی جو اعصاب پر کوندی تھی، ہر چند کہ گذشتہ کئی دنوں سے مفتی صاحب کی ناسازگی طبیعت کی خبریں مسلسل آرہی تھیں اور خود اس عاصی کو بھی رحمتِ حق سے ان کی جلد صحت یابی کی دعا مانگنے کی توفیق ملی تھی، لیکن پھر بھی یہ حادثہ آفتِ ناگہانی سے کسی صورت کم محسوس نہ ہوا، دم تحریر بھی مفتی صاحب کے نام کے ساتھ ''دامت برکاتہم'' کے بجائے ''رحمۃ اللہ علیہ'' کا لاحقہ لگانا دل مضطر کے اختیار سے باہر محسوس ہو رہا ہے، تاہم جب کلام الٰہی کی اس آیت کی طرف نظر جاتی ہے کہ

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَيْءٍ۔

ترجمہ: اور (ایک اور اہم خوشخبری سنو) جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے (بھی ایمان میں) ان کی پیروی کی ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ (جنت میں) ملا دیں گے۔ اور ان کے عمل میں سے کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے۔

تو بے اختیار رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حمد و شکر کے جذبات دل میں آتے ہیں اور یک گونہ سکون ملتا ہے کہ کل بروز محشر انشاء اللہ پھر جمع ہونے کی امید ہے، اور ساتھ ہی یہ دعا بھی لب پر آتی ہے کہ بارالٰہا! حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ اپنی خاص رحمت کا معاملہ فرمائیے، ان کو جنت الفردوس میں قرب کا اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور ہم پیچھے رہ

جانے والوں کو ایسے ایمان اور اعمال صالحہ کی توفیق دیجیے کہ ہم اس آیت کے مصداق بن کر روزِ قیامت ایک بار پھر جمع ہوسکیں، اور جب تک دنیا میں رہیں آپ کی اور آپ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ نسبت قائم رہے جس کے واسطے سے آپ نے ہمیں حضرت مفتی صاحب سے وابستہ کیا ہے، اور اس نسبت کے فیوض ان کی وفات کے بعد بھی ہم پیچھے رہ جانے والوں پر سایہ فگن رہیں۔

حضرت مفتی صاحب کے سانحۂ ارتحال پر نہ صرف ان کے لواحقین و منتسبین بلکہ پوری امت مسلمہ تعزیت کی مستحق ہے، اللہ رب العزت اس امت کے حال پر رحم فرمائے کہ جیسے جیسے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں، جیسے جیسے نئے فتنے اور نئے چیلنجز سر ابھار رہے ہیں، رہبری کرنے والے، اور حالات سے نبرد آزما نوجوانوں کو ہمت و حوصلہ دینے اور ان کی دستگیری کرنے والے اولوالعزم افراد ہمارے بیچ سے رخصت ہوتے جارہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ حالات جس رخ پر جارہے ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ سفر کی جس منزل پر ہم اس وقت کھڑے ہیں وہاں حضرت مفتی صاحب جیسی مردم گر اور رجال ساز شخصیت کی کمی بے انتہاء محسوس کی جانے والی ہے۔

حضرت مفتی صاحب کے لئے مردم گر اور رجال ساز کے جو الفاظ ہم نے استعمال کیے ہیں وہ محض ایک انداز تعبیر نہیں حقیقت واقعہ ہے، ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی حیثیت ایک پاور ہاؤس کے مانند ہوتی ہے، جہاں سے علم کی روشنی سیکڑوں جگہوں سے آئے ہوئے ہزاروں طالبین کے دلوں میں منتقل ہوتی ہے، انھیں مرد میداں اور رجال کار بنایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ کر علم کے اس نور کو گھر گھر پہنچانے کا فریضہ انجام دیں۔ ۱۳۹۳ھ میں حضرت مولانا منظور نعمانی قدس سرہ کی تجویز وتحریک پر حضرت مفتی صاحب کا دارالعلوم دیوبند بحیثیت مدرس تقرر ہوا تھا، تب سے لے کر اب تک ان کی زندگی کے اڑتالیس سال یعنی تقریباً نصف صدی طالبینِ علوم کی تشنہ کامی، انھیں رجال کار بنانے اور مختلف میدانوں کے لیے مختلف افراد کار مہیا کرنے میں صرف ہوئے، اسی لیے صرف استاذ نہیں استاد گر کہا جاتا تھا، اور پھر مزید یہ کہ تدریسی خدمات کے علاوہ متعدد تصنیفات و

تالیفات اور شروح وتسہیل کا جو کام اللہ نے ان سے لیا م وہ ان کی اس صفت مردم گری کو ان کی وفات کے بعد بھی انشاءاللہ قائم ودائم رکھے ہوئے ہے۔ **فجزاہ اللہ عنا احسن الجزاء۔**

گو کہ حضرت مفتی صاحب کے رحلت فرما جانے سے یہ سلسلہ تدریس اور تصنیف وتالیف رک نہیں گیا، اور آپ کے بعد بھی یقین مسند صدارت پر بہت سے اصحاب علم فین براجمان ہوں گے لیکن ع

لائیں کہاں سے ایسا کہ تجھ سا کہیں جسے

شدت سے یاد آتا ہے دارالعلوم دیوبند کا زمانۂ طالب علمی، یوں تو تمام ہی اساتذہ ایسے تھے کہ ان کی علمی لیاقت، انداز تدریس اور بہترین علمی جواہر پاروں سے ہزاروں تشنگان علوم نبوت استفادہ کرتے تھے۔ لیکن حضرت مفتی صاحب کی بات ہی کچھ اور تھی، وہ سبق کیا پڑھاتے تھے۔ علم گھول کر پاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھ جیسے نبی اور کند ذہین طالب علم کو بھی مطالب حدیث کے سمجھے میں بھی دشواری نہیں ہوتی تھی، ان کے یہاں عبارت خوانی کے بڑے آداب تھے، ہر کس وناکس کو ان کے درس میں عبارت پڑھنے کی اجازت تھی، ابتدائی چند دنوں میں تو بہت سے لوگ موقع آزمائی کرتے پھر چند خوش نصیبوں کو مفتی صاحب کی طرف سے متعین کر دیا جاتا، اچھی طرح یاد ہے کہ جن لوگوں کو حضرت مفتی صاحب نے متعین کیا تھا، انھیں ہم جیسے طالب علم بڑے احترام اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ بھائی یہ تو مفتی صاحب کے یہاں عبارت پڑھتے ہیں، خوش الحان قاری جب **بسم اللہ الرحمن الرحیم** پڑھ کر "**وبہ قال حدثنا**" سے شروع کرتا تو عجب سماں ہوتا، ہزار بارہ سو طلباء کی موجودگی میں ایسی خاموشی ہوتی اور ماحول پر حدیث نبوی کا ایسا رعب پڑتا کہ درسگاہ کے باہر چلنے والوں کے بھی قدم تھم جاتے، ہر چند کہ مفتی صاحب کی طرف سے ہدایت ہوتی کہ میرے آنے کے بعد کوئی درسگاہ میں نہ آئے لیکن اکثر دوسری درسگاہوں کے طلبہ جن کا یہاں درس مکمل ہو جاتا یا جن کی گھنٹیاں خالی ہوتیں، چپکے سے شامل درس ہو جاتے۔ مفتی صاحب کا انداز تدریس یہ تھا کہ بہت ہی مرتب انداز میں پہلے احادیث سے متعلق مسائل ومفاہیم کی تشریح میں

تفصیلی گفتگوفرماتے ،اوراس کے بعد حدیث نبوی پڑھی جاتی تو سارے معانی ومطالب بالکل واضح ہوجاتے ،اور اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ انداز تشریح سال کے شروع سے آخر تک یکساں رہتا جتنی بھرپور اور دلیل گفتگو سال کے ابتدائی ایام میں ہوتی اتنی ہی محقق ومدلل تشریح آخری سبق تک جاری رہتی۔

وہ وقت کے بڑے پابند تھے،کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا،ادھر وقت شروع ہوتا اور اُدھر مفتی صاحب سادگی کا مجسمہ بنے ہوئے رکشے سے اترتے ہوئے دکھائی دیتے، یہی وجہ تھی کہ ان کے وقت میں بڑی برکت تھی، خاصی طویل اور تفصیلی گفتگو کے بعد بھی بخاری شریف جلداول بروقت مکمل ہوجاتی۔

طبیعت میں اعتدال ان کی شخصیت کا ایک بہت ہی خوبصورت اور سبق آموز پہلو تھا، بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں مفتی صاحب کی رائے دیگر اصحاب علوم وفنون سے مختلف تھی، وہ ہمیشہ اپنی رائے کو بہت ہی ٹھوس اور مضبوط دلائل کے ساتھ پیش فرماتے لیکن کبھی اپنی رائے پر اصرار بھی نہ فرماتے کہ بس یہی بات قبول کی جائے اور اس کے علاوہ تمام آراء مسترد کردی جائیں۔

دوران درس بہت سی نصیحتیں اور زندگی بھر کام آنے والی باتیں مفتی صاحب وقتاً فوقتاً بتایا کرتے تھے،مطالعہ کی کثرت اور خصوصاً عربی کتابوں سے براہ راست استفادہ کرنے کی بہت زیادہ تاکید کیا کرتے تھے، خصوصا جس دن بخاری شریف کا آخری سبق پڑھاتے اس دن یہ نصیحت ضرور فرماتے کہ پہلی وی جو نازل کی ہے اس میں دوبار اقرأ (یعنی پڑھیے) آیا ہے،فرمایا کرتے کہ پہلا اقرأ ناخواندہ کے لئے ہے،یعنی جب یہ آیت نازل ہوئی اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الإنسان من علق۔ تب تک اللہ کے نبی ﷺ ناخواندہ تھے،تب تک آپ نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا، دوسرا اقرأ خواندہ (پڑھے لکھوں) کے لئے ہے،یعنی جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اقرأ وربك الأكرم ۔تب تک آپ قرآن مجید کی دو آیتیں پڑھ چکے تھے،اس کے بعد مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ زندگی کے آٹھ نو سال جو آپ نے اب تک تعلیم حاصل کی وہ پہلا اقرأ تھا، اس سے آپ کے اندر پڑھنے کی

صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، اب وقت آیا ہے دوسرے اقرأ کا جو پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ہے اور اس پر عمل کرنے کے لئے پوری زندگی ہے، تا عمر اب علم حاصل کرنا ہے۔۔۔۔۔اس کے علاوہ مفتی صاحب کا معمول تھا کہ اس آخری درس میں طلبہ سے وعدہ لیا کرتے تھے کہ زندگی بھر اس دین پر قائم رہیں گے، اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے خود کو دین کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گے۔

اللہ تعالی حضرت الاستاذ کی حسنات و خدمات کو قبول فرمائے، انھیں قرب کا اعلی مقام عطا فرمائے اور ہماری زندگی کو اس راستے کے لئے قبول فرمائے۔ ہمیں ان کے علوم کا وارث بنائے، اور وقت کے اکابر و مشائخ کا ان کی زندگی ہی میں قدر دان بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

❁...❁...❁

سعادتوں کا گنجینہ ومحور تھے حضرت الاستاذ مفتی سعیدؒ

مولانا محمد سلمان الخیر نعیمی قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم وقف شاہ بہلول سہارنپور

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

بروز منگل ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء صبح ساڑھے چھ بجے محدث جلیل، مفسر نبیل ،فقیہ ممتاز، عالم ربانی، مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ علوم کا مستند شارح اور مسلک دارالعلوم دیوبند کا صحیح ترجمان، حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ شیخ الحدیث و صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند نے ممبئی شہر کے ایک ہسپتال میں تقریباً اسی (۸۰) سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا، اناللہ و انا الیہ راجعون ، ان للہ ما اخذ و لہ مااعطی و کل شیء عندہ باجل مسمی فلتصبر ولتحسب۔اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد ونقہ من الخطایا کمانقیت الثوب الابیض من الدنس وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ وزوجا خیرا من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر و من عذاب النار۔

یہ ایک سو فیصد مبنی بر حقیقت بات ہے کہ قسام ازل نے دست اجل کو جو کام سونپا تھا اس پر صد فیصد عمل کے نمونے ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں، ہنستی، کھیلتی، مسکراتی بستیاں سکڑتی، سمٹتی اور اُجڑتی نظر آتی ہیں، کل تک جن گھروں اور گھرانوں میں چراغاں تھا، انسانیت کا بول بالا تھا، آج وہاں حیوانیت کا منظر نظر آتا ہے، کل تک جن گلوں سے خوشبو کا احساس ہوتا تھا آج وہاں نہ ہی گل ہیں نہ خوشبو، بس خار ہی خار نظر آتے ہیں اور اَب خاروں سے

اُلجھ کر خوار ہونا ہمارا مقدر بن چکا ہے، جو تہذیب وتمدن مشرقی کہلاتا تھا وہ تہذیب اور تمدن خود پر آنسو بہا رہا ہے ،کل تک جن ہستیوں کو اپنا متاعِ گرانمایہ تصور کرتے تھے آہ! کہ آج وہی ہستیاں کئی من مٹی کے نیچے محوخواب ہیں۔

جانا تو سبھی کو ہے ، یہاں آنا ہی جانے کی تمہید ہے ؛لیکن کیا بتاؤں کہ ہر ایک کا جانا جانا نہیں ہوتا، ایسی شخصیات صدیوں میں وجود میں آتی ہیں جن کا جانا ہی حقیقی جانا ہوتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

انسان وہی ہے جس کی ذات سے دوسرے فیضیاب ہوں ،**خیر الناس من ینفع الناس** کا مزاج ہو،**خیر کم خیر کم لاھلہ** کا مصداق ہو،حیا اور شرافت کا پتلا ،تقویٰ اور تہذیب کا خوگر ،قناعت اور زہد کا راہی ،عبادت اور ریاضت کا سپاہی ،دن کا عابد اور رات کا مجاہد،مسند درس کا محدث ،مسند سلوک کا مربی ،گھر میں شفیق اور باہری دنیا میں غمخوار ہو۔وہی حقیقی انسان کہلاتا ہے، مجھے کہنے دیجیے:

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

مگر آہ! نیک اور نیکوں سے یہ دنیا بڑی تیزی کے ساتھ خالی ہو رہی ہے، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ انسان جانے سے پہلے اپنا صحیح اور سچا جانشین تیار کر جائے جو اس کے لگائے ہوئے پودوں کی دیکھ ریکھ کر سکے، ان کی آبیاری اور آب پاشی کر سکے، ان کے نوک و پلک کو سدھارا اور سنوار سکے۔

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک شور تھا غل تھا
جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

آج ہمیں ایسے ہی حالات کا شکار ہونا پڑ رہا ہے، بہاروں پر خزاؤں کی حکمرانی قائم ہوچکی ہے، انسانیت نے شرافت کا لبادہ اُوڑھ کر چادر تان لی ہے ، دین اور ہدایت کے ٹمٹماتے چراغوں کی روشنی مدھم پڑتی جاتی ہے ،شیطان اوراس کے کارندے عصیان وطغیان کی آندھیوں کو ہوا دے رہے ہیں ، ہمارے گناہوں کی نحوست نے ہمیں قعر مذلت میں پھینک دیا ہے، فسق وفجور اور عشق وفتور کے چکر میں پوری دنیا نے اللہ احکم الحاکمین سے بغاوت کردی ہے ، جب حالات ایسے ہوں تو سلیم الطبع لوگوں کا دَم گھٹنا یقینی ہے ،فطرت سلیم اور طبع مستقیم لوگوں کا جینا دوبھر ہوجاتا ہے، ایسے وقت میں ایسی صحبتوں سے بچنا اور ایسی دنیا سے کوچ کر جانے ہی میں عافیت محسوس ہوتی ہے ۔ ہمارے مربی وکرم فرما استاذ محترم جامع العلوم والفنون محدث کبیر فقیہ نبیل حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ بھی ان ہی اصحاب ِعلم وفضل میں سے تھے جن پر دنیا کو ناز تھا ،جن کی صحبتیں ،جن کی مجلسیں ،جن کی صفات اورخوبیاں اس لائق تھیں کہ ان کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنایا جاتا مگر افسوس! یہاں شخصیات کے چلے جانے کے بعد کف افسوس ملنے کا ایک عام مزاج بن چکا ہے، جب تک شخصیات موجود ہوتی ہیں تب تک ہم ان سے کچھ حاصل کرنے میں لیت ولعل ،حیل وحجت اور تاخیر وتعویق سے کام لیتے ہیں اور بعد میں کف افسوس ملتے ہیں ۔

۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل ہمارے لیے نہایت ہی حرماں نصیبی کا دن ہے، کیونکہ اس دن میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے فرزندار جمند اور قابل فخر سپوت حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نوراللہ مرقدہ وبرد مضجعہٗ بھی عاصی وطاغی اور سرکش ونافرمان دنیا سے رخ موڑ کر مولائے حقیقی کے پاس یہ کہتے ہوئے تشریف لے گئے ۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

نظام عالم میں اقوام عالم نے اپنے اپنے مذہب وادیان کی بہت سی تاریخوں کو زندہ وجاوید بنانے کے لیے

تعطیلات کا اعلان کیا ہوا ہے، مگر اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا؛ کیونکہ اسلام ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم کسی شخصیت کی جدائی اور کسی ہستی کی مرگ ناگہانی پر کف افسوس ملنے کے بجائے ان کی تعلیمات کو زندہ، ان کے افکار عالیہ کو تابندہ، ان کے اقوال وفرمودات کو جاوید، ان کے احساسات کو دوام اور ان کے تحریکی امور کو مکمل کر کے صحیح معنوں میں خراج عقیدت پیش کریں، صرف رونا اور آنسو بہانا ہماری فطرت نہیں ہے، اشک افشانی کا سبق ہمارے بڑوں نے ہمیں دیا ہی نہیں ہے، آہ وبکا اور گریہ وزاری تو مردہ قوموں اور فرسودہ لوگوں کا کام ہے ہم ایسے وقت میں وہی کریں گے جس کی تعلیم ہمارے بڑوں نے دی ہے۔

سیدنا و وسیلتنا الی اللہ شیخ الحدیث حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد علیہ الرحمہ کا اس طرح اچانک جانا ایک ہستی کا جانا نہیں ہے ایک عہد کا خاتمہ اور کئی صدیوں کا نقصان ہے، وہ صرف عالم جلیل ہی نہ تھے اسلام کے بطل جلیل بھی تھے، وہ صرف ایک مشفق استاذ، کریم مربی اور صالح انسان ہی نہیں تھے بلکہ علوم وفنون بالخصوص حدیث نبوی کے علوم ومعارف کے گنجینہ وخزینہ تھے، حدیث کے حقائق ودقائق ان کے سینہ وسفینہ میں مثل نگینہ جڑے ہوئے تھے۔ ان کے افکار واحساسات کی رنگینیوں سے ایک عالم فیضیاب اور راہ یاب تھا، ان کے طریق اور طریقت سے خدا جانے کتنے گم راہ لوگوں کو راہ راست نصیب ہوئی، کتنے اندھیرے دور اور کتنی تاریکیاں کافور ہوئیں، ان کی علمی نکہتوں، ان کی فکری نزہتوں، ان کی علمی بصیرتوں، ان کی خداداد صلاحیتوں، ان کی عدیم النظیر صالحیتوں، ان کی مرصع صلاحیتوں اور ان کے اولوالعزم کارناموں کو چند صفحات میں سمیٹنا اور سمونا مشکل ہے۔

وہ ایک بحر ناپیدا کنار سمندر تھے، جس میں غواصی کرنے والوں کو لعل وجواہر بھی ملتے تھے، قیمتی دھاتیں اور کارآمد اشیاء بھی ملتی تھیں، متلاشیان حق کو حق کی وادیاں بھی ملتی تھیں، شیدائیان علم کو علم کی تابناک منزلوں کا سراغ بھی ملتا تھا، کھوئے ہوئے، لٹے ہوئے، مٹے ہوئے، پٹے ہوئے افراد وہاں پہنچ کر گرانمایہ سرمایہ پا جاتے تھے

۔سکون قلب کی خاطر ان کی خدمت میں پہنچنے والے لوگوں کو طمانینت قلب حاصل ہوجاتا تھا، ڈاکٹروں کے در، عاملوں کے گھر، وکیلوں کے دفتر، تھانوں کے چکر ان تمام چیزوں میں الجھے ہوئے لوگ بھی آپ کی خدمت میں پہنچ کر اپنے مسائل بتا کر طالبِ دعا ہوتے تھے اور پھر جب حضرت الاستاذؒ کے دست مبارک اللہ احکم الحاکمین کے آگے اٹھتے تھے تو پھر قول رسول اللہ کی پوری ترجمانی ہوتی تھی **لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لأَبَرَّہٗ**۔

اب یہ تو تقدیر کی بات ہے کہ جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے اسی مقدار میں چیز ملتی ہے، بہتوں نے حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ سے بہت کچھ حاصل کیا اور کامیاب و بامراد ہوگئے اور بہتوں نے دریا میں کھڑے ہوکر پانی کو تلاش کیا اور ناکام ونامراد ہوگئے۔ کرم کے جھونکے چلتے ہیں، رحمت کی بارش ہوتی ہے، سخاوت کی بہاریں آتی ہیں، اور قول نبی: **ان لربکم فی أیام دهر کم نفحات**۔ اے لوگو! تمہارے ایام زمانہ میں حق تعالیٰ کی طرف سے کرم کے جھونکے، نسیم ہدایت کی باد صرصر، باد صبا کی ٹھنڈک اور عنایات کی بارشیں چلتی ہیں۔

وہ مادر علمی ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں قریب نصف صدی تک مختلف علوم وفنون کی کامیاب تدریس اور اب آخر میں پورے طور پر اُصح الکتب بعد کتاب اللہ کی تعلیم وتبلیغ اور تدریس وتشریح کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور اس طرح قول نبی: **نضر اللہ امرأ سمع مقالتي فوعاها و حفظها و بلغها** پر پورے طور پر عامل رہے، الحمدللہ وہ درسِ حدیث دیتے دیتے حدیث کے رنگ میں رنگ گئے تھے، انہیں سیرتِ نبی پورے طور پر مستحضر ہوگئی تھی، نبی اکا جمال، نبی اکا جلال، نبی اکا کمال، نبی اکے اقوال، نبی اکی حسب بیان محدثین منشاء اور مراد سب کچھ ان کے لیے سامنے کی چیز بن چکا تھا، جیسا کہ ان سے قرب وتعلق رکھنے والے اور اُن کے پر مغز مواعظ وخطابات اور درس سننے والے حضرات اُن کی اس ادا وامتیاز سے بخوبی واقف ہیں۔

وہ بات بات میں حدیث کی باتیں بتاتے تھے، نبی کے طریقے بتاتے تھے، سیرت کا خلاصہ کرتے تھے، صحابہ کے والہانہ تذکرے کرتے تھے، اصحابِ رسول کی باتیں اور ان کے اثر سے قیمتی باتیں نکالتے تھے، تابعین

وائمہ دین، فقہاء ومحدثین اوران کے بعد والوں کے ذکر خیر میں ادب اوراحترام کی پوری رعایت رکھتے تھے،غیبت سے بچنا اورلغویات سے احترازان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی ، نہ توخود غیبت کرتے تھے نہ ہی سننا پسند کرتے تھے ، پھربھی اگرکوئی اس چکر میں پڑتا تو عجیب انداز میں بے اعتنائی ظاہر فرماتے تھے،قناعت پسند تھے،اوراپنی اولاد اور متعلقین ومحبین کوقناعت ہی کی تعلیم دیتے تھے،کئی دہائیاں جامعہ اسلامیہ میں تعلیم وتنظیم کے فرائض انجام دینے کے باوجود نظام مدرسہ،قوانین مدرسہ،ضوابط مدرسہ،مفاد مدرسہ،اورمزاج مدرسہ کی رعایت فرماتے تھے،بات بات میں درخواستیں گزارنا ان کی عادت نہیں تھی ،شکوہ وشکایت اورحرف وحکایت ان کی طبیعت نہیں تھی ، بڑوں کا احترام تو دنیا کرتی ہے لیکن آپؒ چھوٹوں کا بھی احترام کرتے تھے،ان کی عزلت نشینی،ان کی مصلحت پسندی،ان کی خلوت،ان کی جلوت ہر جگہ ایک خاص رنگ تھا جو ہمیشہ صاحبان عقل وخرد کونظر آتا تھا۔

بہرکیف حضرت کا سانحۂ ارتحال پوری قوم وملت کا عظیم خسارہ ہے،کیونکہ حضرت رحمہ اللہ قحط الرجال کے اس دور میں ایک ایسی شمع تھے جس کی روشنی سے نورانیت کا ماحول بنا ہوا تھا افسوس کہ اب وہ روشنی بھی نہ رہی،حضرت والا ہمارے درمیان سے چلے گئے لیکن ہمیں اس وہم میں مبتلا کر گئے ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

آپؒ ایک کامیاب محدث ومدرس،مصنف ومؤلف،شارح قرآن وحدیث،واعظ وخطیب یا باوقار صدر المدرسین ہی نہیں تھے؛ بلکہ ولیٔ کامل،عالم باعمل،مربی ومخلص،مونس وغمخوار،صاحب الرائے اورصائب الرائے انسان تھے،پوری عمر علم دین کی اشاعت وتبلیغ ،درس وتدریس،وعظ ونصیحت،تلقین وارشاد،ہمدردانہ وخیرخواہانہ انداز میں اُمت کی دنیوی واُخروی فلاح وبہبود کی فکروکوشش،خردوں کی حوصلہ افزائی،خردنوازی اورقوم وملت کی خدمت میں گزاری،جواس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی تھا،کیونکہ ان کارہائے خیر کی سعادت

اللہ تعالیٰ ہر ایک کو نہیں دیا کرتے، یہ وہ سعادت ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

ارتجالاً یہ سطور قلم بند کر دی ہیں ورنہ حضرت کی ذات گرامی ایسی نہیں ہے کہ ان کے لیے چند صفحات پر اپنا دردِ دل لکھا جائے اس کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ ؎

جلا کر شمع پروانے کو ساری عمر روتی ہے
اور اپنی جان دے کر چین سے سوتا ہے پروانہ

بڑے کاموں کے لیے لائق لوگوں کا ہی انتخاب کیا جاتا ہے۔

بلبل کو دیا نالہ پروانے کو دیا جلنا
غم ہم کو دیا مشکل سب سے جو نظر آیا

میں حضرت والا رحمہ اللہ کے پسماندگان بالخصوص صاحب زادگان و اہل خانہ سے اظہارِ تعزیت نہیں کر سکتا، کیونکہ آپ حضرات کے والد ماجد میرے بڑے ہی کرم فرما، حوصلہ نواز، خرد نواز اور سب سے بڑھ کر میرے بخاری شریف کے محبوب استاذ تھے، اس تعلق سے وہ گویا میرے روحانی والد بھی ہوئے، بہر حال تعزیت تو دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں، اس لیے میں خود کو مستحق تعزیت تصور کرتا ہوں اور اپنے دل بے قرار کو روم کے عارف مولانا کی زبان میں قرار دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ ؎

اولیاء را چوں بوصل افتد نظر
داں کی ایشاں را اجل باشد شکر

اولیاء اللہ چونکہ موت کو محبوب حقیقی کی ملاقات و دیدار کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس لیے ان کے لیے موت شکر کی طرح شیریں ہوتی ہے۔

جاں مجرد گشتہ از غوغائے تن
می پرد با پر دل بے پائے تن

عارف کی جان جسم کے حواس خمسہ ظاہرہ وباطنہ کے ہنگاموں سے آزاد ہوکر دل کے پر سے حق تعالیٰ کی طرف ہرلحظہ اُڑتی رہتی ہے بغیر جسم کے پاؤں کے۔

حضرت والا رحمہ اللہ کا وصال خود ان کے لیے تو رحمت ہے؛ کیونکہ ان حضرات کا دیدار الٰہی کا شوق پورا ہوا لیکن ہم حرماں نصیبوں کے لیے بڑا نقصان اور نا قابل تلافی خسران ہے کیونکہ یہ سب ہمارے اعمال کی نحوستوں کے باعث ہوا ہے۔

اے دریغا! اے دریغا! اے دریغ!
کاں چناں ماہے نہاں شد زیر میغ

اللہ تعالیٰ حضرت والا کے درجات عالی فرمائے، اعلیٰ علیین میں اپنا جوارِ خاص عطا فرمائے، پسماندگان کو صبر واجر نصیب فرمائے، حضرتؒ کی اس اچانک رَحلت سے ملتِ اسلامیہ بالخصوص مادر علمی دار العلوم دیوبند میں جو عظیم خلا پیدا ہوا اللہ تعالیٰ مادر علمی کو اس کا بدل نصیب فرمائے، اور ہم سب کو حضرتؒ کے نقوشِ خیر اور محاسن ومحامد کو حرزِ جان بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

لئن کان هذا الدمع يجری صبابة
علی غير سعدی فهو دمع مضيع

❁…❁…❁

قافلہ علم وعمل کا ایک اور درخشاں ستارہ غروب

معدن علم وبصیرت، فقیہ النفس، محدث کبیر دار العلوم دیو بند

مولانا محمد طفیل ندوی
جنرل سکیٹری امام الہند فاؤنڈیشن، ممبئی

رنج وغم زندگی کا حصہ ہے ہر خوشی کے بعد غم ہے، حیات ممات کا پیش خیمہ ہے، نور کے بعد ظلمت، ظلمت کے بعد روشنی، خوشیوں کیساتھ آنسو اور آنسو کیساتھ خوشی ومسرت کے قہقہے یہی تو زندگی ہے اور اسی زندگی کے خاتمہ کا نام ''موت'' ہے یہ بات مسلم ہے کہ یہ دنیا چل چلاؤ کا نام ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دوام اور قرار تو صرف اللہ رب العزت کو حاصل ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ رب العزت کی ذات مقدس کے سوا ہر چیز پر فنائیت طاری ہوگی جس کے بارے میں قرآن مقدس کے اندر ارشاد ہے ''کل نفس ذائقة الموت'' لیکن کیا کیجئے انسانی طبیعت کا کہ اسے جب بھی کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو اس کا دل روتا ہے یہ جاننے کے باوجود کہ سفر کتنا ہی آرام دہ کیوں نہ ہو اس کی ایک منزل یقینی ہے اس یقین کے باوجود کہ جس شخص نے خدائی اسٹیشن سے جہاں اور جتنے کا ٹکٹ حاصل کیا ہے اس منزل کے آتے ہی ٹکٹ اپنی حیثیت کھو دیتا ہے مگر دوران سفر بعض مسافر اپنے کردار وعمل سے ایسی چھاپ اور اپنی شخصیت کا ایسا اثر چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کی جدائی سے دل کو کرب کا احساس ہوتا ہے لیکن وفور محبت میں کوئی بھی مسافر ایسا نہیں ہوتا جو خلیق وملنسار اور نیک طینت مسافر کیساتھ اپنے سفر اور اپنی منزل کے آنے سے پہلے اتر جائے ہر شخص کو اپنی زندگی کی آخری سانس تک جینا ہے اور ہر کسی کو اپنی منزل تک پہونچ کر سواری سے اترنا ہے لیکن خدا جانے ان آنکھوں کو کرب وبلا کے کتنے مناظر دیکھنے مقدر ہیں افکا وحوادث کے کتنے

سین دیکھ چکی لیکن زندگی میں جب بھی کوئی ایسا لمحہ آیا کہ جب کسی برگزیدہ شخصیت نے اپنا بوریہ بستر لپیٹا ،دنیا اور دنیاوی چیزوں سے رخ موڑا تو احساس زیاں کی چنگاریوں نے نہاں خانہ دل کو بے چین و بے کل کر دیا معدن علم وبصیرت ،تعلیم وتربیت کا نگہبان ،فقہ اسلامی کا شناور، تحقیق وتصنیف کا مہر منیر، شعور وآگہی کا پیکر جمیل ،رئیس المحدثین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ نے اپنی عمر طبعی گذار کر تقریبا ۸۰ سال کی عمر میں ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح کے اولین ساعتوں میں اس دار فانی سے ہمیشہ ہمیش کیلئے آنکھیں موندلیں ”اناللہ وانا الیہ راجعون“

اے فرشتہ اجل ! کیاخوب تیری پسند ہے
پھول تونے وہ چنا جو گلشن کو ویران کرگیا

حقیقت یہ ہے کہ بعض آفاقی شخصیات ایسی ہوتی ہیں، جو چرخ کے ہزاروں گردشوں کے بعد جنم لیتی ہیں اور چشم فلک جن کا صدیوں اور سالوں انتظار کرتی ہیں وقت قدم قدم پرر ک کر اور سنبھل کر ایسے افراد کو بناتا ہے ،سنوارتا ہے اور تراشتا ہے تب کہیں جا کر ایک گوہر نایاب اور مرد کامل جنم لیتا ہے، بلاشبہ حضرت مفتی صاحبؒ ایسی ہی عالمی شخصیات میں سے تھے وہ بیک وقت فقیہ بھی تھے اور محدث کبیر بھی، بے مثال خطیب بھی تھے اور شیریں گفتار عالم دین بھی بلکہ یوں کہیے کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اللہ رب العزت حضرتؒ کے تمام نیک کاموں کو قبول فرمائیں ،روح کو سکون واطمینان بخشیں اور جنت الفردوس کی بہاروں سے پوری طرح سرفراز فرمائیں۔

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

حضرت مفتی صاحبؒ کی ولادت باسعادت ۱۹۴۰ء کالیڑہ ،شمالی گجرات (پالنپور) میں ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے وطن گجرات میں حاصل کی جب آپ کی عمر تقریبا ۵ یا ۶ سال کی تھی تو والد محترم نے آپ کی تعلیم

کا آغاز فرمایا لیکن والد محترم کھیتی وغیرہ کے کاموں میں مصروف رہتے جس کی وجہ سے خاطر خواہ توجہ نہ دے سکیں اسلئے آپ کو مکتب میں بٹھادیا جہاں ناظرہ ودینیات کی تعلیم حاصل کی پھر اپنے ماموحضرت مولانا عبدالرحمن صاحب شیرا کے ہمراہ دارالعلوم چھاپی چلے گئے جہاں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اس کے بعد مصلح امت حضرت مولانا نذیر میاں صاحبؒ پالنپور کے مدرسہ میں جو پالنپور شہر میں واقع ہے داخلہ لیا اور چار سال تک حضرت مولانا مفتی محمد اکبر میاں صاحب پالنپوریؒ اور حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاریؒ سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں پھر ۱۳۷۷ھ میں مظاہرالعلوم سہارنپور میں داخلہ لے کر حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جمویؒ سے نحو، منطق وفلسفہ کی بیشتر کتابیں پڑھیں نیز حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوریؒ حضرت مولانا یحی صاحب سہارنپوریؒ اور حضرت مولانا وقار صاحب بجنوریؒ سے بھی چند کتابیں پڑھیں بعد ازاں ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں فقہ، حدیث، تفسیر ودیگر علوم وفنون کی اعلی تعلیم حاصل کرنے کیلئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور سال اول حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلند شہریؒ سے تفسیر جلالین مع فوز الکبیر حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندیؒ سے ہدایہ اولین وغیرہ پڑھیں ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں دورہ حدیث شریف سے سالانہ امتحان میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہو کر فارغ ہوئے مزید تعلیم کیلئے شعبہ افتاء میں داخل ہوئے اور فتاوی نویسی کی تربیت حاصل کی جس کے بعد آپ کے فقہی ذوق میں چار چاند لگ گئے جن حضرات اکابر کے سامنے زانوئے تلمذ طے فرمایا ان میں حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندیؒ، حضرت عبدالجلیل صاحب کیرانویؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا فخرالحسن صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ، شیخ محمود عبدالوہاب صاحب مصریؒ ودیگر اساتذہ کرام قابل ذکر ہیں۔

تکمیل افتاء کے بعد ۱۳۸۴ھ میں حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ کے توسط سے آپ کا تقرر دارالعلوم

اشرفیہ راندیر سورت میں درجات علیا کے استاد کی حیثیت سے ہوا یہاں تقریباً دس سال تدریسی خدمات انجام دیتے رہے پھر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے معزز رکن حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی تجویز پر ۱۳۹۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کے مسند درس وتدریس کیلئے آپ کا انتخاب کیا گیا آپ مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھانے کیساتھ برسوں ترمذی شریف جلد اول اور طحاوی شریف کے اسباق آپ سے متعلق رہیں، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدرالمدرسین حضرت مولانا نصیراحمد خاں صاحبؒ کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء میں بخاری شریف کا درس آپ کے سپرد کیا گیا اور شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے جس کو آخری وقت تک بحسن خوبی انجام دیتے رہے اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ مختلف اسلامی علوم کے بحر بیکراں تھے لیکن علم حدیث وفقہ میں تدریس کا جو سلیقہ اور اس فن پر جو مہارت آپ کو خزانہ قدرت سے ودیعت ہوئی تھی بہت کم خادم حدیث کی خدمت میں آئی ہوگی بہت خوبصورتی کیساتھ جامع اور مختصر انداز میں حدیث کا مفہوم سمجھا کر طلباء کو مطمئن کر دینا آپ کیلئے کوئی بڑی بات نہیں تھی اللہ نے آپ کو وہ صلاحیت عطا کی تھی جس سے اپنے افکار وخیالات کو طلباء تک منتقل کر دینے کی پوری مہارت تامہ حاصل تھی اور دوران درس بڑی خوبی اور اعتمادی کیساتھ حال و مستقبل کا آئینہ دکھا کر تعلیم وتربیت کے ایسے اشارے فرماتے کہ طلباء کے ذہن ودماغ پر نقش ہوجاتا جس سے ان کا دل بے حد مسرور ہوجایا کرتا اور چہرے پر بشاشت ٹپکنے لگتی کیوں کہ آپ کا اسلوب تدریس بڑا ہی دلکش اور دلکو بھا جانیوالا ہوا کرتا تھا آپ بولتے تو یوں لگتا جیسے آبشار بہہ رہے ہوں تلفظ کی ادائیگی میں خوبصورتی ، عام فہم باتوں میں معلومات کا سمندر، کسل مندی پر برمحل ڈانٹ ڈپٹ آپ کی نمایاں خصوصیات میں سے تھیں۔

جس کے کردار سے آتی ہو صداقت کی خوشبو
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

آپؒ نے نہایت جفاکش اور سادہ طبیعت پائی تھی کھانا لباس اور سواری ہر ایک میں سادگی ملحوظ رہتی تھی، عام

محفلوں میں بیٹھنا اور اضاعت وقت کرنا آپ کی طبیعت کے بالکل خلاف تھا حضرت کی طبیعت میں درس وتدریس کیساتھ تصنیف وتالیف کا بڑا مادہ تھا گویا آپ اس میدان کے بھی بہترین شہسوار تھے اسلئے آپ کے نوک قلم سے کئی کتابیں منظر عام پر آئیں خاص طور پر درسی کتابوں کی شروحات جو علمی مواد اور تحقیقی بنیاد پر علمی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کی اسی طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ''امداد الفتاوی'' پر آپ نے گراں قدر حاشیہ بھی تحریر فرمایا آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین، کتب بینی، اور محنت کے عادی تھے اپنی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے مختلف علوم وفنون اور خاص طور پر فقہ اور حدیث میں ممتاز جانے جاتے تھے، فقہی سیمناروں میں آپ کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی، فقہی باریکیوں کی طرف اشارہ فرماتے اور آپ کے مقالے کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا آپ کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند شرمتی پرتبھا پاٹل کے ہاتھوں آپ کو قیمتی ایوارڈ کے ذریعے نوازا گیا۔

حضرت عرصہ دراز سے علیل چل رہے تھے لیکن ضعف علالت کے باوجود اپنی غیر معمولی ہمت اور قوت ایمانی سے کام لے کر اپنے آپ کو متحرک اور فعال بنائے رکھتے تھے مگر صحت کے انحطاط کو دیکھتے ہوئے یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ کسی بھی وقت داغ مفارقت دے سکتا ہے جسکی چند جھلکیاں وقتاً فوقتاً محسوس ہوتی رہی ابھی حالیہ ختم بخاری شریف کے وقت اپنی گفتگو سے قبل زور زور سے دہاڑے مار کر رونے لگے اپنے استاد کو یوں دیکھ کر طلباء اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکیں اور یوں پورے دارالحدیث میں رونے کا سماں بندھ گیا ہر شخص آبدیدہ ہوگیا چند منٹوں بعد حضرت کو پانی دیا گیا جس کے بعد کچھ بولنے کی کوشش کی تو ایسا لگا جیسے الفاظ غائب ہوگئے ہوں، کئی مرتبہ بولنے کی کوشش کی مگر نہ بول سکے لیکن حضرت کی زبان سے جو جملہ نکلا وہ تھا ''اب جو اللہ چاہے گا وہ ہوگا'' یہ جملہ تین مرتبہ فرمایا اور مسند سے نیچے اتر گئے طلباء کیلئے یہ منظر عجیب تھا تمام طلباء حضرتؒ کے احترام میں کھڑے ہوگئے اور حضرتؒ ہاتھ ہلاتے ہوئے طلباء کو سلام کر کے رخصت ہوگئے اور یہ شائد دارالعلوم کی تاریخ میں

پہلی مرتبہ بغیر دعا کے مجلس اختتام پذیر ہوگئی ۔حضرتؒ زمانے سے شوگر کے مریض تھے اور سن وسال کیساتھ ساتھیکے بعد دیگرے بڑھتے گئے ابھی چند سالوں سے مختلف امراض نے مزید بال و پر نکال لئے تھے وقفہ وقفہ سے حضرتؒ پر مرض کا شدید حملہ ہوتا رہا اور طرح طرح کی پیچیدگیاں اور نئے نئے عوارض نمودار ہوتے گئے مرض نے طول پکڑا تو ایمرجینسی وارڈ کے خصوصی دیکھ ریکھ والے کمرے میں رکھا گیا خویش واقارب ،خدام اور احباب ومتعلقین نے دیکھ ریکھ میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہرح کی کوششیں کی لیکن ۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بالآخر یہ حادثہ فاجعہ ایسے وقت میں پیش آ گیا جس وقت پوری دنیا قید وبند میں ہیں اسلئے حضرت کے احباب ومتعلقین ،مریدین اور تلامذہ کو نہ عیادت کرنے کا موقع ملا اور نہ ہی جنازے میں شرکت کا حضرتؒ بغرض علاج شہر ممبئی میں مقیم تھے ملاڈ کے سنجیونی ہاسپٹل میں صبر آزما علالت کے بعد آخری سانس لے کر اپنے رب حقیقی سے جا ملے اور عقیدتمندوں نے اپنی نم آنکھوں کیساتھ جوگیشوری ممبئی اوشیوارہ قبرستان میں آغوش لحد کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرتؒ اسلاف کے اس قافلے سے تعلق رکھتے تھے جن کی زندگیاں قوم وملک ،دین وملت کی ہمہ وقت خدمت کیلئے وقف تو تھی ہی مگر اسی کیساتھ وقت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کا مینارہ بھی بنی ہوئی تھیں لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ موت سے کسی کو رستگاری نہیں ۔

کریں کیا اپنی ہستی کا یقیں ہم
ابھی سب کچھ ابھی کچھ بھی نہیں ہم

آگے پیچھے سب کو جانا ہے اس جہان فانی میں جو بھی آیا وہ اپنی متعینہ بہاریں دیکھ کر جہان باقی کی طرف رخصت ہو گیا اسلئے کہ آنیوالوں کی آخری منزل قبر ہے۔

دنیا کے اے مسافر منزل تیری قبر ہے

یقیناً حضرت مفتی صاحبؒ ہم سب سے جدا ہو گئے مگر حضرت کی خدمات کا نقش جمیل ناقابل فراموش ہیں

گوناگوں اس فتنے کے دور میں ان خدارسیدہ بزرگوں کا نفس وجود بھی امت کیلئے مجسم رحمت ہوتا ہے اور نہ جانے کتنے فتنوں کیلئے آڑ بنا رہتا ہے اسلئے حضرت کی وفات پوری امت کا ایسا خسارہ ہے جس کی تکمیل مشکل سے ہوسکتی ہے اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ حضرت کے درجات کو بلند فرمائیں، تمام احباب و متعلقین کو صبر جمیل عطا فرما کر امت مسلمہ کو حضرت کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

❁...❁...❁

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالنپوریؒ

بے نظیر طبیب الطلبہ اور صانع العلماء تھے

مولانا مفتی محمد معصوم احسان
مفتی ومحدث جامعہ دار المعارف الاسلامیہ، بنگلا دیش

آفتاب ہا گر دیدہ ام مہر بوتا ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام امّا تو چیزے دیگر یست

میرے والد صاحب شیخ الحدیث علامہ احسان الحق سندیپی (رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ)، جو شیخ الاسلام حسین احمد مدنی (رحمہ اللہ علیہ) کے شاگرد رشید اور علامہ انظر شاہ کشمیری (رحمہ اللہ علیہ) کے ہم سبق تھے، اور بنگلا دیش کے مشہور شیخ الحدیث تھے، انہوں نے اپنے والد ماجد (ہمارے دادا جان) جو کہ صرف بنگلا دیش کے نہیں، بلکہ پورے بنگال کے دو شیخ الحدیث میں سے شیخ ثانی شمار ہوتے ے، جن کا نام شیخ الحدیث علامہ عبد الودود سندیپی چاٹگامی (نوّر اللہ مرقدہ) تھا، انکی شان میں یہ اشعار پڑھا کرتے تھے، انکے علم وعمل، تقوی وطہارت اور اتباع سنت میں لا ثانی ہونے کی حیثیت سے، بندہ کو بھی بنگلا دیشی ہونے کی حیثیت سے، بنگلا دیش کے مشہور بڑے بڑے دو ادارے میں درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنے کی توفیق نصیب ہوئی، پہلا جامعہ حسینیہ عرض آباد، میر پور ،ڈھاکہ، جس کو بنگلا دیش میں علماء دیو بند کیلئے مقر اور قیام گاہ سمجھا جاتا ہے، دوسرا بنگلا دیش کے سب سے قدیم مشہور اور سب سے بڑی علمی درسگاہ الجامعہ الاھلیہ دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام، اسکے بعد اللہ تعالی نے اپنے خاص رحمت سے ہندوستان میں ازھر الہند (بلکہ از ہر سے برتر) دار العلوم دیو بند میں نہر قاسمی سے بلا واسطہ علم

الحدیث حاصل کرنے کے لئے بندہ کو طالب علم ہونے کا شرف عنایت فرمایا، پھر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں۔

ان چاروں اداروں میں کئی درجن اساتذۂ کرام کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا، جن میں محدث العصر، مفتی زمان وغیرہ بہت سارے علماء ہیں، ان کا احترام وقدر علی الرأس والعین ہیں، سب اساتذہ ہمارے اعتقاد میں سو فیصد نمبر حاصل کرنے والے ہیں، لیکن سب کو اگر سو فیصد نمبر مل جائے تو کوئی بھی نمبر اول نہیں ہوسکتا، اگر ممتحن کسی ایک کے جواب کو مستحسن سمجھ کر سو میں اگر ایک اضافی نمبر بڑھا دے، (جیسا کہ دار العلوم دیوبند اور اس کے مسلک پر چلنے والے اداروں میں اگلے زمانے میں کرتے تھے، اب بھی بہت ادارے کرتے ہیں) تو وہ طالب علم نمبر اول ہو جاتا ہے، ویسا ہی اللہ تعالی نے حضرت الاستاذ علامہ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (قدس سرہ) کو جن صفات و کمالات سے نوازا یہ سارے اکابرین علماء کرام کو حاصل ہیں، لیکن بعض صفات اور خصوصیات میں اللہ تعالی نے حضرت الاستاذ کو کچھ خصوصی نمبرات سے نوازا، اس لئے حضرت الاستاذ اپنے دور کے سارے علماء میں ممتاز فائق اور نمبر اول ہو کر بے نظیر ہو گئے، اس لئے بندہ بھی مذکورہ بالا کمالات کی پیش نظر حضرت الاستاذ کی شان میں یہ اشعار پڑھتا ہے۔

حضرت طبیب الطلبہ تھے

ہمارے بنگلا دیش کے اکثر طلبہ اور بندہ بھی بڑے بڑے ادارے میں دورۂ حدیث شریف پڑھ کر اور بہت ساتھی وفاق المدارس العربیہ بنگلا دیش جیسے تعلیمی بورڈوں کے ماتحت دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں ممتاز اور نمبر اول ہو کر شرف و برکت کیلئے دوبارہ دار العلوم دیوبند جا کر دورۂ حدیث کے شریکِ درس ہوتے تھے، دورۂ حدیث کی درسگاہ میں بیٹھنے کے بعد بالخصوص حضرت مفتی صاحب (قدس سرہ) کے درس میں تو کتاب میں بہت سارے مقام ایسے آتے ہیں کہ ان کا حل ہم نے پہلے کیا تھا، لیکن اب ان کی تقریر وتشریح سن کر لگتا تھا کہ پہلے نہیں، یہ مسئلہ ابھی ہم نے تشفی بخش طریقہ سے سمجھا ہیں، اصل بھی معلوم ہو گیا قاعدہ بھی سمجھ گئے۔

کامیاب ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جو نبض شناس ہو، مرض کی تشخیص کے ساتھ ساتھ دوا کی تعیین اور مقدار کی تحدید کر سکے۔ حضرت الاستاذ کو بھی یہ پتہ چل جاتا کہ طلبہ کو کون سا مقام مشکل رہ گیا؟ کون سے مسئلے میں وہ پھنسے ہوئے ہیں، کون مقام بغیر حل کے رہ گیا ہے؟ کس انداز سے اس کو حل کرانا ہے؟ اور اس کے لئے کتنی تفصیل کرنی ہے؟ تاکہ ”**لا یقل فیخل، ولا یطل فیمل**“ نہ ہو جائے، اور اس کے لئے کون سی مثال پیش کرنی چاہئے ان چیزوں میں حضرت الاستاذ لاثانی تھے، اور ان کی بتائی ہوئی مثالیں بھی بے نظیر ہوتی تھیں، ایک مثال سے بہت سارے مسائل حل ہو جاتے تھے، جیسے حاجی بہلول کا پاجامہ، علیگڑھی پرنسپل“ وغیرہ وغیرہ، حرمت مصاہرت کی بحث میں ایک مسئلہ ہے ”لبن الفحل“ بندہ جیسے طالب العلم اس جیسے نازک مسئلہ کو بے ذوق اور شرم کا مسئلہ ہونے کی وجہ سے زیادہ کچھ التفات نہیں کیا، اور سمجھ میں نہیں آیا تھا، بس سرسری عبارت سے ظاہری اور لفظی جو معنی و مطلب ہوسکتا ہے اتنے پر بس کیا، لیکن حضرت الاستاذ نے درس میں جیسی تفصیل وتشریح کی اس سے میرا ذہن کھل گیا، اور آج تک وہ مجھے یاد ہے، اور جو بھی کتاب حضرت پڑھاتے تھے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ ہم نئی کتاب پڑھ رہے ہیں، سبق بھی نیا، مسئلہ بھی نیا، بندہ تدریسی زمانہ میں سبق کے دوران طلبہ کے سامنے بہت مرتبہ بلا اختیار و بلا تکلف یہ بات کہہ چکا کہ اگر اب بھی میرے سامنے کوئی استاذ بخاری شریف کا درس دے اور حضرت الاستاذ پالنپوری صاحب اردو کا قاعدہ کا درس دیں تو بندہ اردو قاعدہ کے درس میں شریک ہوگا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ حضرت کے اس درس میں میرے لئے کوئی سبق آموز نکتہ اور کوئی قیمتی قاعدہ حاصل ہو جائے۔

ہم نے سن ۱۸/ ۱۴۱۷ھ، مطابق ۹۸/ ۱۹۹۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف پڑھا، اس وقت حضرت الاستاذ سے ہم نے ترمذی شریف جلد اول اور طحاوی شریف پڑھی، ترمذی شریف کو کیسے حل کرنا اور سمجھنا ہے، کتب صحاح ستہ کے سامنے طحاوی شریف کی کیا حیثیت اور اس کی کیا اہمیت ہے حضرت کی تقریر سے جتنا معلوم ہوا اس سے پہلے اس کا اندازہ بھی نہیں تھا، حضرت کے درس میں کبھی بھی اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی، جو بھی

کتاب ہواور جوبھی مسئلہ ہو، یہ مشہور بات ہے جوسب کومعلوم ہے،اس کی چند وجہ ہوسکتی ہے،اس میں اہم وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت الاستاذ جوبھی کتاب جتنے سال سے پڑھاتے تھے اس کونئی کتاب اور پہلی بار درس دینے کے تصور سے کتاب کوحل کر کے درس میں حاضر ہوکر طلبہ کے سامنے تقریر پیش کرتے تھے،اور یہ کتاب طلبہ کے لئے جیسی نئی ہونے کی حیثیت سے قابل توجہ ہے استاذ کے لئے بھی قابل توجہ ہے،ان کواس کتاب میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے پہلے استاذ کے اندر دلچسپی پیدا ہونی چاہئے ، حالانکہ بہت سارے مدرس ایسے ہیں کہ کوئی ایک کتاب اگر چندسال پڑھائے تواس کے بعدانکے اندرایک قسم کی اکتاہٹ پیدا ہوجاتی ہے،(کیونکہ اس کتاب کا ترجمہ تقریرسب کچھ مابین الشفتین ہوگیاہے) کتاب کوجلدی جلدی پڑھاکر ختم کردیتے ہیں،سبق توجہ سے نہیں سنتے اور ذہن سے یہ بات اوجھل ہوجاتی ہے کہ یہ کتاب ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ کے لئے نئی کتاب ہے، ان کے لئے یہ کتاب پہلی مرتبہ پڑھائی جارہی ہے،آہستہ آہستہ سمجھا کر پڑھانا ہے،یہ ان طلبہ کے حق میں بخاری شریف جیسی مشکل کتاب ہے اس انداز سے اس کو پڑھانا چاہئے تھا۔

حضرت مؤثراستاذ تھے

حضرت کی ایک بڑی خصوصیت جوکسی کرامت سے کم نہیں یہ ہے کہ حضرت کے درس میں بیٹھنے سے بیک وقت دو چیزیں حاصل ہوتی تھیں،علم کا شوق اورعمل کا جذبہ،حضرت جس انداز سے جوبھی بات فرماتے تھے اس انداز سے ہرایک کے ذہن میں کم وبیش اس کی ایک کیفیت طاری ہوجاتی تھی ،اب تو یہی کہنا ہے:

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

حضرت صانع العلماء تھے

علماء اساتذۂ مدرسین ماشاءاللہ بہت ہیں،لیکن صانع العلماء،شاگردساز بہت کم ہیں،آپ استاذ گر تھے،

آپ سے پڑھنے والے کیسے پڑھانا ہے وہ سیکھ جاتے تھے، خوش نصیب ہیں وہ تمام حضرات جن کو حضرت کے سامنے دوزانو بیٹھ کر عقیدت کے ساتھ تلمذی کا موقع ملا اور حضرت کے اسلوبِ درس کو اپنا سکے، فراغت کے بعد اپنے اپنے ادارے میں حضرت الاستاذ کی مثال بن کر مقبول عام استاذ ہونے کی سعادت نصیب ہوسکی، **ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.**

ہم کو درس وتدریس کی خدمت کے لیئے کونسا ادارہ انتخاب کرنا چاہیئے؟ حضرت الاستاذ مفتی صاحب (قدس سرہ) ایک مرتبہ بمبئی تشریف لے گئے اور وہاں مفکر اسلام حضرت علامہ سید ابوالحسن علی ندوی (نور اللہ مرقدہ) بھی تشریف فرما تھے، تو ایک موقع پر حضرت ندوی صاحب (نور اللہ مرقدہ) نے حضرت مفتی صاحب (قدس سرہ) کو کہا کہ: مفتی صاحب تم ہمارے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آجاؤ، حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: حضرت میں استخارہ اور غور وفکر کر کے آپ کو بتاؤنگا، حضرت مفتی صاحب اس وقت دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت (گجرات) میں تھے، حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ، غور وفکر کے بعد مجھے دو چیزیں ملی جو ندوہ جانے کیلئے آمدہ کرتی ہیں، اور تین چیزیں ملی جو جانے سے روکتی ہیں۔

آمدہ کرنے والی دو چیزیں: ایک شخصیت ابوالحسن علی ندوی یعنی اگر ندوہ رہوں تو ان سے بہت کچھ حاصل کرنے کا موقع مجھے ملیگا، دوسری چیز میں جس مدرسہ میں ہوں اس سے ندوہ بڑا، اور طلبہ استعداد میں اعلی ہیں، ان کو پڑھانے کے لیے مجھے بہت مطالعہ کرنا ہوگا، جس سے میرا بہت فائدہ ہوگا، (شاید حضرت الاستاذ کے ذہن میں ہوگا امام بخاری رحمہ اللہ کے مشہور قول جو اپنے شاگرد رشید امام ترمذی کو مخاطب کرئے فرمائے تھے: **استفدت منك مالم تستفد مني**) آخر حضرت الاستاذ کو ندوۃ العلماء میں جانا نہیں ہوا، کچھ دنوں کے بعد دارالعلوم دیوبند نے حضرت کو قبول کرلیا۔

اب آمدہ کرنے والی ان دو چیزوں نے بندہ کو بہت نفع پہنچایا الحمد اللہ، اور وہ یہ کہ بندہ ہندوستان میں طالب

علم کی زندگی ختم کر کے شعبۂ افتاء میں پڑھنے کے لئے دوبارہ الجامعہ الاسلامیہ دارالعلوم معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام (بنگلادیش) میں داخلہ لیا، افتاء کا نصاب دوسال کا تھا، سال ثانی ختم ہونے سے پہلے تین چار مدرسوں کی طرف سے تعلیمی خدمت کے لئے بندہ کو بلایا جارہا تھا، ان میں دو ادارے بڑے بڑے تھے ایک تو جہاں بندہ اب تک ہے وہ جامعہ دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام (بنگلادیش)، جس کو بنگلادیش میں علم الادب العربی کا مرکز سمجھا جاتا ہے، اور ایک دوسرا ادارہ جس کے ذمہ داروں نے بندہ کے پاس خبر بھیجی کہ ہم آپ کو دورۂ حدیث میں ترمذی شریف اول دیں گے، حالانکہ اب بندہ جہاں ہے وہاں دورۂ حدیث کی کوئی کتاب نہیں ملے گی، یہ پہلے ہی سے معلوم تھا، (بعد میں دیکھا گیا کہ بندہ کے ذمہ میں جلالین شریف ثلث اول اور مشکاۃ شریف ثانی کی تقسیم ہوئی) دوسری بات اس دوسرے ادارہ میں جو تنخواہ مجھے دی جائیگی وہ بھی مجھے سنائی گئی، اس وقت دارالمعارف میں تنخواہ نہایت کم ہوتی تھی، وہ بھی مجھے معلوم تھی، (جو بعد میں دیکھا گیا اس ادارہ کو تنخواہ کی مقدار دارالمعارف کی تنخواہ سے بالکل دوگنا تھی، دوگنا کے قریب نہیں بلکہ برابر دوگنا) لیکن الحمد اللہ حضرت الاستاذ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف آمدہ کرنے والی دو چیزیں بندہ کو یاد تھی، اور یہ دو چیزیں دارالمعارف میں بھی میرے لئے موجود ہیں، جو اس ادارے میں نہیں ہیں، ایک تو میرے والد صاحب کا وجود انکی خدمت کر کے دعا حاصل کرونگا، ان کے علوم و معارف سے مستفید ہونگا، جن کا تعارف ابتدائے تحریر میں آچکا ہے، اور ان کے ساتھ بنگلادیش کے مشہور عالم دین نصاب تعلیم اور عربی ادب کے مجدد، اور مفکر اسلام سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے خلیفہ بنگلادیش میں ندوی رحمہ اللہ کی مثال ومندوب جامعہ دارالمعارف الاسلامیہ کے بانی ومہتمم حضرت علامہ سلطان ذوق (حفظہ اللہ) کی شخصیت، ان دونوں بزرگوں سے میرے لئے سیکھنے کو بہت کچھ ملے گا، دوسری چیز کہ یہاں کے طلبہ بنسبت اس دوسرے مدرسہ کے تعداد میں زائد اور استعداد میں فائق ہیں،

اس لئے جامعہ دارالمعارف کو اختیار کیا، اور اس دوسرے ادارہ کے ذمہ داران کے پاس اعتذار کیا، الحمد للہ

اللہ تعالی کی خاص رحمت اور حضرت الاستاذ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی برکت اور والد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی دعا، حضرت ذوق صاحب (حفظہ اللہ) کی شفقت، اور حضرت نائب مدیر علامہ فرقان اللہ خلیل صاحب (حفظہ اللہ) کی توجہ کی بدولت تقرر کی تین سال کے بعد دورۂ حدیث کی کتاب سنن ابوداؤد جزء ثانی پھر جزء اول کی تدریس کی ذمہ داری ملی، پھر کئی سال کے بعد الحمدللہ بعونہ وفضلہ وکرمہ صحیح بخاری شریف کی ورق گردانی کی سعادت حاصل ہوئی، (ھذا من فضل ربی)، اور اقتصادی حالت یہ کہ الحمدللہ زندگی گزر جاتی ہے اور اب تک بڑی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔

بیس سال تک مہینہ کے بیس تاریخ کو تنخواہ ختم ہو جاتی تھی:

حضرت الاستاذ مفتی صاحب قدس سرہ ایک مرتبہ مذاکرہ کے طور پر فرمایا تھا کہ میری زندگی کے بیس سال ایسے گزرے ہیں کہ ہر مہینہ کے بیس تاریخ کو تنخواہ ختم ہو جاتی تھی، پھر چائے۔ پان بھی بند ہو جاتے تھے، اگلے مہینہ میں جب تنخواہ ملتی تو پھر چائے پان چالو ہوتے، اب حضرت کو کیا اور کتنی سہولتیں ملیں یہ سب کو معلوم ہے۔

حسن اتفاق

ہمارے جامعہ دار المعارف الاسلامیہ کے بانی و مہتمم علامہ سلطان ذوق ندوی صاحب (حفظہ اللہ) جو حضرت الاستاذ کے مخلص دوست تھے حضرت مفتی صاحب کا جب بھی بنگلا دیش چاٹگام کا سفر ہوتا تو حضرت ذوق صاحب کی دعوت پر دار المعارف تشریف فرماتے، تو حضرت ذوق صاحب بھی ایک دن جامعہ کے اساتذۂ کرام و طلبہ کے سامنے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: میری زندگی میں بیس سال ایسے گزرے کہ میں اپنے بال بچوں کو لے کر دو کمرے والے ایک مکان پر رہتے تھے، (اس وقت الجامعہ الاسلامیہ پٹیہ چاٹگام میں حضرت محدث کے طور پر مقیم تھے) اور رات گیارہ بارہ بجے گھر پہنچ کر معلوم کرتا کہ اب تو چاول نہیں یا ڈال نہیں، الحمدللہ، اب اللہ تعالی کی مہربانی ہے ایسا بڑا مکان ملا کہ ہمارے پوتے نواسے وہاں فٹ بال کھیلتے ہیں۔

حضرت الاستاذ کی ایک اور خصوصیت جوان کی کرامت بھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء جو حضرت کے شاگرد ہیں مختلف مدارس اور بہت اساتذۂ کرام کے پاس پڑھنے کے باوجود ان کے دل و دماغ رفتار و گفتار، اسلوب و مسلک سب کچھ میں حضرت کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور ہر قول و فعل سے حضرت کی خوشبو مہکتی ہے اور ہر ایک شاگرد ان کو دل سے محبت کرتے ہیں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ طلبہ مجھے محبت کرتے ہیں۔

حسن اتفاق

ہمارے حضرت علامہ سلطان ذوق صاحب ندوی حفظہ اللہ جو ہمارے استاذ مفتی صاحب کے دوست ہیں انہوں نے فرمایا: بہت سے علمائے کرام کا یہ اشکال ہے کہ ہمارے طلبہ ہمارے مدرسہ میں بہت سال تعلیم حاصل کر کے پھر جب عربی ادب کے لئے آپ کے یہاں (دار المعارف) داخلہ لے کر پڑھتے ہیں، تو ان کے رنگ آپ جیسے ہو جاتے ہیں، ہمارے طرح نہیں رہتے، اسکی کیا وجہ ہے؟ حضرت ذوق صاحب (حفظہ اللہ) فرماتے ہیں کہ یہ زردہ چاول کی مانند، کہ مختلف تقریب اور بیاہ شادی میں بہت قسم کے کھانے کھاتے ہیں، بریانی، پلاؤ، گوشت، کباب وغیرہ، آخر میں زردہ کھاتے ہیں، وہ ایک قسم کا کھانا ہے جو چاولوں کو مٹھاس، اور ایک قسم کا زرد رنگ دے کر پکایا جاتا ہے، یہ سب کے آخر میں کھایا جاتا ہے، پھر جب ڈکار لیتے ہیں، تو وہ آخر میں کھایا ہوا زردہ کی خوشبو آتی ہے، دوسرے کھانے کی نہیں، ٹھیک ویسا ہی دار المعارف کے طلبہ مختلف مدارس سے فارغ ہو کر آخر میں جب دار المعارف پڑھتے ہیں تو ان سے بھی دار المعارف کی خوشبو مہکتی ہے، ویسا ہی ہم جیسے شاگردوں کی مثال ہے، کہ ہم مختلف مدارس میں بہت اساتذۂ کرام کے پاس پڑھ کر جب آخر میں حضرت الاستاذ مفتی صاحب قدس سرہ کے پاس پڑھتے ہیں تو ہم سے ان کی خوشبو مہکتی ہے۔

حضرت الاستاذ کی طرف سے طلبہ کو سوال کرنے کا موقع دینا، لا ادری کہنا، اور غلطی کا اقرار کرنا، بعض اساتذۂ

کرام اور مدرسین حضرات درس اور خارج درس میں طلبہ کو سوال کرنے کا موقع نہیں دیتے ہیں، بعض مدارس میں کچھ اساتذۂ کرام ایسے بھی ہوتے ہیں کہ کوئی طالب علم شروع سال میں کوئی اشکال یا اعتراض کر دے تو اس کو جواب دینے کے بدلے میں ایسی توہین وتحقیر کی سزا دی جاتی ہے کہ پورے سال کوئی طالب علم کوئی اشکال کے لئے ہمت نہ کرے، خصوصا یہ لڑکا اور کوئی اشکال کا نام بھی نہ لے، اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ اساتذہ کے اندر یہ خوف طاری ہوتا ہے کہ اگر کوئی سوال کر دے، اور اس کا جواب ہم نہ دے سکے، تو ہم کو شرمندگی لاحق ہوگی، طلبہ کے سامنے چھوٹا ہونا پڑیگا، اصل میں یہ خوف اور طریقہ اکابر و اسلاف کے خلاف ہیں، لیکن ہمارے حضرت الاستاذ (جیسا کہ سب طلبہ، فضلاء، علماء کو معلوم ہے) کہ اگر انکو کوئی مسئلہ یاد نہ ہو تو طلبہ کے سامنے صراحت ''لا ادری'' کہہ دیتے، (میں نہیں جانتا، مجھے معلوم نہیں)، جیسا کہ یہ بات امام ابوحنیفہ امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل (رحمہم اللہ) سے لے کر تمام اکابر سے مروی ہے، اور وہ اس کی تعلیم دے کر گئے ہیں، یہ لا ادری'' ہم پہلے بنگلادیش میں ہاٹ ہزاری مدرسہ کے ایک مفکر اور مشہور استاذ سے سنتے تھے، اور وہ سوال کا موقع بھی عنایت فرماتے تھے، اگر معلوم نہ ہوتا تو کہتے کہ میں مطالعہ کر کے کل بتاؤنگا، تم بھی مطالعہ کر کے آنا، دیوبند جا کر حضرت الاستاذ مفتی صاحب (قدس سرہ) کو ایسا دیکھا، مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ہمیں عبدالملک بن مروان کے اولاد کی فہرست سنا رہے تھے، تو ایک کا نام حضرت کے ذہن میں نہیں آرہا تھا، تو حضرت مذاق کے طور پر فرمایا: اور ایک کا نام'' پاجامہ بن عبدالملک''۔

تواضع وعاجزی ظاہر کرنا

ترمذی شریف کا مقدمہ شروع سال میں حضرت الاستاذ بغیر دیکھے یادداشت سے عبارت پڑھکر تشریح کرتے تھے، مقدمہ ختم ہونے کے بعد ایک دن فرمایا: دیکھو میں تم کو یہ حفظا سنا دیا، سال کے آخر اگر مجھ سے پوچھو تو میں یہ مقدمہ حفظا نہیں سنا سکونگا۔

فراغت کے بعد طلبہ کو چاہئے بیس سال لگاتار مطالعہ کرے، ورنہ کم از کم دس سال حسب استعداد حضرت اپنی طالب علمی زندگی سے فراغت کے بعد بیس سال تک لگاتار مطالعہ میں مصروف تھے، ہمارے ساتھیوں کے اندر یہ بات مشہور تھی کہ ایک مرتبہ عام عادت کے خلاف کسی کام میں حضرت کی اہلیہ محترمہ (ہماری اماجان) مشغول رہنے کی وجہ سے گھر میں کام کے لئے جو لڑکی رہتی تھی اس کو حضرت کے پاس بھیج دی پیسے کیلئے، حضرت اس کی طرف نگاہ اٹھا کر فرمارہے تھے تم کون ہو؟ اس لڑکی نے جواب دیا میں آپ کے گھر میں کام کرتی ہوں، حضرت نے پھر سوال کیا کب سے؟ لڑکی نے جواب دیا چھ سال سے، لڑکی کا علم بھی حضرت کے پاس نہیں تھا۔

حضرت کے اسفار سو فیصد کامیاب ہیں

ہمارے دورۂ حدیث کے سال حضرت کو لندن (برطانیہ) کے سفر سے واپس ہونے میں ذرا سی تاخیر ہوگئی، اسلئے کتاب کے شروع میں تمہیدی کلام مختصر کر کے کتاب شروع فرمادی تھی، اور یہ بھی اطمینان دلایا تھا کہ باقی باتیں آئندہ دروس کے دوران آجائیں گی، تو ایک دن حضرت فرمارہے تھے کہ ہم جب سفر کر کے واپس آتے ہیں لوگ سوال کرتے ہیں سفر کیسا ہوا؟ ہم جواب دیتے ہیں الحمد للہ ہمارا سفر تو سو فی صد کامیاب ہوا ہے، کیونکہ ہم وہاں چندہ اور ہدیہ کے لئے نہیں گئے تھے، دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کے لئے گئے تھے یہ تو پورا کیا۔

حضرت ابو الحسن علی ندوی (رحمہ اللہ) کے بارے میں بھی یہ بات مشہور ہے کہ آپ کبھی کہیں چاہے عرب ممالک ہو یا یورپ امریکہ اور افریقہ ہو چندہ کیلئے نہیں جاتے، دعوت و تبلیغ کے لئے جاتے تھے، دوسرے اساتذۂ کرام و ملازمین جو رفیق سفر ہوتے تھے حضرت کے نام سے چندہ کرتے تھے۔

ہمارے بنگلا دیش کے ایک بڑے مشہور عالم دبئی کے ایک شیخ کے مکان میں چندہ کے لئے لائن پر کھڑے تھے، اچانک وہ شیخ علماء کو کھڑے چھوڑ کر ائیر پوٹ چلے گئے، کیا وجہ؟ معلوم ہوا کہ ائیر پوٹ سے ایک بڑے عالم کو استقبال کرنے کے لئے گئے ہیں، تو بنگلا دیش کا وہ مولانا تعجب کے ساتھ انتظار میں تھے کہ وہ کونسا عالم ہے جس

کے استقبال کیلئے شیخ ہم کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے؟ آنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ حضرت ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) ہیں، ہمارے حضرت مفتی صاحب اگر کسی ائیرپوٹ میں پہنچتے تو علماء مشائخ سب مفتی صاحب کے استقبال کے لئے وہاں بھیڑ لگاتے۔

حضرت حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ اور پالن پوری قدس سرہ

ہمارے والد صاحب سے بارہا سنا ہوں کہ حضرت سید حسین احمد مدنی (نوراللہ مرقدہ) سیاست اور وعظ و نصیحت کے لئے بہت سفر کرتے تھے، ان کے درس کے لئے خاص کوئی حصہ مقرر نہیں تھا، بلکہ جب بھی دارالعلوم حاضر ہوتے تب ہی گھنٹہ بجتا اور سبق شروع ہو جاتا، چاہے دن ہو یا رات کے بارہ اور ایک کیوں نہ ہو، ہر وقت درسگاہ کھچا کھچ بھر جاتی تھی۔

یہ منظر ہمارے حضرت الاستاذ کے درس میں تھی کہ دن کے درس میں جیسی درسگاہ کھچا کھچ بھر جاتی رات میں بھی بھر جاتی، بلکہ امتحان کے موقع پر جب سب کے اسباق بند ہو جاتے تو انکے اسباق کا سلسلہ امتحان کے قریب قریب تک جاری رہتا، ایک سال جب شیخ اول نصیر احمد خان صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی طبیعت زیادہ ناساز تھی تو حضرت الاستاذ کو بخاری شریف اول ختم کرنے کے لئے ذمہ داری دی گئی، بنگلا دیش کے ایک بڑے عالم نے سنایا (جو اس وقت دورۂ حدیث پڑھتا تھا) کہ اس سال میں صبح کو امتحان ہوتا، امتحان کے بعد بخاری شریف کا سبق شروع ہوتا، اور پورے سال کی طرح درسگا ہ بھری رہتی تھی، ایک طالب علم بھی غیر حاضر نہیں رہتا تھا۔

حضرت شیخ الحدیث زکریا نوراللہ مرقدہ اور حضرت الاستاذ مفتی صاحب قدس سرہ ہم بچپن سے سنتے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث زکریا (رحمہ اللہ) پر جب اللہ تعالی نے فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو مظاہر العلوم سے تنخواہ لینا بند کر دیئے تھے، اور جو تنخواہ پہلے لئے تھے وہ بھی واپس کر دئے تھے۔

حضرت الاستاذ نے بھی مالی وسعت حاصل ہونے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینا بند کردیا اور پہلے جو تنخواہ دارالعلوم اشرفیہ سورت (گجرات) اور دارالعلوم دیوبند سے لئے تھے وہ سب واپس کردیا، جس کی مقدار ساڑھے نولاکھ روپیے سے زائد ہوگی۔ "**ولمثل هذا فليعمل العاملون**".

حضرت سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت الاستاذ قدس سرہ علماء کی زبان سے کہ حضرت ندوی کے حین حیات میں سنتا تھا حضرت ندوی ہمارے سارے اکابر کے ساتھ تعلق قائم کرکے ایسا استفادہ کیا کہ ان میں سارے اکابر کا رنگ اور خوشبو آ گئی تھی، اور انکو مجموعہ عطر کہا جاتا تھا۔

ویسا ہی ہمارے حضرت الاستاذ میں بھی سارے اکابر کا رنگ تھا، حضرت مدنی (نور اللہ مرقدہ) کا درس، حضرت شیخ الحدیث زکریا (قدس سرہ) کی تنخواہ واپسی، حضرت اشرف علی تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی طرح ہر موضوع پر تصنیفات وتالیفات۔

أولئك آبائي فجئني بمثلهم إذا جمعتنا يا جرير المجامع

علم کی زیادتی کے لئے روزانہ ہر نماز کے بعد دعا کرنا

حضرت الاستاذ نے سنایا کہ ان کے استاذ مفتی مہدی حسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے حضرت کو ایک دن کہا کہ سعید تم ہر فرض نماز کے بعد تین مرتبہ "**رب زدني علما**" یہ دعا پڑھو، حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ یہ سننے کے بعد سے آج تک کسی نماز کے بعد یہ دعا پڑھنا نہیں چھوڑا، چاہے حضر میں ہو یا سفر میں اگر بلا اختیار کبھی بھول سے چھوٹ گئی تو الگ بات ہے۔

ہر روز ہر سبق شروع کرنے سے پہلے کچھ کلماتِ دعائیہ پڑھنا حضرت کو ہم نے کبھی بھی نہیں دیکھا کہ کلمات دعائیہ پڑھنے کے بغیر سبق شروع کیا، تجربہ شاہد ہے کہ کلمات دعائیہ پڑھ کر سبق شروع کرنے اور بغیر پڑھ کر شروع کرنے میں آسمان وزمین کا فرق پڑتا ہے، حضرت کے دریائے اوصاف سے عاجز نے یہ چند کلمات عرض کی، اللہ

تعالی اس پر عمل کی توفیق عنایت فرماوے۔ حضرت کے یہ کمالات عالیہ اور قبول عام حاصل ہونے کا وسیلہ پہلے تو یہی حق ہے:

داد حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت داد اوست

ظاہری وسیلہ حضرت کی جفاکشی، جد و جہد، بے پناہ متواصل محنت، وقت کا صحیح استعمال، قول و فعل کا تطابق، رفتار و گفتار میں تماثل ظاہر و باطن میں توافق اور باطنی وسیلہ اللہ تعالی بہتر جانتا ہے کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری قدس سرہ کو یہ کیمیائے سعادت کس پیر و فقیر کی خدمت کی بدولت اور کس کی دعا کی برکت اور کس عمل کے طفیل میں ملی ہے، کاش وہ معلوم ہوتی تو ہمیں کچھ حاصل ہو جاتا۔

❁...❁...❁

مدتوں رویا کرینگے۔۔۔

مولانا جعفر احمد صاحب
شیخ الحدیث جامعہ شرعیہ مالی باغ ڈھاکہ بنگلہ دیش

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ امابعد!

اللہ تعالی اس عالم کے خالق، مالک اور رب العالمین ہیں، مالک ہونے کی حیثیت سے انھوں نے سارے عالم کی ہدایت کے لئے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک بے شمار انبیاء کرام اور رسول بھیجے ہیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دین کی حفاظت کے لیے جس وقت جس سبب کی ضرورت پیش آتی تھی اللہ رب العزت اسی کا ہی انتظام فرماتے رہتے تھے، جب انبیاء کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں یہ آیۃ نازل ہوئی ”**الیوم أکملت لکم و أتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا**“ اور آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ذمہ داری سے فارغ کر کے اپنے پاس بلا لیا اب اس دین اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالی نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو سونپ دی، صحابہ کرامؓ کو سامنے رکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعلان کیا ”**بلغوا عنی ولو آیۃ**“ تو صحابہ کرامؓ نے اس ذمہ داری کو سو فیصد ادا کیا اس کے بعد تابعین پھر تبع تابعین پھر مجتہدین عظام، فقہائے امت اس ذمہ داری کو پورا کرتے رہے۔

دین اسلام کی حفاظت کے لیے جس زمانے میں جس شخصیت کی ضرورت ہوئی اللہ تعالی ایسی ہی شخصیت پیدا فرمائی، یہ اللہ تعالی کا فضل و کرم ہے، دین اور علم دین کو اللہ تعالی نے پہلے مکہ میں نازل فرمایا پھر یہ مدینہ منورہ میں

منتقل ہوا پھر بغداد، کوفہ وغیرہ کو بھی اللہ تعالی نے علم کی مرکزیت دی تھی۔ انیسویں اور بیسویں صدی کو یہ مرکزیت اللہ تعالی نے دارالعلوم دیوبند کو عطا فرمایا، یہاں سے ساری دنیا کے دینی تقاضوں کو اللہ تعالی پورا فرما رہے ہیں۔ الحمدللہ دین کے بڑے بڑے اکابر یہاں سے پیدا ہوئے اور اللہ تعالی ان سے دین کے بڑے بڑے کام لیے انہیں اکابر میں ہمارے حضرت الاستاذ شیخ المشائخ استاذ الاساتذہ مفتی سعید احمد پالن پوری۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ ہیں، جن کو اللہ تعالی نے بڑی مقبولیت دی تھی جو سورج کی طرح نمایاں ہے۔

احقر راقم السطور نے ۱۴۰۴ھ مطابق سن ۱۹۸۴ء میں دارالعلوم دیوبند میں حضرت الاستاذؒ کے پاس ترمذی شریف ج ا پڑھی، پڑھائی کے زمانے میں احقر حضرتؒ کے گھر بہت جاتا تھا کبھی کتاب کے مشکل مقامات سمجھنے کے لیے اور کبھی مختلف مشورے کے لئے انکے گھر جاتا تھا ہر جمعے میں انکے یہاں خصوصی طور پر جانا ہوتا تھا۔

الحمدللہ فراغت کے بعد ۱۹۹۰ء (انیس سو نوے) تک ہر سال ایک مرتبہ دارالعلوم جانے کا معمول جاری رہا، پھر اسکے پچیس سال بعد سن ۲۰۱۶ سے ۲۰۱۹ کے اخیر تک ہر سال میں دو یا تین مرتبہ دارالعلوم دیوبند جانے کا موقع ملتا تھا۔ خاص طور پر بخاری شریف جلد اول کے درس میں شرکت کرتا تھا ساتھ ساتھ دیگر اساتذہ کے اسباق میں شریک ہو جاتا، روزانہ عصر بعد کی مجلس میں جانے کا اہتمام کرتا اور حضرتؒ سے مختلف سوالات کے جوابات سنکر مستفید ہوتا۔

حضرت الاستاذؒ کو اللہ تعالی نے بہت سے ایسے علمی کاموں کو جاری کرنے کی توفیق دی جو فی الحال امت مسلمہ کے لیے نہایت ہی ضروری تھی، میں نے ایک مرتبہ حضرتؒ سے پوچھا تھا کہ ہر صدی کے ۳۰/۳۵ سال کے اندر اندر کسی نہ کسی مجدد کا ظہور ہوتا ہے، اب چودہ سو چالیس ہو گیے کوئی مجدد کا ظہور نہیں ہو رہا ہے؟ تو حضرت الاستاذؒ نے جواب دیا اس صدی کا مجدد دارالعلوم دیوبند ہے" میں نے عرض کیا ادارہ بھی مجدد ہوتا ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا "ہاں ہوتا ہے۔"

حضرتؒ کی تقریر - جو تحفۃ القاری کے نام سے چھپی ہے - پڑھتا ہوں تو اس میں حضرتؒ نے حدیث شریف کی ایسی

ایسی توجیہات کی ہیں کہ اسے پڑھ کر دل کی حالت ایسی ہوجاتی ہے کہ اگر حضرتؒ سامنے ہوتے تو ان کی پیشانی کا بوسہ لیتا! آج حضرتؒ کا وصال ہوگیا، دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلی علیین اور جنت میں ٹھکانہ کردے۔ ان کی علمی فیوضات کو جاری رکھے، اور بندۂ حقیر کو حضرتؒ کی طرف سے ملی ہوئی علمی امانت کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین ثم آمین۔

آہ! میرے مخدوم

مفتی عبدالرحمن نعیم قاسمی
استاذ حدیث جامعہ محمودیہ ڈاکہ، بنگلہ دیش

حضرت اقدس شیخ الحدیث مفتی سعید احمد پالنپوری - رحمۃ اللہ علیہ - کی حیات وخدمات پر بہت کچھ لکھا جاچکا اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ مجھ جیسے بے بضاعت اور حرف نا آشنا کی کیا مجال کہ حضرت کی زندگی پر کچھ سپرد قلم کروں، مگر چونکہ بندے کو اللہ کی توفیق سے ایک عرصہ حضرت والا کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا ہے، اس لیے حضرت کی زندگی کی وہ خاص باتیں جنکا گواہ بندہ خود ہے وہ عرض کرنے کی کوشش کرر ہا ہے۔ بندہ ان تمام تفصیلات سے تعرض نہیں کرے گا جو ہر مضمون ہر مقالے کے اندر مکرر آپ کو مل سکتی ہیں

حضرتؒ کی پرہیزگاری:

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تقوی اور پرہیزگاری کے جس اونچے مقام پر فائز تھے، وہ محتاج بیاں نہیں ہے، البتہ افادۂ عام کی نیت سے یہاں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

سن ۲۰۱۸ء کی بات ہے سردی کا موسم تھا، بنگلہ دیش کے بڑے تاجر جو اسوقت امریکہ میں مقیم ہیں وہ دار العلوم کے کسی فاضل کو ساتھ لیکر حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت رحمہ اللہ نے ان لوگوں سے آنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ بنگلہ دیش میں آئندہ مہینے کے پہلے بدھ کو ایک اجلاس عام ہے، جس میں ملک اور بیرون ملک کے بڑے حضرات تشریف لا رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ بحیثیت مہمان خصوصی شرکت قبول فرمالیں۔ (یعنی ان لوگوں نے حضرتؒ کو اس اجلاس میں تشریف لانے کی دعوت دی اور اصرار

کرتے رہے) تو حضرتؒ نے کیلنڈر میں تاریخ دیکھی، پتہ چلا اسوقت دار العلوم میں اسباق جاری رہیں گے تو حضرتؒ نے جواب دیا ''آپ حضرات بہت دور سے تشریف لائے ہیں اس لئے آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ؛ لیکن دار العلوم کی طرف سے مجھ پر ایک ذمہ داری ہے میں اسے چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں نہیں جا سکتا'' دیر تک حضرتؒ سے ان لوگوں کی گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ ان لوگوں کے جانے کا وقت ہوگیا اور وہ لوگ جانے لگے، جانے سے پہلے انھوں نے تقریباً دس ہزار روپیے نقد بطور ہدیہ حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں پیش کیے، تو حضرت نے فرمایا: ''میں یہ ہدیہ نہیں لوں گا'' ان لوگوں نے بارہا اصرار کیا لیکن حضرت الاستاذؒ نے معذرت فرمادی، یہ حضرت کے تقوی اور پرہیزگاری (استغنا اور بے نیازی) کی ادنی مثال ہے، ورنہ ایسے سینکڑوں واقعات آپ کی زندگی میں پیش آئے۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیکر:

حضرت الاستاذؒ اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیکر تھے، ان کی وضع قطع، اخلاق وسیرت الغرض ہر چیز میں عشق نبوی کی جھلک نمایاں نظر آتی تھی، آپ کے اخلاق کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے رشتہ دار اعزاء وأقرباء کی ہمیشہ خبر گیری کرتے تھے، اپنے پاس آنے والے ہر آدمی بالخصوص علماء طلباء سے روزانہ عصر بعد ملتے تھے، سکون سے ان کی باتیں سنتے اور اطمینان سے جواب دیتے تھے، یہاں تک کہ حضرتؒ نے اپنے چھوٹے پوتوں اور نواسوں کے لئے بھی وقت متعین کر رکھا تھا، موقع کی مناسبت سے ایک واقعہ یہاں ذکر کرتا چلوں، دو سال پہلے کی بات ہے احقر اس وقت دار العلوم دیوبند کے مایہ ناز استاذ مفتی عبد اللہ معروفی صاحب۔ دامت برکاتہم۔ کی خدمت میں رہ کر علمی کاموں میں تعاون کرتا۔

ایک رات حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ کا فون آیا، انھوں نے کسی کام کی غرض لیے احقر کو اپنے دولت کدہ بلایا، میں بہت جلدی ان کے مکان پر پہنچا، دروازہ کھولتے ہی میں نے دیکھا حضرتؒ کے کمرے

میں (یوسف، حفیظ، محمد، یحیی، زینب وغیرہم یہ سب حضرتؒ کے پوتے اور پوتیاں ہیں) کھیل رہے ہیں، ان کو دیکھ کر حضرتؒ خوش ہو رہے ہیں، یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا! تو حضرتؒ نے فرمایا: ''لکھتے لکھتے جب دماغ تھک جاتا ہے؛ تو گھنٹی بجا کر کر سب بچوں کو بلاتا ہوں، انہیں کھیلنے کو کہتا ہوں، یہاں تک کہ میرا دماغ کام کرنے لگتا ہے تو سب کو بھگا دیتا ہوں''۔

سبحان اللہ! حضرتؒ کو ہم نے اسی طرح پایا کہ انھوں نے اپنے پوتوں اور نواسوں کے لیے بھی وقت متعین کر رکھا تھا، اس تعلق سے گھر کے چھوٹے بچوں کی بھی کوئی شکایت نہیں تھی، اس دن احقر کو نواسۂ نبی حضرات حسنین -رضی اللہ تعالی عنہما- کی باتیں بڑی یاد آرہی تھیں۔

معاملات کی صفائی:

معاملات کی صفائی حضرتؒ کا خاص شعار تھا، معاملات کے تعلق سے حضرتؒ کتنے محتاط تھے، اس بات کو انکے اقارب اور احباب بخوبی جانتے ہیں، بندہ یہاں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہے؛ بندہ چونکہ بنگلہ دیش سے تعلق رکھتا تھا اس لیے حضرتؒ بندے کے زمانہ دیوبند میں کبھی کبھی مچھلی خریدنے کے لیے بازار بھیجتے تھے، بندہ بازار سے جس قیمت پر مچھلی خریدتا تھا حضرتؒ کے پاس اس سے کچھ کم قیمت بتانے کی کوشش کرتا، لیکن اللہ گواہ ہے بندہ اس تعلق سے کبھی کامیاب نہیں ہو سکا نیز حضرتؒ کی محبت کا یہ عالم تھا جب یہ مچھلی دسترخوان کی زینت بنتی تو احقر کو بھی دسترخوان پر بلالیا کرتے تھے۔

حضرت الاستاذؒ کا علمی انہماک:

حضرت الاستاذؒ علم و تحقیق کے خوگر تھے ان کے علمی انہماک و مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ انکے نزدیک مطالعہ سے بڑھ کر کوئی شئی مرغوب نہیں تھی، مشکل سے مشکل اوقات میں بھی کتاب کا مطالعہ یا کتاب نویسی سے بے رخی نہیں برتتے تھے، یہی عادت زندگی کے آخری لمحات میں بھی باقی رہی، اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا۔

سن ۱۴۳۷ھ کے شروع میں حضرت رحمہ اللہ کی آنکھوں میں موتیا ہو گیا، اسلیے کتاب کے چھوٹے حروف کے پڑھنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔اس وجہ سے اس سال شش ماہی امتحان کے موقع پر آپ بغرض علاج ممبئی تشریف لے گئے اور بحمداللہ آنکھ کا کامیاب آپریشن کرا کر ایک ہفتے کے بعد دیوبند تشریف لے آئے۔(حضرتؒ اس وقت تفسیر ہدایت القرآن لکھ رہے تھے) ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق دو روز تو آرام فرمایا لیکن تیسرے روز حضرتؒ لکھنے کے لیے بیٹھ گئے،اسی شب ایک حوالہ دیکھنے کے لیے احقر کے ذریعہ علامہ سیوطی کی ''الدرالمنثور'' طلب فرمائی، احقر جلدی سے کتاب لے کر آیا، کتاب کے حروف بہت چھوٹے تھے،حضرت کی زحمت کے خیال سے میں نے عرض کیا۔حضرت! ہم تلاش کر کے دیتے ہیں'' یہ سن کر حضرتؒ نے احقر کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور کہا'' کیا ہم اندھے ہو گئے ہیں'' یہ کہہ کر دیر تک مطالعہ کرتے رہے گویا انہیں یاد ہی نہیں کہ ابھی چند دن پہلے ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا۔

اللہ تبارک وتعالی حضرت الاستاذ کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور ہم شاگردوں کوانکے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

❁...❁...❁

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کی یادیں

مولانا قمر الزمان قاسمی
مہتمم مرکز التقوی للدراسات الاسلامیہ، بنگلہ دیش

بلبلوں کو گل پسند اور کسی کو کچھ پسند
میری نظر میں تو پسند میری نظر میں تیرا درس پسند

یوں تو دنیا میں رہنے کے لیے کون آیا ہے؟ آج نہیں تو کل ہر ایک کو یہ مسافر خانہ چھوڑ کر حقیقی منزل کی طرف کوچ کر جانا ہے؛ لیکن اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انکی رحلت پر ایک عالم افسردہ ہوجاتا ہے، وہ تنہا نہیں جاتے بلکہ انکے ساتھ بہاروں کا ایک موسم رخصت ہوجاتا ہے، ان باکمال ہستیوں میں ہمارے حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالنپوریؒ ہیں جنکی وفات سے اس حقیقت کا واقعۃً ثبوت ہوگیا۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ۔

احقر (راقم السطور) آج سے تقریباً پچیس سال پہلے دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھا تھا اس زمانے میں حضرتؒ ترمذی شریف جلد اول پڑھاتے تھے، دار العلوم دیوبند میں حضرتؒ کا یہ درس بہت مقبول تھا، دور دور سے علماء طلباء (کبھی کبھی عوام الناس بھی) دیوبند آکر حضرتؒ کے درس میں شرکت کرتے تھے۔

حضرتؒ کے مکان پر روزانہ عصر بعد مجلس لگتی تھی احقر وہاں حاضر ہونے کی کوشش کرتا تھا ایک دن کا واقعہ بہت یاد آرہا ہے: اس دن عصر بعد کی مجلس میں بہار کا ایک طالب علم حضرتؒ سے کہا: ”حضرت! آج ترمذی شریف کے سبق میں آپ نے فلاں راوی کا نام عبد اللہ ابن عباسؓ بتائے ہیں؛ شاید اس راوی کا نام عبد اللہ بن عمرؓ ہوگا جیسا کہ اس کتاب میں موجود ہے“۔ اس مقام کو حضرتؒ نے بغور دیکھا، تفتیش، تلاش وثبوت دلیل کے بعد اگلے

روز حضرتؒ درس میں تشریف لائے اور تمام طلبہ کو متوجہ کر کے ایک دم بے تکلفی کے ساتھ فرمایا: ''کل میں نے ایک غلطی کی تھی اگر کسی نے لکھا تو اسی ذرا ٹھیک کرلو یہاں عبداللہ بن عباسؓ کے بجائے عبداللہ بن عمر لکھ لو''

یہ ایک نصیحت آموز واقعہ ہے، حضرتؒ جیسی شخصیت کے لیے سبقت لسانی میں یہ ہونا بعید نہیں؛ لیکن اس کو اسطرح بیان کرنا ہمارے لیے بڑی عبرت کی چیز ہے۔

حضرتؒ کا انداز تربیت بھی بہت ہی نرالہ تھا، اگر طلبہ سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو حضرتؒ بروقت ٹوکتے تھے، کبھی کبھی غصہ بھی ہوتے تھے؛ لیکن تھوڑی دیر میں اس چیز کو پیار سے سمجھا دیتے۔ بعد عصر کی مجلس میں ان کا طرز یہی تھا، اس سلسلے میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک بنگلہ دیشی طالب علم نے اس دن کے سبق سے متعلق حضرتؒ سے ایک مسئلہ پوچھا، اور وہ مسئلہ پانی کے بارے میں تھا، وہ بندہ پانی کو بار بار فانی کہہ رہا تھا، اس کے گمان کے مطابق یہی صحیح تھا، کیونکہ وہ دیہات کا رہنے والا تھا اور وہاں پانی کو فانی بولا جاتا ہے، یہ سنکر حضرتؒ بڑے غصہ میں آگئے اور اس طالب علم کو بہت ڈانٹا اور فرمایا پہلے تو اپنی زبان صحیح کرو اس کے بعد مسئلہ پوچھنے آو'' تمام شرکائے مجلس کچھ دیر خاموش رہے، جب حضرتؒ مجلس کا یہ حال دیکھا تو انھوں نے اپنے سے گفتگو شروع فرمائی اور اس طالب علم کو بہت پیار سے اپنی غلطی کی طرف نشاندہی فرمائی۔ اللہ تعالی حضرتؒ کو پوری امت کی طرف سے جزائے عطا فرمائے اور ان کی صفات عالیہ سے ہم سب کو متصف فرمائے۔ آمین

❁...❁...❁

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے

مولانا احمد نور عینی
استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

یہ دنیا فانی ہے، رب ذو الجلال کے سوا ہر ایک کو فنا آشنا ہونا ہے، **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ** (الرحمن: ۲۶، ۲۷)، **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ** (القصص: ۸۸)، یہاں حیات سرمدی کسی کے نصیب میں نہیں، **وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ** (الانبیاء: ۳۴) **كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ** (آل عمران: ۱۸۵)، یہاں آنے والا ہر شخص جانے کے لیے آتا ہے؛ مگر ہر جانے والے کا جانا۔

ایک جیسا نہیں رہتا:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

ہر جانے والا جاتے جاتے اپنے جانے کا غم دے جاتا ہے، دلوں کے طاقچوں میں رنج وملال کی قندیل جلا جاتا ہے، جو جانے والا جتنے زیادہ دلوں کے طاقچوں میں غم کی قندیل اور یادوں کے چراغ رکھ جاتا ہے وہ اتنا ہی عظیم اور ہر دل عزیز ہوتا ہے، حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ تعالی ان عظیم اور ہر دل عزیز بندگان خدا میں سے تھے جن کے جانے کے غم میں نہ جانے کتنی آنکھیں اشک بار اور کتنے دل سوگوار ہیں:

ویراں ہے میکدہ ، خم وساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

حضرت الاستاذ کی زندگی بھی قابل رشک تھی اور موت بھی قابل رشک ہے، رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں داعی اجل کی دعوت پر لبیک کہا، ہمیں خدا کی ذات سے پوری امید ہے کہ کہنے والے نے کہا ہوگا: يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً (الفجر: ۲۷، ۲۸) حضرت الاستاذ اب اس جہاں میں نہیں رہے، مگران کی یادوں کی قندیل ہمارے دلوں میں سدا ضوفشانی کرتی رہے گی۔

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

حضرت الاستاذ شیخ الحدیث ضرور تھے: مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف حدیث اور علوم حدیث کے ہی ماہر تھے، حضرت مختلف الجہات صلاحیتوں اور مختلف علوم وفنون کی مہارتوں کے حامل تھے، حضرت کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ حضرت کی شخصیت کتنی عبقری تھی، تفسیر میں ہدایت القرآن، اصول تفسیر میں الفوز الکبیر کی تعریب اور اس کی عربی شرح العون الکبیر، اصول حدیث میں نخبہ کی اردو شرح تحفۃ الدرر، مقدمۂ مسلم کی اردو شرح فیض المنعم، شروح حدیث میں بخاری کی اردو شرح تحفۃ القاری، ترمذی کی اردو شرح تحفۃ الالمعی، شرح معانی الآثار کی عربی تلخیص زبدۃ الطحاوی، اصول افتا میں شرح عقود رسم المفتی کی شرح آپ فتوی کیسے دیں، اسرار شریعت میں حجۃ اللہ البالغۃ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعۃ، منطق میں آسان منطق، تہذیب المنطق کی شرح مفتاح التہذیب، فلسفہ میں مبادئ الفلسفہ اور اس کی اردو شرح معین الفلسفہ، اسماء رجال میں المغنی کی عربی شرح تہذیب المغنی، نحو میں آسان نحو اور صرف میں آسان صرف وغیرہ ، یہ تو درسیات سے متعلق تصنیفات ہیں، اس کے علاوہ درسیات سے خارج اور کئی کتابیں ہیں۔ حضرت کو انگریزی زبان سے بھی کافی حد تک واقفیت تھی، دوران درس الفاظ کے معنی کبھی انگریزی زبان میں بھی بتاتے تھے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک انگریز سیاح دارالعلوم وزٹ

کرنے کے لیے آیا، دار الحدیث میں آکر اپنے مخصوص کیمرے سے ویڈیو بنانے لگا، حضرت نے اسے اردو میں ٹوکا تو وہ سمجھ نہیں پایا، حضرت نے اسے قریب بلا کر انگریزی میں سمجھایا، مجھے اس وقت انگریزی نہیں آتی تھی اس لیے حضرت کی بات میں سمجھ نہیں سکا؛ مگر اس سیاح کے سمجھ میں آگئی اور وہ معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ دار الحدیث سے باہر چلا گیا۔

حضرت کی پوری زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے، حضرت حافظ قرآن بھی تھے؛ مگر آپ نے حفظ کسی مدرسے یا مکتب میں بیٹھ کر نہیں کیا؛ بل کہ افتا کرتے ہوئے خود سے حفظ کیا، یقین محکم، عزم مصمم اور عمل پیہم ہو تو انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے، افتا کرنے والے طلبہ جانتے ہیں کہ افتا کرتے ہوئے حفظ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، مگر حضرت نے اپنے وقت کی حفاظت کر کے حافظ بننے کی اپنی خواہش پوری کی۔ درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تحقیق وتعلیق، مطالعہ وکتب بینی حضرت کا اخیر تک معمول رہا، حضرت اپنے شاگردوں کو بھی مسلسل لکھنے پڑھنے میں مصروف رہنے کی تلقین فرماتے تھے، آخری درس میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتے تھے، حضرت فرماتے کہ فاضل اور فارغ کے الفاظ دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہیں، ابھی تو تمھیں پڑھنے کی شد بد پیدا ہوئی ہے، مدرسہ نے تمھیں علم حاصل کرنے کا راستہ دکھایا ہے، یہاں سے جانے کے بعد تم دس بیس سال تک مسلسل مطالعہ وکتب بینی اور درس وتدریس میں لگے رہو گے تب جا کر تمھیں محسوس ہوگا کہ اب علم آرہا ہے۔

حضرت کا ایک نمایاں وصف شہرت ودولت سے دوری اور استغنا وبے نیازی ہے، آج جب کہ شہرت ودولت ہی مقصد زندگی بن گیا ہے، الا ماشاء اللہ، اور اسٹیج کی 'ہوس' نے ایک بڑی خلقت کے خلوص پر ڈاکہ ڈال رکھا ہے، ایسے زمانے میں اپنے آپ کو حب شہرت وحب دولت سے دور رکھنا خود اپنے آپ میں ایک بہت بڑی کرامت ہے، حضرت کو یہ کرامت حاصل تھی، حضرت کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بلا تن خواہ خدمت انجام دیتے تھے اور یہ بات بھی ہم نے سنی ہے کہ حضرت نے ماضی کی لی ہوئی تن خواہیں بھی حساب کر کے دار العلوم کو

واپس کردیں، یہ ایک بہت بڑی قربانی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ خلوص وللّٰہیت کی دلیل بھی۔ حضرت کا عام معمول تھا کہ ایام درس کے دوران کہیں کا سفر نہیں فرماتے تھے، استثنائی صورتیں ہوسکتی ہیں؛ لیکن عام معمول یہی تھا، ہم نے ایک سے زائد مرتبہ حضرت کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میرے پاس مستقل دعوت نامے آتے رہتے ہیں؛ لیکن میں تم لوگوں کی وجہ سے سفر نہیں کرتا؛ کیوں کہ تم لوگ ہم اساتذہ کی وجہ سے یہاں آتے ہو، حالاں کہ اسفار کرنے میں ہمارا دوہرا فائدہ ہے، ایک یہ کہ شہرت ہوتی ہے، آؤ بھگت ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ لفافے ملتے ہیں اور ہدیے تحائف ملتے ہیں؛ مگر اس کے باوجود میں اس لیے اسفار نہیں کرتا کہ کہیں تمہارا نقصان نہ ہوجائے۔ حضرت الاستاذ کے یہ جملے بہ ظاہر بہت معمولی لگ رہے ہوں مگر یہ جملے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ حضرت ان اسلاف کی یادگار تھے جو قوم کی نسلوں کو بنانے کے لیے اپنے دنیاوی فائدے کو تیاگ دیتے ہیں۔

حضرت نزاعی مسائل سے اپنے آپ کو دور رکھتے تھے، تقسیم دارالعلوم کے قضیۂ نامرضیہ میں حضرت کی کیا پوزیشن تھی میں اس بابت کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا؛ کیوں کہ اس وقت عالمِ وجود عدم نما میں میرا وجود نہیں تھا؛ البتہ جمعیت کے اختلاف کے وقت میں دیوبند میں ہی تھا، حضرت الاستاذ ان معدودے چند اساتذہ میں سے ایک تھے جو عملاً بالکل غیر جانبدار رہتے تھے، اختلاف کے انہی ایام میں جب کہ دونوں جمعیتوں کی طرف سے اجلاس عام منعقد کیے جارہے تھے، ایک دن دلی میں کسی ایک جمعیت کی طرف سے اجلاس عام تھا، اس اجلاس کا اثر دارالعلوم پر بھی پڑا اور درس گاہوں میں مغرب بعد والے گھنٹے نہیں ہوئے، مگر حضرت الاستاذ حسب ضابطہ تشریف لائے اور حسب معمول عشا تک درس دیا، اسی دن کچھ شرپسند لڑکوں نے جمعیت کے جھگڑے کو لے کر موقع پاکر قریب نصف شب کو فساد وانتشار برپا کیا اور صورت حال قابو سے باہر ہوگئی، حضرت کو اس کی اطلاع ملی تو آدھی رات گذر جانے کے باوجود حضرت گھر سے مدرسہ پیدل تشریف لائے اور دارالحدیث میں طلبہ کو جمع کر کے بہت پیار سے سمجھایا، تب کہیں جا کر حالات قابو میں آئے ورنہ تو شرپسندوں نے ایسی اودھم مچا رکھی تھی کہ پولیس کو طلب کئے بغیر حالات کا

قابو میں آنا مشکل تھا۔

آج ہماری قوم اکابر پرستی اور اکابر بیزاری کی دو انتہاؤں پر ہے، حضرت ان دونوں انتہاؤں کے بیچ اعتدال کی راہ پر گامزن تھے، وہ اکابر کا پورا احترام کرتے تھے اور عقائد کے باب میں خاص کر اپنے اکابر کی تشریحات پر اعتماد کرتے تھے، مگر اکابر کے ہر قول وفعل کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے کے قائل نہ تھے، انھیں جو بات یا جو عمل غلط لگتا اس پر تنقید کرتے، جماعت اسلامی کے بارے میں ان کی سخت گیری تو مشہور ہے ہی؛ مگر انھوں نے تبلیغی جماعت پر اور خود دارالعلوم پر بھی تنقیدیں کیں، مزار قاسمی میں لگے ہوئے کتبے پر وہ ہر سال درس میں تنقید کرتے تھے، دیوبندیت کے بارے میں فرماتے تھے کہ مجھ سے حضرت مولانا منظور نعمانیؒ نے فرمایا تھا کہ بریلویت اور دیوبندیت کے درمیان صرف ایک بالشت کا فرق رہ گیا ہے، پھر فرماتے کہ اب یہ ایک بالشت کا فرق بھی ختم ہو گیا ہے۔ تبلیغی جماعت میں فی سبیل اللہ کے مفہوم کو جو عام کر دیا گیا ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے کہ یہ شریعت میں معنوی تحریف ہے۔ مدارس کے مروجہ نصاب پر تنقید کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اس نصاب میں سب سے مظلوم کتاب خدا کا کلام یعنی قرآن ہے، اس نصاب میں نحو وصرف کی تو ایک ایک درجن کتابیں ہیں مگر قرآن سمجھنے کے لیے صرف ایک کتاب ہے اور وہ جلالین جو قرآن کا عربی ترجمہ ہے، حضرت کہتے تھے کہ میں یہ باتیں کہتے کہتے تھک گیا ہوں؛ لیکن کوئی نہیں سنتا، تفسیر کا جو نظام درس ہے اس پر بھی حضرت کو اطمینان نہیں تھا، حضرت فرماتے تھے کہ تفسیر کا درس اس طرح ہونا چاہیے کہ استاذ کے سامنے صرف قرآن کا متن ہو، وہ تفسیر کی مراجع کی کتابیں مطالعہ کر کے آئے اور قرآن سامنے رکھ کر اپنے مطالعہ کی روشنی میں درس دے، حضرت فرماتے تھے کہ یہ جو طریقہ رائج ہے کہ نصاب میں تفسیر ابن کثیر رکھ دی، قرطبی رکھ دی، روح المعانی رکھ دی، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ میں بخاری پڑھانے کے بجائے فتح الباری پڑھاؤں کہ پورا وقت فتح الباری کی عبارت حل کرنے میں چلا جائے گا۔ دورۂ حدیث کے نصاب کے بارے میں حضرت کی رائے تھی کہ فہم حدیث کا دورانیہ ایک سال کے

بجائے دو سال ہونا چاہیے، دوسرے یہ کہ بحث کے لیے حدیث کی ہر کتاب سے ابواب مختص ہونے چاہئیں، تا کہ تکرار نہ ہو اور وقت کا ضیاع نہ ہو، یعنی کتاب الطہارت کو مثلاً ابوداود سے لے لیا جائے، کتاب الصلاۃ کو مثلاً ترمذی سے لے لیا جائے وغیرہ، ایسا نہ ہو کہ بخاری پڑھانے والا بھی کتاب الطہارت پر بحث کر رہا ہو، ترمذی پڑھانے والا بھی کتاب الطہارت پر بحث کر رہا ہو اور ابوداود پڑھانے والا بھی کتاب الطہارت پر بحث کر رہا ہو، جیسا کہ اکثر مدرسوں کا حال ہے۔

حضرت ایک بے باک محقق تھے، ان کی تحقیق انھیں جس نتیجہ تک پہنچاتی اسے اختیار کرتے اور پھر اس پر جم جاتے، انھیں نہ کسی کی ملامت کی پروا ہوتی اور نہ کسی کو خوش کرنے کی خواہش، ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تحقیقی مزاج اپنے اندر ایک طرح کی سختی لیے ہوئے تھا؛ مگر حاشا وکلا ہم ان کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کر سکتے۔ ان کے مزاج میں تصلب تھا، ان کی رائے میں پختگی تھی، وہ دونوں ہاتھ میں لڈو لینے کے شوقین نہیں تھے، وہ جسے ناجائز سمجھتے اس کے ناجائز ہونے کا برملا اظہار کرتے، خواہ ان کے اس اظہار کی زد میں خود ان کا ادارہ آ رہا ہو، تصویر کشی اور ویڈیو گرافی کو وہ ناجائز سمجھتے تھے اور خود بھی اس پر سختی سے عمل کرتے تھے، دارالعلوم کے احاطہ میں جب دہشت گردی مخالف کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا تو اس میں پریس والوں کو بھی بلایا گیا، پریس والوں نے پوری کانفرنس کی ویڈیو گرافی کی، دوسرے دن جب حضرت درس گاہ میں آئے تو کافی غصہ میں تھے، حضرت نے فرمایا کہ یا تو دار العلوم کا دارالافتاء تصویر کی حرمت کا فتوی دینا بند کرے یا دارالعلوم تصویر کشی یا ویڈیو گرافی کا عمل بند کرے، ہمیں حضرت الاستاذ کی رائے سے اختلاف ہوسکتا ہے؛ لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت اپنا موقف رکھنے میں نہ کسی کی ملامت کی پروا کرتے تھے اور نہ کسی کو خوش رکھنے کی فکر، نیز حضرت کے قول وعمل میں کوئی تضاد نہیں تھا، وہ جسے ناجائز سمجھتے تھے عملاً اس سے دور رہتے تھے، ایسا نہیں کہ فتوی تو ناجائز کا دے رہے ہوں اور مصلحتاً اس عمل کو کر بھی رہے ہوں۔ حضرت کی تحقیقات کا مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت رسم ورواج، بدعات

وخرافات اور ظاہری شان وشوکت کے کافی خلاف رہتے تھے، اس سلسلہ میں اس قدر احتیاط برت تھے کہ بسا اوقات مسئلہ کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی تھی اور جو شخص حضرت کے اس مزاج سے ناواقف رہتا تھا تو وہ سمجھ نہیں پا تا تھا اور بدگمان ہونے کا امکان بھی پیدا ہو جا تا تھا۔

حضرت سے ہم نے (۲۰۰۷-۲۰۰۸ کی بیچ نے) تین کتابیں پڑھی ہیں: ترمذی شریف اول، طحاوی شریف، بخاری شریف اول، بخاری کو میں نے اخیر میں اس لیے ذکر کیا کہ اصلا یہ کتاب حضرت مولانا نصیر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق تھی؛ مگر آپؒ کی طبیعت مسلسل ناساز ہونے کی وجہ سے تقریبا نصف تعلیمی سال کے آس پاس یہ کتاب حضرت پالنپوریؒ کو دی گئی، اس طرح ہماری بیچ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم نے حضرت الاستاذ سے ایک ہی سال میں حدیث کی تین اہم کتابیں پڑھیں، بخاری شریف کے لیے میقات اولی کا آخری گھنٹہ مقرر تھا، حضرت گھنٹہ ختم ہونے کے بعد بھی ایک گھنٹہ پڑھاتے تھے، یعنی تقریبا دو گھنٹے مسلسل درس دیتے تھے، ترمذی شریف کے لیے میقات ثانی کا آخری گھنٹہ مقرر تھا، حضرت عصر کی نماز تک پڑھاتے تھے، طحاوی شریف کا درس حضرت مغرب کے بعد عشا تک دیتے تھے، حضرت کے مکان کی دوری دار الحدیث سے تخمینا لگ بھگ نصف کیلو میٹر ہوگی، حضرت پیدل ہی تشریف لاتے تھے، ادھر چند سالوں سے رکشہ پر جانے لگے تھے، گو یا روزانہ تین مرتبہ اتنی لمبی مسافت پیدل طے کر کے آتے تھے، حضرت پان کھاتے ہوئے آتے، احاطہ مولسری کے نل کے پاس آکر کلی کرتے، پھر درس گاہ میں تشریف لاتے، حضرت کو کبھی پان منہ میں رکھ کر درس دیتے ہوئے نہیں دیکھا، درس گاہ آنے کے بعد اگر طلبہ کی تعداد کم نظر آتی یا طلبہ بے ہنگم ادھر ادھر بیٹھے نظر آتے تو حضرت درس گاہ کے دروازے سے واپس گھر کی طرف لوٹ جاتے، حضرت کا 'روٹھنا' بہت مشہور تھا، سال میں ایک دو مرتبہ ضرور روٹھتے تھے، اخیر کے سالوں میں کیا صورت حال رہی نہیں معلوم، حضرت کا یہ روٹھنا طلبہ کے لیے بہت پریشان کن ہوتا تھا، طلبہ کو ایک تو اس بات کا افسوس ہوتا کہ ہم نے حضرت کو ناراض کر دیا دوسرے اس بات کا ٹینشن رہتا کہ حضرت اب آئیں گے یا نہیں، آئیں گے تو پہلے کی طرح دل لگا کر پڑھائیں گے یا نہیں، نئے طلبہ خاص کر کچھ زیادہ پریشان ہو جاتے تھے، پرانے طلبہ ان کو دلاسا دیتے کہ حضرت کا یہ محبت بھرا روٹھنا ہر سال ہوتا ہے، حضرت

پھر آئیں گے اور پہلے کی طرح پڑھائیں گے، ہمارے سال بھی حضرت ایک مرتبہ روٹھے تھے، طلبہ کی تعداد معمول سے کچھ کم تھی تو حضرت دروازے سے ہی واپس ہو گئے، ہمارے ترجمان مولانا عبدالرزاق قاسمی نے یہ اعلان کیا کہ حضرت کو منانے کے لیے سارے طلبہ حضرت کے مکان کی طرف چلیں؛ چناں چہ کئی سو طلبہ حضرت کے گھر پہنچے، اتنی بڑی تعداد تھی کہ ایسا لگ رہا تھا کہ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ جا رہے ہوں، ترجمان کے ساتھ چند ساتھی اندر گئے، حضرت اس شرط پر راضی ہوئے کہ آئندہ سے تم لوگ ایسی حرکت نہیں کروگے، محبوب استاذ اور بے پایاں محبت کرنے والے شاگردوں کے درمیان روٹھنے کے اس رشتہ میں محبت کا جو لطف ہے اسے ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

حضرت ایک ماہر اور کامیاب مدرس تھے، حضرت کا درس کافی مقبول تھا، مشکل سے مشکل بات کو بہت آسانی سے مرتب انداز میں ذہن نشین کر دیا کرتے تھے، حضرت کا منہج تدریس یہ تھا کہ پہلے ترجمۃ الباب یا باب کا عنوان سمجھاتے اور اس کے مشمولات کی طرف مختصرا اشارہ فرماتے، پھر طالب علم باب کا عنوان پڑھتا، پھر سند پر کچھ کلام کرنا ہوتا تو حضرت کلام کرتے ورنہ طالب علم ترجمۃ الباب کے بعد سند بھی پڑھتا، سند کے جس راوی پر کلام کرنا ہوتا عام طور پر اس راوی کے نام سے پہلے عبارت خواں کو روکتے، حضرت کا مزاج سند پر باریک اور پیچیدہ بحثیں کرنے کا نہیں تھا، حضرت سند سے زیادہ متن کی تشریح پر زور دیتے تھے، سند کی عبارت خوانی ہو جانے کے بعد طالب علم رک جاتا، اب حضرت متن کی تشفی بخش شرح فرماتے، اگر اس کا تعلق کسی فقہی مسئلہ سے ہوتا تو صورت مسئلہ بتا کر حکم مسئلہ کی وضاحت فرماتے، ائمہ کا اختلاف بھی ذکر کرتے، اختلاف نص فہمی کی وجہ سے ہوا ہے یا دلائل کے تعارض کی وجہ سے اس کی نشاندہی کرتے، اگر دلائل کا اختلاف ہوتا تو متن کس کا مستدل ہے واضح کرتے، اگر احناف کا نہیں ہے تو دو باتوں کی وضاحت فرماتے: ایک یہ کہ احناف کا مستدل کیا ہے؟ دوسری یہ کہ احناف نے اسے مستدل کیوں نہیں بنایا؟ اور اگر نص فہمی کا اختلاف ہوتا تو دو باتوں کی وضاحت فرماتے: ایک یہ کہ اس سے ہر امام نے اور خاص احناف نے کیا سمجھا؟ دوسری بات یہ کہ احناف نے ایسا کیوں سمجھا؟ اختلاف ائمہ کا ذکر کرتے ہوئے ادب الاختلاف کی پوری رعایت کرتے، ہر امام کا نام پورے احترام کے ساتھ لیتے، طنزیہ انداز کے بجائے معروضی انداز اختیار کرتے، عام طور سے فقہ کی اختلافی بحثیں اس انداز سے کی

جاتی ہیں کہ دوسرے مسلک والے کے جذبات کو ٹھیس پہنچ ہی جاتی ہے، مگر حضرت الاستاذ پوری بحث اس انداز سے کرتے کہ کسی دوسرے مسلک والے کو تکلیف نہ پہنچے، حضرت فرماتے بھی تھے کہ میری جماعت میں شافعی مسلک کے شاگرد بھی رہتے ہیں، میں ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔ جن مسائل میں غیر مقلدین احناف کو حدیث مخالف باور کراتے ہیں، ان مسائل پر سیر حاصل بحث کرتے، فکری مسائل پر خاص کر وہ مسائل جن پر مغرب کو اعتراض ہے تشفی بخش کلام کرتے، متن کی تشریح ہو جانے کے بعد عبارت خواں اس متن کی عبارت پڑھتا، متن میں کوئی لفظ وضاحت طلب ہوتا تو عبارت خواں عبارت پڑھتے ہوئے جب اس لفظ کے پاس آتا تب اس لفظ کی توضیح کرتے، متن کے شروع میں ہی اس لفظ کو نہ چھیڑتے، درس کی اخیر حدیث تک بل کہ کتاب کی اخیر حدیث تک یہی منہج برقرار رہتا، حضرت کا منہج اُس منہج سے مختلف تھا جو مدارس میں عام طور سے رائج ہے، رائج منہج میں پہلے طالب علم عبارت پڑھتا ہے اور پھر استاذ تشریح کرتے ہیں، جب کہ حضرت الاستاذ پہلے تشریح کرتے پھر طالب علم عبارت پڑھتا، حضرت نے یہی منہج اپنی تمام شروحات میں بھی اختیار کیا ہے، اس منہج کی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علم پہلے پوری بات سمجھ لیتا ہے پھر عبارت پڑھتا ہے، بات سمجھنے کے بعد عبارت پڑھنا عبارت فہمی میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ عام طور سے درس نظامی کی دورہ حدیث کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ وہاں عبارت خوانی زیادہ ہوتی ہے، حدیث پر کلام بہت کم ہوتا ہے اور سال کے آخری ایام میں تو کلام تقریباً ہوتا ہی نہیں، یہ تاثر کتنا صحیح ہے بتانے کی ضرورت نہیں ہے؛ مگر جہاں تک حضرت الاستاذ کے درس کی بات ہے تو یہ تاثر سراسر غلط ہے، حضرت الاستاذ کوئی بھی حدیث تشنۂ تشریح نہیں چھوڑتے، سال کا آغاز ہو یا اختتام، حضرت کے درس کا انداز یکساں ہوتا، نیز حضرت عبارت خوانی کی رفتار میں میانہ روی کو پسند فرماتے، تیز رفتاری کی قطعا اجازت نہیں دیتے۔

دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ حضرت کے دولت کدہ پر عصر کی بعد کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، حضرت کے کوئی مہمان بھی وہاں تشریف فرما تھے، حضرت نے دوران گفتگو کسی بات پر بہادر شاہ ظفر کی طرف منسوب یہ شعر پڑھا:

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

پھر حضرت نے ظریفانہ انداز میں ہنستے ہوئے فرمایا کہ اور دراز مانگ لیتے ، چار ہی دن کیوں مانگے؟ حضرت نے یہ تبصرہ کچھ اس انداز سے فرمایا کہ محفل زعفران زار بن گئی؛ مگر اس وقت کسی کے دل میں یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ جب حضرت اپنی عمر طبیعی مکمل کر کے داغ مفارقت دیں گے تو ہر شخص سنجیدگی سے تمنا کر رہا ہوگا کہ اے کاش حضرت کی عمر کچھ اور دراز ہوتی تا کہ امت اور خاص کر تشنہ گان علوم نبوت ان سے مزید استفادہ کر پاتے۔ مگر ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے، فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (النحل:۶۱)۔

خدائے تعالی حضرت کی قبر کو نور سے بھر دے، حضرت کو جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے:

مثلِ ایوانِ سحَر مرقد فرُوزاں ہو ترا
نُور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

❁...❁...❁

پھول وہ مُرجھا گیا، گُلزار تھا جس سے چمن

حیاتِ سعیدؒ کے درخشاں نقوش

محدّثِ پالن پوریؒ وقت شناسی اور تدریسِ شہنشاہی کے آئینہ میں

مفتی اسعداللہ قاسمی مظاہری

استاذِ حدیث وفقہ جامعہ ام الہدیٰ، مدھوبنی، بہار

پیکرِ علوم ومعارف، صدنازش وصدافتخار، محدّثِ کبیر حضرت الاستاد مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نوّر اللہ مرقدہ کی وفات سے علمی دنیا میں جو صفِ ماتم بچھی، اور مشائخِ عرب وعجم کی طرف سے جو تعزیتی پیغامات وتاثرات آئے، اس سے اُن کی قابلِ رشک رفعتوں کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

وہ اپنی اسّی سالہ زندگی میں اخلاص وللّٰہیت، علم ومعرفت، اتباعِ سنت، خوف وخشیت، جہدوریاضت، زُہد وقناعت، حلم وسخاوت، عفوودرگذر، عزم واستقلال، صبر وشکر، تفویض وتوکّل، انکساروفروتنی، خودشَناسی وخودآگہی اور عالمانہ شرف ووقار کے لحاظ سے ایک تاریخ ساز، ہمہ جہت اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔

وہ ایک ہی وقت میں محدّثِ ذی شان بھی تھے، اور مفسّرِ عالی شان بھی، فقیہِ رَمز شَناس بھی تھے اور متکلّمِ دقیقہ شَناس بھی، مدرّسِ باکمال بھی تھے اور مصنّفِ خوش اقبال بھی، مُرشدِ کامل بھی تھے اور مُصلحِ خدارسیدہ بھی، فکرِ ولی اللّٰہی کے امین بھی تھے، اور گلشنِ قاسمی کے گلِ سرسبد بھی!

غرض وہ ان خوش اقبال ہستیوں میں تھے، جنہیں قسّامِ ازل نے بےشمار کمالات وامتیازات سے بہرہ مند فرمایا تھا، ان کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہوگئی تھیں، وہ إنّ ابراھیم کان أمة کی جیتی جاگتی شرح

تھے،ان کی اِسی جامعیتِ اوصاف کی وجہ سے اس کہنے میں کوئی تامل نہیں:

و لیس من اللہ بمستنکر

أن یجمع العالم في واحد

کسی ایک تحریر یا مقالے میں اُن جیسی کثیر جہتی شخصیت کے تمام محاسن ومکارم کا احاطہ کرنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے۔

بقولِ شاعر

من کثرۃ الاخبار من مکرُ ماته

یمرّ به صنف و یأتي به صنف

یعنی ان کے مکارم اتنے گونا گوں ہیں کہ ایک کا ذکر چھڑتا ہے،تو دوسرا سامنے آجاتا ہے،اس لیے مختلف قسطوں میں آپ کی زندگی کے چند وہ رخشندہ نقوش تحریر کرنے کی کوشش کروں گا، جومیرے دِیدہ وشُنیدہ ہیں،اور جومجھ جیسے لاکھوں شاگردوں، ریزہ چینوں،عقیدت مندوں، جاں نثاروں، بلکہ راہِ علم اورراہِ انسانیت کے پُرشوق مسافروں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

وقت کی حفاظت آپ کی زندگی کا تابندہ نقش

تاریخ شاہد ہے کہ کامیابی ہمیشہ اُن ہی لوگوں کے سروں کا تاج بنتی ہے جو وقت کے قدر شناس ہوتے ہیں،اورناکامی ہمیشہ اُن ہی لوگوں کے گلوں کا طوق بنتی ہے، جووقت کے ناقدرے ہوتے ہیں۔

قحط الرّجال کے اِس دور میں استاذِ عالی وقار محدّثِ پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی روشنی کا ایک استعارہ تھی،اُنہیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا کہ ہم اپنے درخشندہ ماضی کی عہدآفریں شخصیتوں کے درمیان موجود ہیں،اُنہوں نے اپنی خداداد لیاقتوں کی بدولت اِس قدرناشناس معاشرے میں اپنا مقام خود بنایا،اُن کی ذاتِ سعید

سے نہ جانے کتنے دینی وملّی کام تکمیل پائے، ہزاروں باکمال شاگرد تیار ہوئے ، چالیس سے زائد علمی تحقیقی ،اورتشریحی کتابیں وجود میں آئیں ،جن میں بعض کئی کئی جلدوں کو حاوی ، بلکہ کمّاً وکیفاً سیکڑوں کتابوں کے مُساوی۔

ملک وبیرونِ ملک علمی واصلاحی اسفار ،رسوم وبدعات کی نشاندہی ،مشنِ نانوتوی کی فروغ دِہی، دنیا کے گوشے گوشے اورچپّے چپّے میں فکرِ ولی اللّٰہی کی تشہیر،اُن کی اِن روشن خدمات کودیکھ کرعقل حیران!

تنہااس ایک شخصیت سے وہ سارے کام کیسے انجام پائے،جن کے لیے اکیڈمیاں درکار ہوتی ہیں!

بڑی مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا فرزانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اِن تمام فتح مندیوں کا اصل راز اللہ جلّ شانہ کے فضل کے بعداُن کی ’’وقت شناسی ہے۔

وہ اپنی حیاتِ مُستعار کے قیمتی لمحوں کی مکمل حفاظت فرماتے، اپنی عمرِ عزیز کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتے، یاتو مطالعہ وکُتب بینی میں مشغول رہتے، یادرس وتدریس میں مصروف، یاتو تصنیف وتالیف میں سرگرم رہتے، یااپنے بچوں کی تعلیم وتربیت میں مُستغرَق۔

وہ صرف دارالعلوم میں اپنے روحانی جگر گوشوں کو ہی علوم ومعارف سے سیراب نہیں کرتے، بلکہ گھر پر اپنے صُلبی جگر پاروں کو بھی مختلف درسی کتابیں پڑھاتے، یوں ان کی دوتدریسی درس گاہیں: ایک درس گاہِ دارالعلوم، اوردوسری درس گاہِ دولت کدہ!

عصر بعد کا وقت طلبہ، اساتذہ اورزائرین کے لیے خاص ہوتا جس میں مختلف علمی باتیں ہوتیں، وارِدین کے علمی اشکالات کا تشفّی بخش جواب دیا جاتا، اوراُن کے پیش کردہ مسائل حل کیے جاتے، گویا اُن کا دولت کدہ عام

دولت کدہ نہیں، بلکہ ایک عظیم ''جامعۃ المعارف'' تھا، جہاں بڑے بڑے اہلِ علم اپنی پیچیدہ علمی گتّھیوں کو سلجھانے کے لیے حاضر ہوتے، یوں روزانہ اُن کی چوبیس گھنٹہ پر مُحیط زندگی کا ایک ایک لمحہ معنی خیز مشاغل میں صرف ہوتا۔

اُن کے یہاں ہر کام کا وقت متعین ہوتا، جس پر وہ سے سختی سے کاربند رہتے، بلا عذرِ شدید سرِ مُو انحراف نہیں فرماتے، کوئی وارِد نا وقت آجاتا، تو خفگی کا اظہار کرتے اور کبھی واپس بھی کر دیتے۔ اس معاملہ میں اُن کے سامنے سب برابر، خواہ اہل ثروت ہوں یا اہلِ رسوخ۔ ممبئی سے کچھ اہلِ ثروت مکاتب کے سلسلے میں مُشاورت کے لیے دیو بند پہنچے، جن میں ممبئی کے ایک مُستند عالمِ دین ہمارے رفیق بھی شریک تھے، آپ نے ان واردینِ ممبئی کو ملاقات کا وقت دیا، مگر وہ وقت سے ذرا تاخیر ہو گئے، جب حاضر ہوئے، تو آپ کسی عزیز کو پڑھانے میں مشغول تھے، علَیک سلَیک ہوئی، مگر تفصیلی بات چیت سے منع کر دیا۔۔ کہنے لگے: ''یہ وقت آپ کا نہیں، تشریف لے جائیں، ابھی بات نہیں ہو سکتی۔'' پھر حسبِ حال اپنے عزیز کو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

یہ حیرت انگیز، مگر سبق آموز ادا دیکھ کر وہ وارِدین بہت نادم ہوئے، اور واپس لوٹ آئے، بعد میں دوبارہ وقت لے کر حاضرِ خدمت ہوئے۔

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ دورانِ درس کہنے لگے: ''جب میں گھر سے سبق پڑھانے کے لیے آؤں، تو کوئی میرے ساتھ ساتھ نہ چلے اور نہ ہی مجھ سے بات چیت کرے، کیوں کہ میں اُس دوران درس کو ذہن میں مرتّب کرنے میں جُٹا ہوتا ہوں، اِس عمل سے مجھے خَلل ہوتا ہے''۔ یہ ہے وقت کی حفاظت! سبق پڑھانے کے لیے گھر سے دار الحدیث محوِ سفر، مگر اس مختصر دورانیے میں بھی مصروفِ عمل!!

عام حالت میں بسر کی زندگی تُونے تو کیا
کچھ تو ایسا کر کہ عالَم بھر میں افسانہ رہے

حضرت الاستاد پالن پوریؒ صرف اپنے زمانۂ تدریس میں ہی وقت کے قدر شناس نہ تھے، بلکہ اُن کا دورِ طالبِ علمی بھی حفاظتِ وقت سے عبارت رہ چکا ہے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد ۱۳۸۲ھ اور ۱۳۸۳ھ میں ایک طرف جہاں آپ شعبۂ تکمیلِ افتاء میں کتبِ فقہ کا مطالعہ کرتے، فتاوی نویسی کی مشق کرتے، وہیں بڑے بھائی ہونے کے ناطے دیو بند میں فروکش اپنے چھوٹے بھائیوں کی تعلیم وتربیت بھی کرتے، جہاں تعلیمی اوقات کے علاوہ صدر دروازے کے سامنے چبوترے پر خود حفظ کرتے، وہیں اپنے برادرِ خورد حضرت مفتی امین صاحب پالن پوری کو بھی حفظ کراتے، اس طرح فراغت کے بعد اپنی ذاتی کوشش ولگن سے آپ حافظ ہوئے۔ اِن گونا گوں اَشغال میں ایسے مُستغرق کہ رمضان میں وطن بھی نہ جاسکے۔

کیا تاریخ وقت شناسی کی اس سبق آفریں داستان کو بھُلا دے گی؟

ایک مرتبہ دورانِ درس وقت کی قدردانی اور سبق کی حاضری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ: دورِ طالبِ علمی میں ترمذی کے ایک سبق میں غیر حاضری ہوگئی، جس کی خلش آج بھی محسوس کرتا ہوں، اور اس غیر حاضری کی وجہ یہ بتائی کہ: میری رہائش صدر دروازے کے پاس تھی، حضرت الاستاذ علامہ ابراہیم بلیاوی قدّس سرّہ عصا ٹیکتے سبق پڑھانے کے لیے تشریف لاتے، میں عصا کی آہٹ سنتے ہی اپنی رہائش سے نکل جاتا، اور حضرت کے ساتھ ہولیتا، لیکن ایک دن مطالعہ میں اس قدر ڈوب گیا کہ حضرت کی آمد کا احساس تک نہ ہوا، اور غیر حاضری ہوگئی، جس کی کسک آج بھی کبھی کبھی سینے میں اُٹھتی ہے۔

شادباش اے محدّثِ زمن! شاد باش

وقت شناسی کے حوالے سے آپ کی یہ بات بھی ہم جیسوں کے لیے چشم کُشا ہے جو حضرت الاستاد مفتی ابوالقاسم نعمانی باغبانِ گلشنِ قاسمی مدظلہ کی زبانی، تعزیتی پیغام میں سننے کو ملی کہ دارالعلوم میں مسجدِ قدیم کے پاس

آپ کی رہائش گاہ، اوردارِجدید کی شکل دیکھے مہینوں بیت گئے، جب کہ مسجدِ قدیم اوردارِجدید کے درمیان صرف ''نَو درے کی عمارت'' حائل!! یہ وقت شناسی کا درخشاں باب نہیں تو اور کیا ہے؟

بھلا سکے گا نہ زمانہ وہ یادگار ہوں میں

آپ ممبئی میں مَرَضُ الموت کے اپنے آخری خطاب میں کہنے لگے: ''میرے ایک عزیز ہیں ایران میں ،مولانا حکمت اللہ سلّمہ، انہوں نے فون کیا: بیان نہ فرمائیں۔ میں نے کہا: نہیں۔ بیان ہوگا۔ میرے ایک دوست ہیں کراچی میں، مولانا عبدالرؤف صاحب، انہوں نے فون کیا: مختصر بیان فرمائیں۔ میں نے کہا: ہاں! یہ ٹھیک ہے، مختصر بیان ہوگا۔''

طبیعت سخت علیل، متعلّقین کی طرف سے آرام کا مشورہ، مگراس وقت بھی مصروفِ کار رہنے کا جذبہ، اور بے مشغلہ بیٹھنا ناپسند۔

یہ وقت کی قدردانی کا نقشِ تابندہ نہیں نہیں، تواور کیا ہے؟
اب اُنہیں ڈھونڈھ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

حضرت محدّثِ پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے آخری ایّام میں شدید مرض کے باوجود تراویح کے بعد جس حوصلے کے ساتھ خطاب کا سلسلہ شروع فرمایا، وہ بجائے خود کسی کرامت سے کم نہیں، جن میں دو خطاب دو نزاعی مسئلوں میں فیصلہ کُن ہیں: ایک حدیثِ ثُریّا سے متعلق ۔۔۔۔ اور دوسرے اس سے کہ قرآنِ کریم کی روزِ اوّل سے مُتوارِث ترتیبِ قدیم صحیح ہے یا ایک ندوی عالمِ دین کی مُختَرَع ترتیبِ جدید؟

گویا آپ اپنے اس سلسلہ وار خطاب کے ذریعہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے بھی اپنے لاکھوں شاگردوں ،ارادت مندوں، بلکہ دینی کام میں سرگرم سبھی جیالوں کو یہ سبق دے گئے کہ لمحۂ رواں کی قدر کرلو، تاکہ بعد میں حسرت نہ ہو۔

ہے وہ عاقل جو کہ آغاز میں سوچے انجام

ورنہ ناداں بھی سمجھ جاتا ہے کھوتے کھوتے

حَیاتُکَ أَنْفَاسٌ تُعَدُّ فَکُلَّما
مَضٰی نَفَسٌ أَنقَصتَ بِهِ جُزءاً

القصّہ: وقت شناسی کے گلہائے رنگارنگ سے مزین آپ کی یہ خوبصورت زندگی، رہتی دنیا تک راہِ علم کے پُرشوق مُسافروں کے لیے، بلکہ محفلِ گیتی میں کچھ کرگذرنے کے خواہش گر تمام انسانوں کے لیے روشن شاہراہ ہے، جس پر گامزن رہ کر دنیا کی ہر بلندی کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ ماہِ تاباں سے کوئی کہہ دے تُو اپنی کرنوں کو گِن کے رکھ لے میں اپنے صحرا کے ذرّے ذرّے کو تابنا کی سکھا چکا ہوں۔

ایوانِ تدریس وتفہیم کے ہردلعزیز شہنشاہ

حضرت الاستاد رحمۃ اللہ علیہ یوں تو ہمہ جہت کمالات کے حامل تھے، مگر تدریس وتفہیم آپ کی امتیازی شان تھی، جس میں کوئی دوسرا صاحبِ تدریس ان کا شریک نہیں، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ مجتہد ف؀ التدریس والتفہیم، یعنی ایوانِ تدریس وتفہیم کے بے تاج شہنشاہ تھے، تو قطعاً بے جا نہیں۔

ان کے کمالات ومحاسن میں جواب اس کا نہیں
اس قبیلے میں کوئی بھی ہم رکاب اس کا نہیں

مجھے ۲۰۱۱ء میں آپ سے أصحّ الکتب بعد کتاب اللہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، درس کی بہت سی حسیں یادیں اورشیریں باتیں ہیں جو ذہن ودماغ میں محوِ گردش ہیں، جن میں چند نوکِ قلم پر برق رفتاری سے آرہی ہیں، جنہیں لکھے بغیر چارہ نہیں۔

درس گاہ تشریف آوری کا دلکش منظر

حضرت محدّث پالن پوریؒ کے درس گاہ تشریف لانے کا انداز بہت دلکش ہوتا، وہ اپنے مخصوص روایتی لباس

میں تشریف لاتے ۔۔۔نصف ساق دراز جُبّہ ۔۔۔سفید،مُدَوّر،سروں سے چپکی ٹوپی،اُس پر سفید عربی رومال ۔۔۔کبھی کبھی عمامہ اوراُس پر سفید عربی رومال ۔۔۔یوں لگتا کہ کوئی عربی نژاد محدّث تشریف لارہے ہیں، پُرشکوہ رفتار سے تشریف لاتے،نَو درہ میں تاریخی کنویں کے پاس کُلّی فرماتے ،پھرمحدّ ثانہ شان وشوکت کے ساتھ نَو درہ سے متصل تاریخ ساز دارالحدیث میں داخل ہوتے، مَسند کے پاس کھڑے ہوکرمحفلِ درس کے ہر گوشے پر نظر ڈالتے ،اور بلند آواز میں اپنے مخصوص لب ولہجہ میں طلبہ کوسلام کرتے ،پھرنہایت پُروقار انداز میں مسندِ درس پر چارزانو تشریف فرماہوتے،آپ کا یہ اندازِ نشست درس کے اختتام تک رہتا،دورانِ درس اس میں ذرابھی تبدیلی نہ ہوتی ،اورنہ ہی حرکت ، بلکہ خاشعًا ومتواضعًا جلوہ افروزرہتے ، جوآپ کے درسِ حدیث کے احترام پر روشن دلیل ہے۔

عبارت خواں یا بُلبلِ خوش آہنگ

حضرت پالن پوریؒ کے یہاں عبارت خوانی کا مرحلہ کافی اہم ہوتا، ہرطالبِ علم عبارت خوانی کی ہمت نہیں کرپاتا، بلکہ آغازِ سال میں عبارت خوانی کے شائق طلبہ کوگھر بُلاتے ،امتحان لیتے ،اور بلند آہنگ ،خوش نوا، ذی استعداد چند طلبہ کو سال بھر عبارت خوانی کے لیے متعین فرمادیتے ۔اورانہیں تصحیحِ اعراب کے ساتھ بلندآہنگی اورمیانہ رَوی کی تاکید فرماتے ، پھریہ خوش بخت طلبہ سال بھراِس محاذ کوسنبھالے رہتے۔

یہ طلبہ اِس قدرخوش اِلحانی کے ساتھ قراءتِ حدیث کرتے کہ دارالحدیث کے بام ودَرفرطِ شوق سے وجد میں آجاتے ،اورایک عجیب دلکش سماں بندھ جاتا،دارالحدیث کے گردوپیش سے گزرنے والا ہرفردِ بشراس روح پرور منظرکولمحہ بھرکے لیے ضروردیکھتااوراپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا۔اس خوش جمال قراءتِ حدیث کوضرورسنتا اورمحظوظ وشاداں ہوتا۔

بجلیوں کی رو میں غلطی دہ وہ لحن ِ جاں نواز

دل کی دھڑکن کو عطا کرتا ہے جو سوز و گداز
اُف وہ نغمہ جس کو کہتے ہیں تمنائے بہار
کوئلوں کی کُوک ، ساون میں پپیہوں کی پُکار

میں جس سال دورۂ حدیث شریف میں زیر تعلیم تھا، تحفۃ القاری کی تالیف شباب پر تھی، اس لیے اس سال آپ خود قراءتِ حدیث کرتے، جب آپ اپنے سوز بھرے انداز میں، خوش نغمگی اور نرم رَوی کے ساتھ قراءت کرتے، تو ایک عجیب کیف آور سماں ہوتا۔

اللہ اللہ وہ دل سے نکلی ہوئی، جذبات سے سرشار، ذوقِ عرفاں سے مالا مال آواز، وہ پُرشوکت لب ولہجہ، وہ کوثر وتسنیم سے دُھلی زبان، کیا کہوں اُن کی ہر شان وادا میں کیا کیا سحر انگیزی تھی، یہ باتیں جب یاد آتی ہیں، دل پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔

اک برقِ طپاں ہے کہ تکلم ہے تمہارا
اک سحر ہے لرزاں کہ ترنم ہے تمہارا

درسِ بخاری؛ حسیں یادیں، شیریں باتیں

حضرت الاستاد محدث پالن پوریؒ ابتدائی چند دن بخاری اور صاحبِ بخاری کا جامع تعارف پیش کرتے، حدیث اور اصولِ حدیث پر محققانہ کلام کرتے،، اسمائے حُسنیٰ اور احادیث یاد کرنے پر زور دیتے، بلکہ سبق شروع کرنے سے پہلے اسمائے حسنی اور مختصر احادیث یاد کراتے، عمامہ باندھنے کی ترغیب دیتے، اصولِ درس گاہ پر روشنی ڈالتے، اپنی مقرر کردہ اصطلاحات سے روشناس کراتے، پھر باضابطہ کتاب شروع فرماتے۔

آپ کی تدریس گوناگوں خوبیوں کی حامل تھی، جن پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے لیے مقالہ نہیں، کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ واہ کیا خوب ہوتا آپ کا درس! عبارت خوانی ہوتی، پھر آپ کا علمی چشمہ پھوٹ پڑتا، تراجمِ بخاری کی دلنشیں شرح کرتے، ابواب کا جامع، پیشگی خلاصہ پیش فرماتے، غریب الفاظ کو محاورں کی مدد سے بے

غبار کرتے، مذاہبِ اربعہ پر سیر حاصل بحث کرتے، فقہِ حنفی کی مدلل تنقیح وترجیح فرماتے، کلامی مسائل پر تسلّی بخش کلام کرتے، علومِ ولی اللّٰہی کا جابجا تذکرہ فرماتے، افکارِ دیوبند کا موقع بہ موقع حوالہ دیتے، حدیث کے دقیق نکتے سمجھاتے، سند کی پُر مغز بحثیں بتاتے، غرض مسئلے کے ہر ہر گوشہ کو واضح کرتے۔ اور یہ سب کچھ جس سہل اور دل کش پیرائے میں بیان کرتے، اس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں۔ بقولِ کلیم عاجزؔ

یہ طرزِ خاص کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

دورانِ درس طلبہ یا تو گوش برآواز بدیدہ ودل آپ کی طرف متوجہ رہتے، یا آپ کے علمی جواہر پاروں کو قلم بند کرنے میں جُٹے ہوتے، ہر طرف ایسی خاموشی کہ صرف ورق پلٹنے کی آواز محسوس کی جاتی، یعنی **کأنھم علی رؤس الطیور** کا دلفریب نظارہ!

گفتگو ٹھہر ٹھہر کر، صاف اور شیریں کرتے، آواز خوش نوا، مگر قدرے پست ہوتی، دورانِ تقریر ہاتھوں کا متوازن اشارہ ہوتا جس سے مسئلے کی تفہیم میں مدد ملتی، اندازِ تفہیم اتنا مُرتّب ودل نشیں ہوتا کہ پیچدہ سے پیچیدہ علمی سنگلاخ لقمۂ تر بن جائے، یعنی غبی وذکی ہر ایک کے لیے یکساں مفید، موضوع پر مکمّل توجہ مرکوز رکھتے، دلائل وبراھین اتنے دلچسپ اور منطقی اسلوب میں پیش کرتے کہ طبیعت عَش عَش کر اٹھتی، بیان وردِ مذاہب میں ائمۂ سلف کا مکمل احترام ملحوظ رکھتے ،مسلکِ حنفی کو ترجیح ضرور دیتے ،مگر غیر حنفی طلبہ کو اُسے اپنانے کی دعوت نہیں۔۔۔ نبی ہاشمی کے ذکر پر درود وسلام کا نذرانہ پیش کرتے، اور طلبہ کو بھی اس کی تاکید فرماتے، صحابِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا تذکرے کرتے وقت زبان پر ترضیہ کے کلمات ہوتے، ائمہ ومشائخ کا نام لیتے وقت نوّر اللہ مرقدہ اور قدّس سرّہ ضرور ارشاد فرماتے، وقفہ وقفہ سے خاص ادا سے لا الہ الا اللہ کا وِرد کرتے، جو آپ کی فطرت ثانیہ ہے

۔

دورانِ تقریر متعلقہ بحث سے وابستہ کوئی خاص ضروری بات بتانی ہوتی، تو فرماتے کہ: یہاں رک کر ایک مسئلہ سمجھو، پھر مسئلہ کی مختصر تشریح کرتے، اس کے بعد مضمونِ سابق کو مضمونِ لاحق سے اس طرح ہم رشتہ کر دیتے کہ طلبہ اس دل نشیں تسلسل سے جھوم اٹھتے۔ مذاہبِ ائمہ کے اختلاف میں اس بات پر ضرور روشنی ڈالتے کہ یہ اختلاف نص فہمی کی بنا پر ہوا ہے، یا دلائل میں اختلاف کی بنا پر؟۔ جو طلبہ کے لیے فہمِ مسئلہ میں سکون کا باعث ہوتا۔

یوں تو حضرت الاستاد رحمۃ اللہ علیہ کا درس اس قدر روح پرور ہوتا کہ تعب وتکان کا اس شاہی دربار میں گذر نہیں، تاہم دوران درس آپ کی چند حسین ادائیں اور نت نئی تعبیریں ایسی دیکھنے اور سننے کو ملتیں جن سے طبیعت ازسرنو ہری بھری ہو جاتی، دل کی کلیاں مسکرا اٹھتیں، ذہن کے دریچے خشک علمی باتوں کے استقبال کے لیے فرش راہ بن جاتے۔ جن کی چند جھلکیاں یہ ہیں:

کسی مسئلے میں اہلِ علم کی بہت سی آراء ہوتیں، تو آپ دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے کہ: اس مسئلے میں ٹوکرے بھر کر اقوال ہیں، ایسا لگتا کہ آپ کسی شئے کی مقدار بتا رہے ہوں۔

آپ کی اس ادا سے محفلِ درس میں تبسم کی لہر دوڑ جاتی، اور پوری محفل کشتِ زعفران بن جاتی۔ کسی اشکال کے کئی جواب ہوتے، تو فرماتے کہ: اس اشکال کے دس جواب ہیں، مجھے کسی سے تشفی نہ ہو سکی، میں نے گیارہواں جواب گھڑا ہے، تمہیں میرا گھڑا جواب سمجھ میں آ جائے، تو ٹھیک، ورنہ تم بارہواں جواب گھڑ لینا، آپ کی اس بات پر شرکائے بزم خوب ہنستے، مزے لیتے، اور ایک دوسرے کو آنکھوں سے خفیف اشارے کرتے اور یوں مجلس سرسبز وشاداب ہو جاتی۔

آپ کی یہ حسین ادا اگرچہ بادی النظر میں ظرافت وخوش طبعی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی یہ ادا تدریس میں آپ کی اجتہادی شان کی آئینہ دار ہے، آپ نقل درنقل کے پابند نہ تھے، بلکہ خود بھی استخراج کرتے، اور طلبہ کے ذہنوں میں بھی استخراج کی تُخم ریزی کرتے، اس کا اندازہ ان قارئین کو خوب ہے، جو آپ کے درسی افادات

سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔

آپ فرماتے کہ: کسی بھی واقعہ میں دو پہلو ہوتے ہیں، ایک واقعہ کے مرکزی مضامین، دوسرے واقعہ کے متعلقات۔ اگر واقعہ کے کسی مرکزی مضمون میں تعارض ہو، تو میں اس کے جواب دینے کا پابند ہوں، اور اگر واقعہ کے کسی متعلق میں تعارض ہو، تو میں اس کے جواب دینے کا پابند نہیں۔

مذکورہ بالا تناظر میں کبھی مخصوص لب ولہجہ میں فرماتے ارے بھائی! غزوہ میں شریک افراد کی تعداد کیا ہے اور غزوہ کا جائے وقوع کیا ہے، اس بارے میں مختلف متعارض اقوال ہیں، اس کے چکر میں نہ پڑو، غزوہ میں جتنے بھی افراد تھے، تھے تو سہی!، غزوہ جہاں بھی ہوا، ہوا تو سہی! تیرے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے،!؟ یہ باتیں واقعہ کے متعلقات میں سے ہیں، میں ان میں جھک جھک نہیں کرتا، اگر تمہیں جھک جھک کرنا ہے، تو جاؤ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ کے ساتھ فتح الباری میں جھک جھک کرو۔

آپ یہ ساری باتیں اس انداز میں بیان فرماتے کہ پیٹ میں گُدگُدیاں لگنے لگتیں، اور طبیعت میں نشاط کی نئی شمع فروزاں ہوجاتی۔

سند پر کلام کرتے ہوئے کسی کمزور راوی کا تذکرہ آتا، تو فرماتے، یہ راوی دو پیسے کا نہیں، جابرِ جُعفی کے بارے میں فرماتے: یہ لَپاڑیا راوی ہے، کبھی کسی راوی کے بارے میں فرماتے، یہ انٹرنیشنل جھوٹا ہے۔ آپ کے ان بے لاگ اور برمحل تبصروں پر طلبہ خوب ہنستے اور محظوظ ہوتے۔ کسی امام یا محدّث کا تعارف کراتے، تو کبھی کبھار ازراہِ مزاح فرماتے کہ ان کا تعلق گاگلہیڑی سے ہے یا ناگل سے ہے، (یہ دیوبند کے مضافاتی علاقے ہیں)

شرکائے محفل آپ کی اس ادا پر بھی خود کو ہنسنے سے روک نہیں پاتے، اور محفل قہقہ زار ہوجاتی۔ کئی بار عبارت خواں طلبہ غلطیاں کرتے، تو کہتے تیرے ساتھ سر ٹکرانے سے اچھا ہے کہ میں خود ہی عبارت پڑھ لوں۔ کبھی کہتے: چل رہنے دے، تیرے ساتھ جھک جھک کون کرے، اس سے بہتر میں خود عبارت پڑھ لوں۔

جن مدرسین کے یہاں خوب ہنسنا ہسانا ہوتا، اس پر آپ تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے کہ: یہ کانوں کی عیّاشی ہے، حصولِ علم نہیں۔ بھینس کا انڈا، بھینس اللغات، اورنہ جانے کیا کیا تعبیرات! ۔غرض آپ کی یہ ساری تعبیریں اورادائیں درس کے نشاط کو باقی رکھنے، بلکہ اسے چار چاند لگانے میں ٹانک کا کام کرتیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کچھ خودساختہ اصطلاحات بھی تھیں، جو بڑی دل چسپ، اورجدت آمیزتھیں، آغازِ سال میں ان کی نشاندہی فرمادیتے، تاکہ شرکائے درس کو درس سمجھنے میں دشواری نہ ہو:

آپ اپنی ایک اصطلاح یہ بیان فرماتے کہ: جب میں کہوں ”حضرت شاہ صاحب قدس سرّہ“ تواس سے مراد ”مُسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ“ ہوں گے۔اورجب کہوں ”ہمارے حضرت شاہ صاحب قدّس سرّہ“ تواس سے مراد ”محدّثِ عصر حضرت علّامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ“ ہوں گے۔اورفرماتے کہ علامہ کشمیری کے لیے ”ہمارے“ کی تعبیراس لیے ہے کہ آپ دارالعلوم میں مدرّس رہ چکے ہیں۔اوردوسری اصطلاح یہ ذکرکرتے کہ: جب میں کہوں، بڑے دوامام تواس سے مرادامام ابوحنیفہ اورامام مالک رحمہما اللہ ہوں گے اورجب کہوں چھوٹے دوامام تواس سے مراد امام شافعی اورامام احمد بن حنبل رحمہما اللہ ہوں گے۔اورفرماتے کہ یہ بڑااورچھوٹا ہونا عمر کے لحاظ سے ہے، رتبہ کے لحاظ سے نہیں، یعنی بڑے دونوں امام چھوٹے دونوں اماموں سے عمر میں بڑے ہیں۔آپ کی ایک خاص ادایہ بھی تھی کہ بعض اوقات اپنی تشریحات سے رجوع فرمالیتے اوریوں کہتے کہ:

کل اس مسئلہ میں، میں نے جوتقریر کی، وہ صحیح نہیں ہے، اب جوتقریر کروں گا، وہ صحیح ہے، آپ کا یہ عمل جہاں آپ کی خاکساری کی دلیل ہے، وہیں آپ کی امانت داری کی غماز بھی! آپ کے یہاں درس گاہ کے کچھ اصول وآداب بھی ہوتے، جنہیں آغازِ سال میں ہی بتادیتے، اورجن پرکاربندرہنے کی تلقین کرتے۔مثلاً

(۱) ”ہرطالبِ علم میری آمد سے قبل درس گاہ حاضرہوجائے، اپنی نشست گاہ محفوظ کرلے، اطمینان ووقار

سے بیٹھ جائے، میری آمد کے بعد کسی طالبِ علم کا درس گاہ میں آنا جُرم ہے، یوں نہ ہو کہ میں سبق شروع کروں اور کچھ طلبہ اِس رُخ سے آئیں اور کچھ اُس جانب سے، اس سے ذہنی انتشار ہوتا ہے۔۔ چناں چہ اگر کبھی کوئی طالبِ علم آپ کی تشریف آوری کے بعد حاضرِ درس ہوتا، تو آپ برافروختہ ہوجاتے، اور اسے فوراً درس گاہ سے نکال باہر فرماتے، اور کہتے: ظالم! چل چلاجا، تیرے بغیر بھی سبق ہوجائے گا۔ یا کبھی درس گاہ کا کوئی گوشہ خالی نظر آتا، تو آپ غضب آلود درس گاہ سے تشریف لے جاتے، اور خاص طور سے ترجمان سے جواب طلب فرماتے۔ ہمارے سال بھی دو مرتبہ یہ صورت پیش آئی، تو آپ ناراض ہوکر اپنے مخصوص لب ولہجہ میں فرمانے لگے کہ: ’’میں تپائیوں کو پڑھانے نہیں آتا، تم آؤ گے، پڑھاؤں گا، نہیں آؤ گے، نہیں پڑھاؤں گا، مجھے بخاری پڑھانے کا شوق نہیں، میرا یہ شوق بہت پہلے پورا ہوچکا ہے، میں نے آج سے تیس سال قبل کیمپ کے زمانے میں اِسی دارالعلوم میں بخاری پڑھائی ہے۔

اور لوٹتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کہنے لگے: ظالمو! اگر تمھیں پڑھنے کا شوق نہیں، تو ہمارے پڑھانے کا شوق بھی پورا ہوچکا ہے۔ یہ مرحلہ طلبہ کے لیے نہایت باعثِ تشویش ہوتا، چناں چہ ترجمان اور چند وفا کیش طلبہ عصر بعد سہمے سہمے آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہوتے، غلطی پر ندامت کا اظہار کرتے، معافی چاہتے، آئندہ پابندی سے حاضر ہونے کا عہد کرتے، تو آپ چند تنبیہی جملے ارشاد فرما کر معاف کردیتے، اور اگلے دن سبق کے لیے تشریف لاتے۔

آپ کی اس سرزنش کا فائدہ یہ ہوتا کہ طلبہ کی طرف سے بھی حتی الوسع یہ کوشش ہوتی کہ وقت سے پہلے پابندی سے درس گاہ میں موجود رہیں۔ آپ کا یہ سبق آمیز رُوٹھنا اور طلبہ کا مَنا کرلانا قریب ہر سال ہوتا، بلکہ بعض مرتبہ سال میں دو تین

مرتبہ ہوجاتا، جو سبق کی تئیں آپ کی فکرمندی کی درخشندہ دلیل ہے۔

(۲) سبق کے دوران کوئی طالبِ علم سوال نہ کرے، اس سے سبق کا تسلسل ختم ہوتا ہے، ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے۔

آج کے سبق سے متعلق کوئی سوال ہو، تو اسے ورقے پر لکھ کر ترجمان کے پاس جمع کرے، میں آج ہی سبق کے آخر میں یا پھر کل اس کا جواب دوں گا۔

کوئی طالب علم سبق کے علاوہ کوئی فقہی سوال نہ کرے، یہ دارالحدیث ہے، دارالافتاء نہیں۔ اگر پوچھنا ہی ہے، تو عصر بعد گھر کی مجلس میں دریافت کرے۔

گذشتہ اسباق کے سلسلے میں کوئی سوال ہو، یا سبق کے علاوہ کوئی علمی سوال ہو، تو وہ بھی درس گاہ میں نہ کرے، بلکہ گھر کی مجلس میں معلوم کرے۔

آپ فرماتے کہ: ان صورتوں میں درس میں جواب نہ دینے اور گھر پر بلانے کے دو فائدے ہیں: ایک یہ کہ سبق کی رفتار متاثر نہ ہو اور دوسرے یہ کہ تمہارے مبلغِ شوق کا ہمیں علم ہو۔

یہ سارے اصول آپ ایک ایک کر کے بہت واضح انداز میں بتاتے، اور ترجمان کو تاکید فرماتے کہ: ان اصولوں کے خلاف کوئی سوال ہو، تو وہ مجھے پیش نہ کرے۔۔۔۔۔ آپ فرماتے کہ درس کے نظام کو خوبصورت اور نفع بخش بنانے کے لیے یہ اصول ضروری ہیں۔

پھر حسبِ وعدہ کبھی آغازِ درس سے پہلے اور کبھی اختتامِ درس کے بعد سارے سوالوں کا ایک کر کے تشفی بخش جواب دیتے۔ جن طلبہ کا سوال معنی آفریں اور باوزن ہوتا، ان کی حوصلہ افزائی فرماتے، اور اگر بعض اوقات سوال مہمل وغیر معنی خیز ہوتا، یا سوال طالبِ علم کی بے توجہی کا غمّاز ہوتا، تو اسے بلند آواز سے پڑھنے کے بعد تنبیہ فرماتے، یا کبھی تنبیہًا مسکراتے ہوئے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، پھونک کر ہوا میں اُڑا دیتے، اور فرماتے کہ: لو! یہ رہا اِس کا جواب۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں ارشاد ونصیحت کی لُطف آفرینیاں اور طلبہ کی

صورت حال پر دردو کرب کی دل فگاریاں بھی ہوتیں۔ چناں چہ موقع بہ موقع انذار وتبشیر بھی فرماتے رہتے، آپ کی نصیحتیں بے حد چشم کُشا ہوتیں، جن کی چند جھلکیاں یہ ہیں:

آپ کہا کرتے: جب سے طلبہ کے ذہن میں یہ بات آگئی کہ ہم فاضل ہو گئے، ان کی علمی ترقی رک گئی، اس لفظِ فاضل نے ان کا ناس پیٹ دیا، ارے بھائی! فاضل تو کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں۔ فاضل من الفضیلۃ بننے کے لیے پوری زندگی محنت شرط ہے۔

آپ کہا کرتے: ہم تمھیں عالم نہیں بناتے ہیں، بلکہ عالم بننے کی راہ پر ڈال دیتے ہیں، اب عالم بنو۔ آپ کہا کرتے: فراغت کے بعد علمی مشغلہ جاری رکھو گے، اور ذہین ہو تو ۱۰/سال بعد، متوسط ہو تو ۱۵/سال بعد اور کند ذہن ہو تو ۳۰/سال بعد علم آنا شروع ہوگا۔

آپ کہا کرتے: طلبہ دو طرح کے ہیں: ایک جو اپنے لیے پڑھتے ہیں، اور ایک جو ماں باپ کے لیے پڑھتے، جو اپنے لیے پڑھتے ہیں، وہ واقعی پڑھتے ہیں، اور جو ماں باپ کے لیے پڑھنے مدرسوں میں آتے ہیں، وہ پڑھتے نہیں، بلکہ پَڑتے ہیں، یعنی پَرے رہتے ہیں، اس لیے اپنی خوش دلی سے پڑھو، ماں باپ کے دباؤ سے نہیں۔

آپ کے ان جملوں نہ جانے کتنے بدشوق طلبہ کی زندگیاں تبدیل کر دی ہیں۔

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

ایک بہت نمایاں امتیاز۔۔۔ جو موجودہ دور میں شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتا ہے۔۔ یہ تھا کہ آپ کے یہاں پورے سال سبق کا ایک ہی نہج ہوتا، آپ سردًا اور روایۃً پڑھانے کے قائل نہ تھے، ہر ہر حدیث پر کچھ نہ کچھ کلام ضرور فرماتے، معرکۃ الآراء مسائل پر سیر حاصل گفتگو کرتے، ورنہ ہر حدیث پر ضروری کلام ضرور فرماتے، اگر کسی

روایت پر کلام ہو چکا ہوتا، اور وہ روایت دوبارہ آتی ،تو فرماتے کہ: اس پر کلام ہو چکا ہے، یوں بالکل خوش رفتاری کے ساتھ کتاب اپنی آخری منزل پر پراوٗ ڈالتی ،تعلیمی دنوں میں سفر کی عادت نہیں ،اور سبق بھی امتحانِ سالانہ سے بالکل قریب بند، اس لیے کتاب ختم ہونے میں کوئی دشواری درپیش نہ ہوتی۔

المختصر! ان جیسی بے شمار اعلی خصوصیتوں ، مستحکم اصولوں ،نرالی اداؤں، انقلاب آفریں نصیحتوں نے آپ کو ایوانِ تدریس کا ہر دلعزیز بادشاہ اور میدانِ تفہیم کا مشاق شہ سوار بنا دیا تھا۔

طلبہ کے درمیان آپ کی حیثیت ایک شمعِ فروزاں کی تھی ،جس پر شوقین و بدشوق تمام طلبہ پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ، ایک چشمۂ شیریں کی تھی ،جس پر محنتی وغیر محنتی تمام طلبہ پیاسوں کی طرح امنڈ پڑتے ، المختصر! فنّ تدریس میں آپ ایک مقناطیسی حیثیت کے مالک تھے ،جس کی طرف ہر کوئی آہن ریزوں کی طرح کھنچتا چلا آتا۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن وَر بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف استاد ہی نہیں ، استاد گر تھے ،نہ جانے کتنے تلامذہ حسبِ ظرف آپ کے طرزِ تفہیم کو اپنا کر کامیاب مدرس ہو گئے ،جن کی روشن مثالیں ملک میں پھیلے مدارس و جامعات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہ بھی اعجاز ہے آپ کے نطق کا
بے زبانوں کو طرزِ کلام آ گیا

بڑے خوش نصیب ہیں وہ علماء اور طلبہ جنہیں اس شہنشاہِ تدریس محدّث کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو!

جب بھی ان کو دھیان آئے گا تم نے فراق کو دیکھا ہے

آہ! ۲۵ ؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ صبح کی ابتدائی ساعتوں میں اس آبروئے تدریس فخرِ ملک وملت نے زندگی کی آخری ہچکی لے لی اور اپنے تمام اعلیٰ قدروں کے ساتھ رب کے حضور حاضر ہو گیا۔

اب بخاری پڑھانے کے لیے کس کو لائیں اور کہاں سے لائیں، کتابیں پڑھانے والے بہت ہیں، مگر دل میں اتارنے والا کوئی نہیں۔

اب کہاں جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں
اے ہجومِ نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

اللہ جل شانہ ان کی پاک روح پر رحمتوں کی موسلا دھار بارش فرمائے، جوارِ رحمت میں فروکش فرمائے، مادرِ علمی کو ان کا نعم البدل نصیب فرمائے، جملہ سوگواروں کو حوصلہ دے اور ہمیں ان کے تابندہ نقوش پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا الٰہ العالمین

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نُور سے معمور یہ خاکی شَبِستاں ہو ترا

❁...❁...❁

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

مولانا انور بن علی صاحب کاوی
استاذ حدیث دار العلوم عربیہ اسلامیہ محمود، گجرات

آسمان علوم قرآن وحدیث وفقہ واسرار شریعت کا روشن ستارہ حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کا آج مؤرخہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱، مطابق ۱۹ مئی صبح چاشت کے وقت ضیقُ النفس کی تکلیف میں دار فانی سے دارِ بقاء رحلت فرما گئے، بندہ کو ۱۹۷۵ء دار العلوم دیو بند میں حضرت کے ادنیٰ شاگردوں میں شمار ہونے کا موقع اللہ نے دیا، حضرت رح سے احقر نے دو کتابوں میں تلمّذ کا شرف حاصل ہوا، علم کلام میں مسامرہ اور ادب میں متنبی، اس انتساب کو احقر اپنا فخر سمجھتا ہے۔

دوستو!

زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا، لیکن ایسی شخصیت کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج وغم افسوس کا باعث ہوتا ہے، حضرتؒ فکر ولی اللہ اور حکمت قاسمیہ کے صحیح معنی میں ترجمان اور چلتی پھرتی زندہ شرح تھے، حضرتؒ کے علوم میں فکر ولی اللہ اور حکمت قاسمیہ کی پوری پوری جھلک نظر آتی ہے، آپؒ اپنی خداداد صلاحیت سے عمیق سے عمیق مباحث محسوس اور مشاہدہ کروا دیتے تھے، حضرت کی تصانیف سے یہ بات صاف واضح ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بنسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہیں، ہماری زندہ قوم کا یہ کام نہیں کہ جب کوئی شخصیت جن کے ساتھ قوم وملت کی قسمت وابستہ ہو مر جاوے اور دنیا

سے اٹھ جاوے تو چند کلمات حسرت وافسوس کے کہہ کر خاموش ہوجاوے یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پوچھ کر چہرہ صاف کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسی شخصیت کی یادگاری کو قائم رکھیں، اس لئے ہم حضرتؒ کی علمی وراثت کا مطالعہ کریں، ان کے علوم کو اس طرز سے جس طرز سے حضرتؒ پیش فرماتے تھے باقی رکھے۔

آہ! آج علوم شرعیہ کا گنج گراں مٹی کے نیچے دفن ہوگیا، حضرت شیخ الہندؒ کے شعر پر جو حضرت نانوتویؒ کے دفن کے وقت پڑھا تھا۔

مٹی میں کیا سمجھ کے دبائے ہو
دوستو گنجینہ علوم ہے یہ گنجینہ زر نہیں

بس اسی پر بات پوری کرتا ہوں۔

❁...❁...❁

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی
مشکی پور، جمال پور، کھگڑیا، بہار

کرونائی نظر بندی کے اذیتناک دور سے ہم گزر رہے ہیں۔نظامِ کائنات یوں تھم سا گیا ہے کہ انسان کہیں آ سکتا ہے نہ جا سکتا، نہ کسی کو کسی کی خوشی میں شرکت کی گنجائش ہے اور نہ کسی عزیز کے جنازے پر عقیدت کے دو آنسو نچھاور کرنے کا موقع، ذہن ودماغ بری طرح منتشر ومضطرب ہے، کہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت خدا کو یاد کیا جاتا ہے لیکن یہاں تو میرے اللہ بھی روٹھے ہوئے ہیں۔مسجدوں پر پہرا ہے، نہ جمعہ وجماعت نصیب ہے، نہ روزہ رمضان کا لطف ہے اور نہ ہی منبر ومحراب کا دیدار۔سب بے رونق، سب پھیکا پھیکا۔یہی کیا کم غم تھا کہ غم والم کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا اور ایک انتہائی محبوب اور مشفق ومخلص استاذ کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا۔ایک بار پھر ہمیں اپنی یتیمی کا احساس شدت سے ہو رہا ہے۔

استاذِ محترم مفتی سعید احمد پالنپوری علیہ الرحمہ کی ایک ایک ادا، ان کی رفتار وگفتار، ان کی نشست وبرخاست، ان کی یادیں اور ان کی باتیں سب ایک ایک کر کے ذہن کی اسکرین پر رقص کر رہی ہیں۔یقین نہیں ہو رہا ہے کہ مفتی صاحب اب اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے اور اب دوبارہ لوٹ کر ممبئی سے دیوبند نہیں آئیں گے۔

اس کا غم کم ہے کہ ایک عظیم انسان راہی ملکِ عدم ہوا لیکن اس لمحے کو یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور جسم پہ کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ اتنا بڑا انسان کیسی خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ایسی خاموشی کہ آخری وقت میں

ان کے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی کے علاوہ چند لوگ ہی موجود تھے۔ ان کے دیگر بچے اور اہل خانہ دیوبند تھے۔ نہ خاندان والے ہیں، نہ متعلقین و منتسبین ہیں اور نہ ہی شاگردوں کا کوئی کارواں۔ مولیٰ یہ کیسا عذاب ہے کہ چاہتے ہوئے بھی ان کا کوئی چاہنے والا آخری دیدار نہ کر سکا، انھیں غسل اور کاندھا نہ دے سکا۔ آہ جب تک وہ زندہ رہا ہزاروں کے جھرمٹ میں رہا لیکن آج جب اس کی روح جسم سے آزاد ہو چکی ہے اور زندگی کا آخری سفر درپیش ہے تو اس کے اس قافلے میں گنتی کے چند افراد شامل ہیں۔ اس مختصر سے باراتی کے ساتھ جنت کا یہ دولہا بڑی سبک خرامی کے ساتھ اپنے ابدی حجلہ عروسی کی طرف اس تیزی سے لپکا گویا اسے برسوں سے اس خوبصورت لمحے کا بے صبری سے انتظار رہا ہو۔ ہاں ہاں کون آرام نہیں چاہتا مفتی صاحب دن رات محنت کر کر کے تھک جو گئے تھے۔ ہاں میرے مولی! تیرا ارشاد بھی تو ہے کہ میں اپنے بندوں کے ساتھ ان کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔ تیرے اس پیارے بندے نے تو زندگی

بھر بدعات و خرافات کو آنکھیں دکھائیں اور مسلم معاشرے سے انھیں گھر بدر کیا تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسنون تعزیت کو بھی اس نے نوحہ گردانا تو اس کی رخصتی پر اس کے سامنے کیوں آہ و واویلہ ہوتا، کیوں میلہ لگتا؟ الٰہی! تیرا راز تیرے سوا اور کون جان اور سمجھ سکتا ہے؟

مفتی صاحب نرے ایک استاذ ہی نہیں تھے؛ وہ ایک بہترین شوہر، مشفق و مربی باپ، مخلص خسر، انصاف پرور دادا، ذمہ دار منتظم، شاندار مصنف اور جاندار واعظ بھی تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تدریس میں گزرا، ساتھ ہی انھوں نے تبلیغ و ارشاد اور تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا لیکن تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ اپنی خانگی ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہیں رہے، مفتی صاحب کے نزدیک شوہر، باپ، خسر اور دادا نانا جیسے الفاظ محض الفاظ نہیں تھے؛ ان الفاظ کے گہرے معانی بھی تھے اور وہ معانی تھے حقوق و ذمہ داریاں۔ حضرت مرحوم نے اپنے بڑے صاحبزادے کے ایک حادثے میں وفات کے بعد ان کے بیوی بچوں کی مکمل کفالت اپنے ذمے لی۔ ایک

بارانھوں نے دورانِ درس فرمایا تھا کہ دادا کے رہتے ہوئے والد گزر جائے تو شرعاً دادا کی جائیداد سے پوتے کا حصہ تو ساقط ہوجاتا ہے لیکن دوسری طرف اس کی کفالت کی اخلاقی ذمہ داری بھی دادا پر عائد ہوجاتی ہے۔اس ذمہ داری کو مفتی صاحب نے بحسن وخوبی نبھایا۔

مفتی صاحب نے ایک بار فرمایا کہ میرا اصل نام احمد تھا اور سعید کا اضافہ میں نے خود کیا ہے۔کبھی کبھی اپنے ابتدائی زمانے کی عسرت کا حال بھی بتاتے، کہنے لگے نا ندیر میں جب پڑھاتا تھا تو اس وقت تنخواہ معمولی تھی بمشکل پورے مہینے خرچہ چل پاتا تھا، ہم پان کے عادی تھے لیکن مہینے کی ۲۰ تاریخ کو پان کھانا چھوڑ دیتے تھے۔

مفتی صاحب کی پہلی زیارت جامعہ عربیہ خادم الاسلام ہاپوڑ میں ہوئی جب میں وہاں تجوید کا طالب علم تھا۔یہ ۱۹۹۷-۹۸ کی بات ہے۔اس وقت بس اتنا سمجھ سکا تھا کہ دیو بند کے حضرت تشریف لائے ہیں۔وہ تو بعد میں دیو بند پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ اچھا وہ حضرت مفتی صاحب ہی تھے۔اب مفتی صاحب کو دور دور سے دیکھتا رہتا، کبھی غلہ اسکیم کے جلسے میں اور کبھی کسی اور جلسے میں۔اسفادۃً سالِ دوم عربی میں آسان منطق کے توسط سے پہلی بار مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔پھر الفوز الکبیر اور مبادی الفلسفہ سے ملاقات کرتے ہوئے دورہ حدیث کے سال (فائنل یر) ترمذی شریف کے واسطے سے براہِ راست مفتی صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔مفتی صاحب سے ہم نے (۲۰۰۷) ترمذی اور طحاوی پڑھی۔ہمارے شیخ نصیر احمد خاں علیہ الرحمہ کی طبیعت جب زیادہ علیل ہوگئی تو بخاری شریف کے بھی کچھ حصے پڑھنا نصیب ہوئے۔ہمارے زمانے میں دورہ حدیث شریف میں صفِ اول میں جگہ پانے کے لیے بڑی مارا ماری رہتی، دارالحدیث کھلنے کا واضح اعلان نہ کیا جاتا، طلبہ بڑے بے چین رہتے، کہیں سے کوئی خبر مل جاتی کہ آج کسی وقت درسگاہ کھل سکتی ہے بس دروازوں پر لڑکوں کا تانتا بندھ جاتا، کئی کئی گھنٹے اور بسا اوقات پوری رات انتظار میں گزر جاتی، کبھی کبھی تو طلبہ دارالحدیث کی بالکنی سے بذریعہ رسی نیچے اتر کر اپنے ناموں کی پرچیاں پہلی صف کی تپائیوں پر چسپاں کر دیتے لیکن جب درسگاہ کھلتی تو عجیب ہنگامہ آرائی رہتی، بسا اوقات

بحث بحثی شروع ہو جاتی اور اس تنازعہ کے تصفیے کے لیے انتظامیہ کو دخیل بننا پڑتا۔ میں نے بھی مسندِ استاذ سے جانبِ جنوب کونے پہ جگہ پائی اس لیے کہ سامنے بیٹھنے کی اپنے اندر جرات نہیں پاتا تھا۔ مفتی صاحب کا درس ترمذی مغرب تا عشاء ہوتا۔ کیا مجال کہ درسگاہ خالی رہے، کتاب ساتھ نہ ہو گوارا لیکن طلبہ حاضر ضرور رہتے، چاہے دروازے کی چوکھٹ پر جگہ ملے یا چپلوں میں بیٹھنا پڑے۔

اس وقت مفتی صاحب کی عمر ۶۷-۶۸ سال تھی، محلہ بیرون کوٹلہ سے پیدل تشریف لاتے، تقریباً ایک کلو میٹر کا فاصلہ ہوگا، بابِ قاسم سے جامعہ کے احاطے میں داخل ہوتے، بابِ امداد سے ہوتے ہوئے مولسری کے کوئیں پہ پہنچتے اور چاپاکل سے پانی لیتے اور منہ صاف کرتے، اس لیے کہ وہ پان کا شوق رکھتے تھے لیکن درس حدیث کے وقت منہ میں پان رکھے رہنے کو نامناسب سمجھتے تھے۔ مفتی صاحب حدیث پڑھاتے نہیں؛ گھول کر پلا دیتے تھے کہ ادنی سے ادنی ذہنی سطح کے حامل طلبہ کا ذہن و دماغ بھی مطمئن ہو جاتا اور استاذ محترم جو کچھ اپنے شاگردوں کو سمجھانا چاہتے ہیں وہ ان کے ذہنوں میں پیوست ہو جاتا۔

مفتی صاحب نے محفوظات کے عنوان سے تین چھوٹے چھوٹے کتابچے تیار کیے تھے جو منتخب آیات و احادیث اور اسمائے حسنیٰ پر مشتمل تھے۔ ہمیں اس بات کا پابند کرتے کہ ہم انھیں زبانی یاد کریں۔ مفتی صاحب انتہائی محنتی انسان تھے اور طلبہ کی لاابالی انھیں گوارا نہیں تھی وہ کبھی کبھی ہماری لاپرواہیوں سے بددل ہو کر ناراض بھی ہو جایا کرتے تھے اور یہ وقت شاگردوں بطور خاص محنتی اور پابند طلبہ کے لیے بڑی آزمائش کا وقت ہوتا اور بڑی مشکل سے حضرت الاستاذ مانتے اور دوبارہ درسگاہ میں تشریف لاتے۔ ہماری اصلاح و تربیت کے لیے ان کا ایک انداز یہ بھی ہوتا تھا۔ چھوٹے موٹے عوارض کبھی بھی مفتی صاحب کی تدریس کی راہ میں حائل نہ ہوتے۔ ایک دفعہ انھوں نے فرمایا کہ رات بھر سر چکراتا رہا اور بے خوابی کی کیفیت رہی، میں نے اپنا بی پی یا شوگر چیک کیا تو مشین نے کہا "پڑھانا وڑھانا چھوڑ اور آرام کر" میں نے کہا اپنا فلسفہ تو اپنے پاس رکھ اور میں تو چلا پڑھانے، یہ یا اسی طرح

کے ملتے جلتے الفاظ مفتی صاحب کے تھے،کبھی میں نے انھیں ایسا نہیں دیکھا کہ وہ دورانِ درس سستی یا تھکاوٹ کا اظہار کررہے ہوں یا پڑھاتے پڑھاتے ان کے اندر اکتاہٹ پیدا ہورہی ہو۔ وہ درس نہیں دے رہے ہوتے ؛ عشق وجذب کے ایک عجیب وغریب عمل سے گزر رہے ہوتے ۔،انتہائی اطمنان کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر مزے لے لے کر اور مچل مچل کر پڑھاتے ۔دو چار احباب پر مشتمل ہمارا ایک گروپ تھا،ہم انتہائی پابندی کے ساتھ اسباق میں حاضر رہتے ،مفتی صاحب کی تقریر سنتے اور کاپی بھی لکھتے لیکن سچی بات یہ ہے کہ حضرت الاستاذ کی بہت سی باتیں ہمیں ہضم نہیں ہوتیں تو ہمارا مذکورہ گروپ آنکھوں آنکھوں ہی میں تبصرہ کر ڈالتا تاہم الحمدللہ سنجیدگی کے جامے سے ہم کبھی باہر نہ ہوئے اور مفتی صاحب سے براہِ راست تو کبھی سوال کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی اس لیے کہ ان سے سوال کرنے یا سوالیہ پرچی پیش کرنے کی کچھ شرطیں تھیں اور ان شرطوں پر ہر کسی کا کھرا اترنا بہت مشکل تھا۔مفتی صاحب علیہ الرحمہ کتنے محقق تھے اور کتنے ماہر تعلیم ، اس پہلو پر گفتگو ہوسکتی ہے لیکن رب ذوالجلال نے انھیں بلا کی قوت تفہیم جو دولت بیش بہا عطا کی تھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا،اس وصف میں وہ بلاشبہہ طاق اور اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ان کا اندازِ درس انتہائی مربوط ومرتب، پرکشش،سادہ،سہل اور رواں تو ہوتا ہی لیکن کبھی کبھی حسبِ حال لطائف وظرائف سے بھی قہقہہ بکھیر دیتے اور پورا دارالحدیث زعفران زار ہوجاتا۔ایک دفعہ کی بات ہے کہ طہارت کے باب کے ضمن میں پاکی ناپاکی بحث چل رہی تھی ،مفتی صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی کا ایک قصہ سنایا جب وہ مظاہر العلوم سہارنپور میں زیرِ تعلیم تھے۔فرمایا ایک بار گھومتا گھومتا اسٹیشن والی مسجد پہنچ گیا،استنجے کا تقاضہ ہوا،سامنے مٹی کا لوٹا نظر آیا،اسے لے کر استنجے خانے میں چلا گیا،فارغ ہوکر جب باہر آیا تو موذن ملک الموت کی طرح سامنے کھڑا تھا،اس نے مجھ سے لوٹا لیا اور غصے سے زمین پر دے مارا اور کرختگی کے ساتھ کہا لا آٹھ آنے ،تم نے لوٹا ناپاک کردیا۔بالآخر اس نے مجھ سے آٹھ آنے لیے۔مفتی صاحب نے فرمایا کہ بھئی !اس روز تو ہگنا مہنگا پڑ گیا۔اس نادان کو یہی پتہ نہیں تھا کہ کوئی چیز کب ناپاک ہوتی ہے اور ہوتی بھی ہے تو

اسے پاک کرنے کا طریقہ بھی ہوتا ہے۔ مفتی صاحب نے ایسے اچھوتے انداز میں اس قصے کو بیان کیا کہ ہم لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ایک بار انھوں نے فرمایا کہ تم میں سے پچاس فیصد کا پاجامہ ناپاک رہتا ہے اس لیے کہ تم اس سلسلے میں سنتوں کی پابندی نہیں کرتے۔

دعا کے سلسلے میں استاذ محترم نے فرمایا کہ جن نمازوں کے بعد نوافل نہیں ہیں ان میں تو نماز کے بعد ہی دعا کرو اور جن کے بعد نوافل ہیں ان میں نوافل کے بعد دعا کیا کرو اور جم کے کیا کرو۔

مفتی صاحب میدانی آدمی تو تھے نہیں؛ تاہم اپنے زبان وقلم اور علم وعمل سے طلبہ کی ایسی کھیپ تیار کرنا چاہتے تھے جو علم و دین میں تعمق وتصلب کے ساتھ ساتھ خدمت دین کے والہانہ جذبے سے بھی سرشار ہو، ایک پکا مسلمان اور سچا شہری بھی ہو۔

مفتی صاحب ہمیں کتابوں کے ساتھ زندگی کے اسباق بھی پڑھاتے تھے، فرماتے کہ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد جب دن ورات دس سال تک مستقل مطالعہ کروگے تو کچھ کچھ علم آنا شروع ہوگا۔ علم ومطالعے کو اپنا مشغلہ بنانے کی شاگردوں کو ہمیشہ نصیحت فرماتے۔ وہ اس بات کی نصیحت فرماتے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد قرآن کریم کی چند آیات اور چند احادیث کا ترجمے کے ساتھ مطالعے کا معمول بنالو اور اسے اپنی زندگی وظیفہ بنالو۔

حضرت عام طور سے طلبہ کی دو قسمیں بیان کرتے۔ (۱) اعلیٰ ذہن کے مالک۔ (۲) ادنیٰ ذہن کے حامل۔ ان کی خواہش ہوتی کہ اول الذکر دینی مدارس میں تدریسی لائن ہی سے وابستہ ہوں اور آخر الذکر تدریس کے علاوہ ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مدارس کے وہ اعلیٰ اذہان جو عصری جامعات کا رخ کر لیتے ہیں ان سے مفتی صاحب بہت نالاں رہتے اور کہتے کہ یہ طبقہ میرا مخاطب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مفتی صاحب کی نیت پر شک کی گنجائش نہیں ہے تاہم اپنے تشخصات کے ساتھ عصری اداروں میں علماء کی موجودگی بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمیں اس رویے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ پڑوس میں آگ لگی ہوئی ہے اور ہم مطمئن ہیں کہ ہم محفوظ ہیں۔ جواہر لال نہرو

یونیورسٹی نئی دہلی کے آٹھ سالہ قیام کے دوران میں مجھے اچھی طرح اس کا تجربہ ہوا کہ اس طرح کے مخالف ماحول میں بھی اگر ایک عالم اپنی عالمانہ شان کے ساتھ رہتا ہے تو وہ خود روشن ہوتا بھی ہے، روشن رہتا بھی ہے اور دوسروں تک روشنی پہنچاتا بھی ہے ۔

دارالعلوم دیوبند میں بھی تبلیغی جماعت کا کام ہوتا ہے (عارضی طور پر ابھی کچھ دنوں سے موقوف ہے) اور علی گڑھ میں بھی، لیکن دونوں میں نوعیت کا فرق ہے۔ دیوبند میں اساتذہ کی شمولیت صفر ہے جب کہ علی گڑھ میں اساتذہ ہی کی نگرانی میں سارا کام انجام پاتا ہے۔ یہاں جماعت سے جڑے طلبہ کا خیال ہے کہ اصل مقصود عمل ہے اور علم عمل تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے اس لیے جماعت کا نمبر پہلے ہے اور تعلیم کا درجہ دوسرے نمبر پر ہے ۔ وہاں والے کی فکر یہ ہے کہ وہ ایک پروسیس اور معاہدے کے تحت اس ادارے میں داخل ہوئے ہیں اس لیے اولین ترجیح تعلیم ہے لیکن عملی اور دعوتی زندگی کی عملی

مشق بھی بہت ضروری ہے اس لیے اپنے خارجی اوقات کو یہ لوگ ضائع کرنے کے بجائے انھیں کام میں لگاتے ہیں۔ تعلیم ان کے یہاں پہلی ترجیح ہے اور تبلیغی سرگرمیاں ثانوی ترجیح۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں جماعت کو عموماً مثبت نظریے سے دیکھا جاتا ہے اور دیوبند میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس تناظر میں مفتی صاحب کی رائے کی تفہیم آسان ہوسکتی ہے۔ ان کے نزدیک طلبہ کے لیے جماعت دیگر غیر درسی سرگرمیوں کی طرح کا ایک کام ہے اور اس کی حیثیت اضافی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس جماعت میں بے اعتدالی اس لیے بھی آرہی ہے کہ مرکز نظام الدین اپنے مرکز دیوبند سے دور ہوتا جارہا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ امیر جماعت مولانا محمد یوسف کاندھلوی جب بھی سہارنپور جاتے تو دیوبند ہوتے ہوئے جاتے اور اور وہاں سے واپسی پر بھی یہی معمول رہتا۔ وہ دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے اساتذہ سے پورے طور پر جڑے ہوئے تھے، اپنی کارگزاریوں سے انھیں آگاہ کرتے، ان سے مشورے لیتے اور اربابِ دیوبند کو بھی بہت سے معاملات میں مفید مشوروں سے

نوازتے ،لیکن ان کے بعد یہ سلسلہ تقریباً منقطع ہو گیا۔ مفتی صاحب اس پر افسوس کا اظہار بھی کرتے۔

ہمارے زمانے میں دورہ حدیث میں تقریباً آٹھ سو طلبہ تھے۔ مفتی صاحب فرماتے تھے کہ اتنی بڑی درسگاہ اصولاً صحیح نہیں ہے ،کم ازکم اس کی چار ترتیبات (Sections) ہونی چاہئیں۔ وہ یہ بھی فرماتے کہ مدارس میں آج عموماً یہ ہورہا ہے کہ شیخ الحدیث کا انتقال ہوا اور مہتمم ہی اس مسند پر قابض ہو بیٹھا چاہے اس کے اندر اس کی اہلیت ہو کہ نہ ہو اور طنزاً کہتے کہ گاؤ تکیہ لگایا ،بغل میں ایک اگالدان رکھا اور بن گئے شیخ الحدیث۔ کبھی یہ فرماتے کہ آج مدارس سے اچھے نتائج اس لیے برآمد نہیں ہورہے ہے کہ اہل مدارس نے اموال زکوٰۃ میں خرد برد شروع کردی ہے اور اس کے مصرف میں بڑی بے اعتدالی آگئی ہے۔

وہ برابر ہمیں محنت کی تلقین کرتے اور فرماتے کہ یہاں سے چلے جاؤ گے ،شادی ہو جائے گی اور صغریٰ کبریٰ ملنے کے بعد نتیجہ بھی کھٹا کھٹ نکلنا شروع ہو جائے گا اور ہر سال سلام ابا بھی ہونے لگے گا۔ اس لیے ابھی ہی جو کرنا ہے کرلو۔ یعنی بعد میں بہت کچھ کرنا چاہتے ہوئے بھی نہیں کر پاؤ گے۔

مفتی صاحب کا چوں کہ ہر سال لندن و کناڈا وغیرہ بیرون ممالک کا سفر ہوا کرتا تھا اور ان کا سابقہ انگریزی داں طبقے سے بھی پڑتا تھا اس لیے ایک زمانے میں انھوں نے انگریزی اخبار پڑھنے کا آغاز کیا تھا لیکن الٹی سیدھی تصاویر کی بہتات کی بنا پر اسے ترک کردیا۔

تصویر کشی کے جواز و عدم جواز بارے میں علمائے ہند اور علمائے عرب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے یہاں شدت پائی جاتی ہے اور وہاں تساہل۔ آج تو تقریباً سب برابر ہی ہو گئے ہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پچاسی سالہ جشن کا موقع تھا، میں بھی شریک تھا، تصویر کشی دھڑلے سے ہو رہی تھی، علمائے عرب اس عمل میں پیش پیش تھے اور میں گریزاں، پروگرام کے اختتام کے بعد ان سے گفتگو ہوئی لیکن انھوں نے اس عمل کو الگ اور حدیث میں آئی وعید کو دو علیحدہ شئی قرار دیا۔ میں نے دوسرے روز علی

الصباح ان میں سے ایک صاحب کو صبح کی چہل قدمی کے بہانے سڑکوں پہ گھمانے لے گیا اور ایک جگہ ہنومان مندر کے پاس ہم رک گئے جہاں ہنومان جی کی ایک قدآدم تصویر لگی ہوئی تھی اور لوگ اس کی پوجا کر رہے تھے۔ جب دوبارہ پروگرام میں میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ بھی تصویر کشی سے گریزاں ہیں۔ مفتی صاحب نے اس عالم کا نام بھی بتایا تھا جو مجھے اب یاد نہیں رہا۔ مفتی صاحب اپنی رائے تھوپنے کے بجائے اسے مثبت اسلوب اور نرم لہجے کے ساتھ سمجھانے کی پرخلوص کوشش کرتے تا کہ مخاطب خود ہی سمجھ کر اس کا قائل اور اس پر عامل ہوجائے۔

ہمارے شیخ مولانا نصیر احمد خاں صاحب جب صاحبِ فراش ہو گئے تو دارالعلوم کو شیخ الحدیث کا مسئلہ درپیش آیا، دارالعلوم کے خوشہ چینوں اور بہی خواہوں کے لیے یہ وقت بڑی کشمکش کا تھا، اسی دوران جمعیۃ تنازعہ بھی طول پکڑ گیا تھا، اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ بڑی آسانی کے ساتھ شیخ الحدیث کے لیے حضرت الاستاذ کا نام متعین ہو گیا اور اللہ نے جتنے دن مقدر کیے تھے اتنے دن مفتی صاحب اس منصبِ عظیم پر فائز رہے۔

استاذ محترم کی خدمات کی کئی جہات ہیں۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ، لیکن میرے نزدیک ان کی دو خصوصیات ایسی ہیں جو کروڑوں میں کسی کو نصیب ہوتی ہیں۔ اول ان کا ۲۰۰۲ سے پہلے پہلے مدرسے سے لی ہوئی تنخواہوں کی واپسی، یعنی دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت، گجرات میں نو سال (۱۰۶۵-۱۹۷۳) اور دارالعلوم دیوبند میں تیس سال (۱۹۷۳-۲۰۰۲) کی لی ہوئی تنخواہ کی کل رقم (۹۷۳۰۵۴/۷۵) نو لاکھ تہتر ہزار چون روپے پچہتر پیسے واپس کر دی۔ اس کے بعد تادم واپسیں تنخواہ نہیں لی۔ دوسرا بڑا امتیاز ان کا یہ تھا کہ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد خود، شادی کے بعد اہلیہ اور صاحبِ اولاد ہونے کے بعد تمام بیٹوں اور بیٹیوں اور بیٹوں کی شادیوں کے بعد تمام بہوؤں کو حافظ بنانے کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ مفتی صاحب کی یہ ایسی خوبی ہے کہ دور دور تک ان کا کوئی ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ **ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔**

سال کے اخیر میں یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ اس بار مفتی صاحب ختم بخاری کے موقعے پر نہ تو ناصحانہ کوئی کلمہ کہہ

پائے اور نہ ہی دعاء کر پائے۔ آج الفاظ کے بجائے ان کے آنکھوں سے نکلے آنسو کچھ نہیں بہت کچھ بول رہے تھے اور مفتی صاحب یوں ہی اٹھے اور چلے گئے، استاذ کے ساتھ شاگردوں کی بھی گھگھی بندھ گئی۔ مجھے جب یہ خبر ملی تو ٹھٹھک سا گیا، یہ محض تشویش نہیں تھی بلکہ کسی طوفان کا شاخسانہ تھی جو ۲۵ رمضان ۱۴۴۱ھ کو ان کی وفات کی صورت میں سامنے آئی۔ اللہ انھیں اعلی علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی جملہ خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور دارالعلوم دیو بند کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

❁...❁...❁

نابغہ روزگار شخصیت تھے مفتی سعید-نور اللہ مرقدہ-

شیخ الحدیث دار العلوم حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی علمی و عملی زندگی کی ایک جھلک؛ کچھ یادیں کچھ باتیں

مولانا محمد عطاء اللہ داؤد القاسمی
ریسرچ اسکالر جامعہ ام القری، مکہ مکرمہ

عالم بالا کے فیصلے سے کسی کو مفر نہیں، موت کا ایک وقت مقرر ہے، ہر کسی کو اس کا مزہ چکھنا ہے،" کل نفس ذائقة الموت" (آل عمران:۱۸۵) مکہ میں رمضان کی چھبیسویں، جبکہ ہندوستان میں رمضان کی پچیس اور عیسوی ۱۹/ ۵/ ۲۰۲۰ء تاریخ تھی، بعد نماز فجر واٹس آپ کے ذریعے خبر ملی کہ، حضرت اس دنیاں کو چھوڑ چکے ہیں۔

بچھڑے وہ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
ایک شخص پورے شہر کو ویران کرگیا

انا للہ و انا الیہ راجعون، بہت دیر تک افسوس میں ڈوبا رہا، بار بار میسیج کو پڑھتا رہا، آنکھیں نم اور دل سے آہیں نکل رہی تھیں، کہ سالار قافلہ کی علمی شہادت ہوگئی، ایک روشن دماغ تھا نہ رہا، ایک کامیاب معلم و مربی ہمارے درمیان سے اٹھ گئے، ایک مخلص ناصح، ایک عظیم محدث، ایک گوہر نایاب فقیہ جو حقیقةً فقیہ النفس تھے، رخصت ہوگئے، اللہ نے آپکو جو کسبی اور وہبی صلاحیتیں دی تھیں بے مثال تھی؛ ہر فن سے دلچسپی ہر علوم سے لگاؤ، نحو وصرف منطق وفلسفہ، اصول فقہ، اصول حدیث، ہر موضوع پہ آپ نے قلم اٹھایا، ہر فن کے زلف برہم کو آپ نے سنوارا، دوران درس آپ ایک مجتہدانہ شان میں نظر میں آتے، آپ ایک اصولی، متکلم اور فقیہ شخص تھے، دیکھنے میں

بارعب، باوقار، کثیف اللحیہ، سر پہ عمامہ اور ہمیشہ جبہ میں ملبوس رہتے، جسم وجثہ کے اعتبار سے بھی باکمال شخصیت کے مالک تھے، آپ اپنے ہر قول وعمل سے نئی نسل کیلئے متفکر رہتے تھے، انکی باتوں سے نصیحتوں سے تقریروں سے پتہ چلتا تھا کہ کس قدر قوم وملت اور علمی تخلف کے تئیں متفکر ہیں، آپکے وجود سے علمی حلقہ میں ایک ولولہ ایک شور بپا تھا، انداز درس نرالا، افہام وتفہیم کے ہر گر سے واقف تھے۔

درس وتدریس میں آپکا نمایاں مقام

۲۰۰۹ء ۱۴۳۰ھ میں استاذ محترم سے براہ راست دار العلوم دیوبند کی عظیم پرشکوہ دار الحدیث میں بخاری شریف جلد اول اور ترمذی شریف جلد اول پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، آپ ایک عظیم محدث، تھے، حدیث کی باریکیوں اور فنون سے گہرا لگاؤ تھا، روایت کے ساتھ ساتھ جب احادیث پہ درایہ گفتگو کرتے تو گھنٹوں گزر جاتا، کبھی کبھی متعینہ وقت سے آدھا آدھا گھنٹہ زائد گفتگو کرتے چلے جاتے کچھ پتہ نہیں چلتا، بخاری شریف کے کئی مسائل میں آپ کی رائے محدثین کی شروحات سے ہٹ کر ہوتی، مثلا: حضرت موسی علیہ السلام اور خضر کے واقعات میں آپ کی رائے یہ تھی کہ خضر نہ نبی تھے نہ رجل صالح بلکہ میری رائے ھے، کہ ملک ارضی میں سے ہیں جسے اللہ تعالی نے تکوینی نظام کیلیے پیدا فرمایا ھے، اس پر وہ دلیل بھی دیتے تھے اور دو تین تجرباتی واقعہ بھی بیان کرتے تھے، اس طرح دیگر مختلف مقامات پر آپ کی رائے سب سے الگ ھوتی، بخاری کے درس میں اولاً آپ ترجمۃ الباب پہ بحث کرتے اور احادیث الباب اور ترجمۃ الباب میں جو باریکی مطابقت ہوتی اس پہ گفتگو کرتے، اور فرماتے بخاری شریف کے درس میں یہی اصل سمجھنا ہوتا ہے، اور ترجمۃ الباب کی تشریح کے بعد امام بخاری کی فقاہت کو طلبہ کے سامنے رکھتے اور فرماتے "یہاں سے امام بخاری کی فقاہت شان چھلکتی ہے،" جب بخاری شریف کا درس شروع ہوا، پہلی حدیث پہ جب انکی گفتگو سنی، آپ کے طرز استدلال اور ترجمۃ الباب اور حدیث کے مابین مطابقت جو آپ نے بیان کیا اسے سنکر دل باغ باغ ہوگیا، بخاری شریف کا پہلا باب ہے، کیف کان بدء الوحي

إلى رسول اللہ صلى اللہ علیہ وسلم امام بخاری نزول وحی کا طریقہ ذکر کرتے ہیں اور پہلی حدیث لاتے ہیں إنما الاعمال بالنیات ۔دونوں میں مطابقت کیا ہے؟ مفتی صاحب رحمۃ اللہ فرمانے لگے: کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی متلو، (جسکی تلاوت کی جائے، دوسرا وحی غیر متلو (جسکی تلاوت نہیں کی جاتی ہے) یعنی احادیث، لہذا جو احادیث صیحہ ثابت ہوں، لہذ إنما الاعمال بالنیات والی حدیث وحی میں سے ہے یہ مطابقت ہے۔

یہ ایک مثال ہم نے پیش کی بخاری شریف کے بیشتر مقامات پہ آپنے امام بخاری کی آراء سے اختلاف کیا، اور کھل کر فرماتے اس جگہ ہم ان سے اختلاف کرتے ہیں، اب تو مکمل انکے دروس تحفة القاري کے نام سے ۱۲ جلدوں میں چھپ کر آگئی، سال ۲۰۰۹ بخاری کا پہلا سال تھا بلکہ اس سے پہلے آدھے سال شیخ الحدیث مولانا نصیر خان کی علالت کے بعد شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز کئے گئے تھے۔

ترمذی اول میں مفتی صاحب زیادہ زور مسائل سمجھانے میں دیتے تھے اور خواص طور پہ احناف کے دلائل کو طلبہ کے سامنے بڑی دقت سے رکھتے، اور دوسرے ائمہ کے استدلال بھی پوری امانت سے رکھتے، اور فرماتے فقہی اختلاف کا دار مدار نص فہمی کا اختلاف ہے، وہ طلبہ سے برملا فرماتے، سنو! ہمارے درمیان اور دیگر ائمہ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ نص فہمی کا اختلاف ہے، اور مجھے یاد ہے فرماتے: ۹۷.۵۰ ساڑھے ستانوے فیصد مسئلہ میں چاروں ائمہ متفق ہیں جو نصوص سے ثابت ہیں اور واضح ہے صرف ڈھائی فیصد مسائل میں نصوص فہمی کا اختلاف ہے جس میں کسی ایک کی تقلید کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، لیکن چاروں برحق ہیں، درس میں شافعی طلبہ بھی رکھتے کسی کسی مسئلے میں فرماتے شافی مسلک میں کیا کوئی شافعی طالب بتائے، البتہ اہل حدیث اور جماعت اسلامی سے اختلاف ہے وہ فکری اختلاف ہے، وہ اپنی بات پہ مبنی رہتے، انکے مزاج میں تصلب تھا جس کو وہ حق سمجھتے اس پہ ڈٹ جاتے۔

تصویر اور ویڈیو گرافی کے مسائل میں ان کا دیگر علمائے کرام سے شدید اختلاف تھا، لہذا انہیں کے حکم سے

کیوں کہ وہ صدر المدرسین بھی تھے، دار العلوم دیو بند کے احاطہ میں جگہ جگہ کو چہ آویزاں کیا گیا تھا، دار العلوم کے احاطے میں تصویر کھینچنا اور فوٹو گرافی سخت منع ہے؛

Not Allawed photo graphy in darul loom area

خلاصہ یہ کہ قول وعمل میں تضاد نہیں تھا جو کہتے تھے ویسے ہی عملی شکل میں نظر بھی آتے، تاہم اس مسئلے سے دوسرے کو اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔

آپ ایک فقیہ النفس شخصیت تھے، مسائل استنباط کرنے میں خداداد صلاحیت تھی، ہر چھوٹی چھوٹی گفتگو پر دلیل پیش کرتے، طلبہ دورہ حدیث کی تعداد اسوقت ۹۰۰ تھی ہر کوئی یہ چاھتا تھا کہ اساتذہ کے مسند درس کے قریب ہم بیٹھیں۔

ایک دن مفتی صاحب تک بات پہنچی تو اس مسئلے پہ بولے، سامنے کے تین یا چار صف طلبہ کے نمبرات کو دیکھو، اور ادارہ تعلیمات والے جو طے کرے، اس میں کسی کو دخل اندازی کا جواز نہیں چار صف کے علاوہ باقی سب آزاد ہیں جو پہلے کلاس میں پہنچے گا، جو جہاں بیٹھے گا اس کا حق جوگا، اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے حضرت الاستاد نے جو دلیل دی تھی؛ وہ مزے کا ہے، حدیث میں ہے: **مِنًی مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ۔**

عن عائشة رضي الله عنها قلنا: يا رسول الله ألا نبني لک بيتا بمنى يظلک. قال: لا، منًى مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ (رواہ الترمذي: رقم الحديث: ۸۸۱)

ایام حج میں منی ومزدلفہ میں حجاج کرام کو آزادی ھوا کرتی تھی جو جہاں پہلے اپنی اونٹنی کو بیٹھا دے اپنا خیمہ گاڑ لے وہ اسکی جگہ ہوگی (گرچہ مرور زمانہ کی وجہ سے حالات تبدیل ہونے کی وجہ سے اب پہلے سے طے ہوتا حج کمیٹی اسے ترتیب دیتی ہے) اس سے استدلال کرتے ہوئے مفتی صاحب نے بتایا کہ کلاس میں بھی یہی اصول کارفرما جوگا، اللہ اکبر، سلام کے مسائل پر آپ فرماتے سلام کرنا سنت ہے اور جواب دینا واجب لیکن یہ ایسی سنت کو جس

کا ثواب واجب سے زیادہ ہے سلام کے باب میں، یہ تو چند مبالیں تھیں، علمی لطیفے، درس میں جوب سناتے، عبارت خوانی میں اگر طبعیت کے خلاف ہوتی تو فرماتے، "رھنے دے اس سے اچھا میں خود پڑھ لوں گا"

گھریلو تربیت کا نرالا انداز:

آپ اپنی زندگی کے اکثر معمولات گھریلو ہوں یا مابین الاساتذہ یا کسی اور کے ساتھ طلبہ سے شیر کرتے تھے، اور واضح بھی کر دیا کرتے تھے اس سے سیکھو، گویا آپ اپنی عملی زندگی سے بھی طلباء کی تربیت فرماتے تھے، حفظ قرآن کا اپنا واقعہ سنایا کہ میں شروع میں حفظ نہیں کیا بلکہ دار العلوم دیو بند آ کر افتاء وتعریب کے سال میں حفظ قرآن مکمل کیا، اس کا فائدہ علمی زندگی میں محسوس کر رہا ہوں، الحمدللہ، اپنے گھر کے واقعہ بیان کرتے کہ جب میری شادی ہوئی میرے اہلیہ حافظہ قرآن نہیں تھی میں نے اپنی نگرانی میں اسے حفظ کروایا، پھر جتنے بچے ہوئے سب کو میری اہلیہ نے حفظ کروایا، ماشاءاللہ مفتی صاحب کو اللہ نے کثیر الاولاد بنایا تھا، آپکے ۱۱/ ۱۲ لڑکے ہیں فرماتے تھے جب بچوں کی شادی ہوئی تو جو بہو حافظہ نہیں ہوا کرتی تھی شروع کے تین سال تک گھر میں ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا، نہ کھانا بناتی نہ شوہر کا کپڑا دھوتی صرف اور صرف انکو حفظ مکمل کرنا ہے، واقعی گھریلو۔ ماحول کو اس انداز سے تربیت کا کارخانہ بنانا اور آنے والی دلھن کے ساتھ اس طرح کا رویہ شاید کہیں کہیں سننے کو ملے۔

بچوں کے درمیان وظیفہ مقرر کرنا:

مفتی صاحب اپنے بچوں کی تربیت اس انداز سے کرتے تھے کہ جو جس میعار کا ہوتا اسی اعتبار سے انکو ماہانہ خرچ کیلیے روپیہ ملتا، کوئی ثانویہ میں ھے کوئی، مولوی کے سال میں پڑھ رہا ھے، کوئی عالمیت کے سال میں ھے، تو اسی انداز سے وہ سب کو مدرسے کے اخراجات طے کرتے، سال کے اخیر میں دوران درس وہ طلبا سے نصیحت کرتے کہ اب ایک ماہ کے بعد تم فارغ ہو جاؤ گے تو سنو!

طلباء کی تین قسمیں ہیں ایک اعلی قسم کا طالب جو ذہین ھیں اور گھریلو حالات اچھے ہیں وہ اپنی تعلیم مزید

آگے رکھنا چاہتے ہیں، انکو چاہیئے کہ تخصصات میں جائے اور جوب ترقی کرے۔ دوسرا قسم متوسط قسم کا طالب جو فراغت کے بعد کہیں درس وتدریس میں لگ جانا ہے۔ تیسرا جواب کہیں اپنا کاروبار میں لگ جائیگا یا کہیں عملی میدان میں لگ جائیگا، اسکے لئے میرا مشورہ ہے کہ پہلے تم جماعت میں چلہ لگاؤ پھر اسکے بعد جہاں تک ہوسکے دین پر عمل کرو، یہ بات میں اسلئے کہ رہا ہوں اب تمہارا سابقہ زیادہ تر تبلیغی جماعت کے ساتھیوں سے پڑیگا، ایک زمانہ سناش، آپ ایک پیدرانہ شفقت رکھنے والے ماہر مربی تھے۔

تصنیفی وتالیفی کاموں کی ترغیب:

آپ ایک عظیم محقق، بے مثال شارح حدیث، اور لاجواب مفسر قرآن تھے، تحقیق وتالیف کے میدان میں آپکا سب سے نمایاں کارنامہ شاہ ولي الله محدث دہلوی کی مایہ ناز کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، اولا اسکے تین مخطوطہ آپ نے جمع کی ایک مخطوطہ آپ پاکستان سے اسوقت کے حساب سے ڈیڑھ لاکھ میں خریدی، پھر تینوں کو جمع کر کے اس کی شرح لکھی جس نے علمی حلقہ میں ایک ہلچل پیدا کردی، ہر کسی نے اسے دل کی آنکھوں سے سجایا اور ہر مکتب فکر کے لوگوں نے اسے قبول کیا، اور علمی حلقہ کا ایک خلا پر ہوگیا، اس کتاب میں سب سے اہم بات آپ کے باب کے شروع میں جو گفتگو کی ہے وہ بڑا زبردست ہے، جو اصل کتاب کی شرح کا مقصد ہے، اور جسے فکر ولی اللہی کا شگوفہ پھوٹتا اور علمی خوشبو مہکتا نظر آتا ہے۔

تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی:

درس ترمذی آپ کا مشہور درس تھا، اس میں دورہ حدیث کے طلباء کے علاوہ آنے والے مہمان دیگر کلاس کے طلبہ بھی شریک ہوجایا کرتے تھے، دارالحدیث کا کشادہ حال بھی تنگ ہوجاتا تھا، انہیں دروس وتقاریر کا مجموعہ ہے، جو تمام طریقے سے محقق ہوکر تصنیفی قالب میں تیار ہوکر ۸ جلدوں میں منظر عام پر آگئی ہے۔

تحفۃ القاری:

یہ بھی آپ کی اردو شروحات میں بہترین بخاری کی شرح جو بارہ جلدوں میں شائع ہوکی ہے اور تفسیر میں ہدایت القرآن، ایک بیش قیمتی خزانہ ہے، اسکے علاوہ چھوٹی بڑی مختلف موضوعات پہ آپ نے قلم اٹھایا، اور پورا پورا حق ادا کیا، طلبہ سے مخاطب ہوتے کہ بیس سال پڑھو اور بیس سال پڑھاؤ اسکے بعد تھوڑی علم کی خوشبو آئیگی اور اگر تصنیف وتالیف کے کام میں لگو گے تو علم میں اور فن میں اضافہ ہوگا، اقرأ باسم ربک...... کی تفسیر میں آپ درس وتدریس اور مطالعہ اور تالیف کی طرف اشارہ فرماتے، قرآن بحر بیکراں ھے، ہر طرح کے مسائل اہل علم اپنے ذوق کے اعتبار سے استنباط کرتے ہیں۔

مولانا سے آخری بالمشافہ ملاقات:

۲۰۰۹ء میں دورہ حدیث سے فراغت کے بعد کبھی ملاقات نہیں ہوی تھی، تعلیمی ایام روز بروز گزرتا گیا اللہ تعالی کے فضل وکرم سے نیز انہیں بزرگوں سے پڑھنے اور انہیں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کا صلہ ہے کہ دورہ حدیث کی سند سے میرا داخلہ ۲۰۱۲ء میں جامعہ ام القری مکہ مکرمہ میں ہوا، پھر ۲۰۱۶ء کے مارچ میں مشائخ جامعہ ام القری کے ساتھ ہندوستان کے اہم مدارس کے دورہ میں ندوہ و جمعیت علماء ہند کے بعد دارالعلوم کی زیارت ھوی، دارالعلوم دیوبند میں مہمانوں کا قیام تھا، عصر بعد شیخ کی تقریر مسجد رشید میں ہوئی بعدہ اسی روز عشاء بعد ۱۴ رویں تاریخ کی شب مولانا عارف جمیل صاحب- استاذ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب سے مولانا مفتی رحمۃ اللہ علیہ سے تفصیلی ملاقات ہوئی واضح رہے اس وقت جامعہ ام القری کے مایہ ناز استاذ فضیلۃ الشیخ الدکتور علي صالح محمد المحمادي حفظہ اللہ- مدرس معہد الحرم المکي الشریف اور أحمد محمد الخیري المکي اور مولانا عبدالشکور صاحب المفتاحی، (بنگلور) اور رفیق درس مولانا خالد عبدالقیوم الندوی لکھنوی، حافظ عرفان عبدالرؤف نیپالی تھے۔

رات ۱۰ بجے تقریباً مفتی صاحب کے گھر پہنچے آپ نے مہمانوں کا باھر آکر استقبال کیا پھر فرش پر ہی سب

حضرات تشریف رکھے جو حلقہ دیو بند کے بزرگوں کا متواضعانہ ودرویشانہ عادت ہے، دوران گفتگو اولا شیخ نے سب سے کہا اپنا اپنا تعارف پیش کیجیے، داہنی طرف سے سبھی لوگ اپنا اپنا نام اور موجودہ عمل بتایا، جب شیخ سے پوچھنے لگے تو میں شیخ کا تعارف کرانے لگا مفتی صاحب برجستہ بول پڑے کیا میں آپ سے پوچھا ہوں،؟ جس سے پوچھا ھوں وہ بتائے ،تو مولانا عارف جمیل صاحب قطع کلامی کرتے ہوئے بولے حضرت مشائخ کے کولیکر جامعہ ام القری سے لیکر آئے ہیں وہ زیادہ انکے متعلق جانتے ہیں وہ انکے استاذ ہیں ، اور دیوبند کے فارغ ھیں، اس پر مفتی صاحب نے خوشی کا اظہار کیا، اور تعارفی بات چیت کے بعد ہم نے اپنی شاگردی کا مفتی صاحب کے ساتھ اظہار کیا اور کہا کہ آپ کے درس بخاری میں میرا سب سے زیادہ نمبر تھا جس پر آپ نے پوزیشن والے طلباء کو انعام بھی دیا تھا، اور دورہ حدیث میں ششماہی میں الحمدللہ میری دوسری پوزیشن بھی تھی کافی خوش ہوئے ، اور دعائیں دی چائے نوشی کی محفل سجی بسکٹ، نمکین، چائے سے مہمانوں کا استقبال کیا، اپنا پورا تعارف پیش کیا، اور تصنیفی کاموں کے تعلق سے مشائخ کے سامنے اپنا سابقہ اور آئندہ کے خاکے رکھے۔مشائخ ام القری حضرت کی اعلی منصبی، دوسری طرف سادگی کو دیکھ کر بے ساختہ بول پڑے" آپ کو دیکھ کر خدا یاد آنے لگا" یہی نہیں راستے بھر بار بار ان کی سادگی اور علمی تفوق کا تذکرہ کرتے۔

حضرت کی تدفین:

آپ جیسا کہ معلوم ہوا ممبئی کے جوگیشوری قبرستان میں ۲۰۲۰/۵/۱۹ء پچیسویں رمضان شب قدر والی راتوں کے انوار وبرکات سمیٹتے جسے علی الصبح بوقت چاشت اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور ممبئی ہی میں کرونا وائرس اور لاک ڈان کی وجہ سے محض ۱۵ سے ۲۰ لوگوں کے ہاتھوں سپرخاک ہوے،لوگ چاہ کر بھی شریک جنازہ نہ ہوسکے۔

پھول کیا ڈالوگے تربت ہر میری، خاک بھی تم سے ڈالا جائیگا کے مصداق ٹھہرے۔اخیر میں دعا گوں ہوں کہ

اللہ مفتی صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور بروز قیامت صدیقین شہداء صالحین کے صف میں کھڑا کرے، لاکھوں کی تعداد میں انکے شاگرد یقیناً سب انکے حق میں دعا گو ہونگے۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحَر مرقد فرُوزاں ہو ترا
نُور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحَد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❁...❁...❁

داغ کس کا ہے کہ ساری انجمن خاموش ہے

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی
استاذ ادارہ اشرف العلوم، حیدرآباد

یہ کیسا وقت آن پڑا ہے کہ ہر کوئی مستحق تعزیت بنا ہوا ہے، میں آپ کی تعزیت کررہا ہوں، آپ میری تعزیت کررہے ہیں، اکابر سے اصاغر تک سب ہی رنجور وحزیں اور مجسمۂ غم و ماتم بنے ہوئے ہیں اور کیوں نہ ہو کہ حضرت الاستاذ کی وفات کا سانحہ ایک فرد کی وفات نہیں، ایک کائنات کا نقصان ہے، ایک عہد کا خاتمہ ہے، ایک صدی کی رحلت ہے۔

ہم اور آپ کس کس کو روئیں گے؟ منقولات کے ماہر کو؟ معقولات کے شناور کو؟ فکر ولی اللہی کے پاسبان کو؟ علوم قاسمیہ کے امین کو؟

داغ کس کا ہے کہ ساری انجمن خاموش ہے
شمع کس کے نور سے محروم ظلمت پوش ہے
حسرتِ نظارہ بن کر آنکھ وقفِ جوش ہے
کس کی رخصت ہے یہ ہم سے کون یوں روپوش ہے

درحقیقت یہ کسی فرد فرید کی وفات نہیں ہے؛ بل کہ یہ رحلت ہے ایک مردم ساز استاذ کی، عظیم مفسر قرآن کی، مایۂ ناز محدث؛ بل کہ رئیس المحدثین کی، کہنہ مشق ومزاج شریعت سے باخبر فقیہ کی، بہترین مصنف ومولف کی، اسلام کے متکلم وشارح کی، ناموس رسالت وختم نبوت کے محافظ کی اور مسلک اہل سنت کے بے لاگ ترجمان کی۔

حضرت مفتی صاحب کی وفات کا صدمہ صرف کسی خاندان، کسی علاقے اور کسی ادارے کا صدمہ نہیں؛ بلکہ پورے اہل دین، اور اہل علم کا صدمہ ہے اور میرا احساس ہے کہ ہم سب سے زیادہ تعزیت کا مستحق ’’دار العلوم دیوبند‘‘ ہے جہاں نصف صدی پر محیط آپ کی بےلوث خدمات نے ایک عالم کو سیراب کیا، جہاں کی مسند حدیث کو آپ نے عرصۂ دراز تک آباد رکھا، جہاں کے سرد و گرم حالات کا آپ نے نہ صرف مشاہدہ کیا؛ بل کہ آگے بڑھ کر قائدانہ رول ادا کیا، آج وہ مادر علم وفن اپنے ایک ایسے علمی ترجمان اور فکری نمائندے سے محروم ہوگئی؛ جس کا متبادل عالمِ اسباب میں بظاہر کوئی نظر نہیں آتا۔

تاریخ میں ہے کہ حضرت قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ، اُن بانصیب افراد میں سے تھے جنہوں نے زمانۂ جاہلیت میں بھی اپنے اوپر شراب حرام کر رکھی تھی، جب ان کا انتقال ہوا تو عبدہ بن طبیب (جو ایک مسلمان شاعر تھے) نے بڑا جاندار مرثیہ کہا‘ جس کا ایک شعر ضرب المثل ہے:

وما کان قیس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

(قیس کا مرجانا‘ صرف ایک شخص کی موت نہیں ہے‘ وہ تو پوری قوم کی بنیاد تھی‘ جو منہدم ہوگئی)۔

بلاشبہ حضرت الاستاذ پالن پوریؒ کا رخصت ہوجانا‘ صرف ایک شخص کا دنیا سے چلا جانا نہیں ہے؛ بلکہ ایک عہد اور دور کا خاتمہ ہے، جن کی حسین یادیں اور علمی باتیں حسرت بن کر ہمیشہ لوح دل پر محفوظ رہیں گی اور طلبۂ علوم دینیہ کے لیے نشانِ منزل کا کام دیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

❁...❁...❁

فقیہ النفس محدث جلیل مفتی سعید احمد پالنپوری کی رحلت؛

تیری جدائی سے مرنے والے، وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے۔

ڈاکٹر جسیم الدین قاسمی صاحب
گیسٹ فیکلٹی شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی

کائنات کا روز ازل سے یہ دستور ہے کہ جو بھی کارگہ عالم میں آیا ہے، اسے ایک نہ ایک دن جانا پڑے گا، لیکن بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں، جن کے وجود سے ایک انجمن آراستہ رہتی ہے اور ان کے جانے سے انجمن کی رونق ماند پڑ جاتی ہے، استاذ محترم فقیہ النفس، محدث جلیل مفتی سعید احمد پالنپوری بلاشبہ ایسی شخصیت تھے کہ جن کے وجود مسعود سے دارالعلوم دیوبند کی علمی فضا معطر و مشکبار تھی، آپ کی ذات والا صفات قرن اول کی سادگی کا نمونہ تھی، آپ کی طبیعت میں حلم و بردباری، مزاج میں انکساری اور زبان میں شیرینی تھی، آپ علم القرآن کے شیدائی، علم الحدیث کے رسیا اور فقہ اسلامی کے رمز شناس تھے، آپ کے بیان میں شیفتگی، تحریر میں شگفتگی تھی، آپ فقید المثال اساتذہ کے شاگرد اور نامور شاگردوں کے استاذ تھے، چہرہ مہرہ شرافت کی دستاویز، دل خوف غیر اللہ سے خالی، دماغ غور و فکر کا خزینہ اور آپ کا سراپا اکابر و اسلاف کا نمونہ تھا۔

آپ کی رحلت سے ایک فرد یا ایک خانوادہ ہی نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ مغموم و رنجور ہے، آپ ملت اسلامیہ ہند کے لیے جہاں گراں مایہ تھے، وہیں علوم نبویہ کے طالبعلموں کے لیے چشمۂ صافی تھے۔ آپ کے علم و فضل کا دائرہ غیر محدود تھا، آپ کے درس حدیث کا عالم میں غلغلہ تھا۔ صرف دارالعلوم دیوبند میں داخلہ پانے والوں نے ہی آپ کے علم و فضل سے استفادہ کیا، بلکہ آپ کی بیش قیمت تصانیف و تالیفات سے بلا تفریق مذہب و ملت

ہر خاص وعام نے کسب فیض کیا۔آپ کی غیر معمولی علمی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ایوارڈ بھی پیش کیا گیا۔ بلاشبہ آپ کی ذات والا صفات ہر چند کہ اس طرح کے ایوارڈ سے بلند وبالا تھی، لیکن آپ نے حب الوطنی کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت ہند کی طرف سے دیے جانے والے اس اعزاز کو قبول فرما لیا تھا۔

آپ کو ذات باری تعالیٰ نے جہاں قرطاس وقلم کی بے پایاں قوت واستعداد سے سرفراز کیا تھا، وہیں آپ کی شخصیت رجال سازی کے لیے مشہور تھی، آپ نہ صرف اپنے گرد وپیش رہنے والے طلبہ کے لیے فکرمند رہتے، بلکہ طلبہ کی پوری برادری کے لیے دل دردمند رکھتے تھے، راقم الحروف نے ۲۰۰۱ء میں آپ سے جامع ترمذی جلد اول پڑھی۔ درس وتدریس میں آپ کے کچھ منفرد اصول وضوابط تھے، جن پر اخیر وقت تک سختی سے قائم رہے، یوں تو آپ کا طریقۂ تدریس ہی ممتاز خصوصیات کا حامل تھا، شاید ہی کوئی طالب علم آپ کے سبق سے غیر حاضر ہوتا، جامع ترمذی جلد اول کی عبارت خوانی کے لیے بھی چند طلبہ کو اپنی رہائش گاہ پر بلاتے اور فرداً فرداً عبارت خوانی کراتے اگر آواز مترنم اور پرکشش ہوتی تو زہے نصیب، ورنہ جامع ترمذی کی عبارت خوانی کے شرف سے محروم رہنا پڑتا، صرف سماعت سے مستفید ہوتے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ بعد نماز مغرب متصلاً درس حدیث شروع ہوجاتا، مفتی صاحب کے ورود مسعود سے پہلے تمام طلبہ کی درسگاہ (دارالحدیث تحتانی) میں اپنی نشستوں پر موجودگی لازم ہوتی، مفتی صاحب رونق افروز ہوتے اور عشا کی اذان تک تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تشنگان علوم حدیث کو اپنے منفرد اسلوب وانداز میں سیراب کرتے۔ بطور خاص سال کے اختتام پر آخری سبق جو سبھی طلبہ کے لیے اپنے میدان عمل میں نہ بھلایا جانے والا سبق ہوتا، اس سبق میں آپ کا انداز وآہنگ اتنا پرتاثیر ہوتا کہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد جہاں آپ کے ارشادات کو قلمبند کرتے وہیں کچھ طلبہ ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ریکارڈنگ میں مصروف رہتے، اور باقی ہمہ تن گوش ہوکر میدان عمل میں اترنے کے لیے جن آلات کی ضرورت درپیش ہوتی ہیں ان کے بارے میں کیا تیاری ہو اور کس نہج پر ہو گرہ باندھ لیتے۔ اس آخری سبق میں جہاں مفتی صاحب اپنے طلبہ کو بیش بہا پند ونصائح سے

نوازتے وہیں مدارس کے مروجہ نظام (چندہ وغیرہ) پر کھل کر تنقید بھی فرماتے اور بطور خاص ناقص الاستعداد طلبہ سے منصب اہتمام سے خود کو دور رکھنے کا عہد و پیمان بھی لیتے، مفتی صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا منصب اہتمام مدرسہ آگ پر چلنے کے مترادف ہے، اگر یہ کوالیٹی آپ میں ہے تو آپ شوق سے منصب اہتمام کو سنبھالیے، ورنہ نہیں۔تبلیغی جماعت میں علماء کی شمولیت کتنا مفید اور کتنا مضر؟ اس حوالے سے بھی پرتاثیر خطاب فرماتے کہ جو جید الاستعداد طلبہ ہوں وہ فراغت کے فوراً بعد سال بھر کے لیے دعوت وتبلیغ میں جانے کے بجائے تخصصات کے شعبوں میں وقت لگائیں، ہاں جو متوسط ہیں وہ درس وتدریس سے جڑ جائیں اور جو ناقص الاستعداد ہیں وہ مسجد سے وابستہ ہوکر اذان وامامت کی ذمہ داری نبھائیں۔آپ جہاں علم حدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے، وہیں آپ علم کلام اور علم فقہ میں بھی ممتاز ومنفرد مقام رکھتے تھے۔آپ نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شہرۂ آفاق تصنیف ’حجۃ اللہ البالغۃ‘ کی شرح ’رحمۃ اللہ الواسعۃ‘ کے نام سے تقریباً چار جلدوں میں لکھی، حجۃ اللہ البالغہ کی شرح ’رحمۃ اللہ الواسعۃ‘ میں مفتی صاحب نے جس انداز میں شاہ ولی اللہ کے علوم ومعارف کی تشریح وتوضیح کی ہے وہ آپ کی امتیازی شان ہے۔

آپ فقیہ النفس تھے، فقہ جو دراصل قرآن وحدیث فہمی کے بعد اس سے مستنبط ہونے والے مسائل کا مصدر وسرچشمہ ہے، اس میں بھی آپ کو رب ذوالجلال نے آفاقیت عطا فرمائی، آپ قدیم مختلف فیہ مسائل کو جس انداز سے تشریح وتوضیح کرتے ہوئے فقہ حنفی کی وجہ ترجیح کو احادیث اور آیات قرآنی سے ثابت کرتے، یہ بھی آپ کا یگانہ انداز ہوتا تھا، جدید مسائل میں بھی امت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ جس انداز میں انجام دیا، وہ بھی قابل رشک ہے، حال ہی میں ’کورونا‘ کے ختم ہوجانے کے سلسلے میں ’ثریا‘ ستارہ کے طلوع ہونے کے بعد بیماری کے خاتمہ کا سبب ہونے کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئیں تھیں اس کی واضح تردید کرتے ہوئے بہت ہی مفصل محدثانہ خطاب فرمایا جو یوٹیوب وغیرہ پر موجود ہے۔غرضیکہ قدیم مختلف فیہ فروعی مسائل میں مضبوط رائے کے ساتھ نصوص

شرعیہ کو پیش کرنے اور اختلاف کو رفع کرنے میں قسام ازل نے غیر معمولی قدرت دی تھی ۔ چھ دہائیوں سے مسلسل درس وتدریس اور پچھلے اڑتالیس برسوں سے دارالعلوم دیوبند کی مسند درس وتدریس اور شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خان صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ۲۰۰۹ء سے بحیثیت شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی آن بان شان تھے۔آپ کا وجود ایک ادارہ، آپ کی شخصیت ایک انجمن اور آپ کی ذات ایک جماعت تھی۔ کاش ابھی آپ داغ مفارقت نہ دیتے، لیکن قدرت کے منشا کے سامنے انسان بے بس ہے۔اس مبارک ماہ میں آپ کی رحلت قابل رشک ہے، ساتھ ہی آپ کی رحلت سے نہ صرف وابستگان دارالعلوم دیوبند کا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کا جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے، اللہ اس کی بھرپائی کرے۔رب ذوالجلال آپ کے درجات کو بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ع

تیری جدائی سے مرنے والے،
وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے؟

۞...۞...۞

وہ نایاب گوہر جسے زمانہ کبھی فراموش نہیں کرسکے گا

مولانا سعود احمد صدیقی
ایڈیٹر قیادت میڈیا، باندرہ، ممبئی

۲۵ / رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ / مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ بروز منگل بوقت چاشت ایک ایسا دلسوز واقعہ ممبئی کی سرزمین پہ پیش آیا جسے سن کر خواص وعوام کے دلوں میں سکتہ طاری ہوگیا اور وہ خبر یہ تھی کہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ اپنے مالک حقیقی سے جاملے جو آگ کی طرح پوری دنیا میں گشت کرنے لگی اور تمام سوشل میڈیا نے بلاتاخیر ہر خاص وعام تک یہ خبر پہونچادی جس کے نتیجے میں متعلمین، اور متوسلین کی طرف سے تعزیتی جملے موصول ہونے لگے اوران کے چاہنے والے مغفرت کی دعائیں کرنے لگے۔ اور میری بھی اللہ سبحانہ وتعالی سے دعا ہے کہ مرحوم کو غریق رحمت کرے اوران کے پسماندگان کو صبر جمیل عطافرمائے۔ اورامت کے اس خلا کی بھرپائی کرے۔ آمین

مجھے اس بات کا بے حد قلق ہے کہ میری جائے قیام اور جوگیشوری کے درمیان کوئی زیادہ حد فاصل نہیں ہے پھر بھی حضرت کی تجہیز وتکفین میں شامل نہیں ہوسکا یہ میرے لئے بہت ہی بڑی محرومی کی بات ہے۔ علم وعرفان کا ایک عظیم الشان مہتاب غروب ہوگیا اور میں آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔ میں حضرت کی دیدار کا یقینا دل سے عازم تھا مگر وقت اورحالات نے گویا میرے قدموں کو جکڑ دیا اور میں چاہتے ہوئے بھی اپنی دیرینہ آرزو میں بے بس اورناکام رہا۔ یہ لاک ڈاون کسی کا کچھ چھینا ہو یا نا چھینا ہولیکن اس نے میری آرزو کے شیش محل کو چکنا چور کردیا۔ اورآخری سانس تک کے لئے مجھے ایک ایسا غم دیا جس کا افسوس میرے دل ودماغ سے جانے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ

مجھے صبر جمیل عطا فرمائے۔آمین

یہ حقیقت ہے کہ حضرت کے وصال سے علمی دنیا میں ایک بڑی کمی ہوگئی۔جن کو اللہ تعالی نے مختلف علوم وفنوں کی گیرائی و گہرائی دے رکھی تھی اور ساتھ ساتھ انہیں ایمانی فراست بھی حاصل دی تھی۔

آپ تقریر وتحریر دونوں میدانوں کے ایک عظیم شہسوار تھے۔آپ نے تقریبا اکثر فنوں میں اپنے قلمی اثاثے چھوڑے ہیں۔خاص طور پر تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی اور تحفۃ القاری شرح صحیح بخاری یہ دونوں شرح کافی مقبول ہیں اور دیگر شروحات کے مقابل میں انہیں تفوق اور برتری حاصل ہیں۔کیونکہ ان کا انداز،اسلوب نہایت ہی نرالہ ہے۔جوکشش دل کا باعث ہے۔اہل علم حضرات انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

آپ کا درس طلبہ کے درمیان بہت ہی مقبول اور پروقار ہوا کرتا تھا جس میں طلبہ کا بے پناہ ہجوم ہوا کرتا تھا۔اور حضرت والا اپنی محدثانہ شان کے مطابق ہر بات کونہایت مستند اور تحقیق کے ساتھ بیان فرمایا کرتے تھے اورنہایت فراخ دلی کے ساتھ حدیث کی تشریح کرتے تھے۔جس حدیث سے جس مسلک کی تائید ہوتی تھی آپ اسی کی ترجمانی کرتے تھے۔اوراس معاملے میں کسی طرح کی کوئی کتر بیونت نہیں کرتے تھے یہی وہ مقام ہے جہاں بڑے سے بڑے محدث کا قدم ڈگمگا جاتا ہے اور تعصب کے جال میں گرفتا ہوکر نفس وغلام کا اسیر ہوجاتا ہے اور یہ تقریباً تمام اہل ہوی اور بدعت کا شیوہ رہاہے اور ہے۔مگر چونکہ آپ اہل حق کے ترجمان اور داعی اسلام تھے جس کے نتیجے میں اللہ سبحانہ وتعالی نے آپ کے زبان وقلم کی حفاظت کی تاکہ طالب حق کے لیے مشعل راہ بن سکے۔

آپ کو اللہ تعالی نے صرف حدیث میں کمال عطا نہیں کیا تھا بلکہ آپ بہت سارے علوم وفنون میں یگانہ روزگار اورمنفرد زمانہ تھے۔علم میں کمال کے ساتھ ساتھ زہد وتقوی میں اونچا مقام رکھتے تھے۔اور تصوف وسلوک کے اعتبار سے بھی آپ مرشدین ومصلحین کے اونچے فہرست میں شامل تھے۔قصہ مختصر یہ کہ آپ کی ذات ایک انجمن تھی جن کی خاموشی علمی دنیا کو تاریک کرگئی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ☆ سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

محرمِ اسرارِ دیں و مشیخیت حدیث کے مسند نشیں:

حضرت العلامہ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ

(۱۳۶۰ھ=۱۹۴۰ء-۱۴۴۱ھ=۲۰۲۰ء)

مفتی شکیل منصور قاسمی، بیگوسرائے

یوں تو گلستانِ علم وفن اور مرغزارِ دین و دانش" دارالعلوم دیوبند" میں کھلنے اور کھل کر شش جہات معطر کردینے والا ہر پھول اپنے جلو میں الگ الگ رنگ وبو بسائے ہوا ہوتا ہے" ہر گلِ را رنگ وبوے دیگر است"؛ لیکن دارالعلوم دیوبند کی معاصر بلکہ ماضی قریب کی شخصیتوں میں جس قابل فخر سپوت کی حیثیت" نابغہ روزگار" کے بطور مسلم رہی ہے ان میں ممتاز اور اہم نام حضرت الاستاذ علامہ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

میکدہ فکر وفن" دارالعلوم دیوبند" کے اس ساقیِ مستانہ کے جرعہ کش و بادہ نوش اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ گوناگوں خوبیوں اور کمالات کے جامع تھے، ذہین وفطین تھے، محرمِ اسرار دین تھے، مفسر قرآن تھے، وسیع النظر محدث تھے، گہرائی وگیرائی کے حامل بالغ نظر و دور اندیش فقیہ تھے، استنتاجی، استنباطی واستخراجی اوصاف سے مالا مال زود نویس مؤلف تھے، علم وعمل کے پیکر فیض رساں مقبول واعظ تھے، حق گو، جری اور بے باک مصلح تھے، نکتہ سنج، نکتہ داں، حلم مزاج، خوش طبع، خوش مزاج، باوقار، بلند حوصلہ، بلند نگاہ، زہد واستغناء، صبر وقناعت وخودداری کے پیکر محسن ومربی تھے، امانت ودیانت میں اپنی مثال آپ تھے، سادگی اور بے تکلفی کا مجسمہ تھے۔ جامعیت، اعتدال، جمال وکمال کا حسین امتزاج تھے، آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، آپ کی ہمہ جہت صلاحیت اور جوہر ذاتی کے ایک ایک پہلو پہ ہزاروں صفحات لکھے جائیں گے۔

ان تمام متنوع کمالات کے ساتھ آپ کی ایک انفرادی حیثیت اور امتیازی شناخت تفہیمی لیاقت اور ترسیلی قوت ہے، تقریر ہو یا تحریر! آپ کا انداز تدریس وتحریر البیلا، منفرد، اچھوتا، سحر انگیز اور دل فریب ہوتا تھا، مشکل سے مشکل ترین اور غامض ودقیق مباحث کو اپنے اسلوب خاص اور ترتیب دلکش سے چٹکیوں میں حل کردیتے تھے۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اپنی اس مشک بار اثر انگیزی اور ممتاز وخداداد ترسیلی قوت وموثر وپرکشش انداز تفہیم کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

اس معجز نما اور کرشماتی انداز کا ہی اثر تھا کہ دارالحدیث تحتانی اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود آپ کے درس میں تنگ پڑ جاتی، درس کا رعب اور آپ کا جاہ وجلال دیدنی ہوتا، بام ودر پہ سکوت طاری ہوتا، طلبہ پروانہ نچھاور ہوتے۔ آپ کے درس سے غیر حاضری کا شاید ہی کوئی طالب علم سوچتا، پورے عالمانہ وقار اور جاہ وجلال کے ساتھ مسند نشیں ہوتے، مجتہدانہ ومحققانہ شان سے درایت وروایت کی جامعیت کے ساتھ ایسے مرتب انداز میں حدیث پہ گفتگو فرماتے کہ مسائل دو اور دو چار کی طرح نکھر کر ذہن نشیں ہوجاتے۔

یوں تو آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، آپ کی ذات مختلف اوصاف وکمالات، محاسن اور خوبیوں کا حسین مرقع تھی؛ تاہم میرے مشاہدے اور مطالعے کی حد تک آپ کی شخصیت پہ دارالعلوم دیوبند کی تدریسی زندگی کی چھاپ نسبتاً گہری بلکہ غالب تھی، گلہائے رنگ رنگ میں سے آپ کی تدریسی شان اور رنگ وآہنگ سب سے جدا وممتاز تھی، یعنی آپ دیگر تمام محاسن کے اعتراف کے علی الرغم بطور خاص آپ کی تدریسی خوبیاں بے مثال تھیں، پیچیدہ عبارت، مشکل مباحث اور دقیق مقامات کی ایسی دلچسپ تشریح، کیف افزا اور دلنشیں تفہیم فرماتے کہ ذہن نا رسا میں سارے مباحث گویا انڈیل دیتے تھے، آپ کا طریقہ تدریس وترسیل بڑا ہی مثالی، موثر، دلچسپ اور ماہرانہ تھا، آپ کے حلقہ درس میں افتادگی یا بوریت نام کی کوئی چیز نہ ہوتی، موضوع کتاب کی تفہیم وتسہیل کے لیے اختیار کردہ آپ کا اچھوتا انداز واسلوب تقلیدی نہیں؛ بلکہ تخلیقی واختراعی ہوتا، ایک سال تک پیہم استفادے کے

بعد ہم نے آپ کی تدریسی امتیازات وخصوصیات جاننے کی جو اپنی سی ناتمام کوشش کی وہ کچھ یوں ہوسکتی ہے:

زیر تدریس مضمون کتاب پہ آپ مکمل عبور، دسترس ومہارت رکھتے تھے۔

* پڑھائے جانے والے مضمون کو از بر و مستحضر، اعادہ وجائزہ کے ساتھ ذہن میں مرتب ومنظم بھی کر کے آتے۔

* درسی نصاب میں دستیاب مواد پہ اکتفانہ کرتے؛ بلکہ دیگر منتشر ومتفرق حقائق کے لئے غیر نصابی کتابوں سے بھی مراجعت کرتے۔ یعنی کہ پورے فن پہ حاوی ہوکر پڑھاتے۔

* معصوم اذہان پہ اپنی تبحر علمی، کثرت مطالعہ، اور مرعوبیت کی دھاک بٹھانے کی بجائے، طلبہ کے ذہنی اور نفسیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ، حشو وزوائد سے پاک، قدر ضرورت، سہل وسبک، مختصر ودلنشین انداز میں مسائل کی تشریح کرتے۔

* پیش کردہ تقریر درس پہ طلبہ کے استدراکات، علمی اعتراضات ومناقشات کو خندہ پیشانی سے سنتے، مطمئن کرنے کی کوشش فرماتے۔ یہ انداز طلبہ میں اکتسابی دلچسپی کی نمو وفروغ اور شوق ودلچسپی کے اضافے کا باعث بنتا۔

* دوران درس طلبہ کی جذباتیت، احساس، دلچسپیوں اور ذہانت واستعداد کا خاص خیال رکھتے، حوصلہ شکن اور جذبات مجروح کرنے والے کرخت، درشت فقروں یا انداز ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔

* وقت کے حددرجہ پابند تھے، اپنی ذمہ داریوں اور متعلقہ فرائض کا آپ کو شدید احساس تھا۔

* آپ کے علم وعمل میں پوری مطابقت تھی۔

* نظم وضبط، اخلاص، سچائی، امانت ودیانت، صبر وتحمل، محنت واستقامت کے پیکر تھے۔

ان خصوصیات وامتیازات کی وجہ سے آپ کی تدریس بے حد مقبول تھی، اس سے طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں میں وسعت واستحکام اور خود اعتمادی پیدا ہوتی تھی۔

ہمارا دورے کا سال ۱۹۹۹ عیسوی مطابق ۱۴۱۹ ھ کا ہے، جب دورے کی درسگاہ دارالحدیث تحتانی ہوا کرتی تھی، سامنے کی سیٹ پر شیخ کے بالکل محاذات اور قاری العبارہ والی مخصوص نشست کے بازو میں جگہ لینے میں بامراد ہوگیا تھا، ہمارے سال دورحدیث شریف میں درس کا نظام الاوقات کچھ اس طرح سے تھا:

مسلم شریف اول مع مقدمہ/حضرت مولانا قمرالدین صاحب مدظلہ (پہلی گھنٹی، چھ ماہ)

مسلم شریف جلد ثانی حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی (پہلی گھنٹی، آخری چھ ماہ)

ترمذی ثانی حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب (دوسری گھنٹی)

ترمذی اول وطحاوی شریف (حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ (تیسری گھنٹی)

بخاری شریف اول حضرت شیخ نصیر احمد خان صاحب بلندشہری رحمہ اللہ (چوتھی گھنٹی)

شمائل ترمذی حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی (پانچویں گھنٹی، ہفتے میں چند دن)

سنن ابن ماجہ شریف حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمہ اللہ (پانچویں گھنٹی)

سنن ابی داؤد شریف ثانی، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ (چھٹی گھنٹی)

سنن ابی داؤد شریف اول حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی (چھٹی گھنٹی)

ترمذی شریف اول حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری رحمہ اللہ (بعد مغرب)

بخاری شریف ثانی حضرت مولانا شیخ عبدالحق صاحب اعظمی رحمہ اللہ (بعد عشاء)

موطاامام مالک حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصورپوری حفظہ اللہ (روز جمعہ)

موطاامام محمد حضرت مفتی محمد امین صاحب پالنپوری حفظہ اللہ (روز جمعہ)

ہر استاذ کی اپنی ایک شان اور اپنا مخصوص ومنفرد انداز تھا، کسی کے درس میں فقہی انداز غالب ہوتا تو کسی کے یہاں درایت حدیث پر زور دیا جاتا۔ کسی کا درس اسماء الرجال پر محققانہ نقد وتبصرہ کا مظہر ہوتا تو کسی کے یہاں عشق

نبوی کا دلکش نظارہ دیکھنے کو ملتا، کہیں جلال تو کہیں جمال، کسی کی سادگی پر مرنے کو جی چاہتا، تو کسی کا رعب ودبدبہ سے استقامت اور عزم کا درس ملتا، غرضیکہ ایک سے ایک اصحاب فضل وکمال اور ارباب علم وتحقیق کا حسین سنگم، جہاں سے تشنگان علوم اپنے اپنے ظرف کے مطابق نہایت ہی ذوق وشوق کے ساتھ اسرار وحکم جمع کرنے میں مصروف کار نظر آتے۔

طلبہ کے ساتھ شفقت، مہربانی، خیر خواہی اور ان کی جذباتیت، وجدان، احساس، دلچسپیوں اور ذہانت واستعداد کا خاص خیال رکھنے کی ایک حسین یادگار ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارے دورے کا سال تھا، ہم نے اپنے رفقاء گرامی قدر مفتی شمشیر حیدر قاسمی اور مفتی مجتبی حسن قاسمی کے اشتراک سے طالبعمانہ بساط کے مطابق حدیث شریف سے متعلق عربی کتابوں وشروحات کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کرلیا تھا، جن کتابوں تک رسائی ہمارے دسترس سے باہر تھی، ان سے استفادے کے لئے دارالعلوم دیوبند کے پرشکوہ کتبخانہ سے رجوع کیا جاتا، لیکن چونکہ کتب خانہ کھلنے اور بند ہونے خصوصا عربی شروحات سے استفادے کے وہی اوقات ہوتے تھے جو درس کے اوقات تھے، جس کی وجہ استفادے کی کوئی شکل نہیں بن پارہی تھی؛ اس لئے رفقاء سے مشورہ کرکے یہ طے پایا کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ سے رجوع کیا جائے، ممکن ہے ان سے مل کر استفادے کی کوئی مناسب راہ نکل آئے؛ چناں چہ ایک درخواست تیار کی گئی اور اس کو لیکر حضرت استاذ محترم کے آستانے پر حاضری دی گئیں درخواست میں دو باتوں کی گزارش کی گئی تھی:

(۱) رات میں کم از کم ایک بجے تک کتب خانہ کھولے جانے کا نظم ہو (تاکہ دورہ حدیث شریف کے جو طلبہ گیارہ کبھی ساڑھے گیارہ بجے تک حضرت شیخ ثانی سے بخاری شریف جلد ثانی کا سبق پڑھ کر مطالعہ کرنا چاہیں بآسانی مطالعہ کرسکیں)۔

(۲) مسلم شریف جلد ثانی کے لئے کسی حنفی محدث کی کوئی شرح کتب خانہ میں ابتک نہیں آئی ہے؛ لہذا تکملہ

فتح الملہم کتب خانہ میں منگوادی جائے تا کہ باذوق طلبہ اس سے اپنی علمی تشنگی بجھا سکیں، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے درخواست پڑھ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور ارشاد فرمایا: مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی سے ملو! ہم بھی ان سے کہہ دیں گے؛ چنانچہ ہم لوگ واپس آ گئے اور مغرب بعد مسجد رشید میں حضرت مولانا عبد الخالق صاحب مدراسی مدظلہ کے پاس حاضر ہو گئے، حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت عالیہ میں اپنے مطالبات پیش کر دیئے۔ حضرت والا دامت برکاتہم نے ہماری گزارش کی تحسین فرمائی اور دوسرے ہی دن سے حسب درخواست رات کے ایک بجے تک کتب خانہ کھلنے کا نظم فرما دیا، اور ایک سیٹ تکملہ فتح الملہم بھی کتب خانہ میں فراہم کر دیا گیا (ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ”فتح الملہم“ کا وہ سیٹ حضرت کا ذاتی ہے جسے حضرت نے ہماری درخواست پر فوری طور پر کتب خانے میں دے دیا) پھر چند ہی دنوں کے بعد ”فتح الملہم“ کے متعدد نسخے کتب خانے میں آ گئے۔ یہ واقعہ آپ کی خردنوازی، حوصلہ افزائی اور افراد سازی کی بہترین صلاحیت کا حسین مظہر ہے جو آپ کے جوہر ذاتی کا طرۂ امتیاز تھا۔

آپ کی جامع الکمالات شخصیت کی دوسری انفرادی شان معارف ولی اللہی اور علوم نانوتوی کی توضیح وترجمانی ہے، ویسے تو آپ کی مستقل تصانیف، شروحات، مراجع وتعلیقات کی تعداد تو پچاس کے قریب پہونچتی ہے: لیکن ان تمام تحریری کاوشوں میں سب سے مشہور، فائق اور مفید ترین بے نظیر اور عظیم ترین علمی کارنامہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ ۱۱۷۶ھ) کی ”حجۃ اللہ البالغۃ“ کی اردو اور عربی زبانوں میں شروحات لکھنا ہے۔

اردو زبان میں رحمۃ اللہ الواسعۃ کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں تقریبا چھتیس سو چودہ صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ عربی زبان میں حجۃ اللہ البالغۃ کی محققانہ اور بصیرت افروز تحقیق، تعلیق وتحشیہ کے ساتھ دو جلدوں میں تیرہ سو چالیس مجموعی صفحات پر مشتمل دار ابن کثیر دمشق سے شائع ہو چکی ہے۔

اوپر میں مذکور آپ کی تدریسی امتیازات وخصوصیات کافی حد تک آپ کی تالیفات، تعلیقات وشروحات میں

بھی جھلکتی ہیں، جن میں بحث ونظر کے لعل و یاقوت، دقیق تحقیقات کے ہیرے اور گہری کاوشوں کے موتی پورے آب وتاب کے ساتھ چمک رہے ہیں، آپ کی تمام درسی شروحات وقیع تحقیق اور بصیرت افروز معلومات اور انوکھے انداز تشریح وتوضیح کا شاہکار ہیں، اللہ نے انہیں بے پناہ مقبولیت بخشی ہے، علماء وطلبہ کے مابین متداول ہیں۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ ابتداءً غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، عالمی اعتبار، استناد، مرجعیت، مشیخیت، محبوبیت، مقبولیت اور علمی فضل وکمال میں جو مقام بلند حاصل کیا وہ اپنی ذاتی محنت، لگن، قدردانی وقت، عشق مقصد، انہماک عمل، ریاضت، جفاکشی، انتھک محنت، سوزعشق، جستجوے پیہم، جان گسل وصبر آزما طویل مجاہدے، اوقات زندگی کی بامقصد تقسیم وانضباط، اور استغناء وخودداری کے باعث حاصل کیا، شوق کمال اور خوف زوال سے یکسر عاری، پانے کا خمار تھا نہ کھونے کا آزار!

عزم وہمت کے آپ کوہ ہمالہ اور فولادی اعصاب کے مالک تھے، روح فرسا اور جاں گسل حوادث ومصائب سے بھی آپ کے پائے صبر واستقامت میں تزلزل نہ آسکا، زندگی کے راز اور وقت کی قیمت کو آپ نے خوب اچھی طرح جان لیا تھا، شب وروز کے ایک ایک لمحے کی آپ کے یہاں تقسیم تھی، پیرانہ سالی اور عمر عزیز کی آخری منزل کو بھی آپ نے ایسا حوصلہ مندانہ اور مجاہدانہ گزارا جس کا ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے، فکر ونظر میں رسوخ وتصلب تھا، اظہار حق ورد منکرات میں مصلحت اندیشی آپ کے مسلک میں بالکل روا نہ تھی، جسے حق سمجھتے پورے دلائل کے ساتھ بے لاگ وبے باک، دوٹوک وبرملا اس کا اظہار فرماتے۔

آپ طبعا سادگی پسند تھے، سادہ پہنتے، سادہ کھاتے، پر اوروں کو اچھا کھلاتے، مہمانوں کے لئے کشادہ دست وفیاض تھے، طلبہ کے تخلیقی وتحقیقی علمی کاوشوں کو سراہتے، حوصلہ افزائی فرماتے، نقد انعامات دیتے اور دعاؤں سے بھی نوازتے۔ نکتہ سنج، دوراندیش ومعاملہ فہم تھے۔ سادگی، خاکساری ومسکنت آپ کی شناخت تھی۔ علم دین

سے دنیا کمانے کو معیوب سمجھتے، معاشی بے چارگی کے ایام میں تدریس پہ جو مشاہرات وصول کیے تھے آسودگی حال کے بعد پائی پائی واپس فرمادیا جو ملینوں کی رقم بنتی ہے، اجتماعی غوغاے ہاؤ ہو سے نفور تھا، جلسے جلوس میں خاص دینی ودعوتی داعیے کے بغیر شرکت سے گریزاں رہتے۔

۲۵ رمضان ۱۴۴۱ء مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ کو صبح چھ بجے، ہشت پہل ہیرا، علم وفضل کا آفتاب عالمتاب، تدریس وتالیف کا یہ لعل درخشان طویل علالت کے بعد ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، ۲۵ رمضان کو ہی نماز جنازہ ادا کی گئی، اور ممبئی کے جوگیشوری کے اوشیورہ قبرستان میں سپردخاک کردیا گیا، خدا آپ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آپ کے تلامذہ وفیض یافتگان کو خدا تعالی انہی کے نقش قدم وخطوط پہ تدریس وتعلیم کی توفیق بخشے۔ آمین

دن رات مے کدے میں گزرتی تھی زندگی
اختؔر وہ بے خودی کے زمانے کدھر گئے؟

کیرالا میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض وبرکات

مولانا عبدالشکور القاسمی
استاد حدیث دار العلوم الاسلامیۃ، کولم، کیرلا

ہمارے استاد، مربی، مشفق، والد روحانی اور دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین وشیخ الحدیث، عظیم مفسر، علوم ولی اللہی وقاسمی کے عظیم شارح اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری ثم الدیوبندی نے کچھ دنوں کی مسلسل علالت کے بعد آخرت کی طرف اپنا رخت سفر باندھ لیا، إنا لله وإنا إليه راجعون، **اللهم اجرنا في مصيبتنا وأخلف لنا خيرا منها۔**

کیرالا شمالی ہندوستان کے کونے میں واقع ایک ریاست ہے، لیکن زبان کی بنیاد پر کچھ اجنبیت اور علیحدگی محسوس کرتی ہے۔ کیونکہ یہاں کی زبان ملیالم ہے جو دنیا کے کسی اور علاقے میں پائی نہیں جاتی ہے۔ اسی وجہ سے علماء دیوبند کے فیوضات وبرکات اور علمی انوار سے عموماً محروم رہی۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ریاست کیرالا دینی علوم سے مکمل عاری تھی، کیونکہ اسلام کے انوار وبرکات چودہ سو سال پہلے ہی سمندر کے راستے سے یہاں داخل ہوگئے تھے، اور مزید یہ کہ مخدومی خاندان کے مایہ ناز علماء اور دیگر اساطین علوم نے یہاں کی علمی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اور عالمی شہرت یافتہ شافعی فقیہ علامہ ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ نے بھی یہاں پونّانی نامی جگہ کی مسجد میں درس دیا ہے۔

علماء دیوبند کا ورود مسعود ایک طویل عرصہ تک ریاست تامل ناڈو تک محدود رہا، اور ریاست کیرالا ان سے محروم رہا۔ ہمارے علم کے مطابق کیرالا کے سب سے اولین دیوبندی عالم مولانا مصطفی عالم صاحب ہیں جنہوں

نے حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد بہت سے علماء اوراکابر نے دیوبند کارخ کیا۔جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ان میں سے ایک بڑی ہستی کا نام ہے مولانا شیخ حسن صاحب رحمۃ اللہ جو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص تھے۔اور پانچ سال دارالعلوم میں رہ کر علوم ظاہریہ وباطنیہ میں خصوصی مہارت حاصل کی۔فراغت کے بعد حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر شمالی ہند کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ الباقیات الصالحات ویلور میں تدریسی خدمات میں لگ گئے۔ وہیں سے مسلک علماء دیوبند کیرالا میں پھیلنا شروع ہوا۔اوراس کے بعد حضرت شیخ حسن صاحب کے طفیل یہاں جمعیت علمائے ہند کا قیام بھی عمل میں آیا اور حضرت اس کے صدر بھی رہے۔لیکن مسلک علماء دیوبند کو کیرالا میں صحیح رخ دینے اوراس کی توسیع کا کام حضرت الاستاد مولانا مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا۔حضرت اقدس بڑی مشقت کے ساتھ سفر کر کے پانچ سے زائد مرتبہ کیرالا تشریف لائے جو دیوبند سے ساڑھے تین ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے،ان میں ایک دومرتبہ ٹرین کے سلیپر کلاس میں سفر کر کے آئے تھے۔

پہلے سفر کی نوبت ایسے آئی کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ تمل ناڈو میں دعوتی واصلاحی سفر پر تشریف لائے تو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے ایک مایہ ناز فاضل اور علامہ کشمیری رحمۃ ہ اللہ سے فیض یافتہ مولانا ابراہیم صاحب (میل وشارم) تمل ناڈو سے حضرت کو کیرالا لائے یہاں جمعہ میں اور کئی جگہوں پر خطاب ہوا۔اور اس کے بعد کیرالا کی مشہور دینی تنظیم جمعیۃ علماء جنوب کیرالا کے چالیسواں اجلاس عام میں بطور مہمان مکرم حضرت مفتی صاحب کو دعوت دی گئی اور حضرت نے "مسلک علماء دیوبند" پر مفصل خطاب فرمایا،اور جلسے میں ختم نبوت کے سلسلے میں بھی بات کی۔اس موقع پر کیرالا کے اکابر علماء جیسے حضرت مولانا محمد موسیٰ کانجار جنہوں نے دعوت وتبلیغ کے بابرکت عمل سے کیرالا والوں کو متعارف کرایا،مولانا نوح القاسمی اور مولانا محمد عیسیٰ المنبعی وغیرہ سب نے مل کر حضرت مفتی صاحب کا استقبال کیا۔اور جامعۃ حسنیۃ واڈکلم مین ختم النبوۃ کے بارے مین خطاب فرمایا۔اس کے

بعد شعبہ تحفظ ختم نبوت کی بنیاد ڈالنے کے لئے اور ایک مرتبہ ایک مدرسہ میں درس حدیث شروع کرانے کے لئے حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم العالیہ تشریف لائے۔ اور تحفظ سنت اور مذاہب کے سلسلے میں خطاب کرنے کے لئے ایک مرتبہ حضرت کی آمد ہوئی اور الجامعہ الحسنیہ کایم کلم مین خطاب فرمایا۔ اس سفر میں بہت مشقت اٹھانی پڑی تھی۔ اس کے باوجود دو تین مجلسوں میں پوری بشاشت کے ساتھ خطاب فرمایا۔ اور پورے سفر میں ذرا سا بھی وقت ضائع ہونے نہیں دیا۔ مسلسل علمی باتیں کرتے رہے، ٹرین میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور مسجدوں میں بھی عمومی باتیں ہوئیں جن میں سورہ کافرون اور سورہ اخلاص کا خلاصہ پیش کر کے اس پر زور دیا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرنی ہے۔ ایک مرتبہ پھر حضرت کا تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں ورود مسعود ہوا (یہی حضرت والا کے آخری بیان کا بھی موضوع رہا جو رمضان المبارک کے پندرہویں شب کو ہوا تھا) اور الجامعہ الکوثریہ میں ختم نبوت پر بات ہوئی۔

حضرت مفتی صاحب کے کیرالا کے اسفار میں خاص موضوع گفتگو "دار العلوم، مسلک علماء دیوبند اور ختم نبوت" رہتے تھے۔ اور حضرت آل انڈیا تحفظ ختم نبوت کے صدر بھی رہے۔ حضرت کیرالا کے بارے میں ہمہ تن متفکر رہتے تھے اور مسلک شافعی کے تعلق سے کوئی بات جیسے قراءت خلف الامام اور اذان میں ترجیع دوران سبق اگر آ جائے تو کیرالا کا تذکرہ دار الحدیث میں کئے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اور جب بھی ملاقات کے لئے دیوبند میں حضرت کی رہائش گاہ پر پہونچتا تو کیرالا آنے کی خواہش کا اظہار فرماتے تھے۔ کیرالا کے تلامذہ اور متعلقین سے حضرت کا ایک خاص طرح کا تعلق تھا۔ حضرت کے سانحہ ارتحال سے ریاست کیرالا ایک مشفق، مربی اور روحانی پیشوا سے محروم ہوگئی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
غنچۂ نو رستہ اس گھر کی نگھبانی کرے

ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالنپوری علیہ الرحمہ کی یاد میں

مولانا شمشیر حیدر قاسمی
استاذ مدرسہ مقصود العلوم، رامپور، بہار

یوں تو اس دنیائے دنی میں کوئی بھی ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آیا، ہر آنے والے کے لئے اس کے آنے سے قبل ہی جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے، اور یہ ایسا فیصلہ ہے، جس میں تقدم تأخر کا امکان ہے اور نہ تخلف کی گنجائش، بلکہ اس فیصلے کے خلاف آمد و رفت بساط خلقت سے باہر ہے، یہی وجہ ہے کہ کل سے ہی دل کو سمجھا رہا ہوں کہ استاذ محترم حضرت مفتی سعید احمد صاحب کو خالق موت وزیست کی طرف سے بلاوا آیا، وہ چلے گئے، اس پر رنج و ملال فضول ہے، ارے ہاں وہ خود بھی تو پوری زندگی اسی جانے کی تیاری میں لگے رہے، اور اس جانے کے دن کے آنے کے لئے دن گنتے رہے، مگر دل ہے کہ ماننے کو تیار نہیں، بیتابی بڑھتی ہی جارہی ہے، جب تب آنکھیں بھی اشکبار ہو جارہی ہیں، اگر بآواز نوحہ وگریاں ممنوع نہ ہوتا تو چشم گریاں وقلب بریاں کی موافقت میں ہر طرف چیخیں ہی چیخیں سنائی دے رہی ہوتیں، کئی دفعہ سوچا دل کے پھپھولوں کو سینۂ قرطاس پر ثبت کردوں اور حضرت استاذ محترم کے فراق اور جدائیگی کی وجہ سے غموں اور صدموں کے پھوٹتے لاوے کو کسی قدر ٹھنڈک فراہم کردوں مگر نہ جانے کیوں الفاظ کے خزانے ہموم وکروب کے اس تیرہ وتار موقع سے خامہ فرسا ہونے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوئے، مجبورا دل تھامنے کی کوشش میں لگ گیا، اور اسے منانے کی کوشش کرنے لگا، دریں اثنا کچھ اس طرح کے افکار و خیالات کا تموج وتلاطم نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا کہ علوم ومعارف کے خزانے لٹانے والی زبان دو مہینہ قبل

اس عرض ومعروض پر کہ، جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا، رک گئی تھی، دراصل یہ ایک تمہیدی جملہ تھا، اس طویل سلسلے کے اختتام یا تکمیل پزیری کو ظاہر کرنے کے لئے، جس میں ایک مرد قلندر انتہائی شان وشوکت، جوش وجذبہ، وقار و سنجیدگی اور رعب ودبدبہ کے ساتھ ایک پرنور وپرسکون ماحول میں کبھی الامام الترمذی کے سنن سے خوبصورت جملے چن چن کر اس کے گیسوئے برہم کو سنوارتا نظر آتا ہے، تو کبھی الامام الھمام البخاری کے الجامع الصحیح میں مستور آبدار موتیوں سے تشنگان علوم نبویہ کو روشناس کراتا دکھائی دیتا ہے، گاہے امام ابوجعفر الطحاوی کے انظار وافکار سے نقاب کشائی کر رہا ہوتا ہے تو کبھی حجۃ اللہ البالغہ کے صفحات میں مسند الہند الامام ولی اللہ کی نکتہ سنجی ودقیقہ رسی پر انھیں خراج تحسین پیش کرتا دیکھائی دیتا ہے، اسی کے ساتھ اس تمہیدی جملہ میں یہ اشارہ بھی تھا کہ بخاری وترمذی کا عظیم المرتبت شارح، تفسیر ہدایت القرآن کا مصنف، رحمۃ اللہ الواسعہ کا مؤلف، نحو، صرف، بلاغت، منطق، فلسفہ، اصول حدیث، اور اصول فقہ جیسے بے شمار علوم پر مشتمل درجنوں کتابوں کا یہ قابل رشک خامہ بردار اب جلد ہی قلم و قرطاس سے اپنا ناطہ توڑ لے گا، مگر ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ عظیم الشان سلسلہ اس قدر جلدی میں تھم جائے گا، ایک طویل عرصہ سے قرآنی علوم اور نبوی فیوض سے قلوب انسانی کو منور کرنے والا مسافر سلسلہ مسافرت کو بعجلت تمام منقطع کرلے گا، اور اسی رمضان المبارک کے عشرہ رحمت وعشرہ مغفرت سے رحمتوں اور مغفرتوں کا ذخیرہ جمع کرنے کے بعد بارگاہ الٰہی سے عتق من النار کا پروانہ حاصل کرتے ہوئے سوئے عدن رواں ہوجائے گا، واہ کتنا دلربا ہوا کرتا تھا وہ منظر جب ملت اسلامیہ ہند کا دھڑکتا ہوا دل مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی پرشکوہ درسگاہ حدیث شریف میں شیخ سعید رونق افروز ہوا کرتے تھے، ترجمان درسگاہ لاؤڈ سپیکر پر اپنی انگلی سے بالکل آہستہ ایک یا دو مرتبہ ٹھوکر مارتا، جس سے ٹک ٹک کی آواز پیدا ہوتی، جسے سن کر گلشن قاسمی کے چہچہاتے عنادل یکدم خاموش ہوجاتے اور وسیع وعریض درسگاہ میں بالکل سناٹا طاری ہوجاتا اور سب کی نگاہیں مسند درس کی طرف اٹھ جاتی، تو سامنے ایک وجیہ اور بارعب شیخ پورے جلال وجمال کے ساتھ جبہ میں ملبوس، سر پر عمامہ اور عمامہ پر رومال ڈالے

ہوئے انتہائی وقار سے مسند آرا ہوتے اور پروانۂ علوم نبوت کو اپنی زیارت سے سرفراز فرماتے اور پھر پوری درسگاہ میں شیخ سعید احمد کی یہ خوبصورت آواز سنائی دیتی، "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" جواب میں طلبہ کی طرف سے جذبۂ جانثاری سے موجزن غایت ادب کے ساتھ کسی قدر دھیمے لہجے میں **وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ** کی صدا بلند ہوتی، اس کے بعد کوئی متعین طالب علم نہایت ہی پرکیف اور خوبصورت آواز میں حدیث پاک کی عبارت پڑھتا پھر شیخ سعید اپنے مخصوص لہجہ، پرکیف انداز، منفرد طرز تفہیم، کانوں میں رس گھولنے والی آواز اور بہت ہی دلکش اشاروں کے ساتھ متعلقہ عبارت کی اس طرح تسلی بخش تشریح فرماتے کہ طلبہ بزبان قال یا بزبان حال پکار اٹھتے کہ

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

افسوس صد افسوس مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی درسگاہ حدیث شریف کو اس امتیازی شان سے رونق بخشنے والا شیخ اب ہمیشہ کے لئے ہم سے روٹھ گیا ہے، اور ہمیں سسکتا و بلکتا چھوڑ کر عروس البلاد سے ملحق جوگیشوری کے اوشیورہ مسلم قبرستان نامی شہر خموشاں میں ہمیشہ کے لئے اس حال میں روپوش ہوگیا کہ ہم نہ صرف ان کی آخری دیدار کو ترس گئے بلکہ ہم ان کے قبر انور پر خاک ڈالنے سے بھی محروم رہ گئے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

❀...❀...❀

رئیس المحدثین حضرت مفتی سعید صاحبؒ

کی نرالی باتیں اور کچھ یادیں

مولانا ابوحیان فرحان قاسمی

جان کر من جملہ خاصان مے خانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

۲۵/رمضان المبارک کی صبح حضرت مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ کا سانحہ ارتحال ہند و بیرون ہند کے تمام علماء وطلباء برادری کے لیے خصوصاً اور عوام الناس کے لیے باعث صد حسرت وافسوس ہے، یہ آفتاب علم اچانک بجھ گیا، جیسے ہی حضرت رح کی وفات کی خبر پہنچی ایک سکتہ طاری ہوگیا اور دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ واقعی حضرت اس دار فانی سے رخصت ہو چکے ہیں، خیر ذہن میں وہ ساری باتیں اور یادیں گردش کرنے لگیں اور ہر حرکات وسکنات نظروں میں گم نے لگیں اور آپ کی نمایاں صفات وخصوصیات ذہن ودماغ میں دستک دینے لگیں، وہ انداز درس جو غبی سے غبی طالب علم کو بھی ذہن میں نقش کر دیتے اور پورا سبق گھول کر پلا دیتے اور یہ محسوس ہوتا کہ یہ سبق کبھی ذہن سے نہی بھلایا جائے گا، اختلافی بحثوں کو بڑی آسانی کے ساتھ مدلل کرتے ہوئے ذہن نشین کرادیتے، آپ جس مسئلہ پر بھی گفتگو فرماتے، مکمل شرح وبسط کے ساتھ ابتدا تا انتہا سیر حاصل بحث فرماتے، آپ اس انداز درس و تدریس کے تعلق سے فرماتے کہ میرا یہ طریقہ اپنے دو استاذوں کے طرز درس کا امتزاج ہے، ایک حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی رحمۃ ہ اللہ کہ وہ عبارت میں مذکور مسئلہ کو وہی سے بیان کرتے ہوئے انتہا تک پہونچاتے اور دوسرے حضرت شیخ فخر الدین مرادآبادی رحمۃ ہ اللہ کہ وہ عبارت سے متعلق مسئلہ کو سمجھانے کے لیے ابتدا سے کلام کرتے

ہوئے عبارت حل کرنے تک گفتگو فرماتے، یعنی بحث کو انتہا تک نہیں پہنچاتے اور ان دونوں بزرگوں کے طرز کو میں نے اپنے درس میں ملا دیا چنانچہ میں عبارت میں مذکور مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ابتدا سے عبارت حل کرتے ہوئے انتہا تک سیر حاصل بحث کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

آپ کی زبان شیر وشکر تھی، مٹی کو سونا بنانے اور پتھر کو ہیرا بنانے کا فن آپ کے پاس تھا، آپ اپنے سحر انگیز خطاب کے ذریعہ سامعین کے ذہن ودماغ پر حاوی ہوجاتے، کسی ہنگامی یا نامناسب حالات میں طلباء کے درمیان آپ ہی گفتگو فرماتے اور مسئلے کو چٹکیوں میں اس طرح حل کر دیتے گویا کوئی واقعہ ہی پیش نہیں آیا۔

آپ کی شخصیت ہمہ گیر تھی، مختلف علوم وفنون پر مکمل دسترس حاصل تھی، اسلاف کی جھلک، علم کی جلالت شان اور پیکر صدق ووفا کے حامل تھے۔

آپ محنت کا اسلوب بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ تدریس کے زمانے میں متعلقہ اسباق کے علاوہ ایک فن کی تمام چھوٹی بڑی کتابوں کو تین سال تک اس طرح پڑھ لینا چاہیے کہ پورے فن پر مکمل دسترس اور گرفت حاصل ہوجائے اور اس میں غور وفکر کر کے استنتاج کی صلاحیت پیدا ہو اور ماحصل کو قلم بند کیا جائے، پھر اگلے تین سال کے بعد دوسرے فن کی چھوٹی بڑی تمام کتب کو پڑھ کر پورے فن کو چٹ جائے، اس طرح ایک ایک فن کو تین تین سال تک مکمل پڑھ کر ۲۰ - ۲۵ سال میں سارے فنون پر گرفت حاصل ہوگی، اس جہد مسلسل اور انتھک محنت وکوشش کر کے بیس پچیس سال کے بعد کچھ علم آنا شروع ہوگا اور علم کے سمندر میں غوطے لگانا اور سفر کرنا آئے گا، آپ کے دل میں طلباء کا درد تھا، بڑے متفکر، حساس ذہن کے مالک تھے، ہر اچھی بات کو سراہتے اور نامناسب بے تکی بات پر نکیر فرماتے۔

عصر کی نماز کے بعد آپ کے علم کدہ پر طلباء کی حاضری ہوتی، اساتذہ بھی تشریف لاتے، یہ مجلس عمومی ہوتی، اس عاجز کو الحمد اللہ چھ/۶ سال مسلسل حضرت کی خدمت کا شرف حاصل رہا، علمی وروحانی استفادہ کا موقع ملا، عربی

پنجم کی بات ہے، سالانہ امتحان کا موقع تھا، عصر کے بعد سلم العلوم کی ایک بحث سمجھانے کی درخواست کی جب سلم کے پرچے کے صرف دو دن باقی تھے، حضرت نے درخواست قبول کر کے دل چسپی کے ساتھ اس بحث کا آغاز کیا اور بڑے شان دار طریقے سے آسان انداز میں گھول کر پلاتے گئے، ابھی بحث مکمل نہیں ہوئی تھی کہ پرچے کا دن آ گیا، خیر میں سلم کا امتحان دینے کے لیے امتحان گاہ میں داخل ہوا تھوڑی دیر میں پرچے تقسیم ہو گئے، اتفاقاً تیسرے سوال میں وہی عبارت تھی جو میں حضرت مفتی صاحب سے دو دن میں پڑھ رہا تھا، دیکھتے ہی دل خوش ہو گیا، پندرہ بیس منٹ کے بعد ناظم امتحان نے اعلان کیا کہ: سلم کے طلباء متوجہ ہو، سوال نمبر تین کی عبارت کا کچھ حصہ پڑھتے ہوئے کہا کہ یہ عبارت درست کر لیں۔ ادھر حضرت مفتی صاحب امتحان گاہ میں موجود تھے انہوں نے اس عبارت کو سن لیا.... اس دن عصر کے بعد معمول کے مطابق حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی، دل میں سوچا کہ پہلی فرصت میں حضرت کو اس پر شکریہ کہوں، ابھی زینے سے حضرت کے ساتھ اوپر چڑھ ہی رہے تھے، میرے اظہار کرنے سے پہلے ہی حضرت نے کہا:

ارے بھائی تمہاری وہ بحث پرچہ امتحان میں تھی، میں نے عرض کیا جی حضرت، بہت جما کے لکھا ہے۔۔ حضرت الاستاذ کا کمال فیض اور قابلیت کا ایک واقعہ نقل کرتا ہوں ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد دو میاں بیوی جو کسی عربی کنٹری سے تعلق رکھتے تھے، عورت قدرے اردو جانتی تھی مہمان بن کر کسی طالب علم کی رہنمائی میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں کچھ گفتگو کرنی ہیں، حضرت نے یہ کہتے ہوئے معذرت کر دی کہ ہمارے یہاں عورتوں کے ٹھہرانے کا کوئی انتظام نہیں ہے، وہ دونوں واپس دارالعلوم کے مہمان خانہ میں چلے آئیں کوئی گفتگو نہیں ہو سکی.... پھر دوسرے دن عشاء کے بعد دونوں حاضر خدمت ہوئیں جب مفتی صاحب اکیلے اپنے کام میں مصروف تھے، حضرت نے اجازت دی، علیک سلیک کے بعد تعارف ہوا آور آنے کا مقصد بیان کیا، دونوں کے پاس علمی سوالات کی ایک فہرست تھی، باری باری سوالات پیش

کرتے اور حضرت مفتی صاحب تسلی بخش جواب دے کر مطمئن کرتے اوران جوابات کوسن ان کے دل میں حضرت کی قدر بڑھتی گئی، ہر جواب پر وہ دونوں یہ کہتے:

واللہ ما سمعت ھذا الکلام الا شیخ سعید

یہ علمی گفتگو اور سوالاتی نشست رات دیر تک چلتی رہی اور حضرت مفتی صاحب ان کے سوالات سے بہت خوشی کا اظہار فرماتے، اس نشست کے مکمل ہونے کے بعد حضرت نے خود سامنے سے دوبارہ وقت دیا اوراگلے دن ظہر سے عصر تک یہ مجلس چلتی رہی۔۔۔۔ یہ دونوں میاں بیوی طالب علم تھے، کسی غیر ملکی اسلامک یونیورسٹی میں دینی تعلیم حاصل کرتے تھے اورانہیں بہت اعتراضات وسوالات ہوتے تھے تو ایک شامی عالم دین جن کو حضرت مفتی صاحب بالکل نہیں جانتے میں نے ان دونوں میاں بیوی سے کہا کہ آپ کے ان اعتراضات کے جوابات ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث علامہ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دیں گے، چنانچہ دونوں میاں بیوی نے اس غرض سے دارالعلوم کا سفر کیا، ہفتہ دس دن دیوبند میں رہےاور دارالحدیث فوقانی کی گیلری میں بیٹھ کر تین چار دن تک پہلے حضرت مفتی صاحب کا درس سنتے رہے پھر آپ کی خدمت میں حاضری کی درخواست کی۔۔۔ الغرض حضرت الاستاذ بہت سی خوبیوں اور کمالات کے مالک تھے، آنے والے دنوں میں ان کے شاگرد مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھائیں گے ان شاءاللہ۔

حضرت الاستاذ اس عاجز سے بہت محبت فرماتے تھے جس کا احساس دیوبند کے قیام کے ساتھ ساتھ مقام پر بھی ہوا، جب بھی حضرت بمبئی تشریف لاتے تو ضرور حاضر خدمت ہوتا، حال احوال، ادارہ کی نوعیت اور تعلیمی وتدریسی خدمات معلوم کر کے دعائیاں کلمات سے نوازتے اور کام سراہ کر حوصلہ افزائی فرماتے۔

میرے بڑے بچے حیان کی تحنیق اور بسم اللہ کا آغاز حضرت کے دست مبارک سے ہوا الحمدللہ۔ آج وہ آفتاب علم وفن ہمارے درمیان نہیں رہا، ہر وقت حضرت کا تصور ذہن و دماغ میں گردش کر رہا ہے، اور وہ پرانی

باتیں اور یادیں ذہن میں دستک دیتی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت کی خدمات قبول فرما کر رفع درجات فرمائیں اور ہم شاگردوں سے خوب دین کی خدمت لے کر ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے اور ہمارے حق میں اپنی رضامندی اور نجات کا ذریعہ بنائے۔آمین ثم آمین۔ پھر نم آنکھوں کے ساتھ یہ شعر پیش کرتا ہوں۔

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

❀...❀...❀

عالم بے بدل مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

کچھ یادیں کچھ باتیں

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی
رفیق تصنیف دار الدعوۃ والارشاد، حیدر آباد

اس دار فانی کو ہر شخص کو چھوڑ کر عالم بقا کی جانب کوچ کرنا ہے، دراصل ساری کوشش محنت، عمل پیہم، جہد مسلسل کا مقصود اور مطمح نظر بھی آخرت کی کھیتی بونا ہے، لیکن اس عالم فانی میں جب انسان آتا ہے اور حیات مستعار کے لمحات اور گھڑیوں کو گذار کر راہی عالم بقا ہو جاتا ہے تو پھر اس میں بعض ایسی اساطین ہوتے ہیں جو اپنے انمٹ علمی نقوش اور کارناموں کی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں، یہ شخصیات اور ان کی حیات اور جہد مسلسل کی وجہ سے طبیعت یہ سننا گوارا ہی نہیں کرتی کہ فلاں شخصیت، فلاں عالم بے مثل، محدث عظیم، فقیہ نفس اس دار فانی سے کوچ کر کے راہ عالم بقا ہو چکا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے ایسی بہت سی عظیم شخصیات کو اللہ عزوجل اس دنیا میں بھیجتا ہے، ان سے بڑے بڑے کام لیتا ہے، جس کے انمٹ نقوش اور گہرے اثرات انسانیت پر پڑتے ہیں، اس شخصیت سے انسان حد سے زیادہ اثر لیتا ہے، بلکہ اس کی زبان کی طوطی بولتی ہے، اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اور ہیرے موتی اس کی موت کے بعد بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ بڑے عظیم محقق، مدقق، عالم بے بدل، فقیہ نفس اور علم کا گہرا اور اتھاہ سمندر تھے، جن کو دیکھ کر گذشتہ اسلاف دار العلوم جن کے عظیم کارناموں سے دار العلوم کی علمی شہرت کو چار

چاند لگے، یاد آجاتی تھی، حضرت کا ترمذی کا پر مغز درس، پر وقار مجلس، علمی ہیبت سے معمور محفل وانجمن، عجیب سا سماں ہوتا، درس گاہ ساری کی ساری کچھا کچھ بھر جاتی، تل دھرنی کو جگہ نہ ہوتی ہے، چنیدہ قاری حدیث کونہایت رس گھولنے والی آواز میں پڑھتے، پھر اس کے بعد استاذ محترم کا پر وقار، پر مغز، علمی خطاب شروع ہوتا، جس میں دلائل کو اس قدر پختگی کے ساتھ پیش کرتے اور مسائل میں علماء کے درمیان اختلاف کی صورت میں موازنہ ایسے نہایت نازک اور البیلے اور اچھوتے انداز میں پیش فرماتے کہ ہر طرح کی علمی گتھیاں سلجھ جاتی، بات کو کہنے اور پیش کرنے کا سلیقہ، علمی وقار وسنجیدگی اور متانت اس قدر زیادہ لفظ لفظ سے علم کی بو جھلکتی، نہایت پختگی کے ساتھ بغیر کسی جھجک کے نہایت پر وقار اور ایک عالم بے مثل وبے بدل کے مانند نہایت پختگی اور یقین کے ساتھ بات کو رکھنے کا سلیقہ، اور علماء ومحققین کے اقوال کو پیش کر کے ان کے درمیان توازن اور ان کے علمی مباحث کا تجزیہ وتبصرہ درس کا منظر نہایت قابل دید ہوتا، طلبہ ہمہ تن گوش، کسی کے مجال کے دوران درس اپنی جگہ سے اٹھ کر بھی چلا جائے، بلکہ کئی مرتبہ دیکھا ہے کہ اگر درسگاہ میں طلباء کی تعداد کم محسوس ہوتی تو ناراض ہوکر واپس تشریف لے جاتے۔ درس گاہ اپنی وسعت کے باوجود تنگ دامنی کا شکوہ کرتی، بلکہ طلباء دروازوں پر بیٹھے سماعت درس میں مصروف نظر آتے۔

دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحب کی علمی لیاقت کا طوطی بولتا تھا، نہایت تندہی اور توجہ کے ساتھ مفتی صاحب کے خطابات سنے جاتے، علمی جلسوں اور ابتدائی تعلیمی سالوں اور مختلف انعامی جلسوں وغیرہ کے موقع سے نہایت پر مغز گفتگو کرتے اور بلا جھجک بلا تکلف نہایت پختگی اور ایقان کے ساتھ گفتگو کا طرز وانداز طلبہ وشاگردوں کے ذہن ودماغ کو ہمیشہ جھنجوڑتا رہے گا، معمول تھا کہ درسگاہ میں داخل ہوتے ہی طلبہ دورہ حدیث کو مختصر اور جامع احادیث حفظ اور ذہین نشیں کرنے کے لئے کئی مرتبہ دہرا کر یاد کرانے کی کوشش کرتے، ایک حدیث یاد پڑتی ہے کہ ''البصاق فی المسجد خطیئۃ، کفارتھا دفنھا'' اس قسم کے مختصر اور جامع احادیث یاد دلائی جاتی۔

اسماء حسنی بھی باضابطہ مکمل حدیث کی شکل میں حفظ کرائے جاتے، بلکہ اسماء حسنی تمام طلبہ دورحدیث نے سنایا

تو بطور انعام فتاوی رحیمیہ وغیرہ اور ہدایت القرآن کا سٹ بھی عنایت فرمایا، میں بھی تمام دورہ حدیث کے طلبہ کے ساتھ حضرت اقدس کے گھر پر اسماء حسنی سنانے کے لئے گیا، علمی ہیبت وقار کی وجہ سے بڑی ہیبت اور کوفت ہوئی، بہر حال اسماء حسنی والی حدیث صحیح سنانے پر ہدایت القرآن اور فتاوی رحمیہ کے سٹ سے نوازا گیا جس سے میں ابھی بھی استفادہ کرتا ہوں۔

علمی متانت کے ساتھ سادگی بھی لائق دید ہوتی، گھر سے رکشہ پر سوار دار العلوم آتے جاتے، گھر چونکہ دار العلوم سے دور واقع تھا ایک دیڑھ کیلومیٹر کی دوری پر وہاں سے رکشہ پر تشریف لاتے اور جاتے، بلکہ تمام دار العلوم کے اساتذہ کی یہی شان استغناء رہی ہے کہ اس قدر بڑے ادارے کے اساتذہ جن کے ہزاروں لاکھوں شاگردوں دنیا کے انگت حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن کار نشیں نظر نہ آتے، وہی سادگی، وہی جفاکشی، وہی جہد مسلسل، علمی طلب ان کا سرمایہ، گویا کہ ان کو دنیا سے کوئی سروکار ہی نہیں، ساری کتابیں دور رسالت کے بعد سے لے کر موجودہ قریبی صدیوں تک کے محققین کے کتب بینی کے لئے انہیں کا انتخاب ہوا ہے، علمی خوشہ چینی، علمی کمال، علمی لیاقت سب ہی امور ان کے لئے ہیں۔ نمازوں کے اوقات میں یہ اساطین علم ادھر سے ادھر عام انداز میں آجا رہے ہیں، جب یہ دار العلوم سے باہر نکلتے ہیں، لوگ ان کی دست بوسی اور مصافحہ کے لئے ترس جاتے ہیں، یہی شان استغناء و بے نیازی وللّٰہیت، بے گانگی، فرزانگی مفتی صاحب رحمہ اللہ کی بھی خصوصیت تھی۔

حضرت مفتی صاحب دار العلوم دیوبند کے موجودہ شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے، آپ ایک مستند محدث، کامیاب مدرس، متعدد اہم کتابوں کے مصنف اور جید الاستعداد اور صاحب بصیرت مفتی وفقیہ بھی تھے۔

حالات وکوائف

۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۰ء میں آپ کی ولادت ہوئی، آپ کا وطن موضع ''کالیڑہ'' بناس کانٹھا (شمالی گجرات) ہے، مفتی صاحب پالن پور کی نسبت سے مشہور ہوئے جو آزادی سے پہلے ایک مسلم نواب اسٹیٹ تھا اور اس ضلع کا

مرکزی شہر بھی، بسم اللہ والد محترم نے کروائی، وطن میں ہی مکتب میں ناظرہ ودینیات کی تکمیل کے بعد ''دارالعلوم چھاپی'' میں داخل مدرسہ ہوئے، جہاں مفتی صاحب کے ماموں جان عبدالرحمن صاحب تدریسی خدمات کی انجام دہی میں مصروف تھے۔

۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء میں مظاہر العلوم سہارن پور آ گئے، یہاں نحو، منطق اور فلسفہ کی اکثر کتابیں پڑھیں، اعلی تعلیم کے لئے ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، علم حدیث وفقہ وتفسیر کے علاوہ دیگر علوم وفنون کی کتابیں دارالعلوم میں پڑھیں، ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور سالانہ امتحانات میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے، بڑے اساتذہ علامہ ابراہیم بلیاوی، قاری طیب صاحب وغیرہ کی سرپرستی حاصل رہی، فراغت کے بعد ایک سال تک شعبہ افتاء میں زیر تعلیم رہے اور حضرت مفتی محمود احمد نانوتوی (رکن مجلس شوری واعزازی مفتی دارالعلوم دیوبند) کے یہاں معین مفتی کے طور پر بھی فتوی نویسی کی خدمات انجام دیتے رہے۔

تدریس

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں درجہ علیا کے مدرس مقرر ہوئے اور ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء تک وہاں نہایت حسن وانتظام کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، اسی زمانے میں ''العون الکبیر شرح الفوز الکبیر'' اور علامہ طاہر پٹنی کی کتاب ''المغنی'' کی شرح ''تہذیب المغنی'' (غیر مطبوعہ) ''حرمت مصاہرت'' وغیرہ کتابیں تصنیف فرمائیں۔

دارالعلوم دیوبند میں

حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ کے ایماء پر دارالعلوم دیوبند میں تقرر عمل میں آیا، دارالعلوم میں اس وقت سے اب تک تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، منطق وفلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا درس نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا، دورۂ حدیث میں ایک طویل عرصہ تک ترمذی شریف کا درس دیا، جس کی شان اور خوبی نہایت قابل دید ہوتی، درس

طلب کے درمیان نہایت مقبول تھا، اسی طرح تکمیل العلوم میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' جو فکر شاہ ولی اللہ کی ترجمان ہے، یہ کتاب بھی تدریس میں آپ سے متعلق تھی، جس کی ہمہ جہت شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے نام سے ترتیب دے کر فکر شاہ ولی اللہ کی ترجمانی کا کام خوب انجام دیا۔ دار العلوم دیوبند کے موقر شعبہ دار الافتاء سے میں بطور مفتی افتاء نویسی کی خدمات بھی انجام دی ہے، اخیرش مفتی صاحب کی علمی سرپرستی میں ''فتاوی دار العلوم'' کی ترتیب جدید کام انجام دیا گیا۔

مفتی صاحب ''فتنہ قادیانیت'' و ''تحفظ ختم نبوت'' کے سلسلہ میں قائم کردہ شعبہ ''کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت'' کے ناظم اعلی بھی رہے ہیں، دار العلوم کے مختلف اجلاس اور عمومی جلسوں میں مفتی صاحب کی علمی تقریروں اور پند ونصائح پر علمی خطابات کو بڑی تندہی اور بیدار مغزی کے ساتھ سنا جاتا، طلباء کے لئے علمی گتھیاں سلجھاتیں، رجال سازی اور مردم گری کا کام انجام دیتے، دورہ حدیث کے سال طلباء کی تین قسم کی استعداد کے حامل قرار دے کر فرماتے ہیں، اعلی قسم کے صلاحیتوں کے حامل طلباء تدریس متعلق رہیں، ابھی تو علم کی چابی ملی ہے جس سے علم کے تالے کھولنے ہیں، درمیان اوسط درجے کے طلباء اور وغیرہ دیگر دینی شعبوں سے متعلق خدمات کی انجام دہی کی طرف توجہ دلاتے۔

بہت سارے طلبہ کی راست نگرانی فرما کر ان کو مختلف مقامات اور خود دار العلوم میں اپنا جانشیں اور ترجمان بنایا ۔۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء میں استاذ محترم حضرت مولانا نصیر الدین صاحب بلند شہریؒ کی علالت کی وجہ سے استعفاء کے بعد اس آخری سال تک دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث کے باوقار شعبہ پر نہایت علمی طمطراق، وعلمی شان کے ساتھ فائز رہے۔

تصنیف وتالیف

نہ صرف آپ ایک کامیاب مدرس تھے، بلکہ ایک نہایت کامیاب مصنف اور کتب درسیہ کے محرر بھی تھے، جن میں

محفوظات کے نام سے احادیث پر مشتمل کتابیں، آسان نحو وصرف، آسان منطق ، معین الفلسفہ اس طرح کی دیگر مبادیات پر مشتمل کتابیں آج بھی ہندوستان کے طول وعرض میں داخل درس ہیں، جن کو نحو وصرف و منطق وفلسفہ کی مبادیات کی شکل میں بچوں کو حفظ کرایا جاتا ہے، اس کے علاوہ ترمذی کی شرح ''تحفۃ الالمعی''، ''تحفۃ القاری شرح بخاری''، العون الکبیر شرح الفوز الکبیر، حاشیہ امداد الفتاوی، ہدایت القرآن وغیرہ شامل ہیں۔ نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے عظیم استاذ، محقق، مدقق، مفتی وفقیہ، محدث باکمال، مصنف ومولف تھے؛ بلکہ موجودہ وقت میں دارالعلوم دیوبند کے حقیقی ترجمان بھی تھے، دنیا کے طول وعرض میں دارالعلوم کے ترجمان کی حیثیت سے مفتی صاحب کے اسفار ہوتے۔

آخری وقت

آخری وقت میں دوران سال کچھ طبیعت علیل ہوئی، پھر بحالی پر بخاری شریف کی تدریس کی تکمیل فرمائی، تکمیل بخاری کی آخری مجلس نہایت ہی زیادہ غم آگیں رہی، جس میں مفتی صاحب کہتے کہتے رک گئے، بولنے کی سکت نہ رہی، فرمایا: وہی ہوگا جو اللہ چاہے، استاذ محترم کو روتا بلکتا اور سستا دیکھ دارالحدیث طلباء کی بھی سسکیاں بندھ، عجیب سماں بندھ گیا، پھر علالت کے بعد صحت یابی ہوئی، پھر حضرت والا کے فرزند قاسم احمد پالنپوری نے ۱۸ رمئی کو قارئین سے خصوصی دعاں کی درخواست کرتے ہوئے یہ کی اطلاع دی تھی کہ والد محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب دامت برکاتہم کی طبیعت آج بتاریخ ۱۸ رمئی بروز پیر سیریس ہوگئی ہے۔

دراصل حضرت مفتی صاحب کے پھیپھڑوں میں پانی چلا گیا تھا جس کے باعث انکو سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی، اسی تناظر میں وہ ایک ہفتہ قبل انتہائی نگہداشت کے شعبہ میں داخل کیے گئے تھے، علاج معالجہ ہوتا رہا، دن بدن طبیعت میں سدھار بھی ہو رہا تھا مگر آج طبیعت تشویشناک ہو چلی ہے۔ حضرت کے ہی فرزند نے ۱۹ رمئی کی صبح حضرت والا کے داغِ مفارقت کی خبر دے کرامتِ مسلمہ بالخصوص تلامذہ محبین متعلقین اور محبین کو مغموم کردیا۔ مفتی صاحب کی نصف صدی پر مشتمل علمی خدمات کو ہر دور میں سنہری تحریر میں لکھا جائے گا، لاکھوں کی تعداد میں دنیا کے ہر کونے میں پھیلے شاگرد مفتی صاحب کی فکر وفن کو عموم دینے میں لگے رہیں گے۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

مولانا حامد پالنپوری
بھاگل، گجرات

حضرت استاذ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کی شخصیت سے کون نا آشنا ہے، آپ ایک عظیم محدث ومفسر؛ افکارِ نانوتوی کے محافظ؛ علومِ نانوتوی کے امین؛ علوم وفنون کا تابندہ ستارے؛ ایک بلند پایہ مصنف؛ یگانہ روزگار شخصیت؛ ایک بے بدل فقیہ؛ ایک محقق و مدقق عالم؛ ایک بارع و ماہر مفتی تھے، حضرت الاستاذ کو اللہ تعالی نے علوم وفنون پر مضبوط دسترس، اور مغلق وپیچیدہ مسائل کو چٹکیوں میں حل کردینے پر بڑی گرفت عطا فرمائی تھی، واقعتاً حضرت مفتی صاحب ہمارے لئے ایک درِ بے بہا تھے، آپ کی طبیعت میں یوں تو نرمی تھی، لیکن دینی امور میں آپ انتہائی سخت تھے، آپ عاملِ شریعت متبعِ سنت تھے، جب کسی بدعت کو جنم لیتا ہوا دیکھتے تو آپ فی البدیہہ روک ٹوک دیتے، حقیقتا آپ دین کے چوکیدار تھے، ساری عمر درس وتدریس آپ کا مشغلہ رہا، آپ کو اپنے مشغلے سے اس قدر دلچسپی تھی، کہ آپ جی جان لگا کر پڑھاتے رہے، پھر وہ وقت بھی آیا کہ آپ نے اکثر وبیشتر علوم کو اپنی گرفت میں لے لیا، پھر کیا تھا، آپ کے قلم میں جنبش ہوئی اور قلم بس اٹھتا ہی چلا گیا ،کبھی تفسیر ہدایت القرآن؛ تو کبھی تحفۃ الالمعی ؛تو کبھی تحفۃ القاری؛ تو کبھی حجۃ اللہ البالغہ؛ کی لاجواب وبے مثال شرح رحمۃ اللہ الواسعہ؛ تو کبھی متفرق درسی وغیر درسی کتب تحریر فرمائی۔

گلزار ہست وبود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

حضرت کا درس بڑا مقبول تھا، لہجے کی ملاحت، دلنشیں تشریح، دلکش لب ولہجہ، شفقت ومحبت بھری ڈانٹ ڈپٹ، آج بھی یاد آتی ہے؛ جب حضرت الاستاذ درس دینے آتے تو طلبہ کا ہجوم اس قدر کے دارالحدیث کھچا کھچ بھر جاتا، اس قدر تسلی بخش وضاحت فرماتے کہ ادنیٰ طالب علم بھی بخوبی سمجھ لیتا تھا، یہ حضرت کے درس کی خصوصیت تھی۔

نیز آپ کا درس صرف دارالعلوم ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان و بیرون میں مقبول گردانا جاتا تھا، آپ نے صرف نقل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ نے خود منصوصات میں غوطہ زنی کی اور بیش بہا قیمتی موتی نکال کرامت کے سامنے پیش فرمایے، آپ کو مطالعے کی اس قدر اہمیت تھی کہ آپ نے اتنی تصنیفات کے باوجود کبھی مطالعہ ترک نہیں کیا، بلکہ آپ تو مطالعہ کے دلدادہ تھے، جی ہاں مطالعہ ہی علوم کو جلا بخشتا ہے، مطالعہ ہی حاصل کردہ علوم کی آبیاری کا بہترین ذریعہ ہے، مسلسل مطالعہ انسان کو علوم و معارف کی گہرائی تک پہنچا دیتا ہے، مفتی صاحب کے مسلسل مطالعہ ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اتنی گوہر بار کتب تصنیف فرمائیں، مفتی صاحب نہایت عاجز؛ اور سادہ لوح انسان تھے، آپ بڑے متواضع؛ اور منکسر المزاج؛ اور خاموش طبیعت؛ انسان تھے، چناچہ جب محبوب العلماء والصلحاء حضرت پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ دارالعلوم تشریف لائے تھے، تو آپ نے حضرت کو بالکل اسی طرح پایا تھا جس طرح سنا تھا، اس کا آپ نے حضرت الاستاذ کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں اظہار فرمایا ہے، انتہائی تعجب وحیرت تو اس وقت ہوئی، جب حضرت مولانا جمال الرحمن صاحب بلندشہری رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تھا، جنازہ آنے میں کچھ دیر تھی، آپ بھی طلباء کے ساتھ کھڑے تھے، جب کافی دیر ہوگئی تو آپ وہیں بیٹھ گئے، جب کہ آپ رئیس المحدثین ہیں، آپ کو اس کا بالکل خیال نہ آیا، کیونکہ علم نے آپ کو انتہائی متواضع انسان بنا دیا تھا، جبکہ "علم کا مقتضی بھی یہی ہے کہ جوں جوں علم آتا جائے، انسان میں عاجزی بھی آتی جائے، کیونکہ پھل دار درخت جب بار آور ہوتا ہے، تو ڈالیاں ٹہنیاں جھک جایا کرتی ہیں،" بہر حال حضرت مفتی صاحب علوم وفن کا خزانہ

؛حسنِ عادات واخلاق کا حسین مجسمہ تھے۔

بھلا سکے گا نہ زمانہ وہ یادگار ہوں میں

بہارِ عہدِ گزشتہ کا راز دار ہوں میں دکھ تو اس بات کا ہے کہ اہل مدارس ہر سال حضرت کو اپنے جلسوں پر بلاتے تھے، پوسٹروں اور اشتہارات میں جب لوگ آپ کا اسم گرامی دیکھتے تو خواص وعوام سبھی آپ کی شیریں گفتگو علمی سخن کو گوش گزار کرنے کے لیے جوق در جوق جمع ہوجاتے تھے،لیکن اب اہل مدارس کسے بلائیں گے؟ جن کے چہرے کو دیکھ کر فرحت وانبساط نصیب ہوتا تھا،جن کی باتوں کو سن کر کلیجہ ٹھنڈا ہوجاتا تھا؛ جن کی ملاقات سے دل باغ باغ ہوجاتا تھا؛ جن کی آمد سے محفل پر رونق تھی؛ جب سنتے کہ آپ کی آمد ہے تو خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی؟ ہر سال حضرت کی زیارت نصیب ہوتی تھی؛ خصوصا حضرت کو جامعہ نورالعلوم گٹھامن سے گہری عقیدت تھی، جہاں آپ کا جامعہ سے ربط تھا؛ وہاں آپ جامعہ کے ایک سرپرست اور شوریٰ کے رکن بھی تھے؛ ہر سال حضرت خوشی خوشی جلسہ کے موقع پر تشریف لاتے تھے، اور کبھی مختصر سی طلباء کو نصیحت بھی فرماتے تھے، بس دیکھتے ہی رہ جاتے تھے، جب حضرت بولنا شروع کرتے، کسی مسئلے پر گفتگو کا آغاز فرماتے تو بس بولتے ہیں جاتے، امسال جب اثنائے سال آپ تشریف لائے تھے، تو آپ نے مدرسے کا بخوبی دورہ بھی کیا تھا، لیکن کیا پتا تھا، کہ یہ آخری زیارت ہے؛ یا آخری آنا ہے؛ پھر کبھی آنا نہ ہوگا؛ بس آئے گی تو آپ کی یادیں آئے گی؛ آئیں گے تو صرف آپ کے خواب آئیں گے؛ دل تجھے ڈھونڈتا رہ جائے گا؛ ہم نہیں بلکہ ہر کسی کو تیری طلب ہوگی۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

کچھ ایام گزرے امتحانات کے مواقع چل رہے تھے، فارغین وفاضلین کو حضرت کے ہاتھوں اختتام بخاری کا انتظار تھا، لیکن طلباء کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا، آپ علالت کے سبب ممبئی لائے گئے، وہی زیرِ علاج رہے،

افاقہ ہونے پر اپنے وطن لوٹنے کی سوچی، لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، رمضان شریف چل رہا تھا، ایک ہفتہ قبل حضرت کے علیل ہونے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں، لیکن کوسوں دور اس کا یقین نہیں تھا، چنانچہ تصدیق کے لیے حضرت کے برادر مکرم حضرت مفتی امین صاحب مدظلہ کے فرزند ارجمند مفتی مصطفی صاحب سے رابطہ کیا، تو آپ نے طبیعت کے قدرے ناساز ہونے کی خبر دی، کچھ اطمینان نصیب ہوا، لیکن رفتہ برفتہ طبیعت ناساز ہوتی جا رہی تھی ، ۲۵؍رمضان کی صبح تھی، چاشت کا وقت تھا، کہ ناگاہ یک دل سوز خبر بجلی بن کر سب پہ گری: کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ آغوش رحمت میں چلے گئے، پھر کیا تھا کہ علمی حلقوں میں سوگ چھا گیا: علماء طلباء کی آنکھیں نم ہوگئیں، کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا، (کہ آج دیوبند یتیم ہوگیا) اور اس طرح علم وفن کا آفتاب وماہتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گیا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ

آتی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

۞...۞...۞

تھی جو وہ شمعِ ہدایت آج گُل ہو ہی گئی

استاذِ عالی شان کی یاد میں چشمِ گریاں کے چند آنسو

مولانا اسعد اللہ قاسمی مظاہری
دربھنگہ، بہار

مورخہ ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء، بروزِ منگل صبح کی ابتدائی ساعتوں میں محفلِ گیتی میں یہ کُہرام مچ گیا کہ محرمِ اسرارِ قرآں، رموزِ حدیث کے رازداں، اصولِ دینِ حق کے پاسباں، علم وفن کے مہرِ درخشاں، دشتِ معرفت کے حدی خواں، صدق وحق کے شیرِ نیستاں، فریدِ عصر وخلدِ آشیاں، مردِ عالی مردِ ذیشاں، اُستاذ الاساتذہ، حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس اللہ سرہ نے ہندوستان کے تجارتی دار السلطنت شہرِ ممبئی میں اپنی زندگی کی آخری سانس لے لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آہ! جس قدسی الاصل کی مجلسِ علم وعرفاں میں فرشتے فخر وناز سے شرکت کرتے تھے، وہ مجسمۂ علم وفن ہم سے روٹھ گیا۔ آہ صد آہ! جس شمعِ عرفان وصداقت کی زبان سے قریب نصف صدی تک قال اللہ وقال الرسول کے زمزمے بلند تھے، وہ عُقدہ کُشائے سُخن ہمیں داغِ مفارقت دے گیا۔ اُف !! جس سراپا مُہر ومحبت شہنشاہِ تدریس سے لاکھوں تشنگانِ علوم نے اپنی پیاس بجھائی تھی، وہ گوہرِ یکتائے فن ہم سے جدا ہو گیا۔ اُف صد اُف !! جس پیکرِ خلوص ویقین کے جوہر ریز قلم سے علم وتحقیق کے چشمے پھوٹتے تھے، وہ فخر ونازشِ چمن ہم سے بچھڑ گیا۔

آپ کے وصالِ پُرملال کی خبرِ وحشت اثر پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، آنکھوں سے اشکہائے غم ٹپکنے لگے، شاگرد ہچکیاں لے کر رونے لگے، مشائخ کے شگفتہ چہرے مُرجھا گئے، ایسا معلوم ہونے لگا کہ

آج ہر شخص کی تمام شادمانیاں چھین لی گئیں، اس کے سر سے ایک ٹھنڈی چھاؤں کا سایہ اٹھ گیا۔ آج صرف دارالعلوم کا ہی نہیں، بلکہ پورے ملک، پورے ایشیاء، اور پورے عالمِ اسلام کا سرمایۂ سکون لٹ گیا۔

رواں ہوں نہ آنکھوں سے کیوں غم کے دھارے
نہ مایوس ہوں کیوں جہاں کے نظارے
لرزتے ہیں پلکوں پہ آکر ستارے
جدا ہوگئے ہائے! مُحسن ہمارے
وہ جب یاد آئیں گے آیا کریں گے
ہمیں خوں کے آنسوؤں لایا کریں گے

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کی خبر دیکھتے ہی دل پر شدید چوٹ لگی، بلکہ شیشۂ دل چور چور ہوگیا، آنکھیں اشک ریز ہوگئیں، ہوش وحواس پر کاری ضرب لگی، اور طبیعت بوجھل سی ہوگئی، کچھ لکھنا تو درکنار، بلکہ سوچنا بھی سوہانِ روح! اسی اداسی و پژمردگی میں دو دن گذر گئے، ہر وقت ذہن ودماغ کے پردے پر طالب علمی کی کئی حسین ودلکش یادیں جھلملاتی رہیں، اور یوں محوس ہوتا رہا کہ میں آج سے نو سال قبل ۲۰۱۱ء کے عرفان انگیز ومشک بیز درسِ بخاری میں ہوں، جو میرے دورۂ حدیث کا سال تھا۔

بیٹھا ہوں مست وبے خود خاموش ہیں فضائیں
کانوں میں آرہی ہیں، بھولی ہوئی صدائیں

پھر آج جب میں نے ہوش سنبھالا، عقل وخرد نے رہبری کی، تب میرا سوگوار قلم لوحِ قرطاس سے لپٹ لپٹ کر آنسوؤں کا سیلاب بہانے لگا۔ آہ! کتنا پُرکیف وپُرلطف تھا وہ زمانہ، اور کتنی خوش جمال ورنگین تھیں وہ گھڑیاں، جب ہم صبح کے پانچویں گھنٹے میں شیخ کی آمد کا انتظار کیا کرتے تھے، حضرت کی آمد سے پہلے ہی ہم اپنی نشست گاہ محفوظ کر لیتے، اور درس گاہ عاشقینِ علم سے کھچا کھچ بھر جاتی، جن میں بعض طلبہ دیوبند کے دوسرے

مدرسوں سے بھی کشاں کشاں آ گئے ہوتے۔

ذرا دیر بعد کانوں میں آواز آتی ''مفتی صاحب آرہے ہیں'' پھر کیا تھا، نگاہیں سب کی شمالی دروازے پر لگ جاتیں، پیچھے پیچھے صاحبزادۂ شیخ مولانا حسین احمد زید مجدہ۔۔۔جوان دونوں تحفۃ القاری کی ترتیب میں ہمہ تن مشغول تھے۔۔۔اور چند وفا کیش طلبہ اور آگے آگے درویش صفت انسان۔جس کے چہرے پر انوارِ الٰہی رقصاں۔پیکرِ علم وعمل، شمعِ تسلیم ورضا، شانِ خُلقِ اتم، فروغِ دینِ نبی، ترجمانِ فکرِ ولی اللٰہی، امینِ فقہِ نعمانی، رازدارِ فقہِ ابوابِ بخاری، پاسبانِ معارفِ نانوتوی، درویشِ شب زندہ دار، مجسمۂ عشقِ رسول، گوہرِ درجِ ہدی، نیّرِ برج سعادت یعنی محدثِ کبیر، شانِ دیوبند حضرت مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سکون ووقار کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیتے، گردوپیش کی فضاء خوشبوؤں سے معطر ہوتی چلی جاتی، پھر آپ درس گاہ میں مُحدّ ثانہ شان سے داخل ہوتے، اور مسند کے پاس کھڑے ہوکر سلام کرتے، پھر خاشعًا ومتواضعًا مسندِ تدریس پر جلوہ گر ہوتے، چند لمحوں کے لیے فضا ساکت وخاموش ہوجاتی، اس وقت عجیب کیفیت محسوس ہوتی۔

نظر میں ہے اب تک وہ رنگین زمانہ نشیلا نشیلا سُہانا سُہانا

اُس سال حضرت کے درسی افادات کے شاہکار مجموعہ تحفۃ القاری کی تالیف وترتیب کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے حدیث شریف کی قراءت خود سے شروع فرماتے اور سبق شروع ہوجاتا، پھر کیا تھا، دارالحدیث کے بام ودَر فرطِ شوق میں وجد میں آجاتے، ایک عجیب مسرت بخش سماں ہوتا، پُرشوکت لہجہ اور ذوقِ عرفاں سے سرشار آواز، علم کا بے پایاں سمندر موجیں مارنے لگتا، مذاہب کا بیان، امامِ ابوحنیفہ کے مسلک کی تحقیق وتنقیح، حدیثی معنی آفریں نکات، سندورجال کی پُرمغز بحثیں، تصوف کے اسرار ورموز، کلام وحکمت کی دقیق باتیں، سب ہی کچھ سبق میں زیرِ بحث آجاتا، بلکہ یوں سمجھیں کہ منقولات ومعقولات کے نکات ہائے گنجلک جب تک سلجھ نہ جاتے برابر تقریر جاری رہتی۔

موضوع پر مکمل توجہ مرکوز رکھتے، اور متعلقہ تمام دلائل و براہین اس قدر خوش اسلوبی اور منطقی ترتیب سے بیان فرماتے کہ طلبہ عش عش کرنے لگتے۔ گفتگو ٹھہر ٹھہر کر، صاف اور شیریں ہوتی، یوں محسوس ہوتا کہ لبوں سے پھول جھڑ رہے ہیں، اندازِ تفہیم مرتّب و دل نشیں ہوتا، یوں لگتا کہ آپ صرف پڑھا نہیں رہے ہیں، بلکہ سامعین کے دلوں پر علوم و معارف کا نقشِ جمیل مرتسم کر رہے ہیں، اسی لیے بدشوق طالبِ علم بھی آپ کے درس میں جس شوق و ذوق سے شرکت کرتے وہ دِیدَنی ہوتا۔

آواز میں نہایت کشش اور سحر آفرینی تھی کہ ڈھائی، تین گھنٹے کا یہ سبق طلبہ کو بالکل گراں معلوم نہ ہوتا، بلکہ وہ **كأنهم على رؤسهم الطيور** کی دل کش تصویر بنے آپ کی طرف ہمہ تن گوش رہتے۔ دورانِ تقریر جب کسی ایک بحث کو مکمل فرماتے، تو اپنے مخصوص و دل کش انداز میں ایک دو مرتبہ **لا اله الا الله** کا وِرد فرماتے، جس سے سامعین کے دل و دماغ میں نشاط کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔

آپ آغازِ سال میں اپنے ایک منفرد انداز کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے کہ: جب میں کہوں ''حضرت شاہ صاحب قدس سرّہٗ'' تو اس سے مراد ''مُسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ'' ہوں گے۔ اور جب کہوں ''ہمارے حضرت شاہ صاحب قدّس سرّہٗ تو اس مراد ''محدّثِ عصر حضرت علّامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ'' ہوں گے۔

آپ طلبہ کو اس بات کا پابند بناتے کہ وہ ہمارے آنے سے پہلے درس گاہ میں موجود رہیں، اور اس کی سختی سے نگرانی فرماتے، چناں چہ اگر کوئی طالبِ علم آپ کی درس گاہ تشریف آوری کے بعد درس گاہ حاضر ہوتا، تو کیا مجال کہ وہ سبق میں شامل ہوجائے، اسے فوراً باہر کردیا جاتا، اور آپ برآشفتہ ہوکر فرماتے کہ: ''اِسے باہر نکالو، چل چلا جا، تیرے بغیر بھی سبق ہوجائے گا''۔

حضرت الاستاد رحمۃ اللہ علیہ بعض اوقات دورانِ درس خوش طبعی کی باتیں بھی ارشاد فرماتے، جس سے محفلِ

درس کشتِ زعفران ہو جاتی۔ ذوق کو تازگی بخشنے کے لیے دو نمونے پیشِ خدمت ہیں:

(۱) دورۂ حدیث شریف میں انتظامیہ کی طرف سے ایک ملازم مامور ہوتا ہے، جو برقی امور کو دیکھتا ہے، تا کہ مائیک کا نظام مختل نہ ہو۔

ایک مرتبہ آپ اس ملازم سے ازراہِ خوش طبعی یہ فرمانے لگے کہ: ''سالوں سے تم یہاں بیٹھتے ہو، تمام شیوخ کے دروس سنتے ہو، اب تک تو تمہیں حافظِ حدیث ہو جانا چاہیے''۔ اس پر محفلِ درس میں ہنسی کی لہر دوڑ گئی، خود حضرت بھی مسکرانے لگے اور وہ ملازم بھی ہنس پڑا۔

(۲) بعض اوقات ائمہ کے مختلف فیہ مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے کہ: اس مسئلے میں ''نص فہمی'' یعنی دلیل فہمی'' کا اختلاف ہے، دلیل کا اختلاف نہیں ہے، یعنی ایک ہی نص کو کسی امام نے ایک طرح سے سمجھا ہے اور اسی نص کو دوسرے امام نے دوسری طرح سے سمجھا۔

اسی پس منظر ایک مرتبہ دورانِ درس فرمانے لگے کہ: طلباء اصطلاح بھی نہیں سمجھتے، مجھ سے ایک طالب علم نے پوچھا کہ آپ جو یہ ''نسخ فہمی'' ارشاد فرماتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟ طالبِ علم اپنی کم علمی کی وجہ سے نص فہمی'' کو ''نسخ فہمی'' سمجھ بیٹھا، جس کا اس تناظر میں کوئی معنی نہ تھا، اس لیے طلبہ اس علمی لطیفے سے خوب محظوظ ہوئے اور ہنسنے لگے اور حضرت بھی تبسم فرمانے لگے۔

آہ! آپ کی ہر شان و ادا میں کیا تاثیر تھی، آج جب یہ باتیں یاد آ رہی ہیں، تو دل پارہ پارہ ہو رہا ہے، آنکھیں نَم ہو رہی ہیں، اور قلم پر لرزش طاری ہے۔ حضرت الاستاد رحمۃ اللہ علیہ دورانِ سبق نصیحت آمیز سلف کے چیدہ چیدہ واقعات بھی سناتے، اور طلبہ کو مَہمیز کرنے کے لیے بعض اوقات مختلف چشم کُشا، تحیُّر آفریں اور سبق آموز باتیں ارشاد فرماتے: ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ: گجرات کے بعض اہلِ مدارس ہم سے کہتے ہیں کہ: ہمیں کوئی مشاق و دیدہ وَر شیخ الحدیث دو، تو ہم ان سے کہتے ہیں کہ ''ماؤں نے شیوخ الحدیث جننے چھوڑ دیے، میں نے بارہا آپ

کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: ’’بتّیس سالوں سے دارالعلوم کو اچھے مفتی کی تلاش ہے، جو ملک کے طول وعرض میں نہیں ہیں، اور چند ہیں بھی، تو وہ اپنی جگہ کام کررہے ہیں، آتے نہیں‘‘۔

آپ کی یہ بات بھی طلبہ کے لیے بہت سبق آموز ہوتی، جو آپ اکثر ارشاد فرماتے کہ: ’’جب سے طلبہ کے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ ہم فاضل ہو گئے، ان کی علمی ترقی رک گئی، اس لفظِ فاضل نے ان کا ناس پیٹ دیا، ارے بھائی! فاضل تو کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں۔ فاضل من الفضیلۃ بننے کے لیے پوری زندگی محنت شرط ہے‘‘۔

آہ کل جب یہ جملے یاد آتے تو فرحت ونشاط اور جوشِ عمل کا باعث بنتے تھے، آج جب یاد آتے ہیں تو کرب ناک اور سوہانِ روح بنتے ہیں۔

عہدِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

آپ نے کم وبیش پینتیس سال تک گلشنِ نانوتوی میں سننِ ترمذی کا درس دیا اور ۲۰۰۹ سے تادمِ زیست صحیح بخاری بھی آپ کے زیرِ درس رہی۔

مفتی صاحب کا صرف یہی روشن کارنامہ نہیں ہے کہ انھوں نے کم وبیش نصف صدی تک علمِ حدیث کے نغمے سنائے اور ہندو بیرونِ ہند کے ہزاروں طلبہ ان کے علوم ومعارف سے سرشار ہوئے، بلکہ ان کا ایک درخشاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کے عنبریں، عطرپاش، سدابہار اور بدیع آثار قلم سے اکثر اسلامی اور عربی علوم وفنون پر کم وبیش پچاس کتابیں وجود میں آئیں، جن میں بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔

برِّصغیر پاک وہند میں قبولیت یافتہ سننِ ترمذی کی شاہکار شرح ’’تحفۃ الالمعی‘‘ آٹھ جلدوں میں،۔۔۔۔ صحیح بخاری کی مشہور ترین شرح ’’تحفۃ القاری‘‘ بارہ جلدوں میں۔۔۔۔ فہمِ قرآن کی شاندار کلید ’’ہدایت القرآن‘‘ پانچ جلدوں میں۔۔۔۔ اور مُسنِدُ الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدّثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عدیم النظیر، لیکن ادق ترین

تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی فقید المثال اور جامع ترین شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' پانچ جلدوں میں۔

اس مُؤخّر الذکر شرح نے اپنے یومِ اشاعت سے آج تک علمی حلقوں میں خوب دھوم مچائی ہے، اور بڑے بڑے جبالِ علم وفن سے اپنی جامعیت ومعنویت کا لوہا منوایا ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دورانِ سبق سفر پسند نہیں کرتے، البتہ چھٹیوں کے ایام میں ملک وبیرونِ ملک سفر فرماتے، اور پُر مغز علمی واصلاحی خطابات فرماتے تھے، آپ کے یہ شہ پارہ خطابات جہاں سامعین کے مردہ ضمیروں کو اس بات کے لیے جھنجھوڑتے کہ وہ اپنا سمتِ سفر تبدیل کریں، اور آخرت کو اپنا نصب العین بنائیں، وہیں وہ صد پارہ خطابات مختلف پیچیدہ اور مشکل علمی مسائل سے پردے ہٹاتے اور اہلِ علم ودانش کی تسکینِ روح کا سامان فراہم کرتے۔

میں نے سب سے پہلے حضرت الاستاد رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر اس وقت سنی جب میں ۲۰۰۱ء میں دارالعلوم بالا ساتھ، سیتامڑھی، بہار میں شعبۂ حفظ کا ایک کمسن طالبِ علم تھا اور آپ جلسۂ دستار بندی میں تشریف لائے تھے، مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے ''سورۃ العصر'' کی روشنی میں نہایت پُر مغز تقریر فرمائی تھی۔

وہ تقریر کیا تھی! صُورِ اسرافیل تھی جس نے غفلت کوش انسانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، ضربِ تھی جس نے دل کی سرد انگیٹھی کو عشق وعرفان سے سلگا دیا۔

الغرض حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی نہایت ہی پُر جوشِ عمل اور سرگرمِ کار رہی۔ یوں تو مجھے ممبئی قیام کے زمانے میں آپ کی بارہا زیارت واستفادے کا موقع ملتا رہا، لیکن آپ سے بالمشافہ آخری ملاقات ۲۰۱۸ء کی ایک شام آگری پارہ ممبئی میں ہوئی، آپ وائی، ایم، سی گراؤنڈ میں منعقد ہونے والے ''تحفّظِ سنت کانفرنس'' میں شرکت کی غرض سے سہاگ پیلس میں قیام فرما تھے، میرے ایک عزیز نے مجھ سے کہا کہ: حضرت مفتی صاحب سے ایک بچے کی تحنیک کرانی ہے، آپ جب مفتی صاحب سے ملاقات کے لیے

تشریف لے جائیں گے، تو میں بھی ساتھ چلوں گا، چناں چہ میں اس عزیز کے ساتھ عصر سے قبل حاضرِ خدمت ہوا، حضرت کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی، زائرین کا خاصہ مجمع تھا، نماز سے فراغت کے بعد میں نے کھجور بڑھائی اور کہا کہ حضرت اسے چبادیں، فرمانے لگے کہ: کیا کروگے؟ میں نے کہا کہ: تحنیک کرنی ہے، آپ نے فرمایا کہ: بچہ کہاں ہیں؟ کیوں کہ تحنیک تو میں کروں گا، بچہ لاؤ، میں کھجور کو باریک چباؤں گا اور اسے اپنے انگوٹھے پر لگا کر بچے کے تالو میں خاص انداز سے چپکاؤں گا، اس سے بچہ گلے کی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے، اور جہروی الصوت ہوتا ہے، یعنی اس کی آواز بلند ہوتی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا، تو بچے کو پیدائش کے بعد کچھ کھانے پینے سے پہلے ہی آپ کی خدمت میں لایا جاتا، اور آپ تحنیک فرماتے تھے، اور پھر آپ نے فرمایا کہ تحنیک کا یہی صحیح طریقہ ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت! بچہ تو ساتھ میں نہیں لایا، آپ کھجور چبادیں، تحنیک نہ سہی، تبرک سہی! آپ نے فرمایا کہ: ہاں! اسے تبرک کہہ سکتے ہو، تحنیک مت کہو، پھر میں نے آپ کو کھجور پیش کی اور آپ نے اسے باریک چبا کر مجھے عنایت فرمائی۔ آہ! اب کون ہمیں یہ باریکیاں بتائے گا؟ کون ہماری غلطیوں کی اصلاح کرے گا۔

آپ نے ۱۹۴۰ء میں صوبۂ گجرات کے ضلع پالن پور میں اس دنیائے آب وگل میں آنکھیں کھولیں،، ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی تکمیل کی اور ۱۹۷۲۔ ۷۳ میں دارالعلوم دیوبند میں مسندِ تدریس پر جلوہ افروز ہوئے اور تادمِ واپسیں حدیث وفقہ کی امہاتِ کتب کا شاہانہ درس دیا۔ آپ نے آیۃ من آیات اللہ، حجۃ اللہ فی الارض شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجرِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے اصلاحی تعلق کی شروعات کی تھی، بعد میں فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خلعتِ خلافت حاصل ہوئی۔

راہِ علم کا یہ بوڑھا مسافر کم وبیش زندگی کی اسّی بہاریں دیکھ کر رحمتِ خداوندی کے جشنِ سالانہ یعنی ماہِ رمضان

میں ہمیشہ ہمیش کے لیے راہئ ملک عدم ہو گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

آ عندلیب مل کر کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکارے میں چلاؤں ہائے دل

سید الشہور کی اتنی مبارک ساعتوں میں آپ کا اس جہانِ فنا سے جہانِ بقا کا سفر!! خدا کی بے پناہ نوازشوں سے مجھے یہ یقین ہے کہ میرے استاذِ عالی شان کا عالمِ بالا میں پُرجوش خیر مقدم کیا گیا ہوگا۔

بہشتِ بریں کو سجایا گیا ہے
درِ خُلد کو جگمگایا گیا ہے
صدائے "سلامٌ علیکم" کہیں ہے
کہیں دعوتِ "فادْخُلوُا خالِدیں" ہے
چلے آیئے آپ کا گھر یہیں ہے
یہی آج آوازِ خُلدِ بریں ہے

زندگی بھی خوب گزری، اور موت بھی پاکیزہ پائی ۔ **عاشَ سعیدًا و ماتَ حمیدًا**

کتنی مبارک و بابرکت تھی وہ شخصیت جس کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہونے والوں کی تعداد ہزاروں سے گذر کر لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، ایک ایسی جامع، مقدس، انوار و برکات کی حامل شخصیت کا ہم سے رخصت ہو جانا اس صدی کا عظیم سانحہ اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے، ایسی جامع ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، اور اُٹھ جاتی ہیں، تو ان کی جگہ پُر ہونا مشکل ہوتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ کی نمازِ جنازہ دو مرتبہ پڑھائی گئی: پہلی نمازِ جنازہ آپ کے گوشۂ جگر مولانا عبدالوحید صاحب زید مجدہ نے احاطۂ ہاسپیٹل میں پڑھائی، اور دوسری نمازِ جنازہ آپ کے فرزندِ ارجمند مولانا عبداللہ صاحب زید لطفہ نے

احاطۂ اوشیورہ مسلم قبرستان جوگیشوری میں پڑھائی۔اور بالآخر پچیس رمضان المبارک عصر ومغرب کے درمیان اس آفتابِ رشد وہدایت کو۔۔۔جس کی روحانی کرنیں اب تک چمک رہی ہیں اور پَون صدی سے کچھ زائد تک چہار دانگ عالم میں چمکیں،اور جب تک دنیا میں اہلِ نظر مجود رہیں گے،چمکتی رہیں گی،۔۔۔قبر کے خاکی ذروں میں چھپا دیا گیا۔اور یوں آپ شہرِ خموشاں میں ہمیشہ ہمیش کے لیے میٹھی نیند سو گئے۔

ذهب الّذين يُعاشي في أكنافهم　　　بقي الّذين حياتهم لاتنفع

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بہت سے درخشاں پہلو ہیں،جن پر ان شاء اللہ اہلِ قلم لکھیں گے اور خوب لکھیں گے،ہم نے چند بے ربط سی باتیں خراجِ عقیدت کے طور پر بروقت تحریر کردی ہیں۔بارِ خدایا! میرے استاذِ عالی شان کی تُربت پر رحمت کے پھول برسا،درجاتِ عالیہ نصیب فرما،مادرِ علمی کو نعم البدل عطا فرما،اور ہم فُرقت زدوں کے مجروح دلوں کو صبر وسکون عطا فرما۔آمین بجاہ النبی الامین

ابرِ رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر میں شانِ کریمی ناز برداری کرے۔

آہ! حضرت الاستاد مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ

بحیثیت مدّرس، مصنّف ومؤلف

محمد احسان ندوی قاسمی

استاذ مدرسہ مدینۃ العلوم، مہاراشٹر

یہ دنیا دارالفناء ہے، یہاں جو بھی آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہی ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، لیکن اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جانے سے صرف ایک قصبہ اور گاؤں ہی نہیں بلکہ پورا عالم ماتم کناں ہوتا ہے، اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ "**موت العالِم موت العالَم**" یعنی ایک عالم کا دنیا سے چلا جانا پورے ایک عالم کی موت ہے، ایسے ہی پاکیزہ نفوس میں سے حضرت الاستاد مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری قُدّس سرّہ بھی تھے، آپ پورے ایک عالم کو سسکتا، بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیش کے لئے ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء کو ممبئی کے ایک ہاسپٹل میں اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے اور وہیں جوگیشوری قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

وہ بڑی خوبیوں کے حامل تھے، راقم الحروف آپؒ کی کن کن صفات کو بیان کرے اور کسے نظر انداز کرے، حقیقت تو یہ ہے کہ آپ پوری ایک انجمن تھے، یوں تو راقم الحروف جب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا اور آپ کے علمِ حدیث وفقہ کی شہرت سنتا تھا، اور آپؒ کی کتاب تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، اور تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی مطالعہ کرتا تھا، تو دوران استفادہ آپ کی تبحر علمی کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا، دل ہی دل میں حسرت ہوتی تھی کہ کاش حضرت سے براہ راست ملاقات یا کسب فیض کا موقع مل جاتا، آپؒ کے متعلق اس ناچیز کی زبان سے خوب دعائیں نکلتی تھیں، لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کے بعد دورہ حدیث (فضیلت)

کے لئے راقم الحروف نے جب دار العلوم دیو بند کا قصد کیا، اور بخاری شریف جلد اول حضرت الاستاد مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھنے کا موقع ملا، تو جو باتیں میں نے حضرتؒ کے متعلق سن رکھی تھی بالکل ویسا ہی پایا بلکہ جتنا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔

شنیدہ کئے بود مانند دیدہ

حدیث پاک سے آپ کے شغف اور شوق کو میں کس انداز سے بیان کروں کہ آپؒ عام طور سے پورا پورا سال روزانہ ڈھائی ڈھائی گھنٹے پڑھاتے، اور اخیر سال میں جب دیگر اساتذہ کے اسباق مکمل ہوجاتے تو آپ سات بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک مکمل پڑھاتے تھے، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ دوران درس پانی وغیرہ کی طرف خیال بھی نہیں جاتا تھا، اور انتہائی ذوق وشوق سے بخاری شریف پڑھاتے رہتے تھے، آپؒ خود حدیث پاک بالکل صاف صاف پڑھتے، اور توضیح وتشریح بھی بالکل صاف کرتے، اور ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک بات صاف کردینا اور پیچیدگیوں کو دور کردینا آپ کے درس کا خاص پہلو تھا، آپؒ پورے سال بخاری شریف ایک ہی انداز سے پڑھاتے تھے، عام طور سے دیگر مدارس کا حال ہے کہ شروع سال میں خوب لمبی، چوڑی بحث کریں گے اور سال کے اخیر میں صرف عبارت خوانی پر اکتفا کریں ایسا آپ کبھی نہیں کرتے تھے، آپؒ کے پڑھانے کا انداز بڑا نرالا اور دلچسپ تھا، جس نے آپؒ سے استفادہ کیا ہے وہی اس درس کی اثر انگیزی کا لطف اٹھا سکتا ہے، جو حدیثیں کچھ مشکل معلوم ہوتیں، آپؒ اسے اس طرح حل فرماتے تھے کہ طلبہ عش عش کرتے رہ جاتے تھے، حدیث فہمی کا جو ملکہ اللہ نے آپؒ کو ودیعت کیا تھا، مجھ کوتاہ نظر نے پورے ہندوستان میں دور دور تک اس میں آپ کا ثانی نہیں دیکھا، آپؒ کا جب وہ انداز یاد آتا ہے تو آپؒ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، وہ فرماتے تھے کہ دیکھو بھائی!

یہ حدیث ہے، اس میں امام اعظم ابو حنیفہؒ یہ کہیں گے، کیوں کہ ان کا اصول یہ ہے، اور امام مالکؒ، امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ یہ کہیں گے کیوں کہ انکے اصول یہ ہیں، مطلب یہ کہ آپؒ کو ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اصول اور ان

کے مسالک اس طرح مستحضر تھے کہ آپ اصول سے ہی ائمہ کے مسالک سمجھ جاتے تھے، اور ائمہ کے مسالک اور دلائل اس طرح بیان کرتے تھے جیسے آپ کے سامنے کوئی کتاب کھلی ہو اور آپ اسی میں سے نقل کر رہے ہوں۔

طالبین حدیث جانتے ہیں کہ بخاری کا ترجمۃ الباب سمجھنا کس قدر مشکل کام ہے، لیکن آپ اسے چٹکیوں میں حل فرماتے تھے، اور یہ بات تو بہت ہی مشکل ہے کہ امام بخاریؒ اس مسئلہ میں کس امام کے ساتھ ہیں؟ آپ اسے بھی انتہائی آسانی کے ساتھ حل فرماتے تھے۔ آپؒ دورانِ درس لایعنی باتوں سے مکمل اجتناب فرماتے تھے، ادھر ادھر کی بات بالکل نہ کرتے تھے۔

ایک طرف تو آپ خود بھی کامیاب مدرّس اور استاد تھے دوسری طرف ممتاز مصنّف اور مؤلّف بھی تھے، درجنوں کتابیں آپؒ کے سیال قلم سے منظر عام پر آئیں اور اہل علم ونظر سے خوب داد وتحسین حاصل کی، کچھ معروف کتابیں یہاں ذکر کی جارہی ہیں۔

رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ پانچ جلدیں مکمل، تفسیر ہدایت القرآن، تحفۃ الالمعی شرح ترمذی آٹھ جلدیں مکل، تحفۃ القاری شرح بخاری شریف بارہ جلدیں مکمل، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، علمی خطبات دو جلدیں، فقہ حنفی اقرب اِلی النصوص ہے، فیض المنعم شرح مقدّمۃ المسلم، ہادیہ شرح کافیہ، وافیہ شرح کافیہ، حیات امام طحاویؒ، زبدۃ الطحاوی، آسان نحو، آسان صرف، محفوظات، دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، آسان فارسی قواعد، مبادی الاصول، مبادی الفلسفہ، معین الاصول، شرح علل الترمذی، ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم، مفتاح العوامل شرح شرح ماۃ عامل، حاشیہ امداد الفتاوی، کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟، داڑھی اور انبیاء کی سنت، وغیرہ، ان کے علاوہ بہت سے مضامین ومقالات اور علمی وفقہی بحثیں ہیں جو ان شاء اللہ قیامت تک طالبین وباحثین کے لئے نئے راستے بناتی رہیں گی اور آپ کے حق میں صدقہ جاریہ اور وسیلہ نجات ثابت ہوں گی۔

آپؒ نے اپنے بعد جو اولادیں چھوڑی ہیں وہ بھی قابل رشک ہیں، آپ کا پورا خاندان علم کا گہوارہ

ہے، ایک، دو بچوں کے علاوہ سب حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ عالم بھی ہیں، اور حیرت کی بات یہ ہے اکثر بہویں بھی حافظہ ہیں، **فالحمدللہ علی ذلک۔**

راقم الحروف اس بات پر جتنا بھی اللہ رب العزت کا شکر ادا کرے کم ہے، کہ اس نے مجھے بھی آپؒ سے بخاری شریف جلد اول پڑھنے کا موقع عطا فرمایا، اور اس سے مجھے جو فائدہ پہونچا بندہ اس کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔

اخیر میں اللہ سے دست بدعا ہوں کہ وہ استاد محترم مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کی بال بال مغفرت فرمائے اور دارالعلوم کو آپؒ کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا!

(استاذِ محترم کی یاد میں)

مولانا نایاب حسن

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور کئی نسلوں کے معلم ومربی، استاذ الاساتذہ حضرت مفتی سعید احمد پالنپوری آج صبح قضائے الٰہی سے وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل مغموم ہے، آنکھیں نم ہیں، ذہن پر رنج وغم کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ میں نے ان کی وفات کی خبر قدرے تاخیر سے دیکھی اور دیکھتے ہی ان سے منسوب زمانۂ طالب علمی کی کتنی ہی یادیں ذہن کے پردے پر جھلملانے لگیں۔ کیا شگفتہ وشاندار انسان تھے اور خدا نے ان کی شخصیت میں کیسی دلکشی رکھ دی تھی! مفتی صاحب ہندوستان؛ بلکہ دنیا کے ایسے چیدہ وخوش نصیب لوگوں میں سے ایک تھے جنھیں کم وبیش نصف صدی تک مسلسل علمِ حدیث کی تدریس کا موقع ملا اور انھوں نے ہزارہا طالبانِ علومِ نبوت کی علمی تشنگی بجھائی۔

وہ دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں ان منتخب ترین اساتذہ میں سے ایک تھے جنھیں تمام طلبہ کے درمیان یکساں مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی اور اس کی وجہ صرف ان کا تدریسی کمال، افہام وتفہیم کا اثر انگیز انداز اور پڑھانے کا ایسا دلنشیں طَور تھا، جو شاذ ہی کہیں دیکھنے کو ملے۔ نو دس سال قبل جب ہم وہاں دورۂ حدیث کے طالب علم تھے، تب اس جماعت میں کم وبیش آٹھ سو طلبہ ہوتے تھے، اسی سال انھیں صحیح بخاری کی تدریس کی ذمے داری ملی تھی، سنن ترمذی وہ پہلے سے پڑھا رہے تھے۔ دوسرے اساتذہ کے گھنٹوں میں عموماً آدھی یا دوتہائی درس گاہ

خالی ہوتی تھی، مگر مفتی صاحب کی کلاس میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہ ہوتی، جو طلبہ کلاس میں ان کی آمد کے بعد پہنچتے وہ عموماً آدھے اندر اور آدھے باہر رہ کر سبق سنتے۔ ان سے استفادے کے لیے دیو بند کی دوسری درسگاہوں کے طلبہ بھی جوق در جوق آتے تھے۔ جب حدیث کی عبارت خوانی ہوتی اور اس کے بعد مفتی صاحب کی تقریر شروع ہوتی تو ایک عجیب ہی سماں ہوتا، دلکش و سحر انگیز و دلنشیں، ہر طالب علم سراپا سماعت بن جاتا، مکمل ذہنی و جسمانی حاضری کے ساتھ سبق سنتا۔ وہ ایسے استاذ تھے کہ ان کے سبق میں شاید ہی کوئی طالب علم ذہنی غیاب کا شکار ہوتا ہوگا، ان کے اسلوبِ کلام اور اندازِ بیان میں ایک مقناطیسیت تھی، جو طالب علموں کو ہمہ تن اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ مفتی صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ پڑھاتے ہوئے اپنا ارتکاز موضوع پر رکھتے اور اس کی تفہیم میں تمام متعلقہ دلائل و براہین کو اس خوب صورتی اور منطقی ترتیب سے بیان کرتے کہ طالب علم عش عش کرنے لگتا۔ کم و بیش تیس پینتیس سال تک انھوں نے فضیلت (دورۂ حدیث شریف) کی اہم کتاب سنن ترمذی کا درس دیا اور ۲۰۰۹ء سے تاحیات صحیح بخاری بھی ان کے زیر درس رہی۔

ان کی ظاہری شخصیت میں بھی مخصوص نوع کی وجاہت تھی، جو ایک محدث کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ سادگی و بے تکلفی ہوتی، مگر اس میں کشش ایسی کہ دل و نگاہ کو اپنا اسیر بنالے۔ اپنے گھر سے دارالعلوم تک کی مسافت عموماً رکشے سے طے کرتے، صدر دروازے سے دارالعلوم میں داخل ہوتے، احاطۂ مولسری میں پہنچ کر دو تین بار کلی کرتے، چوں کہ وہ پان کھانے کے عادی تھے تو تدریسِ حدیث سے قبل اہتمام سے کلی ضرور کرتے، پھر درس گاہ (دارالحدیث) میں داخل ہوتے، مسندِ تدریس پر بیٹھتے، ایک طالب علم بلند و خوش الحان آواز میں حدیث پاک کی عبارت پڑھتا، اس کے بعد اس حدیث پر مفتی صاحب کی گفتگو ہوتی۔ میں یہ سطور لکھتے ہوئے اس لذت کو پھر سے محسوس کر رہا ہوں، جس سے ان کے درس میں ہم لطف اندوز ہوتے تھے۔ مفتی صاحب پڑھاتے نہیں تھے، جادو کرتے تھے، طالب علم اور سامع کے حواس پر چھا جاتے تھے، وہ بولتے نہیں تھے موتی رولتے تھے، ان کی نگہ

دلنواز تھی اور ادا دلفریب، ان کی امیدیں قلیل تھیں اور مقاصد جلیل، وہ اقبال کی تعبیر ''نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو'' کی نہایت ہی تابناک مثال تھے۔

جب ہم دورۂ حدیث شریف میں تھے، تو ششماہی امتحان میں ترمذی و بخاری میں پچاس پچاس نمبرات (تب دارالعلوم میں کل نمبرات پچاس ہوا کرتے تھے) حاصل کرنے والوں کی مفتی صاحب نے خصوصی حوصلہ افزائی کی اور ایسے طلبہ چند ایک ہی تھے۔ اللہ کے فضل سے ان میں سے ایک میں بھی تھا، مفتی صاحب نے ایسے سب طالب علموں کو بعد نماز عصر اپنے گھر بلا کر دعائیں دیں، تحسین آمیز کلمات سے نوازا، ہمت افزائی کی اور انعام کے طور پر سنن ترمذی کی شرح عنایت فرمائی۔ انھیں یہ شکایت رہتی تھی کہ اب طلبہ محنت نہیں کرتے اور اس کا وہ ہمیشہ اپنی کلاسوں میں اظہار کرتے۔ پرانے محدثین وعلما اور خود دارالعلوم کے اساتذۂ متقدمین کے واقعات و حالاتِ زندگی سے چیدہ چیدہ واقعات سناتے اور طلبہ کو مہمیز کرتے۔ وہ طلبہ واساتذہ کے راست تعلق اور رابطے پر زور دیتے تھے؛ تاکہ افادہ واستفادہ کا عمل تیز اور نتیجہ خیز ہو؛ اس لیے ہم نے ہمیشہ ان کی زبان سے سنا کہ ایک ایک جماعت میں کئی کئی سو طلبہ کا ہونا درس وتدریس کے نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، مگر پھر وہ یہ بھی کہتے کہ چوں کہ دارالعلوم کو اس کے معیار کے مطابق اساتذہ نہیں ملتے، اس وجہ سے مجبوری میں ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اب تو دورۂ حدیث میں غالباً پندرہ سو یا اس سے بھی زیادہ طلبہ ہوتے ہیں۔

سال کے آخری دن ہونے والی ان کی پند ونصائح سے معمور تقریر بھی یادگار ہوتی تھی۔ اس دن وہ خود بھی جذبات سے لبریز ہوتے اور طلبہ پر بھی ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی۔ آخری حدیث کا سبق ہوتا، تشریح کی جاتی اور پھر وہ باتیں ہوتیں جو فضیلت کی تکمیل کرنے والے طلبہ کے لیے زندگی بھر کام آنے والی ہوتیں۔ وہ اپنے طلبہ کی تین جماعتوں میں تقسیم کرتے: اعلی، متوسط اور ادنی اور پھر ان میں سے ہر ایک کو عملی زندگی کا ٹاسک بتاتے۔ اسی کے مطابق سرگرمِ کار ہونے کی تلقین کرتے۔ جب طالب علم آخری دن ان کی کلاس سے اٹھتا تو گرچہ اسے اس

بات کا غم ہوتا کہ مفتی صاحب جیسے عظیم استاذ سے جدا ہونا پڑ رہا ہے، مگر ساتھ ہی اسے خوشی بھی ہوتی کہ اس کا دامن علم وفکر کے جواہر ریزوں سے بھرا ہوا ہے۔ مفتی صاحب نہایت ذہین انسان تھے اور ان کا دماغ گویا ایک وسیع و عریض کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم وفنون کی ہزاروں کتابیں ہر وقت موجود و مستحضر رہتیں۔

مفتی صاحب کا کارنامہ صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے کم وبیش نصف صدی تک علم حدیث پڑھایا اور ہندو بیرون ہند کے ہزارہا طلبہ ان سے سیراب ہوئے، ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ عصرِ حاضر کے طلبہ کے ذہنی مستوی کا ادراک کرتے ہوئے درسِ نظامی کی کئی اہم کتابوں کی لسانی تہذیب وتسہیل کا کام کیا اور انھیں نئے لباس میں شائع کیا۔

بانیِ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کی متعدد کتابوں کی تسہیل فرمائی اور انھیں نئی نسل کے لیے سہل الفہم بنایا، درسِ نظامی کی متعدد اہم کتابوں کی آسان اردو زبان میں تشریحیں کیں اور جامع ترمذی کی آٹھ جلدوں میں، جبکہ صحیح بخاری کی بارہ جلدوں میں شرحیں لکھیں اور امام ولی اللہ دہلوی کی معرکۃ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی منفرد وممتاز شرح رحمۃ اللہ الواسعہ لکھ کر علمی دنیا پر احسانِ عظیم کیا۔ ان کے علاوہ بھی مختلف درسی کتابوں کی دسیوں شروح تحریر کیں اور دیگر موضوعات پر بھی اہم کتابیں لکھیں۔

الغرض مفتی صاحب کی پوری زندگی نہایت ہی سرگرم وماجرا پرور رہی۔ ان کی پیدائش ۱۹۴۰ء میں گجرات کے ضلع پالن پور میں ہوئی تھی، ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی تکمیل کی اور ۱۹۷۲۔۷۳ میں دارالعلوم دیوبند میں استاذ مقرر ہوئے اور تاحیات علمِ حدیث وفقہ کی امہاتِ کتب کی تدریس کی خدمت انجام دی۔ لگ بھگ اسی سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اللہ پاک حضرت مفتی صاحب کی کامل مغفرت فرمائے، پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہم جیسے ان کے ہزارہا شاگردوں کی طرف سے انھیں بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

مفتی محمد عبد اللہ قاسمی
استاذ فقہ و ادب دار العلوم حیدر آباد

موت ایک اٹل اور نا قابل انکار حقیقت ہے، اس کائنات رنگ و بو میں ہر اس چیز کے لئے موت مقدر ہے جو اس صفحہ ہستی پر زندگی کا عارضی لباس پہن کر نمودار ہوئی ہے؛ لیکن جیسے زندگی زندگی میں نمایاں فرق ہوتا ہے، ایسے ہی ہر ایک کی موت یکساں نہیں ہوتی، کچھ اموات ایسی واقع ہوتی ہیں جو افراد و اشخاص کی موت نہیں ہوتی؛ بلکہ اس سے ان لاکھوں افراد کی زندگی کا ہرا بھرا باغ ویران ہو جاتا ہے جو ان کے دامانِ عقیدت سے وابستہ ہوتے ہیں، بعض بندگان خدا کی رحلت سے ان بے شمار لوگوں کی امیدوں کا چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے جو ان کے خوانِ نعمت کے ریزہ چیں ہوتے ہیں، پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہائے اشک سے نہیں ہوتا؛ بلکہ قطرہ قطرہ گر کر مستقل دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس کی وفات کی وجہ سے دلوں کی پر سکون آبادیاں آتش کدہ حسرت بن جاتی ہیں، زندگی کے ہنگامے اور ولولے سرد پڑ جاتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بساطِ ہستی کی ہر ہر چیز اداس اور غمگین ہے، اس کے احوال و کوائف کو قلم بند کرنے کے لئے سیاہی بازار کی بوتلوں میں نہیں ملتی؛ بلکہ خونچکاں دلوں میں پائی جاتی ہے، شیخ الحدیث حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کی رحلت کے بعد بھی کچھ یہی دل فگار نقشہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی وفات ایک شخصیت کا خاتمہ نہیں؛ بلکہ ایک زرین عہد اور ایک روشن باب کا خاتمہ ہے، حضرت شیخ الحدیث کے سانحۂ ارتحال سے علمی حلقے میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا بہ ظاہر مشکل نظر آتا ہے۔

مجھے اس موقع پر عربی شاعر کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

فما کان قیس هلکه هلک واحد و لکنه بنیان قوم تهدما

(ترجمہ) قیس کی موت فرد واحد کی موت نہیں ہے، لیکن وہ قوم کی بنیاد تھا جو متزلزل ہوگیا۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ کو کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) میں پیدا ہوئے، آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقائی مکتب میں حاصل کی، پھر آپ نے پالن پور کے ایک مدرسہ کا رخ کیا، اور وہاں آپ نے چار سال تک حضرت مولانا مفتی اکبر میاں صاحب پالن پوری اور حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاری سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں، اپنے تعلیمی سلسلہ کو مزید بڑھانے کے لئے آپ نے سہارن پور یوپی کا سفر کیا، اور وہاں کی بافیض دینی درس گاہ مظاہر العلوم میں داخلہ لیا، اور تین سال تک آپ نے جید اساتذہ کرام سے علمی فیض حاصل کیا، مظاہر العلوم کے اساتذہ کرام میں امام النحو والمنطق حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جموی قدس سرہ، حضرت مولانا یامین صاحب سہارن پوری، حضرت مولانا مفتی یحییٰ صاحب سہارن پوری، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری اور حضرت مولانا وقار صاحب بجنوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پھر آپ نے برصغیر کی شہرہ آفاق یونیورسیٹی دارالعلوم دیوبند............جس کی وجہ سے علم وادب کے گلشن میں بہار آئی، اور اس کے برگ وبار کو ذوق نمو ملا، اور جس کی وجہ سے بحمد اللہ آج دنیا کا چپہ چپہ متمتع اور فیض یاب ہورہا ہے............کا قصد کیا، اور وہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا نصیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ، مولانا فخر الدین صاحبؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ جیسے جبال العلم اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذتہہ کیا، اوران قدآور اساتذہ کرام سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں، مادر علمی کی علمی اور روحانی فضا نے آپ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو پروان چڑھایا، جستجوئے علم وادب

کی چنگاری کو شعلہ زن کیا، اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لئے جو خام مواد اپنے گھر سے لائے تھے آپ کے اساتذہ نے اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنی عطا کیا، چنانچہ کچھ ہی سالوں کے بعد چشم فلک نے دیکھا کہ وہ آسمان دین و دانش کے ماہ و پروین بن کر جلوہ گر ہوئے، جس کی تابانی اور ضوفشانی سے نہ صرف راہ علم کے مسافر مستفید ہوئے؛ بلکہ وہ کاروان علم کے رہنما اور رہبر بھی بن گئے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے ایماء پر ۱۳۸۳ھ میں آپؒ دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) تشریف لے گئے، اور وہاں ۱۳۹۳ھ نو سال تک پوری محنت و جانفشانی کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دینے لگے، اس نو سالہ عرصہ میں علیا کی کتابیں: ابوداؤد، ترمذی، طحاوی، شمائل، موطین، نسائی، ابن ماجہ، مشکاۃ، جلالین، الفوز الکبیر، ہدایہ آخرین، شرح عقائد اور حسامی وغیرہ آپ کے زیر تدریس رہیں، پھر ۱۳۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں آپ کی تقرری عمل میں آئی، اور آپ وہاں تادم وفات تدریسی فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، ۲۰۰۹ء مطابق ۱۴۳۱ھ میں حضرت مولانا شیخ نصیر احمد خان صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد آپ کو صدر مدرس بنایا گیا، اور بخاری شریف جلد اول آپ کے سپرد کی گئی، بخاری شریف جلد اول کے علاوہ متعدد اصولی و فنی کتابیں پڑھانے کا آپ کو شرف حاصل ہوا، ایشیاء کی عظیم دینی درس گاہ سے آپ تقریباً پانچ دہائیوں تک وابستہ رہے، اور تشنہ گان علوم نبوت کے لئے تشنگی کا سامان فراہم کرتے رہے۔

حضرت شیخ الحدیث کا درس طلبہ میں بے حد مقبول تھا، قسام ازل نے آپ کو افہام و تفہیم کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا، آپ پیچیدہ سے پیچیدہ مباحث کو بہت ہی آسان اور سہل انداز میں طلبہ کے ذہن نشیں کر دیتے تھے، آپ کی درسی تقاریر اپنے تمام پہلوؤں کو جامع اور حاوی ہونے کے ساتھ مرتب اور منضبط ہوتی تھیں، قدرت نے آپ کو دریا کو کوزہ میں بند کرنے اور اور قطرے کو سمندر کی شکل میں پھیلانے کا غیر معمولی ہنر عطا کیا تھا، اور جہاں جیسا موقع اور محل ہوتا آپ اپنی عبقریت کے حسن کو کانوں کے راستے دلوں میں اتار دیتے

تھے،آپ کے درس حدیث میں محض دو چار کتابوں کا مطالعہ نہیں جھلکتا؛ بلکہ آپ کا درس فن حدیث کے ایک قابل قدر کتابوں کے مطالعے کی غمازی کرتا،آپ کے درس میں تحقیقی شان، محدثانہ طرز اور متکلمانہ اسلوب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کروٹیں لیتا،اور طلبہ کو حدیث کے جام وساغر سے مخمور کیے رہتا،حضرت شیخ الحدیث کا درس عام اساتذہ کی طرح خشک اور بے کیف نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ دل چسپ اور دلوں کو موہ لینے والا ہوتا تھا،اعلی ،متوسط اور ادنی ہر طرح کے طلبہ کے لئے اس میں نشاط ودل چسپی کا سامان ہوتا،اوران کے لئے غور وفکر کی نئی شاہراہیں کھولتا،آپ کے درس کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے طلبہ کے آپ کے درس میں پورے ذوق وشوق سے شریک ہوتے ،اورحسب استعداد اپنے دامان علم کو علم وحکمت کے گراں قدر موتیوں سے بھرتے ،ہم جب دورہ حدیث میں زیر تعلیم تھے اس وقت طلبہ کی تعداد ہماری جماعت میں آٹھ سو سے کچھ متجاوز ہوا کرتی تھی ،اوردارالحدیث تحتانی اپنی کشادگی کے باوجود تنگ پڑ جاتی تھی ،ہمیں یاد پڑتا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کا درس شروع ہونے سے پہلے ہی دارالحدیث کھچا کھچ بھرجاتی ،اور جو طالب علم دیر سے آتا وہ اس طرح درس میں شریک ہوتا کہ آدھا اندر اور آدھا باہر ہوتا تھا،حضرت کی درس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اپنی بات کو کچھ اس خاص انداز سے پیش کرتے کہ طلبہ پوری یکسوئی ودل جمعی کے ساتھ سبق سننے پر مجبور ہوتے ،اورگھنٹوں اس طرح ہمہ تن گوش رہتے گویا ان کے سروں پر پرندہ ہے،کائنات کی بہترین ہستی کے زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے موتیوں سے آپ کو اس قدر شیفتگی اور محبت تھی کہ عمر کے اخیر مرحلے میں بھی جب کہ صبح پیری کے آثار نہ صرف نمایاں ہوئے تھے ؛ بلکہ پیری کا ہلال ماہ کامل بن چکا تھا،اورضعف ولاغری کا سایہ آپ کے جسم پر مکمل طور پر چھا گیا تھا آپ دوڈھائی گھنٹے بے تکان تسلسل کے ساتھ ایک ہی ہئیت پر بیٹھ کر درس دیتے ،اورآپ کے چہرے پر تھکان اور اضمحلال کے آثار ظاہر نہیں ہوتے تھے،درس کے دوران آپ کا ظاہری وقار اور علمی رعب ودبدبہ دیدنی ہوتا،آپ کی زبان نہایت صاف ستھری اور شائستہ تھی،آپ کی زبان میں وہ بہاؤ تھا جو ایک

دریا میں ہوتا ہے، آپ کے انداز تدریس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے ایک ندی ہے جو خراماں خراماں، گاتی ہوئی گنگناتی ہوئی، عراق دل نشیں ساز کو چھیڑتی ہوئی چل رہی ہے، اور کشت زاروں کو سیراب کر رہی ہے، ان سب کے ساتھ آپ بڑے باہمت اور اوقات کے پابند تھے، اخیر عمر تک بھی آپ بخاری شریف کا طویل نصاب مقررہ وقت میں مکمل کرتے تھے، درس کی پابندی کا یہ حال تھا کہ تعلیمی سال کے دوران آپ بالکل اسفار نہیں کرتے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے تدریس کے لئے خود کو پابہ زنجیر کرلیا ہے، اور اپنے سفینہ علم کو لنگر انداز کرلیا ہے، یہ کہنا شاید مبالغہ نہیں ہوگا کہ آپ نے درس نظامی کی کتابوں کی تدریس کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ فراہم کیا ہے، جو نسل نو کے لئے مفید بھی ہے۔ اور اثر انگیز بھی، حضرت شیخ الحدیث نے تدریسی میدان میں اپنا ایسا نقش جمیل چھوڑا ہے جو ان شاء اللہ صدیوں تک ارباب مدارس کے لئے سرمۂ چشم اور رفیق خضر ثابت ہوگا۔

آپؒ ایک جلیل القدر محدث ، بلند پایہ فقیہ اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی پیشانی کا جھومر تھے، اور علمی کمالات اور گوناگوں امتیازات وخصوصیات کی وجہ سے شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ اپنی مثال آپ تھے، چنانچہ جس طرح سورج کی روشنی پھیل کر تیز ہوجاتی ہے، اور شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بن جاتی ہے، اسی طرح مولانا کے مختلف علوم وفنون پر دسترس اور ان کے علمی کمالات کا آوازہ دارالعلوم دیوبند کی چہاردیواری تک ہی محدود نہیں رہا؛ بلکہ دارالعلوم دیوبند کی چہاردیواری سے نکل کر صرف ہندوستان ہی نہیں ؛ بلکہ پورے برصغیر کے چپہ چپہ میں آپ کی تگ وتاز پہونچی ، اور برصغیر کے گوشہ گوشہ میں آپ نے دعوتی اسفار فرمائے، اور اپنے پرمغز اور اثر آفریں خطابات سے خلق خدا کو مستفید اور فیض یاب کیا، ان کے دلوں میں طاعت وفرماں برداری کی شمع فروزاں کی، گم گشتہ راہ لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے سنجیدہ کوششیں کیں۔ آپ علم وفن کے شوقین، مطالعہ وکتب بینی کے والہ وشیدا اور قلم وقرطاس کے حریص تھے، آپ نے جہاں تدریسی ذمہ داریاں بحسن وخوبی نبھائیں

وہیں تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی آپ نے انمٹ اور یادگار نقوش چھوڑے ہیں، چنانچہ آپ کے قلم گل ریز سے تین درجن سے زائد کتابیں منصۂ شہود پر آئیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے مشرق ومغرب میں پھیل گئیں، آپ کی تصانیف کو عوام وخواص نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور ذوق وشوق سے انہیں پڑھنے کا اہتمام کیا، درس کی طرح آپ کی تمام تصانیف بھی آسان اور عام فہم ہونے کے ساتھ جامعیت اور حسن ترتیب کا بہترین نمونہ ہیں، علمی جواہر پارے اور تحقیقی نکات سے لبریز اور سینکڑوں کتابوں کے مطالعے کا نچوڑ ہیں، ان وبیان سادہ اور سلیس ہے، علم، خدائے بزرگ وبرتر نے آپ کی بعض تصانیف کو وہ دوام اور مقبولیت عطا کی ہے جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے، چنانچہ آپ کی متعدد کتابیں آج مدارس عربیہ میں داخل درس ہیں، اور اساتذہ وطلبہ کے لئے یکساں مفید اور نفع بخش ثابت ہورہی ہیں، بلکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج مدارس عربیہ میں داخل ہونے والے طلبہ کی اندر بنیادی استعداد پیدا کرنے میں حضرت شیخ الحدیث کی کتابیں مرکزی اور کلیدی کردار ادا کررہی ہیں، اور ان کی زنگ آلود صلاحیتوں کو صیقل کررہی ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کی تصانیف میں حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعۃ، تفسیر ہدایت القرآن، الفوز الکبیر عربی، العون الکبیر، مبادئ الفلسفۃ، آپ فتوی کیسے دیں؟ کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ حیات امام ابوداؤد، حیات امام طحاوی، اسلام تغیر پذیر دنیا میں، ڈاڑھی اور انبیاء کرام کی سنتیں، حرمت مصاہرت، تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی، تحفۃ القاری شرح صحیح بخاری، دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، مسلم پرسنل لا اور نفقہ مطلقہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کو ظاہری علوم میں جیسے کمال اور درک حاصل تھا، اور اپنے ہم عصروں پر فوقیت اور برتری رکھتے تھے، اسی طرح خدائے بخشندہ نے آپ کو علوم باطنیہ کی دولت سے بھی مالامال کیا تھا، لیکن اس کے اخفاء کا اتنا اہتمام تھا کہ عام لوگ حضرت شیخ الحدیث کو محض ظاہری علوم شریعت کا امین سمجھتے ہیں، اور کوچۂ عشق ومعرفت سے انہیں ناآشنا اور نابلد خیال کرتے ہیں، جب کہ

حقیقت یہ ہے کہ زمانہ طالب علمی ہی میں آپ نے راہِ طریقت کا سفر شروع کر دیا تھا، اور اس پر خار منزل کو قطع کرنے کے لئے ایک مردِ کامل شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کا دامن تھام لیا تھا، اور با قاعدہ حضرت مرحوم نے ان سے بیعت فرمایا تھا، مدرسہ مظاہر العلوم کے اندر حضرت کے زمانہ طالب علمی میں مولانا عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی اصلاحی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں، حضرت شیخ الحدیث پابندی سے ان بافیض مجالس میں شرکت کرتے، اور قیمتی نصائح سے متمتع اور فیض یاب ہوتے، بالآخر آپ نے مفتی مظفر حسین صاحب سے باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم فرمایا، کچھ دنوں کے بعد حضرت نے ان خرقۂ خلافت عطا کیا، اور بیعت وارشاد کی تلقین فرمائی۔ بچوں کی تربیت اور ان کے اخلاق ورجحانات کی تشکیل وتعمیر کے لیے حضرت شیخ خاص طور بہت ہی فکر مند رہا کرتے تھے، ہر کوئی جانتا ہے کہ تربیت کا میدان ایک صبر آزما اور دشوار گزار گھاٹی ہے اس وادی کو بحسن وخوبی قطع کرنے کے لیے ایک طرف بچوں کی نفسیات اور ان کے طبع بوقلموں سے مکمل واقفیت ضروری ہے تو دوسری طرف معلم ومربی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی شخصیت متضاد عناصر کی سنگم ہو، اس کی ذات میں نرمی بھی ہو گرمی بھی، جلال بھی جمال بھی، شیشہ بھی آہن بھی، کوہِ فراز بھی ماں کے دل کا گداز بھی، شعلہ بھی اور شبنم بھی۔

حضرت شیخ الحدیث کی شخصیت میں فیاض عالم نے یہ دو متضاد صفات جس خوبی اور اعتدال سے جمع کر دیا تھا وہ اپنی نظیر آپ ہے؛ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث نے اپنے صاحبزادوں اور اپنے پوتوں کی عمدہ طور پر تربیت فرمائی، اور ان کو اخلاق وکردار کے لحاظ سے نمایاں بنایا، اور براہ راست ان کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ تقوی وللّٰہیت کی جیتی جاگتی تصویر تھے، تضرع اور انابت الی اللہ حضرت کی زندگی کا خاص وصف تھا، سنت نبوی کی اتباع وپیروی کا آپ خاص اہتمام فرماتے تھے، آپ انتہائی متواضع اور منکسر المزاج تھے، چھوٹوں کے ساتھ شفقت ورحمت سے پیش آتے، اور ان کی غلطیوں کو درگزر کرتے، حلم وبردباری اور تحمل مزاجی آپؒ کا خصوصی وصف تھا، کوئی بات خلاف طبیعت پیش آتی تو خاموشی اختیار فرماتے، اور بے جا غصہ سے گریز کرتے، اسی کے ساتھ آپؒ نہایت متین اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے، متانت وشائستگی اور وقار وسنجیدگی آپؒ کے قول وعمل سے جھلکتی تھی، آپؒ ہر کام نہایت اطمینان

اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، عجلت اور جلد بازی سے گریز کرتے تھے، آپ استغناء اور بے نیازی میں اپنے اسلاف واکابر کی ایک زندہ تصویر تھے، آپ اسباب تجمل سے مستغنی اور بلند معیار زندگی سے دور اور نفور تھے، آپ نے پوری زندگی ایک گوشہ نشیں اور خلوت گزیں عابد کی طرح گزار دی، نہ خدمات کی ستائش کی تمنا کی، نہ زخارف دنیوی سے اپنے دامن کو ملوث کیا، آپؒ کی پوری زندگی ریاضت ومجاہدے اور مسلسل جد وجہد سے عبارت تھی، کم ہمتی اور سستی وکاہلی کو کبھی آپؒ نے راہ نہ دی، کبھی کسی عہدہ اور منصب کی نہ طلب رہی اور نہ داد وتحسین کی پرواہ؛ بلکہ زندگی بھر بے لوث اور مخلصانہ خدمات انجام دیتے رہے۔

آج جب کہ قحط الرجال کا دور ہے، اساطین علم وفن ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں، علماء اور صلحاء یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں، ایسے نازک وقت میں حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا سانحہ ارتحال ملت کے لئے ایک عظیم خسارہ ہے، آپ جیسی عبقری اور نابغہ روزگار شخصیات بڑی مدتوں میں جا کر پیدا ہوتی ہے، اور جب پیدا ہوتی ہے تو اس کے افکار وکردار کی خوشبو سے پورا چمنستان عالم مہک اٹھتا ہے، اور اس کی خوشبو صدیوں تک باقی رہتی ہے، شیخ الحدیث مرحوم ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئے ہیں؛ لیکن ان کی روحانی اولاد ہزاروں کی تعداد میں ہمارے درمیان موجود ہیں جن کی دینی وعلمی خدمات سے لاکھوں بندگان خدا مستفید ہو رہے ہیں، اور یہ مبارک سلسلہ ان شاء اللہ قیامت تک چلتا رہے گا، یہ ٹھیک ہے کہ موت کے بے رحم پنجہ نے حضرت مرحوم کو موت کی ابدی نیند سلا دیا؛ لیکن حضرت شیخ الحدیث مرحوم کے مخلصانہ خدمات وکارنامے اور ان کی صفات وخوبیوں کا گلشن ہمیشہ سرسبز وشاداب اور سدا بہار رہے گا، اور اس کی خوشبو اور مہک صدیوں تک قلب ودماغ کو معطر کرتی رہے گی، اور رفتار زمانہ اور گردش لیل ونہار کی وجہ سے اس گلستاں پر خزاں کا سایہ نہیں پڑے گا۔

اللہ تبارک وتعالی سے دعاء ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کو غریقِ رحمت فرمائے، اعلی علیین میں ان کو ٹھکانہ نصیب فرمائے، اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

❁ ... ❁ ... ❁

مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ:
ایک نادرۂ روزگار فقیہ ومحدث کی رحلت

مولانا محمد عارف جیسلمیری
مقیم لدھیانہ پنجاب

کل رات مولانا قاسم صاحب پالن پوری منیجر مکتبہ حجاز دیو بند نے واٹس ایپ کے ذریعے اپنے والد ماجد اور ایک نسل کے کام یاب ومثالی استاذ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی شدتِ علالت کی خبر دی تھی، احقر ان دنوں مالیر کوٹلہ پنجاب کے الفلاح پبلک اسکول میں کورنٹائن کی میعاد پوری کررہا ہے اور کتابیں ہم راہ نہ ہونے کی بنا پر واٹس ایپ کی برقی تحریریں ہی زیادہ تر زیرِ مطالعہ رہتی ہیں، مفتی صاحبؒ کی علالت کی اس خبر سے دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی اور مختصر مختصر وقفے سے محض اسی نیت سے واٹس ایپ کھولا کہ مفتی صاحبؒ کی صحت کی بابت شاید کوئی تسلی بخش وامید افزا خبر موصول ہو؛ مگر ہر دفعہ مایوس کن خبریں ہی موصول ہو کر دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر کرتی رہیں، خلافِ معمول دورانِ تراویح بھی ایک دو ترویحوں میں اسی نیت سے واٹس ایپ دیکھا، غرض رات کے تقریباً بارہ ایک بجے تک واٹس ایپ سے چمٹے رہنے کے بعد، اللہ کا نام لے کر بستر کا رخ کیا، آخرش صبح سات بجے کے قریب جو موبائل کھولا، تو ہر طرف سے یہ کرب ناک خبریں آرہی تھیں کہ آج بہ روز منگل بہ وقتِ اشراق استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند بمبئی کے ہسپتال میں انتقال فرماگئے، اس خبر سے ان کے ہزارہا معتقدین و متعلقین اور شاگردان و مریدین کی طرح اس عاجز کو بھی بے حد صدمہ ہوا اور حسبِ توفیق ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا۔

اس دورِ قحط الرجال میں مفتی صاحبؒ کا وجود واقعی ایک عظیم خدائی نعمت تھا، علم و عمل کے مقامِ بلند پر فائز ہونے کے باوصف تواضع وللّٰہیت اور شفقت و ہم دردی ان کی اصل شناخت و پہچان تھی، اس راقم کو دارالعلوم دیوبند کے تین سالہ زمانۂ طالب علمی میں بارہا ان کی قیام گاہ پر حاضری کا شرف حاصل ہوا، میں نے کچھ عرصہ دیوبند کی شاہ مارو مسجد میں امامت کی تھی، مفتی صاحبؒ کا مکان یہاں سے قریب ہی واقع ہے اور اس زمانے میں وہ جمعہ کی نماز کے لیے اسی مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے، ایک دفعہ نمازِ جمعہ کے بعد انھوں نے مجھے طلب فرمایا اور جمعہ کے دوسرے خطبے کے بعض جملوں کو آئندہ نہ پڑھنے کی نصیحت فرمائی، اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا؛ بل کہ جس کتاب کے حوالے سے یہ خطبہ پیش کیا گیا تھا، باضابطہ اس کتاب کو منگوایا اور اپنے دستِ مبارک سے ان تمام جملوں پر قلم کھینچتے ہوے فرمایا کہ مؤلفِ کتاب نے یہ چند جملیں قال رسول اللہ کے بعد ایسے لکھ دیے ہیں، جن کا اصل حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہاں باقی جملے واقعی کتبِ حدیث میں منقول ہیں، اس لیے انھیں پڑھا جائے اور قلم زد جملوں کو پڑھنے سے اہتمام کے ساتھ بچا جائے؛ تاکہ غیر حدیث کا حدیث کے ساتھ التباس نہ ہو، مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ گرمی کا زمانہ تھا اور انھوں نے صحنِ مسجد کے کنارے دھوپ ہی میں کھڑے کھڑے یہ اصلاحات و گفتگو فرمائی اور پھر پانچ دس منٹ کے بعد اپنے قدیم معمول کے مطابق وہاں موجود سائل حضرات کی مدد فرماتے ہوئے اپنے مکان کی جانب بڑھ گئے تھے۔

ان کی خدمت میں حاضری سے علمی و روحانی بہر دو اعتبار سے بڑا فائدہ ہوتا تھا، بعد العصر منعقد ہونے والی ان کی اس مجلس میں طلبہ اور علماء بہ کثرت حاضر ہوتے تھے اور ہر شریکِ مجلس حسبِ توفیق دامنِ مراد بھر واپس ہوتا تھا۔ علمی، سماجی، معاشرتی، دعوتی و تبلیغی اور ملکی و بین الاقوامی ہر طرح کے سوالات ان کے سامنے پیش ہوتے اور حضرتؒ ان کے جواب میں بڑی گراں قدر اور چشم کشا باتیں اور نصیحتیں ارشاد فرماتے۔

تدریسی و تصنیفی اور دینی و دعوتی خدمات کے علاوہ ان کی حیات کا ایک حد درجہ نمایاں پہلو امر بالمعروف ونھی

عن المنکر تھا، وہ جس چیز کو دلائل کی رو سے غلط سمجھتے، اس کی کھل کر تردید فرماتے تھے اور اس کے لیے بڑے سے بڑے مجاھدات سے بھی گریز نہیں فرماتے تھے، ان کا یہ اصول اپنوں و بیگانوں اور شناسا و غیر شناسا سب حضرات کے ساتھ یکساں طور پر نافذ تھا، مسلکِ دیوبند کے منتسبین میں در آنے والی کمیوں پر پوری صفائی سے بولنا اور مسلک و مشرب کی صیانت و حفاظت کے طریقے سجھانا ان کا ایک لائقِ تقلید کارنامہ ہے، اس سلسلے کے واقعات ان کی مطبوعہ تقریروں و تحریروں میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں، چند سال قبل ایک لائقِ صد احترام عالمِ دین نے قرآنی آیت **ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم** الخ کی تشریح کرتے ہوئے بڑے ہی مدلل و مبرھن علمی انداز میں سیاست اور اسلام کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی تھی اور ملک بھر سے تشریف لائے ہوئے جید علماء نے اس خطاب کو دل کے کانوں سے سنا تھا، آخر میں صدارتی خطاب کے لیے حضرت شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحبؒ کو دعوتِ اسٹیج دی گئی، آپؒ نے ان مرحوم بزرگ کے خطاب کو بلند الفاظ میں سراھنے کے ساتھ ساتھ، ان سے ہونے ہولی ایک فروگذاشت سے سامعین کو آگاہ کیا، یہ عمل خاصا مشکل طلب اور صبر آزما ہے؛ لیکن امرِ واقعہ یہی ہے کہ یہ مزاج و مذاق ہمارے اسلامی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ عام ہونا چاہیے اور اس مزاج و مذاق کے حامل افراد کی دل سے قدر کرنی چاہیے، برسرِ منبر حضرت عمر جیسے جلیل القدر صحابی کے اپنی معروضات پر نقد کی اجازت دینے کے واقعات میں بھی ہمارے لیے اسی جانب دعوتِ عمل ہے۔

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد احقر نے ایک سال کے لیے تحفظِ ختمِ نبوت کے شعبے میں داخلہ لیا تھا، حضرت مفتی صاحبؒ چوں کہ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کے ناظمِ عمومی تھے؛ اس لیے برسہا برس سے یہ نظام چلا آرہا تھا کہ اس شعبے میں داخلے کے خواہش مند طلبہ کو تقریری و تحریری امتحان کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ کے گھر لے جایا جاتا اور پھر حضرتؒ تحریر کے ملاحظے اور تقریر سننے کے بعد متعلقہ طلبہ کے داخلے کو منظوری عنایت فرماتے تھے، جب میں نے اس شعبے میں داخلے کی درخواست داخل کی، تو مجھے بھی اس مرحلے سے گزارا

گیا، اللہ عمر دراز فرمائے امیر الھند حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علمائے ھند کی، وہ ہم چند طلبہ کو بعد العصر حضرت مفتی صاحبؒ کے گھر لے گئے اور پھر حضرتؒ کی تائید وتصدیق کے بعد ہمارے داخلے کو منظوری دی گئی، اس حقیر کے لیے یہ ایک سعادت کا موقع تھا کہ اس کی شکستہ تحریر کو حضرت مفتی صاحبؒ نے ملاحظہ فرمایا اور اس کی بے ربط وضبط لسانی معروضات کو بھی سماعت فرمایا، اس یادگار مجلس میں دونوں بزرگوں کے بیچ شعبے کی سالانہ کارکردگی پر دیر تک تبادلۂ خیال ہوا تھا اور شعبے کو مزید فعال و مستحکم بنانے پر بھی غور وخوض ہوا تھا۔

کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کے پلیٹ فارم سے انجام دی گئیں ان کی خدمات کا ذکر ایک مستقل مقالے کا متقاضی ہے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی طرح ہمارے حضرت مفتی صاحبؒ بھی فتنۂ قادیانیت کی تلبیسات ودسیسہ کاریوں سے مکمل طور واقف وآگاہ رہے اور زمانۂ صحت میں انھوں تحفظ ختم نبوت وردقادیانیت کی نسبت پر ملک کے دور دراز کے متفرق علاقوں کے اسفار بھی فرمائے، انھوں نے یہ اہم کام مکمل احساسِ ذمے داری کے ساتھ انجام دیا اور مجلس شوری کی پیش کش کے باوجود اس اضافی خدمت کے عوض ایک پیسہ بھی دارالعلوم سے وصول نہیں فرمایا؛ جب کہ آپؒ کثیر العیال شخص تھے اور خود اپنے بیان واعتراف کے مطابق ان کی اقتصادی پوزیشن اس زمانے میں اس درجہ کم زور تھی کہ دارالعلوم سے ملنے والی تنخواہ اخراجات کے تناسب سے کم پڑ جاتی تھی اور تقریباً ہر مہینے کے آخر میں انھیں ضروری اخراجات کی تکمیل کے لیے قرض لینا پڑتا تھا، جب بہ تدریج وہ آزمائشی دور رخصت ہوا اور مکتبہ حجاز دیوبند کے قیام کے بعد مالی حالات لائقِ رشک بنے تو آپؒ نے جامعہ اشرفیہ راندیر سورت اور دارالعلوم دیوبند سے لی ہوئی وہ تمام تر تنخواہیں بھی متعلقہ اداروں کو واپس کردیں۔

فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی تحریک پر ۱۹۷۶ عیسوی میں دارالعلوم دیوبند میں تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تھا، مفتی صاحبؒ اس کانفرنس کے خصوصی مقررین

میں سرِفہرست تھے اور کانفرنس کی نتیجہ خیزی و کام یابی میں اس دور کے دیگر اکابر کے علاوہ آپؒ کے دوررس مشوروں اوران کی مثبت تجاویز کا اساسی حصہ رہا تھا،اس کانفرنس کے موقع پر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے دارالعلوم دیوبند میں ایک مستقل شعبے کا قیام عمل میں آیا اور بہ اتفاق آرا حضرت مفتی سعید صاحب اس کے ناظمِ عمومی منتخب ہوے اور دنیا بھر میں اس انتخاب کو سراہا گیا، یہ شعبہ اپنے ناظمِ عمومی حضرت مفتی سعید صاحبؒ اور ناظمِ اعلی حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری مدظلہم کی زیرِ نگرانی،شروع دن سے اپنے اہداف و مقاصد کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہے،مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند سمیت ملک و بیرونِ ملک تحفظ ختم نبوت کے محاذ پر زریں خدمات انجام دینے والے مبلغین ومقررین کی ایک بہت بڑی تعداد ہے،جس نے اس شعبے سے تربیت حاصل کی ، ناظمِ عمومی و ناظم اعلی اور دیگر منتظمینِ دارالعلوم کے مشورے سے اس شعبے کے تحت ملک بھر میں بے شمار تربیتی کیمپ منعقد کیے جا چکے ہیں،جن میں حضرت مفتی سعید صاحبؒ اور فاتحِ قادیانیت مولانا محمد اسماعیل صاحب کٹکیؒ جیسے جلیل القدر اکابر علماء پورے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں اور یقیناً یہ ان کی جہدِ مسلسل اوران کے خلوص وللّٰہیت کا نتیجہ ہے کہ آج ملک کے ہر صوبے میں ایسے افراد واشخاص موجود ہیں،جنھوں نے تحفظ ختمِ نبوت وردقادیانیت کواپنی زندگی کا اصل مشن بنایا ہوا ہے اور جن کی خدمات کے اثر سے قادیانیت کا غلیظ چہرہ قریب قریب ہر جگہ بے نقاب ہو چکا ہے۔

مفتی صاحبؒ نے اس میدان میں لسانی وقلمی دونوں اعتبار سے بھرپور حصّہ لیا،۱۴۰۹ ہجری میں دارالعلوم دیوبند کی جانب سے تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر دس روزہ تربیتی کیمپ منعقد کیا گیا تھا،جس میں زیادہ تر بیانات مولانا اسماعیل صاحب کٹکیؒ کے ہوے تھے،آخری روز کی آخری نشست میں مفتی سعید صاحبؒ کا خطاب ہوا تھا،جس میں قادیانیت کا تعارف اوراس کے تعاقب کا طریقہ شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بیان کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے اسی وقت ٹیپ ریکارڈ سے نقل کر کے،کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت نے شائع کر دیا تھا اور ’’مسئلۂ ختم

نبوت اور قادیانی وسوسے'' کے نام سے اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، جو اس کی عنداللہ و عندالناس مقبولیت کی دلیل ہیں۔ ۱۴۱۰ ہجری میں دارالعلوم میں منعقدہ دوسرے تربیتی کیمپ میں بھی مفتی صاحبؒ بہ نفسِ نفیس شریک رہے تھے اور حاضرین کو آپؒ کے بیانات سے بڑا نفع ہوا تھا، اس دوسرے کیمپ میں اصل مربی کی حیثیت سے پاکستان سے حضرت مولانا منظور احمد صاحب چنیوٹیؒ تشریف لائے اور انھوں نے اس موضوع پر کئی قیمتی محاضرات پیش فرمائے تھے، اس کیمپ کے اختتام پر حضرت چنیوٹیؒ کے افادات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی بات سامنے آئی، تو یہ اہم کام بھی حضرت چنیوٹیؒ اور حضرت مفتی سعید صاحبؒ کی رہنمائی میں مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم نائب مفتی و استاذِ حدیث مدرسہ شاہی مرادآباد نے انجام دیا، کتاب کے شروع میں مفتی صاحبؒ کا معلوماتی پیش لفظ شامل ہے، کتاب کا نام ''ردمرزائیت کے زریں اصول'' بھی مفتی صاحبؒ ہی کا تجویز فرمودہ ہے، کتاب میں چند مقامات پر ترمیم بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے قلم سے کی گئی ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک لاجواب کتاب ہے اور دنیا بھر میں ہر مبلغِ تحفظ ختم نبوت کے لیے خاصے کی چیز بنی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر پمفلٹ بھی مفتی صاحبؒ کے قلم سے نکلے اور عوام و خواص میں وقعت و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے، اس سب کے علاوہ علمی خطبات اور آپ کی دیگر تصانیف میں بھی اس عنوان پر بڑا قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ اللہ کی شان کہ اپنے آخری خطاب میں بھی وہ امت مسلمہ کو ایمان بالغیب وعقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت کے ساتھ ساتھ فتنۂ قادیانیت کے دجل وفریب سے آگاہی دے کر اس فانی دنیا سے رخصت ہوے۔

قادیانیت کے علاوہ دنیا بھر میں جتنے ایسے فرقے و فتنے ہیں، جو شریعتِ محمدیہ سے کسی بھی اعتبار سے مزاحم ومتصادم ہیں، ان سب پر حضرتؒ کی بڑی گہری نظر تھی اور وہ وقتاً فوقتاً ان کا رد بھی فرماتے تھے۔

مفتی صاحبؒ کا شہرۂ آفاق ملکۂ تدریس، ان کی بے پناہ تفہیمی صلاحیت اور حدیث وفقہ پر ان کی کامل و مکمل دسترس علمی و دینی دنیا میں معروف و مسلم ہے اور زیادہ تر آپ کے تعارف میں ان چیزوں کا ذکر کیا جاتا

ہے؛لیکن حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات و شخصیت اس تعارف سے کہیں بلند تھی،مہمان نوازی،صلہ رحمی،دورقریب کے رشتے داروں کا مکمل خیال اور بہ وقتِ ضرورت ان کی مالی معاونت،اولادواحفاد اور برادران و متعلقین کی تعلیم و تربیت کی بھرپور کوشش،اوقاتِ زندگی کی مکمل حفاظت،مشتبہ ذرائع آمد سے احتراز،مسلک ومشرب پر تصلب کی حق تک استقامت،حلقۂ بیعت میں شامل سینکڑوں مریدین کی اصلاح و تربیت،قرآن کریم کی تلاوت وتفہیم اوراس کی تشریح وتفسیر سے عشق کی حدتک تعلق؛یہ اوراس جیسے متعددعناوین ہیں،جن کے تفصیلی ذکر کی حاجت مستقل سوانح حیات ہی سے پوری ہوسکے گی،وہ حفاظ وقراءاورعلماء ومفتیان اور مقررین ومصنفین سے بھراپراایک لائقِ رشک خاندان چھوڑ گئے ہیں،امید ہے کہ ان کی مسقل سوانح عمری کا جلد ہی فیصلہ لیاجائے گااور پوری ملت کی جانب سے یہ فرضِ کفایہ اداکیاجائے گا۔وہ صحیح معنوں میں مجموعۂ علوم وفنون تھےاوراسلامی علوم پرانھیں اعلیٰ درجے کاعبورحاصل تھا،شاید ہی کوئی دینی وعلمی گوشہ ایسا ہوگا،جس پر انھوں نے بولا یالکھانہ ہو۔علوم ولی اللٰہی ونانوتوی کی تسہیل وتشریح کا کام مختلف اہلِ علم نے انجام دیااوران سب حضرات کی اس سلسلے کی کوششیں بڑی قابلِ قدر ہیں؛مفتی صاحبؒ اس طبقے کے ایسے مثالی فرد ہیں،جنھوں نے شاہ ولی اللہ اور حضرت نانوتوی کی کتب وافادات کوزمانی اسلوب عطا کیااورعہدِحاضرکی علمی ودینی برادری کی ذہنی سطح سے قریب تر ہ کرآپؒ نے ان اکابر کی کتب پرایسی جامع تعلیقات یاعربی واردوشروح قلم بندفرمائیں،جنھیں عالمِ اسلام میں قبولِ عام حاصل ہوااورجن سے افادے واستفادے کا دائرہ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے روزافزوں ہیں۔یہ تاثراتی مضمون آپ کی کتب پرتبصرےاوران کےتعارف کاظاہر ہے متحمل نہیں ہے؛تاہم رحمۃ اللہ الواسعۃ کے شائع ہونے پر،دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ان کے نام جوتہنیتی خط جاری ہوا،اسے یہاں درج کیاجاتا ہے کہ

اکابرعلماء کی نظرمیں

آپ کےمقامِ بلند کاپتہ لگانے کے لیے یہ مکتوب ایک عظیم ترشہادت ہے۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری قدس سرہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند آپ کے نام رقم طراز ہیں:

الجامعۃ الاسلامیۃ دارالعلوم دیوبند (الھند)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۳۔۱۴ صفر المظفر ۱۴۲۵ ہجری کی منظور شدہ تجویز کا متن ارسالِ خدمت ہے۔

تجویز ۵ بہ اجازت صدر:

دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدکم نے مسند الہند حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کی تشریح وتوضیح بنام رحمۃ اللہ الواسعۃ کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، مجلس شوریٰ مولانا موصوف کو اس عظیم علمی خدمت پر مبارک باد پیش کرتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس شجر طوبیٰ کے اصل اصیل ہیں، جس کے برگ و بار اکابرِ دیوبند اور منتسبین دارالعلوم دیوبند ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی اس عدیم المثال تصنیف کی عظمت کا اعتراف کرنے کے باوجود اس سے استفادہ علماء کرام کے لیے بھی سہل نہ تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے پوری جماعت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے اور پوری جماعت کی طرف سے شکریہ وتحسین کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی عمر میں برکت عطا فرمائیں اور ان کے ذریعہ دارالعلوم اور پوری امت کو فیض یاب فرمائیں۔

مرغوب الرحمن عفی عنہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۲۔۲۔۱۴۲۵ھ

باتیں ان کی یاد رہیں گی

مفتی صاحبؒ کی طبیعت میں ہلکا پھلکا مزاح بھی شامل تھا، جس کا اظہار دورانِ درس بھی ہوتا تھا اور زیادہ تر آپ کی بعد العصر کی مجلس میں یہ چیز دیکھنے کو ملتی تھی، ایک دفعہ نمازِ عصر کے معاً بعد میں حاضرِ خدمت ہوا، تو آپؒ کے دو معصوم پوتے آپ کی گود میں کھیل رہے تھے اور آپ ان سے پیار بھری باتیں کر رہے تھے، جب آپؒ لیٹ گئے اور میں نے آپ کے پاؤں دبانا شروع کیے، تو وہی دونوں پوتے اندر سے پھر دوڑے ہوئے آئے اور آپؒ سے چمٹ گئے، اس وقت مفتی صاحبؒ کے ہنسنے اور اپنے پوتوں سے پیار کرنے کا منظر جیسے آج بھی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑے رعب داب سے نوازا تھا، ہر کہ ومہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا؛ لیکن احقر کے چند رفقائے درس اس کلیے سے کافی حد تک مستثنیٰ تھے، جنھیں دیکھ کر مفتی صاحبؒ کی طبیعت کھل اٹھتی تھی، ایک رفیق یوپی کے کسی ضلع کے باشندے تھے، جن کا نام ومقام اب محفوظ نہ رہا، وہ ملکی وعالمی اہم خبریں مفتی صاحبؒ کو سنایا کرتے تھے، مفتی صاحبؒ اپنی مجلس میں انھیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تو روزمرہ کی خبریں پڑھنے کی فرصت نہیں، البتہ یہ میرا اخبار ہے، جو روزانہ آکر ساری اہم خبریں مجھے سناجاتا ہے۔ دوسرے رفیقِ گرامی مولانا عبدالوحید جیسلمیری حال مقیم پونے مہاراشٹر تھے، جو احقر سے پہلے ایک عرصے تک مسجد شاہ مارو کے امام رہے تھے، آپؒ ان سے کافی بے تکلف تھے، رفیق محترم شروع شروع میں کتاب دیکھ کر جمعہ کا خطبہ پڑھا کرتے تھے، مفتی صاحبؒ نمازِ جمعہ یہیں ادا فرمایا کرتے تھے اور ہر جمعہ کو وہ ہمیں کوئی نا کوئی نصیحت بھی فرمایا کرتے تھے، ممکن ہے ان کا یہ معمول قدیم سے چلا آرہا ہو اور ہم سے پہلے کے اس مسجد کے ائمہ و مؤذنین کو بھی ان کے ملفوظات وارشادات سے استفادے کا شرف حاصل ہوا ہو، ایک دفعہ نمازِ جمعہ کے بعد رفیق محترم مولانا عبدالوحید جیسلمیری کو بلایا اور فرمایا کہ آئندہ جمعہ کو کتاب دیکھ کر خطبہ پڑھا، تو میں اپنی اس چھڑی سے تیری اچھی طرح مرمت کر ڈالوں گا اور یہ بھی فرمایا کہ آئندہ جمعہ کو میں منبر کے سامنے مؤذن کی جگہ پر بیٹھوں گا اور

میری اس بات کی عدمِ تعمیل کی صورت میں تنبیہ کا یہ عمل وہیں سب کے سامنے انجام پائے گا، رفیقِ محترم نے لگ لگا کر ہفتے بھر میں دو طویل خطبے اچھی طرح یاد کیے اور آنے والے جمعہ کو بہت اچھے انداز میں خطبہ پیش کیا، جمعہ کے بعد مفتی صاحبؒ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور اپنی چھڑی کی طرف اشارہ کر کے ہنستے ہوئے فرمایا کہ یہ سب کچھ یاد کرا دیتی ہے، خطبہ تو معمولی چیز ہے، یہ تو تجھے قرآن کا حافظ بھی بنا ڈالے گی۔

ایک دفعہ رفیق محترم نے عصر کے بعد ان سے اپنے دو خوابوں کا ذکر کیا، ایک خواب پہاڑ پر چڑھنے سے متعلق تھا، جس کے جواب میں حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں پڑھنے آیا ہے یا پہاڑ پر چڑھنے آیا ہے اور مجلس زعفران زار بن گئی۔ رفیق محترم نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے قل سیروا فی الارض قرآنی آیت کا یہ حصہ تلاوت کیا، تو آپؒ خوب ہنسے اور پھر از راہِ مزاح فرمایا کہ یہ چیزیں اولا بصار کے لیے ہیں اور قرآن میں **فاعتبروا یا اولی الابصار** فرمایا بھی گیا ہے، تجھ جیسے بے وقوفوں کے لیے تھوڑی ہیں۔

دوسرا خواب یہ تھا کہ مفتی صاحبؒ نے اپنے گھر پر ایک لمبی چوڑی دعوت کر رکھی ہے اور دو بڑے بڑے پانی کے ڈرم رکھے ہیں، جن میں رفیقِ محترم نے اعلی درجے کا شربت بنایا ہے اور دسترخوان پر موجود مہمانوں کو پلا رہے ہیں، مفتی صاحبؒ فرمانے لگے کہ اس خواب کی تعبیر تو بعد میں کسی وقت بتائی جائے گی، فی الحال ایسا ہے کہ تو روز میرے یہاں آجایا کر، جب تو آتا ہے، تو میں اپنی دن بھر کی ساری تکان بھول جاتا ہوں۔ واقعی عجب معاملہ تھا، رفیقِ محترم پر نظر پڑتے ہی حضرتؒ کے چہرے بشرے سے مسرت کے آثار ظاہر ہو جاتے تھے اور مجلس کے آخر تک آپؒ بڑی بے تکلفی کے ماحول میں اپنے ملفوظات سے حاضرین کو محظوظ و مستفید فرماتے تھے۔ فراغت کے تین چار سال بعد جب آپؒ کے یہاں حاضری ہوئی، تو رفیقِ محترم سے فرمانے لگے کہ تمہارا وہ دسترخوان والا خواب آج شام کو شرمندۂ تعبیر ہوگا، شام کو آجائیو، میرے یہاں تیری دعوت ہے، چناں چہ متعینہ وقت پر رفیقِ محترم حضرت الاستاذؒ کے گھر حاضر ہوئے اور حضرتؒ نے اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا اور فرمانے لگے تمہارے زمانۂ طالب علمی

کے اس خواب کی یہ ہے تعبیر اور دسترخوان پر رکھے پانی کے دو جگوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ انھیں وہ دوڈرم تصور کر لیجیے، جن میں شربت بنا کر تم نے میرے مہمانوں کو پلایا تھا۔ راجستھان نہ آنے کا شکوہ کیا گیا، تو فرمایا کہ مغربی راجستھان کے مدارس والوں کی جانب سے اب تک کوئی دعوت موصول نہ ہو سکی، ورنہ میں تو سال میں دو مرتبہ پالن پور جاتے اور وہاں سے آتے ہوے راجستھان ہی سے گزرتا ہوں۔

حضرت الاستاذؒ اگر چہ عالم بالا کے سفر پر چلے گئے، جہاں سے واپسی کا کوئی امکان وگمان نہیں؛ لیکن ان کے علمی احسانات اور ان کی یہ حسین یادیں و باتیں انھیں ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی اور حسبِ توفیق ان کے لیے ایصالِ ثواب و دعائے مغفرت کا سلسلہ بھی ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

❁...❁...❁

میرے محبوب ترین استاذ کی یاد بھلائے نہیں بھولتی

مولانا محمد علی قاسمی باڑمیری
الوکرہ، قطر

تقریباً ہر سلیم الفطرت اور مخلص شاگرد کو اس کا استاذ محبوب ہوتا ہے، مجھے بھی اپنے تمام اساتذہ سے الحمدللہ محبت ہے، لیکن مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی چہاردیواری میں مجھے میری جان سے زیادہ عزیز اور محبوب ترین استاذ دو ہیں: (۱) ایک بقید حیات ہیں (اللہ صحت و عافیت کے ساتھ ان کا سایۂ عاطفت دراز فرمائے۔(۲) حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہ العزیز۔

دارالعلوم میں گزرا ہوا بچپن اور طالب علمی کا زمانہ ایک دہائی پر محیط ہے، جس میں ابتدا ہی سے حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالی کی قریب سے زیارت کرنے، سننے اور ان کے بیانات وعلوم سے مستفید ہونے کی بے شمار بار فرصت میسر آئی۔

بعد عصر بھی حضرت کے درِدولت پر مجلس میں شرف یابی کا بکثرت زریں موقعہ ملا کرتا تھا، کبھی مغرب نماز حضرت کی جوار میں ادا کر کے حضرت کے ساتھ دارالعلوم جاتا، کبھی مغرب سے پہلے۔ اس عرصہ کی بہت ساری یادیں ہیں جو دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں، جن کی بنیاد پر حضرت الاستاذ محدث کبیر حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالنپوری رحمہ اللہ کی بہت یاد آتی ہے۔ دل پر حضرت کی جدائی اور وفات حسرت آیات کا ایسا صدمہ ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ ہر لمحہ حضرت کی ادائیں اور شفقتیں غمزدہ کئے رہتی ہیں۔ اللہ کے فضل وکرم سے بندہ کو حضرت الاستاذ سے سنن ترمذی اور شرح معانی الآثار للطحاوی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کو پیچیدہ مسائل کو آسان کر کے شیریں زبان میں پیش کرنے کا نہایت زبردست ملکہ حاصل تھا، افہام وتفہیم کے آپ بادشاہ تھے، اسی بے مثال خصوصیت کی وجہ سے آپ کے درس میں طلبہ پروانہ وار گرتے تھے، دیگر طلبہ کی طرح بندہ بھی آپ کے ترمذی شریف کے درس میں کھنچا چلا جاتا تھا۔ حضرت کا کوئی سبق پورے سال کبھی ناغہ نہیں ہوا، فللہ الحمد۔ صبح کے تیسرے گھنٹے اور مغرب کے بعد کے درس میں دارالحدیث تحتانی طلبہ سے کھچا کھچ بھر جایا کرتا تھا۔

حضرت کا ہمیشہ کا یہ معمول تھا کہ صدر دروازے سے داخل ہو کر احاطۂ مولسری میں واقع کنویں پر لگے ہینڈ پمپ سے کلی فرماتے، اس کے بعد دارالحدیث میں مسند حدیث پر فروکش ہوتے، پھر علم وفن کا یہ بحر عمیق علومِ کتاب وسنت کے موتی لٹانا شروع کر دیتا، ہر ایک طالب علم بساط اور ظرف کے مطابق اپنا اپنا دامن بھرتا، ایک سکون اور خموشی کا سماں بندھ جاتا۔ دارالحدیث میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی؛ دروازوں سے باہر بھی طلبہ کتابیں ہاتھوں میں لئے ہمہ تن گوش رہتے۔

حضرت الاستاذ کی بہت باتیں بار بار یاد آتی ہیں:

ہمارے دورے کے سال ۲۰۰۲ء میں باضابطہ سبق شروع کرنے سے پہلے کوئی ایک حدیث شریف یاد کراتے، تین بار دہراتے، اور اسی سال اسمائے حسنی بھی یاد کرائے تھے، طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ترمذی شریف کے درس سے پہلے تین اسمائے حسنی تین بار اجتماعی طور پر پڑھاتے، یاد ہونے کے بعد عصر کے بعد گھر پر بلا کر سنتے تھے، جو پورے اسمائے حسنی بغیر کسی غلطی کے سناتا اسے انعام میں تفسیر ہدایت القرآن عطا فرماتے، بندے نے بھی سنایا اور بدلہ میں بطور انعام تفسیر ہدایت القرآن پائی، جو کہ اس وقت پندرہ پارے تک ہی ہو پائی تھی۔ اس وقت دورے میں ہم آٹھ سو طلبہ تھے۔

دارالعلوم سے رسمی تعلق ختم ہونے کے بعد بھی کئی بار حضرت سے ملاقات اور زیارت ہوئی، چناں چہ دولۃ قطر

میں ملازمت شروع ہونے کے بعد ہمارے ایک دوست ابراہیم بھائی جو کہ دبئی میں رہتے ہیں ان سے مشورہ ہوا کہ حضرت کا قطر کا پروگرام بنایا جائے۔ ہماری پرخلوص محنت ودعوت اور حضرت اقدس رحمہ اللہ کی شفقت ومحبت اور اللہ تعالی کے فضل وکرم سے پانچ دن حضرت نے قطر کے سفر کے لئے عنایت فرمائے۔ ہم نے پورا گھر حضرت کے لئے خالی کیا تاکہ اہل قطر مکمل آزادی کے ساتھ حضرت کے علوم وفیوض سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ایئرپورٹ پر استقبال سے لے کر الوداع کرنے تک بندہ کو گاڑی ڈرائیو کرنے اور حضرت کی معیت کی عظیم سعادت حاصل ہوئی۔ تمام پروگراموں میں بندہ حضرت کے ساتھ بیٹھ کر خود گاڑی ڈرائیو کر کے لے جاتا اور واپس قیام گاہ پر لے آتا۔ اس دوران حضرت کی خدمت اور ہر طرح کی راحت رسانی کا اللہ تعالی نے خوب خوب موقعہ میسر فرمایا اور حضرت اقدس کی خوب دعائیں لیں۔

بہت یادیں ہیں جو غم کے آنسو رلا رہی ہیں:

حضرت نے حجۃ اللہ البالغہ کا تینوں دن بعد نماز مغرب عرب علماء کے درمیان عربی زبان میں درس دیا۔ عشاء کے بعد عمومی بیان فرماتے جس میں اتنا بڑا مجمع پہونچتا کہ اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی تعداد کسی بیان میں نہیں دیکھی گئی، ثلاثیات بخاری پر نہایت بے مثال اور عجیب الہامی بخشیں فرمائیں، دن بھر علمی اور تحقیقی مجلسیں قائم رہتیں، ابتداء میں قطر کے پروگرام کے لئے پانچ دن تھے مگر بعد میں کسی عذر کی وجہ سے مختصر کر کے تین دن کر دیا، ہمارے شہر وکرہ میں بیان کے موقعہ پر ساتھیوں نے اناؤنسری کی ذمہ داری مجھے دی تھی، میں نے دوران اناؤنسری سامعین سے عرض کیا کہ حضرت نے شروع میں پانچ دن دیئے تھے جو کسی عذر کی وجہ سے کم کر دیئے گئے ہیں، ان شاء اللہ حضرت ہمیں یہ دو دن آئندہ مرحمت فرمائیں گے، تو حضرت نے بیان کے شروع میں فرمایا کہ اِس نے ابھی جو دو دن قرض رکھا ہے اس کا ابھی کوئی وعدہ نہیں ہے، بعد میں دیکھیں گے۔

مدتوں روئیں گے جام و پیمانہ تجھے

افسوس وہ بعد اب کبھی نہ آئے گی

میں اس مرتبہ ماہ رمضان میں پابندی سے تراویح کے بعد حضرت کا ڈیڑھ گھنٹہ کا درس تفسیر سنتا تھا، جو حضرت ممبئ میں قیام کے دوران آن لائن دیتے تھے، اگرچہ بغرض علاج تشریف لے گئے تھے، مگر ماشاء اللہ چند روز کے علاج کے بعد اللہ تعالی نے مکمل شفا عطا فرمائی تھی۔ ۱۵؍رمضان المبارک تک حضرت روزانہ ڈیڑھ گھنٹہ کے دورانیہ پر مشتمل تفسیر اور سوالات کے جوابات دیتے تھے۔

پھر اس کے بعد تیز بخار آیا اور یہ اعلان ہوا کہ آج حضرت کی طبیعت خراب ہوگئی ہے کل بیان ہوگا، تراویح کے بعد رو رو کر حضرت کی صحت یابی کے لئے دعا کرتا، ہر روز اس نیت سے موبائل کھولتا تھا کہ آج کچھ فرمائیں گے مگر کسے معلوم تھا کہ وہ شخصیت جن کے علوم ومعارف سے ایک جہاں سیراب ہو رہا تھا وہ ہمیشہ کے لئے سو جائے گی۔

روشنی جو ہم کو دیتا تھا وہ زیر خاک ہے
اک ستارہ اور ڈوبا، آسماں غمناک ہے

حضرت والا کی رحلت صرف خاندان کے لئے نہیں، بلکہ ہم جیسے ہزاروں شاگردوں اور پوری علمی دنیا کے لئے ایک ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ امت کو آپ کا سچا جانشین اور نعم البدل عطا فرمائے۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان میں سرفہرست ہزارہا علماء تیار کرنا اور بڑی مقدار میں علمی سرمایہ چھوڑ جانا ہے یہ سب حضرت کے لیے مغفرت اور ترقی درجات کا سبب بنیں گے ان شاء اللہ۔ آپ کا نہایت گراں قدر اور بہت نمایاں کارنامہ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآرا تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی تسہیل وتشریح رحمۃ اللہ الواسعہ'' ہے جو منفرد و یکتا ہے ابھی تک دنیا اُس جیسی تصنیف اور اِس جیسی تشریح پیش نہیں کرسکی ہے۔

اسی طرح قرآن کریم کی آسان تفسیر ''ہدایت القرآن'' عام لوگوں کے لیے بڑا قیمتی تحفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کو کروٹ کروٹ چین وسکون نصیب فرمائے، جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور دارالعلوم کو آپ کا نعم البدل نصیب کرے، انبیاء کرام اور صدیقین کی رفاقت نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین یا رب العالمین۔

❁...❁...❁

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

مفتی محمد شرف الدین عظیم قاسمی الاعظمی
مسجد انوار، شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی

اس دنیا میں تاریخیں انسانوں کو امتیازی مقام عطا کرتی ہیں، لمحات شناخت عطا کرتے ہیں، زمانے کی کوئی گردش اور وقت کی کوئی گھڑی انھیں یادگار بنا جاتی ہے، گردش شام وسحر کی انہیں مخصوص ساعتوں کے آئینے میں انسان اپنے اہم واقعات کو دیکھتا ہے، وہ اپنی ذات کو خاندان کو اور قوموں کو انہیں تاریخی حوالوں سے پہچانتا ہے وہ تاریخ اس کی زندگی کا حوالہ ہوتی ہے اور پستیوں وعظمتوں کے حوالے سے اس کے وجود کی رہین منت۔

لیکن زندگی کی شاہراہوں پر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگیاں ان لمحات اور زمانوں کے رحم وکرم کی محتاج نہیں ہوتی ہیں، ان کے وجود کی تنویروں میں کسی ساعت کسی وقت کسی تاریخ اور کسی گردش ارض وفلک کا کرشمہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ زمانے کی گردشیں خود اپنی انفرادیت کے لئے ان کی محتاج ہوتی ہیں، وہ اپنی صلاحیتوں، استعدادوں، بے نظیر شعوری قوتوں، مسلسل جہد، متواتر عمل، چٹانوں کی طرح عزم، پہاڑوں کے مانند ہمت واستقلال، دریاؤں کی طرح بے تاب، اور ہواؤں کی طرح ہر دم رواں دواں اور پارے کی طرح بے چین طبیعت کے باعث لوح ایام پر اس طرح اپنی عظمت کا نقش قائم کرتے ہیں کہ ان کی روشنی سے ایک خطہ نہیں، ایک علاقہ نہیں بلکہ سرحدوں سے بے نیاز ایک جہاں اور ایک عہد روشن ہو جاتا ہے۔

علمی وتحقیقی، اصلاحی اور فن حدیث کی دنیا کی ایک مایہ ناز، یگانہ روزگار، اور برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی نہایت معتبر، مستند، اور اسلامی تعلیمات کے حوالے سے نہایت قابل اعتماد ہستی استاذ محترم حضرت مولانا مفتی سعید

احمد پالنپوری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبندانہیں تاریخ ساز اور عہد ساز لوگوں میں تھی، زمانے کی پیروی آپ نے نہیں بلکہ زمانہ آپ کی اتباع پر مجبور ہوا، آپ تاریخ سے نہیں بلکہ تاریخ آپ کی وجہ سے عظمت پر پہونچی، آپ عظمتوں کے اس آسمان پر تھے جہاں نظر اٹھاتے ہوئے اچھے اچھے قدآوروں کی ٹوپیاں گر جاتی ہیں، عظمتیں یقینا فطرت کا عطیہ ہیں مگر اس کے پیچھے حرکت وعمل اور ایثار وقربانی کی طویل تاریخ پوشیدہ ہوتی ہے حضرت مفتی صاحب کی پشت پر بھی جد وجہد کی ایک وسیع دنیا ہے، ایک طویل قربانیوں کا سفر ہے، علم کے صحراؤں کی آبلہ پائی ہے، دشت جنوں کی آوارگی ہے، فکر وتحقیق کے سمندروں کی غوطہ زنی ہے، دنیا جب خوابوں کے مزے میں ہوتی تو یہ کتابوں کے سفر میں، اسلامی تاریخ کی نادرہ روزگار شخصیات کی دریافت، ان کے جہان ادراکات کی فتوحات، حدیث وفقہ، تفسیر ورجال، فلسفہ وادب، تاریخ وتہذیب، عمرانیات وعرفانیات، کی سیاحتوں میں راتوں کو قربان کرتے رہتے تھے، جس وقت دنیا اپنے مفادات میں مست تھی یہ درد کے صحرا میں بیٹھ کر انہیں عظمتوں کے شاداب علاقوں، اور تعمیر زندگی کے نخلستانوں کی خبر دیتے رہے، یہ نفس پرستی کے تاریک ماحول میں اشکوں کے چراغ جلاتے رہے، یہ بے بسی میں، کلفتوں میں، معاشی تنگیوں میں، اور حالات کی چیرہ دستیوں میں رہ کر بھی ملت اسلامیہ کو نوید حیات کے نسخے بتاتے رہے، ان نسخوں کے نتیجے میں، جانے کتنے دلوں میں فکر وفن کے پودے اگے، کتنی ذہن کی بنجر زمینوں میں بہار آئی، اشکوں کے چراغ سے کتنے قلوب روشن ہوئے، کتنی زندگیاں منور ہوئیں، ان کی علمی فتوحات اور تدریسی خدمات کے باعث کتنے دیار اجالوں میں آئے، کتنے خطوں سے تاریکیاں کافور ہوئیں، اس کا اندازہ کیسے لگایا جائے، آسمان کی بارشوں کے قطرے شمار کرنا کیونکر ممکن ہے، روشنیوں کی پیمائش ناکام سعی کے علاوہ اور کیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب عالمی شہرت کے حامل تھے پھر بھی ان کے نام سے ذہن اس وقت آشنا ہوا جب عمر کا کارواں عربی تعلیم کی چوتھی جماعت میں پہونچا، دارالعلوم دیوبند پہونچنے کے بعد ان کی عظمت کا ستارا نظر آیا، اور

وہیں ان کی شخصیت کی اہمیت سمجھ میں آئی۔ طویل القامت، معتدل جسم، گورا اور صاف چہرہ، روشن پیشانی، آنکھوں میں فراست ایمانی کی چمک، ناک متوسط، ڈاڑھی بھری ہوئی نہ بہت ہلکی پھلکی اور نہ ہی بہت گھنی، سر پر عربی سفید رومال، جسم پر عربی جبہ، گفتگو میں ٹھہراؤ، طبیعت متانت وسنجیدگی کا نمونہ مگر ایسی خشک بھی نہیں کہ جہاں زندگی کا نام ونشان بھی نہ ہو، اس کی جھلک اکثر درسگاہوں میں دیکھنے کوملتی کہ دوران درس آپ موضوع کے لحاظ لطائف کے ذریعے ماحول کو زعفران زار کرتے رہتے۔ عربی ہفتم میں اگرچہ ان کے پاس ہمارا کوئی پیریڈ نہیں تھا باوجود اس کے کبھی کبھی ان کی کشش اور شخصیت کا سحر دارالحدیث میں ہمیں کھینچ لاتا۔۔ دورہ حدیث میں پہونچنے کے بعد باضابطہ ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا، درس میں ان کی انفرادیت ان کے علم کی وسعت اور ان کی محدثانہ شان سورج کی طرح جلوہ آرا تھی، تدریسی صلاحیت میں انہیں کمال حاصل تھا، وہ رجال کا معاملہ ہو یا فقہ کا حدیث کی معرکۃ الآرا بحث ہو کہ علم کلام کے پیچیدہ مسائل، وہ ہر موضوع پر کلام فرماتے اور اس طرح تشریح کرتے کہ مسائل بے غبار اور مطالب آئینہ ہوجاتے، ان کی اسی صلاحیت کی وجہ سے دوران تعلیم دارالعلوم کی انتظامیہ نے معین مدرس کی حیثیت سے تقرر کرلیا تھا اور فراغت کے چند ہی سال بعد شوری کے فیصلے سے انہیں بحیثیت استاذ گجرات سے بلالیا گیا۔ وہ فیض رساں مدرس تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کے درس میں اگر ذرا بھی تاخیر ہوئی تو پھر کلاس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل پاتی تھی، ان کے تلامذہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر دینی علوم اور اسلامی خدمات میں مصروف ہیں۔

حضرت استاذ العلماء مفتی سعید صاحب صرف مدرس نہیں تھے بلکہ وہ ایک بہترین فقیہ تھے، دیدہ ور مفتی تھے، بصیرت مند مصنف تھے، ایک عظیم محدث تھے، حدیث کے بہترین شارح تھے، اور ایک زبردست محقق اور ساتھ ساتھ علم کلام کے دریائے لامحدود کے شناور بھی تھے، انھوں نے درسگاہوں میں علم کی تشریح وتوضیح کے ساتھ ساتھ قرطاس وقلم کے ذریعے بھی اسلامی تعلیمات کی حفاظت کا سامان پیدا کیا، ان اوصاف وکمالات کا اثر تھا کہ

آپ کو ترجمان دار العلوم اور فکر دیوبند کی حیثیت سے بھی جانا گیا۔

آپ نے حدیث کی شروحات کے علاوہ مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں، وہ اردو دنیا میں وہ تمام تصنیفات مقبولیت کے مقام پر پہنچیں، مثلاً تفسیر میں ہدایت القرآن، الفوز الکبیر کی تعلیق وتشریح، مبادئ الفلسفہ، مفتاح التہذیب، محفوظات تین حصے، کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے، حیات امام داؤد، مشاہیر محدثین۔ حیات امام طحاوی، اسلام تغیر پذیر دنیا میں، نبوت کے انسانیت کو کیا دیا، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پڑھا جانے والا مقالہ، حرمت مصاہرت، تہذیب المغنی، المغنی کی عربی شرح۔ تحفۃ الالمعی شرح ترمذی آٹھ جلدوں میں،۔ تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری بارہ جلدوں میں، رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ البالغہ وغیرہ ہیں، ان کتابوں کے علاوہ دسیوں کتابیں آپ نے لکھی ہیں جس میں سوانح حیات بھی ہیں' شروحات بھی، رد ابطال بھی ہیں اور اثبات حق کے موضوع پر بھی، مؤخر الذکر تصنیف رحمۃ اللہ الواسعہ پانچ ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شہرہ آفاق تصنیف حجۃ البالغہ کی تشریح ہے' جو ڈھائی سو سال سے کسی ایسے مفکر اور اہل قلم کی منتظر تھی جو قران وحدیث کے علوم کے ساتھ ساتھ فلسفہ اسلامی، اور حکمت ہائے احکامات شرعیہ کے دشت کا بھی سیاح ہو، مفتی صاحب نے یہ شرح اس انداز سے لکھی ہے کہ شاہ صاحب کی تمام مراد اوران کی عبارتوں کی تمام پیچیدگیاں آشکار ہوگئی ہیں، مفاہیم ومطالب تک سفر کرنے کیلئے جہاں پہلے ذہنی کاوشوں اور اذیتوں کا طویل سفر کرنا پڑتا تھا باوجود اس کے منزلوں کا سراغ نہیں مل پاتا تھا، اس شرح نے اذہان کے اس لمبے سفر سے نجات دے دی، یہ کتاب جب منظر عام پر آئی تو علمی دنیا میں ایک شور مچ گیا، حسن اتفاق سے اس وقت ہم دار العلوم دیوبند ہی میں زیر تعلیم تھے، نگاہوں نے اس وقت لوگوں کی زبانوں پر مفتی صاحب کے اس عظیم کارناموں کے نعرے دیکھے، اڑتے ہوئے تہنیتوں اور مبارکبادیوں کے ستارے دیکھے، سماعتوں نے فضاؤں میں اس سے متعلق زمزمے سنے، حقیقت یہ ہے کہ یہ تصنیف مفتی صاحب کا شاہکار کارنامہ ہے، ایسا کارنامہ؟ کہ اگر صرف ان کی فتوحات صرف اسی

کارنامے میں محصور ہوتیں تو بھی ان کی عظمتوں کا ستارہ علمی و تحقیقی افق پر ہمیشہ کے لیے رخشندہ رہتا۔۔

افق علم و فضل کے آفتاب کے ساتھ حضرت مفتی صاحب سلوک عرفان کی رہ گذر کے بھی بامراد مسافر تھے، تزکیہ واحسان میں بھی ان کا خاص مقام تھا اور اس راہ میں حضرت مفتی مظفر حسین صاحب نوراللہ مرقدہ کے خلیفہ ومجاز بھی تھے وہ محدث وقت اور فقیہ وقت کے ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے مگر زمانے کے تقاضوں سے بے خبر نہیں تھے، وہ شیخ طریقت بھی تھے مگر خشک نہیں بلکہ وہ تمام جدید وسائل و ذرائع کے صحیح استعمال کے قائل تھے اور اسباب کو استعمال بھی کرتے تھے اس حوالے سے ان کی زندگی راہبانہ مزاج سے بہت دور تھی، وہ درسگاہوں میں طلباء سے کہا کرتے تھے کہ علم کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ سائڈ سے بزنس بھی کروتا کہ اہل ثروت کے آگے نیازمندی کا مظاہرہ نہ کرنا پڑے۔

حضرت مفتی صاحب ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ کو آبائی وطن کالیڑہ شمالی گجرات پالنپور میں پیدا ہوئے، گھرانہ اگرچہ علمی حوالے سے کوئی شناخت نہیں رکھتا تھا لیکن دیندار ضرور تھا، ماحول کے اسی اثر کے نتیجے میں آپ کی ابتدائی تعلیم عام روایات کے مطابق کالیڑہ کے مکتب ہی ہوئی بعدازاں عربی وفارسی کے لئے دارالعلوم واقع چھاپی گجرات گئے جہاں آپ کے ماموں مولانا عبدالرحمن صاحب عربی درجے کے استاد تھے انہیں سے فارسی کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد عربی مدرسہ جو پالن پور شہر میں واقع ہے اس میں داخل ہوئے، یہاں شرح جامی تک تعلیم کا سفر جاری رہا اس کے بعد مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا یہاں تین سال تک نحو صرف اور منطق وفلسفہ کی کتابیں پڑھ کر ۱۳۸۰ھ میں دارلعلوم دیو بند تشریف لائے اس دارالعلوم دیو بند میں علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب کی ایک کہکشاں آباد تھی، آپ نے اس سے اپنی صلاحیتوں کے مطابق جی بھر کر اکتساب فیض کیا، خاص طور سے حضرت مولانا سید حسن دیوبندی، مولانا عبدالجلیل کیرانوی، مولانا اسلام الحق اعظمی، مولانا قاری طیب صاحب دیوبندی، حضرت مولانا فخرالدین صاحب مرادآبادی، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی، شیخ محمود عبدالوہاب صاحب

مصری، اور مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری رحمہم اللہ تعالیٰ سے علمی تشنگی کو دور کیا اور ۱۳۸۲ھ میں پہلی پوزیشن سے فراغت حاصل کی علمی تڑپ تو تھی ہی قدرت نے صلاحیت بھی دی تھی

اس کا تقاضا تھا کہ یہ سفر جاری رہی رہے وقت کی آواز پر آپ نے افتا کی درخواست دی اور منظور ہوگئی اور یہ منزل بھی امتیازی شان سے سر کرلی، یہانتک کہ انتظامیہ نے معین مدرس کے لئے منتخب کرلیا۔

تعلیمی مرحلے سے فارغ ہوتے ہی حضرت علامہ بلیاوی کے واسطے دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں تدریسی خدمات میں مشغول ہوگئے، اور ۱۳۸۴ سے ۱۳۹۳ھ تک ۹ سال تک اس ادارے کو اپنے فیضان سے سیراب کرتے رہے، اسی دوران دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے بحیثیت استاذ آپ کا انتخاب کیا اور آپ نے سعادت مندی کے تصور میں قبول کرکے اسی وقت سے تدریسی خدمات پیش کیں اور زندگی کی آخری سانس تک اس سے وابستہ رہے، اور اس شان سے رہے اس قدر علمی وفکری تحقیقی حوالے سے جدوجہد اور سرگرمیاں قائم کیں، اس انداز سے علم وکتاب کی تشریحات کیں، اس انوکھے طرز ادا میں حدیث وتفسیر کی تقریریں کیں، دوران تدریس علم کے وہ لولوومرجان لٹائے کہ ایک دنیا آپ کی شیفتہ ہوگئی، ایک عالم آپ کا گرویدہ ہوگیا، نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط آپ کی تدریسی، تشریحی، تربیتی، اصلاحی، تقریری، اور تصنیفی خدمات کا جائزہ اس مختصر سی تحریر میں کیسے لگایا جائے سوائے اس اعتراف اور خراج عقیدت کے اظہار کے۔

جان کر منجملہ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

زندگی کے نصیب میں موت اسی وقت سے کاتب تقدیر نے لکھ دی تھی جب اسے وجود میں لانے کا ارادہ کیا تھا، جس طرح کائینات کو ایک مضبوط نظام اور مستحکم اصول میں جکڑ دیا گیا ہے، ہونا نہ ہونا سب ہوکر رہتا ہے، دریا پہاڑوں سے نکلتا ہے اور سمندر سے مل کر فنا ہوجاتا ہے، آسمان بارش برساتا ہے، پودے اگتے ہیں، نشوونما پاتے

ہیں، اور آفتاب کی تمازت اس کی شادابیاں چھین لیتی ہے، سارے قوانین مرتب اور اصول مقرر ہیں کہ ہر آغاز کا ایک انجام اور ہر انجام کسی ابتدائی منزل پر رونما ہوتا ہے۔

اس قانون کے تحت مفتی صاحب کی زندگی بھی مخصوص ومتعین تھی وہ جانے کے لئے ہی آئے تھے مگر ان کے کارناموں ان کی خدمات اور ان کی بلندیوں نے اس رحلت کو حادثے کی صورت دے دی ہے، ایک غل ہے کہ دنیا علمی حوالے سے یتیم ہوگئی ہے، ایک شور ہے کہ طالبان علوم نبوت ایک عظیم شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں، علم کی ایک بساط تھی جو لپیٹ دی گئی، فکر وتحقیق کا ایک سورج تھا جو روپوش ہوگیا، کل ایک گروپ میں خبر آئی تھی کہ مفتی صاحب کی طبیعت اب زیادہ خراب ہے وہ ممبئ میں علاج کے سلسلے میں اقامت پذیر تھے درمیان میں طبیعت سنبھل گئی تھی، لیکن کل کی خبر سن کر طبیعت میں بہت اندیشے اور وسوسے پیدا ہو گئے، کل انہیں سانس کی تکلیف تھی اور آجکل یہ تکلیف موت کا الارم ہے۔

صبح میں اٹھا تو ان رحلت کی خبر ملی اس وحشت انگیز وصاعقہ اثر خبر نے طبیعت میں افسردگی پیدا کردی، دل یہ سوچ کر تڑپ کر رہ گیا کہ حکومت کے بے بصیرت اقدام قفل بندی کے باعث آخری زیارت اور قبر پر حاضری بھی دشوار ہوگئی اور اس سعادت سے بھی زندگی محروم رہی۔ مفتی صاحب جوگیشوری ممبئ میں ہی ایک ہاسپٹل میں اچھی نگہداشت میں ایڈمٹ تھے اور وہیں کی قبرستان ان کی آخری آرامگاہ بھی بنی، حضرت مفتی صاحب یقیناً اس عالم مثال سے رحلت کر گئے مگر اپنے کارناموں سے، فتوحات سے علم کے کارواں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، موت عام لوگوں کے لئے اگرچہ گمنامی کا ذریعہ ہے مگر تاریخ ساز لوگوں کے لئے تو یہی موت اصل زندگی اور جاودانی کا دروازہ ہے، وہ زندگی جو لوگوں کے دلوں میں بستی ہے، ذہنوں میں الفتوں کا دیپ جلاتی ہے، عظمتوں کے چراغ روشن کرتی ہے۔

آتی ہی رہے گی ترے انفاس کی خوشبو
گلشن تری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

❁...❁...❁

وہ جانثارِ علمِ شریعت نہیں رہا

مولانا وصی اللہ قاسمی
سدھارتھ نگری

الفاظ کی دنیا میں لکھنے، پڑھنے اور کہنے کے لیے تو یہ چند حروف سے مرکب ایک نام ہے؛ لیکن معانی کی دنیا میں ''بحرِ علوم کا ماہر شناور، بیش قیمت ہیرہ، نکات ومفاہیم سے پُرخزینہ صدف، تحقیق وتفہیم کا آفتابِ ضوفشاں'' سے تشریح کیجیے تو شاید شخصیت کا ایک گونہ صحیح تعارف ہوسکے۔

لیکن اب یہ روشن آفتاب، غروب ہوگیا، وہ دنیا سے اس طرح رخصت ہوا کہ متعلقین ومعتقدین کے اوسان گُم ہوگئے، کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس ناگہانی اور ناقابلِ یقین حادثے کی گزند اس طرح سہنی پڑے گی، زندگی بھر علومِ شریعت کا درس دینے والا انسان جاتے جاتے بھی درس دینا نہ بھولا، پر اس مرتبہ کسی کتاب کا بیانی درس نہ تھا، کوئی علمی اشکال بھی نہیں، اور نہ ہی کوئی فقہی مسئلہ ،اس دفعہ درس تھا آخرت کا، دنیا کی حقیقت کا، وہ بھی عملی طور پر، کہ:

یہ دنیا کھیل ہے اور کھیل بھی ہے چند لمحوں کا
نظر جو کچھ بھی آتا ہے اسے خوابِ گراں سمجھو

درس بھی عبرت سے بھرپور، نصیحتوں کا ایک جہان لیے ہوئے، زندگی بھر جس ذخیرہ حدیث کی زبان سے تشریح کی، آج اُسی ذخیرہ سے چُن کر ایک حدیث کی بے زبانی تشریح کی، حدیث کچھ یوں ہے: **"إن اللہ لا یقبض العلم انتزاعًا ینتزعه من العباد، ولکن یقبض العلم بقبض العلماء**

یقیناً آپ نے سمجھا دیا کہ دنیا سے علم کیسے رخصت ہوتا ہے؟ اور بہت خوب سمجھایا کہ عالم کی موت صرف عالَم کی موت نہیں؛ بلکہ عِلم کی بھی موت ہے، اور علم کی موت تیرگی ہی ساتھ لاتی ہے، چنانچہ:

تا بہ امکانِ نظر ہے تیرگی چھائی ہوئی
تیرگی اور تیرگی بھی موت کی چھائی

آپ اپنی ساری خصوصیات سمیٹے عالمِ ایں سے عالمِ آں کی سمت کوچ کر گئے، عالمِ فنا کو چھوڑ عالمِ دوام کو اپنا مسکن بنالیا، مسکراتے ہوئے ہنستی مسکراتی دنیا کے باسی بن گئے، کیونکہ دعائے نبوی "**نضر الله إمرأ سمع مني مقالتي فحفظها ووعاها وأداها كما سمع**" کے آپ بجاطور پر مستحق ہیں؛ پر یہاں نہ جانے کتنے ایسے ہیں جو ماہئ بے آب کے مانند تڑپ رہے ہیں، رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں، یہاں فرزانوں کی ایک دنیا ہے جن کے ہاتھوں میں اب نہ شمع ہے، نہ اس کے ملنے کے آثار، ان کی زبانوں پر بار بار یہ سوال آتا ہے:

کیا ہوا اے وقت! سناٹا ہے کیوں چھایا ہوا؟
زمزمہ کیوں رک گیا ہے، تا بہ لب آیا ہوا؟

جبکہ آنکھوں کا حال اور سوال یہ ہے کہ:

حسرتِ نظارہ بن کر آنکھ وقفِ جوش ہے
کس کی رخصت ہے یہ ہم سے، کون یوں روپوش ہے؟

اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ دنیا بھر میں پھیلے معتقدین ومستفیدین کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں تو صرف وہ طلبہ ہیں جنہوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، اور اب وہ آپ سے سیکھے ہوئے نقوش کو رہنما بنائے ہوئے عملی میدان میں ہیں، انہوں نے زندگی کی نہ جانے کتنی الجھی ہوئی گتھیاں لمحوں میں اس طرح سلجھتے ہوئے دیکھا اور سنا جس کی کوئی نظیر نہیں، نہ جانے کتنے علمی اعتراضات واشکالات کا حل آپ کی زبان سے اس انداز میں سنا جیسے یہ ابتدائی درجات کے معمولی مسائل ہوں، آپ اُنہیں سادہ، سہل اور انتہائی پروقار زبان میں تفہیم کے وہ گر

سکھا گئے جو کسی اور در پہ نہیں ملتے۔۔۔۔اور آج یہ ساری چیزیں خواب بن گئیں نتیجتاً وہ بزبانِ حال وقال یوں شکوہ کناں ہیں:

رہنما بن کر حدِ منزل پہ لے جائے گا کون؟
بے کسانِ راہ بتلاؤ کہ کام آئے گا کون؟

اور

ہم گمرہانِ شوق کسے دیکھنے چلیں؟
کس راستے میں نقشِ قدم دیکھنے چلیں؟

یہ سب ایک طرف اور دارالعلوم دیوبند کا درد وغم ایک طرف جہاں قدرت نے علم وفن کی وہ فضا میسر کی جس نے آپ کو زندہ جاوید بنا دیا، دنیا کے کونے کونے میں آپ کا نام گونجا، دلنشیں آواز پہنچی، دارالعلوم کے مسندِ حدیث کی حالتِ زار اس پر مستزاد، جس مسند پر بیٹھ کر ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' کی وہ تشریح کی کہ آج وہ ۱۲رضخیم جلدوں میں قارئین کے لیے ایک تحفہ کی شکل میں منظر عام پر ہے، اسی مسند پر بیٹھ کر ترمذی شریف کا وہ محدثانہ درس بھی دیا کہ ۸ر جلدوں میں اس کی تقریر زیرکوں کی زیرکی میں اضافہ کر رہی ہے، یہ تو خاص مسندِ حدیث کی بات تھی، اس کے علاہ تقریباً نصف صدی تک پورا دارالعلوم آپ کے علمی زمزموں سے ایسا گونجا ہے کہ سننے والوں کے کان حیرت میں ہیں، ان کا سوال ہے کہ:

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ آواز اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

یہ الگ بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں آپ اپنی اس طویل بے لوث خدمت کے متعلق برملا یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں:

رنگیں ہے ہم سے قصہ مہر ووفا کہ ہم
اپنی وفا کا رنگ ترے رخ پہ مَل گئے

آپ کی قلمی وتصنیفی خدمات ہوں یا تقریری وبیانی، ایسا نہیں کہ صرف دار العلوم دیوبند یا ہندوستان تک ہی اس کے فیوض محدود ہوں؛ بلکہ قدرت نے سات سمندر پار تک کے افراد کو ان سے محظوظ کیا، احادیث کا درس دیا، بیانات اور تقریریں کیں، ملحدین کے جوابات دیے، انہیں قرآن وسنت کے حقیقی مقام سے آشنا کیا، ان کے سامنے اسلام کا صحیح اور سچا تعارف پیش کیا، فریضہ دعوت وتبلیغ سے بھی کنارہ کش نہ ہوئے۔

تیرے لیے تھے مشرق ومغرب بچھے ہوئے
اے نافہ بہار، دل وجاں لیے ہوئے

قدرت نے علوم کا وافر حصہ، علوم کو پیش کرنے کا سلیقہ وانداز، اور استحضار وفطانت اتنی فیاضی کے ساتھ آپ کو عطا کئے تھے کہ جہاں تشریف لے گئے وہیں علم کے جلوے بکھیر دیے، طبیعت کی ناسازی کے عالم میں دیا گیا آپ کی زندگی کا آخری بیان سوشل میڈیا پر خواب وائرل ہوا اور ہو رہا ہے، آپ فرماتے ہیں ”میرے ایک عزیز ہیں ایران میں مولانا حکمت اللہ سلمہ انہوں نے فون کیا کہ آج بیان نہ کیجیے گا، میں نے کہا: نہیں، بیان ہوگا، میرے ایک دوست ہیں کراچی میں، مولانا عبدالرؤف صاحب، انہوں نے فون کیا کہ آج مختصر بیان کیجیے گا، میں نے کہا: ہاں! یہ ٹھیک ہے، بیان مختصر ہوگا“ ذرا غور کیجیے کہ طبیعت سخت ناساز ہے، پھر بھی دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ صادق نہ صرف یہ کہ برقرار ہے؛ بلکہ پُر جوش بھی، یعنی:

میں جہاں بیٹھا، وہیں میخانہ بنے

لیکن ہائے افسوس کہ آج:

وہ جانثارِ علم شریعت نہیں رہا
وہ آشنائے جادہ حکمت نہیں رہا

آپ نے اپنی زندگی میں لکھا اور بہت لکھا، پڑھا اور بہت پڑھا، محنت کی اور خوب کی، بھلا بتایئے! دار العلوم کے زمانہ تعلیم میں عربی درجات کے ساتھ حفظِ قرآن مکمل کیا، وہ بھی صدر گیٹ کے چبوترے پر بیٹھ کر، اب اِسے قرآن پاک

کے تئیں سچی محنت اور محبت نہیں تو اور کیا کہا جائے، اتنا ہی نہیں درسیات میں لگن، مطالعہ و مذاکرہ میں دلچسپی کا یہ عالم کہ دارالعلوم میں مسجد قدیم کے پاس رہائش ہے، اور دار جدید کی شکل دیکھے ہوئے کئی مہینہ کا عرصہ بیت جاتا ہے، جبکہ مسجد قدیم اور دار جدید کے مابین صرف نودرہ کی عمارت حائل ہے۔

لکھا اتنا کہ تعداد میں تو تقریباً ایک سو کتابیں آپ کے قلمِ گہربار سے شائع ہوچکی ہیں، جن میں تفسیر قرآن، شرح بخاری، شرحِ ترمذی، شرح حجۃ اللہ البالغہ وہ کتابیں ہیں جو بلا مبالغہ تنہا کمّاً وکیفاً سیکڑوں کتب کے قائم مقام ہیں، لکھنے پڑھنے کا یہ سلسلہ زندگی کی آخری سانس تک جاری رہا، آپ کا ایک جملہ جہاں اس حوالے سے آپ کی زندگی کا آئینہ دار ہے، وہیں طالبانِ علوم نبوت کے لیے نصیحت آمیز بھی، چنانچہ موقع بموقع آپ فرمایا کرتے تھے:

پڑھو...... راتوں کو جاگ کر پڑھو.......... نیند قربان کرو...... دیکھو میں رات کو نہیں سوتا اور طے کرلیا ہے کہ اب قبر میں ہی ٹانگ پھیلا کر سوؤں گا۔ اللہ اکبر کبیرا

اگر آپ نے طلبہ کو یہ نصیحت کی، تو سب سے پہلے خود اس پر عمل کیا، واقعتاً آپ نے دنیا میں آرام نہ کیا، راتوں کی نیند قربان کردیا؛ لیکن اللہ کی ذات سے امید؛ بلکہ یقین کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلاشبہ آج آپ قبر ہی میں سکون کی نیند سورہے ہوں گے، (اللھم اجعل قبرہ روضۃ من ریاض الجنہ۔ آمین)

گویا آپ کی پوری ذات تحریک وعمل سے عبارت تھی؛ لیکن آج نہ سراپا عمل شخصیت ہے، نہ تحریکی ذات:

آئے گا کون راہ دکھانے کے واسطے
سینے میں آرزو کو جگانے کے واسطے
اٹھے گا کون سوز بڑھانے کے واسطے
اک شمعِ جاں گداز جلانے کے واسطے

اللہ رب العزت ہم سب کو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس نصیحت پر کرنے والا اور آپ کے فیوض کو عام کرنے والا بنائے! آمین یارب العالمین۔

رئیس المحدثین فقیہ العصر واعظ شیریں بیاں

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالنپوریؒ

مولانا محمد مرتضیٰ رشادی صاحب
استاذ مدرسہ مدینۃ العلوم آتما کور

عالم اسلام کی عظیم الشان دینی دانشگاہ دارالعلوم دیوبند (یوپی) کے شیخ الحدیث صدر المدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا ۱۹/مئی/۲۰۲۰ء مطابق ۲۵ رمضان ۱۴۴۱ھ بروز منگل بوقت چاشت وفات کی خبر ملنا نہایت ہی تکلیف دہ واقعہ ہے، آہ کس کڑے وقت میں یہ سائبان بھی ہم سے چھن گیا، ہر طرف مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں، جانا تو ہر کسی کو ہے مگر ایک ایسے وقت میں جانا جبکہ ملت اسلامیہ ہندیہ ایک نازک موڑ پر کھڑی ہے، ایک مضبوط آسرے کا چھوٹ جانا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ہم کیا کہہ سکیں گے، اور نہ ہی ہم اس لائق ہیں، محض اپنے سکون اور اطمینان کے لئے یہ بکھری تحریر پیش ہے۔ حضرتؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے براہِ راست علم حاصل کرنے کا موقع بندہ کو نہیں ملا، لیکن حضرت کی تصانیف، رفقائے درس کے تذکرے اور اپنے اکابر اساتذہ سے بالواسطہ ضرور استفادہ کا زرین موقع حاصل ہوا ہے، اس طرح آپ بھی ہمارے استاذ اور روحانی باپ ہیں۔ ہندوستان کے مرکزی اور تاریخی دینی ادارے دارالعلوم دیوبند کے استاذ الاساتذہ تھے ہزاروں تشنگان علوم نبویہ نے آپ سے استفادہ کیا ہے، ملک وبیرون ملک نے حضرت کے علمی فیض سے فائدہ اٹھایا، آپ دارالعلوم کے عظیم محدث تھے، مسند حدیث پر آپ کا انوکھا انداز یادگار رہے گا، آپ کا علمی سرمایہ ہمیشہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ بن کر رہے گا۔

ہم نے اپنے اساتذہ سے سنا ہے کہ آپ بچپن ہی سے ذہین وفطین، کتب بینی کے عادی اور جفاکش انسان تھے، مختلف علوم وفنون خاص طور پر فقہ وحدیث میں امتیازی درجہ رکھتے تھے، فراغت کے بعد مختلف مدارس میں علم حدیث کی خدمت کرتے رہے اور آج سے تقریباً ۴۷ رسال پہلے دارالعلوم دیوبند نے آپ کو طلب کیا، اس وقت سے آپ کا علم حدیث سے خاص شغف رہا، آپ کا درسِ حدیث مختلف علوم وفنون پر مشتمل ہوتا، یہ کہا جائے کہ دارالعلوم کی مسند حدیث کو آپ سے زینت ملی ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔

حضرت رحمہ اللہ کی بیشمار درسی وغیر درسی تصانیف ہیں جو کئی مدارس میں داخل نصاب بھی ہیں، مسند الہند حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی شاہکار تصنیف، حجۃ اللہ البالغۃ کی بہترین شرح کر کے آپ نے امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، آپ طلبہ پر نہایت ہی شفیق اور مہربان تھے، حق گو اور حق پسند تھے، امت کا غم وہمدردی کے پیکر تھے، دین اسلام وشعار اسلام کے محافظ تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت کے پاس ایک سوال یہ آیا اس ملک میں دینی تعلیم کو عام کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے تو حضرت نے بہت ہی عام فہم انداز میں سمجھایا اور آسان عمل بتایا کہ ٹوپیاں پہننا چاہئے، اسلامی لباس عام ہو، گھر کا بچہ بغیر ٹوپی پہنے کہ نہ رہے اور ساتھ جبہ بھی ضرور پہنے اور ماں باپ ٹوپی پہنائے بغیر ہرگز باہر نہ بھیجیں، اسلامی لباس کا خاص اہتمام کریں پھر دیکھیں کہ مسلم پاپولیشن کتنا بڑھا ہوا نظر آئے گا؟ کئی گنا بڑھا ہوا سڑکوں پر دکھائی دے گا، آگے بتایا کہ دیوبند کے قریب ایک روتی نامی جگہ ہے، وہاں ہندو مسلم فساد ہو گیا، مسلمان تھوڑے تھے، ہندو بہت تھے تو ایک مولانا صاحب رات سہارنپور گئے اور پانچ ہزار (۵۰۰۰) ٹوپیاں خرید کر لائے اور رات ہی میں سب گھروں میں سپلائی کر دی اور کہا کہ صبح میں سب آدمی ٹوپیاں پہن کر نکلیں اور جب صبح سب ٹوپیاں پہن کر نکلے تو ہندو ڈر گیا اور سہم گیا کہ اپنے یہاں اتنے نئے مسلمان کہاں سے آگئے، چنانچہ فساد دب گیا۔

لہٰذا یہ تو پاپولیشن بڑھانے کا اور دشمن پر رعب ڈالنے کا ایک طریقہ ہے، اصل ڈھال تو ہم اپنے گھروں میں

دینداری کولانا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات کو بلند فرمائے، جنت الفردوس نصیب فرمائے، آپ کی جملہ خدمات کو قبول فرمائے، آپ کے اہل خانہ اور تلامذہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔

تلاش جتنا کرے زمانہ ملیں گے کیوں؟ بے بدل گہر تھے

مولانا افضال اختر قاسمی
استاذ جامعہ عربیہ شمس العلوم شاہدرہ، دہلی

کسی کی موت پر رنج وتکلیف انسانی فطرت ہے، ایک وقت تھا، موت کی خبر سن کر چہرے پر رنجیدگی کے بادل چھا جاتے تھے اور زبان پر "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعونَ" کے کلمات ہوتے تھے، زمانے نے کروٹ لی، حالات بدلے، سوشل میڈیا نے بھی اپنا رنگ دکھایا، موت کی خبریں روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گئیں، وہ فطری کیفیت کہیں گم ہوتی چلی گئی، رسمی اظہارِ غم کا بھی لوگوں کے پاس موقع نہیں رہا، موت کی خبر پر دعا (إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعونَ) بھی زیادہ تر لوگ نہیں پڑھتے ہیں۔ لیکن بعض خدا ترس اللہ کے برگزیدہ بندے ایسے ہیں جن کی موت سے آج بھی زمانہ سوگوار ہو جاتا ہے، دلوں کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور بے اختیار آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری قدس سرہ کی بابرکت ذات ایسے ہی اوصاف وکمالات کی حامل تھی۔

موت کی خبر اور ناچیز کی جذباتی کیفیت:

حضرت الاستاذ قدس سرہ اگرچہ نگاہوں سے دور تھے، ناچیز کو آپ سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوتا تھا؛ لیکن دل میں عقیدت ومحبت اور احترام وعظمت کے گلاب شگفتہ تھے، جن کی خوشبوؤں سے ہر سانس معطر تھی، زندگی کا لمحہ لمحہ شاداب تھا؛ چناں چہ حضرتؒ کے انتقال کی خبر سے رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، طبیعت نڈھال ہوگئی، اس سے پہلے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کے علاوہ کسی کی موت سے ایسی المناک کیفیت نہیں ہوئی

تھی۔

وہ بھیانک صبح تھی، منگل کا دن تھا، ۲۵ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ =۱۹ر مئی ۲۰۲۰ء کی تاریخ تھی، روز کی طرح ناچیز نے فجر کی نماز پڑھی، مختصر تلاوت کی اور سو گیا، تقریباً آٹھ ساڑھے آٹھ بجے آنکھ کھلی، غسل کی تیاری کرنے لگا، دیوار میں بنی الماری میں موبائل رکھتے ہوئے بلا ارادہ وہاٹس ایپ کھول دیا، ہائے اللہ.....! یہ کیا؟ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری قدس سرہ ہم سب کو دائمی جدائی کا غم دے کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (یاد نہیں کہ یہ دعا بھی ناچیز اس وقت پڑھ سکا تھا یا نہیں۔) ایک پل کے لئے دل کی دھڑکنیں تھم گئیں، زبان گُنگ ہوگئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، ذہن و دماغ مفلوج ہوگئے، پورے وجود پر رنج والم اور گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے، جیسے طوفان زدہ اندھیری رات میں کوئی مسافر حوصلہ کھو چکا ہو۔ تھوڑی دیر میں جب حالت کچھ سنبھلی تو یادوں کا کربناک سلسلہ شروع ہوا، حضرتؒ کا خوبصورت سراپا، جمالِ علم اور حسنِ عمل خیالات کے آئینے میں جھلکنے لگے، ایک ایک بات یاد آنے لگی: دراز قد، کشادہ پیشانی، حسین کھلتا چہرا، بارعب ادائیں، بلند اخلاق و کردار، گل بار گفتگو، الفاظ گویا موتی، پُر تاثیر اندازِ تکلم، فصیح و بلیغ اسلوبِ تحریر، نکتہ داں، صاحبِ نظر، "علمٌ ینتفعُ بہٖ" کے مصداق، "..... خیراً یفقِّهُ فی الدِّین" سے سرفراز، علم و عمل کے پیکر، عظیم شیخ الحدیث، فقہِ حنفی کے ترجمان اور صاحبِ طرز مدرس یعنی لمحہ بھر میں حضرتؒ کی ظاہری و باطنی خوبیاں ذہن و دماغ میں گھوم گئیں۔ اداس چہرے، خموش لب ہیں، ہے درد دل میں، بہے ہیں آنسو جنھیں ہے کھویا نہیں ستارہ، وہ مطلعِ علم کے قمر تھے۔

حضرت الاستاذؒ کی مجلس میں ناچیز کی حاضری:

زمانۂ طالبِ علمی میں احباب سے ناچیز کا تعلق نہایت محدود تھا، جن سے ملا ضرورت سے ملا، جہاں گیا ضرورت سے گیا، کسی سے شب و روز کا ایسا تعلق نہیں تھا جسے چولی دامن کا ساتھ کہا جائے، یہی مشفق و مربی حضرت

ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد صاحب قاسمی مدظلہ العالی کی نصیحت بھی تھی۔لیکن اس معاملے میں ناچیز شاید راہِ اعتدال سے ہٹ گیا؛ چناں چہ فائدوں کے ساتھ ایک محرومی ہوئی، اکابر اساتذہ کی ملاقاتی مجلسوں سے ناواقف رہا، قلیل تعلقات کی بنا پر احباب سے اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں مل سکی، حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب اور استاذِ محترم حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہما العالی کی مجالس کا علم ہوا، پر حاضری کی کوئی شکل نہیں بن سکی؛لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد ہوئی، حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب قدس سرہ کی مجلس میں ایک بار حاضری کا موقع نصیب ہوا، واسطہ بنے جناب بھائی مولانا محمد عارف صاحب جو ناچیز کے ہم وطن تھے اور شریکِ درس بھی نیز دورۂ حدیث کے ترجمان بھی تھے۔ایک دن یونہی پوچھنے لگے: مفتی صاحب کی مجلس میں جائیں گے؟ ناچیز پہلے تو گھبرایا، خود کو اس عظیم مجلس کے لائق نہیں سمجھا، لیکن پھر خدا کی اس نعمت کو غنیمت جانا، موقع کہیں ہاتھ سے نکل نہ جائے، یہ سوچ کر فوراً اثبات میں جواب دے دیا۔دوسرے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم دونوں ساتھیوں نے عصر کی نماز ادا کی اور تیز تیز قدموں سے حضرت الاستاذؒ کے گھر کی طرف چلے، اس سے پہلے ناچیز حضرت الاستاذؒ کے گھر سے بھی واقف نہیں تھا، ایک طرف جہاں حضرتؒ کی مجلس میں حاضری کی خوشی تھی وہیں دوسری طرف اساتذہ سے فطری مرعوبیت کی وجہ سے دل میں گھبراہٹ بھی تھی، چہرے پر ملی جُلی کیفیت تھی، ہمیں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی، بالکل اخیر میں جگہ ملی، رفیقِ درس جناب بھائی مولانا محمد عارف صاحب نہایت سلیقے سے کسی طرح آگے جگہ لینے میں کامیاب ہوگئے، ناچیز کو کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی، جہاں آسانی سے جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا، آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی، بے ادبی کا اندیشہ تھا۔حضرت الاستاذؒ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، چہرا کھلا ہوا تھا، گفتگو جاری تھی، دھیمی دھیمی آواز ناچیز کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی؛لیکن ناقابلِ فہم تھی، ناچیز میں بے تابی کی کیفیت تھی، افسوس ہورہا تھا، لیکن حضرت الاستاذؒ کی مجلس میں حاضری اور دیدار کی خوشی کسی طرح کم نہ تھی۔

حضرتؒ الاستاذ سے ناچیز کا تعلق:

براہِ راست ناچیز نے صرف حضرت الاستاذ قدس سرہ کے درس وتدریس سے استفادہ کیا اور یہی حضرتؒ سے ناچیز کے تعلق اور رشتے کی بنیاد ہے؛ ہر چند کہ استاذ وشاگرد کے رشتے میں عمومیت ہے؛ لیکن اس سے اس رشتے کی عظمت واہمیت میں سرِ موفرق نہیں پڑتا؛ کیوں کہ جو چیز جس قدر اہم ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اسے اسی قدر عام کردیتے ہیں؛ تاکہ کوئی محروم نہ رہے۔ حضرتؒ کے دیگر تلامذہ کی طرح ناچیز کے لئے بھی یہ نعمت نہایت قابلِ رشک ہے کہ ہمیں حضرتؒ سے بخاری شریف سبقاً سبقاً پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔ آپؒ کی زندگی کے دیگر گوشوں کے بہ نسبت ناچیز نے آپؒ کی تدریسی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ یقیناً آپؒ صاحبِ نظر محدث اور مثالی استاذ تھے۔

حضرتؒ کے درس وتدریس کا اسلوب:

حضرت الاستاذؒ کا درس نہایت مرتب ہوا کرتا تھا، ایک ایک لفظ بالکل صاف ادا فرماتے تھے، آواز میں ٹھہراؤ کے ساتھ لہجہ میں تسلسل برقرار رکھتے تھے، تعبیر سلیس لیکن پُرکشش ہوا کرتی تھی، صحیح عبارت خوانی پر خصوصی توجہ ہوتی تھی، کبھی کبھی خود ہی عبارت پڑھا کرتے تھے، مشکل مقام پر آپ مضمون دوہراتے تھے، تشریح وتوضیح بالکل نپی تلی ہوتی تھی، درس وتدریس کے حوالے سے نہ تو آپؒ کے کلام کی نوعیت میں تبدیلی ممکن تھی اور نہ ہی مقدارِ گفتگو میں کمی زیادتی کی گنجائش نکل سکتی تھی، ہر حدیث ہر عبارت؛ بلکہ ایک ایک لفظ پر نہایت مناسب کلام فرماتے تھے، ایک حرف بھی تشنہ نہیں چھوڑتے تھے، فقہ سے متعلق حدیث آتی تو آپؒ کا فقیہانہ انداز ہوتا تھا، علمِ حدیث سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے آپؒ کا رنگ محدثانہ ہوتا تھا، اہلِ حق کے درمیان اختلافی مسائل میں آپؒ اختلاف کی بنیاد خاص طور سے واضح فرماتے تھے، ترجمۃ الباب اور سبق کی دیگر پیچیدگیاں بڑی خوبی سے حل فرماتے تھے، طلبہ کو مقام کی دقت ودشواری کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا، آپؒ اردو ترجمہ کے قائل نہیں تھے، لیکن کوئی جملہ یا لفظ مشکل ہوتا تو آپؒ ترجمہ ضرور کرتے تھے، پورے سال درس کا انداز یکساں ہوتا تھا، سال کے آخری ایام میں آپؒ کے درس کا انداز وہی ہوتا تھا جو سال کے شروع میں ہوتا تھا، ہاں کوئی تشریح پیچھے آچکی ہوتی تو عموماً آپؒ

اسے دوہراتے نہیں تھے، ناچیز کو یاد ہے کہ کتاب کے شروع میں تمہیدی گفتگو آپؒ نے بہت تفصیل سے کی تھی، امام بخاری رحمہ اللہ تعالی کی حالاتِ زندگی، احادیث کی کتابوں میں بخاری شریف کا مقام، بخاری شریف کا اصل نام اور اس کے تمام اجزا کو بڑی وضاحت سے بیان کیا تھا، علمِ حدیث سے متعلق دیگر مضامین پر بھی آپؒ نے تفصیلی روشنی ڈالی تھی، یہ آپؒ کے درس کی کیفیت تھی۔

اسباق کی کمیت (مقدار) میں بھی آپؒ کا انداز نرالا تھا، روزانہ کے سبق کی مقدار انتہائی معتدل ہوتی تھی، درس کے اوقات بھی متعین ہوتے تھے، تعلیمی سال کے آخری دن تک درس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، نصاب کی تکمیل بہ حسن وخوبی ہوجاتی تھی، نہ ایسا ہوتا تھا کہ وقت سے پہلے نصاب مکمل ہوجائے اور نہ یہ ممکن تھا کہ تعلیمی ایام ختم ہوجائیں اور نصاب باقی رہ جائے، یعنی اسباق اور سال کے ایام دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ سال کے اول، درمیان اور آخر میں سبق کی مقدار میں بہ تدریج فرق ہونا ایک فطری چیز ہے اور مفید بھی؛ جو آپ کے درس میں بھی تھا، لیکن سبق کی مقدار میں بہت زیادہ نامناسب فرق نہیں ہوتا تھا، پورے سال ہر دن کے سبق کی مقدار اس دن کے مناسب رکھتے تھے جس سے طلبہ کے لئے روزانہ کے اسباق کو سمجھنا اور محفوظ رکھنا آسان تر ہوجاتا تھا، بعض طلبہ روزانہ کا سبق قلم بند کرلیتے تھے، آپؒ درس میں صرف سبق سے متعلق گفتگو کرتے تھے، خارجی باتیں بالکل پسند نہیں کرتے تھے، ہاں کبھی کبھی تربیتی واصلاحی گفتگو کرتے تھے، آپؒ کے درس کی یہ بڑی خوبی تھی کہ کند ذہن طلبہ بھی آپؒ کے درس سے خاطر خواہ مستفید ہوتے تھے۔ آپؒ تمام کاموں پر درس وتدریس کو ترجیح دیتے تھے، ایامِ تعلیم میں اجلاس وغیرہ میں شرکت سے احتراز کرتے تھے، آپؒ کے سبق کا ناغہ شاید باید ہی ہوتا تھا۔

حضرت الاستاذؒ کے درس کی مقبولیت:

استاذ وشاگرد کے رشتے کی بنیاد تعلیم وتعلم اور درس وتدریس ہے، یہی وجہ ہے کہ محنتی اور ذہین طلبہ اساتذہ کی نگاہوں میں محبوب ہوتے ہیں اور استاذ کی مقبولیت کا انحصار بھی درس وتدریس کی عمدگی پر ہے۔ اللہ تعالی نے

حضرت الاستاذ قدس سرہ کو درس وتدریس کے حوالے سے بے نظیر خوبیوں سے نوازا تھا، چناں چہ آپؒ کا درس طلبہ کے درمیان کافی مقبول تھا، جماعت دورۂ حدیث شریف میں عام طور سے طلبہ کی ایک بڑی تعداد غیر حاضر رہتی ہے؛ لیکن آپؒ کے درس میں تمام طلبہ آپؒ کے تشریف لانے سے پہلے حاضر ہوجاتے تھے یعنی آپؒ کی پابندی، محنت وجاں فشانی اور تدریس کی عمدگی نے اس زوال پذیر دور کے طلبہ کو بھی اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ ہجوم تشنہ لبوں کا ہر دم، تھا میکدہ ان کا مثلِ زم زموہ علم وعرفاں کے جام ومینا، لُٹاتے ہر شام ہر سحر تھے حضرت الاستاذ قدس سرہ کے درس وتدریس سے متعلق جو کچھ لکھا گیا یہ ناچیز کی ذاتی معلومات اور احساسات ہیں، جو دورانِ درس محسوس ہوئے، آپؒ کے درس وتدریس کی پوری عکاسی نہیں ہے۔ اور یہ اس تہی دست، بے مایہ اور کم علم کے لئے ممکن بھی نہیں ہے۔

حضرتؒ سے ناچیز کی پہلی اور آخری ملاقات:

حضرت الاستاذؒ سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب آپؒ دیوبند سے اپنے وطن پالن پور کے سفر پر تھے، مدرسہ نور العلوم گٹھامن کے اجلاس ختم بخاری شریف میں آپؒ کو شرکت کرنی تھی، حضرتؒ اس مدرسے کے سرپرست تھے، آپؒ کی ٹرین "احمد آباد میل" (یوگا اکسپرس) کا روٹ شاہدرہ اسٹیشن ہو کر تھا، خوش قسمتی سے تھوڑی دیر ٹرین یہاں رکتی بھی ہے، حضرتؒ کے شریکِ سفر اور چہیتے شاگرد ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد صاحب قاسمی مدظلہ العالی کے توسط سے جامعہ عربیہ شمس العلوم شاہدرہ کے ایک مدرس کو اس سفر کی اطلاع مل چکی تھی، لیکن ناچیز کو خبر نہیں تھی، عشاء کی جماعت ہوتے ہی عربی کے بعض اساتذہ خلافِ معمول ایک ایک کر کے مسجد سے نکلنے لگے، باقی لوگ اطمینان سے سنن ونوافل میں مشغول ہو گئے، ناچیز سمجھ نہیں پا رہا تھا، معاملہ کیا ہے؟ یوں تو کسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ناچیز کی عادت نہیں ہے، لیکن اس دن حسنِ اتفاق سے کسی سے پوچھ لیا، معلوم ہوا کہ اساتذہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری (قدس سرہ) سے ملاقات کے لئے اسٹیشن جا رہے

ہیں۔ پھر کیا تھا، ناچیز بھی پُرانے رفیقِ درس مولانا سلطان احمد صاحب قاسمی کے ہم راہ اسٹیشن پہنچ گیا، وہاں مولانا امیر معاویہ صاحب قاسمی، مولانا حذیفہ صاحب قاسمی اور مفتی آفتاب صاحب قاسمی پہلے سے موجود تھے۔ چند منٹ انتظار میں گزرے، ٹرین آئی پلیٹ فارم نمبر ۴ پر رکی، کھڑکی سے ہی حضرتؒ کا نورانی چہرا نظر آ گیا، ہم تمام ساتھی اندر داخل ہوے، ایک ایک کر کے بہت اطمینان سے ہم نے ملاقات کی، مصافحہ کیا، مفتی اشتیاق احمد صاحب قاسمی مدظلہ العالی نے ہمارا تعارف کرایا، حضرتؒ سب سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ حضرتؒ سے ناچیز کی ایسی ملاقات پہلی تھی اور بدقسمتی سے یہی آخری بھی۔ اس ملاقات کے لئے ناچیز استاذِ محترم حضرت مفتی اشتیاق احمد صاحب قاسمی مدظلہ العالی اور رفیقِ محترم مولانا سلطان احمد صاحب قاسمی کا تہِ دل سے شکرگزار ہے۔ فجزاھما اللہ احسن الجزاء۔ ناچیز کا دورۂ حدیث کا سال تھا، ایک موقع سے استاذِ محترم حضرت ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد صاحب قاسمی مدظلہ العالی نے حضرت الاستاذ قدس سرہ کے علمی مقام و مرتبہ کے حوالے سے ایک جملہ کہا تھا، اس کے ذکر کے ساتھ ناچیز اپنی بات ختم کرتا ہے۔ وہ جملہ تھا:

”جس طرح آج حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کو یاد کیا جاتا ہے اسی طرح حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری (قدس سرہ) وفات کے بعد یاد کئے جائیں گے“۔ مٹا کے ہستی وہ مثلِ دانہ، سجا گئے علم کا خزانہ تلاش جتنا کرے زمانہ ملیں گے کیوں؟ بے بدل گُہر تھے۔

❁...❁...❁

آہ! ایک روشن چراغ بجھ گیا

مولانا حماد نعمانی قاسمی
استاد دارالعلوم سلیمانیہ میرا روڈ

دنیا میں ہزاروں ایسی ہستیاں آئیں جنہیں قدرت نے عزت وشہرت سے نوازا، درجنوں ایسے لوگ آئے جنہیں زمانے نے نیک نامی کے اوج ثریا تک پہونچادیا، ایسی شخصیات بھی اس روئے زمین پر نمودار ہوئیں کامیابی وکامرانی نے جن کے قدموں کو چوما، انبیا، صلحا، اتقیا اور علمانے اپنے پیچھے ایسے انمٹ نقوش چھوڑے جو ان کے پس ماندگان کے لیے مشعل راہ ہیں۔

اسی چمنستان صلاح وتقوی اور علم وعمل کے ایک بیش بہا وبیش قیمت پھول دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مفتی سعید احمد پالن پوری تھے جو گذشتہ کئی سالوں سے طرح طرح کی بیماریوں سے پنجہ آزما، اور کئی قسم کی تکلیفوں سے نبرد آزما تھے، گاہے ان کے مرض کی خبر سوشل میڈیا کے ذریعے ملتی تو دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی، گاہے ان کے صحت یاب ہونے کی خبر کانوں سے ٹکراتی تو خوشی کی لہر جسم میں دوڑنے لگتی، ان کی صحت کے تئیں کبھی ہم امید کے سایے میں ہوتے تو کبھی ان پر مرض کا ایسا حملہ ہوتا جس کی وجہ سے ہم خوف کے چھاؤں میں ہوتے، اسی امید وبیم، آس ویاس اور صحت ومرض کے موج میں ان کی زندگی کی کشتی برابر ہچکولے کھارہی تھی کہ دفعۃً موت نے انہیں اپنے دامن صید میں گرفتار کرلیا، اور ۲۵ ؍ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بوقت چاشت ان کی وفات کی جانکاہ اطلاع ملی جس نے دل ودماغ، اعضاوجوارح کو مفلوج کرکے رکھ دیا، جسے سن کر ذہن میں تلاطم برپا ہوگیا، مسلسل کئی دنوں ان کی صحت کی خرابی اور مرض کے تشویشناک ہونے کی اطلاعات مل رہی تھیں جس سے رمضان کی خوشیاں اور اس

کی بہاریں بھی پھیکی لگنے لگی تھیں، انسان اسباب کا سہارا لے کر ہزاروں تدبیریں کرتا ہے تا کہ موت کے پنجۂ آہنی سے بچ سکے؛ لیکن تقدیر ایزدی اور ضابطۂ خداوندی: **اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدة**۔ ہر ایک تدبیر پر غالب آجاتی ہے، اور امیر وغریب، بادشاہ ورعایا اور عالم وجاہل سب کو اپنا شکار بنالیتی ہے۔

ہم دنیا کی رنگینیوں اور بوقلمونیوں میں ایسے الجھے رہتے ہیں کہ ہمیں دائیں بائیں مڑنے اور اوپر نیچے دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی، ہم اس ناقابل اعتبار دنیا میں ایسے مگن ہوجاتے ہیں کہ آخرت کا منظر ہمارے نگاہوں سے مخفی ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم مسافران آخرت کو بیدار کرنے اور اس دنیا کی حقیقی بے ثباتی کو بیان کرنے کے لیے ایسی برگزیدہ ہستیوں اور مرجع خلائق شخصیتوں کو اپنے پاس بلالیتے ہیں تا کہ **وما الحیاة الدنیا الا متاع الغرور** کا سبق ہمارے ذہنوں میں ازبر رہے، اور اس کی بے ثباتی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہوں۔

یہ دنیا اہل دنیا کو بسی معلوم ہوتی ہے نظر والوں کو یہ اجڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے۔ اس دنیا سے اخرت کی منزل کی طرف ہر ایک کو جانا ہے؛ لیکن بعض لوگوں کے جانے سے کسی فرد انجمن یا ادارے کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ پوری ملت کا نقصان ہوتا ہے، استاد مرحوم کی وفات ملت کے لیے عظیم خسارہ ہے جس سے صرف دیوبند یا گجرات ہی سوگوار نہیں ہوا بلکہ ان کے محبین ومخلصین پوری دنیا میں گہرے رنج وغم میں ڈوب گئے، ان کے جانے کے بعد علمی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا جس کا پورا ہونا مشکل ہے، ان کے رخصت ہوجانے سے علم وعمل کا قافلہ لٹ گیا اور مسند حدیث پر ویرانی سی چھاگئی ہے، ان کے انتقال سے ایسا گہرا زخم لگا ہے جس کا برسوں میں مندمل ہونا مشکل ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، قدرت نے ان میں طرح طرح کی صلاحیتیں ودیعت کردی تھیں، ہر فن میں انہیں ید طولی حاصل تھا، نحو وصرف، فقہ واصول فقہ، تفسیر واصول تفسیر، منطق وفلسفہ، علم

حدیث اور اصول حدیث تقریباً ہر موضوع پر ان کے گہر بار قلم سے کئی کتابیں منظر عام پر آئیں، اور ان کے کئی علمی رسالے شائع ہو، جنہیں علما وطلبا کے درمیان ایک نمایاں مقام حاصل ہوا، وہ زبردست محدث، بے مثال فقیہ، لاجواب واعظ اور شاندار مصنف تھے۔

درس وتدریس سے انہیں خاص شغف تھا، وہ کتابوں کے مطالعے کے نہایت شوقین اور رسیا تھے، ان کا درس طلبا میں نہایت مقبول تھا، الحمدللہ اس ناکارہ کو بھی ان سے بخاری جلد اول پڑھنے کا شرف حاصل ہے، انداز تدریس اس قدر دلکش تھا کہ ہر ایک پر ان کے درس کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا، ہر طالب علم ان کے درس کی خوب پابندی کرتا اگر کسی طالب علم سے ان کا درس فوت ہوجاتا تو وہ ایسا افسوس کرتا گویا کہ ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھ سے چھن گئی ہو، مسلسل ڈھائی گھنٹے طلبا کے درمیان جلوہ افروز ہوکر علم کا دریا بہاتے رہتے، بعض دفعہ ایسی طویل بحث کرتے کہ ایک سطر میں پورا وقت صرف ہوجاتا اور لگتا کہ کوئی علم کا چشمہ ابل رہا ہے، حدیث اور مشکل مقامات درس کی ایسی تشریح کرتے کہ ہر طالب علم اسے بآسانی سمجھ لیتا اور کسی طرح کی تعقید وابہام ان میں باقی نہیں رہتیں، گنجلک عبارت کی عمدہ توضیح کر کے سامعین وقارئین کو مطمئن کردیتے، گرمی ہو یا سردی، بارش ہو یا آندھی، تقریباً ہر موسم میں سائیکل رکشہ پر سوار ہوکر دارالحدیث کے صحن میں تشریف لاتے

اور طلبا پروانہ وار ان کے اردگرد جمع ہوجاتے پھر طلبا کے ساتھ دارالحدیث میں قدم رکھتے، سبق میں دیر حاضری یا غیر حاضری کو نہایت ناپسند کرتے تھے، ان کی آمد کے بعد درسگاہ میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی، گاہے گاہے دوران درس طلبا کو فکر معاش اور تجارت کی جانب بھی توجہ دلاتے، ان کی زندگی کا سب سے روشن کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بخاری وترمذی کی مکمل شرح اردو زبان میں لکھی، ہدایت القرآن کے نام سے ایک تفسیر کی کتاب بھی ترتیب دی، شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے تحریر کی ہے جو مقبول عام وخاص ہونے کے ساتھ ہر الماری کی زینت بنی ہوئی ہے، بالآخر علم وعمل کا یہ چراغ دارالعلوم دیوبند میں

۴۴ رسال روشن ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ اللہ تعالیٰ استاد مرحوم کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کرے اور ان کی قبر کو نور سے منور فرمائے۔

ملک سخن کا تاجور حال اٹھ گیا
دنیا سے اہل علم کا اقبال اٹھ گیا
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا کہہ کے
روئیں دنیا سے اعتبار مہ وسال اٹھ گیا

جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

مولانا ناصرالدین دیوبندی
فاضل دارالعلوم دیوبند

علم کا روشن ستارہ آفتاب سے زیادہ فیض پہنچانے والا چاند سے زیادہ چاندنی رکھنے والا پھولوں سے زیادہ مہکنے والا علم وعمل کا نیر تاباں بن کر سارے عالم پر جگمگانے والا، دیوبندیت کا حقیقی ترجمان اسلاف کی آواز باطل شکن، حق کو متعارف کرانے والا، میں کسی اور کی بات نہیں کر رہا ہوں میں بات کر رہا ہوں، اپنے حضرت الاستاذ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث صدر مدرس حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نوراللہ مرقدہ کی، جو جہد مسلسل محنت پیہم اور اپنی بے پایاں سعی سے علم کے اس مقام پر پہنچے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، حضرت نے نہ جانے کتنے تشنہ لبوں کی علمی پیاس کو بجھایا ہے اور کتنی علمی گتھیوں کو سلجھایا ہے، اور علمی حلقوں میں اپنا لوہا منوایا ہے۔

واقعی حضرت کی وفات پوری علمی دنیا کے کے لیے بڑا خسارہ اور پر نہ ہونے والا خلا ہے اللہ ہمیں حضرت کے علم کا قدرداں اور ان کا سچا جانشیں بنائے حضرت کی علمی خدمات کو قبولیت سے نوازے اور حضرت کو اپنی شایان شان جزا عطاء فرمائے۔ آمین

حضرت کی پہلی دید

حضرت کا نام تو شعور کے زمانے سے پہلے ہی سنتے آرہے تھے کہ ایک دارالعلوم کے بہت بڑے استاذ ہیں جو حضرت شیخ الادب رحمہ اللہ سے نسبت کی بنیاد پر اس گھر سے تعلق رکھتے ہیں حضرت وقفے وقفے سے نانی جان کے گھر تعاون فرمایا کرتے تھے جس کی وجہ سے ایک قلبی ربط پیدا ہو گیا تھا کہ اتنے بڑے مرتبہ پر ہو کر بھی اب بھی شیخ

الادب کی نسبت کا لحاظ فرماتے ہیں لیکن پہلی مرتبہ حضرت کا دیدار شعور کے زمانے میں ہوا یہ دیکھا کہ ایک بارعب باوقار استاذ صاحب ہیں جو آگے آگے ہیں اور طلبہ کثیر تعداد میں ان کے پیچھے گھبراتے ہوئے دوڑ رہے ہیں ایک طالب علم سے معلوم کیا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے جواب دیا ہمارے استاذ صاحب ہیں ناراض ہوکر جا رہے ہیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت کا درس میں طلبہ کی کم تعداد ہونے پر تنبیہ فرمانے کا طریقہ ہے جو ایک مرتبہ ہمارے سال بھی پیش آیا تھا۔ حضرت نے فرمایا تمہارا ترجمان تمہیں سدھاتا ہے لیکن تم سمجھتے نہیں ہو؛ کیونکہ ہمارا دورہ حدیث شریف کا سال ایسا جا رہا تھا کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید یہ ایسا پہلا سال ہو کہ حضرت الاستاذ تنبیہ فرمانے کے لیے درس چھوڑ کر نہ جائیں لیکن ایسا نہ ہوا اور حضرت کو کم تعداد پر ناگواری ہوئی اور بالآخر سال کے اختتام کے قریب ایک دن حضرت درس چھوڑ کر چلے گئے اس وقت ہمیں بھی وہ ہی گھبراہٹ محسوس ہوئی جو ان طلبہ کو ہو رہی تھی درس کی رونق حضرت کے درس کا انداز بالکل نرالا تھا، پابندی سے متعینہ وقت پر درس گاہ میں تشریف لاتے، آغاز سال میں درس شروع کرنے سے قبل حضرت اپنی زبان مبارک سے اسمائے حسنی کہلواتے اور یاد کراتے، یاد ہوجانے کے بعد جو طلبہ سنانا چاہتے تو عصر کے بعد گھر پر سننے کا اہتمام فرماتے، تفہیم میں آپ کی نظیر ملنا مشکل ہے، آپ مشکل سے مشکل مسئلہ کو پیچیدہ سے پیچیدہ عبارت کو بآسانی غبی سے غبی طالب علم کو سمجھا دیا کرتے تھے، آپ کی آواز انتہائی شیریں تھی دل چاہتا بس آپ کو سنتے رہو اور دوران درس آپ کا درود شریف پڑھنا درس کی رونق کو دوبالا کر دیتا تھا اور تمام طلبہ آپ کے ساتھ درود شریف پڑھتے جس سے ایک الگ ہی کیفیت کا حصول ہوتا اور درس کے اختتام پر آپ کا؛ لا الہ الا اللہ؛ کہنا ایک نرالا انداز تھا، جس کی ملاحت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ شخصی رعب اللہ تعالیٰ نے جہاں حضرت کو علمی و عملی دولت سے نوازا تھا وہیں اللہ جل شانہ نے آپ کو ایک الگ ہی رعب عطا کیا تھا کہ بڑے سے بڑا قد آور شخص آپ سے بلا تکلف گفتگو کرنے سے گھبراتا تھا۔

یہ آپ کے مزاج کے سخت ہونے یا آپ کے ناراض ہونے کے سبب نہ تھا بلکہ ایک قدرتی عطا تھی جو اللہ

اپنے خاص بندوں میں ودیعت فرماتا ہے، جس کی بنا پر ہر کسی کی آپ سے بات کرنے کی جرات نہ ہوتی اور جو آپ کو قریب سے جان جاتا وہ آپ پر جان نثار کرنے پر بھی راضی ہو جاتا ایسا رعب ہم نے اپنے بڑوں سے حضرت شیخ الادب نور اللہ مرقدہ کے متعلق سنا تھا کہ دل کے بہت نرم تھے لیکن اللہ نے ایک عجیب ہی رعب عطا کیا تھا کہ اس رعب کی بنا پر ان کو دارالعلوم کا باپ اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ کو دارالعلوم کی ماں کہا جاتا تھا حضرت کا تبسم فرمانا علمی وعملی دولت شخصی رعب اور اور لہجہ کی ملاحت وشیرینی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مسکراہٹ میں بھی عجب ہی جاذبیت اور کشش رکھی تھی ہم دوران درس یا مجلس میں یا آپ کے خطاب فرمانے کے وقت اس بات کے خواہاں اور دلدادہ رہتے کہ حضرت تبسم ریز ہوں حضرت کا چونکہ ایک رعب تھا اس لیے حضرت کوئی لطیفہ سناتے وقت پہلے خود مسکراتے جس سے سامعین کو بھی ہنسنے کا موقع مل جاتا حضرت اس میں بھی ایک ممتاز انداز رکھتے تھے۔

دوران درس کی کچھ حسین یادیں

ایک مرتبہ حضرت الاستاذ نے ایک طالب علم سے فرمایا کہ میں لوگوں کو ان کے علم سے جانتا ہوں مگر تم پہلے ایسے شخص ہو جس کو میں اس کی بے وقوفی اور نادانی کی وجہ سے جان گیا ہوں یہ حضرت کا مزاح کا انداز تھا اور اس سے آپ کے علمی ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ اشخاص کو ان کی علمی صلاحیتوں کی بنیاد پر جانتے اور یاد رکھتے تھے حضرت سے عصا لینے میں پہل کرنا حضرت جب درس میں تشریف لاتے تو خود طلبہ کو کھڑے ہو کر سلام کیا کرتے تھے اور آپ کی آمد پر طلبہ کا کھڑا ہونا آپ کو ناگوار محسوس ہوتا تھا آپ نے طلبہ کو اس سے منع فرمایا کہ میرے آنے پر کوئی طالب علم کھڑا نہ ہوا کرے اور آنے والا سلام کیا کرتا ہے۔ ہم حضرت الاستاذ کے داہنی جانب تپائی پر بیٹھا کرتے تھے اور کھڑے ہو کر سلام کرتے اور حضرت سے عصا لینے میں پہل کرتے لیکن حضرت کے تمام طلبہ کو قیام سے منع فرمانے کے بعد طلبہ نے ہمیں بھی منع کیا کہ تم بھی اپنی جگہ پر ہی رہا کرو حضرت نے منع فرمایا ہے۔ ہم نے کہا یہ حکم ہمارے لیے نہیں ہے یہ ہمارا قلبی جواب تھا۔ پھر حضرت الاستاذ تشریف لائے ہم کھڑے ہوئے حضرت سے

عصا لیا حضرت مسند پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا یہ لوگ راستے میں بیٹھے ہیں اس لیے یہ کھڑے ہو سکتے ہیں۔

اب تو حضرت کی جانب سے اجازت مل گئی تھی اور کوئی ناراضگی و ناگواری بھی نہیں ہوئی ہمیں بہت خوشی ملی کہ پورے سال یہ سلسلہ جاری رہے گا ہم حضرت کے دست مبارک سے کھڑے ہو کر عصا لیں گے اور یہ سعادت ہمیں ہی حاصل رہے گی اور الحمدللہ ایسا ہوا ایک مرتبہ آپ درس میں وقت مقررہ سے پہلے حاضر ہو گئے اور طلبہ اس وقت درسگاہ میں کم موجود تھے اور آپ یہ گمان کر رہے تھے کہ میں وقت پر آیا ہوں اور طلبہ موجود نہیں ہیں آپ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ایسا تعلیم کے گھنٹوں میں تبدیلی کے سبب ہوا تھا لیکن جب اگلے دن آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ درس میں تشریف لائے اور آپ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ میں ہی پہلے آ گیا تھا اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود آپ کا طلبہ کے سامنے بلا جھجھک اس بات کو بیان کرنا آپ کی حق پسندی اور سادگی کی روشن دلیل ہے اور بھی بہت سی باتیں اور یادیں ہیں جنہیں تحریری شکل نہ دے سکا۔

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

❁...❁...❁

فقیہ النفس، محدّثِ کبیر حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ

کی ذرّہ نوازیوں کی ایک جھلک

مولانا محمد سعادت اللہ خان قاسمی
استاذ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم، آمبور

مدرسۂ رفیق العلوم، آمبور میں دورانِ طالبِ علمی ہم اپنے حضراتِ اساتذۂ کرام سے بارہا حضرت رحمہ اللہ کی درس وتدریس، جاہ جلال، علمی وعملی قابلیت ومقبولیت کا تذکرہ سنتے تو دل آپ کی عظمت ومحبت سے بھر جاتا اور بڑی تمنا ہوتی کہ کب حضرت والا کی تشفی بخش زیارت نصیب ہوگی اور کب ہمیں دارالعلوم دیوبند میں آپ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل ہوگا، اسی درمیان غالباً ۲۰۰۵ء میں شہرِ آمبور کی عظیم المرتبت شخصیت حضرت الاستاذ مفتی محمد صلاح الدین صاحب قاسمی زید مجدہم کے زیرِ انتظام ایک عظیم الشان دوروزہ اجلاس حضرت رحمہ اللہ کی صدارتِ باسعادت میں بنام ''ائمہ اربعہ کانفرنس'' منعقد ہوا، جن میں ملک کے مؤقر ترین علمی شخصیات مدعو تھیں، ہم طلبہ ناظمِ مدرسہ حضرت مفتی سبیل احمد صاحب زید مجدہ، خلیفہ ومجاز حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہیؒ کی اجازت سے حضرت رحمہ اللہ کی زیارت، ملاقات ودرخواستِ دعا برائے داخلہ دارالعلوم دیوبند کا شوق لے کر دیوانہ وار کانفرنس میں حاضر ہوئے، زیارت کے لئے بے تاب ہو رہے تھے، اتنے میں حضرت رحمہ اللہ اپنے پورے جاہ وجلال خوبصورت وپُرنور روئے محترم کے ساتھ سفید لباس میں ملبوس انتہائی باوقار انداز میں اسٹیج پر رونق افروز ہوئے، ایسے معلوم ہو رہا تھا کوئی فرشتہ ہے جو ہم سب کے درمیان اُتر آیا ہے، غرض ایکہ اُس نشست کے اختتام پر ہم سب ساتھی جو ۹/ تھے بہت ڈرتے ڈرتے اسٹیج پر گئے حضرت رحمہ اللہ کسی سے محوِ

گفتگو تھے، ہمارے قریب جانے پر ہماری طرف متوجہ ہوئے، ہم میں سے ایک ساتھی نے ڈرتے ہوئے کہا ہم سب مدرسۂ رفیق العلوم میں زیرِ تعلیم ہیں، آئندہ سال دورۂ حدیثِ شریف کے لئے دارالعلوم دیوبند آنے کی تیاری کررہے ہیں، حضرت والا سے داخلہ کے لئے دعاؤں کی گذارش ہے، سن کر پہلے تو حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا ،صرف دعا سے کام نہیں چلے گا محنت بھی بہت ضروری ہے، خوب پڑھ کرآؤ، اچھا امتحان دو، توان شاء اللہ داخلہ ہوگا اور کامیابی کی دعا دیتے ہوئے نشست گاہ سے اُٹھ گئے۔ بعدہٗ بحمد اللہ حضرت رحمہ اللہ کی نصیحت کے مطابق ہم محنت میں لگے رہے، دارالعلوم گئے، امتحان دیا، اللہ تعالیٰ کا کرم کہ داخلہ نصیب ہوا جو کہ کسی بیش بہا دولت سے کم نہیں تھا، اسباق شروع ہوئے اور پوری پابندی اور شوق وذوق سے حضرت رحمہ اللہ سے استفادہ کے ساتھ ساتھ جی بھرکر آپ کی زیارت بھی ہوتی رہی۔

خدمتِ بابرکت میں حاضری

حضرت رحمہ اللہ کی بارعب شخصیت کے پیشِ نظر دارالعلوم میں بس دور دور سے ہی زیارت ہوتی، کبھی قریب جانے یا بات کرنے کا موقعہ نہیں ملا، بعدِ عصر دیگر طلبہ کی طرح حضراتِ اساتذۂ کرام کی خدمت میں حاضری کا معمول تھا، ایک دوست کی معیت میں حضرت رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی کئی مرتبہ حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، حضرت رحمہ اللہ مطالعہ یا لکھنے میں مصروف رہتے، وہاں بھی بس عظمت ومحبت کے ساتھ زیارت پر ہی اکتفا کرنا پڑتا، ایک دن میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرانے سے آواز بلند ہوئی، حضرت رحمہ اللہ نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور مزاحاً فرمایا ''کیوں بھئی کیا توڑ رہا ہے'' تھوڑی دیر کے لئے پیروں تلے زمین کھسک گئی میں کچھ نہ بول سکا، اتنے میں قریب بیٹھے طالبِ علم نے میری وکالت کی، اُس کے بعد بھی کبھی کبھی حاضر ہوتا رہا لیکن بات چیت یا شناسائی نہیں تھی اور حضرت رحمہ اللہ کے یہاں یہ بات اتنی آسان بھی نہیں تھی، بس دیکھتے ہی دیکھتے دارالعلوم سے جدائی کا وقت آگیا، اور اپنے جلیل القدر حضراتِ اساتذۂ کرام زیدمجدہم کی قیمتی نصائح ودعائیں اوردینِ متین کی

خدمت کا جذبہ لے کر اپنے شہرِ کولار (کرناٹک) چلا آیا۔

ذرہ نوازی کے مواقع

فراغت کے بعد اللہ رب العزت کی توفیق و حضرت الاستاذ مفتی محمد صلاح الدین صاحب قاسمی زید مجدہم کی نظرِ عنایت وانتخاب سے جنوبی ہند کے ممتاز شہر ''آمبور'' میں خدمت کی سعادت ملی، جہاں وقتاً فوقتاً حضراتِ اکابرین کی آمد ہوتی رہتی ہے، اتفاق دیکھئے ہماری مسجد کے متولی جناب الحاج ناٹامکار فاروق احمد صاحب ؒ کا اکابرین خصوصاً حضرت رحمہ اللہ سے بہت ہی مخلصانہ ووالہانہ تعلق تھا، حضرت رحمہ اللہ جب بھی جنوبی ہند تشریف لاتے تو حاجی صاحب بڑی محبت سے آمبور تشریف لانے کی دعوت دیتے، حضرت رحمہ اللہ اُسے شرفِ قبولیت عطا فرماتے اور حضرت الاستاذ مفتی صاحب کی زیرِ نگرانی شہر میں کئی جگہ وعظ ونصیحت کا نظام بنتا اور قیام حاجی صاحبؒ کے مکان پر ہی رہتا، چونکہ بندہ کی خدمتِ امامت وخطابت حاجی صاحب کی تعمیر کردہ ''مسجدِ ہاشم'' میں ہے حضرت رحمہ اللہ بوقتِ قیامِ آمبور اکثر نمازیں وہیں پر ادا فرماتے، سچی بات ہے کہ حضرت رحمہ اللہ پیچھے کھڑے ہوں اور بندہ امامت کرارہا ہوتو پسینے چھوٹ جاتے، بعض مرتبہ نماز میں پیش آمدہ غلطیوں کی بروقت اصلاح فرمائی، ایک مرتبہ بعدِ نماز جہراً دعا کرنے پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ دعا سری ہونی چاہئے اور اس کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ اسی پر مدلل اور جامع خطاب فرمایا اور عموماً بندہ کو ''امام صاحب'' سے مخاطب فرماتے۔

دست بوسی حضرتؒ کو پسند نہیں تھی

ایک مرتبہ حضرت رحمہ اللہ مسجدِ ہاشم تشریف لائے، کار سے اُترتے ہوئے میں نے مصافحہ کیا اور بڑی ہمت کر کے ہاتھ کا بوسہ لینے کے لئے جُھک ہی رہا تھا کہ فرمایا یہ کیا ہے؟ (شاید حضرتؒ کو دست بوسی پسند نہیں تھی) اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''بوسہ دینا ہو تو یہاں دو'' اور اپنی پیشانی مبارک میرے قریب کردی، بڑی ہمت کر کے اُس پُرنور پیشانی کو بوسہ دینے کے شرف سے مشرف ہوا۔

ایک لطیفہ

ایک مرتبہ رات کا قیام مسجد ہی میں تھا، صبح نماز کے لئے وضو سے فارغ ہوکر کمرے میں تشریف فرما تھے، میں نے بہت ڈرتے ڈرتے گذارش کی کہ حضرت بعدِ فجر مسجد میں کچھ نصیحت فرما دیں تو فرمایا ''میری تو ابھی صبح ہی نہیں ہوئی میں سمجھا نہیں، میری ناسمجھی کو حضرت نے سمجھ لیا پھر مُسکرا کر فرمایا کہ ''میں جب تک پان نہ کھالوں اور چائے نہ پی لوں میری صبح ہی نہیں ہوتی'' بحمد اللہ چائے اور پان تیار تھا پیش کیا گیا، فارغ ہوکر مسجد تشریف لے گئے بعدِ نمازِ فجر جامع خطاب فرمایا۔

سن ۲۰۱۷ء میں سفرِ بنگلور کے موقع پر

بروزِ جمعہ، ہفتہ واتوار ۸، ۷، ۶/ اکتوبر ۲۰۱۷ء میں جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور میں منعقدہ عظیم الشان جلسۂ دستار بندی کو بھی اپنی تشریف آوری سے آپ رحمہ اللہ نے زینت بخشی تھی، اُس موقع پر بھی

حضرتؒ کے معتمد، ہمیشہ جنوبی ہند کے پورے سفر میں سایہ کی طرح ساتھ رہنے والے جناب الحاج حسن احمد صاحب اور الحاج فاروق احمد صاحبؒ کی دعوت و درخواست پر آپؒ کی بروزِ جمعہ ہی مدراس ایر پورٹ سے آمبور تشریف آوری ہوگئی تھی، جامع مسجد آمبور میں خطاب جمعہ سے آپؒ نے ایک بڑے مجمع کو مستفیض فرمایا، اِس سفر میں حضرتؒ کے ساتھ آپ کے ہونہار فرزندِ ارجمند حضرت مفتی حسین احمد صاحب پالنپوری زید مجدہم بھی تھے، بعدِ جمعہ حاجی صاحبؒ کے مکان میں تناولِ طعام کے بعد کچھ دیر آرام کر کے بعدِ عصر بنگلور کے لئے نکلنے کا نظام بن رہا تھا۔

حضرت رحمہ اللہ سے میری درخواست

آمبور سے بنگلور کے لئے دو راستے ہیں، ایک نیشنل ہائی وے دوسرا سنگل راستہ شہرِ پرنامبٹ کی طرف سے

۔۔۔اور اُسی راستہ پر میرا شہر کولار پڑتا ہے اور وہاں سے بنگلور صرف ۶۰ رکلومیٹر ہے اور دونوں راستوں سے بنگلور کے لئے لگ بھگ اتنی ہی مسافت ہے، اِس لئے میں نے حضرت رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ اُس دوسرے راستے سے بنگلور تشریف لے جائیں، حضرتؒ نے فرمایا کہ حسن بھائی اور حاجی صاحبؒ سے مشورہ کرلو، وہ تیار ہوں تو چلیں گے، بحمد اللہ وہ دونوں بھی تیار ہو گئے، میری نادانی یہ ہوئی کہ حضرتؒ کو کولار لے جانے کے شوق میں نہ مجھے حضرتؒ کی نزاکتِ طبعی یاد رہی اور نہ ہی مجھے یاد آیا کہ وہ راستہ کچھ ٹھیک نہیں ہے اور وہ بھی رات کے وقت جانے میں مزید دِقّت ہوسکتی ہے۔

کولار چلنے کے لئے راضی ہونے کی وجہ

راضی ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے حضرت رحمہ اللہ کو بتایا کہ حضرت والا! ہمارے نسبتی برادر مولانا سید یوسف صاحب قاسمی زید مجدہٗ کولار کی صدارت ونظامت میں ہم کچھ ساتھی جن کی تعداد ۹ رہے، بنام ''المحاسن'' ایک ٹرسٹ بنایا ہے، جس کے تحت ایک ایکڑ جگہ خرید کر ایک مدرسہ بنام جامعہ حضرت انعام الحسنؒ قائم کیا ہے، ٹرسٹ کے تحت مزید کچھ رفاہی خدمات بھی جاری ہیں، جن میں قابلِ ذکر یہ ہے کہ کولار میں پانی کی بہت قلت ہے، زمین میں ایک ہزار فٹ میں بھی پانی نہیں ہے، پھر بھی بحمد اللہ مدرسہ کی زمین پر ہی ذمہ داروں نے ایک ''بورویل'' لگایا جس میں ۱۵۶۰ رفٹ میں بڑی فراوانی سے میٹھا پانی ملا، بحمد اللہ مدرسہ کی جانب سے روزانہ ۲۰۰۰ رمکانات کو بلاتفریقِ مذہب وملت پانی دیا جاتا ہے، بندہ کو ٹرسٹ میں بحیثیت سکریٹری خدمت کا موقع دیا گیا ہے، میں نے دوبارہ گذاش کی کہ چونکہ وہ راستہ ہی میں پڑتا ہے حضرت والا وہاں برکت کی دعا فرما کر بنگلور تشریف لے جائیں۔

کولار کے لئے روانگی

بحمد اللہ بعدِ عصر کولار کے لئے روانہ ہوئے، حضرت رحمہ اللہ حضرت مفتی حسین صاحب زید مجدہٗ، حاجی

فاروق احمد صاحبؒ، حاجی حسن احمد صاحب اور بندہ گاڑی میں موجود تھے، کچھ دور جانے کے بعد راستہ کی خرابی کی وجہ سے گاڑی اُچھل کود کرنے لگی، ستم ایکہ اندھیرا اور بالائے ستم ایکہ زودار بارش بھی، حضرت رحمہ اللہ نے کچھ دیر صبر فرمایا، بعدہٗ بہت ناراض ہوئے ڈانٹا کہ جب معلوم ہے کہ راستہ خراب ہے تو لانے کی ضرورت کیا تھی؟ اور مُجھ سے بات بھی نہیں کی لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی مجھے تو بس اس بات پر بے حد ندامت وشرمندگی ہورہی تھی اور میں دل ہی دل میں خود کو ملامت کرر ہا تھا کہ کیوں میں نے میرے پیارے حضرت کو اتنی تکلیف دی ، کیوں مجھے راستہ کی خرابی یا حضرتؒ کی نزاکتِ طبعی یا صحت وعافیت کا خیال نہیں آیا، خیر اللہ کرکے دو گھنٹے میں کولار پہنچے، نہیں معلوم حضرتؒ نے گاڑی میں بیٹھ کر کیا دعا مانگی کہ اُس کے کچھ ہی دنوں بعد اُس راستہ کی مرمت شروع ہوگئی، جوکہ برسوں سے اُسی حالت میں پڑا ہوتھا، بحمداللہ آج وہ راستہ ایک وسیع عریض خوبصورت شاہ راہ کی شکل میں ہے۔

کولار میں۔۔۔

بحمداللہ مدرسہ پہنچے، ذمہ دارانِ مدرسہ طلبہ، شہر کے کچھ علماء کرام وعوام استقبال کے لئے موجود تھے... حضرت رحمہ اللہ مدرسہ میں تشریف لائے، مختصر مگر جامع خطاب فرمایا اور ذمہ دارانِ مدرسہ کی خدمات خصوصاً پانی کی خدمت کو سراہا اور نصیحت کی کہ رفاہی خدمات انسانیت کی بنیاد پر ہونا چاہئے، مسلمان، غیر مسلم سب کی خدمت کرو اور سب کو پانی دو بعدہٗ سبھی کے خصوصاً مدرسہ کے حق میں اپنے پرسوز لہجہ میں بہترین دعا فرمانے کے بعد بنگلور تشریف لے گئے اور میں کولار ہی میں رہ گیا۔

میری حالت اور خوشخبری

میری دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہوگئی تھی مغموم بھی تھا اور شرمندہ بھی اور حضرت رحمہ اللہ کی صحت وعافیت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرر ہا تھا، جامعہ مسیح العلوم کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے حضرت رحمہ اللہ

کے ساتھ حضرت مفتی حسین صاحب زید مجدہم، حاجی فاروق صاحبؒ حاجی حسن احمد صاحب بنگلور تشریف لے گئے اور دو دن بھی قیام حاجی صاحبؒ کے مکان میں ہی میں تھا، اجلاس کے اختتام پر حضرت رحمہ اللہ کو رخصت کر کے حاجی صاحبؒ آمبور تشریف لائے، ایک دو دن بعد مجھ سے ملاقات کی، میں نے اُن سے بھی معذرت چاہی تو فرمایا کہ آپ پریشان نہ ہوں، کولار سے نکلنے کے کچھ دیر بعد حضرت رحمہ اللہ نے مجھ سے فرمایا ''حاجی صاحب'' میں آپ کے امام صاحب پر اِس لئے ناراض ہوا کہ تا کہ اُس کی تربیت ہو اور وہ ابھی سے یہ سب سیکھے، ورنہ میرے دل میں کچھ نہیں ہے، رہی بات اُس کے کام کی وہ بہت اچھا ہے، یہ سن کر مغموم دل کو تسلی ملی، حضرت رحمہ اللہ کے حق میں دعائے خیر کرتا رہا اور بہت سوچا کہ دیوبند حضرت کی خدمت میں ایک معافی نامہ لکھوں لیکن ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت رحمہ اللہ کی دوبارہ تشریف آوری

بروزِ اتوار ۱۷/اپریل ۲۰۱۹ء جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور ہی میں ''جلسۂ ختمِ بخاری شریف'' میں حضرتؒ کی تشریف آوری کی خوشخبری ملی، حاجی فاروق صاحبؒ کو معلوم ہوا تو اُنہوں نے حسن بھائی کے ذریعہ ۱۸/اپریل بروزِ پیر آمبور تشریف آوری کی دعوت دی، جسے حضرت رحمہ اللہ نے شرفِ قبولیت سے نوازا، لہٰذا بروزِ پیر کی صبح غالباً صبح ۱۲/بجے حاجی حسن صاحب کی معیت میں حضرت رحمہ اللہ آمبور تشریف لائے، ظہرانے اور آرام کا نظام حاجی صاحبؒ کے کارخانہ کے گیسٹ ہاؤس میں تھا، استقبال کے لئے میں بھی پہنچا، لیکن میرے دل کی کیفیت اُس وقت عجیب وغریب تھی، ڈر بھی رہا تھا اور شرمندہ بھی کہ نہیں معلوم کہ کیا بولیں گے، یا مجھ سے ناراض ہوں گے۔ لیکن میں قربان جاؤں میرے پیارے حضرتؒ کہ گاڑی سے اُتر کر حاجی صاحب وغیرہ سے ملاقات کے بعد مجھ پر نظر پڑی تو مسکراتے ہوئے فرمایا خیریت سے ہو امام صاحب'' اور معانقہ کے لئے اپنی باہیں کھول دیں یہ فرماتے ہوئے کہ ''آجا بھئی'' گویا ہیرے جواہرات سامنے رکھ کر کوئی کہہ رہا ہو کہ سمیٹ لو اور میں نے سمیٹ لیا یعنی آگے بڑھ کر

معانقہ کیا، واقعی اُس وقت دل کو ایک عجیب تسلی وٹھنڈک محسوس ہوئی، بعدہٗ اندر تشریف لے گئے حضرتؒ ہی کے ساتھ کھانا ہوا، اُس کے بعد بوقتِ آرام کچھ دیر پیر دبانے کی خدمت کے بھی آپؒ نے خوش نصیب لمحات عطا فرمائے، بعدِ عصر مسجدِ شمس تشریف لے گئے، بعدِ نماز مغرب مسجدِ ہاشم میں ایک بڑے مجمع کو اپنے جامع خطاب سے مستفیض فرمایا، مکمل وقت اِس طرح محسوس کرایا کہ گویا کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔

حادثہ فاجعہ

کسے معلوم تھا اِس سفر کے صرف دو مہینے بعد ہی حضراتِ علماء کرام اور صلحاءِ عظام، اکابرینِ دیوبند خصوصاً آپؒ سے بے انتہا محبت کرنے والے، دل وجان آپ پر قربان کردینے والے، شہرِ آمبور کی ممتاز وفیاض شخصیت معروف وعظیم تاجر''حاجی فاروق احمد صاحب رحمہ اللہ ۹ر جون ۲۰۱۹ء بروزِ اتوار اپنے مالکِ حقیقی سے جاملیں گے، اِس اندوہناک خبر سے شہر بیرونِ شہر بلکہ پورے ملک میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی، حضرتؒ نے خود حاجی صاحبؒ کے لئے جو تعزیت نامہ لکھا اُس میں فرمایا ہے''حاجی فاروق احمد صاحب عجیب صفات سے آراستہ تھے، جس نے اُن کو نہیں دیکھا وہ اُن کی خوبیوں کا اندازہ نہیں کرسکتا، علم وعلماء سے اُن کا تعلق رسمی نہیں قلبی تھا''اللہ رب العزت حاجی صاحبؒ کی مغفرت فرمائے، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ وارفع مقام نصیب فرمائے، آمین۔

جلسۂ اصلاحِ معاشرہ میں تشریف آوری

بروزِ پیر ۲۸ر اکتوبر ۲۰۱۹ء حاجی صاحب کے فرزندِ ارجمند جناب فضیل احمد صاحب کی دعوت پر حضرتؒ بمقام جامع مسجد آمبور ایک عظیم الشان اجلاس''بعنوان اصلاحِ معاشرہ''میں رونق افروز ہوئے، اس موقع پر اُنہیں کی دعوت پر ملک کی مایہ ناز شخصیت حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری زید مجدہٗ کی بھی تشریف آوری ہوئی تھی، دونوں بزرگوں نے''بعنوان اصلاحِ معاشرہ''جامع اصلاحی وعلمی خطاب سے سبھی کو مستفیض فرمایا۔

حضرتؒ کی ذرہ نوازی کا ایک اور واقعہ

اِس تشریف آوری کے موقع پر قیام جناب فضیل احمد صاحب کے مکان میں فرمایا، نمازِ فجر کے موقع پر میں بھی حاضرِ خدمت ہوا، پہلے ہی سے وہاں حضرت مفتی محمد صلاح الدین صاحب قاسمی زید مجدہم، حسن بھائی و دیگر ایک دو حضرات موجود تھے، ابھی جماعت نہیں کھڑی تھی، میں گیا تو حضرت مفتی صاحب زید مجدہٗ نے نمازِ فجر کی امامت کرانے کا حکم دیا، مصلیٰ پر گیا تو پاؤں کانپ رہے تھے، ہمت کر کے نماز مکمل کی، نظرِ شفقت مجھ پر تھی، نماز مکمل کر کے ادب کی بنا پر میں پیچھے جا کر بیٹھ گیا، حضرت رحمہ اللہ نے اشارۃً قریب آ کر بیٹھنے کا حکم فرمایا، تعمیلِ حکم کے بعد فرمایا: قرأت اچھی کر لیتے ہو لیکن کہہ کر ایک غلطی کی اصلاح فرمائی۔۔۔ چائے نوش فرماتے ہوئے کولار کے مدرسہ کے بارے میں پوچھا، میں نے کہا الحمد للہ ٹھیک چل رہا ہے،، پوچھا کتنے طلبہ ہیں؟ کچھ عمارت و مارت بنی کی نہیں ؟ پانی کی خدمت جاری ہے؟ میں نے ادب سے جواب دیا۔۔۔جی۔۔۔فرمایا پانی دو اور خوب دو۔۔۔ اتنے میں قریب تشریف فرما حضرت الاستاذ مفتی صاحب زید مجدہٗ نے فرمایا کہ حضرت! یہ وہاں کے سکریٹری ہیں، تو سنتے ہی برجستہ حضرت مفتی صاحب سے فرمایا ’’چابی اپنے ہاتھ میں ہے‘‘ اِس جملہ کا مطلب میں فوراً نہیں سمجھ سکا بعدہٗ غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی بھی آدمی کسی ادارہ کا سکریٹری ہو وہ کُل اختیارات کا مالک ہوتا ہے، اِس طرح سے ازخود حالات پوچھ کر ہمت افزائی فرمائی۔

ایک خوشخبری ملی لیکن افسوس کہ۔۔۔

لاک ڈاؤن نافذ ہونے سے کچھ دن پہلے ایک رفیق نے بتایا کہ امسال مدرسۂ مفتاح العلوم کے جلسۂ دستار بندی میں حضرتؒ رونق افروز ہونے والے ہیں، سن کر خوشی کی انتہا نہیں رہی، ارادہ ہو کہ ضرور جلسہ میں شریک ہو کر ایک اور مرتبہ زیارت و استفادہ کی سعادت پاؤں، لیکن افسوس کہ ساتھ ہی ساتھ طبیعت کی ناسازی کی خبریں بھی ملنے لگیں، دارالحدیث کے آخری سبق کے منظر سے تو دل دہل گیا، چونکہ حضرتؒ بغرضِ علاج فوراً ممبئی تشریف لے

گئے اِس لئے کچھ اطمینان تھا، ان شاء اللہ بہت جلد صحت یاب ہوکر دوبارہ اپنے فیوض کے دریا بہائیں گے اور ایسا ہوا بھی کہ رمضان المبارک کے شروع میں ماشاء اللہ آپ کے علمی وتحقیقی بیانات نشر ہونے لگے، لیکن پھر اچانک طبیعت کی ناسازی کی خبر پھیلنے لگی، ہر جگہ متعلقین، تلامذہ اور مسلمانوں میں ایک عجیب بے چینی سی تھی، ہر کوئی حضرتؒ کی صحت وعافیت اور عمر میں برکت کے لئے اللہ رب العزت کے حضور بہت گڑگڑایا لیکن ہوا وہی جو اللہ رب العزت کو منظور تھا کہ اُس نے اپنے اس نیک بندے کو رمضان المبارک کے ان بابرکت وپرفضیلت ایام ہی میں اپنے پاس بلالیا، اُس وقت آپ کے متعلقین، تلامذہ کی حالت ناقابلِ بیان تھی کہ ہر کوئی پنے روحانی باپ کو کھو کر آبدیدہ تھا اور بارگاہِ الٰہی میں دست دراز کر کے یہ التجا کر رہا تھا کہ یا اللہ! ہمارے حضرت کی مغفرت فرما، اُن کے درجات بلند فرما، اپنا قرب اُنہیں نصیب فرما، اُن کی جملہ تصنیفات کو اُن کے حق میں صدقۂ جاریہ بنا، متعلقین، تلامذہ خصوصاً پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرما اور دارالعلوم دیوبند کو نعم البدل عطا فرما، اور ہمارے تمام موجودہ اکابرین حضراتِ اساتذہ کرام کی عمر صحت وعافیت میں خوب برکت عطا فرما۔ آمین۔ ثم آمین۔

عالم اسلام ایک گوہر نایاب سے محروم

مولانا محمد معین الدین ندوی قاسمی
استاذ جامعہ نعمانیہ، ویکوٹہ، آندھرا پردیش

شہر استبداد کے دیوار و در ڈھاتا رہا
گم شدہ اسلاف کی تصویر دکھلاتا رہا
ان کے کمالات و محاسن میں جواب اس کا نہیں
اس قبیلے میں کوئی بھی ہم رکاب اس کا نہیں

آج بتاریخ ۲۵ ؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ ؍مطابق ۱۹ ؍مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت چاشت عالم اسلام کے عالمی دینی درسگاہ مادر علمی دار العلوم دیو بند کے صرف شیخ الحدیث وصدر المدرسین، یا برصغیر کے ایک چوٹی کے عالم دین ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے عبقری شخصیت، قدوۃ المفسرین، زبدۃ العارفین، رئیس المحدثین، استاذ الاساتذہ، عالم ربانی، علماء سلف کے سچے پیروکار، ان کی سیرت کا بہترین نمونہ، غیرت وحمیت اسلامی کا علمبردار، مجسمہ علم وعمل، اصول وضوابط کی پاسداری میں یکتائے زمن، اخلاص وللّٰہیت اور خشیت ایزدی کا پیکر، شارح بخاری وترمذی، علوم ولی اللہی کے سچے جانشین، موسی وہارون علیہما السلام کے ایک عمدہ نمونہ، مردم شناس و مردم ساز، مربی جلیل، ہزاروں کے سائبان شفقت، **لا یخافون لومۃ لائم** کا خوگر، بھاری اعمال ناموں والی شخصیت، ترجمان اہلسنت والجماعت، جامع الکمالات والمحاسن، میرے بخاری شریف کے چھ اساتذۂ کرام میں سب سے محبوب استاذ، استاذ محترم حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ اپنے پیچھے ہزار ہا علماء، صلحاء اور طلباء کو روتے بلکتے چھوڑ کر اس فانی دنیا سے عالم عقبی کی طرف روانہ ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون، ان اللہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل شئ عندہ باجل مسمی

حضرت قدس سرہٗ کا سانحہ اس قدر شاق وسنگین ہے کہ اپنی نوعیت میں صرف ایک حادثہ نہیں بلکہ اس کے ضمن میں صدہا سانحات مضمر ہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

شورش کاشمیری مرحوم نے یہ اشعار شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا تھا۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے، افق پہ مہر مبیں نہیں ہے
تیرے جدائی سے مرنے والے وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے
اتر گئے منزلوں کے چہرے، امیر کیا، کارواں گیا ہے
مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو ان گنت خوبیوں سے نواز تھا، آپ انتہائی درجہ کے محنتی استاذ تھے، آپ رح افتاء سے فراغت کے بعد قرآن پاک حفظ کیا، اس سے آپ کا محنتی ہونا صاف ظاہر ہے، آپ کا درس کم گو لیکن معنی خیز اور حقائق ومعارف سے پر ہوا کرتا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالی نے آپ کو ایک ایسا ملکہ دیا تھا جو اس دور میں نایاب نہیں کمیاب ضرور ہے وہ ”ملکہ افہام وتفہیم“ ہے۔

آپ کا درس طالبان علوم نبوت میں بے پناہ مقبول تھا، جس شوق وذوق سے طلبہ آپ کے درس میں شریک ہوتے وہ قابل دید ہوا کرتی۔

آپ گنجلک وپیچیدہ مسائل کو بھی اس طرح آسان اور دل کش پیرائے میں تشریح کرتے کہ ہر طالب علم اسے

بآسانی سمجھ لیتا۔ آپ سالہا سال حدیث پاک کا درس دیتے رہے، آپؒ اس دور قحط الرجال میں فن حدیث کے امام تھے۔

الحمدللہ! آپ کے لائق وفائق اور قابل صد تعریف فرزند ارجمند حضرت مولانا احمد حسین صاحب قاسمی دامت برکاتہم نے آپ کی دروس کو آپ رح کی موجودگی میں ہی کتابی شکل دے دی، سنن ترمذی کی شرح "تحفۃ الالمعی" اور صحیح بخاری کی "تحفۃ القاری" یہ دونوں شروحات اس قدر مقبول ہوئیں کے شاید اردو میں "بخاری و ترمذی" کی جتنی شروحات ہیں ان تمام میں سب سے زیادہ اہل علم کے نزدیک یہی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، وجہ یہی ہے کہ اس میں افہام وتفہیم کا جو نرالا انداز ہے اس سے دیگر شروحات خالی ہیں۔

مفتی صاحب قدس سرہ کی شرح سے متعلق ایک علمی بات ملاحظہ فرمائیں!

احقر سن ۲۰۱۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شریک عالیہ رابعہ (دورہ حدیث) تھا۔ صحیح مسلم کا درس استاذ محترم حضرت مولانا عبدالرشید ندوی دامت برکاتہم (مترجم: فضائل اعمال، عربی) کے پاس تھا، کسی حدیث کے ذیل میں حضرت نے فرمایا: میں اردو شرح نہیں دیکھتا ہوں، اس حدیث کے ذیل میں ایک مفہوم میرے ذہن میں یہ آرہا تھا، لیکن یہ بات مجھے عربی کے کسی شرح میں نہیں ملی، میں نے اس کا تذکرہ مولانا عبدالسلام خطیب ندوی بھٹکلی (استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) سے کیا، مولانا محترم نے فرمایا کہ ہاں جو مفہوم آپ سمجھ رہے ہیں وہی مفہوم حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (قدس سرہٗ) نے اپنی کتاب میں بھی تحریر فرمایا ہے، اس پر حضرت مولانا عبدالرشید صاحب دامت برکاتہم نے کہا: میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے مفہوم کی تائید ایک محدث کی تشریح سے ہوگئی، استاذ محترم نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے بارے میں بہت بلند کلمات فرمائے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ جس مفہوم سے عربی شروحات خالی وہ اردو میں موجود ہے۔

اللہ رب العزت نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو حکمت و دانائی بھی وافر مقدار میں عطا فرمایا تھا، جس کو

"**حجۃ اللہ البالغۃ**" کی شرح "**رحمۃ اللہ الواسعۃ**" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ایک سال قبل آپؒ دارالعلوم دیوبند کے افتاء کے طلبہ کے سامنے خصوصی خطاب فرمایا تھا، وہ خطاب بشکل آڈیو احقر نے بھی سنا تھا، دوران خطاب آپ رح نے فرمایا، اللہ تعالی کا فرمان ہے:

ویعلمھم الکتاب والحکمۃ علم کتاب سے آتی ہے اور حکمت، تو سنو! جب تم تمام کتب پڑھ ڈالو گے کوئی بھی چھوٹی بڑی کتاب باقی نہیں رہے گی، اس کے بعد حکمت آئے گی، اس سے پہلے حکمت نہیں آسکتی، حضرت رح کی یہ بات سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ علوم اسلامیہ وعلوم عقلیہ میں یدطولی رکھتے تھے، آپ رح کے گوہر بار قلم سے تفسیر، حدیث، نحو، صرف، منطق، فلسفہ، اور علم کلام ہر موضوع پر کتابیں آئیں اور اہل علم سے داد وتحسین حاصل کیں۔

آپ علمی معاملہ میں جس چیز کو دلائل کی رو سے غلط سمجھتے اس کی کھل کر تردید کرتے، جو درست ہوتا اسے برملا اظہار فرماتے، مزار قاسمی کے بارے میں صاف فرماتے یہ جو کچھ ابھی ہو رہا ہے یہ کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے، فرماتے: میں بھی اپنے اساتذہ کے لئے فاتحہ پڑھنے جاتا ہوں لیکن میں گیٹ کے باہر سے ہی پڑھ کر آجاتا ہوں۔

آہ! ایسی عظیم جلیل القدر ہستی رفیق اعلیٰ کی جانب کوچ کر گئے، دار فانی کو چھوڑ کر دار باقی کے باسی ہوگئے۔ اللہ تعالی کی آپ پر بے حساب اور بے کراں رحمتیں نازل ہوں، رب ذوالجلال آپ کی جملہ حسنات کو قبول فرمائے، اور قبر میں کروٹ کروٹ راحت وسکون نصیب فرماتے ہوئے آپ کو جنت الفردوس کا مکیں بنائے۔

اللھم اغفر لہ، وارحمہ، وعافہ، واعف عنہ، وارفع درجاتہ فی اعلی الجنات، اللھم لا تحرمنا اجرہ، ولا تفتنا بعدہ، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی سعادت

مولانا عزیر احمد قاسمی
استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمت اللہ علیہ پوری زندگی قال اللہ وقال الرسول گنگناتے رہے، حق و باطل میں بہت باریکی سے تمیز سکھاتے رہے۔ زندگی کے ہر قدم پر سنت و بدعت کی ہمیشہ تفریق سکھاتے رہے۔ جملہ اکابرین دیوبند میں آپ کی انفرادی شان تھی سلام میں سبقت کرنا آپ کی عادت رہی بلا رو رعایت ڈنکے کی چوٹ پر اصلاح کرنا اور حق کی رہنمائی کرنا آپ کی طبیعت تھی۔ اہلسنت والجماعت کے صاف وشفاف چہرے کو ہمیشہ دھوتے رہنا اور اس پر پڑی دھول کو پھونکوں سے اڑا دینا آپ کا معمول تھا۔ ملک بھر میں آپ کے اسفار ہوتے ہی رہتے ہر سفر میں آپ مذکورہ بالا تصویر کی غماز تھے۔

حضرت الاستاذ کا ایک واقعہ ہے پچھلے سال جب آپ ختم بخاری شریف کے جلسے میں حضرت اقدس مفتی شعیب اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی درخواست پر جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور تشریف لائے تو بعض دوستوں نے حضرت الاستاذ کے اعزاز و اکرام میں ایئر پورٹ سے جامعہ پہونچنے کے وقت جامعہ کے صدر دروازے کے پاس کافی دور سڑک تک عوام وطلبہ کے لب سڑک دو قطار بنا دئے تھے۔ منظر نہایت خوش نما تھا حضرت الاستاذ کی آمد پر ہر کسی کا دل حضرت کی قدموں پر بچھ چکا تھا جب حضرت الاستاذ کار سے اترے تو مجمع کو سلام کرنے کے بعد فرمایا:

کہ اس طرح کسی کی راہوں پر دو قطار میں کھڑے کر کے پلکے بچھانا دو خطروں سے خالی نہیں جس کے لئے یہ

کیا جارہا ہے وہ فتنے میں پڑسکتا ہے اور جو لوگ اس طرح کھڑے کئے گئے ہیں ان کی تحقیر کی جارہی ہے۔

الغرض اس طرح آپ ہر لمحہ اصلاح کی طرف توجہ دلاتے تھے، حضرت الاستاذ نے دوران درس ایک واقعہ سنایا ترمذی کا سبق تھا مغرب کے بعد حضرت کا درس ہوتا تھا فرمایا کہ میرے بچوں نے مجھ سے کہا: کہ ہمارا پڑوسی ہماری دیوار پر چراغ دان یا محراب بنانا چاہ رہا ہے تا کہ اس محراب میں وہ اپنا چراغ رکھ سکے اور کچھ اجالا حاصل کر سکے حضرت الاستاذ نے اس کی اجازت دے دی حضرت کے بعض فرزندوں کو یہ بات کھٹکی کہ اگر ہم آج اسے دیوار میں محراب بنانے کی اور دیوار میں تصرف کی اجازت دیں گے تو کل وہ یہ دعویٰ کرے گا کہ دیوار اس کی ہے اور زمانہ بھی آجکل ایسا ہی ہے تو حضرت الاستاذ نے وصیت میں یہ بات لکھ دی لکھ دیں کہ اگر ہمارا پڑوسی دیوار کا دعوی کرے تو وہ دیوار اس کو دے دو۔

حضرت الاستاذ بے انتہا سخی مستغنی اور زہد فی الدنیا کے اوصاف سے آراستہ تھے، حضرت الاستاذ کبھی فرماتے تھے کہ اللہ کا میرے ساتھ ایک خاص کرم ہے کہ جو چیزیں مجھے پسند آجاتی ہے یا جس کو زیادہ چاہنے لگتا ہوں تو وہ مجھ سے گم ہوجاتی ہے یا وہ چیز میرے ہاتھ سے ضائع ہوجاتی ہے مثال کے طور ایک خوبصورت نفیس اٹاپچی کا ذکر فرمایا تھا کہ وہ بہت پسند تھی پھر اچانک گم ہوگئی۔

اس کے علاوہ اور بھی چیزوں کی مثالیں دی تھیں، مرغوب چیزیں چھن لیا جانا اللہ والوں کے ساتھ بہت ہوتا ہے اسی لئے اللہ والوں کی نظر میں کوئی فانی چیز پسندیدہ نہیں ہوتی اگر پسندیدہ بننے لگے تو اللہ تعالیٰ کا خاص کرم یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز دور کردی جاتی ہے جیسے کہ حدیث میں یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو فانی چیزوں سے ایسے بچائے رکھتے ہیں جیسے بخار زدہ انسان کو ٹھنڈے پانی سے بچاتے ہیں۔

❁ ... ❁ ... ❁

باتیں ان کی یاد رہیں گی!

امینِ علومِ شرعیہ

مخدوم ومحسن گرامی قدر حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ

سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

مولانا محمد طفیل صاحب دربھنگوی
متعلّم دار العلوم دیوبند

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ما سوا کو مٹاتی چلی گئی

حضرت الاستاذ اسم بامسمی تھے، آپ کا نام نامی ایسا ہے جسے زندگی کے ہر شعبے میں بہ طور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے؛ آپ کی طالب علمانہ زندگی موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے قابلِ اتباع ہے، سنت نبوی کے عاشق، تدریس کے میدان کے سلطان، طلبہ کے تئیں خیر خواہی، اساتذہ کے لیے نمونہ، تصنیف وتالیف کا ایسا انداز کہ پڑھنے اور سمجھنے کے درمیان فصل نہ ہو، قاری بس پڑھتا چلا جائے، تقریر کا البیلا انداز، جامع اور مختصر کلام کرنے میں علامہ محمد ابراہیم بلیاوی قدس سرہٗ کی نشانی، علوم نانوتویؒ کے امین، فقہی بصیرت میں حضرت گنگوہیؒ کا عکس جمیل، علومِ ولی اللہی کے شارح، مسلک کے پاسبان، دیوبندیت کے ترجمان، برملاحق گوئی امتیازی شان، تصوف میں حضرت شیخ زکریا قدس سرہٗ کے فیض یافتہ، صبر واستقامت میں اپنی مثال آپ تھے، توکل علی اللہ قابلِ رشک، خانگی زندگی امتِ مسلمہ کے لئے مشعلِ راہ، تجارت کی مہارت قابلِ دید، اولاد کی تربیت کا طریقہ بے مثال، تواضع کے پیکرِ

حسین، خودداری ناقابلِ یقین، صفتِ استغناء غیر متزلزل، قوت ارادی میں یکتائے زمانہ، علمی انہماک ماضی کے علماء کی یاد تازہ کرنے والا، دوراندیشی لاجواب، خود پسندی سے کوسوں دور، اصول پسندی میں کامل، ان میں سے ہر صفت مفصل مضمون کی محتاج ہے۔

کونسی خوبی پہ جان دوں کس ادا پہ مرمٹوں
خوبیاں لاکھ بھری ہیں آپ کی تصویر میں

اولین شناسائی

شوال ۱۴۳۲ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۱ء کی بات ہے، جب احقر نے حفظ کی تکمیل کے بعد دیوبند کا رُخ کیا؛ اور مدرسہ جامعۃ الشیخ حسین احمد مدنی دیوبند میں فارسی میں داخلہ لیا، نئے اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا، ان میں سب سے زیادہ مقبول درس حضرت مولانا احمد سعید صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کا تھا، حضرت سے فارسی کی پہلی اور گلستاں پڑھنے کا موقع ملا تو بندہ بھی ان سے متأثر ہوا، معلوم کرنے پر معلوم ہوا کہ موصوف دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے صاحب زادے ہیں تو سوچا کہ صاحب زادے کا یہ حال ہے تو والد صاحب کا کتنا اونچا مقام ہوگا، یہاں سے حضرت الاستاذ قدس سرہٗ سے عقیدت کی ابتدا ہوئی، پھر عربی اول میں سیرت خاتم الانبیاء اور مالابدمنہ پڑھنے کا موقع ملا، جامعۃ الشیخ میں حضرت کے درس کی مقبولیت ایسی ہی ہے جیسے دارالعلوم میں روزِ اول سے حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے درس کی مقبولیت تھی، موصوف فراغت کے بعد سے تادم تحریر پندرہ سال سے جامعۃ الشیخ میں تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

دارالعلوم میں داخلہ

آئندہ سال بندے کا دارالعلوم میں عربی دوم میں داخلہ ہوگیا، اب تک بندہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی آسان فارسی قواعد، آسان نحو اور آسان صرف سے بھرپور استفادہ کر چکا تھا، پھر دارالعلوم میں جن اساتذہ سے

پڑھنے کا موقع ملا ان میں سے ایک مفتی صاحب قدس سرہٗ کے شاگردِ رشید حضرت مولانا مفتی اشتیاق احمد صاحب دامت برکاتہم ہیں، موصوف سے نور الایضاح اور قدوری از ابتدا تا ختم کتاب الحج پڑھنے کا موقع ملا، عربی چہارم میں قطبی اور عربی پنجم میں نور الانوار، حضرت الاستاذ دامت برکاتہم مفتی صاحب قدس سرہٗ کا ذکرِ خیر کرتے رہتے تھے، جس سے عقیدت میں اضافہ ہوتا تھا۔

پھر عربی سوم میں شرح تہذیب کے حل کے لئے مفتاح التہذیب سے استفادہ کیا تو دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ مفتی صاحب قدس سرہٗ کے پاس جانا چاہیے، سال کے آخر میں ارادہ کرلیا کہ آئندہ سال سے جاؤں گا۔

مجلس میں جانے کی ابتدا

آئندہ سال مولانا اشتیاق احمد صاحب دامت برکاتہم (استاذ دارالعلوم) سے خواہش کا اظہار کیا تو حوصلہ افزائی فرمائی اور مجلس کے اصول بتلائے: (۱) سلام کر کے جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ (۲) کوئی علمی سوال ہو تو پوچھو، ورنہ خاموش رہو؛ بہر حال ۱۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۳۱/ اگست ۲۰۱۵ء بروز پیر عصر بعد بندہ حاضر ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا، اس دن تکمیلِ علوم کے طلبہ کو رحمۃ اللہ الواسعہ (شرح حجۃ اللہ البالغہ) جلد اول تقسیم ہو رہی تھی (مفتی صاحب قدس سرہٗ ہر سال تکمیلِ علوم کے طلبہ کو رحمۃ اللہ الواسعہ جلد اول ہدیہ کرتے تھے) کچھ دیر بعد آپ نے فرمایا کہ تکمیل علوم کے طلبہ رہیں باقی چلے جائیں، دل میں بہت بے چینی ہوئی، اچانک تکمیل علوم کے ترجمان صاحب نے عرض کیا کہ تقریباً تمام ساتھیوں کو کتاب مل چکی ہے تو مفتی صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ، تب جا کے دل کو سکون ملا، اس کے بعد میں نے مجلس کی حاضری کو اپنے معمول میں داخل کرلیا، چنانچہ عربی چہارم سے دورۂ حدیث تک پانچ سال میں گنے چنے ایام ہیں کہ دیوبند میں ہوتے ہوئے مجلس میں حاضری نہ ہوئی ہو۔

اولین شرف تکلم

عربی چہارم کے نصاب میں سورۂ یوسف سے سورۂ حجرات تک ترجمۂ قرآن بھی ہے، چنانچہ سورۂ انبیاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق سے ایک آیت آئی ہے (قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ) اس میں متعدد اقوال سنے، لیکن اطمینان نہیں ہوا تو عصر بعد مفتی صاحب قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ اس کی آسان توجیہ فرمادیں، آپ نے صرف اتنا فرمایا "فعلہ پر سانس توڑ دو" بس میں سمجھ گیا یعنی کسی کرنے والے نے کیا............اس توجیہ سے مکمل شرح صدر ہو گیا، اور حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے کلام کی جامعیت کا اولین مشاہدہ ہو گیا۔

نئی کتاب دیکھنے کی خصوصیت

اسی سال بندے نے مفتی اشتیاق احمد صاحب دامت برکاتہم (استاذ دارالعلوم دیوبند) کی نگرانی میں "مقادیرِ شرعیہ" (شرعی اوزان) مرتب کی اور وہ مکتبہ حجاز سے شائع ہوئی، چنانچہ عصر بعد بغیر کچھ کہے حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کو پیش کی، آپ نے کتاب کھولتے ہی فرمایا کہ مہر فاطمی ۴۸۰ نہیں ۵۰۰ درہم ہے، روایتیں دونوں طرح کی ہیں، تطبیق یہ ہے کہ ۴۸۰ والی روایت میں ایک نش یعنی نصف اوقیہ (۲۰ درہم) جو کہ کسر ہے حذف کیا گیا ہے؛ یہ آپ کی خصوصیت تھی کہ نئی کتاب ہاتھ میں لیتے ہی ایسی جگہ کھولتے تھے جہاں کوئی غلطی ہو۔

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کا قرب

بندہ ایک سال مسلسل مجلس میں حاضر ہوتا رہا اور آئندہ سال عربی پنجم کے آغاز میں آپ نے نام اور پتہ پوچھا تو بے حد خوشی ہوئی، اس وقت آپ تفسیر ہدایت القرآن کی آخری (آٹھویں) جلد لکھ رہے تھے، مفتی صاحب قدس سرہٗ قلم برداشتہ لکھتے تھے الا یہ کہ کوئی لمبا یا پیچیدہ مضمون ہو تو املا کراتے تھے، لیکن یہ رف کے درجے میں ہوتا تھا، پھر آپ از خود اسے صاف کرتے تھے، چنانچہ اس سال سے بندے سے املا کرانے لگے، عصر بعد املا کراتے وقت طلبہ سے فرماتے کہ تم اپنا سوال جاری رکھو، دونوں کام کروں گا، چنانچہ جب پرچی آتی تو رک کر جواب دیتے،

اور کبھی زیادہ لمبا مضمون ہوتا تو مغرب بعد روک لیتے یا فرماتے کہ عشاء کی اذان پر آنا۔

خالص علمی مجلس

چوں کہ آپ کی مجلس میں صرف علمی باتیں ہوتی تھیں اس لئے سوال کا اصول یہ تھا کہ ایسا سوال پوچھا جائے جسے طالب علم حل نہ کرسکے، مسائل پوچھنے پر فرماتے کہ دارالافتاء سے پوچھو اور عام اشکال کرنے پر فرماتے کہ تیرا مبلغِ علم تو یہ ہے تجھ سے کیا بات کریں؟ اور معقول سوال ہو تو جامع اور مختصر جواب دیتے تھے، اس کے سنتے ہی سائل کو شرحِ صدر ہو جاتا تھا۔

یہ ملکہ آپ نے اپنے استاذِ محترم و مخدومِ گرامی حضرت اقدس علامہ محمد ابراہیم بلیاوی قدس سرہٗ سے حاصل کیا تھا، ایک موقع پر آپ نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں حضرت علامہ قدس سرہٗ کے یہاں عشاء کے بعد سر میں تیل رکھنے کے لئے جاتا تھا، ایک دن میں نے حضرت الاستاذ قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ میں نے ابن تیمیہؒ کے سلسلے میں بہت کچھ پڑھ لیا ہے، اب میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں، آپ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر فرمایا: مولوی صاحب! یہ حضرت بلیاوی قدس سرہٗ کا تکیہ کلام تھا، حضرت الاستاذ قدس سرہٗ جب بھی حضرت بلیاوی قدس سرہٗ کی کوئی بات نقل فرماتے تو ترنم کے ساتھ ان ہی کے لہجے میں فرماتے ''مولوی صاحب!'' سننے میں بہت مزہ آتا تھا ''حدیث میں تھا کھلاڑی، کلام میں تھا اناڑی'' بس مجھے اطمینان ہوگیا اور میں نے طے کیا کہ حدیث میں اگر چہ وہ ماہر ہیں، لیکن ہمارے اپنے اکابر کی فن حدیث میں بہت کتابیں ہیں، لہٰذا ان کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ کہیں بھی ہمارا عقیدہ خراب کرسکتے ہیں۔

بہت جی لگتا تھا محفل میں ان کی ؏
وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

خود پسندی سے کوسوں دور

(۱) حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے ساتھ نماز کے لئے مسجد جاتے وقت معلوم ہوا کہ آپ اپنے پیچھے چلنے کو پسند نہیں کرتے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل فرماتے تھے کہ: ’’عوام کا عالم کے پیچھے چلنا، عوام کے لئے ذلت ہے اور عالم کے لئے فتنہ‘‘ اس کے بعد فرماتے کہ میرے ساتھ چلو یا آگے چلو۔

(۲) ہم آپ کی قیام گاہ میں بیٹھے ہوتے تھے اور آپ اندر سے وضو کر کے آتے تو ہم کھڑے ہونے لگتے ،آپ فوراً روک دیتے اور فرماتے کہ قیام تعظیمی جائز ہے، لیکن ہمارے اکابر اسے پسند نہیں کرتے تھے۔

(۳) جب طبیعت میں زیادہ اضمحلال ہوتا تو گھر پر ہی نماز ادا فرماتے اور صرف ایک بندے کو روکتے، بقیہ سے کہتے کہ مسجد جاؤ، احقر کو بھی بارہا نماز پڑھانے کا موقع ملا، احقر سلام پھیرنے کے بعد فوراً پیچھے ہوجاتا تھا تاکہ آپ آرام سے بیٹھ سکیں، چند دن بعد آپ نے سخت لہجے میں فرمایا کہ: یہ کیا طریقہ ہے؟ احترام میں اتنا غلو کیوں کرتے ہو؟

(۴) آپ کو بے جا خدمت پسند نہیں تھی، چنانچہ جب آپ وضو کے لئے اندر جانے لگتے تو احقر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتا، ایک دن آپ نے فرمایا کہ تم نے استاذ کو اپاہج سمجھ رکھا ہے، میں اتنا کام خود نہیں کرسکتا؟

بہرحال ایام گزرتے گئے اور دورے کا سال آپہنچا (اس مختصر مضمون میں درمیان کی ساری باتیں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے) لیکن کیا معلوم تھا کہ یہ آپ کی زندگی کا آخری سال ہوگا، اللہ تعالی کا ہم پر بہت بڑا فضل وکرم ہے کہ ہمیں حضرت الاستاذ قدس سرہٗ سے بخاری شریف پڑھنے کا موقع عنایت فرمایا، اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی بال بال مغفرت فرمائیں! اور درجات بلند فرمائیں۔ آمین یارب العالمین!

تدریسی زندگی پر ایک نظر

چوں کہ یہ حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کا آخری سال تھا، اس لئے آپ کی تدریسی زندگی کا خلاصہ پیش کررہا ہوں: جب آپ افتاء کے دوسرے سال (انتظامیہ نے آپ کے لئے افتاء میں ایک سال کی توسیع کردی تھی) میں

تھے تو ایک دن علامہ بلیاوی قدس سرہٗ نے آپ سے فرمایا کہ: میرے پاس طلبہ آتے ہیں، کوئی امامت کی درخواست کرتا ہے، کوئی تدریس کی وغیرہ وغیرہ، تو نے کوئی درخواست نہیں کی! آپ نے علامہ قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ:

''بیٹے کے بارے میں باپ سوچتا ہے'' تو علامہ قدس سرہٗ خاموش ہوگئے، پھر سال کے آخر میں فرمایا: سعید! ''میں نے راندیر میں تیری جگہ طے کردی ہے''

چنانچہ آپ سفر کی تیاری کر کے آخری ملاقات کے لئے علامہ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا کہ کچھ نصیحت فرمادیں حضرت نے فرمایا:

مولوی صاحب! (۱) فن دیکھ کر پڑھانا، شرحیں دیکھ کر مت پڑھانا، علم آئے گا (۲) طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا، وہ تم سے محبت کریں گے (۳) سنت کی پیروی کرنا، لوگوں کے دلوں میں وقعت پیدا ہوگی؛ حضرت الاستاذ قدس سرہٗ نے ان تینوں نصیحتوں پر تاحیات سو فیصد عمل کیا اور نتیجہ امت کے سامنے ہے۔

بہر حال آپ نے نو (۹) سال دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں، اس کے بعد اڑتالیس (۴۸) سال دارالعلوم دیوبند میں، کل ستاون (۵۷) سال تدریسی خدمت انجام دی، اس کا سن وار تفصیلی تذکرہ استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری دامت برکاتہم (استاذ حدیث وفقہ ومرتب فتاوی دارالعلوم دیوبند) حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی سوانح میں کریں گے، میں صرف یہ عرض کررہا ہوں کہ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں بڑی کتابیں کتنے کتنے سال پڑھائی ہیں، اور کیمپ کے سال دورے میں کتنی کتابیں پڑھائی ہیں؛ ترمذی شریف جلد اول انتیس (۲۹) سال، طحاوی شریف پچیس (۲۵) سال، حجۃ اللہ البالغہ اکیس (۲۱) سال، بخاری شریف جلد اول پہلی مرتبہ ۱۴۰۵ھ میں اور آخر میں تیرہ (۱۳) سال کل چودہ (۱۴) سال۔

وہ کتابیں جو آپ نے کیمپ کے سال دورے میں پڑھائی ہیں

اس کا تذکرہ آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب غزنوی دامت برکاتہم فاضل وسابق استاذ وخطیب دار العلوم دیوبند، حال: استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نے آپ کی وفات کے بعد اپنے تأثراتی بیان میں کیا ہے، موصوف نے کیمپ کے سال ہی دورہ پڑھا ہے، جو کتابیں موصوف نے حضرت الاستاذ قدس سرہٗ سے پڑھی ہیں وہ درج ذیل ہیں: (۱) بخاری شریف جلد ثانی (۲) ترمذی شریف جلد اول (۳) شمائل ترمذی شریف (۴) ابوداؤد شریف مکمل (۵) مسلم شریف مکمل (۶) موطا امام محمد (۷) موطا امام مالک۔

آخری سال کی روداد

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کا سبق چوتھے گھنٹے میں ہوتا تھا، لیکن آپ طلبہ کو ناشتہ وغیرہ کے لئے آدھا گھنٹہ دیتے تھے، سبق کا ابتدائی وقت تبدیل ہوتا رہتا تھا، البتہ چھٹی کا وقت متعین تھا، ساڑھے بارہ بجے، سردی ہو یا گرمی پورے سال چھٹی کا یہی وقت ہوتا تھا، مگر بریانی کے دن پندرہ منٹ پہلے سوا بارہ بجے چھٹی کردیتے تھے، آپ فرماتے تھے کہ میرے شیخ علامہ فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی قدس سرہٗ بخاری شریف جلد اول کا سبق دن کے ساڑھے بارہ بجے اور بخاری شریف جلد ثانی کا سبق رات کو ساڑھے گیارہ بجے ختم کرتے تھے، اس لئے میں بھی ساڑھے بارہ بجے چھٹی کرتا ہوں، بہر حال سال کی ابتدا چوں کہ گرمی میں تھی، اس لئے چوتھا گھنٹہ ساڑھے نو بجے سے تھا اور رعایتی وقت (آدھا گھنٹہ) ملا کر آپ کی آمد کا وقت دس بجے تھا، چنانچہ ۳/ذیقعدہ ۱۴۴۰ھ مطابق ۶/ جولائی ۲۰۱۹ء بروز سنیچر مقررہ وقت پر دار الحدیث میں جلوہ افروز ہوئے، اور امام بخاری رحمہ اللہ کے مختصر احوال بیان فرمائے۔

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید:

ذیقعدہ ہی کی کسی تاریخ میں بندہ جب عصر کے وقت حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ رات ایک خواب دیکھا

ہے اور عائشہ (حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی بڑی صاحبزادی) کو بھی فون پر بتایا ہے، اس کی تعبیر میں آپ نے فرمایا کہ: (موت کا) ''وقت قریب ہے'' اس کے بعد احقر نے ایک خواب دیکھا اور آپ سے بیان کیا، آپ نے اس کی تعبیر میں فرمایا کہ: ''ٹھیک ہے تجھے بھی بخاری پڑھاؤں گا''

ایک ہفتے تک سبق میں مبادیاتِ حدیث بیان کرتے رہے اور فرماتے تھے کہ: میں ابھی تمہارا مبلغِ علم بڑھا رہا ہوں، اس کے بعد کتاب شروع کروں گا، خیر ایک ہفتے بعد کتاب شروع ہوئی اور عید الاضحیٰ کی تعطیل تک ساڑھے سولہ صفحے (کتاب العلم: باب ذکر فی ذھاب موسیٰ فی البحر إلی الحضر) تک سبق ہوا، اور تعطیل کے بعد کتاب العلم: باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللھم علمه بالکتاب سے سبق کا آغاز ہوا۔

تدریس کا بے پناہ سلیقہ

جب آپ سے پوچھا جاتا کہ آپ نے درس میں تفہیم کا انداز کہاں سے حاصل کیا؟ تو فرماتے: دو اساتذہ سے (۱) علامہ صدیق صاحب جموی قدس سرہٗ (ان سے آپ نے مظاہر علوم میں معقولات کی اکثر کتابیں پڑھی ہیں) یہ مسئلے کو شروع سے لے کر چلتے تھے اور ایک حد پر جا کر رک جاتے تھے (۲) علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہٗ (ان سے آپ نے ترمذی شریف جلد اول، مقدمۂ مسلم اور مسلم شریف کتاب الایمان پڑھی ہے) یہ مسئلے کو اوپر سے، بالفاظِ دیگر جہاں دیگر اساتذہ بات ختم کرتے تھے وہاں سے لے کر چلتے تھے اور مسئلے کو اس کی انتہا تک پہنچاتے تھے، میں نے دونوں کو جمع کیا ہے یعنی مسئلے کو شروع سے لے کر انتہا تک پہنچاتا ہوں۔

چنانچہ درس میں آپ کا انداز ایسا ہوتا کہ غبی طالب علم بھی بآسانی سمجھ لیتا اور ذہین طالب علم کو اکتاہٹ بھی نہیں ہوتی تھی، آپ کے درس کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ آپ اختلاف کی بنیاد سمجھاتے تھے، نفسِ اختلاف میں لمبی چوڑی تقریر نہیں کرتے تھے، فرماتے کہ میں پنچایت نہیں کرتا، ایک جملے میں کہوں تو یہ کہ مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکی

میں حل فرمادیتے تھے۔

آپ طلبہ کا خیال کرتے ہوئے ساڑھے بارہ بجتے ہی کتاب بند کردیتے تھے، خواہ کتنا ہی اہم مضمون چل رہا ہو، اور اگلے دن مضمون کی ابتدا سے سبق شروع کرتے تھے۔

تیرے کردار سے آتی ہے صداقت کی مہک
تیری تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

درود شریف کا اہتمام

جب بھی سرد کار دو عالم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا تو آپ صاف اور اہتمام سے درود شریف پڑھتے، اور عبارت کے دوران تذکرہ آتا تو ہم سے فرماتے کہ صاف اور مزے لے کر درود پڑھو، لوگ جلدی کرتے ہیں، الفاظ بھی صاف ادا نہیں کرتے، یہ ٹھیک نہیں ہے، یہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کامل محبت کا نتیجہ تھا۔

علامہ بلیاویؒ کی دوسری نصیحت (طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا، وہ تم سے محبت کریں گے) کا اثر درس گاہ میں آپ کا مزاج یہ تھا کہ میرے آنے کے بعد کوئی طالب علم نہ آئے، اور سب سلیقے سے مل کر بیٹھیں، اس کی خلاف ورزی پر آپ ناراض ہوتے تھے، فرماتے: پہلے بیٹھنا سیکھو، پھر پڑھانے آؤں گا، لیکن ہمارے سال بحمد اللہ آپ ناراض ہو کر ایک بار بھی درس گاہ سے واپس نہیں لوٹے، ایک دن ناراض ہو کر جانے لگے، جب مسند سے چند قدم آگے بڑھے تو رفیق محترم اعجاز الحق سہارن پوری سلمہ نے عرض کیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا، میں ذمہ داری لیتا ہوں تو آپ واپس آئے اور سبق شروع فرمایا، اور درمیان میں سخت الفاظ میں ڈانٹا، فرمایا: تمہیں علم آئے گا؟! اگلے دن تمام ساتھی بے چین تھے اور قبل از وقت سلیقے سے مل کر بیٹھ گئے، آپ تشریف لائے تو طلبہ نے آپ کی بے پناہ شفقت کا مشاہدہ کیا، فرمایا: کل میں نے غصے میں پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیا تھا، میں تو تمہیں اپنی اولاد سمجھتا ہوں، اللہ تمہیں علم

عطا فرمائیں، اس بے پناہ شفقت پر احباب دم بخود رہ گئے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو
ان کو جب معلوم یہ ہوگا، ہم نے ان کو دیکھا ہے

پہلا حادثۂ فاجعہ

ششماہی کی تعطیل تک ۱۷۸ صفحے (کتاب الجنائز: باب المیت یسمع خفق النعال) تک سبق ہوا، اس کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے حافظ سعید احمد رحمہ اللہ (یہ آپ کے ہم نام تھے) کی طبیعت نازک ہوگئی، اس لئے آپ کو راندیر (سورت) جانا پڑا (موصوف دارالعلوم رام پورہ سورت میں حفظ کے استاذ تھے) پھر جس دن ہمارا بخاری شریف کا امتحان تھا یعنی ۲۸/ربیع الاول ۱۴۴۱ھ مطابق ۲٦/نومبر ۲۰۱۹ء بروز منگل ساڑھے چار اور پونے پانچ کے درمیان جان جانِ آفریں کے سپرد کی، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور وہیں رات گیارہ بجے تدفین ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائیں۔ آمین!

مصائب میں تسلی کے لئے ایک قیمتی جملہ

ششماہی کی تعطیل کے بعد کتاب الجنائز: باب من أحب الدفن فی الارض المقدسة أو نحوها سے سبق کا آغاز ہونا تھا، حضرت الاستاذ قدس سرہٗ تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے لڑکے کی وفات پر تعزیت کرنے والوں میں سے ایک شخص نے تسلی کے لئے بہت اچھا جملہ کہا کہ: ’’جو آیا وہ اپنا، جو گیا وہ سپنا‘‘

ایک مشفقانہ جملہ

سردی کے ایام میں آپ کو وقت کم ملتا تھا، کیوں کہ سوا گیارہ بجے سبق شروع ہوتا تھا، اس لئے آپ نے مذاقاً فرمایا کہ سردی میں بریانی نہیں پکے گی (یعنی جلدی چھٹی نہیں ہوگی) حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کو دارالحدیث کے دروازے پر رکشے سے اترتے وقت میں ہی بریانی کی اطلاع دیا کرتا تھا، اس لئے شام کو عرض کیا کہ اب بریانی

کی اطلاع نہ دیا کروں؟ آپ نے فرمایا: دیا کرو، ایک دن شفقۃً درس گاہ میں فرمانے لگے کہ:

''ہمارا جو طفیل ہے یہ باؤلا ہے'' اسے کہہ رکھا ہے کہ سردی میں بریانی نہیں پکتی، پھر بھی آکر کھڑا ہو جاتا ہے، جاؤ کھاؤ بریانی، اور کتاب بند کردی، لفظ ''باؤلا'' یاد کر کے بہت مزہ آتا ہے، اللہ آپ کے درجات بلند فرمائیں، آمین!

دوسرا حادثۂ فاجعہ

۲۳ر جمادی الثانیہ ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۸ر فروری بروز منگل صبح ساڑھے نو بجے آپ کے غم خوار وغم گسار، آپ کے تئیں بے حد فکر مند، آپ کے سمدھی جناب محمد حنیف صاحب قدس سرہٗ بانی وسابق مہتمم جامعہ نور العلوم گھٹامن (پالن پور) اللہ کو پیارے ہو گئے، طرفین میں بے پناہ محبت تھی، پھر بھی آپ دار الحدیث میں تشریف لائے اور ایصالِ ثواب کر کے سبق پڑھایا، چھٹی کے بعد راقم الحروف گھر پر حاضر ہوا تو بیٹھتے ہی فرمایا کہ میں پالن پور جارہا ہوں، درس گاہ میں اعلان کر دیجیو کہ ہر طالب علم ایک ایک پارہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کرے، پھر فون پر مجھے اطلاع دیجیو، لیکن ٹکٹ کا انتظام نہیں ہو رہا تھا، احمد آباد میل میں ایک پہچان کا ملازم تھا، اس نے کہا کہ میں ٹی ٹی سے بات کر کے انتظام کروا دوں گا، اس پر حضرت الاستاذ قدس سرہٗ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: سامان تیار کرو، پالن پور اپنے پہنچنے کی اطلاع کے ساتھ یہ بھی ہدایت دے دی کہ تدفین میں تاخیر نہ کریں، چنانچہ تدفین عشاء بعد ہو گئی اور آپ اگلے دن دوپہر کو پہنچے۔

آخری ایام کی روداد

دار العلوم کی مسجد رشید کے تہ خانے میں ۱۶ر رجب المرجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۲ر مارچ ۲۰۲۰ء بروز جمعرات حسب روایت انعامی جلسہ منعقد ہوا، حسب معمول اصلاحی بیان کے لئے آپ زینتِ اسٹیج بنے، طبیعت میں رات ہی سے اضمحلال تھا، اس لئے درمیان میں زبان رک رہی تھی، پھر بھی آپ نے تقریباً پون گھنٹہ بیان

فرمایا۔

اگلے دن جمعہ کو عشاء کے بعد (دیگر اساتذہ کے اسباق مکمل ہو گئے تھے، اس لئے عشاء بعد بھی ساڑھے گیارہ بجے تک سبق ہورہا تھا) درس گاہ میں تشریف لائے، یہاں بھی زبان رک رہی تھی، بمشکل ایک گھنٹہ پڑھا کر ساڑھے دس بجے گھر تشریف لے گئے، پھر سنیچر کو صبح میں تشریف لائے، پڑھاتے ہوئے باب برکۃ الغازی فی مالہ حیاً ومیتاً مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وولاۃ الامر صفحہ ۴۴۱ سطر ۵ پر پہنچے تو تکلیف بڑھ گئی، بارہا کوشش کے باوجود نہ بول سکے تو فرمایا کہ: یہ حدیث بہت اہم ہے سمجھانا ضروری ہے، مگر کیا کروں؟ چھوڑ و رہنے دو، اب چیک اپ کے لئے ڈاکٹر کے یہاں جانا ہے اور ساڑھے گیارہ بجے گھر تشریف لے گئے، پھر اپنے صاحب زادے مولانا مفتی حسین احمد صاحب کے ہمراہ ڈاکٹر کے یہاں گئے۔

راقم الحروف عشاء بعد حاضر ہوا تو مفتی اشتیاق احمد صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند) کے مشورے پر مفتی صاحب قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ جب تک یہ پریشانی ہے سرداً پڑھائیں، درساً نہ پڑھائیں، آپ راضی ہو گئے اور دارالحدیث میں تشریف لائے، قاری نے پڑھنا شروع کیا، سات/آٹھ صفحے بعد اسی فیصد زبان کھل گئی تو تکلم فرمانے لگے، اس طرح بارہ صفحے (۴۵۲ تک) ہوئے اور کتاب الجہاد کی تکمیل کے ساتھ بارہواں پارہ مکمل ہوا، اخیر میں مذاقاً فرمایا کہ ''ہمارا طفیل کہتا ہے کہ اکثر احادیث مکرر ہیں ہم سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں، آپ ویسے ہی روایۃً پڑھا دیں''!

اس طرح دونوں وقت ملا کر ۲۰/۲۵ صفحے ہوتے رہے، جب تکلم کی قدرت ہوتی تو تکلم فرماتے، پھر ۲۱ رجب ۱۴۴۱ھ، مطابق ۱۷/مارچ ۲۰۲۰ء بروز منگل عصر بعد آپ کے دو رشتے دار: عمار بھائی اور عبداللہ بھائی آپ کو ممبئی لے جانے کے لئے دیوبند آگئے اور اخیر کے تین اسباق میں شریک رہے، آج عشاء بعد چودھواں پارہ مکمل ہو گیا، اب ایک پارہ (۳۰ صفحے) باقی رہ گیا۔

ختم بخاری

بدھ کو صبح میں دس صفحے ہوئے، پھر ۲۳/رجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۸/ مارچ ۲۰۲۰ء جمعرات کی شب میں عشاء بعد آپ تکمیل کے ارادے سے تشریف لائے، صفحہ ۵۴۲ سطر ۹ **القسامة فی الجاهلية** سے عبارت شروع ہوئی، گیارہ بجے جب ۳/۴ صفحے باقی رہ گئے تو حضرت الاستاذ قدس سرہٗ آبدیدہ ہوگئے اور رومال سے آنسو پونچھنے لگے، آخری حدیث پر بے ساختہ کھل کر رونے لگے اور طلبہ بھی باآواز رونے لگے، پھر آپ نے تین مرتبہ یہ جملہ ارشاد فرمایا:

''اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا'' مولانا اشیاق احمد صاحب (استاذ دارالعلوم) نے عرض کیا کہ سراُدعا فرمالیں اور عمار بھائی نے چائے پیش کی، لیکن آپ غم سے نڈھال تھے، اس لئے توجہ نہیں فرمائی اور ۳/۴ منٹ بعد کھڑے ہوئے اور اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''بھائیو! معاف کرنا'' احباب یہ سن کر دھاڑیں مار کر رونے لگے، ساڑھے گیارہ بجے حضرت الاستاذ قدس سرہٗ دارالحدیث سے رخصت ہوئے، کیا معلوم تھا کہ یہ جدائی دائمی ہوگی، اللہ آپ کے درجات بلند فرمائیں، آمین!

ممبئی کے لئے روانگی

اگلے دن ۲۳/رجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/ مارچ ۲۰۲۰ء بروز جمعرات ساڑھے گیارہ بجے عمار بھائی، عبد اللہ بھائی اور اپنے صاحب زادے قاری عبداللہ سعید کے ہمراہ بغرض علاج ممبئی تشریف لے گئے، اگلے دن جمعہ کو صبح کے وقت ملت ہاسپٹل (جوگیشوری) میں داخل ہوئے، چوتھے دن ۲۷/رجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۳/ مارچ ۲۰۲۰ء بروز پیر دوپہر کو ہاسپٹل سے چھٹی ملی، صحت یابی کے چند دن بعد جوگیشوری کے ایک امدادی کیمپ میں مختصر بیان فرمایا اور لا عدوی و لا طیرة کی تسلی بخش تشریح کی، کورونا وائرس کی وجہ سے پورے ملک میں لاک ڈاؤن تھا، اس لئے خواہش کے باوجود دیوبند تشریف نہ لا سکے، پندرہ رمضان تک تراویح کے بعد (آڈیو میں) آن لائن بیان

فرمایا۔

وفات حسرت آیات

اس کے بعد طبیعت خراب ہوگئی تو ۱۷؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۱؍مئی ۲۰۲۰ء بروز پیر سنجیونی ہاسپٹل (ملاڈ) میں آپ کو داخل کیا گیا، ۲۵؍رمضان ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح ساڑھے چھ اور پونے سات کے درمیان جسدِ اطہر سے پاک روح پرواز کرگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راقم الحروف اس وقت دارالعلوم دیوبند میں اپنے کمرے میں سورہا تھا، تقریباً آٹھ بجے رفیق محترم محمد قیس سیتامڑی سلمہ نے آکر جگایا اور اس دل سوز سانحے کی اطلاع دی تو گویا پیروں تلے زمین کھسک گئی، یقین نہیں ہوا، فوراً الماری سے موبائل نکالا تو دیکھا کہ چھ بج کر باون منٹ پر آپ کے گھر سے فون آیا ہوا تھا، یہ دیکھ کر دل کو سمجھایا کہ تقدیر الٰہی یہی تھی، پھر بھی اطمینان کے لئے فون لوٹایا تو خبر کی تصدیق ہوگئی، دل کہہ رہا تھا کہ تو اب یتیم ہوگیا، اب کیا کرے گا؟ دماغ کام نہیں کررہا تھا، اس بے چینی کے عالم میں ہمت کرکے حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے مکان کا رخ کیا اور آپ کے صاحب زادگان کے ساتھ غم میں شریک ہوا، آپ کی نماز جنازہ آپ کے موجودہ صاحب زادوں میں سب سے بڑے صاحب زادے مولانا وحید احمد صاحب نے پڑھائی اور عصر سے کچھ پہلے اوشیواڑہ قبرستان جوگیشوری (ممبئی) میں آسودۂ خاک ہوئے، اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائیں، آمین!

میں آج مر کے بھی بزم وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر میری محفل، مرا مزار نہ پوچھ

آپ کی وفات حسرت آیات پر لوگوں میں یہ تبصرہ ہوا کہ اتنا غم کسی قریبی رشتے دار کی موت پر بھی نہیں ہوتا جتنا آپ کی وفات پر ہے، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے، دوسال پہلے میرے حقیقی والد ماجد رحمہ اللہ اللہ کو پیارے ہوگئے،

اس وقت یہ سوچ کر دل تھام لیا تھا کہ ابھی روحانی والد زندہ ہیں، آپ ہی نے اس وقت تسلی دی تھی اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا تھا، اب آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے، اس لئے قارئین کرام سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے دونوں والد کے رخصت ہوجانے پر صبر جمیل عطا فرمائیں، اور اپنے روحانی والد کی طرح خالص علمی زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین! **وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔**

❁...❁...❁

حضرت الاستاذ حضرت اقدس مفتی سعید صاحب نور اللہ مرقدہ

مولانا اعجاز الحق شمس پوری سہارنپوری
شریک دورہ حدیث دارالعلوم دیوبند

دیدہ لکھا ہے ہم نے شنیدہ نہیں لکھا

ہم طلبہ دورہ حدیث شریف ابھی اس غم کو بھی غلط نہ کر پائے تھے جو ہمیں اس بے پناہ دلدوز درد و کرب سے معمور اختتامی مجلس میں استاد محترم حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آنسوؤں نے اور طلبہ کی چیخ و پکار نے اس ماحول میں عطا کیا تھا اور ہزاروں کوششوں کے بعد بھی وہ آخری دن کی تصویر نظروں کے سامنے گھومتی رہتی تھی، جس میں آپ نے ہاتھ اٹھا کر یہ کہا تھا کہ اللہ کے واسطے معاف کر دینا اور اس سے پہلے مسند سے اترتے وقت نم آنکھوں کے ساتھ فرمایا تھا کہ: جو اللہ کو منظور ہوگا وہ ہوگا، اور اس کے بعد ان کی الوداعی ملاقات ہمیشہ کے لیے الوداعی ہو کر رہ گئی، اور یہ درس آخری درس ہو کر رہ گیا، یہ ملاقات اور آنسو جاودانی بن کر رہ گئے۔

یہ خبر ہم طلبہ دورہ حدیث کے لیے کسی المناک حادثہ سے کم نہ تھی اس حادثے نے ہم طلبہ دورہ حدیث کی کمر توڑ کر رکھ دی، آپ کی ہم طلبہ کے ساتھ شفقت و محبت کا رویہ ناقابل بیان ہے، آپ کے درس کی رونق، آپ کا اجتہادی درس و تدریس کا انداز، آپ کا رعب و دبدبہ، بصیرت اور فقاہت ان تمام چیزوں سے ۲۵ / رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل یہ علمی دنیا محروم ہوگئی، دارالعلوم دیوبند آج نانوتوی کے علوم کے امین اور دیوبندیت کے حقیقی ترجمان، مسلک دیوبند کے پاسبان کی اچانک رحلت سے سوگوار ہے، اور آپ کی رحلت یادگار اور شاندار عہد کا خاتمہ ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
یادوں کی سوغات کے دریچہ سے

وقفہ کا آغاز ہوتے ہی طلبہ چائے نوشی یا ناشتہ وغیرہ کے لیے اپنے اپنے حجروں کا رخ کرتے تھے، یہ وقفہ ۳۰ منٹ پر مشتمل ہوتا تھا، جو حضرت استاد محترم کی شفقت وعنایت میں نہایا ہوا ایک حسین تحفہ تھا، اسلئے کہ اس کے بعد مسلسل ڈھائی گھنٹے تک حضرت والا کا درس جاری رہتا، جو ساڑھے بارہ بجے یا پھر بریانی کے روز سوا بارہ بجے ختم ہوتا تھا، اور آپ مزاحی انداز میں فرماتے: جاو بریانی کھاؤ، تمھاری بریانی ٹھنڈی ہورہی ہے، آپ طلبہ کا بے حد خیال کرتے جیسے ہی سوئی ساڑھے بارہ کا اشارہ دیتی تو کتنا ہی اہم مضمون ہوتا آپ ترک فرمادیتے۔

سراپا

دراز قد، گندمی رنگ، صباحت کا اعلی نمونہ، سوچ میں مستغرق خوبصورت آنکھیں، گھنیری داڑھی، سر پر کلاہ صوفیا، ہاتھ میں آپ کے ذوق لطیف کی ترجمان خوب صورت چھڑی، زہد وتقوی علم وصلاح کی بے پایاں روشنی سے منور مکھڑا، ہر بزم ومجلس کی صدارت اور سرپرستی کے حقیقی مستحق، علمی دنیا میں تحقیق کا سمندر، عالمانہ شان کے حامل، بات میں توازن اور دھیما پن، ظرافت و بذلہ سنجی میں ممتاز، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، علم وفضل کی بارش، سنت رسول پر مر مٹنے والے، بدعت سے حد درجہ متنفر، خلوص وللّٰہیت کے پیکر، اکابر کی آخری نشانی، مستند محدث ، بابصیرت مفتی وفقیہ، نانوتوی کے علوم کے امین، صدر المدرسین حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ وقفہ کے بعد آکر از خود اپنے دل ربا لہجہ میں عبارت پڑھتے اور اپنے منفرد اسلوب جمیل میں مسائل پیش فرماتے۔

مختصر سوانحی خاکہ

آپ کی ولادت ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۰ء میں آپکی ولادت ہوئی، آپ کا وطن موضع کالیڑہ، بناس کانٹھا، (شمالی گجرات) ہے آپ پالن پوری کی نسبت سے مشہور ہیں، جو ضلع کا مرکزی شہر ہے، آپ کی بسم اللہ آپ کے والد محترم نے کرائی، مکتب میں ناظرہ سے فارغ ہوکر دارالعلوم چھاپی میں داخل ہوئے، جہاں آپ کے ماموں مدرس کی حیثیت سے تھے، پھر مولانا نذیر احمد ص پالن پوری کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور شرح جامی تک کی کتابیں وہیں پڑھیں، ۱۳۷۷ / ۱۹۵۸ میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا، اور نحو ومنطق اور فلسفہ کی کچھ کتابیں پڑھیں، اعلی تعلیم کے لئے آپ ۱۳۸۰ / ۱۹۶۱ میں دارالعلوم دیوبند میں باضابطہ داخلہ لیا، علم حدیث وفقہ اور تفسیر کے علاوہ دیگر علوم وفنون کی کتابیں یہیں پڑھیں، ۱۳۸۲ / ۱۹۶۲ء میں آپ نے دورہ کی تکمیل کی، اور امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی، فراغت کے بعد ایک سال تک شعبہ افتا میں زیر تعلیم رہے، اور حضرت مفتی محمود احمد نانوتوی (رکن مجلس شوری واعزازی مفتی دارالعلوم دیوبند) کے یہاں معین مفتی کے طور پر بھی فتوی نویسی کی خدمت انجام دی، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۸۴ / ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں درجہ علیا کے استاد مقرر ہوئے، اور وہاں ۱۳۹۳ / ۱۹۷۳ء تک وہاں بہ حسن وخوبی تدریسی خدمات انجام دی، حضرت مولانا منظور نعمانی کی تحریک پر ۱۳۹۳ / ۱۹۷۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، دارالعلوم میں اس وقت سے اب تک متعدد اہم فنون سے متعلق کتابیں آپ کے زیر تدریس رہیں، ایک طویل عرصے تک آپ سے ترمذی جلد اول متعلق رہی، آپ کی علمی سرپرستی میں فتاوی دارالعلوم کی ترتیب جدید جاری ہے ،۱۴۲۹ / ۲۰۰۸ء میں حضرت مولانا نصیر احمد خان ص بلند شہری کے علالت کی وجہ سے مستعفی کے بعد آپ کو دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث کے باوقار عہدہ کے لیے منتخب کیا گیا۔

علمی کارنامے

آپ کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے مصنف بھی تھے اب تک آپ کی کئی درجن کتابیں منظر

عام پر آ گئی ہیں، آپ کی کتابوں میں تحفۃ الالمعی، تحفۃ القاری، العون الکبیر حاشیہ امداد الفتاوی وغیرہ قابل ذکر ہیں، آپکی شہرہ آفاق شرح رحمۃ اللہ الواسعہ ہے جو آپکی علمی تحقیقات کا شاہکار اور بلند پایہ علمی مقام کا آئینہ دار ہے، حضرت نانوتوی رح کی متعدد کتابیں آپ کی تسہیل وتشریح کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

درسی امتیازات

(۱) آپ ہر مسئلے میں پوشیدہ حکمت کو آشکارا فرماتے۔

(۲) مسائل جدیدہ پر اپنی یا عصر حاضر کے دیگر حضرات کی وقیع تحقیق یا رائے کا اظہار فرماتے۔

(۳) اپنی رائے پیش فرما کر کہتے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے پسند آئے تو لو ورنہ دیوار پر ماردو، یہ بات آپ کی تواضع اور انکساری کی غماز ہے۔

(۵) آپ کے درس کی نمایاں چیز یہ ہوتی تھی کہ آپ تمام احادیث کو سامنے لا کر اور پس منظر کو بتلا کر مسئلے کی تنقیح فرماتے۔

(۶) آپ کا تدریسی انداز اجتہادانہ شان کا حامل ہوتا۔

(۷) احادیث کے تعارض کو اصول وضوابط کی روشنی میں حل فرماتے۔

علمی اصطلاحات:

احادیث کے علمی ذخیرہ کو حل کرنے اور سمجھنے کے لئے یا ذہن سے قریب کرنے کے لیے آپ نے کچھ مفید اصطلاحات سے آگاہ فرمایا جو واقعی بہت کارآمد اور قابل توجہ ہے۔

(۱) حدیث وسنت میں فرق

(۲) تشریع کے وقت کی ترخیص

(۳) واقعات کے متعلقات کا اختلاف

(۴) ناقص کو ناقص کی طرف کامل فرض کرنا

(۵) استدلال خفی

درس کی مقبولیت کا راز

آپ کا درس طلبہ بے حد مقبول تھا ،آپ کے درس کی مقبولیت کا راز ایک طرف علم وفن کی دقیق ابحاث اور نکات میں غایت کمال میں پنہاں تھا تو دوسری طرف آپ کے طرز بیاں، حسیں انداز، اور دل ربا طریقہ تدریس میں، اسی لئے ہمارے لئے وسیع سے وسیع تر مضامین کو بھی ہضم کرنے میں دشواری کا سامنا نہ ہوتا، اختصار اور ترتیب کے ساتھ بیان فرماتے اور زیادہ تر توجہ طلبہ کو مسائل کے استخراج کے طریقے اور دلائل کی باریکیوں پر دلاتے تھے، جس سے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جلا ملے اور پھر یہ اجالا بن کر چہار دانگ عالم کو روشن کریں، اسی لئے آپ کے شاگردوں میں بڑے بڑے جبال العلم موجود ہیں مثلاً مفتی خورشید ص ہمارے مادر علمی کے حالیہ ناظم تعلیمات، گویا ہر کوئی آپ کے درس میں بہ زبان حال یہ کہتا نظر آتا۔

تیری مخمور نگاہوں سے ہے رونق ساری
ورنہ ساقی تیرے میخانے میں کیا رکھا ہے

ذاتی خصوصیات

اسلاف کے مثالی نمونہ، استحضار علمی، سرعت انتقال ذہنی، فقہی بصیرت، اجتہادی صلاحیت، اصول وفروع کے تطبیق کی لیاقت، سابقہ نظائر پر مسائل کو قیاس کرنے کی مہارت تامہ، ایک عبقری مفتی کی خصوصیات کے حامل، علمی مباحث، فرق و مذاہب یا نظریات و رجحانات کے درمیان توازن اور تجزیہ کے بے مثال ذوق کے حامل، اظہار حق میں جری واقع ہونے والے ہمارے فخر کا سامان، دار العلوم کے سر کے تاج تھے۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو

ان کو جب معلوم یہ ہو گا ہم نے ان کو دیکھا ہے

دورۂ حدیث ۲۰۲۰ء کی کچھ جھلکیاں

آنکھ میں آنسو تبسم لب پہ تھا احباب کے ہم طلبہ دورہ حدیث عجیب کشمکش کے شکار تھے، ایک جانب ملک کا بگڑتا منظر نامہ دوسری جانب جامعہ کے بہت سے معاملات میں حکومت کی دخل اندازی، اسی طرح ہم درسگاہ میں جہاں ان شخصیات عبقریہ کی جدائی کے غم میں اپنے آپ کو گھلائے جارہے تھے وہیں ایک خوشی کا لمحہ بھی ہماری یادوں کے حسیں گلشن کو تازہ ہوا دے گیا، ہوا یوں تھا کہ اب صرف ایک کتاب بخاری شریف جلد اول حضرت اقدس مفتی سعید صاحب کی باقی تھی اور اب حضرت کی حاضری کا وقت بھی بدل کر مزید سعادت کا موقع دے رہا تھا ،مغرب بعد، پھر عشاء کے بعد اور صبح میں تینوں اوقات کو آپ کے درس نے گھیر لیا تھا، جو طلبہ آپ کے درس میں مستقل حاضری دے رہے تھے، ان کو اس بیماری کا احساس ہو چلا تھا جو آپ کو کچھ ہی روز سے لاحق ہوئی تھی اور جس نے ہم کو اخیر دن دھاڑے مار مار کر رونے پر مجبور کیا، جس کو میں مفصل ذکر کروں گا انشاء اللہ۔

آپ ایک روز درس دینے کے لیے آئے تو آپ کو ڈاکٹر کے یہاں کی حاجت نے درسگاہ سے جلد نکلنے پر مجبور کر دیا، احقر کا ہاتھ پکڑ کر آپ کھڑے ہوتے پھر اپنا عصا لیکر اور ایک ہاتھ سے بوقت ضرورت احقر کے ہاتھ کو پکڑ کر چلنے لگتے ،اس روز باہر نکلے تو رکشا نہ دارد، احقر درسگاہ سے نکل کر حضرت اقدس مفتی صاحب کا ہاتھ تھامے ہوئے کوئی نہ کوئی بات یا لطیفہ وغیرہ ہی ضرور کہتا، آپ اس کا دندان شکن جواب دیتے اور چند الفاظ ہی میں خاموش کر دیتے اور یہ جواب بھی مزاحیانہ ہوتا، آج احقر نے آپ سے گاڑی میں بیٹھنے کی درخواست کی تو آپ نے اولا نفی فرمادی، پھر احقر نے جملے بدل کر کہا کہ حضرت ہم دورہ حدیث کے طلبہ کے لیے قابل فخر بات ہوگی خیر آپ نے گہری خاموشی اپنے وجود پر طاری کر لی اور دورہ حدیث کے سامنے نیچے معمولی سے پتھر پر بیٹھ گئے، ادھر طفیل بھائی کی قابل داد فہم نے اپنے جوہر دکھائے اور عبد الرحمٰن جدہ کو گاڑی لانے کیلئے فون کیا تو وہ خوشی سے مست

دوڑ کر گاڑی حضرت کی خدمت میں لے آیا، یوں حضرت الاستاذ نے آج گاڑی میں بیٹھ کر ہماری خوشیوں کو دوبالا کردیا تھا، اسی روز احقر کو بھی گاڑی میں بیٹھنے کا موقع ملا اور یوں ہماری بارہا کی کوشش آج نتیجہ خیز ثابت ہوئی، مفتی سعید صاحب کو گاڑی میں بٹھانے کے لیے جہاں ہم طلبہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا وہیں ہم سب کے مشفق و مکرم استاذ مفتی اشتیاق صاحب استاد دارالعلوم دیوبند نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، اسی طرح مفتی اشرف عباس صاحب کے بھی ہم اس سلسلے میں بے حد شکر گزار ہیں، آج محمد طفیل خادم حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب کی بھی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا، یہ طالب علم بھی ہم میں نمایاں رہا ہے، دوم میں دارالعلوم دیوبند میں اول پوزیشن سے داخل ہوئے اور اپنی محنت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں، چہارم ہی سے حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب کی خدمت میں مسلسل حاضری دیتے رہیں ہیں اور پھر خصوصی خادم کے طور پر منتخب کر لیے گئے، یہ ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں جو مقادیر شرعیہ کے نام سے بازار میں دستیاب ہے، ہمارے بااخلاق احباب میں سے ایک یہ بھی ہیں، اور محنت ولگن ان کا خاصہ ہے، بہار کے ضلع دربھنگہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور ممتاز طلبہ میں ان کا شمار رہا ہے، ترجمان اوران کے معاونین کے ساتھ کافی چیزوں میں مشیر و معین رہے ہیں، حضرت اقدس مفتی سعید صاحب کو ہر طرح کا آرام پہنچانے کیلیے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں، ہلکا پھلکا بدن، متحرک اور چست، دوراندیشی اور وسعت ظرفی کا بہترین نمونہ ہے، ان سے بھی احقر کا بے تکلفی کا تعلق رہا ہے، اور جوں جوں سال گزرتا گیا یہ تعلق مزید پروان چڑھتا گیا۔

آج حضرت اقدس مفتی سعید صاحب کے گاڑی میں تشریف رکھنے پر ہر کوئی مست اور خوش وخرم نظر آ رہا تھا، اور پھر یہ گاڑی میں آمدورفت کا سلسلہ اخیر دن تک جاری رہا

دل ہے لہولہان جبیں پر شکن نہیں

یہ آمدورفت کا سلسلہ بذریعہ کار تینوں اوقات تھا اور اس کی وجہ سے احقر کو مزید خدمت کا موقع میسر آیا

،آپ کی طبیعت دن بہ دن بگڑتی جارہی تھی اور بیماری کیا تھی کہ پورے وجود کو گم کردیتی تھی زبان کو مقفل بنادیتی تھی ،ہونٹوں کو سل دیتی تھی ،چاہ کر بھی آپ کلام کرنے سے عاجز رہتے ،طلبہ کی کیفیت بھی دگرگوں ہوجاتی تھی ،احقر مسند کے پیچھے بیٹھ کر بار بار بلکہ درس کے اخیر تک آپ پر دم کرتا رہتا کہ زبان چل پڑے لیکن آپ تنگ آکر قاریٔ عبارت سے فرماتے:

پڑھتے رہو،اور صاحب عبارت اپنی عبارت برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ،بار بار زباں بندی کی یہ صورت پیش آتی تو طلبہ پر رقت طاری ہوجاتی اور کچھ کے آنسو چھلک پڑتے اور احقر کو علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آتا اور پڑھ کر کیفیت بدل جاتی تھی۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

حضرت اقدس مفتی صاحب خود فرماتے تھے کہ آج تک اس طرح صفحات نہیں گذارے گئے اور نہ ہی مجھ سے اس طرح پڑھایا جاتا ہے،ہم احباب نے درخواست کی کہ حضرت جب تک یہ صورت حال ہے تب تک سرداہی پڑھایا جائے تاکہ کتاب پوری ہوجائے اسلیے کہ چند ہی روز باقی ہیں،خیر آپ بوجہ مجبوری تیار ہوگئے،اور یہ صورت اخیر تک جاری رہی،احقر نے درخواست کی کہ حضرت! ہم عصر کے بعد یا جس وقت آپ کو لینے آتے ہیں تو سورہ بقرہ پڑھ دیا کریں تاکہ آپ کی تکلیف میں کمی واقع ہوسکے،اور ساتھ ساتھ احقر نے اس عظیم مسلم شخصیت حضرت اقدس مخدوم مکرم شیخ یونس جونپوریؒ (متوفی ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰۱۷ء) سابق شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور کا حوالہ بھی دیا جن کی خدمت کا بہ حیثیت امام فی التراویح چند سال احقر کو موقع میسر آیا، جو آپ کی رحلت سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا،تو جوابا حضرت اقدس مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: کہ وہ بھی بیچارے ایسے ہی سحر کے مرض میں چلے گئے،پھر آپ نے اولا عصر کے بعد کا وقت متعین فرمایا پھر یہ کہہ کر کہ اس وقت کافی

بھیڑ ہوتی ہے اس لئے جمعہ کو کچھ طلبہ کو لیکر آ و پھر پڑھ لینا لیکن افسوس وہ جمعہ ہی نہ آسکا۔

اسی درمیان میں ایک نام سننے میں آرہا تھا اور بار بار کانوں سے ٹکرا رہا تھا کہ کوئی عمار بھائی ہیں جو حضرت کے رشتہ دار بھی ہیں اور بے حد خیال رکھنے والے ہیں، اکابر کی خدمت دل وجان سے انجام دیتے ہیں، ممبئی میں تجارت کرتے ہیں، بہت سے اکابر کا علاج ان ہی کی توجہ اور تگ ودو کے نتیجہ سے کارگر رہا، یہ ممبئی سے آکر حضرت کو اپنے ساتھ لیکر جاتے اور علاج کے بعد پھر واپس لاتے، خیر یہ عمار بھائی تشریف لائے احقر کی ملاقات بھی ہے، احقر نے کافی خلیق اور ملنسار، مزاحی مزاج رکھنے والا پایا، غیروں کو لمحوں میں اپنا بنانے کا فن جاننے والے، حضرت الاستاذ کو چٹکیوں میں ہنسا دینے والے، ماتمی مجلس کو شہنائی میں تبدیل کر دینے کے فن سے بخوبی آشنا ہیں، یہ آئے اور درس میں حضرت کے ساتھ آتے اور ساتھ میں لے جاتے ان کے آنے سے اب کتاب کے اختتام کا وقت طے ہو چلا تھا، اور رنگ محفل یکسر بدل گیا تھا، اور ہم ایک عجیب دور سے عجیب دور میں داخل ہو رہے تھے۔

حضرت کی زندگی کا آخری درس

ضبط بھی کر نہ سکے پھوٹ کے روئے بھی نہیں

آخری ایام اپنی تیزی دکھا رہے تھے، ہر کوئی مایوس تھا، ہوا بھی ٹھہری ہوئی تھی، پھول مرجھائے جا رہے تھے، پورا ماحول یکسر بدل گیا تھا، دمکتے اور چمکتے چہرے بھی اپنی تابانی کھو چکے تھے، آج عشاء کے بعد ان کو الوداع کہنا تھا جن کے لیے مر مر جا رہے تھے، جن کو دیکھ کر صحرا کی مہک میں مہک پیدا ہو، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ الوداعی مجلس زندگی بھر کی یاد اور ڈائری بن جائے گی جو لمحہ لمحہ ستاتی اور تڑپاتی رہے گی۔

ایک ڈائری پرانی میرے ہاتھ کیا لگی

یادوں کے زرد پیڑ یکایک ہرے ہوئے

حضرت الاستاذ کے آنے کا وقت ہو چلا تھا، تقریباً بیس یا اس سے کچھ زائد صفحات باقی تھے، قارئین مکمل تیاری کے ساتھ آیے تھے، آپ سج دھج کر خوبصورت سفید عبا پہن کر تشریف لائے، اور سبق کے آغاز ہی میں فرمایا

کہ آج تو میں بالکل اچھا ہوں، دیکھو کیسے فر فر بول رہا ہوں، یہ سن کر ہم خوشی سے اچھلنے لگے کہ آج تو گراں قدر نصائح کا سلسلہ ہوگا اور طویل ہوگا لیکن کیا معلوم تھا کہ یہی آخری وضاحت ہے اس کے بعد چند ہی الفاظ سنے جائیں گے، خیر عبارت کا سلسلہ شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے محمد شاداب اعظمی عبدالرحمن امریکی اور محمد اخلد امروہوی نے عبارت پڑھی اور آخر تک اخلد ہی نے پڑھی، جس وقت کتاب کے چھ سات ورق باقی تھے حضرت الاستاذ مفتی صاحب کے آنسو جاری ہوگئے اور آپ کو دیکھ کر سامنے بیٹھے طلبہ بھی رونے لگے اور جس وقت آخری صفحہ باقی تھا تو آدھے صفحہ سے صاحب عبارت کی آواز بھاری ہوگئی اور رونے کی کیفیت طاری ہوگئی اور منظر ہی بدل گیا ہر کوئی تر آنکھیں لیے بیٹھا تھا، جیسے ہی عبارت ختم ہوئی اور کتاب تکمیل کو پہنچی تو حضرت اقدس مفتی صاحبؒ نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے قطعاً ساتھ نہ دیا بس پھر کیا تھا آپ زور زور سے رونے لگے اور طلبہ کی چیخیں نکل گئیں، دارالعلوم کی دارالحدیث نے آج تک ایسا منظر نہیں دیکھا آپ طلباء کو دیکھ کر زور سے روتے طلبہ آپ کو دیکھ کر چیخیں مارتے، پھر آپ نے کہا جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا، یہ جملہ آپ نے کئی بار دھرایا، یہ سن کر طلبہ کی اور ہچکیاں بندھ گئیں، آپ مسند سے اترنے لگے تو احقر نے آپ کو پکڑا لیکن کسی نے میرا ہاتھ چھڑا دیا یہ کہہ کر کہ آپ دل کے مریض ہیں، ہم قطعاً ہوش میں نہ تھے، اور پھر آپ نے جس وقت ہاتھ اٹھا کر یہ فرمایا: کہ بھائیوں! مجھے اللہ کے واسطے معاف کر دینا۔

وقت رخصت الوداع کا لفظ کہنے کے لیے
وہ تیرے سوکھے لبوں کا تھر تھرانا یاد ہے

بس پھر تو ہماری جانیں نکل گئی، اور ہم کوئی مسند پکڑ کر کوئی دیوار پکڑ کر اتنا رویا کہ زندگی بھر نہ رویا ہوگا، اور ایک ڈیڑھ گھنٹے تک طلبہ درسگاہ ہی میں روتے رہے، اسی درمیان کچھ ترانے پڑھے گیے جن میں اظہر شاداب کا تیار کردہ ترانہ نے تو مزید ہچکیوں کا سماں باندھ دیا۔

مجھے یاد ہے کہ میں زندگی میں اتنا نہیں رویا جتنا اس فراق پر رویا تین دن تک تو آنسوؤں نے تھمنے کا نام ہی نہیں لیا، اگلے روز جب ہم حضرت اقدس مفتی صاحب کو ممبئی سفر کے لیے رخصت کرنے ان کے آستانہ پر پہنچے تو وہی منظر وہاں بھی سامنے آ گیا، آپ ہم کو دیکھ کر رونے لگے اور ہم آپ کو دیکھ کر یہ اتنا دلدوز اور جاں سوز منظر تھا کہ وہ بھی سر دھننے لگے تھے جن کا افسانہ نہ تھا، اور ملک و بیرون ملک کی اور دار العلوم کے دیگر اساتذہ کی طرف سے تسلی کے کلمات طلبہ دورہ حدیث کے لیے کہے گئے، جیسے کہ حضرت مولانا الیاس گھمن صاحب دامت فیوضہ اور مولانا سلمان ندوی صاحب دامت برکاتہم کے پیغامات ہم تک پہنچے تو احقر نے ان تک شکریہ کے کلمات طلباء دورہ حدیث کی جانب سے پہنچائے، اور یوں ہمارا یہ سال ایک انقلابی تاریخی بن کر رہ گیا۔

اس چمن سے وہ ہم جب چلے جائیں گے
سچ کہوں ہم تو بے موت مرجائیں گے
یہ اکابر ہمیں یاد جب آئیں گے
گوشہ تنہائی سے لگ جائیں گے
روئیں گے خود سبھی کو رلائیں گے ہم
بعد اس کے کبھی پھر نہ چپ ہوں گے ہم

❁...❁...❁

اس طرح کر گیا دل کو مرے ویران کوئی

مولانا محمد شاہد اختر کھرساوی

آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

موت ایک ابدی اور لازوال حقیقت ہے، جس سے کسی بھی فرد بشر کو انکار نہیں، فرمان خداوندی: **کل من علیھا فان۔ کل نفس ذائقة الموت** انسان کی فنائیت کی مستحکم ومضبوط دلیل ہے، آیت کریمہ کے بیان کردہ اصول کے تحت ایک نہ ایک دن ہر کسی کو یہاں سے جانا ہے، جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اس دنیا سے تشریف لے گئے، تو ہماری اور آپ کی کیا حیثیت ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی، علماء دیوبند اور عالم اسلام کی ممتاز و مایہ ناز شخصیت، ہم سب کے مخدوم ومکرم، عظیم محدث، بے مثال فقیہ، بلند پایہ مفسر، مشفق ومربی استاد محترم، حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات ہے۔

بھلا ہو موت کا جس نے بنا رکھا ہے افسانہ

واقعہ یوں ہے کہ سال کے آخر میں حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کو ایک عارضہ لاحق ہوا کہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتے، لیکن زبان نہیں چلتی، چناں چہ رجب المرجب کے مہینہ میں جب حضرت مفتی صاحب دارالحدیث میں بخاری شریف مکمل کرانے کے لئے تشریف لائے اور کتاب کی تکمیل پر حضرت مفتی صاحب نے کوشش کی کہ طلبہ کو کچھ نصیحت کروں تو زبان نہ چل سکی، جب کہ حضرت والا کا یہ معمول تھا کہ آخری درس میں طلبہ سے ہم خطاب

ہوتے، پرمغز نصیحت فرماتے اور طلبہ کو مستقبل میں کام کرنے کا گر اور ہنر بتلاتے، جسے سن کر طالبان علوم نبوت جس قدر بھی ہو، اپنے اندر دینی خدمت کا جذبہ پیدا کرتے، بخاری شریف کے آخری درس میں طلبہ صرف اور صرف آپ کی قیمتی نصیحتیں اور تجربات کی باتیں سننے کے لئے تشریف لاتے، دارالحدیث کھچا کھچ بھر جاتا۔

خیر! آخری درس میں سبق کی تکمیل پر حضرت مفتی صاحب نے طلبہ سے ہم کلامی کی ہمت کی، بالآخر زبان چلی ہی نہیں، حضرت والا نے کتاب بند کی، طلبہ زار و قطار رونے لگے، اس دوران حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ نے فرمایا کہ ''اب اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا''، اور مسند سے اٹھنے کے بعد اشارہ سے سلام کرتے ہوئے گھر تشریف لے گئے، دوسرے ہی دن بغرض علاج ممبئی کا سفر کیا، اس کے بعد ہی کرونا جیسی مہلک بیماری کی وجہ سے ملک میں لاک ڈاؤن کا نفاذ ہوگیا، نیز! علاج ومعالجہ کا سلسلہ شروع ہوا، (اس دوران جب بھی استاد گرامی قدر حضرت مفتی ریاست علی صاحب رامپوری مدظلہ العالی، استاد حدیث مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ، سے احاطہ جامع مسجد یا ان کے مکان پر ملاقات ہوئی تو دریافت فرماتے کہ حضرت مفتی صاحب کی طبیعت کیسی ہے، تو میں جواب دیتا کہ جی پہلے سے بہتر ہے، پھر حضرت الاستاذ دامت برکاتہم العالیہ فرماتے کہ دعا کرو اللہ حضرت مفتی صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کی حفاظت فرمائے) علاج ہوا مرض پکڑ میں آ گیا، بے شمار تلامذہ نے آپ کی صحت یابی کے لئے دعا کی اور اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت رہی کہ طبیعت اس حد تک بحال ہوگئی کہ رمضان المبارک میں بعد تراویح لوگوں کے اصرار پر درس قرآن اور سوال وجواب کا بھی سلسلہ شروع فرمایا، اور وہ بھی اسی انداز اور بشاشت کے ساتھ جس طرح آپ درس میں کلام فرماتے، ہم نے جب یہ سنا کہ حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رمضان المبارک میں تراویح کے بعد بیان فرمائیں گے تو یہ سن کر طبیعت میں جان آ گئی کہ اب حضرت مفتی صاحب صحت یاب ہوگیے ہیں، اور خرابی صحت سے ذہن میں جو ایک خلجان اور تشویش تھی وہ دور ہوگئی، لیکن خدا کی قدرت بھی عجیب ہے کہ پندرہ رمضان تک حضرت والا علم وعرفاں کی موتی بکھیرتے رہے، پھر اس کے بعد

طبیعت بگڑ گئی، اور ایسی بگڑی کہ سنبھلنے کا نام ہی نہیں لیا، اور ذہن میں جو ایک ڈر اور خوف تھا، اس کا ظہور ہو ہی گیا، بالآخر حضرت الاستاذ ۲۵ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ر مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت اشراق جوار رحمت ہو گیے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس طرح کر گیا دل کو مرے ویران کوئی

خداوند قدوس نے نیک بخت، سعید کو ماہ مبارک میں اٹھایا، جو کہ مومنین کے لیے اعلی درجہ کی سعادت اور خوش قسمتی کی بات ہے، اور وہ بھی رمضان کا آخر عشرہ جہنم سے خلاصی کا ذریعہ ہے، سونے پر سہا گہ۔

حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کی طبیعت کئی دفعہ خراب ہوئی لیکن علاج ومعالجہ کے بعد صحت یاب ہو گئے اور اس دفعہ بھی ہمیں یہی امید تھی کہ حضرت مفتی صاحب صحت یاب ہو کر دیوبند تشریف لائیں گے اور علم وعرفاں کی موتی دوبارہ بکھیریں گے، لیکن اس دفعہ اللہ کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا اور تقدیر خداوندی مخلوق کی تدبیر پر غالب آ کر ہی رہی، اور یہ حادثہ فاجعہ ایسے ناخوش گوار حالات میں رونما ہوا کہ ہم جیسے کمزور طالب حضرت کی آخری زیارت سے بھی محروم ہو گئے، حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کی وفات کو آج کئی روز ہو گئے، لیکن رہ رہ کر ذہن ودماغ میں حضرت کا انداز تکلم گردش کر رہا، گفتگو کا جو طریقہ اپناتے تھے وہ اب بھی ذہن میں مچل رہا ہے، اور یقین بھی نہیں ہوتا کہ آپ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، ان پر کہے گیے منظوم کلام کو سن کر سکون حاصل کرتا ہوں، لیکن ہمارے بس میں کچھ نہیں ہے، جانے والے چلے گئے اب دوبارہ لوٹ کر آنے والے نہیں۔

حضرت مفتی صاحب کی وفات سے آج پورا عالم سوگوار ہے، ہم نے ایک ایسی ہستی کو سپرد خاک کیا ہے جو اب دوبارہ کسی قیمت پر لوٹ کر آنے والی نہیں، ہم نے ایک ایسی ہستی کو کھو دیا ہے جس کا ظہور اب بظاہر مشکل ہے، علم وعمل کا ایک آفتاب عالمتاب ہم سے جدا ہو گیا، جس کے فیضان علم سے سارا عالم سیراب تھا، ہمارا طبقہ ایک ایسی شخصیت کی وجود سے خالی ہو گیا جس کی نظیر اب ممکن نہیں، ہمارا حلقہ ایک ایسے ماہر علم وفن کے مجموعے سے خالی ہو

گیا جس کا ثانی اس قحط الرجال کے دور میں شاید و باید ہو، آج مختلف علوم وفنون کے جامع شخصیت ہماری نگاہ سے اوجھل ہے، آج علم کے نیر تاباں نے ہم سے منہ موڑ لیا، آج ہمارے قافلے کا سپہ سالار قبر میں آرام کی نیند سو رہا ہے، آج ہمارا راہبر و رہنما فانی زندگی سے رخ موڑ کر ابدی وازلی آرام گاہ کی طرف منتقل ہو گیا، بے شمار علماء وفضلا کو قافلہ سالار نے یتیم کر کے جوار رحمت میں جگہ لی۔

موت اس کی کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے مرنے کے لیے

آج منبع علم وعرفاں ہمارے چہروں کو غمگین اور قلوب کو رنجیدہ کر کے آسودہ خواب ہیں، آج صدر المدرسین ہمارے آنکھوں کو پرنم کر کے آغوشِ رحمت میں آرام فرما ہیں، آج ہم شیخ الحدیث کی رحلت سے مغموم ہیں، آج ہم منصب حدیث کی زینت سے محروم ہو گئے، آج ہم سب کے بڑے اپنے چھوٹوں اور خردوں کو علمی دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ گیے، آپ کی جدائی سے ہر فرد کھویا ہوا ہے، آپ کی فراق جاودانی سے ہر شخص اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا ہے، آپ کی جدائیگی سے آنکھیں پرنم اور اشکبار ہیں، آنکھوں میں سفیدی کے بجائے سرخی غالب ہے، جس سے حزن وملال کی علامت کا بخوبی پتہ چلتا ہے، رنج والم کی کیفیت تھمنے کا نام نہیں لے رہی ہے، اداسی و مایوسی کے آثار اب تک لوگوں کے چہروں پر عیاں ہیں، علمی طبقہ حیران و پریشان اور ششدر وشش و پنج میں مبتلا ہے، نہ جانے کتنے لوگ اب تک آپ کے فراق میں آنسو بہا رہے ہوں گے۔

آپ کی شخصیت علمی و عملی خوبیوں اور گونا گوں خصوصیات سے منور تھی، آپ علم کے ایک دیا تھے جو جلا کر چلے گئے، آپ لوگوں کو عملی زندگی کی راہ بتلا کر اور سمت دکھا کر رخصت ہو گئے، آپ کی علمی ضیا پاشی سے پورا عالم سرشار تھا، آپ کی علمی روشنی سے سارا عالم سرسبز و شاداب تھا، آپ کی شخصیت ایک باغیچہ، باغباں، پھول اور عمدہ و خوبصورت مہک کی سی تھی۔ اب ایسی شخصیت ہمیں کہاں نصیب؟

اب نہیں لوٹ کر آنے والا   گھر کھلا چھوڑ کر جانے والا

آپ کی ذات پورے عالم اسلام کا ایک ایسا متاعِ گراں مایہ، سرمایہ بلند پایہ تھا، کہ جس کے اٹھ جانے سے جتنا بھی ماتم اور افسوس کیا جائے کم ہے، افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ جنازہ میں شرکت بھی نصیب نہ ہوئی۔

حیف صد حیف! علم وعمل کی جیتی جاگتی شکل وصورت، اسلامی رواداری کی حامل شخصیت، اپنے خردوں کے علمی کام پر داد وتحسین سے نوازنے والی ہستی نے بارگاہ ایزدی میں جگہ لے لی، اور روز بروز ایسی شخصیتیں عنقا ہوتی جا رہی ہیں، آج لوگ حضرت مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت کو دیکھنے کے لیے ترس رہے ہیں، مادر گیتی کی کوکھ آج ان کے وجود سے خالی ہوگئی، آئندہ نسلیں حضرت کے تذکرے کتاب کے صفحات میں پڑھیں گے تو ان کے کمالات علمی کو پڑھ کر ہاتھ ملتے رہ جائیں گے، اور اس وقت ان کی پاکیزہ صفات کے مانند، بطن ارضی پر ان کی سی ایک صورت وسیرت بھی نہیں ملے گی۔ **اللهم إغفر له وارحمه رحمة واسعة وامطر عليه شآبيب لطفك السني وكرمك الهمني تامة وكاملة.**

لوگ خاک میں ڈھونڈتے ہیں سونا
ہم نے سونا سپرد خاک کیا

میں تو حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کا انتہائی نالائق ونا کارہ شاگرد ہوں میں کیا لکھوں؟ اصل تو حضرت کے مخصوص، ملک وبیرون ملک اور عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ممتاز ونمایاں تلامذہ کے علاوہ دیگر حضرات بھی حضرت الاستاذ کی تدریسی زندگی، تصنیفی وتالیفی پہلو، خدمات وخصوصیات اور دیگر گوشوں کو اجاگر کریں گے، اور لکھنے والے حضرت کی شخصیت پر مستقل لکھیں گے، جس سے ہم سب خوب مستفیض ہوں گے، ان شاء اللہ، میرے ذہن ودماغ میں کچھ نقوش ہیں بس اسی کو قلمبند کررہا ہوں۔

حضرت الاستاذ قدس سرہ دار العلوم دیوبند کے عظیم منصب حدیث کے چشم صافی تھے، صدر المدرسین تھے،

علم وفن کے بحر بیکراں تھے، یادگار اسلاف تھے، اپنے اساتذہ واکابر کے پیشوا تھے، دارالعلوم دیوبند کے سپوت تھے، آپ کی ذات مرجع الخلائق تھی، ہرفن میں نمایاں مقام رکھتے تھے، عالم اسلام کے عظیم محدث، مفسر اور فقیہ تھے، کثیر التصانیف شخصیات میں آپ کا شمار ہوتا ہے، علمی شخصیت بلند وبالا اور نمایاں تھی، اس دور میں شاذ ونادر ہی وہ تمام خوبیاں جو آپ میں تھیں کسی اور کے اندر مجتمع ہوں، آپ کی شخصیت علمی شان وشوکت اور رفعت وعظمت سے لبریز تھی، آپ ایک باکمال، بہترین، منجھے ہوئے، تجربہ کار مدرس تھے، حضرت نے اپنی زندگی تدریس ہی کے لیے وقف کی، پوری زندگی قال اللہ وقال الرسول میں گزاری، زمانہ طالب علمی سے جو یہ سلسلہ شروع ہوا تو آخر دم تک جاری رہا، یقیناً وہ لوگ سعادت محسوس کررہے ہوں گے جو آپ سے فیض یاب ہوکر اپنی علمی وعملی زندگی کو کامیاب بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں مصروف ہیں، کیوں کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب کہ آئندہ نسلیں حسرت کے ساتھ یہ کہیں گی کہ اب اس دنیا میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے تلامذہ میں سے کون کون حیات ہیں، اور ان سے استفادہ کو حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے توسط سے اپنے لیے باعث فخر محسوس کریں گے، یقیناً آپ کی وفات ملت اسلامیہ، تلامذہ، طالبان علوم نبوت اور دارالعلوم دیوبند کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

آپ ایک بارعب مدرس تھے، آپ کے سامنے جلدی کسی کی ہمت نہیں اور نہ ہی مجال کہ کچھ کہہ سکے، لیکن طلبہ عصر کے بعد کی مجلس میں اپنی بات رکھتے تھے، آپ کے چہرہ انور سے رعب کے آثار نمایاں تھے۔

حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے عظیم منصب کے حامل قدیم بزرگوں کی علمی یادگار تھے اور منصب حدیث جیسے عظیم بارگراں کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے، آپ کے علم کا اعتراف ہر شخص کے زبان پر تھا، معاصرین بھی آپ کی علمی خدمات، علمی لیاقت اور ذہانت کے معترف ہیں، چناں چہ ایک واقعہ کو سپرد قرطاس کرنا

مناسب سمجھتا ہوں۔

ایک دفعہ میں نے حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کا انداز تفہیم کو اپنے قابل قدر استاد حضرت اقدس مولانا بلال اصغر صاحب دیوبندی دامت برکاتہم العالیہ استاذ دارالعلوم دیوبند (جو حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سابق استاد حدیث دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادے اور حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سابق استاد حدیث دارالعلوم دیوبند کے پوتے ہیں، دونوں حضرات دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اور جلیل القدر اساتذہ میں سے تھے، حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب قدس سرہ کے مضامین ''رسالہ القاسم'' دارالعلوم دیوبند میں برابر شائع ہوتے تھے، بعض شماروں میں تو پورے کے پورے آپ ہی کے مضامین ہیں، حضرت الاستاذ دامت برکاتہم العالیہ کے خاندان کا علمی خدمات کا سلسلہ تین پشتوں سے دارالعلوم دیوبند میں جاری ہے، اس اعتبار سے دیوبند کا یہ پہلا علمی خاندان ہے) سے بیان فرمایا، اور ان کی شخصیت کے بارے میں کہا تو حضرت استاد محترم مدظلہ العالی نے فرمایا کہ بیٹے ہر کوئی اپنے شیخ کے بارے میں یہی کہتا ہے، علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ حضرت کے بارے میں کہتے تھے کہ ہمارے شیخ کی طرح کوئی نہیں ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ میں علوم وفنون کی جو جامعیت تھی وہ شاید ہی کسی میں ہو، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ اپنے شیخ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ کی مثال نہیں دی جاسکتی، میں بھی بخاری شریف حضرت ہی سے پڑھی ہے، حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ حضرت کے بارے میں بہت کچھ بیان فرماتے ہیں، اسی طرح بعد کے حضرات بھی اپنے شیخ کے بارے میں فرماتے ہیں، پھر فرمایا کہ تم بھی اپنے شیخ کے بارے میں یہی کہہ رہے ہو، ہمیشہ اس منصب پر علمی لوگ جلوہ گر ہوتے رہے، اللہ بہت بڑا ہے، ان کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کسی کو جلوہ افروز فرمادیں گے۔

اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ دامت برکاتہم العالیہ کی بات قبول فرما کر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا دارالعلوم

دیوبند کونعم البدل عطا فرمائے، آمین اور کیوں کر اپنے شیخ کا تذکرہ نہ کروں، چونکہ ان کی زندگی ہمارے آنکھوں کے سامنے تھی، ہم نے انہیں بہت قریب سے دیکھا، ان سے استفادہ کیا، نیز! ہم حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے علمی کمال اور جاہ وجلال سے بخوبی واقف تھے، حضرت مفتی صاحب کے تعلق سے حضرت مولانا بلال اصغر صاحب کی ایک بات اور نقل کرتا ہوں، میں حضرت مولانا بلال اصغر صاحب دیوبندی دامت برکاتہم العالیہ سے بہت مانوس تھا، اور حضرت بھی اس ناچیز کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے، اور اب بھی یہی حال ہے، فون پر بھی گفتگو ہوتی تو انتہائی بشاشت کے ساتھ حال دریافت فرماتے اور دعاؤں سے نوازتے، ''مدنی دارالمطالعہ'' کا اختتامی پروگرام سے تقریباً ۲۵؍دن قبل حضرت الاستاذ مفتی محمد عفان صاحب منصورپوری دامت برکاتہم العالیہ استاذ حدیث وصدر المدرسین مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد کے ہمراہ دیوبند جانا ہوا تو میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، اس دوران بھی ماضی کی طرح پیش آئے، اور ایک ایک بات معلوم کرتے رہے، اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

بسا اوقات میں اور رفیق مکرم مولوی محمد احمد بجنوری فاضل دارالعلوم دیوبند دونوں ساتھ میں حضرت کے یہاں جاتے، اور کبھی کبھی میں اکیلا ہی چلا جاتا، میں حضرت سے بے تکلف بھی تھا، ماضی کے بہت سارے واقعات حضرت سے مجھے سننے کو ملے، دارالعلوم دیوبند میں عربی چہارم میں جغرافیہ کی کتابیں نصاب میں داخل ہیں، ایک دفعہ اس سے متعلق بحث چھڑ گئی، حضرت مولانا جغرافیائی اعتبار سے مصر وحجاز کی باتیں بتانے لگے، میں نے دبے الفاظ میں کہا کہ حضرت اس زمانہ میں اس کا کیا فائدہ، پڑھ کر کیا ہوگا، اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے کہ بیٹے جا اپنے صدر المدرسین ''سعید'' سے جا کر معلوم کر اسی نے تو داخل کر رکھا ہے، معلوم کرو کیوں داخل کیا ہے، مزید فرمانے لگے کہ ''سعید'' نے تو پڑھ رکھا ہے، اس وقت دارالعلوم میں علم جغرافیہ میں مہارت بھی اسی کو ہے۔

یہ تھا حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا اپنے معاصرین میں علمی مقام، اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت مفتی صاحب

نے تمام فنون کی کتابیں پڑھیں اور پڑھائیں، ہر میدان میں ان کا ایک ممتاز مقام تھا، کوئی بھی فن ہو اس کی باریکیوں سے خوب واقف تھے، پہلے دار العلوم میں علم جغرافیہ، علم ہیئت کے علاوہ دیگر فنون کی بعض اہم کتابیں بھی نصاب میں داخل تھیں، اس زمانہ میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہ ہمارے لیے حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ سے کیا کم تھے، ہمارے لیے آپ کی شخصیت نعمت عظمیٰ کی حیثیت رکھتی تھی۔

کہانی ختم ہوئی اور ایسی ختم ہوئی
کہ لوگ رونے لگے تالیاں بجاتے ہوئے

محنت ومشقت اور جد و جہد میں حضرت مفتی صاحب کی مثال دی جاتی تھی، شروع ہی سے آپ محنت کے عادی تھے، اور آخر تک محنت کرتے رہے، آپ نے وقت کو خوب نچوڑا، ضائع ہونے نہیں دیا، معمول کے مطابق کام کرتے تھے، ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے تھے، بیماری کے باوجود بھی حضرت مفتی صاحب اپنے معمولات میں کمی نہیں آنے دیتے تھے، وقت کی خوب خوب قدر کی اور اوقات کی قدر ہی کے بدولت حضرت مفتی صاحب نے علمی دنیا میں اپنے آپ کو روشناس کرایا، محنت وجفاکشی اور جہد مسلسل ہی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے علمی میدان میں اپنا سکہ جمایا اور لوہا منوایا، لوگ مثال دیتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وقت کے بڑے قدرداں تھے اور صحیح معنوں میں انہوں نے وقت کو نچوڑا اور اس کا صحیح استعمال کیا، لیکن اس دور میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ بھی وقت کے بے انتہا قدر داں تھے، اور اس کا صحیح استعمال کیا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا محنت کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت کتابیں ان کے سامنے رہتی تھیں، آپ نے ایک باکمال مدرس بننے کے لئے اپنے آپ کو کھپا دیا، دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد دار العلوم اشرفیہ راندیر کے زمانہ تدریس میں روزانہ کا سبق مطالعہ کرتے، پھر مرتب انداز میں اسے کاغذ پر نوٹ کرتے، اس کے بعد لکھی ہوئی تحریر کا مطالعہ فرماتے، پھر کوئی خامی

نظر آتی تو اسے دور کرنے کے بعد خلاصہ کا خلاصہ اور نچوڑ کو سبق میں مرتب انداز میں بیان فرماتے، اس طرح کے محنت کے بعد تدریسی میدان میں آپ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوا، دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں تفسیر وحدیث کی اعلی کتابیں آپ کے زیر درس رہیں، جن میں ”ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، شمائل ترمذی، طحاوی شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، مؤطین، مشکوۃ شریف، جلالین شریف“ وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب طلبہ کا حق مکمل طور پر ادا کرتے، جس طرح آپ ایک کامل مدرس تھے، اسی طرح آپ مدرسین اور اپنے تلامذہ کو نصیحت فرماتے تھے کہ کامل مدرس بنو، حقیقت میں آپ استاد گر تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ ہدایہ ثانی کے سبق میں حضرت الاستاذ مفتی خورشید انور صاحب گیاوی دامت برکاتہم العالیہ استاذ حدیث وناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے دوران درس فرمایا کہ ہدایہ ثانی کا سبق مجھ سے متعلق ہوا تو ایک روز تین یا ساڑھے تین صفحات میں نے پڑھایے یہ ابتدائی دور تھا، حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، فرمانے لگے کہ آج کتنا پڑھایا؟ حضرت مفتی خورشید انور صاحب نے جواباً عرض کیا کہ اتنا پڑھایا، تو حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ پڑھاتے ہو یا خانہ پوری کرتے ہو، حضرت مفتی خورشید انور صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی عبارت میرے قول سے جدا تو ہوسکتا ہے، لیکن مفہوم تقریباً یہی ہے، حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کا کہنے کا منشاء یہ تھا کہ کامل استاد بنو، محنت ولگن سے پڑھاؤ، طلبہ کا حق ادا کرو۔

حضرت مفتی صاحب کا جو مزاج تھا اسی مزاج کے مطابق اپنے تلامذہ کو بھی ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے، اور تلامذہ کو اس میدان میں محنت کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے، اس سلسلہ میں آپ کی جتنی بھی تعریف اور ثناء خوانی کی جائے کم ہے، اس اعتبار سے آپ ایک بے مثال مربی تھے، نہ جانے کتنے لوگ آپ کے درسی انداز، انداز تکلم اور انداز تفہیم کو اختیار کیا ہوگا اور اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے، خلاصہ یہ ہے کہ اس دور میں آپ کی

شخصیت ہیرے، موتی اور جواہرات سے کچھ کم نہیں تھی، ہم جیسے کمزور، ناتواں اور ناقص طالب علم کے لیے حضرت کی زندگی سے سیکھنے کا بہترین موقع ہے، اللہ ہم سب کو وقت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے علمی مقام سے ہر شخص آشنا اور واقف ہے، آپ ایک کہنہ مشق عالم دین اور مدرس تھے، شریعت مطہرہ کے اسرار وغموض سے واقف تھے، دین اسلام کی خاطر ہر اعتبار سے آپ جان نچھاور کرتے تھے، حدیث کی پیچیدگیاں، تفسیر قرآن کے ماقبل ومابعد سے ربط وتعلق کا انداز اور سلیقہ، فقہ وفتاویٰ کی باریکیاں، موجودہ حالات کے اعتبار سے فقہی کلیات وجزئیات کی تصریحات وتشریحات، منطق، علم کلام، فلسفہ اور علم عقائد کے پیچیدہ مسائل، باریکیاں، اور موشگافیوں سے بخوبی آشنا، فن حدیث پر عمیق نظر، احادیث کے سیاق و سباق اور نزاکت سے باخبر، اسماء الرجال پر گہری نظر اور اس کے نشیب وفراز کا آپ کو کامل علم تھا۔

یہ تھے حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کے کمالات علمی، جس کا معترف ہر شخص ہے، فرماتے تھے کہ اس وقت دیوبندیوں میں جس درجہ بھی علم ہے اس کی قدر کرو اور حفاظت کرو، اللہ ہمیں علم کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دارالعلوم دیوبند نے ڈیڑھ سو سال میں ہر میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں، اس حوالہ سے کوئی انکار نہیں

کرسکتا، دارالعلوم کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، ہر موضوع پر ہمارے اکابر کی ایسی اور بے مثال تصنیف ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی، ہمیں فخر ہے کہ علماء دیوبند نے مذہب اسلام کو بدعات وخرافات سے بچا کر امت مسلمہ کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔

فرقہ باطلہ کے تعاقب اور بدعات وخرافات کے خاتمہ میں دارالعلوم دیوبند کی زریں اور نمایاں خدمات ہیں، علماء دیوبند اور فضلاء دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے سلسلے میں طویل فہرست ہے،، جن میں نمایاں نام قطب العالم، محدث دوراں، فقیہ النفس حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الامت حضرت

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ کا ہے، اس میدان میں ان دونوں حضرات کی خدمات بے مثال اور لازوال ہے، اس حوالے سے اس دور میں ہم نے جنہیں دیکھا ان میں نمایاں نام حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری شیخ رحمہ اللہ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی شخصیت بہت نمایاں، ممتاز اور موزوں تھیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے فرقہ باطلہ کے تعاقب میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، آپ اس میدان کے بھی سپہ سالار اور شہسوار تھے، اس میدان میں بھی آپ نے اپنے خوب جوہر دکھائے، اور بغیر کسی پرواہ کے دین اسلام کی حفاظت میں بھرپور حصہ لیا، حق بات کہنے کے عادی تھے، اور جہاں خامی نظر آتی حضرت والا فوراً نکیر فرماتے اور ٹوکتے تھے، اصلاح ان کا مشن تھا، اسلام کی حقانیت اور ترویج واشاعت میں آپ نے اپنا قیمتی وقت صرف کیا، کسی کی تعریف اور توثیق کے بغیر آپ بدعات وخرافات کی اصلاح کو اپنی ذمہ داری اور دینی فریضہ سمجھتے تھے، حق گوئی و بے باکی میں ضرب المثل تھے، دلائل وشواہد اور کتاب وسنت کی روشنی میں گفتگو فرماتے، بغیر حوالہ اور دلیل کے کوئی بات نہیں کرتے، لاکھ مخالفت کی جائے، برا بھلا کہا جایے، بلکہ مخالفت کا طوفان سامنے کھڑا ہوتب بھی ڈر اور خوف محسوس نہیں کرتے، یہ آپ کی ہمت وجرات، بہادری اور بلند حوصلگی کی کامل اور بین دلیل ہے، احقاق حق اور ابطال باطل آپ کی زندگی کا ایک نمایاں، روشن اور تاریخی باب ہے، برملا تردید فرماتے، مسلک حق کی اشاعت اور اس کے صحیح رخ کو پیش کرنا حضرت

نور اللہ مرقدہ نے اپنا فرض سمجھا، مسلک دیوبند کے حقیقی معنوں میں آپ ترجمان تھے، معاشرے سے خرافات کو دور کرنے کے لیے آپ ہمیشہ فکر مند رہے، دیوبندیت کے منہج ومزاج اور طریقہ کار کو امت مسلمہ کے سامنے کھل کر بیان کیا، اور تحریری وتقریری شکل میں اسے عام کیا، جو رائے قائم کر لیتے تو اس پر تصلب کے ساتھ قائم رہتے، ان کی رایے میں ایک قسم کا جماؤ تھا اور اس مسئلہ پر دلائل اور شواہد پیش کرتے چلے جاتے، بہت سے

لوگ ہوتے ہیں کہ ایک رایے قائم کرنے کے بعد جب مخالفت کی جائے تو اپنی رایے سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں لیکن آپ میں یہ چیزیں نہیں تھیں، آپ علماء دیوبند کے شان بان اور آن تھے، گروہ دیوبندیت کے آپ سالار قافلہ تھے، فرقہ باطلہ میں بھی آپ کی وسعت علمی، گہرائی و گیرائی، نظر عمیق، دقیق نگاہ اور باریک بینی نے یہ باور کرایا کہ اس دور میں حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ شریعت اسلامی کے علمبردار ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کی ایک خوبی یہ تھی کہ آپ استقامت کے ساتھ اپنے کام میں پوری زندگی مصروف رہے، زندگی میں دشوارگزار راہوں کو عبور کیا، کٹھن راہ سے گزرے، حالات نے گھیرا، آلام ومصائب کے پہاڑ راہ میں حائل ہویے، لیکن ہر ایک پریشان کن مرحلہ کو عبور کیا، اپنی ذات سے دوسروں کو یہ پیغام دیا کہ ہر مشکل اور کٹھن مسئلے پر انسان کو صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے، چہرہ پر ذرہ برابر بھی شکن کا نام ونشان نہیں رہتا، فرحت وشادما اور خوش وخرم نظر آتے، ہر حال میں خوش رہتے، خوشی کا اظہار فرماتے، حالات آئے لیکن صبر سے کام لیا، صبر کا بندھن ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں پریشانی کو ضبط کرنے کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا، حالات کا مقابلہ کیا، اللہ کے فیصلے پر راضی رہتے، بس یوں فرماتے کہ جو ہونا تھا ہو گیا، حالات کو کبھی اپنے اوپر غالب آنے نہیں دیا، صبر وضبط، توکل علی اللہ، تقویٰ وطہارت، تواضع وانکساری، سادگی، منکسر المزاجی یہ صفات آپ کی زندگی کی نمایاں صفات میں سے ہیں، مزاج میں نظافت کا رنگ غالب تھا، معمولی کپڑا استعمال کرتے، لیکن سادہ لباس میں بھی آپ کی علمی رفعت وعظمت اور عالمانہ شان وشوکت کی وجہ سے آپ کی شخصیت نمایاں نظر آتی۔

حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ ایک خوددار انسان تھے، آپ نے دنیا میں بے اعتنائی اور بے رغبتی کی زندگی بسر کی، طمع وحرص کا تو نام ونشان تک نہیں، قناعت پسندی، صبر، اللہ کے فیصلے پر رضامندی، ان صفات کو اپنی زندگی میں حرز جان بنائے رکھا، تدریس کے ابتدائی دور میں مالی ضرورت اور بغرض حاجت، مدرسے سے تنخواہیں تو لیں

اور استعمال بھی کیا، لیکن جب اللہ تبارک وتعالی نے آپ کو مالی وسعت اور فراوانی سے نوازا تو حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ نے زندگی بھر کی ساری تنخواہیں ''مدرسہ اشرفیہ راندیر'' اور ''دارالعلوم دیوبند'' کو بیک وقت واپس کردیں، اور پھر زندگی کے آخری ایام تک بلاتنخواہ، فی سبیل اللہ دین کی خدمات انجام دیتے رہے، جو آپ کی زندگی کا ایک روشن وتابناک کارنامہ ہے۔

حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کی شخصیت جاذب نظر، پرنور چہرہ، پرکشش اور دیکھنے میں نمایاں ودلکش معلوم ہوتی تھی، عالمانہ شان اور جاہ وجلال ایک خاص قسم کا آپ کی شخصیت میں موجود تھا۔

اٹھ گئیں ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجئے

حضرت الاستاذ قدس سرہ کا انداز درس وطرز تفہیم بھی بہت نرالا تھا، آپ کی درسی مقبولیت کی دھوم تو ملک وبیرون ملک میں مچی ہوئی تھی، اس میدان میں ہر فرد آپ کو اپنا رہنما وسرپرست سمجھتا تھا، دینی درسگاہوں کا ہر طالب علم آپ کے درس سے متاثر تھا، احقر کا بیرون ملک کے کئی احباب سے رابطہ ہوا دوران گفتگو ہر ایک نے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا انداز درس وانداز تفہیم لاجواب ہے ان سے بہت متاثر ہوں، بنوری ٹاؤن کراچی کے ایک فاضل نے تو حضرت مفتی رحمۃ اللہ علیہ کا انداز درس کا کھلےلفظوں میں اعتراف کیا، (خود حضرت مولانا منظور مینگل صاحب کا حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت کے بارے میں تعریفی کلمات موجود ہیں،) اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب غزنوی دامت برکاتہم العالیہ (جو کہ ایک جید الاستعداد، عمدہ صلاحیت، قابلیت اور اچھے عالم دین ہیں، دارالعلوم دیوبند کے خوشہ چیں ہیں، اور دارالعلوم دیوبند میں تدریسی فرائض بھی انجام دے چکے ہیں، حضرت مفتی رحمۃ اللہ علیہ مخصوص تلامذہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے)

حضرت الاستاذ نوراللہ کے خاص تربیت یافتہ ہیں، اور ترمذی شریف کے اسباق ان سے متعلق ہیں، حضرت

مفتی صاحب رحمہ اللہ کا مولانا غزنوی صاحب مدظلہ العالیہ برابر تذکرہ فرماتے رہتے ہیں۔

حضرت مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ کا انداز درس کا کیا کہنا، وہ تو اس فن میں ضرب المثل تھے، ان کے اسباق میں تو مائک والا بھی بالکل چاک و چوبند رہتا، ایک مرتبہ سبق میں مائک کی آواز ٹکرانے لگی، کچھ خراب سا ہونے لگا، حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ یہ کیا ہورہا ہے، کہاں ہے مائک والا، تمہیں یہاں کیوں بٹھا رکھا ہے، آئندہ مائک خراب نہیں ہونا چاہیے، وہ صاحب پھر وہیں بیٹھے رہتے تھے جب تک سبق ختم نہیں ہوجاتا، بخاری شریف کے سبق میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ عبارت خود ہی پڑھتے تھے، ان کے عبارت کے سلسلہ میں بڑی سختی تھی، سال کے آخر میں دو چار طلبہ کو یہ سعادت نصیب ہوجاتی کہ وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سبق میں عبارت پڑھتے، آپ کے یہاں شروع سال میں جس طرح مقدار خواندگی ہوتی، اسی طرح سال کے آخر تک درس کا سلسلہ جاری رہتا، جس سے طلبہ لطف اندوز ہوتے، طلبہ اور کتاب کا حق مکمل طور پر ادا کرتے، عام طور پر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ آغازِ سال میں اساتذہ ومدرسین لمبی چوڑی تقریریں کرتے اور آخر سال میں کتاب دوڑاتے، حل عبارت بھی غائب اور بعض جگہ کے بارے میں سننے کو یہاں تک ملا کہ نصاب بھی مکمل نہیں کرتے، لیکن حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کا معاملہ پورے سال یکساں رہتا تھا، آپ اخیر سال تک انتہائی شفقت ومحبت، محنت ولگن اور دلچسپی کے ساتھ درس دیتے تھے۔

حضرت الاستاذ نے بخاری شریف فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، حضرت فخر المحدثین قدس سرہ کا علمی رنگ آپ پر غالب تھا، حضرت مفتی صاحب بخاری شریف کا درس چوتھے گھنٹے میں دیتے تھے، حضرت والا آدھا گھنٹہ تاخیر سے تشریف لاتے، شروع سال ہی میں اصول بیان فرمادیتے تھے کہ آدھا گھنٹہ تاخیر سے میں آؤں گا، اور یہ وقت اس لیے دے رہا ہوں تاکہ تم لوگ تمام ضروریات سے فارغ ہوکر آؤ، اور چھٹی کے بعد تک پڑھاؤں گا۔

حضرت مفتی صاحب کے درسگاہ میں آنے کے بعد اگر کوئی طالب علم آتا تو سخت ناراض ہوتے، اور پھر فرماتے کہ ہمارے آنے کے بعد کوئی نہ آئے، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ درسگاہ میں جب حاضر ہوتے تو مسند پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے اپنے مخصوص انداز اور لب ولہجے میں طلبہ کو سلام کرنا آپ کی عادت مستمرہ تھی، پھر درسگاہ میں سناٹا چھا جاتا، طلبہ اپنی اپنی نشست میں بیٹھ جاتے، سبق میں آپ کے اردگرد کھانسنے والوں کو بھی بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔

درس کا عجیب منظر تھا، تمام طلبہ پر آپ کا رعب تھا، باریک باریک باتوں کی طرف خاص توجہ دینا، رہنمائی اور اصلاح فرماتے تھے، بخاری شریف کی عبارت خود ہی پڑھتے تھے، عبارت سے قبل عبارت حل فرماتے، مفہوم سمجھاتے، سیر حاصل بحث فرماتے، اقوال ائمہ بیان کرنے کے بعد مسلک حق کو واضح فرماتے، شواہد اور دلائل کی بنیاد پر راجح قول کی نشاندہی فرماتے، بعدہ عبارت سے ملاتے، اور خاص خاص مقام کا ترجمہ بھی کرتے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا انداز بالکل انوکھا، اچھوتا، انبیلا اور نرالا تھا، ہر طالب علم کو آپ کی بات پوری طرح سمجھ میں آتی تھی، حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں درس میں جو سب سے ادنی ذہن کے طلبہ ہوتے ہیں ان کی رعایت کرتے ہوئے سبق پڑھاتا ہوں تاکہ سب کو بآسانی سمجھ میں آجائے تفہیم میں تو حضرت مفتی صاحب اپنی مثال آپ تھے، رک، رک کر، ٹھہر، ٹھہر کر کلام کرتے، کوئی حرف کٹنے نہیں پاتا، مرتب انداز میں کلام فرماتے، اپنے مخصوص اور جداگانہ لب ولہجے میں درس دیتے تھے، خوبصورت انداز اور جملوں کو دل نشین پیرایہ میں پرونے کا آپ کو سلیقہ اور ہنر تھا، عمدہ اسلوب اور انوکھا انداز بیاں سے ہر طالب آپ کا گرویدہ وہمنوا تھا، یقیناً آپ ایک قابل فخر اور لائق تقلید استاد تھے، جس انداز اور رفتار سے آپ درس حدیث دیتے تھے کہ بہت سارے طلبہ آپ کے کلام کو بآسانی نوٹ کر لیتے تھے، جس جگہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ سیر حاصل بحث کرتے، اور پوری بشاشت، توجہ اور انہماک کے ساتھ درس دیتے تو ہم طلبہ کے ذہن میں یہ بات آجاتی کہ

شاید یہ محل امتحان ہے، چونکہ حضرت الاستاذ

مفتی خورشید انور صاحب گیاوی دامت برکاتہم العالیہ استاذ حدیث وناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند بھی دوران درس کبھی کبھی اہم مقامات پر یوں فرمایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی اس سے بات واضح ہوجاتی تھی کہ یہ محل امتحان ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نبض شناس عالم دین تھے، طلبہ کے مزاج سے بخوبی واقف تھے، ایک بڑی تعداد نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے میدان عمل میں سرگرم عمل ہیں، بہت سے مدرسین اور اساتذہ نے آپ کے انداز درس، اسلوب اور طریقہ کار کو اپنے نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش مزید اس میں پختگی کے لیے جد وجہد کی ہوگی اور کررہے ہوں گے، آپ کے درس میں نظائر وامثلہ کی بھرمار رہتی، طلبہ مطمئن رہتے، کتاب کی ابتدا سے پہلے امام بخاری رحمہ اللہ کے حالات زندگی بیان فرماتے اور ہر طالب علم سے اسمائے حسنی یاد کرواتے، آپ کی گفتگو میں جو مٹھاس، شیرینی، ملاحت اور چاشنی تھی، اس سے ہر فرد کا دل آپ کی طرف مائل ہو جاتا، بار بار رہ رہ کر آپ کا انداز تکلم کانوں میں گونج رہا ہے۔

افہام وتفہیم کا تو آپ بے تاج بادشاہ تھے، جس میں کوئی معاصر آپ کے مثل نہیں، ہر مسئلہ کو انتہائی اطمینان، اہمیت، خوش اسلوبی، اہتمام کے ساتھ بیان فرماتے، عام فہم اور سہل انداز میں کلام کرتے، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے کلام کو سمجھنے میں کوئی دقت اور پریشانی محسوس نہیں ہوتی، ہر طالب علم آپ کی بات کو پوری طرح سمجھ سکتا تھا، آیت قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی دلنشیں تشریح کو نہیں بھلایا جاسکتا، پورا درس گل گلزار رہتا، محققانہ بحث کرتے، مسائل کو دلائل سے مضبوط کرتے، آپ کے درس میں مسائل کا استحضار ہوتا تھا، کتاب کی تکمیل پر ہر طالب علم آپ کے پر مغز خطاب کا منتظر رہتا، آپ کا مزاج تھا کہ بخاری شریف اچانک ختم فرماتے، ہمارے سال سن ۱۴۳۹ھ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اختتام درس کے موقع پر نصیحت فرمائی تھی کہ ابھی اپنے آپ کو عالم، فاضل

مت سمجھو، ابھی ہم نے تمہیں پڑھنا سکھایا ہے کہ کس طرح پڑھا جاتا ہے، اب میدان میں جا کر خوب پڑھو اور سمجھو، آپ کی طبیعت میں محنت اور جفاکشی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا درس طلبہ کے درمیان بے انتہا مقبول تھا، بڑے بڑے فاضل بھی آپ کے درس حدیث میں شرکت کے لئے تشریف لاتے اور لطف اندوز ہوتے، آپ کے درس سے بیش بہا قیمتی موتی لے کر رخصت ہوتے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے سال میں بنگلہ دیش کے ایک بڑے عالم جن کی داڑھی کے بال بھی بالکل سفید ہو چکے تھے، وہ چند دنوں کے لیے دیوبند تشریف لائے تھے، وہ آپ کے درس میں قلم اور ڈائری لے کر بیٹھتے تھے، اور حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی تقاریر نوٹ فرماتے تھے، یہ تھا آپ کا طبقہ علماء میں تدریس کی مقبولیت اور شہرت، یقیناً ہم اور وہ لوگ خوش نصیب ہیں جنہوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔

محفلیں لٹ گئیں جزبات نے دم ٹوڑ دیا
ساز خاموش ہیں نغمات نے دم توڑ دیا

میں تو حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کا انتہائی ناکارہ شاگرد ہوں یقیناً وہ احباب جنہوں نے حضرت کے درس سے مکمل طور پر فائدہ اٹھایا، پابندی کی اور حاضر باش تھے، وہ اس موضوع (یعنی آپ کا انداز درس اور انداز تفہیم) پر مکمل روشنی ڈالیں گے، اور صفحات کے صفحات لکھیں گے، اللہ حضرت والا کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ جہاں ایک طرف کامیاب مدرس تھے، وہیں دوسری طرف کامیاب، تجربہ کار، لاجواب اور بلند پایہ مصنف بھی تھے، آپ نے اپنی حیات مستعار میں تصنیفی اعتبار سے لاجواب خدمات انجام دیں، آپ ایک منجھے ہوئے مصنف تھے، کم وقت میں آپ اتنا علمی کام کر گئے، جتنا ایک اکیڈمی کام کرتی ہے، اور اس میدان میں بھی آپ کو نمایاں کامیابی اور شہرت حاصل ہوئی، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے، حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی معروف وممتاز کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی بے مثال

شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے نام سے تحریر فرمائی، جو آپ کی زندگی کا ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے، ''حجۃ اللہ البالغہ'' ایک مشکل کتاب مانی جاتی ہے، لیکن حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' لکھ کر علماء دیوبند کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، جو کہ علماء دیوبند کے ذمہ ایک قرض تھا، شرح کی تکمیل پر دارالعلوم دیوبند نے آپ کو خراج تحسین بھی پیش کیا، ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے ذریعے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا پڑھنا پڑھانا آسان ہوگیا، قیامت تک لوگ حضرت مفتی صاحب کو دعائیں دیں گے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا تصنیفی انداز بھی تدریسی تھا، مابعد سے ماقبل کا ربط بیان کرنا، باب سے پہلے باب کی مکمل وضاحت، ترجمۃ الباب سے مناسبت بیان کرنا، بعدہ حل عبارت، ترجمہ اور ضروری اہم مسائل کا بیان کرنا، آپ کی ترمذی شریف'' کی شرح ''تحفۃ الالمعی'' ''بخاری شریف'' کی شرح ''تحفۃ القاری'' کے نام سے منصۂ شہود پر آئی، اور خوب مقبول و پذیرائی ہوئی، ایک بڑا طبقہ آپ کی تصنیفات سے فائدہ اٹھا رہا ہے، عام فہم اور سہل انداز ہے، قابل تعریف شرح، یہ آپ کی زندگی کا ایک پائندہ وتابندہ کارنامہ اور علمی شاہکار ہے، قرآن کریم کی تفسیر ''تفسیر ہدایت القرآن'' کے نام سے تالیف فرمائی جو انتہائی مقبول، معروف اور مشہور ترین تفسیر ہے، اس کے علاوہ بھی حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائی جو علمی حلقوں میں بے حد مقبول ہے اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے، حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مصنفات درج ذیل ہیں۔

(۱) تفسیر ہدایت القرآن (۲) تحفۃ الالمعی شرح ترمذی شریف (۳) تحفۃ القاری شرح بخاری شریف (۴) رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ (۵) الفوز الکبیر (۶) العون الکبیر (۷) فیض المنعم (۸) تحفۃ الدرر (۹) مبادی الفلسفہ (۱۰) معین الفلسفہ (۱۱) مفتاح التہذیب (۱۲) آسان منطق (۱۳) آسان نحو (دو حصے) (۱۴) آسان صرف (تین حصے) (۱۵) محفوظات (تین حصے) (۱۶) آپ فتویٰ کیسے دیں (۱۷) کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے (۱۸ حیات امام ابوداؤد (۱۹) مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویان کتب حدیث (۲۰) حیات امام

طحاوی (۲۱) اسلام تغیر پذیر دنیا میں (۲۲) نبوت نے انسان کو کیا دیا (۲۳) داڑھی اور انبیاء کی سنتیں (۲۴) حرمت مصاہرت (۲۵) تسہیل ادلہ کاملہ (۲۶) حواشی الفتاوی (۲۷) حواشی وعناوین ایضاح الادلہ (۲۸) افادات رشیدیہ (۲۹) افادات نانوتوی (۳۰) تہذیب المغنی (۳۱) زبدۃ الطحاوی (۳۲) کامل برہان الٰہی (۳۳) حجۃ اللہ البالغہ (عربی دو حصے) (۳۴) علمی خطبات (۳۵) دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت (۳۶) فقہ حنفی اقرب الی النصوص (۳۷) مبادی الاصول (۳۸) معین

الاصول (۳۹) آسان فارسی قواعد (۴۰) شرح علل الترمذی (۴۱) مسلم پرسنل لاء اور نفقہ مطلقہ (۴۲) ہادیہ شرح کافیہ (۴۳) وافیہ شرح کافیہ (۴۴) مفتاح العوامل شرح شرماۃ عامل (۴۵) ارشاد المفہوم شرح سلم العلوم (۴۶) گنجینہ صرف شرح پنج گنج، اس کے علاوہ بھی حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کے بے شمار علمی وتحقیقی مضامین ومقالات اخبارات ورسائل اور جرائد میں شائع ہوئے ہیں جو قابل استفادہ ہیں۔

نماز جنازہ:

وفات ہی کے روز حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی نماز جنازہ ادا کی گئی، دو دفعہ نماز جنازہ ہوئی، پہلی دفعہ نماز جنازہ حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کے صاحبزادہ مولانا عبدالوحید صاحب نے سنجیونی نرسنگ ہوم سے متصل مسجد کے قریب ادا کرائی، اور دوسری دفعہ نماز جنازہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے صاحبزادہ مولانا عبداللہ صاحب نے اوشیوارہ مسلم قبرستان سے متصل ادا کرائی، پانچ بجے شام اوشیوارہ مسلم قبرستان جوگیشوری (ویسٹ) ممبئی میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

غموں میں جلتا ہوں مثل صحرا میں
بچھڑ گیا مرا سایہ کھڑا ہوں تنہا میں
رنج ہے حالت سفر حال قیام رنج ہے

صبح بہ صبح رنج ہے شام بہ شام رنج ہے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کی قبر کو نور سے منور فرمائے، اللہ غریق رحمت کرے، اللہ درجات بلند فرمائے، اللہ مغفرت فرمائے، اللہ تبارک وتعالی حضرت کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے، پسماندگان، متعلقین، متوسلین، اعزا وأقارب، تلامذہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور دارالعلوم دیوبند کو حضرت کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

❁...❁...❁

باب ششم:

ارشادات وملفوظات

ملفوظاتِ فقیہ النفسؒ

مولانا زبیر احمد قاسمی سلہٹی
فاضل دارالعلوم دیوبند

درس وتدریس

فنون پر مہارت کیسے حاصل کریں؟

حضرت الاستاذ قدس سرہ سے ایک طالب علم نے پوچھا کہ آج کل طلبہ عام طور پر فقہ اور اصول فقہ میں کمزور ہوتے ہیں، فقہ اور اصول فقہ میں پختگی حاصل کرنے کے لیے کونسا طریقہ اپنانا چاہیے؟

حضرت الاستاذ قدس سرہ نے فرمایا: اس مسئلہ کا حل تم نہیں کر سکتے، تم بچے ہو، تمہاری سوچ تو اچھی ہے، مگر اس مسئلے کا حل ارباب مدارس کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ اس کی طرف توجہ دیں تو اس کا حل نکال سکتے ہیں، مگر وہ اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے، توجہ دلانے پر بھی اس کو لائحہ عمل نہیں بناتے!

پھر حضرت نے اس کا حل یہ بتایا کہ طالب علم کو سب سے پہلے علوم آلیہ: نحو، صرف، بلاغت، انشاء اور عربی ادب میں اتنی پختگی حاصل ہو جانی چاہیے کہ وہ عربی کی کسی بھی کتاب کو فرفر پڑھ لے، اور سمجھ بھی لے، جس طرح اردو (اپنی مادری زبان) کو فرفر پڑھ لیتا ہے اور سمجھ بھی لیتا ہے۔

عربی میں مہارت حاصل ہو جانے کے بعد فقہ پڑھے، اور وہ کسی فقیہ کے پاس جا کر پڑھے، اور مسلسل تین سال پڑھے، صبح وشام فقہ ہی پڑھتا رہے؛

فقہ کے بعد حدیث شریف کا نمبر ہے، فقہ اور اصول فقہ میں عبور حاصل ہو جانے کے بعد طالب علم کو چاہیے کہ وہ کسی محدث کے پاس جا کر حدیث پڑھے اور مسلسل تین سال پڑھے، صبح و شام حدیث کی کتابیں پڑھتا رہے، تین سال حدیث اور اصول حدیث پڑھ لینے کے بعد کسی مفسر کے پاس جا کر تفسیر پڑھے، تفسیر کے لیے ایک ہی سال کافی ہے، کیونکہ تفسیر کا معتد بہ حصہ حدیث اور فقہ میں آچکا ہے، اس لیے تفسیر میں ایک ہی سال کافی ہے۔

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: مذکورہ ضابطے ان طلبہ کے لیے ہیں، جو متوسط درجہ کے ہوں، اور اگر طالب علم ذہین ہے اور محنتی بھی ہے، تو اس کے لیے ہر فن میں ایک ہی سال کافی ہے اور اگر غبی ہے تو اس کو "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" کے درجے تک کا علم حاصل کر کے کمائی میں لگ جانا چاہیے، یا عصری تعلیم حاصل کرے! دینی تعلیم اس کے بس کا نہیں ہے۔

فرمایا: موجودہ دور میں ہمارے مدارس اسلامیہ میں تدریس کا جو طریقہ رائج ہے کہ سارے فنون ایک ساتھ پڑھائے جاتے ہیں کہ پہلے گھنٹے میں نحو، دوسرے گھنٹے میں انشاء، تیسرے گھنٹے میں فقہ وغیرہ وغیرہ اس نے تعلیم اور استعداد کی سطح نیچے کردی، پھر اکثر کتابیں پوری پڑھاتے ہی نہیں، ہدایہ آدھی آدھی پڑھ کر کیا فقہ آئیگی؟

فرمایا: اور سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ عربی اول سے چہارم تک کی تعلیم ناقص اساتذہ سے دلواتے ہیں اور جن اساتذہ کو فنون پر قابو نہیں ہوتا ان کو فنون کی کتابیں پڑھانے بٹھا دیتے ہیں، فنون کی تعلیم ان اساتذہ سے دلوانی چاہیے جو صاحب فن ہوں، اور تجربہ یہ ہے کہ ایک عرصہ محنت کرنے کے بعد آدمی صاحب فن ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری طالب علمی کے زمانے میں علیا کے بڑے بڑے اساتذہ عربی اول کی کتابیں پڑھاتے تھے، کیونکہ علیا کا استاد جانتا ہے کہ بچوں کو کیسے لیکر چلنا ہے، اب نئے فارغین کو فنون کی کتابیں پڑھانے بٹھا دیتے ہیں، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ جس استاذ کو فن پر قابو نہیں ہوتا، وہ طلبہ کو فن کیا پڑھائے گا؟

اس لئے طلبہ کو تیار کرنے کے لیے اور ان کے فنون پر پختگی حاصل کرنے کے لیے طرز قدیم کی طرف لوٹنا

پڑے گا کہ طلبہ صبح وشام ایک ہی فن پڑھیں، ایک فن مکمل پڑھ لینے کے بعد دوسرا فن پڑھیں یا مدارس میں درجہ بندی ختم کی جائے، تقریباً پچاس سال پہلے دار العلوم دیوبند میں درجہ بندی نہیں تھی، تو طلبہ ہر فن کی استعداد رکھتے تھے، اب طریقہ ہی بدل گیا اس وجہ سے کوئی فن طلبہ کے قابو میں نہیں آتا۔

اب اگر مدارس والے زمانہ قدیم کی تعلیم کا طرز نہ اپنائیں یعنی ایک ایک فن کر کے نہ پڑھائیں یا درجہ بندی ختم نہ کریں اور طالب علم کسی فن میں کمزور ہو، مثلاً وہ عربی چہارم پڑھ رہا ہے اور نحو میں کمزور ہے، تو اس کا حل یہ ہے کہ وہ کسی استاد کے پاس خارج میں نحو پڑھے، اور نحو کی ابتدائی کتابوں سے شروعات کرے، پہلے آسان نحو پڑھے پھر ہدایت النحو، پھر کافیہ الخ پڑھے، اس طرح اس کی نحو مضبوط ہو جائے گی۔

حضرت الاستاذ قدس سرہ نے فرمایا کہ میں شرح جامی پڑھ رہا تھا لیکن شرح جامی سمجھ میں نہیں آرہی تھی، ایک ساتھی سے مشورہ کیا کہ شرح جامی میری سمجھ میں نہیں آتی، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس نے بتایا کہ تمہاری نحو کمزور ہے اس لیے شرح جامی سمجھ میں نہیں آرہی ہے، میں نے پوچھا کہ وہ پہلوان (مضبوط) کیسے ہوگی؟ اس نے بتایا کہ تم نحو میر سے دوبارہ پڑھنا شروع کرو! چنانچہ میں فوراً بازار گیا اور نحو میر خرید کر لایا، اور پوری نحو میر یاد کی، پھر ہدایت النحو پڑھی اس کے پڑھنے کے ساتھ ہی شرح جامی سمجھ میں آنے لگی۔

نیند اڑانے کی تدبیریں:

ایک طالب علم نے پوچھا کہ حضرت! مجھے مطالعہ کے دوران نیند آجاتی ہے، مطالعہ صحیح سے نہیں کر پاتا ہوں، مجھے ایسا کوئی لائحہ عمل بتلا دیجیے جس کے اپنانے سے نیند نہ آئے؟

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر نیند اپنے وقت پر آرہی ہے تو کتاب بند کر کے سو جاؤ، اگر بے وقت آرہی ہے تو کھانا کم کر دو، پھر بھی اگر نیند آئے تو نیند اڑانے کے مختلف طریقے ہیں، ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کر لو، جیسے جگہ بدل لو، وضو کر لو، تھوڑی دیر ٹہل لو، یا کوئی اور مناسب طریقہ اختیار کر لو، تو نیند اڑ جائے گی۔

فرمایا: شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ رات دیر تک سبق پڑھاتے تھے، اگر کوئی طالب علم سونے لگتا تو آپ فرماتے: مولوی صاحب! غوطہ لگا کر آیئے! اس زمانے میں دارالحدیث (قدیم) کے سامنے پانی کے دو مٹکے ہوتے تھے، ایک میں پینے کا پانی ہوتا تو دوسرے میں ہاتھ منہ دھونے کا، طلبہ وہاں پانی پیتے تھے اور نیند اڑانے کے لیے منہ بھی دھوتے تھے۔

لطیفہ: ایک طالب علم دوران درس سونے لگا، استاد نے اسے ڈانٹا، کھڑا کیا اور کہا: پورے گھنٹہ اسی طرح کتاب ہاتھ میں لے کر کھڑے رہنا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھڑے کھڑے سونے لگا، اور کتاب اس کے ہاتھ سے گر گئی، کتاب مشکات جیسے بڑے سائز کی تھی، جس کے باعث درسگاہ گونج اٹھی، استاد نے پوچھا: کیا ہوا؟ طلبہ نے بتایا کہ وہ کھڑے کھڑے سو رہا ہے، استاد جی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: نالائق! بیٹھ جا! تیرا کوئی علاج نہیں۔

واقعہ: یہ واقعہ حضرت رحمہ اللہ کی طالب علمی کے زمانے کا ہے، وہ زمانہ لالٹین کا زمانہ تھا۔ جناب مولانا افتخار صاحبؒ مظاہر علوم میں نئے مدرس ہوئے تھے، حصرت مفتی صاحب بے تکلف طالب علم تھے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، مولانا کی عادت تھی کہ وہ لال ٹین جلا کر عشا کے بعد بستر پر لیٹے لیٹے مطالعہ کرتے تھے، تھوڑی دیر بعد کتاب سینے پر رکھ کر سو جاتے تھے، پھر جب آنکھ کھلتی تو دوبارہ پڑھنا شروع کرتے، پھر سو جاتے۔ اسی طرح دیر رات تک کرتے تھے، کچھ دنوں بعد حضرت رحمہ اللہ کو شرارت سوجھی! دیکھا کہ نہ وہ سوتے ہیں اور نہ پڑھتے ہیں اس لیے جب وہ سونے لگتے تو آپ جا کر لالٹین بجھا دیتے، اور چلے آتے، پھر وہ اٹھ کر لالٹین جلاتے، پھر جب سونے لگتے تو آپ جا کر لالٹین بجھا دیتے، کچھ دنوں بعد انہوں نے سوچا کہ میری لالٹین کون بجھاتا ہے؟ جب پتہ چل گیا انہوں نے آپ سے پوچھا: میری لالٹین کیوں بجھاتے ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ آپ جس طریقے سے پڑھتے ہیں یہ پڑھنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، اس طرح نہ سونا ہوتا ہے اور نہ پڑھنا، اس لیے جب تک پڑھنا ہو تو

چستی سے پڑھیں، اور بیٹھ کر پڑھیں پھر جب نیند آنے لگے تو کتاب بند کر کے سو جائیں! یہ مطالعہ کا طریقہ ہے، آپ جس طریقے سے مطالعہ کرتے ہیں یہ طریقہ ٹھیک نہیں، اس سے نہ نیند پوری ہوتی ہے اور نہ کتاب ذہن نشین!

عربی کے طالب علم کو انگریزی سیکھنا کیسا ہے؟

حضرت الاستاذ قدس سرہ نے فرمایا: طلبہ کو توحیدِ مطلب چاہیے، کسی ایک فن کے پیچھے لگے رہنا چاہیے، اگر تم نے عربی کے ساتھ انگریزی بھی پڑھنا شروع کر دیا تو تمہارا مقصد فوت ہو گیا، نہ عربی میں پختگی حاصل ہوگی، نہ انگریزی ہاتھ آئے گی، فرمایا: فراغت کے بعد پوری زندگی ہے، آپ کو پوری زندگی پڑھنا ہے، اس وقت جس جس چیز کی ضرورت محسوس کرو سیکھو: انگریزی سیکھو، اپنی مادری زبان سیکھو، جس چیز کی کمی اپنے اندر محسوس کرو اس کو حاصل کرو!

فرمایا: میں نے بچپن میں قرآن کریم حفظ نہیں کیا تھا، پھر جب دورہ حدیث کی جماعت میں پہونچا، اور بخاری کی کتاب التفسیر میں سبق آیا تو مجھے احساس ہوا کہ حافظ ہوئے بغیر قرآن کریم کماحقہٗ سمجھنا مشکل ہے، چنانچہ دورہ حدیث سے فراغت کے بعد میں نے دارالافتاء کے سال کلام پاک حفظ کیا، پھر جب مدرسہ اشرفیہ راندیر (سورت، گجرات) میں مدرس ہو کر گیا تو انگریزی سیکھنے کی ضرورت محسوس کی، چنانچہ افریقہ کے ایک عالم سے میں نے انگریزی سیکھی، دن میں اس کو میں ہدایہ پڑھاتا تھا اور رات میں اس سے انگریزی سیکھتا تھا، اسی طرح میں نے گجراتی (اپنی مادری زبان) باضابطہ نہیں پڑھی تھی تو ایک ہندو ماسٹر رکھ کر گجراتی سیکھی تھی، ماسٹر نے کہا: میں ماہانہ دس روپیہ لونگا۔ میں نے کہا: میرے گھر پر آ کر پڑھانا ہوگا۔ ماسٹر نے کہا: پھر بیس روپے لونگا۔ چنانچہ میں انکو ماہانہ بیس روپے دیتا تھا اور گجراتی سیکھتا تھا، جبکہ اس وقت میری ماہانہ تنخواہ ایک سوستر (۱۷۰) روپے تھی، پھر میں نے گجراتی زبان میں کتابچہ بھی لکھا۔

اس لیے طالب علم کو چاہیے کہ وہ مدرسہ سے نکلنے کے بعد جس چیز کی کمی اپنے اندر محسوس کرے اسے سیکھے، اور

ان سب کا سیکھنا دین کے لیے ہو، دنیا کے لئے نہ ہو، فی الحال جب آپ عربی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو سارا وقت اس میں صرف کرنا چاہیے، دوسری چیزوں کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے۔

افتا کے طلبہ کو انگریزی سیکھنی چاہیے؟

فرمایا: موجودہ دور میں دارالافتاء کے طلبہ کو انگریزی سیکھنی چاہیے، بہتر تو یہ ہے کہ انگریزی دارالافتاء میں داخل نصاب کی جائے، کیونکہ روز روز نئے نئے مسائل پیش آرہے ہیں، ان میں بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کو انگریزی کی معلومات کے بغیر سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے دارالافتاء کے طلبہ کو انگریزی میں کم از کم اتنی استعداد ہونی چاہیے کہ وہ پیش آمدہ مسائل کو سمجھ سکیں تاکہ اس کا حل کرنا آسان ہو جائے۔

طالب علم حرام پیسے اپنے استعمال میں نہ لائے!

طالب علم نے پوچھا کہ اس کے والد سودی کاروبار کرتے ہیں، اور سودی پیسے سے پڑھائی کا خرچہ دیتے ہیں، تو کیا وہ اپنے والد کے پیسے پڑھائی کے خرچہ میں لاسکتا ہے؟

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: طالب علم کو چاہیے کہ وہ اپنے سودی کاروبار کرنے والے باپ کے پیسے سے نہ کھائے، نہ اس کے پیسے اپنے کسی استعمال میں لائے، ورنہ اس کو علم نہیں آئے گا اور اگر علم آ گیا تو علم میں رونق نہیں آئے گی، پس طالب علم کو چاہیے کہ وہ خود کمائے اور پڑھے، پڑھائی نہ چھوڑے۔ مثلاً دن میں محنت مزدوری کرے اور رات میں پڑھے، یا رات میں محنت مزدوری کرے اور دن میں پڑھے، یا کسی اور طرح سے بقدر ضرورت کوئی حلال کمائی کرے اور پڑھے، پڑھائی نہ چھوڑے۔

آپ نے فرمایا: پہلے زمانے میں طلبہ اپنے کھانے پینے کے خود ذمہ دار ہوتے تھے اور طلبہ کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے تو بعض طلبہ رات کو سبزی منڈی میں جاتے، اور سبزی فروش سبزی کے پتے وغیرہ جو پھینک دیتا تھا، اس کو اٹھا کر لے آتے اور صاف کر کے کھا لیتے، یہ بھی فرمایا کہ دارالعلوم کے ابتدائی زمانہ میں دیوبند کے لوگ طلبہ

کے کھانے کا انتظام کرتے تھے، ایک ایک دو دو طالب علم کو کھانا کھلانے لے جاتے تھے، اور طلبہ کھانا کھا کر مدرسہ واپس آجاتے تھے، لیکن بعض دفعہ کھانے کے انتظار میں وقت ضائع ہوتا تھا اس لئے ارباب نے مطبخ کا نظام شروع کیا اور طلبہ کے کھانے پینے کا انتظام مدرسہ کے اندر ہی کرنے لگے، اس پر دیوبند کے لوگوں کو بڑا اعتراض ہوا کہ آپ نے ہمیں بڑے خیر سے محروم کر دیا اللہ تعالی ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

فرمایا: میں جب دار الافتاء کا عالم تھا اس وقت اپنے گذارے کے لیے کتابوں کی تصحیح کا کام کرتا تھا، اور سولہ صفحے میں ایک روپیہ ملتا تھا، آٹھ آنے میں رکھتا تھا اور آٹھ آنے دوسرا ساتھی جو میرے ساتھ تصحیح کرتا وہ لیتا تھا، اس سے ہمارا گزارا بہت شاندار چلتا تھا، فرمایا: تصحیح کا کام کرنے سے میرا یہ بھی فائدہ ہوا کہ تصحیح کرتے کرتے میں بھی مصنف بن گیا، اس لیے طالب علم کو چاہیے کہ وہ حلال پیسے استعمال میں لائے، اور اگر گھر سے بقدرِ ضرورت پیسے کا انتظام نہ ہو تو خود کمائے اور پڑھتا رہے، کسی صورت میں بھی حرام نہ کھائے! تب علم آئے گا اور علم میں رونق بھی آئے گی، اور علم نافع بھی ہوگا۔

علم نافع کی علامت:

فرمایا: علم نافع کی علامت یہ ہے کہ اللہ آپ سے دین کا کام لے، اللہ تعالیٰ آپ سے جتنا دین کا کام لیں گے آپ کا علم اتنا نافع سمجھا جائے گا اور اگر مدرسہ سے نکلنے کے بعد دنیا کے پیچھے لگ گئے تو معلوم ہوگا کہ آپ کا علم نافع نہیں ہے۔

مطالعہ میں استقامت کیسے ہو؟

ایک طالب علم نے حضرت الاستاذ قدس سرہ سے مشورہ طلب کیا کہ اسے مطالعہ میں استقامت نہیں رہتی، کچھ دن مطالعہ کے بعد اس کا جذبہ سرد ہو جاتا ہے، مطالعہ میں استقامت حاصل کرنے کے لیے کونسا طریقہ اپنانا چاہیے ؟

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: آدمی شیخ کے پاس بیعت ہوتا ہے تو اپنے آپ کو شیخ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے، اور شیخ جو ذکر واذکار بتلاتا ہے وہ اس کو پابندی سے کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے اور اللہ تعالی سے اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جس طالب علم کو پڑھنے میں جی نہ لگتا ہو، یا مطالعہ میں استقامت حاصل نہ ہوتی ہو، تو وہ اپنے آپ کو کسی استاد کے ہاتھ بیچ دے اور استاد جو کتابیں پڑھنے کے لیے کہے اور جس طرح پڑھنے کے لیے کہے اسی طرح پڑھتا رہے، جبھی استقامت حاصل ہوگی۔ فرمایا: استاد شروع میں زیادہ توجہ نہیں دے گا، یکدم سب کچھ نہیں سکھلائے گا، مگر اس کے ساتھ لگے رہنا، پیچھا نہ چھوڑنا، آہستہ آہستہ جب انسیت ہوگی اور استاد تمہاری سچی طلب دیکھے گا تو سب کچھ سکھلائے گا، فرمایا: جب آپ کسی ہنر والے کے پاس جاتے ہیں تو وہ یکدم اپنا ہنر نہیں سکھاتا، پہلے جھاڑو دلوائے گا، کمرے کی صفائی کروائے گا پھر آہستہ آہستہ اپنا ہنر سکھائے گا۔

فراغت کے بعد پڑھانے کے لیے مدرسہ نہ ملے تو کیا کریں؟

طالب علم نے پوچھا کہ فراغت کے بعد اگر پڑھانے کے لیے مدرسہ نہ ملے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اور علم کو باقی رکھنے کیلئے کس طرح مطالعہ کریں؟

حضرت الاستاذ قدس سرہ نے فرمایا: تدریس کے بغیر مطالعہ کی مثال دیوار کے بغیر چھت جیسی ہے، دیوار کے بغیر جس طرح چھت کھڑی نہیں رہ سکتی، اسی طرح تدریس کے بغیر مطالعہ باقی نہیں رہتا، اس لیے علم کو باقی رکھنے کے لیے تدریس کے ساتھ مطالعہ چاہیے، تبھی پابندی ہوگی، ورنہ کچھ دن مطالعہ کر کے چھوڑ بیٹھو گے۔ جیسے آپ مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو زبان کی کتابیں پڑھا رہے ہیں، اس کے حصہ چہارم میں لکھا ہے: ”رام چندر جی اپنی بیوی سیتا جی کے عشق میں دریائے ”سرجو“ میں ڈوب کر مرے“ اب یہ بات صحیح ہے یا غلط؟ اس کی تحقیق آپکو کرنی ہے، فرمایا: ڈیڑھ سو سال سے مولانا میرٹھی کی یہ کتابیں پڑھائی جارہی ہیں، مگر کسی ہندو نے آج تک اس پر اشکال نہیں کیا۔ آپ کو اس کا مطالعہ کرنا ہے، اور یہ بات صحیح ہے یا غلط؟ اس کی تحقیق کرنی ہے، اس کی تحقیق کے لیے

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اور"رام سیتا" پر لکھی گئیں کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا، یوں مطالعہ سے مضامین نکلتے ہیں۔

دوسری مثال: جیسے آپ قرآن کریم کی تفسیر پڑھا رہے ہیں، تفسیر کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ: سلیمان علیہ السلام موت کے وقت عصا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اور اسے ٹھوڑی کے نیچے لگا کر کھڑے ہو گئے اور اسی حالت میں روح قبض ہوگئی اور اس طرح سال بھر رہے، وفات کی کسی کو خبر نہ ہوئی"۔ اب یہ سال بھر کی بات کہاں تک درست ہے؟ صحیح ہے یا غلط؟ اس کی تحقیق آپ کو کرنی ہے، اس طرح مطالعہ سے مضامین نکلتے ہیں۔

فرمایا: میں نے تفسیر ہدایت القرآن (٦: ۵۱۴) میں سال بھر کھڑے رہنے کی بات کو غیر صحیح قرار دیا ہے، لکھا ہے کہ یہ چند گھنٹوں کی بات ہوگی۔

پھر سوال یہ ہے کہ اگر پڑھانے کے لیے مدرسہ نہ ملے تو کیا کرنا چاہیے؟

فرمایا: مدرسہ سے نکلنے کے بعد اگر پڑھانے کے لئے مدرسہ نہ ملے تو اپنے گھر پر دین کی محنت شروع کرو! محلے کے بچوں کو اکٹھا کر کے پڑھاؤ! ناظرہ، حفظ قرآن، دینیات، فارسی وغیرہ کی تعلیم دو! اور مطالعہ کے جو طریقے ہم نے بتلائے ہیں اس طرح مطالعہ کرتے رہو ان شاء اللہ رفتہ رفتہ با کمال عالم بن جاؤ گے۔

اب یہ سوال ہے کہ ہم کیا کھائیں گے؟ اور کیا پہنیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان سب چیزوں کا انتظام اللہ کر دیں گے، جب آپ اللہ کے دین کے لئے محنت کریں گے تو اللہ آپ کو بھوکا نہیں ماریں گے، ہر چیز کا انتظام غیب سے کر دیں گے اور آہستہ آہستہ قافلہ بھی بنتا جائے گا اور راہیں ہموار ہوتی جائیں گی؛ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (**والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا**) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے لیے محنت و مجاہدہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ضرور ان کو اپنی راہیں سمجھاتے ہیں۔

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: لیکن تم نے ذہن ایسا بنا لیا کہ جب تک ہمیں کوئی دار العلوم نہ بلائے، ہم نہیں پڑھائیں گے، اس طرح سوچنا قطعاً صحیح نہیں، پہلے زمانے میں اس طرح کے رسمی مدارس کہاں تھے؟ اساتذہ اپنے

اپنے گھروں میں پڑھاتے تھے، اور طلبہ اساتذہ کے گھر جا کر پڑھتے تھے، استاد کے ساتھ ہی کھاتے اور پڑھتے تھے۔

علاوہ ازیں آپ کو ملت نے پڑھایا ہے، لہذا ملت کے حق میں آپ کو سپوت بننا چاہئے، ملت کے دین و ایمان کی فکر اپنا فریضہ سمجھنا چاہیے۔ (هل جزاء الإحسان إلا الإحسان) ملت نے آپ پر احسان کیا ہے، اپنے پیسوں سے پڑھایا ہے، اس لیے اس کے دین وایمان کی حفاظت کرنا آپ کی ذمہ داری ہوگئی۔

طالب علم کو پڑھنے کا فیصلہ خود کرنا چاہیے۔

ایک طالب علم نے پوچھا کہ اس کا ارادہ پڑھنے کا نہیں، لیکن گھر والے زبردستی مدرسہ بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم نہیں پڑھو گے تو ہمارے گھر میں تمہارے لیے جگہ نہیں، اور گھر سے بھگا دیتے ہیں، ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟

آپ نے فرمایا: طالب علم جب تک خود سے یہ فیصلہ نہ کرے کہ اسے پڑھنا ہے تو کوئی اسے پڑھا نہیں سکتا، گھر والوں کی زبردستی اور دباؤ کی وجہ سے مدرسے میں آ کر پڑا تو رہے گا، پڑھے گا کچھ نہیں، اس کے بر عکس اگر طالب علم نے یہ ارادہ کرلیا کہ اسے پڑھنا ہے، تو اگر گھر والے نہ پڑھانا چاہیں تو بھی وہ پڑھ لے گا، کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اس لیے اگر تمہیں پڑھنا نہیں ہے تو خواہ مخواہ اپنی زندگی برباد مت کرو، کسی کاروبار میں لگ جاؤ، اس میں تمہارا فائدہ ہے، اگر گھر والے تمہیں گھر سے نکالیں تو نکل جاؤ، دنیا وسیع ہے اور اللہ رازق ہے، کسی کو بھوکا نہیں مارے گا۔

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے کالیڑہ میں مکتب پڑھا، پھر دار العلوم چھاپی میں ٦ ماہ پڑھا، پھر ٦ ماہ اپنے ماموں عبد الرحمن شیرا کے پاس پڑھا، پھر چار سال پالن پور میں حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحب رحمہ اللہ کے مدرسہ میں پڑھا، پھر سہارنپور آیا، لیکن اس وقت میں پڑھتا نہیں تھا، صرف ابا کے لئے مدرسہ میں پڑا رہتا

تھا، ابا چاہتے تھے کہ میرا بیٹا مولوی بنے! اس لئے مدرسہ میں پڑا رہتا تھا، کچھ پڑھتا نہیں تھا، پھر یہ واقعہ پیش آیا کہ سہارنپور کے زمانے میں مجھے ٹائیفائیڈ ہوگیا، خطرناک قسم کا ٹائیفائیڈ تھا، تقریباً دو مہینے اس ٹائیفائیڈ میں مبتلا رہا، پھر ابا مجھے لینے کے لئے سہارنپور آئے، اور گھر لے گئے، تقریباً ایک ہفتہ کے بعد ابا اپنی امی (میری دادی) سے کہہ رہے تھے کہ مجھے اب احمد (مفتی صاحب کا سابق نام) کو پڑھانا نہیں ہے، دادی نے پوچھا: کیوں؟ ابا کہنے لگے: دیکھیے! میں اسے سہارنپور لے گیا، تو اس کا خرچہ اتنا آیا، پھر بیمار ہوگیا تو بیماری کا خرچہ اتنا آیا، پھر سہارنپور جائے گا تو اتنا خرچ آئے گا، اور پڑھا وڑھا تو اس نے کچھ نہیں! حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: میں سویا سویا اُن دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پڑھنا ہے، چنانچہ مجھے اس رات نیند نہیں آئی، فجر کی اذان کے وقت اٹھا اور جانے کی تیاری کی، اماں نے ایک پیٹی میں سامان تیار کر کے دیا، ابا سے اجازت لی اور سلام کیا تو انہوں نے سوئے سوئے مصافحہ کیا، میں روانہ ہوگیا، تو پھر ابا آئے اور میرا سامان تھاما اور پالن پور سے سہارنپور کے لئے ٹرین پر بٹھا دیا، اور میں سہارنپور چلا آیا، فرمایا: وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے کتاب ہاتھ سے نہیں رکھی، اس لیے جب تک طالب علم خود سے یہ فیصلہ نہیں کرے گا کہ اسے پڑھنا ہے تب تک اسے کوئی پڑھا نہیں سکتا، زبردستی کریں گے تو گھر والوں کی وجہ سے مدرسہ میں آکر پڑا رہے گا مگر پڑھے گا نہیں۔ پھر جب مدرسہ سے فارغ ہوگا تو نہ ادھر کا ہوگا نہ ادھر کا، اس لیے جس طالب علم کو پڑھنا نہیں، وہ خوامخواہ مدرسہ میں پڑا نہ رہے، اور اپنی قیمتی زندگی برباد نہ کرے، بلکہ کسی دنیاوی کاروبار میں لگ جائے، اس میں اس کا فائدہ ہے۔

علم پڑھنے سے آتا ہے

حضرت فقیہ النفس قدس سرہ نے فرمایا: اساتذہ اور طلبہ کو علم اس وقت آئے گا جب وہ پڑھیں گے۔ صرف اساتذہ کے پڑھانے پر اکتفا کر لینے اور طلبہ کے صرف درسگاہوں میں حاضری دینے سے علم نہیں آتا، علم آنکھوں کی محنت سے آتا ہے۔ پھر استاذ اور طالب علم کے پڑھنے کی نوعیت الگ الگ ہے، طالب عالم کا پڑھنا یہ ہے کہ وہ

سبق مطالعہ کرکے اور عبارت حل کرکے درسگاہ جائے، اور استاذ کے سامنے عبارت پڑھے اور ترجمہ بھی کرے، اور اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کا مطلب بھی بیان کرے، اور اگر طالب علم نے کوئی غلطی کی، یا اس کی سمجھ میں نہ آنے والی کوئی بات ہو تو استاذ اس بات کو سمجھائے گا، یہ طالب علم کے پڑھنے اور استاد کے پڑھانے کا طریقہ ہے۔

رہا استاذ کا پڑھنا سو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر استاذ متعدد فنون پڑھاتا ہے تو ان میں سے ایک کتاب فن پڑھنے کے لئے منتخب کرے، فن پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مثال کے طور پر آپ کافیہ پڑھا رہے ہیں اور فاعل کی بحث میں سبق ہے، تو یہ بحث نیچے آسان نحو تک اور اوپر شرحِ جامی تک دیکھ ڈالیں اور اس کا خلاصہ لکھ لیں، اور اسے ذہن نشیں کرلیں، پھر جو باتیں طلبہ کے لیے مفید ہوں، اتنی باتیں ان کے سامنے بیان کریں، باقی اپنے لئے پڑھیں، اس طرح اگر استاذ فن وار مطالعہ کرتا ہے تو اسے علم آئے گا، ایسا نہیں کہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گئے، اور آخر تک دیکھ ڈالی، پھر کوئی دوسری کتاب پکڑ لی، فرمایا: مدرس کے لیے یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔

درسگاہ میں ہمہ وقت حاضر رہنا رحمت کا باعث ہے!

طالب علم نے پوچھا کہ جب درسگاہ میں صرف عبارت خوانی ہو تو درسگاہ میں حاضر رہنا بہتر ہے یا کمرے میں بیٹھ کر مطالعہ کرنا؟

حضرت استاذ محترم نے فرمایا یہ بات متعلقہ استاذ سے پوچھنے کی ہے کہ ان کے سبق میں جب عبارت خوانی ہو تو درسگاہ میں حاضر رہنا بہتر ہے یا کمرے میں مطالعہ کرنا؟!

فرمایا: اس سلسلے میں میرا طریقہ یہ تھا کہ میں درسگاہ چھوڑتا نہیں تھا، درسگاہ میں پڑا رہتا تھا، کیونکہ حدیث میں آیا ہے: "ان للہ نفحات من رحمتہ یصیب بھا من یشاء من عبادہ" (فتح القدیر شرح الجامع الصغیر: ص: ۵۴۱، رقم الحدیث: ۱۱۰۸)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی کچھ خاص جھونکے ہیں جو رات اور دن میں بندوں کے اوپر

سے گذرتے ہیں، اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں اسے رحمت سے نوازتے ہیں۔ فرمایا: اس لئے میں درسگاہ نہیں چھوڑتا تھا، درسگاہ ہی میں پڑا رہتا تھا، تاکہ اللہ کی رحمت سے محروم نہ ہوجاؤں۔ بعض دفعہ نیند کا غلبہ ہوجاتا تو درسگاہ میں سوجاتا تھا، استاذ کی چارپائی (مسند) کے نیچے گھس کر سوجاتا، اس میں ایک تکیہ اور لال رنگ کا چمڑا تھا، اس کو بچھا کر سوجاتا تھا، پھر جب عبارت پڑھنے کا وقت آتا تو طلبہ اٹھادیتے اور اٹھ کر عبارت پڑھتا تھا۔

مہتمم کو بھی پڑھانا ہے

حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ بخاری شریف کا درس دے رہے تھے، جب ابوالاسود دوئلی کی یہ حدیث آئی کہ: حضرت ابوالاسود دوئلی رحمہ اللہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ گئے، ان دنوں مدینہ میں بیماری پھیلی ہوئی تھی، آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے بیٹھ گئے، لوگ وہاں سے ایک جنازہ لے کر گزرے، اہل مجلس نے اس کی تعریف کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ثابت ہوگئی، تھوڑی دیر بعد دوسرا جنازہ لے کر گزرے، اس کی بھی اہل مجلس نے تعریف کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ثابت ہوگئی؟ پھر لوگ ایک اور جنازہ لے کر گزرے، اس کا ذکر اہل مجلس نے برائی کے ساتھ کیا، حضرت عمر نے فرمایا: ثابت ہوگئی۔ ابوالاسود دوئلی نے پوچھا: اے امیر المومنین! کیا ثابت ہوگئی؟ حضرت عمر نے جواب دیا: میں نے وہی بات کہی جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی، یعنی ”جس مسلمان کے لیے چار آدمی خیر کی گواہی دیں تو اللہ تعالی اس کو جنت میں داخل کرتے ہیں“ ہم نے پوچھا: اور تین کی گواہی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تین کی گواہی بھی“ ہم نے پوچھا: دو کی گواہی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دو کی گواہی بھی“ پھر ہم نے ایک کے بارے نہیں پوچھا۔

حضرت فقیہ النفسؒ نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں: پہلی بات یہ ہے کہ مدارس کے مہتمم کو بھی پڑھانا ہے، دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المومنین ہیں، اور طلبہ کو پڑھا رہے ہیں، فرمایا: پہلے زمانے میں پڑھانے کا یہی طریقہ تھا کہ استاذ کسی جگہ بیٹھ جاتا، اور طلباء پوچھتے تھے، اور استاذ

جواب دیتا تھا۔

سبق سمجھ کر پڑھے: دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ طالب علم کوئی بات سمجھے بغیر آگے نہ بڑھے۔ دیکھو! ابوالاسود دوئلی کو حضرت عمر کی بات سمجھ میں نہیں آئی تو فوراً پوچھا کہ: کیا چیز ثابت ہوگئی؟ اس پر حضرت عمر نے کتنی کام کی حدیث سنائی۔ اس لئے طالب علم کو جو بات سمجھ میں نہ آئے فوراً استاذ سے پوچھے، درس میں سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ سبق کے بعد استاذ سے رجوع کرے، پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو کسی اور کی طرف رجوع کرے **وفوق کل ذی علم علیم** ہر صاحب علم پر ایک بڑا جاننے والا ہے، بہرحال سبق سمجھ کر چھوڑے، بے سمجھے آگے نہ بڑھے۔

لیکن اب زمانہ ایسا آگیا کہ طالب علم کو کوئی بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کی کوئی فکر نہیں، نہ کوئی غم ہے نہ کوئی خوشی، پہلے زمانے میں طلبہ کا یہ حال نہیں تھا، اگر کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تو کمرے میں جا کر روتے تھے، اور جب بات سمجھ میں آجاتی، تو خوشی کے مارے ناچتے تھے، فرمایا: میں نے ترمذی شریف علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ سے پڑھی، ایک دن ایسا ہوا کہ میں کمرے میں مطالعہ کر رہا تھا، مجھے پتہ ہی نہیں چلا اور علامہ سبق پڑھا کر تشریف لے گئے۔ فرمایا: اس کا افسوس مجھے آج تک ہے کہ میرا ترمذی شریف کا ایک سبق چھوٹ گیا۔

طلبہ کے بے عمل ہونے کی چند وجوہ

حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ آج کل مدارس میں طلبہ بے عمل ہوتے جارہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

حضرت والا نے فرمایا: اس کی بہت سی وجوہات ہیں، ان میں ایک وجہ اساتذہ کا عمل ہے، پہلے زمانے میں میں اساتذہ کا جو عمل اور اخلاص تھا اب وہ عمل اور اخلاص نہیں رہا، پھر اساتذہ میں اب دنیاداری بھی آنے لگی۔ ہفتم

یا دورے میں آنے کے بعد یہ جو تم سوچتے ہو کہ آئندہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ آنے والی زندگی کیسے گزارنی ہے؟ یہ اساتذہ کے عمل کا پرتو ہے، کیونکہ طلبہ اساتذہ سے متاثر ہوتے ہیں، اساتذہ کے اثرات طلبہ پر پڑتے ہیں، کہتے ہیں: ”خربوزہ خربوزہ سے رنگ پکڑتا ہے“۔

فرمایا: ہم اپنی طالب علمی کے زمانے میں یہ سوچتے تھے کہ: کہاں جا کر دین کی خدمت کرنی ہے؟ جس علاقے میں بدعات وخرافات ہیں وہاں جا کر دین کی خدمت کرنی ہے! فرمایا: میں نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر یہ پلان بنایا تھا کہ اجمیر میں مدرسہ قائم کرنا ہے اور وہاں جو بدعات وخرافات ہیں انکو مدرسے کے ذریعہ مٹانا ہے اور وہاں سنت نبوی کو عام کرنا ہے ایک دن اجمیر کے سجادہ نشین کا بھائی دارالعلوم دیوبند گھومنے آیا، اتفاق سے اس سے میری ملاقات ہوگئی، میں نے اسے اپنا مہمان بنایا، اور دو تین دن تک اپنے پاس رکھا، اور خوب مہمان داری کی، آخری دن میں نے اس سے کہا کہ: ہمارا اجمیر میں مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ ہے، آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ بالکل آجائیے! ہم آپ کی بھرپور مدد کریں گے، بعد میں اللہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ علامہ (ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ) نے مجھے راندیر (سورت، گجرات) میں مدرس بنا کر بھیج دیا، پھر وہاں سے دارالعلوم آگیا، اجمیر جانے کا اتفاق نہیں ہوا، غرضیکہ ہم اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس طرح کی سوچ رکھتے تھے کہ جہاں جہاں دین داری نہیں ہے، اور بدعات وخرافات ہیں، وہاں وہاں جا کر دین کی خدمت کرنی ہے، لیکن موجودہ دور میں طلبہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانے سے سوچنے لگتے ہیں کہ فراغت کے بعد کس طرح دنیا کمانی ہے؟ کس طرح آنے والی زندگی کو سنوارنا ہے؟ یہ سب اساتذہ کے عمل کا پرتو ہے۔

اور طلبہ کے بے عمل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ: اساتذہ اور طلبہ کے درمیان میں تپائیاں آگئیں، دوریاں ہوگئیں، فرمایا: جب سے تپائیوں کا زمانہ آیا تب سے تعلیم کا معیار گر گیا، اور تربیت تو ممکن ہی نہیں رہی، ایک ایک جماعت میں پانچ سو یا ہزار طلبہ ہوتے ہیں، اساتذہ ان کی تربیت کیسے کریں گے؟ پہلے زمانے میں جماعت میں

بیس پچیس طلبہ ہوتے تھے، اساتذہ کی نظریں ان پر رہتی تھیں، ان کی عمومی اور خصوصی تربیت کرتے تھے، اپنے پڑھے ہوئے پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟ اس کی طرف نظر رکھتے تھے، ضرورت کے وقت ٹوکتے بھی تھے، پھر بعض طلبہ کی خصوصی تربیت یعنی بیعت بھی کرتے تھے، اپنے پاس رکھتے تھے اور خوب رگڑتے تھے، جب باکمال ہو جاتے تو جہاں دین کی خدمت کی ضرورت محسوس کرتے وہاں بھیج دیتے تھے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نیک وصالح اور باعمل طلبہ تیار کرنے کے لیے مخلص اور پابند شرع اساتذہ چاہیے، اساتذہ جتنے زیادہ مخلص، متقی اور پرہیز گار ہوں گے، طلبہ کے اندر بھی یہ صفات منتقل ہوں گی۔

کامیاب مدرس کیسے بنیں؟

حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ نے فرمایا: کامیاب مدرس بننے کے لئے سب سے بنیادی چیز تعلق مع اللہ ہے، اللہ تعالی سے تعلق قائم کئے بغیر محض اپنی کوشش سے کوئی کامیاب مدرس نہیں بن سکتا؛ اس کی دلیل سورۂ طٰہ کی یہ آیت ہے: واصطنعتك لنفسي یعنی میں نے آپ (موسیؑ) کو خاص اپنے کام (نبوت) کے لئے تیار کیا ہے، لیکن چونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے، سبب کے بغیر کسی چیز کا وجود عادۃً محال ہے، اس لئے اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کرنے سے پہلے کانٹوں بھرے مختلف مراحل سے گزارا، اس کے بعد نبوت سے سرفراز فرمایا، سب سے پہلے موسی علیہ السلام کو فرعون کے قتل سے بچایا، پھر آپ کی پرورش کا انتظام فرعون کے شاہی محل میں کیا، تاکہ موسی کے اندر رعایا پروری کی صلاحیت پیدا ہو، پھر قتل قبطی کا واقعہ پیش آیا، بلکہ رونما کیا گیا کیونکہ مشیت الٰہی یہ تھی کہ اب موسی علیہ السلام فرعون کے پاس سے ہٹیں اور ان کو کار نبوت کے لیے تیار کیا جائے، چنانچہ آپ مصر سے نکل کر مدین پہنچے، وہاں ایک نیک بندے کی لڑکی سے نکاح کیا، اس کے مہر میں آپ نے دس سال تک بکریاں بھی چرائیں، اس میں حکمت یہ تھی کہ نبی کی امت میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، فقیر بھی ہوتے ہیں، امیر بھی ہوتے ہیں، اور متوسط درجے کے بھی، اور رعایا پروری کے لئے ہر ایک کا مزاج شناس ہونا بھی

ضروری ہے، اس لیے اللہ تعالی موسی علیہ السلام کو شاہی ماحول سے نکال کر غلامی جیسے ماحول میں لے گئے، چنانچہ آپ نے دس سال وہاں نوکری کی، اس کے بعد مع اہل وعیال شام کے لئے روانہ ہوئے، مگر راستہ بھول کر آپ وادی سینا پہنچ گئے، وہاں کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئی، اس کے بعد آپ کو نبوت ورسالت سے سرفراز کیا گیا، غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کار نبوت کے لیے تیار کرنے کے لیے کتنے مراحل سے گذارا، پھر نبوت ورسالت سے سرفراز فرمایا۔

حدیث شریف میں آیا ہے: **لا یزال اللہ یغرس لھذا الدین غرسا یستعملھم في طاعتہ** حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی ہر زمانے میں اپنے کچھ بندوں کو اپنے کام کے لیے تیار کرتے ہیں اور وہ دین کا کام انجام دیتے ہیں، حضرت الاستاذ قدس سرہ نے فرمایا: اس حدیث اور قرآن کی آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دین کی مقبول خدمت انجام دینے کے لئے اور کامیاب مدرس بننے کے لیے سب سے پہلی شرط اللہ تعالیٰ سے لو لگانا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کی منظوری لینی ہے اور چونکہ یہ دنیا دار الاسباب ہے اس لیے اس کو حاصل کرنے کے لیے پابندی اوقات کے ساتھ مدرس کو کتابوں کا مطالعہ کرنا ہے، اور فن وار مطالعہ کرنا ہے، اور پڑھانے کیلیے جانے سے پہلے سبق مکمل طور پر یاد کر کے جانا ہے کہ اگر کتاب سامنے رکھے بغیر پڑھانا چاہے تو پڑھا سکے، اس طرح اگر مدرس محنت کر کے پڑھائے گا تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ کامیاب مدرس بن جائے گا۔

فرمایا: میں اپنی تدریس کے اول دور میں اکثر کتابیں بغیر دیکھے پڑھاتا تھا، کتاب میرے سامنے نہیں ہوتی تھی، کمرے میں بیٹھ کر سبق اتنا رٹتا تھا کہ وہ مکمل طور پر یاد ہو جاتا، تب جا کر پڑھاتا تھا۔ بعض کتابیں مشکل ہوتی تھیں تو ان کا مطالعہ ایک ہفتہ آگے رکھتا تھا، اور ایک اشاریہ پرچہ بھی بنالیتا، مسجد میں آتے جاتے، چلتے پھرتے اسے پڑھتا تھا، اس طرح میں مدرس بنا ہوں۔

نیز فرمایا: اور تجربہ یہ ہے کہ جو طالب علم اپنے زمانہ طالب علمی میں کتابوں کا تکرار کراتا ہے، وہ آخر میں جا کر

کامیاب مدرس بنتا ہے، اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ ہر طالب علم سے تکرار کرائیں! ایسا نہ ہونا چاہیے کہ ایک طالب علم تکرار کرائے اور پانچ دس بیٹھ کر سنیں، فرمایا: یہ تکرار کا طریقہ نہیں ہے، اس سے نہ کتاب یاد ہوتی، نہ طلبہ تیار ہوتے ہیں، تکرار کا اصل طریقہ یہ ہے کہ دو دو طالب علم مل کر تکرار کریں! بیچ میں تیسرا طالب علم نہ ہو، تب نتیجہ اچھا نکلے گا۔ میں ایک مرتبہ لندن میں یہودیوں کے ایک مدرسے میں گیا، وہاں دیکھا کہ طلبہ ''ون ٹو ون'' (ایک دوسرے کے ساتھ) تکرار کر رہے، بیچ میں تیسرا کوئی طالب علم نہیں تھا، فرمایا: تکرار کا یہ طریقہ مجھے بہت پسند آیا، ہمارے مدارس میں بھی اس طرح تکرار ہونا چاہیے کہ دو دو طالب علم مل کر تکرار کریں، ان میں تیسرا طالب علم شامل نہ ہو، جبھی تکرار کا مقصد حاصل ہوگا۔ اگر کوئی کہے: کہ ہمارے مدرسے میں تو ہر طالب علم کے اندر اتنی استعداد نہیں ہے کہ وہ تکرار کرائے؟ فرمایا: ہمارے مدارس اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ طلبہ کی استعداد ہوئے بغیر ان کو آگے بڑھا دیتے ہیں، جب نیچے کی جماعت میں ان کی استعداد نہیں بنی تو اوپر کی جماعت میں استعداد کیسے بنے گی؟ اوپر جا کر وہ تو اور برباد ہوں گے، اس لئے جو طلبہ محنت نہیں کرتے یا جن کی استعداد نہیں بنتی، ان کی چھٹی کر دینی چاہیے، وہ کہیں اور جا کر پڑھیں گے، یا عصری تعلیم حاصل کریں گے، دینی تعلیم ان کے بس کی نہیں؛ لیکن مدارس والے ایسا نہیں کرتے کیونکہ ان کو بھیڑ دکھانی ہوتی ہے کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے ہزار طلبہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دورہ حدیث کے پندرہ سو طلبہ؛ دار العلوم (دیوبند) کے دورہ کی سب سے پہلی جماعت میں جو سات طالب علم تھے، جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ بھی تھے ان کے برابر نہیں ہو سکتے!

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا واقعہ:

فرمایا: علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے زمانہ میں دورہ کی جماعت پینتیس طلبہ کی تھی، جب پڑھانے کے لیے تشریف لاتے تو مسند پر تشریف فرما کر تھوڑی دیر سر جھکا کر بیٹھتے، پھر سر اٹھا کر "حسبنا اللہ و نعم

الوکیل " پڑھتے، اور دائیں اور بائیں طلبہ پر ایک نظر ڈالتے، جس طالب علم پر آپ کی نظر جم جاتی، اسے عبارت پڑھنے کے لیے کہتے، اور وہ عبارت پڑھتا تھا، اگر اس نے عبارت پڑھتے وقت ایسی غلطی کی جو دورہ کے طالب علم سے ہوسکتی ہے تو آپ فرماتے: مولوی صاحب! دیکھ کر پڑھو! دیکھو! اوپر "کان" گذرا ہے، یہ اس کی خبر آئی ہے: اور اگر اس نے ایسی غلطی کی، جو دورہ کے طالب علم سے نہیں ہوسکتی تو آپ فرماتے: جاہلین دیکھ کر پڑھو! اگر اس نے تین غلطیاں ایسی کرلیں جو دورہ کے طالب علم سے نہیں ہوسکتیں تو آپ اسے عبارت پڑھنے سے روک دیتے تھے، اور تعلیمات کو رقعہ لکھتے کہ اس طالب علم کو کافیہ کی جماعت میں اتار دیا جائے! چنانچہ اس کو دورہ سے کافیہ کی جماعت میں اتار دیا جاتا تھا۔ حضرت الاستاذ قدس سرہ فرماتے ہیں کہ پھر وہ طالب علم کافیہ سے دورہ میں پہنچتا تھا اور لوہے سے کندن بن کر نکلتا تھا اور اللہ اس سے دین کا کام لیتے تھے۔

بدعات ورسومات

اجتماعی ذکر بدعت ہے

حضرت فقیہ النفس نور اللہ مرقدہ نے فرمایا: آج کل ایک خاص انداز کا اجتماعی ذکر چل پڑا ہے جو بدعات ہے میں پچاس سال سے زائد عرصہ سے اکابر دیوبند کو دیکھتا آرہا ہوں کہ کہیں اجتماعی ذکر نہیں تھا، اب دیوبندیوں میں بھی اجتماعی ذکر شروع ہورہا ہے، یہ نئی بات ہے اور بدعت ہے، اس سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

اجتماعی ذکر کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک کہے مثلاً: **لا الہ الا اللہ** تو سب کہیں: **لا إله إلا الله**؛ پھر وہ کہے: **لا إله إلا الله** تو سب کہیں گے: **لا إله إلا الله**۔ فرمایا: اس طرح ذکر کرنا بدعت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس پر نکیر فرمائی ہے۔

البتہ اگر سب لوگ بیٹھے ہوئے ہوں، اور ہر ایک اپنا اپنا ذکر کررہا ہو تو یہ طریقہ صحیح ہے، یہ اجتماعی ذکر نہیں

ہے، دیکھنے میں اگر چہ ہیئت اجتماعیہ نظر آتی ہے، مگر حقیقت میں اجتماع نہیں ہے، کیونکہ ہر ایک اپنا اپنا ذکر کر رہا ہے، جیسے نماز سے فارغ ہو کر ہر آدمی دعا مانگ رہا ہے، یہ اجتماعی دعا نہیں ہے، کیونکہ ہر ایک اپنی اپنی دعا مانگ رہا ہے

فرمایا: میں نے اپنے شیخ (حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی قدس سرہ) کو دیکھا کہ رمضان میں آپ کے ساتھ چھ سات سو آدمی اعتکاف کرتے تھے، اور ظہر کے بعد ذکر کا معمول تھا، ہر ایک اپنا اپنا ذکر کرتا تھا، کس کا ذکر پہلے شروع ہوا ہے اور کس کا بعد میں؟ اور کون کیا ذکر کر رہا ہے؟ ان چیزوں سے کوئی مطلب نہیں تھا، نہ دائیں سے کوئی مطلب تھا نہ بائیں سے، ہر ایک اپنا اپنا ذکر کر رہا ہوتا تھا، یہ ذکر کا صحیح طریقہ ہے۔

فرمایا: اگر مجمع میں شریک سب لوگ مل کر بلند آواز سے ذکر کریں یا درود شریف پڑھیں: جیسے **لا إله إلا الله** کا ذکر سب مل کر بلند آواز سے کریں، یا **اللهم صل علی محمد** الخ سب مل کر بلند آواز سے پڑھیں تو یہ طریقہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ درود شریف پڑھنا اور ذکر و اذکار کرنا یہ انفرادی عمل ہے، اس کو اجتماعی عمل بنانا درست نہیں ہے، البتہ اگر ایک آدمی درود شریف پڑھے یا ذکر کرے اور دوسرے لوگ سنیں تو اس میں قباحت نہیں ہے۔

قیام تعظیمی:

حضرت فقیہ النفسؒ نے فرمایا: ہمارے اکابر رحمہم اللہ قیام تعظیمی کو پسند نہیں کرتے تھے، یعنی کسی بڑے کے آنے پر کھڑا ہونا پھر بیٹھ جانا ہمارے اکابر اس کو پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کا عمل:

حضرت فقیہ النفسؒ نے فرمایا: میں نے اپنے اساتذہ سے سنا ہے کہ جب حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ درسگاہ تشریف لاتے اور کوئی طالب علم کھڑا ہوتا تو حضرت وہیں رک جاتے تھے، اس کو ڈانٹتے

تھے اور جب تک وہ بیٹھ نہ جاتا آپ آگے نہیں بڑھتے تھے، علاوہ ازیں قیام تعظیمی میں مقتدیٰ کا نفس بھی خراب ہوتا ہے، اور اگر تعظیم میں غلو شروع ہو جائے تو مقتدِی کا حال بھی برا ہو جاتا ہے، جیسا کہ لوگوں کے احوال میں یہ بات مشاہد ہے، البتہ کسی مہمان وغیرہ کے آنے پر فرحت وسرور اور اعزاز واکرام کے طور پر کھڑے ہونے کو جائز کہتے تھے، حدیث میں آتا ہے: جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر تشریف لاتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے تھے اور اپنی جگہ بٹھاتے تھے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے گھر تشریف لے جاتے تو وہ بھی یہی عمل کرتی تھیں، اس لئے یہ جائز ہے بلکہ مستحسن ہے

قیام تعظیمی کی ایک اور صورت ہے، وہ کہ مسلسل کسی کے لیے کھڑے رہنا، یعنی جب تک بڑا مجلس میں رہے، لوگ کھڑے رہیں، یہ صورت مکروہ تحریمی ہے، حدیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے، من سرہ ان یتمثل له الرجال قیاما، فلیتبوأ من النار یعنی جس کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے، اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ اس کی سرحدیں شرک سے ملی ہوئی ہیں، اس لیے یہ صورت ممنوع ہے۔

قیام تعظیمی کے جواز پر غلط استدلال:

حضرت فقیہ النفسؒ نے فرمایا: بعض لوگ قیام تعظیمی کے جواز بلکہ استحسان پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، مگر یہ استدلال درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں " الی سیدکم" آیا ہے، لسیدکم نہیں آیا ہے، یعنی معاذؓ کے تعاون کے لیے اٹھو وہ بیمار تھے، ان کو سواری سے اترنے کے لیے مدد کی ضرورت تھی۔ البتہ لفظ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید آپ نے لوگوں کو قیام تعظیمی کا حکم دیا تھا، اور یہ شبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں پیدا بھی ہوا تھا، مسند احمد کی مذکورہ روایت میں ہے

فقال عمر: سیدنا اللہ عزوجل! قال (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) "انزلوہ" فأنزلوہ

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے آقا اللہ عز وجل ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو اتارو! چنانچہ لوگوں نے ان کو اتارا۔ اس میں اشارہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لفظ "سید" سے قیام تعظیمی سمجھا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی کہ تعظیم کے لیے نہیں، بلکہ تعاون کے لیے اٹھنا ہے۔

قدم بوسی:

حضرت فقیہ النفسؒ نے فرمایا: ہمارے اکابر رحمہم اللہ قدم بوسی کی بالکل اجازت نہیں دیتے تھے، کیونکہ یہ ہندوؤں کے فعل کے مشابہ ہے، ہندو اپنے بڑوں کے پاؤں پڑتے ہیں، اور اس کو انتہائی تعظیم خیال کرتے ہیں، علاوہ ازیں قدم بوسی آہستہ آہستہ سجدہ تحیہ تک لے جائے گی اور سجدہ تحیہ ناجائز ہے۔

دست بوسی:

دست بوسی بھی ہمارے اکابر رحمہم اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل نہیں ہے، کیونکہ دست بوسی کے وقت جھکنا پڑتا ہے، اور آدمی رکوع کے مشابہ ہو جاتا ہے، پس یہ سلامی کے سجدے کی طرح ہو گیا، اس لیے ہمارے اکابر رحمہم اللہ دست بوسی کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

واقعہ: حضرت فقیہ النفسؒ سے ہم نے بارہا یہ واقعہ سنا کہ حضرت مولانا اسعد مدنی نور اللہ مرقدہ کو اخیر عمر میں، سر پر چوٹ لگ گئی تھی، ایک سو پانچ دن بے ہوش رہے، دہلی میں علاج ہو رہا تھا، آپ کے ایک مرید، جو بنگلہ دیش کے رہنے والے ہیں، فی الحال نیویارک میں مقیم ہیں، مولانا کی عیادت کے لیے نیویارک سے دہلی تین دن کا ویزا لیکر آئے، آپ روزانہ مولانا کے پاس جاتے تھے، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آجاتے تھے، آخری دن واپسی کے وقت وہ مولانا ہاتھ چومنے کے لیے جھوکے تو مولانا مدنی رحمہ اللہ نے ہاتھ یکدم کھینچ لیا، بیہوشی کے عالم میں بھی ہاتھ چومنے نہیں دیا؛ کیونکہ ہاتھ چومنے کے لیے جھکنا پڑتا ہے، اس لیے یہ عمل ہمارے اکابر کے یہاں پسندیدہ نہیں ہے

تنبیہ: فقہ کی بعض کتابوں میں دست بوسی، قدم بوسی اور قیام تعظیمی کو جائز لکھا گیا ہے، حضرت فقیہ النفسؒ نے فرمایا: ہر جائز کام کرنے کے نہیں ہوتے، اور فقہ کا ہر جزئیہ مفتی بہ بھی نہیں ہے، اور اس کی بیسیوں نظیریں ہیں۔

قبر پر سجدہ کرنا

حضرت فقیہ النفس قدس سرہ نے فرمایا: سجدہ ہمیشہ عبادت نہیں ہوتا، وہ نیت کے تابع ہے، اگر بہ نیتِ تعظیم سجدہ کیا جائے تو عبادت نہیں ہے، مگر چونکہ وہ شرک کا مظنہ ہے، اس لئے ہماری شریعت میں مطلقاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور اگر سجدہ بہ نیتِ بندگی ہو تو وہ عبادت ہے، پس اگر آدمی مزاروں پر سجدہ کرتا ہے، اور بہ نیت تعظیم سجدہ کرتا ہے تو وہ سخت گناہ گار ہوگا، مگر اسلام سے خارج نہیں ہوگا، آخرت میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ایک دن جنت میں جائے گا۔ اور اگر عبادت اور بندگی کے طور پر سجدہ کرتا ہے، تو وہ اسلام سے خارج ہوجائے گا واللہ اعلم

اہل میت کے لیے کھانے کا انتظام کرنا

ایک طالب علم نے پوچھا کہ میت کے گھر والوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنا کیسا ہے؟ ہمارے یہاں اہل میت تین دن تک چولہے میں آگ جلانے کو برا سمجھتے ہیں؟

حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ نے فرمایا: جس گھر میں موت واقع ہو، اس کے اقارب یا پڑوسی وہاں اتنا کھانا بھیجیں جو ایک رات دن کے لیے کافی ہو، یہ امر مستحب ہے تاکہ وہ اپنی مصیبت کے وقت کھانے کی فکر میں مبتلا نہ ہوں، اس سلسلے میں لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ کئی کئی گھروں سے کھانا بھیج دیتے ہیں، جو زائد از ضرورت ہونے کی وجہ سے اہل میت کے لیے دردسر بن جاتا ہے، اس لیے پہلے یہ بات اہل میت کو بتا دینی چاہیے کہ وہ کھانا بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے، تاکہ اگر کوئی دوسرا کھانا بھیجنا چاہے تو اس کو منع کردیں۔

اسی طرح بعض جگہ لوگ تین دن تک کھانا بھیجتے ہیں، اور تین دن تک چولہے میں آگ جلانے کو برا سمجھتے

ہیں، فرمایا: یہ رسم ہے، اس سے بچنا ضروری ہے؛ اور بعض جگہ ہفتہ عشرہ تک کھانا بھیجنے کا رواج ہے، یہ بھی صحیح نہیں، حدیث میں" یوم ولیلۃ" ایک رات دن کا ذکر آیا ہے؛ لہٰذا اس سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے۔

بعض علاقوں میں یہ بھی رواج ہے کہ میت کے گھر والے اس موقعے پر رشتہ داروں اور تعزیت کے لئے آنے والوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتے ہیں، حضرت فقیہ النفسؒ نے فرمایا: یہ طعام المیت ہے، جو ممنوع ہے، اسی طرح چالیسویں اور بیسویں دن کا کھانا بھی طعام المیت ہے، جس کی شریعت میں گنجائش نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ دعوت خوشی کے موقعے سے ہوتی ہے، غم کے موقعے پر کوئی دعوت نہیں ہوتی۔

جو اقارب دور دراز سے آئے ہوں، ان کو خود اپنے کھانے کا انتظام کرنا چاہیے، لیکن اگر مجبوری ہو اور گھر والے یا اہل محلہ یا رشتہ دار کھانے کا انتظام کریں تو اس کی گنجائش ہے۔

فرمایا: ہمارے ملکوں میں تو اس کی نوبت نہیں آتی، اور اگر کسی بڑے آدمی کے جنازے میں لوگ دور دور سے آتے بھی ہیں تو اتنی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے کہ ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے، مگر یورپ امریکہ میں چونکہ میت فوراً دفن نہیں ہوتی، اس لیے رشتہ دار وغیرہ دور دور سے جنازے میں شرکت کے لیے آتے ہیں، اور وہاں ہوٹلوں کا اور حلال کھانوں کا بھی کوئی خاص نظم نہیں ہوتا، پس ایسی ضرورت کے وقت آنے والوں کے لیے کھانے کا نظم کیا جا سکتا ہے۔

واقعہ: حضرت فقیہ النفس قدس سرہ نے فرمایا: جب میں اپنے بیٹے سعید احمد رحمہ اللہ کی عیادت کے لیے سورت (گجرات) گیا تو لوگ میری دعوت کرنے لگے، چنانچہ میں ایک دو دعوت میں گیا، پھر یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرا بیٹا بیمار ہے میں دعوت نہیں کھا سکتا، لوگوں نے دوسری صورت اختیار کی کہ کھانا گھر پر بھیجنے لگے، پھر جب سعید احمد رحمہ اللہ کا انتقال ہو گیا اور میں وہاں پانچ دن اور مقیم رہا تو اُن دنوں میں بھی لوگ کھانا بھیجتے تھے، حضرت فقیہ النفسؒ نے فرمایا: یہ طعام المیت نہیں ہے، کیونکہ اگر سعید بھائیؒ کا انتقال نہ ہوتا، تب بھی لوگ کھانا کھلا رہے ہوتے،

اس لئے یہ صورت طعام المیت کی نہیں ہے۔

امراض کا بیان

کورونا وائرس کے سبب مساجد پر پابندی لگانا ایمان کی کمزوری کی علامت ہے

کورونا وائرس سے بچاؤ کے لیے احتیاطی تدابیر کے طور پر دنیا کے ہر ملک نے اپنے اپنے باشندگان پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، ان میں سے ایک پابندی یہ تھی کوئی آدمی گھر سے باہر نہ نکلے، شدید ضرورت کے بغیر کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی، اور مساجد کے تعلق سے یہ حکم نافذ کیا گیا تھا کہ صرف چند آدمی مسجد میں باجماعت نماز ادا کر سکتے ہیں، ان کے علاوہ کسی اور کو جماعت میں شرکت کی اجازت حکومت کی طرف سے نہیں تھی۔اس موقعہ پر حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ فرمایا کہ اسلامی ممالک میں مساجد میں باجماعت نماز پڑھنے پر پابندی لگانا بہت ہی افسوسناک ہے، آپ نے مسلم حکمرانوں کے مساجد پر پابندی لگانے کو ان کی ایمان کی کمزوری اور تقدیر پر یقین نہ ہونے کی علامت قرار دیا۔فرمایا کرتے تھے کہ کافر حکمرانوں کی بات تو الگ ہے، وہ اللہ کو کیا جانتے ہیں؟! لیکن مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے، بغیر مشیت الٰہی کے ایک پتہ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوتا، لیکن چونکہ یہ دنیا دار الاسباب ہے، اس دنیا میں کسی چیز کے وجود کے لیے کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے، اس لیے اسلام نے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، مگر احتیاطی تدابیر ہی کو سب کچھ سمجھ لینا یا مرض کو مؤثر حقیقی تصور کر لینا کہ گھر سے باہر نکلیں گے یا مسجد میں نماز پڑھنے جائیں گے تو بیماری لاحق ہو جائے گی، یہ اسلامی تصور نہیں ہے، یہ تصور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، لہذا مسلمانوں کو مصیبت کے وقت کافروں کی طرح افراط وتفریط کا شکار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسلامی تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے جوانمردی سے مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہیے، اور توبہ واستغفار کی کثرت اور ہمہ وقت اللہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے،

پھر اگر کوئی بندہ مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو وہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہے کہ جو کچھ ہوا ہے بتقدیر الٰہی ہوا ہے، ایسا بندہ اللہ کے یہاں محبوب بن جاتا ہے، اللہ اسے اجر وثواب سے نوازتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وبائی مرض میں مرنے والے مومن کو حدیث میں شہید کا درجہ دیا گیا ہے۔

پس مسلمان کورونا وائرس یا کسی بھی مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے کو لازم پکڑیں، اور توبہ واستغفار کی کثرت کریں، اور مساجد سے اپنا تعلق مضبوط رکھیں، اور کورونا وائرس جیسے وبائی مرض کے وقت؛ مسجدوں کو بند کرنے کے بجائے مصلیوں کے لیے عام رکھا جائے، تاکہ مصلیان مسجد میں آئیں اور توبہ واستغفار کریں اور اس کی برکت سے اللہ تعالی دنیا کو مصائب سے نجات دلائیں۔

کورونا وائرس میں انتقال کرنے والے کے غسل کا حکم

حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر کسی مسلمان کا کورونا وائرس میں انتقال ہو جائے تو اسے عام اموات کی طرح غسل دیا جائے گا، لیکن موجودہ حالات میں کورونا وائرس میں جو مرتے ہیں ان کو انتظامیہ کسی چیز میں پیک کر کے دیتی ہے، اور اسے کھولنے کی اجازت نہیں ہوتی، بہ صورت دیگر پریشانیوں اور مسائل کا اندیشہ ہوتا ہے، پس اگر کورونا وائرس میں انتقال کرنے والے کو غسل دینے میں اس طرح کی پریشانیاں ہوں تو اس سے غسل ساقط ہو جائے گا، صرف نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا جائے گا، نہ اس کے اوپر پانی بہانا ہے، نہ تیمم کرانا ہے، اور نہ ہی مسح کرنا ہے، اسی حال میں نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دینا ہے۔

اس مسئلے کے تعلق سے مختلف فتاوی سامنے آرہے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ جب غسل دینا ممکن نہیں تو پلاسٹک پر پانی بہا دیا جائے گا، بعض تیمم کرانے کا فتویٰ دے رہے ہیں، جبکہ بعض نے مسح کا بھی فتویٰ دیا ہے، یہ سب فتوے صحیح نہیں ہیں کیونکہ فقہ میں ایک قاعدہ ہے: جو چیز ساقط ہو جاتی ہے وہ (نہایت مجبوری میں بھی) واپس نہیں آتی"۔

پس جب کورونا وائرس میں مرنے والے کا غسل بر بنائے مجبوری ساقط ہو گیا تو ساقط ہو گیا، اب کچھ اور کرنے کی

ضرورت نہیں، صرف نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا جائے گا۔

فرمایا: اور یہ مسئلہ شہید کے مسئلہ سے لیا گیا ہے، شہید کا غسل نہیں ہے، کیونکہ شہید کا حال اکثر وقت ایسا ہوتا ہے کہ پورا بدن زخم سے چور چور ہوتا ہے، اس کو غسل دینا ممکن نہیں ہوتا۔ غزوہ احد میں ایک صحابی شہید ہوئے، کافروں نے ان کی لاش کو اس برے طریقے سے کچلا کہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ یہ لاش کس کی ہے؟! آخر میں ان کی بہن آئیں، اور انہوں نے انگلیوں کے پورے دیکھ کر پہچانا کہ یہ میرے بھائی ہیں۔ اس لیے شہداء سے غسل کا حکم ساقط ہوتا ہے، پس کورونا وائرس میں جو مرتے ہیں اور انتظامیہ پیک کر کے دیتی ہے، جہاں کھولنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی، وہاں بھی غسل کا حکم ساقط ہو جائے گا۔ اس کے بعد نہ پلاسٹک کے اوپر پانی بہانا ہے، نہ تیمم کرانا ہے، صرف نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دینا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی یہی ہے، اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

اگر کوئی مسلمان شخص کورونا وائرس میں انتقال کر جائے تو عام مرحومین کی طرح اسے بھی غسل دینا شرعاً ضروری ہے پھر خدانخواستہ میت کو غسل دینے کی کوئی صورت نہ بن سکے تو میت کو پیک کرنے سے پہلے تیمم کرا دیا جائے، مجبوری میں یہ تیمم غسل کا بدل ہو جائے گا، اور اگر تمام تر کوشش کے باوجود کسی مرحوم کے غسل یا تیمم کی کوئی صورت نہ بن سکے اور ہسپتال کے عملہ کی طرف سے میت کو مخصوص تھیلے میں پیک کر دیا گیا ہو، اور اسے کھولنے کی قطعاً اجازت نہ ہو اور بہ صورت دیگر مختلف ناقابل برداشت مسائل اور پریشانیوں کا اندیشہ ہو تو ایسی مجبوری میں غسل اور تیمم کا حکم ساقط ہو جائے گا، اور اسی حالت میں مرحوم کی نماز جنازہ پڑھ کر تدفین کر دی جائے گی، اور اس صورت میں چونکہ باڈی بیگ وغیرہ پر بھیگا ہاتھ یا بھیگا کپڑا وغیرہ پھیرنے کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے اس لیے باڈی بیگ وغیرہ پر پانی بہانے یا بھیگا ہاتھ یا بھیگا کپڑا وغیرہ پھیرنے یا تیمم کرانے کی ضرورت نہیں" الخ (مزید تفصیل اور دلائل کے لیے دیکھیں: 1441/ N=9 / 749T144: آن لائن Fatwa دارالعلوم دیوبند)

کورونا وائرس اور احتیاطی تدابیر کے بارے میں شرعی نقطہ نظر

سوال: کورونا وائرس ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اس کے بارے میں اطباء کا کہنا ہے کہ یہ مرض متعدی، حالانکہ اگر شرعی اعتبار سے دیکھا جائے تو حدیث میں یہ بات ملتی ہے کہ" **لا عدوی و لا طیرۃ**" کہ کوئی مرض متعدی نہیں ہوتا، پھر دوسری جگہ دیکھتے ہیں تو حدیث میں یہ بات ملتی ہے کہ" **فر من المجذوم** "کہ جذامی سے دور رہو! تو اب سوال یہ ہے کہ: ان دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق کس طرح ہوگی؟ اور مسلمانوں کو اس سلسلے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیے کہ کوئی بیماری متعدی ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب: حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ نے فرمایا: بخاری شریف کی حدیث ہے **لا عدوی و لا طیرۃ و لا هامة، وفرّ من المجذوم کما تفرّ من الاسد** ترجمہ: چھوت کی بیماری نہیں ہے، اور بدشگونی نہیں ہے، اور کھوپڑی کا پرندہ نہیں ہے، اور ماہ صفر کی نحوست نہیں ہے، اور جذامی سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو (رقم الحدیث: ۵۷۰۷) مذکورہ حدیث کے اول و آخر میں تعارض ہے، حدیث کے جزء اول میں بتایا گیا کہ "**لا عدوی**" یعنی ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی، جبکہ آخری جزء میں اس کی نفی کی گئی ہے، اور جذامی (کوڑھی) سے دور رہنے کی ہدایت دی گئی ہے، اس تعارض کا حل یہ ہے کہ کوئی بیماری از خود دوسرے کو نہیں لگتی، ایک کی بیماری دوسرے کو از خود لگ جانے کا تصور اسلامی تصور نہیں ہے، یہ توحید کے تصور کے خلاف ہے، توحید تو یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ جل شانہ کی مرضی سے ہوتا ہے، بغیر حکم خداوندی کے کسی چیز کا وجود ہی نہیں، لہذا از خود یعنی اپنے طور پر کسی کی بیماری دوسرے کو لگ جانے کا تصور اسلام میں نہیں ہے اس لیے فرمایا گیا "**لا عدوی**" یعنی ایک کی بیماری دوسرے کو (از خود) نہیں لگتی، چھوت چھات کوئی چیز نہیں ہے مگر بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں مریضوں کے ساتھ اختلاط (میل جول) اسباب مرض میں سے ایک سبب ہے، یعنی بیمار کے ساتھ میل جول رکھنے کی وجہ سے بیماری متعدی ہو جاتی ہے، اور یہ تعدی کا مادہ اللہ نے ان کے اندر رکھا ہے، کوئی بیماری بذات خود

متعدی نہیں ہوتی، جیسے آگ جلاتی ہے، یہ جلانے کی تاثیر اللہ نے اس کے اندر رکھی ہے، سورج طلوع ہوتا ہے تو سارا جہاں روشن ہوتا ہے، پانی پیتے ہیں تو پیاس بجھتی ہے، یہ ساری تاثیرات اللہ ہی نے ان اشیاء کے اندر رکھی ہیں، اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ بعض بیماریوں کے اندر اللہ نے تعدی کا مادہ رکھا ہے کہ ان میں مریضوں کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے مرض متعدی ہوجاتا ہے کورونا وائرس بھی اسی طرح امراض متعدیہ میں سے ایک مرض ہے کہ اس میں تعدی کا مادہ پایا جاتا ہے، کورونا وائرس میں مبتلا مریض کے ساتھ ملنے جلنے کو اسباب مرض میں سے شمار کیا گیا ہے، اور بیماری کا جو بھی سبب ہو اس سے بچنا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ بخار زدہ آدمی ٹھنڈک سے پرہیز کرتا ہے، شوگر کا مریض میٹھی چیز سے پرہیز کرتا ہے، یہ سب اسباب اختیار کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہیں، درج بالا حدیث کے ٹکڑے: فرّمن المجذ وم میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

لہذا جہاں کورونا وائرس یا اور کوئی وبائی مرض ہو وہاں سے نکلنے اور وہاں جانے دونوں سے پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ اگر وہاں گیا اور بیماری میں مبتلا ہوگیا تو خیال کریگا کہ یہاں آنے کی وجہ سے بیماری میں مبتلا ہوا، پس عقیدہ خراب ہوگا، کیونکہ بتقدیر الٰہی بیماری میں مبتلا ہوا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ ایک کی بیماری دوسرے کو از خود نہیں لگتی، جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، بدون حکم خداوندی کے کسی چیز کا وجود ممکن نہیں، لیکن بعض بیماریاں ایسی ہیں کہ ان میں اختلاط: منجملہ اسباب مرض ہے اور بیماری کا جو بھی سبب ہو اس سے بچنا ضروری ہے، موافق اسباب اختیار کرنا اور مضر اسباب سے اجتناب کرنا اسلامی تعلیم ہے، لیکن اسباب کو مؤثر حقیقی تصور کرلینا کہ اگر مریضوں کے ساتھ ملیں گے تو مرض پیدا ہوجائے گا یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ کسی بیماری میں ذاتی تاثیر نہیں ہے کہ وہ ایک سے دوسرے کو لگ جائے، سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔

سیاست

عورت کو سربراہ بنانا

حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ سے راقم الحروف نے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے اپنی زندگی میں جو آخری خط ملکہ بھوپال سلطان جہاں بیگم کو لکھا ہے، اور اس میں ان کی بیعت قبول کی ہے اور ان کو اپنی ولایت وحکومت پر برقرار رہتے ہوئے عدل وانصاف سے حکومت کرنے کا حکم بھی فرمایا ہے، حالانکہ عورت کی امارت درست نہیں ہے، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے، پس حضرت گنگوہیؒ کا ان کو بیعت کرنا پھر عدل وانصاف سے حکومت کرنے کی ہدایت دینا آپ کے نزدیک کیسا ہے؟

حضرت الاستاذ قدس سرہ نے فرمایا: سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ دو مسئلے بالکل علحدہ علحدہ ہیں:

ایک: عورت کو امیر وسربراہ بنانا جائز ہے یا جائز نہیں؟ دوسرے: اگر عورت تغلب کی بنا پر سربراہ بن جائے تو اس کی امارت درست ہے یا نہیں؟ عام طور پر لوگ ان دونوں مسئلوں کے درمیان فرق نہیں کرتے اس لیے مسئلہ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔

۱-عورت کو سربراہ بنانا جائز ہے یا جائز نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک جائز نہیں ہے، مشہور حدیث ہے

"لن یفلح قوم ولّوا امرھم إمرأۃ"

یعنی وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنے معاملہ کا ایک عورت کو ذمہ دار بنایا۔ حضرت فقیہ النفسؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قوم کے اہل حل وعقد باہم متفق ہوکر کسی عورت کو بادشاہ بنادیں، اور وہ مختار کل بن جائے، یہاں تک کہ اس

کے حکم میں کسی حاکم اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت نہ ہو، گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو، تو اس طرح عورت کو حاکم بنانا جائز نہیں ہے، اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں واقعہ بلقیس کے ذیل میں جو لکھا ہے کہ: "ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے" اس کا مصداق وہ صورت ہے جب عورت سربراہ ہو اور مختار کل ہو تو اس طرح عورت کو بادشاہ بنانا منع ہے۔

۲- اگر عورت استیلاء اور تغلب کی بنا پر سربراہ بن جائے تو حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی امارت بالاجماع درست ہے، اس کے احکام نافذ ہوں گے؛ غزالہ نامی عورت جو کسی حروری شخص کی بیوی تھی، جس دن اس نے کوفہ پر قبضہ کیا تھا، اس دن فجر کی نماز کی امامت اس نے کی تھی، اس وقت کثیر تعداد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین کی وہاں موجود تھی، صحابہ نے اس کی اقتداء میں نماز بھی پڑھی تھی۔ اس پر حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد صاحب دامت برکاتہم (استاد دارالعلوم دیوبند) نے پوچھا: اس سے تو عورت کی امامت کا جواز نکلتا ہے؟ تو اس پر حضرت نے فرمایا: وہ اقتدار اور غلبہ کی مجبوری تھی، اگر نہ کرتے تو گردن کٹتی! اس لیے نماز میں عورت کی امامت کے جواز کا استدلال درست نہیں۔

فرمایا: موجودہ دور میں الیکشن، ووٹ، پارٹی اور اکثریت تغلب کی صورت ہے، اور اس کے ذریعہ جو جمہوری حکومت قائم ہوتی ہے وہ بھی تغلبی حکومت ہے، پس اگر عورت اپنی پارٹی کی بنا پر سربراہ اور وزیر اعظم بن جائے تو اس کی امارت درست ہوگی، اور اس کے احکام نافذ ہوں گے، راز اس میں یہ ہے کہ جمہوری حکومت میں وزیر اعظم کی حیثیت صرف ایک رکن شوریٰ کی ہے، وزیر اعظم مختار کل نہیں ہوتا، اور حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے اور عورت مشورہ دینے کی اہل ہے

فرمایا: نواب سلطان جہاں بیگم کی جو حکومت تھی وہ تغلبی تھی، کیونکہ ان کی یہ حکومت خاندانی تھی، ان کے آباء واجداد سے حکومت کا یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا، لہذا ان کی حکومت تغلبی تھی، اور تغلبی حکومت بالاجماع درست ہے، اس

لیے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے ان کی بیعت قبول کی، اور عدل وانصاف سے حکومت کرنے کی ہدایت بھی دی۔ تذکرۃ الرشید (حصہ دوم: ۱۳۴) میں ہے: "میں ان کی بیعت (بارہا اصرار کے بعد) اس امر پر قبول کرتا ہوں کہ اتباع سنت اور اجتناب بدعت کو اپنا شعار رکھیں، اور حق پرستی و عدل گستری و انصاف سے رعایا پروری میں مصروف رہیں" الخ

حضرت والا فرماتے ہیں: نواب سلطان جہاں بیگم باپردہ حکومت کرتی تھیں، ایک مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب "سیرت النبی" کی تکمیل کے بعد سلطان جہاں بیگم کو ہدیہ میں پیش کرنے کے لیے لے گئے، بیگم صاحبہ نے پردے کے پیچھے سے سیرت النبی پر ایک تقریر کی، ان کی تقریر سن کر مولانا ندوی رحمہ اللہ کو تعجب ہوا کہ ایک خاتون سیرت النبی پر اتنی معلومات رکھتی ہیں۔

امداد الفتاویٰ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

حکومت کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ایک قسم وہ ہے جو تام بھی ہو اور عام بھی ہو، تام سے مراد یہ ہے کہ حاکم بانفرادہ خودمختار ہو، یعنی اس کی حکومت شخصی ہو، اور اس کے حکم میں کسی حاکم اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت نہ ہو، گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو۔ اور عام یہ ہے کہ اس کی محکوم کوئی محدود قلیل جماعت نہ ہو۔

(۲) دوسری قسم وہ ہے جو تام تو ہو مگر عام نہ ہو۔

(۳) تیسری قسم وہ ہے جو عام تو ہو مگر تام نہ ہو۔

قسم اول کی مثال: کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو۔ قسم ثانی کی مثال: کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلاشرکت ہو۔ قسم ثالث کی مثال: کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والی صوری در حقیقت والی نہیں، بلکہ ایک رکن مشورہ ہے، والی حقیقی مجموعہ مشیروں کا ہے، حدیث (لن یفلح قوم ولوا امرأھم

إمرأة) کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد حدیث میں پہلی قسم ہے، چنانچہ سبب ورود اس حدیث کا یہ ہے کہ اہل فارس نے دختر کسریٰ کو بادشاہ بنایا تھا، اور لفظ وَلّوْا میں تولیت کے اطلاق سے متبادر اس کا کمال مفہوم ہونا، پھر اس کی اسناد قوم کی طرف ہونا یہ سب اس کا قرینہ ہے، کیونکہ یہ طریقہ تولیت کاملہ کا سلطان ہی بنانے کے ساتھ خاص ہے کہ قوم کے اہل حل وعقد باہم متفق ہو کر کسی کو سلطان بنا دیتے ہیں، اور سلطان کا کسی کو حکومت دینا یہ بھی بواسطہ سلطان قوم کی طرف مسند ہوگا۔ بخلاف قسم ثانی کے کہ وہاں گو تولیت کامل ہوتی ہے مگر مستفاد قوم سے حقیقۃً یا حکماً نہیں ہوتی، اور بخلاف ثالث کے کہ وہاں گو اسناد اس قوم کی طرف صحیح ہے، مگر تولیت کامل نہیں ہے، بلکہ وہ مشورہ محضہ ہے، گو اس مشورہ کو دوسرے منفرد مشوروں پر ترجیح ہو، لیکن اس میں ولایت کاملہ کی شان نہیں ہے، اور نہ تمام ارکان کے مخالف ہونے کی صورت میں بھی اسی کو سب پر ترجیح ہوتی، حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہ قرینہ تو خود الفاظ حدیث سے ماخوذ ہے۔

اب دوسرے دلائل شرعیہ میں جو نظر کی جاتی ہے تو اس کی تفصیل کی تائید ہوتی ہے، حضرت بلقیس کی سلطنت کا قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے، آیت ہے: (ما کنت قاطعةً أمراً حتیٰ تشهدون) جس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلطنت کا طرز عمل خواہ ضابطہ سے، خواہ بلقیس کی عادت مستمرہ سے سلطنت جمہوری کا سا تھا، اور بعد اس کے ایمان لے آنے کے کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ ان سے انتزاع سلطنت کیا گیا ہو، پس ظاہر حکایت سلطنت اور عدم حکایت انتزاع سے اس سلطنت کا بحالہا باقی رہنا ہے، اور تاریخ اس کی مؤید ہے، اور قاعدہ اصولیہ ہے: "إذا قصّ الله ورسوله علینا أمراً من غیر نکیر علیه فهو حجةٌ لنا" پس قرآن سے ظاہراً ثابت ہو گیا کہ سلطنت عورت کی ہو سکتی ہے، جو قسم ثالث ہے........ اور اگر سلطنت شخصی بھی ہو مگر ملکہ التزاماً اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی ہو تو وہ بھی اس حدیث میں داخل نہیں، کیونکہ علت عدم فلاح کی نقصان عقل ہے اور جب مشورۂ رجال سے اس کا انجبار ہو گیا، تو علت مرتفع ہو گئی تو معلول یعنی عدم فلاح بھی منفی ہو گیا الخ (

امداد الفتاوی: کتاب ما یتعلق بالحدیث: ج:۵ /ص:۹۳۹۱ بحذف یسیر)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عورت کو بادشاہ اور وزیر اعظم بنانا اس طرح کہ وہ خود مختار کل بن جائے، جائز نہیں ہے، کیونکہ حدیث: (لن یفلح قوم ولوا أمرھم إمرأۃ) سے اس کی ممانعت کی گئ ہے، اور اگر عورت تغلب کی بنا پر وزیر اعظم بن جائے، جیسے الیکشن، پارٹی، ووٹ اور اکثریت کی بنا پر وزیر اعظم بن گئ تو یہ صورت حدیث مذکور کے تحت نہیں آئے گی، کیونکہ اس صورت میں اگر چہ اسناد قوم کی طرف صحیح ہے، مگر تولیت کامل نہیں ہے، بلکہ وہ مشورہ محضہ ہے، اور عورت مشورہ دینے کی اہل ہے۔

ملی تنظیموں کے سربراہوں کے ظالم حکومت کے خلاف نہ بولنے کی چند وجوہ:

ہندوستان میں این، آر، سی (NRC) کا مسئلہ چل رہا تھا، حکومت نے این، آر، سی جیسے کالے قانون کو ہندوستان میں نافذ کرنے کا اعلان کر دیا تھا، جس سے باشندگان ہند کی شہریت کا مسئلہ سامنے آیا، خاص طور پر حکومت نے مسلمانوں کو نشانہ بنایا تھا کہ اگر مسلمان این، آر، سی کے مطلوبہ شرائط پورے نہ کر سکیں تو ان کی شہریت باقی نہیں رہے گی، پھر عام شہری ہونے کی وجہ سے جو اختیارات ان کو حاصل تھے، وہ ان کے ہاتھ نہیں رہیں گے، جبکہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے بارے میں یہ اعلان تھا کہ اگر وہ این، آر، سی کے مطلوبہ کاغذات نہ دکھا سکیں تب بھی ان کو شہریت مل جائے گی، اس لیے یہ کالا قانون مسلمانوں کے لیے دردسر بن گیا تھا، چنانچہ ملک کے چپے چپے میں حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے، مسلمانوں نے اپنے حقوق کی بقا اور اپنی عزت وآبرو کے تحفظ کیلئے جان کی بازی لگا دی تھی، سیکڑوں جانباز مسلم نوجوانوں نے ملک وملت کے بچاؤ کے لیے جام شہادت نوش کیا، مگر عجیب بات یہ تھی کہ ایسے نازک اور فیصلہ کن وقت میں مسلمانوں کی ملی تنظییں بالکل خاموش نظر آ رہی تھیں، ہر مسلمان کے دل میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اپنی ملی تنظییں مسلمانوں کے حقوق کی بات کیوں نہیں کرتیں؟ این، آر، سی جیسے کالے قانون اور ظالم وجابر حکومت کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتیں؟ بعض تنظییں

اس کو یہ کہہ کر ٹال دیتی تھیں کہ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے، جبکہ بعض نے یہ کہا کہ اس وقت حکومت کے خلاف بولنا مصلحت نہیں ہے، غرضیکہ ہر ایک کوئی نہ کوئی تاویل کر گذر جاتا تھا۔

حضرت استاذ محترم کی خدمت میں اساتذہ اور طلبہ آ کر پوچھتے تھے کہ ملک کن کن مشکل ترین حالات سے گزر رہا ہے، اور قائدین سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں، ایسے نازک وقت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

حضرت والا جواب دیتے تھے کہ یہ مسئلہ دار العلوم کا نہیں ہے، دار العلوم ایک تعلیمی ادارہ ہے، اور تعلیمی ادارہ بحیثیت ادارہ اس طرح کے مسائل کے درپے نہیں ہوتا، یہ مسئلہ ملی تنظیموں کا ہے، ملی وملکی مسائل کا حل کرنا ان کی ذمہ داری ہے، لہذا انہیں اس کی فکر کرنی چاہیے؛ لیکن اب وہ کیوں خاموش ہیں؟ اس کی اصل وجہ اللہ بہتر جانتا ہے، البتہ عام طور پر اس کی دو وجہیں ہوتی ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر بعض سربراہ حکومت کے منظور نظر بننے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ بعض تو حکومت کے ہاتھ بک بھی جاتے ہیں، اب آقا کے خلاف بات کریں تو کیسے کریں؟ اس لیے وہ خاموش رہتے ہیں، اور طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔

اور دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلم لیڈروں کے پاس مال کی اتنی فراوانی ہوگئی ہے کہ حکومت کے خلاف بولنے کی ان کے اندر ہمت ہی نہیں رہی، کیونکہ اگر وہ حکومت کے خلاف بولیں گے تو حکومت فوراً پولیس بھیج دے گی، اور جائیداد کا حساب طلب کرنا شروع کر دے گی، اس لیے وہ خاموش ہیں۔

فرمایا: حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہی بات کر سکتا ہے جس کی شخصیت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہما اللہ کی مانند ہوں، کیونکہ ان بزرگوں کے پاس کچھ نہیں تھا، بدن پر کپڑے اور ہاتھ میں کفن تھا، ایسی شخصیت حکومت کے خلاف بولنے میں کسی کی پروا نہیں کرتی فرمایا: کہتے ہیں کہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی وفات بحالت مقروض ہوئی، حضرت کو لوگ ہدایا دیتے تھے، پس جو ہدایا آپ کے شاگردوں اور مریدوں کی طرف سے ہوتے تھے ان کو تو اپنے پاس رکھتے، باقی دیگر لوگوں کے ہدایا دفتر

محاسبی دار العلوم دیو بند میں جمع کر دیتے تھے، فرماتے تھے: حسین احمد کو کون جانتا ہے؟ یہ تو دار العلوم کی نسبت سے جانتے ہیں، اس لیے آپ بقیہ ہدایا محاسبی میں جمع کر دیتے تھے۔

فرمایا: مجاہد ملت رحمہ اللہ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے، گاندھی جی نے آپ کو باہر کسی ملک میں علاج کے لیے بھیجنا چاہا، تو مجاہد ملت رحمہ اللہ نے انکار کر دیا، اور حکومت کی طرف سے امداد نہیں لی، جب انتقال ہوا تو اپنا مکان بھی نہیں تھا تو کسی نے کرائے والا مکان خرید کر اُن کے ورثا کو دیا۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں

آج دنیا کے ہر ملک میں مسلمان پریشان حال ہیں، طرح طرح کی آزمائشوں کا شکار ہیں، خاص طور پر ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت نہتے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہی ہے، حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ کی خدمت میں لوگ آکر پوچھتے تھے کہ ایسے موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

حضرت اقدس رحمہ اللہ فرماتے تھے: ہم نے ایک مرتبہ ہندوستان میں جنگ آزادی لڑی تھی اور یہ جنگ اپنوں اور پرایوں یعنی انگریزوں کے درمیان تھی، اب ہمیں دوسری جنگ لڑنی ہے اور یہ جنگ اپنوں میں ہے ہم نے انگریزوں کے ساتھ جس طرح جنگ آزادی لڑی تھی اب وہ زمانہ نہیں رہا، اس وقت ہم نے فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی سیکھنا حرام ہے، آج یہ فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح فتویٰ دیا تھا کہ بدیسی مال استعمال نہیں کیا جائے گا، اور فوج میں ملازمت بھی نہیں کی جائے گی، اب یہ سب فتوے کارگر ثابت نہیں ہوں گے، اس لیے دوسری تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی، اور وہ دو تدبیریں ہیں:

(۱) اپنوں پر محنت:

یعنی ہمارے جو مسلمان بھائی دین سے دور ہیں، اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں، دین کے موٹے موٹے مسائل بھی نہیں جانتے ہیں، ان پر محنت کرنی ہے، ان کو مسجدوں کے قریب لانا ہے اور دین کے ضروری مسائل کی

تعلیم دینا ہے، ان کو یہ سمجھانا کہ تم مسلمان ہو، اللہ نے تمہیں اسلام کی دولت سے نوازا ہے، لہذا آپ کو اس کی قدر کرنی چاہیے، اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گذارنی چاہیے، لباس پوشاک، وضع قطع، چال ڈھال اور طور طریق بھی اسلامی ہونے چاہئیں، اور یہ جو تم پتلون پہنتے ہو، اور اس کے اوپر شرٹ یا ٹی شرٹ پہنتے ہو، یہ اسلامی لباس نہیں ہے، یہ غیروں کا لباس ہے، اس میں عریانیت ہے اور اسلام کے نزدیک عریانیت ناپسندیدہ ہے، پتلون پہننی ہو تو پہن سکتے ہو، مگر اس کے اوپر گھٹنوں تک کرتا ہونا چاہیے؛ پھر سر پر ٹوپی اور منہ پر ڈاڑھی کا ہونا یہ مسلمانوں کا شعار ہے، ڈاڑھی، ٹوپی مسلم اور غیر مسلموں کے درمیان طرۂ امتیاز ہیں، یہی وجہ ہے کہ ڈاڑھی اور ٹوپی دیکھ کر ہر کوئی پہچان لیتا ہے کہ یہ مسلمان ہے، اس لیے آپ کے سر پر ٹوپی اور منہ پر ڈاڑھی بھی ہونی چاہیے۔ غرض اس طریقے سے مسلمانوں کو سمجھا کر ان کے اعمال واخلاق درست کرنا سب سے پہلا کام ہے۔

مثال: جب آپ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو کر آئے تھے، اس زمانے میں روڑکی میں ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا، وہاں مسلمانوں کی تعداد کم تھی، تو ایک مولانا صاحب نے یہ تدبیر اختیار کی کہ رات کو سہارنپور گئے، اور پانچ ہزار ٹوپی خرید کر لائے، اور راتوں رات تمام گھروں میں تقسیم کر دیں، اور یہ کہا کہ صبح ہر آدمی ٹوپی پہن کر نکلے، صبح جب ہر آدمی ٹوپی پہن کر نکلا تو ہندو سہم گئے کہ رات میں اتنے مسلمان کہاں سے آئے؟! اور فساد دب گیا۔

مثال: حضرت رحمہ اللہ نے ایک مثال یہ بھی دی کہ ایک بس میں تین سردار جی (سکھ) بیٹھے ہوئے ہیں، پگڑی باندھے ہوئے ہیں، اور شیر کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں، اس بس کے اندر کسی سکھ لڑکی کو کوئی چھیڑ نہیں سکتا، کیونکہ ان کے سردار جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف اسی بس کے اندر دس مسلمان ہوتے ہیں، اور مسلم لڑکیوں کو ہندو چھیڑتے ہیں، کیونکہ پہچانا ہی نہیں جاتا کہ بس میں کوئی مسلمان ہے؟ نہ منہ پر ڈاڑھی ہے، نہ سر پر ٹوپی، اس لیے وہ مسلمانوں کو پریشان کرتے ہیں، بعض دفعہ مارتے بھی ہیں، مگر کوئی دفاع کرنے والا نہیں ہوتا۔ لہذا جب تک مسلمان اپنے حالات نہیں بدلیں گے، ملک کے حالات بدلنا مشکل ہے۔

فرمایا: لیکن مسلمانوں کے چال چلن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے حالات بدلنے کے لیے تیار ہی نہیں، پانچ وقت نماز بھی صحیح سے نہیں پڑھتے، مسجد میں جو ڈیڑھ صف نمازی تھے، اب بھی وہی ڈیڑھ صف ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ میاں کایا پلٹ دیں!

فرمایا: لوگ ہمارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں یوں پریشان ہوں، ووں پریشان ہوں، دعا کرنا میرے حالات ٹھیک ہوجائیں! یعنی میں تو اپنے حالات ٹھیک نہیں کروں گا، میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا، آپ اللہ میاں سے کہیے کہ وہ اپنی عادت بدل لیں!

حضرت رحمہ اللہ ان سے کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا نظام ایسا نہیں کہ تم اپنی مرضی سے جو کچھ کرنا ہو کرتے رہو، اور وہ تمہارے حالات اور پریشانیاں دور کردیں! ارشاد باری تعالیٰ ہے (**ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بأنفسھم**) یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو جو نعمت دی ہے وہ اس وقت تک نہیں لیتے جب تک قوم اپنے حالات بگاڑ نہ لے۔

لہذا ملک کے حالات سنوارنے کے لیے سب سے پہلے مسلمانوں کے حالات درست کرنا ضروری ہے، اس کے لئے دین دار مسلمانوں کو محنتیں کرنی پڑیں گی، اور یہ محنت ہر ایک کو اپنے گھر سے شروع کرنی ہے، پھر اپنی بستی اور محلے سے، اسی طرح پوری قوم پر محنت کرنی ہے، اس کے لئے اگر محلوں یا مسجدوں میں مکاتب اسلامیہ قائم کرنے کی ضرورت پڑے تو یہ بھی کرنا ہے۔

۲۔۔۔۔غیروں پر محنت: یعنی غیر مسلموں کو اپنے اخلاقیات سے متاثر کرنا، ہندوؤں کی جو پسماندہ ذاتیں: چمار، بھنگی وغیرہ ہیں ان پر محنت کرنا، ان کو اپنے اخلاق واعمال سے اور انسانیت کی بنیاد پر قریب لانا، پھر جب ان سے انسیت ہوجائے تو ان کو یہ سمجھانا کہ تم ہندو نہیں ہو، جس طرح سکھ ہندو نہیں ہیں، ہندو تو بڑی ذاتیں: برہمن، کھتری اور راج پوت ہیں، وہ اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں، اور تمہیں زبردستی ہندو بنا رہے ہیں۔

پھران کے سامنے احکام اسلامیہ بتدریج پیش کیئے جائیں، سب احکام ایک ساتھ پیش نہ کردیے جائیں، اگرایک ساتھ تمام احکام پیش کیئے جائیں گے تو ممکن ہے کہ ان کے ذہن پر بوجھ پڑے، اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جائیں۔اس لیے الاھم فالاھم کے قاعدے سے جوحکم سب سے زیادہ اہم ہے وہ پہلے پیش کیا جائے، اور بنیادی حکم توحید باری ورسالت محمدی ہے، اس لیے پہلے توحید کی دعوت دی جائے۔مثلاً ان سے یہ کہا جائے: بتاؤ! آسمانوں کوکس نے پیدا کیا؟ وہ کہیں گے: اللہ نے! زمین کوکس نے پیدا کیا؟ وہ کہیں گے: اللہ نے! اور آپ کوکس نے پیدا کیا؟ وہ کہیں گے: اللہ نے! پھر یہ کہا جائے کہ: جب اللہ نے آپ کو اور سارے جہان کو تن تنہا پیدا کیا ہے، اور اس میں کوئی شریک نہیں ہے تو وہی تنہا معبود ہونے کا مستحق ہے، اسے چھوڑ کر دوسرے معبودوں کا گرویدہ ہونا سراسر نا انصافی ہے، کھلائے پلائے کوئی؛ اور سر نیاز خم کیا جائے کسی اور کی چوکھٹ پر!!؟ یہ غیر معقول ہے، پس جو خالق و رازق ہے وہی معبود ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہوسکتا۔غرضیکہ ان کو توحید کی طرف مائل کرنے کے لیے سب سے پہلے وہ عقائد پیش کیئے جائیں جن کے وہ پہلے ہی سے معتقد ہوں، اور ان کے ذریعے استدلال کرکے توحید کا قائل کیا جائے۔

پھران کو رسالت محمدی کی دعوت دینی ہے، مثلاً ان سے یہ کہا جائے کہ جب ہم نے اس بات کی تصدیق کر لی کہ معبود صرف ایک اللہ تعالیٰ ہیں، ان کے سوا کوئی معبود نہیں، اور آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر اعتبار سے بلند و برتر ہے، نہ کوئی ان کے قریب جاسکتا ہے، نہ کوئی رو در رو کلام کرسکتا ہے، اب ان کی عبادت کس طریقے سے کی جائے؟ ان کی مرضیات اور نا مرضیات ہمیں کیسے معلوم ہوں؟ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم انسانوں میں سے کسی انسان کو اس کام کے لیے منتخب کرتے ہیں، وہ ہمیں اللہ کی عبادت کا طریقہ بتاتا ہے، اور ان کی مرضیات اور نامرضیات کی تعلیم دیتا ہے، اسلام کی اصطلاح میں اسے رسول اور پیغمبر کہتے ہیں، اللہ نے اس دنیا میں لاکھوں سے زائد اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے ہیں، اس سلسلے کی آخری کڑی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ہم ان

کو اللہ کا رسول اور پیغمبر مانتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کے رسول ہونے کی سب سے بڑی دلیل قرآن کریم ہے، کیونکہ قرآن نازل ہوئے آج چودہ سو سے زائد عرصہ گذر چکا ہے، مگر آج تک اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں نکال سکا، اور قرآن نے واضح الفاظ میں چیلنج بھی کر رکھا ہے کہ اگر قرآن کریم کے اللہ کا کلام ہونے میں کسی کو کوئی شک ہو تو وہ اور اس کے ساتھی سب مل کر اس کے ہم پلہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا بنا کر لے آئیں مگر آج تک کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکا، اور نہ قیامت تک کر سکے گا! پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور ہمیں یہ کلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ملا ہے، پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

اگر مخاطب اہل کتاب: یہود و نصاریٰ ہیں تو وہ تو توحید کے قائل ہیں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کے قائل نہیں، پس ان کو توحید کے ساتھ رسالت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بھی دعوت دی جائے۔

نومسلم کو مسلمان اپنائیں!

حضرت فقیہ النفس رحمہ اللہ نے فرمایا: پھر جب اللہ تعالی کسی بندے کو اسلام کی دولت سے نواز دیں، تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس نومسلم کو اپنائیں! اپنی فیملی اور خاندان کا جز بنائیں، اور اس کی دینی دنیوی ہر طرح کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کریں! اگر اس کو لڑکی چاہیے تو لڑکی دیں، اگر اس کی لڑکی ہے تو اپنے لڑکے سے لیں!

فرمایا: پہلے زمانے میں جو اسلام تیزی سے پھیلا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ جو نیا مسلمان ہوتا تھا وہ مسلمان بنانے والے کے خاندان کا جز بن جاتا تھا، اس خاندان کا سرنیم اس کو ملتا تھا، آج ہزاروں آدمی اسلام کی حقانیت سمجھ رہے ہیں، پھر سوچتے ہیں کہ اسلام لائیں گے تو کیا ہوگا؟ کوئی سہارا دینے والا نہیں ہوگا! اس لیے وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں، اور اسلام لانے کی ہمت نہیں کرتے، کیونکہ وہ مسلمان ہو کر اپنے خاندان سے تو کٹ جاتا ہے، خاندان

کے سب لوگ ان کے دشمن ہوجاتے ہیں، بعض دفعہ جان سے مارڈالتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نو مسلموں کو اپنائیں اور ان کے سر پر دست شفقت رکھیں! تب ان شاء اللہ اسلام پھیلے گا، اور اسلام کا بول بالا ہوگا۔

واقعہ: حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: راندیر (سورت، گجرات) میں جس محلے میں آپ رہتے تھے، اس محلے میں ایک نو مسلم ڈاکٹر صاحب تھے، وہ مسلمان ہو گئے تھے، ان کی بیوی بھی مسلمان ہوگئی تھیں، ان کی دو لڑکیاں تھیں، وہ بھی مسلمان ہوئی تھیں، اور پکی مسلمان تھیں، ڈاکٹر صاحب حضرت کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، بعض دفعہ آپ کے پاس آ کر بیٹھتے، اور روتے تھے، کہتے تھے: لڑکیاں بڑی ہوگئیں، کوئی شادی کرتا نہیں، ہر وقت فکر مند رہتا ہوں کہ کیا کروں؟

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: اس وقت میرے لڑکے چھوٹے چھوٹے تھے، اس لیے میں ان سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا، صرف تسلی دیتا تھا، پھر میں دیوبند آ گیا، اب اللہ کے فضل سے دونوں لڑکیاں دو مولویوں کے نکاح میں ہیں اور خوش ہیں۔ فرمایا: دور اول میں یہ طریقہ تھا کہ جس نے کلمہ پڑھا یا وہ اس نو مسلم کو اپنے خاندان میں لے لیتا تھا، اور اس کی خوبی خرابی کا ذمہ دار بنتا تھا، اس لیے اسلام تیزی سے پھیلتا رہا، آج بھی مسلمانوں کو یہ طریقہ اپنانا چاہیئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ملک کے حالات سنوارنے کے لیے مسلمانوں کو سب سے پہلے دو کام کرنے ہیں۔ ایک: اپنوں پر محنت کرنا، یعنی جو لوگ دین سے دور ہیں، ان کو مسجد کے قریب لانا ہے اور دین کی بنیادی تعلیم دینا ہے۔ دوسرے: غیروں پر محنت کرنا، یعنی غیر مسلموں کو انسانیت کی بنا پر اپنے قریب لانا، اور اپنے اخلاق واعمال سے ان کو متاثر کرنا، پھر آہستہ آہستہ ان کو اسلام کی دعوت دینا، پھر جب کوئی بندہ اللہ کے فضل سے مسلمان ہو جائے، تو اس کو اپنانا، اور اس کا سہارا بننا، اگر مسلمان یہ دونوں کام شروع کر دیں تو ان شاء اللہ ملک کے حالات میں تبدیلیاں آنی شروع ہو جائیں گی۔

اقوالِ زریں

چند فکر انگیز اقوال حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

مولانا عادل سعیدی پالن پوری

❁ رذیلوں کا غلبہ ان کی رذالت کو زائل نہیں کرتا، البتہ اس سے شریفوں کی شرافت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

❁ قمری حساب یاد رکھنا، اور اس کی حفاظت کرنا فرض کفایہ ہے، کیونکہ بیشتر احکامِ شرعیہ کا اسی سے تعلق ہے۔

❁ دولت ڈھلتی چھاؤں ہے، آج اِدھر تو کل اُدھر ہے، خوش نصیب وہ ہے جو اس نعمت سے بروقت فائدہ اٹھالے۔

❁ روزی کے طالبو! اولاد بھی روزی ہے، اور ایک روزی سے دوسری روزی کا دروازہ کھلتا ہے۔

❁ شراب، ناچ گانا، ٹی وی، وی سی آر، تصاویر اور بے پردگی زنا کے چور دروازے ہیں، ان سے کلی اجتناب کرو۔

❁ حلال وحرام یکساں نہیں، اگرچہ حرام کی کثرت لوگوں کو بھلی معلوم ہو۔

❁ تکبر: حق کو قبول نہ کرنا اور دوسروں کو حقیر جاننا ہے۔

❁ کائنات اکیلے اللہ تعالی نے بنائی ہے، پس اس کا ساجھی تجویز کرنا ناقابلِ معافی جرم ہے۔

❁ اللہ سبحانہ وتعالی کے دشمن اس خوش فہمی میں ہرگز نہ رہیں کہ وہ ہمیشہ مزے اڑاتے رہیں گے، ایک وقت کے بعد ان کا انجام برا ہونے والا ہے۔

❁ جب دل اندھے ہوجاتے ہیں، تو نصیحت سر پر سے گذر جاتی ہے، اور جب آنکھ اندھی ہوجاتی ہے، تو نشانی بے فائدہ ہوجاتی ہے۔

❁ لوگو! قرآن کریم کی قدر کرو، قرآن کریم وہ نعمت ہے، جو اپنے ماننے والوں کو دنیا میں بالانشیں اور آخرت میں خلد آشیاں بناتا ہے۔

❁ یہ خیال غلط ہے کہ رسول، خدائی اختیارات کا مالک ہوتا ہے، اس کا کام صرف پیغام حق پہنچانا ہے۔

❁ یہ دنیا عمل کی جگہ ہے، فیصلہ کی جگہ نہیں، فیصلہ کا دن یومِ جزا ہے، جو جلد آرہا ہے۔

❁ اللہ سبحانہ وتعالی کا بے پایاں کرم ہے کہ وہ اپنے دشمن کو بھی بڑا عیش دیتے ہیں، یہ ان کا قانونِ امہال ہے، اس سے کوئی دھوکہ نہ کھائے۔

❁ دنیا کا عیش چندروزہ ہے، یہاں جو کرنا ہے کرلے، انجام اس کا فنا ہے۔

❁ دنیا کی فانی زندگی بنانے کی فکر نہ کرو، آخرت کی دائمی زندگی کی فکر کرو، اُس کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔

❁ کلمہ طیبہ جنت کی چابی ہے، اور نیک اعمال اس کے دندانے ہیں، اور چابی کام اسی وقت کرتی ہے، جب اس کے دندانے درست ہوں۔

❁ طالب علم کے لئے استاذ کی اطاعت اور فروتنی ضروری ہے، اس کے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا۔

❁ جنت اللہ کی خوشنودی کا گھر ہے، اور وہ ان لوگوں کی میراث ہے، جو مؤمن ہیں، اور نیکی اور پاک بازی کی زندگی گزارتے ہیں۔

❁ ہر عمل میں اخفا افضل ہے، البتہ کسی عارض سے مثلا: رفعِ تہمت یا امیدِ اقتداء وغیرہ سے اظہار کو ترجیح ہو جاتی ہے۔

❁ قرآن کریم رحمت ونور ہے، حسبِ استطاعت اس کی اشاعت وتلاوت کرنا آخری درجہ کی سعادت ہے۔

❁ قیامت اور موت کا وقت اس لئے مخفی رکھا گیا ہے کہ لوگ عمل سے غافل نہ ہوں، اور مسلسل محنت میں لگے

رہیں۔

❁ اللہ سبحانہ وتعالی کا دین دارین کی بہتری کا ضامن ہے، پس لوگ اس کی قدر کریں۔

❁ وہ لوگ قیامت کے دن زندہ ہونے کا انکار کرتے ہیں، وہ سوچیں کہ پہلی مرتبہ وہ کیسے زندہ ہوئے ہیں۔

❁ سچا ایمان جب کسی کونصیب ہوتا ہے، چاہے ایک لمحہ کے لئے ہوتو وہ ایسی روحانی قوت پیدا کردیتا ہے، کہ زبردست سے زبردست طاقت بھی اس کومرعوب نہیں کرسکتی۔

❁ وہ مومن موت کے ساتھ ہی جنت کا امیدوار ہے، اس کوفرائض سے غافل، اور کبائر میں ملوث نہیں ہونا چاہئے۔

❁ مظاہر پرستی والا ذہن کا ذہن ہے، حقیقت پسندی والا ذہن ہی مثالی ذہن ہے۔

❁ آخرت دنیا کا عکس ہے، جو یہاں اندھا بنا ہوا ہے، وہ آخرت میں اندھا اٹھایا جائے گا، بلکہ اندھے سے بھی بدتر۔

❁ جو کفار رسول کا مرتبہ گھٹاتے ہیں، اوراس کوصرف اپنے جیسا انسان تصور کرتے ہیں، اور جو لوگ رسول کا مرتبہ بڑھاتے ہیں، اوراس کو اللہ تعالی کا بیٹا، یا عالم الغیب، مالک تصرف مانتے ہیں، وہ سب غلط ہیں، صحیح عقیدہ وہ ہے جو کلمہ شہادت میں ہے کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالی کے بندے اور رسول ہیں۔

❁ مال ودولت اور زور وقوت کا نشہ اس وقت ہرن ہوجاتا ہے، جب عذاب کا کوڑا برسنا شروع ہوتا ہے۔

❁ محفلِ کائنات میں باطل اچھل کود مچاتا رہتا ہے۔ مگر جب حق اس سے برسرِ پیکار ہوتا ہے تو وہ باطل کا سر کچل دیتا ہے۔

❁ انسان اللہ سبحانہ وتعالی کے عذاب کا معمولی کھٹکا بھی برداشت نہیں کرسکتا، مگر غفلت کا یہ حال ہے کہ اسبابِ عذاب ڈھیروں جمع کئے چلا جارہا ہے۔

افاداتِ سعید

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ

مولانا محمد یاسین خان قاسمی
استاذ جامعہ مسیح العلوم بنگلور

❁ میری تفسیر (ہدایت القرآن) پڑھو اس میں میں نے قرآن کا عبارت النص سمجھایا ہے لوگ اس کی قدر نہیں کرتے، میرے مرنے کے بعد ہی اس کی قدر ہوگی۔

❁ فہم قرآن کے لئے بنیادی بات یاد رکھو: قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو، ایک آیت کو بھی آہستہ آہستہ پڑھو، اس میں تدبر کرو، ایک سانس میں پوری آیت پڑھوگے تو کبھی کچھ نہیں سمجھوگے۔

❁ قرآن پاک کے مفرد لفظ کے ترجمہ کے لئے مولانا شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کے ترجمہ (موضح القرآن) کو بھی دیکھتا ہوں وہ ایک ہی لفظ کا ترجمہ مختلف جگہوں میں مختلف کرتے ہیں، ان کا ترجمہ ایک حد تک تفسیر کا کام کرتا ہے۔

❁ مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی (شیخ الحدیث) بخاری شریف میں کتاب التفسیر بہت تفصیل سے پڑھایا کرتے تھے، اسی سال مجھے اندازہ ہوا کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے مجھے حافظ ہونا پڑے گا؛ اس لئے آئندہ سال افتاء کے ساتھ میں حفظ بھی کرتا تھا، اور صدر گیٹ کی چوکی پر بیٹھ کر ہی میں نے قرآن حفظ کیا ہے۔

❁ (تحذیر الناس) کے اخیر میں حضرت نانوتوی نے تفسیر بالرای پر جو کلام کیا ہے، وہ مفتی سعید صاحب کو بہت دلکش معلوم ہوتا تھا اسی وجہ سے (العون الکبیر) کے شروع میں اور (رحمۃ اللہ الواسعۃ) کی تیسری جلد میں اس

کو اہتمام سے نقل کیا ہے اور یقیناً اس کو پڑھنے کے بعد قرآن کو ابدی کتاب سمجھنا عقلاً آسان ہو جاتا ہے۔

❁ مفتی صاحب تفسیر لکھنے کے وقت مفتی تقی صاحب کی (توضیح القرآن) سے استفادہ کیا کرتے تھے مجلس میں جانے والے ہمیشہ اس کو ان کے ڈیسک پر دیکھتے تھے۔

❁ میں نے (ہدایت القرآن) میں حتی الامکان یہ التزام کیا ہے کہ: صرف ایک احتمال کو مدلل کر کے لکھوں ، یہ نہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے، اس سے قاری الجھ جاتا ہے۔

❁ میں نے سب سے پہلے فقہ پڑھا، پھر حدیث پڑھی، اسی وجہ سے میرے لئے قرآن سمجھنا آسان ہو گیا، گمراہی سے بچنے کے لئے یہی ترتیب مفید ہے؛ کیونکہ صرف فقہ پڑھو گے تو جمود کا شکار ہو جاؤ گے، اور صرف حدیث پڑھو گے تو غیر مقلد بن جاؤ گے اور قرآن کا عالمانہ فہم: فقہ، حدیث، اور کلام پڑھے بغیر ممکن نہیں ہے۔

❁ حضرت نانوتوی نے (جواب ترکی بہ ترکی) میں قرآن کی فصاحت اور بلاغت پر شاندار بحث کی ہے، جس سے یہ بھی سمجھ میں آسانی سے آجاتا ہے کہ ہم کیوں قرآن کے اعجاز کو اعتبار فصاحت و بلاغت سمجھ نہیں سکتے۔

❁ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے حضرت نانوتوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: مشاہیرِ امت میں تین ایسے افراد گذرے ہیں جن کی کتابوں کے مطالعہ کا عادی کبھی غبی نہیں رہتا۔ اول شیخ ابن عربی۔ دوسرے مجدد الف ثانی۔ اور تیسرے شاہ ولی اللہ۔

حضرت شیخ الہندؒ نے آگے اضافہ فرمایا کہ: حضرت الاستاذ (نانوتوی) بھی اسی فہرست کے چوتھے فرد تھے میں (سعید احمد) نے یہ طے کیا کہ ان کو پڑھنا ہے، لیکن ابن عربی بہت مختلف فیہ شخصیت ہیں اور مجدد صاحب پر تصوف کا غلبہ تھا، اور مجھے تصوف سے مناسبت نہیں ہے؛ اس لئے میں نے حضرت نانوتوی اور شاہ صاحب کا انتخاب کیا۔

❁ طالب علمی کے زمانے میں (جلالین) کے ساتھ کوئی تفسیر نہیں دیکھتا تھا، استاذ کے بتلائے ہوئے مطلب کو

یاد کرتا تھا؛ کیونکہ ابتدا میں کثرت علم سے زیادہ پختگی علم پر توجہ دینی چاہیے۔ (جلالین) کے حاشیہ کو میں نہیں دیکھتا تھا، اس میں رطب و یابس بہت ہے پہلے کتب خانے والے طلبہ سے (حاشیہ لکھوایا کرتے تھے لیکن ان کا نام منظر عام پر نہیں آتا تھا، یہ حاشیہ بھی کسی طالب علم کا ہے۔

✿ حضرت تھانویؒ کی تفسیر (بیان القرآن) کی خصوصیات بہت سے لوگ بیان کرتے ہیں کہ: ایک لفظ بڑھا کر سارے اشکال کو ختم کر دیتے ہیں، بعینہ صاحب (جلالین) یہی کرتے ہیں۔ جلالین سے مقصود یہی ہے کہ طلبہ میں قرآن حل کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے، ضروری نہیں کہ جلالین کی بتائی ہوئی تفسیر راجح ہو، لیکن استعداد سازی میں اس کی اور (بیضاوی) کی کوئی نظیر نہیں ہے

✿ (تحفۃ الالمعی) اور میری دیگر کتابوں میں تمہیں میرے بہت سے تفردات ملیں گے، تو وہ میرے لئے ہیں، تمہارے لئے نہیں اور فرمایا کہ: جب تک دار الافتاء میری رائے قبول نہ کرے تمہیں اس پر عمل نہیں کرنا چاہیے، تمہارے لئے راجح وہی ہے جو دارالافتاء کہے۔

✿ تصدی للاقراء یعنی استاذ کا حدیث پڑھانے کے لئے درسگاہ میں آ کر بیٹھنا، اور اس کے سامنے حدیث کا پڑھا جانا یہ خود آٹو میٹکلی کی اس کی طرف سے حدیث کی اجازت ہوتی ہے، اس کے ساتھ کسی دوسری اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

✿ کسی مقبول شخصیت، مضمون، تنظیم کی تنقید اور اصلاح اس انداز میں ہونی چاہیے کہ: مقابلہ جیسا محسوس نہ ہو، ورنہ اس کی افادیت ختم ہو جائے گی پھر فرمایا کہ: میں نے (حجۃ اللہ البالغہ) کی شرح میں بعض جگہ پر شاہ صاحب کی رائے سے اختلاف کیا ہے لیکن اس کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری اس بات کو سمجھ لے، اور اختلاف کا زیادہ احساس نہ ہو۔

✿ اب طلبہ میں صلاحیت نہیں بنتی، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ: ابتدائی درجات کے اساتذہ ماہر، باصلاحیت نہیں

ہوتے ہیں، جو باصلاحیت ہوتے ہیں وہ اوپر کی کتابیں ڈھونڈھتے ہیں، اس طرح نہیں ہونا چاہئے ،ابتدائی درجات کے اساتذہ بہت مضبوط ہونے چاہئیں ،جس سے بچوں کی ابتدا ہی سے صلاحیت بننے لگے۔

❁ اپنے اشرفیہ کے زمانہ تدریس کا ذکر کرتے ہوئے شیخ احمد رضا اجمیری رحمہ اللہ کے تذکرہ میں فرمایا کہ: شیخ اجمیری بے نفس آدمی تھے، عجیب شخصیت کے مالک تھے،ان سے میں نے کہا: مجھے ابوداؤد پڑھانی ہے، کہا: لے لو، پھر بعد میں کسی سال میں نے کہا: مجھے ترمذی چاہئے ،کہا: لے لو، پھر میں نے کہا: اگلے سال بخاری دیدینا، کہا: ٹھیک ہے، پھر اس کی نوبت نہیں آئی، میں دیوبند آ گیا۔

❁ جب راقم نے اپنی کتاب: ”مروجہ موضوع احادیث کا علمی جائزہ“ حضرت کی خدمت میں اصلاح کے لئے پیش کی تو حضرت والا بہت خوش ہو گئے۔ اور فرمایا کہ: ماشاء اللہ اچھی محنت کی ہے، میری ایک آرزو تو نے پوری کردی۔ اللہ قبول فرمائے، تجھے علمی وعملی ترقی عطا فرمائے۔ اب جن روایات کی کچھ اصل نہیں ملی اور شاید نہ بھی ملے تو ان پر درایۃً کلام کر اور مفتی صاحب (مفتی شعیب اللہ صاحب) کو دکھایا کر اور اسی پر مت رک، تین سو نہیں، ہزاروں کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہیں، لگے رہو۔

باب ہفتم:

منظومات

مرثیہ

بروفات حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالنپوری نور اللہ مرقدہ

حضرت مولانا مفتی محمد یوسف تاؤلوی صاحب
استاذ حدیث دار العلوم دیو بند

حق تعالیٰ نے بنایا ان کو ذی علم و ہنر
معدن اخلاق بہی اور علم و فن کا اک گہر
معدن حکمت بہی ہے لعل و گہر سے کم نہیں
ذی بصیرت پر ضیا ہے ساتھ میں نور بصر
سوز دل درد نہاں عفو و کرم بہی بے مثال
علمی کر و فر بہی ہے اور ساتھ میں سوز جگر
گنج علم و آگہی ہے ان کی محنت کی دلیل
لطف کتب بینی بہی ہے ذوق مناجات سحر
میرا دیرینہ تعلق ان سے وابستہ رہا
بہت سے اسفار میں دیکہا ہے میں ذوق سفر
محسن و ہمدرد سادہ بے تکلف ہم سفر
میں نے دیکھا ہے سفر میں ساتھ میں لطف حضر
بحر عرفاں چشم تر غواص اسرار وحکم

دور رس بھی حق نگر بھی ساتھ میں حق بیں نظر
عدل سے دیکھو تو ہستی جامع الاشتات ہے
جلوئے صدیق بھی ہے اور کبھی رعب عمر
لذت شب زندہ داری کا کمال ان کو ملا
پختگی تھی علم میں اور ذات ان کی ذی اثر
الفت علم نبوت دل میں ان کے موجزن
بس یہی راحت کا ساماں تھا نہ کچھ چیز دگر
ابر رحمت ان کی تربت پر رہے سایہ فگن
ان کی کھیتی پر کبھی ظاہر نہو گرد سفر
صدق کا اعلی ٹھکانہ ان کو یارب کر عطا
ہے دعا یوسف کی یارب کر عطا اعلی ثمر

❁...❁...❁

مرثیہ بروفات

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

مولانا فضیل احمد ناصری صاحب
استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

زمیں ماتم کُناں ہے علم و فن کا آسماں ڈوبا
ستاروں میں ہے ہنگامہ کہ خورشیدِ جہاں ڈوبا

عنادل نالہ زن ہیں، پھول سارے چاک دامن ہیں
کسی کے سوگ میں سارے کا سارا گلِستاں ڈوبا

کتابیں رو رہی ہیں ، کاپیوں پر حشر بر پا ہے
سعید احمد کی رحلت سے حقائق کا نشاں ڈوبا

بپا ہے شورِ نالہ خانقاہوں کی فضاؤں میں
سلوک و معرفت کی منزلوں کا راہ داں ڈوبا

لباسِ ماتمی پہنا فصاحت اور بلاغت نے
کہ اک سحرُ اللساں، جانِ قلم ، فخرِ بیاں ڈوبا

نہ لے اے ہم نشیں دارالحدیثوں کی خبر ہم سے
کہ بحرِ رنج و غم میں فکر و فن کا ہر سماں ڈوبا

نہیں ایسا کہ پالن پور ہی ڈوبا ہو صدمے میں

حجاز و مصر ڈوبے ، متحد ہندوستاں ڈوبا
اجل کے ہاتھ نے مشکل تصرف کر دیا ہم پر
فراقِ رہ نما میں آج پورا کارواں ڈوبا
گریں کچھ اس ادا سے بجلیاں اربابِ گلشن پر
مسلسل آنسوؤں میں بلبلوں کا آشیاں ڈوبا
خدایا ناصری کو صبر کا یارا عطا کر دے
غمِ استاذ میں اس کا ہر اک عزمِ جواں ڈوبا

❁...❁...❁

دکھے دلوں کی عرضی

شہِ دوجہاں کی بارگاہ میں

بروفات حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نوراللہ مرقدہ

مولانا قاسم نور حیدرآبادی

صباتو روضے پہ ان کے جا کے بڑے ادب سے سلام کہنا
سلام کے بعد بے کسوں کا دکھوں بھرا اک پیام کہنا

یہ کہنا ان سے کہ دور تم سے ہوا ہے یاں حادثہ ایسا
کہ دل کی بستی اجڑ گئی ہے ، غموں کی بکھری ہے شام کہنا

وہ ایک ساقی تمہارا عاشق پلارہا تھا جو مئے محبت
بہت دنوں سے تھامے کدے میں جوروحِ میناو جام کہنا

وہ آج فرقت کا داغ دے کر وہ الوداع الوداع کہہ کر
سسکتے روتے ہوئے دلوں کو پلا گیا غم کا جام کہنا

چمن کے ان سرخ روگلوں کو اسی نے خون جگر دیا تھا
حقیر ذرے اسی کے ہاتھوں بنے تھے ماہِ تمام کہنا

اسی نے سب کو افق پہ پرواز کا نیا طور تھا سکھایا
اسی کے دم سے امید کے دیپ جل رہے تھے مدام کہنا

یہ کیسی آندھی چلی یکا یک کہ بجھ گئے آس کے دیے سب
اداس وویران ہو گئے ہیں ہر ایک در اور بام کہنا اجڑ گئی ہیں
وہ محفلیں سب بکھر گئے ہیں وہ سارے منظر
خراب حالوں کا اب نہیں ہے کوئی بھی عالی مقام کہنا
وہ جس کے دیدار سے تھی قلب وجگر کو آسودگی میسر
اب اس روئے جانفزا کو آقا ترس رہے ہیں غلام کہنا
یہ کہنا آقا کہ اس کی محفل کی جلوہ افشانیوں کے منظر
بہت ستاتے ہیں یاد آ کر یہ دل ہے تڑپے مدام کہنا
یہ کہنا ان سے تمھارا اک امتی ہے صد پارہء شکستہ
نہیں ہے کچھ باعث سکوں بس وہ روئے ہے صبح وشام کہنا

❁...❁...❁

خراجِ عقیدت

استاذ محترم؛ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی یاد میں

حضرت مولانا محمد شفیق بستوی صاحب

درد خُود ذوقِ دوا سے بہت انجانا ہے
غمکدے میں ہے مگر غم سے ہی بیگانہ ہے

ہوکے سیراب گئے رند ہزاروں لیکن
ہستیٔ ساقی کو کم لوگوں نے پہچانا ہے

اے میرے ذوقِ جنوں! توڑدے جام و سبو
ساقی رخصت ہوا ویران یہ میخانہ ہے

اٹھ گیا صحنِ چمن سے جو نگہبانِ چمن
موسمِ گل میں بھی گلشن لگے ویرانہ ہے

ٹوٹ کر رہ گئے ضبط کے سارے بندھن
اشکِ سوزاں سے ہی لبریز یہ پیمانہ ہے

علم ودانش کی فضاؤں میں عجب غم کا سماں
حیرت انگیز ہے صدمہ کوئی شاہانہ ہے

بزمِ دیں سے ہوئی اک شمعِ فروزاں رخصت

سوختہ جان نظر آتا ہر اک پروانہ ہے
آج دیوبند میں اندوہ بپا ہے جیسے
آہ کیا بزم سے پیرِ مغاں کا جانا ہے
فکر مایوس ہے پرواز گہِ الفت میں
عشق گم صُم ہے کہ محمل نے چلے جانا ہے
تربتِ مُمبئی جنت کی سلامی تجھ کو
تیرے پہلو میں تقدّس کا اک خزانہ ہے
حضرتِ مفتیٔ پالن پُری سعیدِ زماں
جن کی عظمت کا گواہ سارا ہی زمانہ ہے
مسندِ فقہ وحدیث آپ پہ نازاں تھی بہت
درسِ تفسیر سے بہتوں نے دیں جانا ہے
معرفت، رشد وہدایت کی نوائے دل گیر
آپ کی بزم کا بہلول بھی فرزانہ ہے
رہبرِ علم و عمل مرشد ملت کہیئے!
چار سُو وردِ زباں آپ کا افسانہ ہے
مشنِ نانوتوی کا ترجمان و سچا نقیب
وہ جو خود پر تو آئینہ ہشگانہ ہے
آپ تجھے شارح افکارِ ولی اللٰہی
آپ کے علم کی وسعت کا کیا ٹھکانہ ہے

ان کی خدمات میں حقدار خراجِ تحسین
ان کی توصیف میں رطب اللسان زمانہ ہے

اُن کے جانے سے شفیق آج اداسی کا سماں
جیسے ویران ہے چمن اور آشیانہ ہے

۞...۞...۞

خراجِ عقیدت

بیاد: حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ علیہ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا عطاء الرحمن قاسمی صاحب
استاذ مدرسۂ احیاء العلوم، وانمباڑی

عظمت اسلام کو تو نے دوبالا کر دیا
علم سے اپنے زمانے میں اجالا کر دیا
جہل و ظلمت میں صداقت کی اذاں تھی تیری ذات
علم و تحقیق کا حسنِ بیاں تھی تیری ذات
تشنگان علم پا جاتے تھے سب دل کی مراد
تیری ہستی تھی جہاں بھر کا ضمیر اجتہاد
تیری فکر بیکراں کا اجتہادی بانکپن
پیش کرتا تھا نئے شیشوں میں صہبائے کہن
مسئلہ ہو فقہ کا یا فلسفہ کی بات ہو
پھول کے مانند کھلتے تھے معانی کے چمن
شارح شرع و حدیث و عارف ذات خدا

تو سراپا علم و حکمت تو جسم فکروفن
تیرے اک اک قول سے عرفاں و حکمت آشکار
تیری اک اک بات میں دیکھی بلاغت کی پھبن
ناقدان علم کو تیرا ادب کرنا پڑا
علم را بر دل زنی یارے بود کہنا پڑا
تیری چشم دور میں پر فاش تھا سر جہاں
تیرے دل کی دھڑکنوں میں گم تھے کتنے کارواں
گفتگو تیری اسلام اور ادب کا امتزاج
پارہی تھی تیری ہستی اہل عالَم سے خراج
تجھ سے تھا وابستہ فکر ولی اللہ و فہمِ نانوتوی کا معیار نو
تجھ سے تھا آراستہ تحقیق کا دربار نو
آج دنیا سے فقیہ عہد حاضر اٹھ گیا
سب کو جانا ہے یہاں سے یہی اس کا چلن
تیرا فیض علم و حکمت حشر تک جاری رہے
رحمتیں ہو قبر پر تیری ائے سعید الزمن
جب بھی آتا رہے گا لبوں پے تیرا نام
پیش کرتا رہے گا دل محزوں عطاء عقیدت کے سلام

❁...❁...❁

نظم

استاذ محترم حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری کے انتقال پر ملال پر لکھی گئی دل کی ترجمانی کرتی نظم

مولانا اظفر اعظمی صاحب

ہر دل ہے حزیں ہر آنکھ ہے نم اب ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا
منہ موڑ لیا ہے کیوں اس نے وہ ہم سے کیوں اب روٹھ گیا
خود آنکھ تو اپنی بند کرلی ہر آنکھ مگر نمناک ہوئی
دل زور سے دھڑکا سن کر یہ وہ شیخ ہمارا چھوٹ گیا
اس دل کو سنبھالا کیسے دیں اس آنکھ کو کیسے سمجھائیں
بے تاب ہوا ہے سارا جہاں یہ کیسا پھپھولا پھوٹ گیا
ہر شخص یہاں غمگین ہوا اب کون تسلی کس کو دے
غمخوار نہیں ہے کوئی بھی محفل کو وہ ایسے لوٹ گیا
راضی برضا ہی رہنا ہے جنت میں ملیں گے شیخ سے ہم
اظفر کو تسلی ہوجائے کہہ دو کہ نہیں وہ جھوٹ گیا۔۔

مرثیہ

محدث عصر فقیہ دوراں حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری علیہ الرحمۃ کی رحلت؛ ایک عہد کا خاتمہ

مولانا رشید الدین معروفی

افسردہ کلی، پژمردہ ہے گل، اب عہد بہاراں ختم ہوا
صد پارہ ہوا دامانِ جگر اک درد کا درماں ختم ہوا

وہ مشک ختن وہ شیخ زمن، وہ علم و ہنر کا در عدن
گلزارِ ادب ویران ہوا گلبانگ گلستاں ختم ہوا

میخانے ہوئے خالی ایسے کہ جام و سبو بھی ٹوٹ گئے
ساقی جو گیا تو ایسا گیا پینے کا ہی ساماں ختم ہوا

ساحل کی طلب میں رہ رو ہیں، طوفان کی ہرسو آہٹ ہے
ملاح ہوا رخصت ہم سے، اور عزمِ جواناں ختم ہوا

مایوس مکیں، سنسان مکاں، نمناک زمیں،غمناک زماں
یہ کون گیا منزل سے مری اک عہد درخشاں ختم ہوا

سینوں میں نہاں ہے سوزش غم آنکھوں میں رواں ہے اشک الم
روپوش ہوا مہتابِ فلک،اور نور بیاباں ختم ہوا

یہ بزم جہاں ہے راہ گذر، ہر کوئی یہاں ہے پا بہ سفر

اک دھڑکن دل کیا بند ہوئی ہر جوبنِ جاناں ختم ہوا
کہتے ہیں سعید احمد ان کو، وہ علم کا مہر تاباں تھا
اس ماہ جبیں کی رحلت سے اک شہرِ نگاراں ختم ہوا
اے رب دوعالم سن لے تو یہ نالۂ سوزِ رشید الدیں
پھر بھیج دے کوئی مہر مبیں، آفاقِ درخشاں ختم ہوا

❁...❁...❁

نظم

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ کے سانحہ ارتحال سے متاثر ہوکر۔۔۔ ہے درد دل میں بہے ہیں آنسو

مولانا افضال اختر قاسمی
استاذ جامعہ عربیہ شمس العلوم شاہدرہ، دہلی

وہ جو نگاہوں سے دور دل کے قریب تھے اور قریب تر تھے
انھوں نے اوڑھی کفن کی چادر جو نکتہ داں صاحبِ نظر تھے

انھیں پکاروں انھیں کو سوچوں ہے درد دل میں بہے ہیں آنسو
جنھیں ہے کھویا نہیں ستارہ وہ مطلعِ علم کے قمر تھے

وہ فقہِ حنفی کے ترجماں تھے وہ دینِ احمد کے پاسباں تھے
سپوتِ دارالعلوم تھے وہ، وہ باغِ قاسم کے دیدہ ور تھے

وہ درس و تدریس کی لطافت وہ طرزِ تحریر کی بلاغت
زبان و تقریر کی سلاست علومِ دیں کے وہ تاجور تھے

ہاں تھے وہ علم و عمل کے پیکر نفَسْ نفَسْ وہ خدا کے ہو کر
گزارا جیون جہاں میں رہ کر ہوائے دنیا سے بے خبر تھے

مٹا کے ہستی وہ مثلِ دانہ سجا گئے علم کا خزانہ
تلاش جتنا کرے زمانہ ملیں گے کیوں؟ بے بدل گہر تھے

چمن چمن کی کلی کلی میں شگفتہ گل کی مہک میں
جمال ان کا ہے یاد ان کی تمام محفل میں با اثر تھے
فراقِ استاذ میں چبھن ہے دلوں میں ،افضالؔ نالہ زن ہے
ہمیں ہو جنت میں دید ان کی جو یادِ خالق میں چشمِ تر تھے

❁...❁...❁

قال النبی کے نغمے سنائے گا کون اب

مولانا حیدر آلوی ندوی

سالارِ کارواں مرے حضرت سعید تھے
اسلاف کا نشاں مرے حضرت سعید تھے
دل کو یقیں نہیں ہے کہ وہ کہہ گئے وداع
شفقت کا سائباں مرے حضرت سعید تھے
دنیا میں چار سو ترا فیضان عام تھا
اک علم کا جہاں مرے حضرت سعید تھے
اخلاص و معرفت کا نمونہ کہیں جسے
محبوب طالباں مرے حضرت سعید تھے
باطل کو آپ دیتے تھے دنداں شکن جواب
حق گوئی کی زباں مرے حضرت سعید تھے
قال النبی کے نغمے سنائے گا کون اب
اب تک رواں دواں مرے حضرت سعید تھے
مردان حر میں آپ کا ہوتا رہا شمار
غیرت کا اک نشاں مرے حضرت سعید تھے

فرقت سے تیری، آنکھوں سے جھڑتا ہے آبشار
بے لوث دلبراں مرے حضرت سعید تھے
رنجور بلبلیں ہیں فسردہ ہوا چمن
سب تم سے شادماں، مرے حضرت سعید تھے
حق میں ترے دعا ہے کہ بخشش کرے خدا
آقا کے ترجماں ، مرے حضرت سعید تھے
دل دوز و کرب ناک ہے حیدر یہ سانحہ
سالار رہبراں مرے حضرت سعید تھے

❁…❁…❁

اظہار تعزیت

ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کے انتقال پر ملال پر اظہار تعزیت

قاری محمود عالم بلیاوی
استاذ تجوید وقرات جامعہ حسنیہ جونپور

دارالعلوم کا مہِ تاباں نہیں رہا
وہ ایشیا کا فصلِ بہاراں نہیں رہا
سونا ہوا ہے ازہر ہندوستان آج
عشقِ نبی کا قلبِ پریشاں نہیں رہا
قرآن ، حدیث و فقہ کا مجموعۂ کمال
رونق فزائے خاک گلستاں نہیں رہا
سلجھا گیا جو فلسفہ، منطق کی گتھیاں
صد حیف اب وہ لعل بدخشاں نہیں رہا
پنہاں تھا جس میں مسلک نانوتوی کا راز
دیوبند کا وہ شیخ دُر افشاں نہیں رہا
رعب و جلال، زہد و ورع اور پُر وقار
حق کا وہ اک مجاہد دوراں نہیں رہا
بے مثل و بے فیر سعید و جمیل تھا

افسوس اب وہ درد کا درماں نہیں رہا
کتنے قلوب کو کیا روشن جو آفتاب
حقانیت کا تحفۂ یزداں نہیں رہا
کرتی رہیں بہاریں بھی جس ذات کا طواف
شیریں سخن وہ فخرِ شبستاں نہیں رہا
انیس، پانچ، بیس تھی سہ شنبہ وقتِ صبح
رمضان تھی پچیس وہ ذیشاں نہیں رہا
پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا
دیوبند اس کا گورِ غریباں میں رہا
یا رب بنادے قبر مبارک بہشتی باغ
دل کہہ رہا ہے جنتی مہماں نہیں رہا
کھویا ہے ایسا ہم نے خزانے کا اک گہر
محمود صبر و ضبط بھی آساں نہیں رہا

❀...❀...❀

تعزیتی نظم

زاریٔ غم، بہ چشمِ نم، بہ کیفِ الم، بہ نوکِ قلم

(فخر المحدثین، رئیس المحققین، مرجع العلماء والصالحین، استاذ الاساتذہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری نور اللہ مرقدہ
شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کی فرقتِ پر ملال میں کہی گئی تعزیتی نظم)

مولانا محمد رحیق حنفی قاسمی سیتا پوری
متعلم دار العلوم دیوبند

نازشِ اہلِ سنن شیخِ صفا چھوڑ چلے
دے کے احساسِ یتیمی وہ سدا چھوڑ چلے

فکرِ قاسم، تھانوی فہم وَ علمِ انور
اور گنگوہی بصیرت کی ضیا چھوڑ چلے

ماہرِ رفعِ تعارض وَ بصیرِ علمی
آج وہ اہلِ نظر بند کشا چھوڑ چلے

فخرِ احناف، امامِ رہِ تدریسِ سنن
پیکرِ علم و عمل صدق و صفا چھوڑ چلے

اب جو رب چاہے گا وہ ہوگا یہ قولِ آخر
شیخ کیوں کر کے یہ ایمائے قضا چھوڑ چلے

مبتلائے غم و زاری ہے سمائے علمی

آہ وہ محسنِ اربابِ ہدیٰ چھوڑ چلے
جن کے فیضان سے معمور تھیں نسلیں، اب وہ
نائبِ فخرِ رسل صلے علیٰ چھوڑ چلے
خندۂ برق سی ہے وصلِ سعیدی کی خبر
کرکے وہ محوِ غمِ صبح و مسا چھوڑ چلے
جان تھے، شان تھے، طلاب کا ارمان تھے آپ
فخر و پندارِ زماں، شانِ وریٰ چھوڑ چلے
کون ہے ایسا جو گرویدۂ اسلوب نہ ہو
دے کے خوش طرزِ بیاں وہ یہ سما چھوڑ چل
جوق در جوق چلے آتے تھے گرویدۂ درس
آخرش شیخِ زمن دارِ فنا چھوڑ چلے
یاد آتی ہے بہت رونقِ درسِ حضرت
تا ابد شیخِ زماں علمی ضیا چھوڑ چلے
برق تھی جن کی زباں لشکرِ باطل کے تئیں
آج وہ راہئ حق راہ نما چھوڑ چلے
جن کی الفت سے تھا معمور ہر اک قلبِ سلیم
تھے جو ہم سب کے لیے رب کی عطا چھوڑ چلے
کون ہے رحلتِ حضرت پہ جو مغموم نہ ہو
سانس تھم تھم سی گئی جب یہ سنا چھوڑ چلے

رخِ انور ہے مکیں نظروں میں اس طرح کہ
دل نہیں مان رہا وہ یہ فضا چھوڑ چلے

چار سو آج ہیں عشاقِ دروں محوِ فُغاں
کیف سائل ہے کہ اے شیخ کجا چھوڑ چلے

آج ہر خطے سے آتی ہے دعائے رحمت
کیوں نہ آئے کہ تھی جاں جن پہ فدا چھوڑ چلے

کیسے احوالِ غم و دردِ دروں پیش کروں
لفظ عاجز ہے قلم آبلہ پا چھوڑ چلے

میرے مرشد سا کوئی عکس عطا کر مولیٰ
دل ہے رنجور کہ اب علم رسا چھوڑ چلے

اور کیا کیا لکھوں کیا ترک کروں شیخ زمن
دل سے آتی ہے مسلسل یہ ندا چھوڑ چلے

ادنیٰ شاگرد رحیق اب ہے دعا گوئے کرم
رحمتیں شیخ پہ ہوں جو یہ فضا چھوڑ چلے

❁…❁…❁

دعائیہ کلام

بروفات حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

مولانا حیدر آلوی ندوی

مرے استاذ کا نعم البدل مولا عطا کردے
چمن میں ہمنوا ان سا کوئی نغمہ سرا کردے

زمیں گریہ کناں ہے آسماں نالاں ہے فرقت میں
لگا جو زخم ہے دل میں خدا اس کی دوا کردے

چراغ مصطفیٰ اب گل ہوا جاتا ہے گلشن میں
تو اپنے نور سے اس کی ضیا مولا سوا کردے

گیا باطل شکن ، ایوان باطل میں چراغاں ہے
مرے مولا ہمیں پھر اک عطا شعلہ نوا کردے

سلوک و معرفت کی آج گلیوں میں ہے خاموشی
تو پھر آباد ویرانے میں اک شہر وفا کردے

ہجوم عاشقاں دیدار کو بیتاب رہتا تھا
مرے استاذ کا ثانی کوئی جلوہ نما کردے

ہزاروں تشنگان علم و فن نے فیض پایا تھا
تو پیدا ان کے جیسا نکتہ داں اک رہنما کردے

سنائے حال دل کیسے ہے مجبور نوا حیدر
خدایا مغفرت حضرت کی صدقے مصطفیٰ کردے

❁...❁...❁

لوحِ وصال استاذ فن مفتی سعید

------------------۱۴۴۱ھ------------------

مفتی محمد شاکر نثار مدنی قاسمی
استاذ حدیث وفقہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ بیت العلوم سرائے میر اعظم گڑھ

أعوذ بالله الواحد الشهيد من الشيطان الرجيم

----------۲۰۲۰ء----------

بسم الله المقدمِ التواب الرحمٰن الرحيم

----------۱۴۴۱ھ----------

نحمد الجليلَ الرشيدَ ونصلي على النبي الكريم

----------۱۴۴۱ھ----------

قال المهيمن جلّ جلالُه: سلامٌ عليكم اُدْخُلُوا الجنة

----------۱۴۴۱ھ----------

قال الحيّ: أولئك أصحابُ الجنة هم فيها خالدون

----------۱۴۴۱ھ----------

قال الوالي المانع: اُدْخُلُوا الجنةَ لا خوفٌ عليكم

----------۱۴۴۱ھ----------

قال المعزُّ المقتدرُ: كل من عليها فان

---------۱۴۴۱ھ---------

قال النبي الهاشمی علیه السلام: تحفة المؤمن الموت

---------۲۰۲۰ء---------

غَفَرَ له الوليُ الحيّ

---------۱۴۴۱ھ---------

نوّر مرقدَہٗ الستارُ الباقي

---------۱۴۴۱ھ---------

قطعات تاریخ ہادی دہر

---------۲۰۲۰ء---------

لوحِ وصال گُہر ریز مفتی سعید احمد صاحب

---------۲۰۲۰ء---------

لوح وصال مجمع فضائل مفتی سعید احمد صاحب

---------۲۰۲۰ء---------

لوح تاریخ وفات قبلہ عالم

---------۲۰۲۰ء---------

قرارگاہِ رئیس المحدثین

---------۲۰۲۰ء---------

مرقدِ معجز بیاں رئیس المحدثین

---------۲۰۲۰ء---------

مرقد صاحبِ اعجاز رئیس المحدثین

---------۲۰۲۰ء---------

لوحِ تاریخِ وفات حق گو سعید

---------۲۰۲۰ء---------

لوحِ تاریخِ وفات حکیم دانا سعید

---------۲۰۲۰ء---------

آہ ہادی انجمن استاذِ محترم

---------۲۰۲۰ء---------

ختامِ گلشن

---------۱۴۴۱ھ---------

غروبِ نجمِ علم

---------۱۴۴۱ھ---------

حاتمِ دوراں مفسر قرآن

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

فقیہ عالی شان محدث کبیر

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

آفریں طرز شیخ الحدیث

--------- ۲۰۲۰ء ---------

آہ دریا دل اہل نظر

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

صاف گو رُکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

آہ عدیم البدل رُکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

نادر اہل نظر

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

خوشنما باغ دیباج

--------- ۲۰۲۰ء ---------

فخر گلستاں

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

بزرگ غریب

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

گوہر بیان صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

باادب زاہد خوش اوقات

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

امداد ’’رفعنا لک ذکرک‘‘

--------- ۱۴۴۱ھ ---------

آہ طوطی ہند شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

--------- ۲۰۲۰ء ---------

رہنمائے عالَم محدث عظیم

---------۲۰۲۰ء---------

فروغِ جمال ہے تیری ولادت

۱۳۶۰ھ

ختام گلشن ترا سال رحلت

۱۴۴۱ھ

ہاتفِ غیب بولا وہ خوش خوش گئے
شکم دار فانی سے باغ ارم

--- ۲۰۲۰ء ----

باب کو تاج میں ضرب سے
آپ بھی رحلت المعی جان لیں

۵ × ۴۰۴ = ۲۰۲۰ء

بارش ہاتف از شاکر بگفت
عابدِ پارسا داخلِ جنت بُود

--------- ۲۰۲۰ء ---------
--------- ۱۴۴۱ھ --------

سال وفات شُد عیاں
مغفور قائد در جناں

------ ۱۴۴۱ھ ------

از شیر دل: محمد شاکر نثار مدنی
ز بندہ حقیر: محمد شاکر اعظمی

----- ۲۰۲۰ء -----
--- ۲۰۲۰ء -------

❁...❁...❁

صنعت مربع بر وصال وجود پاک مفتی سعید احمدؒ

مفتی محمد شاکر نثار مدنی قاسمی

استاذ حدیث وفقہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ بیت العلوم سرائے میر، اعظم گڑھ

	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	
۲۰۲۰	جامع	شارح	عارف	ماہر	کامل	نافع	صابر	طاہر	۲۰۲۰
۲۰۲۰	شارح	عارف	ماہر	کامل	نافع	صابر	طاہر	جامع	۲۰۲۰
۲۰۲۰	عارف	ماہر	کامل	نافع	صابر	طاہر	جامع	شارح	۲۰۲۰
۲۰۲۰	ماہر	کامل	نافع	صابر	طاہر	جامع	شارح	عارف	۲۰۲۰
۲۰۲۰	کامل	نافع	صابر	طاہر	جامع	شارح	عارف	ماہر	۲۰۲۰
۲۰۲۰	نافع	صابر	طاہر	جامع	شارح	عارف	ماہر	کامل	۲۰۲۰
۲۰۲۰	صابر	طاہر	جامع	شارح	عارف	ماہر	کامل	نافع	۲۰۲۰
۲۰۲۰	طاہر	جامع	شارح	عارف	ماہر	کامل	نافع	صابر	۲۰۲۰
	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	۲۰۲۰	

یہ مصرعہ ۶۴ بار پڑھا جاسکتا ہے اور ہر چہار طرف سے رئیس المحدثین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، (متوفی ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء بروز سہ شنبہ) کے عیسوی سالِ رحلت کا عدد دو ہزار بیس (۲۰۲۰ء) بر آمد ہوتا ہے جو چودہ سو اکتالیس (۱۴۴۱ھ) کے مطابق ہے۔

زعطائے حق شاکر منجیرپٹی

---------۲۰۲۰ء---------

از طالب کمال محمد شاکر قاسمی استاد بیت العلوم

---------۲۰۲۰ء---------

دارالمؤلفین ٹیلیگرام چینل کا علمی دینی دعوتی اور اصلاحی

ماہنامہ

السعید

برقی مجلہ

ماہنامہ السعید کیا ہے؟

رئیس المحدثین حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہ کی یاد میں حضرت مولانا مفتی اشتیاق احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند کی نگرانی اور سرپرستی میں حضرتؒ کی طرف منسوب علوم و معارف کے بکھرے موتیوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ عمدہ لڑی میں پرونے کا ایک فیصلہ ہے !

ترتیب وتہذیب ہم بے مایوں کی اور علوم وحِکم اس باکمال شخصیت کے !اب قبولیت و پذیرائی آپ قارئین کرام کے طفیل ہے۔

اگر قبولیت سے سرفرازی ملی، تو زہے قسمت کہ یہ حضرتؒ کا معنوی اور روحانی فیض ہوگا بصورت دیگر خدام علوم سعید کی فہرست میں تو بہر حال نام آہی جائے گا اور اس سے بڑھ کر کونسی سعادت نصیبی ہوگی !

ان شاء اللہ آنے والے مہینوں میں ہم اس برقی مجلہ کی وساطت سے حضرتؒ کے علوم و معارف آپ تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ دیگر ضروری اور مفید مضامین بھی نشر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، بالخصوص دعوت تحقیق و تفکر کے عنوان سے سلگتے موضوعات پر معرکۃ الآراء تحریرات کے ذریعے دیگر اہل تحقیق کو دعوتِ تحقیق پیش کریں گے آپ حضرات اگر اپنے مضامین کو اس وقیع مجلہ میں شامل اشاعت کرنا چاہتے ہیں تو درج ذیل رابطہ پر اپنے مضامین ارسال کریں، اگر مجلس ادارت اتفاق کرے تو ان شاء اللہ شامل کرلیا جائے گا۔

Email.mahnamaalsaeed2020@gmail.com